مصفاۃ الینابیع

شرح

مشکوٰۃ المصابیح

جلد اول

مقدمہ • کتاب الایمان • کتاب العلم

شارح

مفتی محمد طاہر صاحب

استاذ حدیث ومفتی جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

مکتبہ سعیدیہ دار العلوم غازی آباد

رسول پور، سکروڈہ، غازی آباد، یوپی

تفصیلات

نام کتاب: .... "مِصْفاة اليَنابيع" شرح مشکاۃ المصابیح (جلد اول)

شارح: .... مفتی محمد طاہر صاحب زید مجدہٗ مفتی واستاذ حدیث مظاہر علوم سہارنپور (یوپی)

معاونت: .... مفتی بشیر احمد، معین مفتی مظاہر علوم سہارنپور (یوپی)

تخریج: .... مفتی محمد اسرار، استاذ مظاہر علوم سہارنپور (یوپی)

کمپوزنگ: .... سلیم احمد دھانوی دفتر تعلیمات مظاہر علوم سہارنپور (یوپی)

اشاعت: .... شعبان ۱۴۴۲ھ مطابق اپریل ۲۰۲۱ء

تعداد: .... گیارہ سو

ملنے کے پتے:

(۱) مکتبہ سعیدیہ، دارالعلوم غازی آباد، رسولپور سکروڈہ، غازی آباد، فون نمبر: 08595480031

(۲) کتب خانہ نعیمیہ، جامع مسجد دیوبند، سہارنپور، فون نمبر: 01336223294 - 09756202118

(۳) مکتبہ حکیم الامت، نزد مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، فون نمبر: 09759870037

(۴) ادارہ فیض شیخ، اشرف نگر، احمد آباد، ۵۵، فون نمبر: 09904152928

(۵) مکتبہ ابن عباس، نزد مظاہر علوم سہارنپور فون نمبر: 9045555413

فہرست

مِصْفاة اليَنابيع شرح مشكوة المصابيح

تمت بالخير

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

تقریظ

حضرت اقدس مولانا سید محمد عاقل صاحب دامت برکاتہم شیخ الحدیث وناظم جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

دینی مدارس میں دورۂ حدیث سے پہلے مشکوٰۃ شریف موقوف علیہ کا درجہ رکھتی ہے اس لیے اس کا درس طالب علم اوراستاذ دونوں ہی کے لیے بڑی خصوصیت اوراہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

ہمارے مدرسہ میں درسِ مشکوٰۃ کی یہ ذمہ داری ایک عرصہ (۱۴۲۲ھ سے ۱۴۳۳ھ) تک محبّ گرامی قدر جناب مفتی محمد طاہر صاحب زید مجدہم پر رہی ہے، جو ماشاء اللہ صاحب نظر فقیہ اورکہنہ مشق مفتی ہونے کے ساتھ ساتھ، بااستعداد استاذ اور کامیاب مدرس بھی ہیں، فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ کے خلفاء اورمعتمد تلامذہ میں سے ہیں، بلکہ کچھ عرصہ تک آپ کی نگرانی اورسرپرستی میں ''الأشباہ والنظائر'' کا درس بھی دے چکے ہیں۔

آپ کا ''درسِ مشکوٰۃ'' اپنی حسنِ ترتیب، جامعیت اورافادیت کی بناپر طلبہ میں نہایت مقبول تھا، اسی لیے بہت سے طلبہ بڑے اہتمام سے اس کوضبط بھی کرتے تھے۔

چونکہ طلبہ ہی کے ذریعے مجھے آپ کے درس کی اِن خصوصیات اورنافعیت کا علم ہوتا رہتا تھا، اس لیے میری خواہش تھی کہ آپ کے یہ افادات طبع ہوکر شائع ہوجائیں، تاکہ یہاں کے طلبہ کے علاوہ دیگر مدارس کے طلبہ اوراساتذہ بھی ان سے استفادہ کرسکیں۔

میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار مفتی صاحب سے کیا تو انھوں نے اِس طرف توجہ کی، پھرمیری ہی باربار کی تحریک اورتقاضے سے اس پر باقاعدہ نظرثانی اور تحقیق وتہذیب کا کام شروع ہوا، اِس وقت سردست کتاب العلم کے آخرتک کی احادیث کی تشریح وتحقیق پرمشتمل جلد اول طباعت کے لیے تیار ہے، جس کے شروع میں تقریباً ستر صفحات پرمحیط ایک نہایت بسیط اوربصیرت افروز مقدمہ بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعاہے کہ مؤلف زید مجدہم کی صحت اورعمر میں برکت کے ساتھ، جلد ازجلد اس سلسلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچادیں، اوراس خدمت کو شرفِ قبول عطافرماکر طالبین وشائقین کے لیے نافع اورمفتی صاحب کے لیے ذخیرۂ آخرت بنادیں، اورالدال علی الخیر کفاعله کے قاعدہ سے ان کے اجروثواب میں میرا بھی حصہ لگادیں، آمین۔

وصلی الله تعالیٰ علی خیر خلقه محمد وآله وأصحابه اجمعین، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین.

محمد عاقل عفی عنہ

۱۰؍ربیع الاول ۱۴۴۲ھ

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

تقریظ

حضرت اقدس مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی زید مجدہم

مہتمم دارالعلوم دیوبند وخلیفہ حضرت اقدس مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

مشکوۃ المصابیح کتب احادیث میں اپنی چند در چند خصوصیات کی بنا پر بہت اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، جن کی تفصیل پیش نظر کتاب کے مقدمہ میں ذکر کی گئی ہے، اسی بنا پر درس نظامی کے نصاب تعلیم میں دورۂ حدیث سے پہلے اہمیت کے ساتھ مشکوۃ شریف کا درس دیا جاتا ہے اور پوری کتاب ترجمہ وتشریح کے ساتھ پڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے، اس کتاب کے ذریعہ طلبہ عزیز کو احادیث سے اتنی مناسبت ہوجاتی ہے کہ دورۂ حدیث کے سال تیز رفتار درس حدیث کے دوران تقریباً تمام ابواب کے مضامین سے اجمالاً سبھی کے کان آشنا ہوجاتے ہیں۔

پیش نظر کتاب ''شرح مشکوۃ شریف'' محبّ مکرم جناب مولانا مفتی محمد طاہر صاحب کے درسی افادات پر مشتمل ہے، مفتی صاحب جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے دارالافتاء میں ایک ذمہ دار اور وسیع النظر مفتی کے فرائض کی انجام دہی کے ساتھ اہم کتابوں کی تدریس کی ذمہ داری بھی پوری کرتے ہیں۔

اس سے قبل علامہ ابن نجیم کی قواعد الفقہ سے متعلق اہم ترین کتاب ''الاشباہ والنظائر'' کی شرح ''**عقود الجواھر**'' کے نام سے جناب مفتی محمد طاہر صاحب کے درسی افادات پر مشتمل شائع ہوچکی ہے اور اہل علم سے سند قبول حاصل کرچکی ہے۔

پیش نظر شرح میں جن امور کا اہتمام کیا گیا ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱- کتاب کے آغاز میں مقدمۃ العلم اور مقدمۃ الکتاب کے عنوان سے بیش قیمت مباحث۔

۲- ہر حدیث کے راوی کا تعارف اور ان کے احوال کا تذکرہ۔

۳- احادیث مبارکہ میں وارد جملوں اور کلمات کی لغوی، نحوی اور صرفی ضروری تحقیق۔

۴- حدیث سے حاصل ہونے والے فقہی مسائل کی توضیح۔

۵- احادیث کی تخریج اور دیگر درج شدہ مضامین کے حوالہ جات کی نشاندہی وغیرہ۔

ان کے علاوہ شرح میں دیگر متعدد امور کی رعایت کی گئی ہے، جن کا اندازہ مطالعہ کنندگان خود کرلیں گے، مذکورہ بالا امور کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ انشاء اللہ یہ کتاب طلبہ عزیز کے لیے حل کتاب کے سلسلہ میں بہترین معاون ثابت ہوگی، اللہ تعالیٰ اس علمی خدمت کو شرف قبولیت سے نوازے اور طلبہ عزیز کے لیے نافع بنائے۔ آمین

ابوالقاسم نعمانی غفرلہ
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۱۴۴۲/۳/۴ھ/۲۲/۱۰/۲۰۲۰ء

بسم الله الرحمن الرحیم

تقریظ

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری زید مجدہم
شیخ الحدیث وصدر مفتی جامعہ تعلیم الدین، ڈابھیل گجرات
وخلیفہ حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ

نحمده ونصلي على رسوله الكريم .

برصغیر ہند وپاک کے علماء کرام کو اللہ تعالی نے اس آخری دور میں کتب احادیث کی خدمت کی خاص توفیق عطا فرمائی، انہوں نے متداول کتب احادیث کی بہت سی شروح عربی زبان میں لکھی ہیں جو عرب دنیا میں مقبول ہیں، اور بہت سی شروح اردو میں بھی لکھی گئی ہیں، اسی سلسلہ کی اہم کڑی مشکوۃ المصابیح ہے، اس کی بہت سی شرحیں عربی، فارسی، اردو زبان میں لکھی گئی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ: اہل علم جس کتاب کو جس درجے اور رتبے کی سمجھتے ہیں، اسی حد تک اس پر کام کرتے ہیں، اس کے حواشی، رجال، شروح، تعلیقات اور اشاریوں وغیرہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور اسی سے کتاب کے مقام ومرتبہ کا تعین ہوجاتا ہے، چنانچہ ''مشکوۃ المصابیح'' اسی نوع کی کتاب ہے۔

اس کی امتیازی شان یہ ہے کہ: اس میں صحاح ستہ کے علاوہ دیگر کتب احادیث مثلاً: شعب الایمان للبیہقی، مسند احمد، مسند رزین وغیرہ کی احادیث وافر مقدار میں موجود ہیں، ''مشکوۃ المصابیح'' میں ایک خصوصیت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ: اس میں ان احادیث کی روایت کا التزام نہیں کیا گیا کہ جن کے سمجھنے میں قاری کو دشواری اور مشکلات کا سامنا ہو، بلکہ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ مشکوۃ المصابیح کو ابتدائی تعارف یا ایک عام مسلمان کے لئے احادیث نبویہ سے علمی و عملی تعلق وربط پیدا کرنے کے لئے منصۂ شہود پر لایا گیا تھا، چنانچہ آج بھی مدارس اسلامیہ میں اس کو صحاح ستہ سے پہلے پڑھایا جاتا ہے، اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ تعارف کا اول مرحلہ ایسی کتاب کے ذریعہ ہو کہ جس میں نہ اتنا طول ہو کہ صرف منتہی طلبہ ہی اس سے استفادہ کرسکیں، اور نہ ہی اتنا اختصار ہو کہ جس سے عام قاری بدکنے لگیں۔

دوسری طرف یہ بات ہے کہ: اگر صحیح بخاری کو یہ رتبہ حاصل ہے کہ مصائب ومشکلات میں اس کا ختم کرایا جاتا ہے، تو مشکوۃ شریف کو یہ مقام حاصل ہے کہ وہ صوفیا کے حلقہ میں زیر درس رہی ہے، صوفیائے کرام نے حدیث کے اس مجموع کو اذکار و وظائف سے معمور زندگی میں اس وجہ سے مقدم رکھا کہ یہ کتاب فن حدیث کی دیگر کتابوں کی طرح اطناب وایجاز پر مشتمل نہیں ہے۔

ماضی قریب میں شمالی ہند میں آزادی کی جدو جہد کرنے والے جن کی قیادت حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی قدس سرہ (م ۱۲۴۶ھ) فرمارہے تھے، ان کا اپنے مجاہدین کے سلسلے میں یہ طریقۂ کار رہا کہ: مشکوۃ شریف کے درس و

تدریس کا التزام تھا، درس کی ذمہ داری حضرت شاہ اسماعیل علیہ الرحمۃ (م ۱۲۴۶ھ) انجام دیتے تھے، البتہ اسرار و رموز اور نکات و حِکَم حضرت سید احمد بریلویؒ بیان فرماتے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ (م ۱۱۷۴ھ) کی معرکۃ الآراء تصنیف ''حجۃ اللہ البالغۃ'' جو علوم اسرارِ الٰہیہ اور حِکَمات شرعیہ کے موضوع پر مشتمل ہے، مثالی کتاب ہے، اس کے متعلق صاحب النظر علماء کی یہ رائے ہے کہ: وہ درحقیقت مشکوۃ شریف کی شرح ہے، جو حضرات کتاب کی ظاہری ترتیب سے ہٹ کر تخریج احادیث پر عمیق نظر رکھتے ہیں، وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ شاہ صاحب عموماً مشکوۃ شریف کی احادیث کو پیش نظر رکھ کر امت مسلمہ کے سامنے اپنے قیمتی جواہر پیش کرتے تھے۔

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ (م ۱۳۷۵ھ) تحریر فرماتے ہیں:

''جس طرح ہندوستان میں بخاری کی متعدد شروح مختلف علماء کے قلم سے پائی جاتی ہیں، مشکوۃ کے حواشی و شروح کی تعداد تو ان سے کہیں زیادہ ہے، آخر میں دنیائے اسلام کی وہ نادر و بے مثال کتاب جس کا نام ''حجۃ اللہ البالغۃ'' ہے، بہ ظاہر وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کوئی مستقل کتاب معلوم ہوتی ہے، لیکن اپنے تجربہ و تتبع کی بنیاد پر میرا یہ خیال ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ''مشکوۃ'' ہی کو سامنے رکھ کر ہر باب کی حدیثوں کو مجموعی نقطۂ نظر سے کچھ اس طرح مرتب فرمایا ہے کہ: اسلام ایک فلسفے کی شکل میں بدل گیا ہے، ایسا فلسفہ جس کی طرف نہ رہنمائی پہلوں کو میسر آئی اور نہ پچھلوں کو، اسی لئے میں ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کو عموماً مشکوۃ ہی کی ایک خاص شرح قرار دیتا ہوں۔ (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ۱/۲۰۱)

زیر نظر کتاب ''مصفاۃ الینابیع'' جو درحقیقت مولانا مفتی محمد طاہر صاحب زید مجدہ (صدر مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور) کا درس مشکوۃ ہے، شرح احادیث کی عمدہ کاوش ہے، مفتی صاحب موصوف ماشاء اللہ صاحب نظر فقیہ اور کہنہ مشق مفتی ہونے کے ساتھ ساتھ بااستعداد استاد اور کامیاب مدرس بھی ہیں، ان کے ان درسی افادات کی اہمیت کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ: حضرت مولانا محمد عاقل صاحب دامت برکاتہم (شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور) جیسے کہنہ مشق محدث اور ''الدر المنضود علی سنن ابی داؤد'' کے مصنف نے بار بار انہیں مشکوۃ شریف کے درسی افادات جمع کر کے طبع کرنے کی تاکید کی، حضرت دامت برکاتہم کی تقریظ میں یہ بات موجود ہے ''ہیرے کی پرکھ جوہری جانے'' مثل مشہور ہے، یعنی اہل ہنر کو قدرداں ہی پہچانتے ہیں۔

دل سے دعا کرتا ہوں کہ: اللہ تعالیٰ اس کتاب کے فیض کو عام و تام کرے، اور شارح کو کتاب کے بقیہ حصوں کی تکمیل کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

۲۷ ربیع الثانی ۱۴۴۲ھ

بسم الله الرحمن الرحیم

تقریظ

حضرت اقدس مولانا محمد ابراہیم صاحب پانڈور زید مجدہم
خلیفہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہ
وجانشین فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

الحمدلله رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابه اجمعین.

امابعد! مشکوۃ المصابیح حدیث نبوی کی ایک جامع اور بنیادی کتاب ہے، جس میں صحاح ستہ اور دیگر معتبر کتب احادیث سے تقریباً ۵۹۴۵ حدیثیں جمع کی گئی ہیں، یہ کتاب درس نظامی میں برسہابرس سے داخل نصاب ہے، اوردورۂ حدیث کے لئے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتی ہے، بہت دنوں سے اس کتاب کی اردو میں ایک جامع، مختصر اور آسان شرح کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔

چنانچہ حضرت فقیہ الامت مفتی محمود الحسن صاحب نوراللہ مرقدہ کے لائق فائق شاگرد اور خلیفہ ومجاز حضرت مفتی محمد طاہر صاحب مدظلہ العالی استاذ حدیث وصدر مفتی مظاہرعلوم سہارنپور کے درس مشکوۃ شریف کی مقبولیت کو دیکھ کر مدرسہ مظاہرعلوم سہارنپور کے صدرالمدرسین وشیخ الحدیث حضرت مولانا عاقل صاحب دامت برکاتہم نے انہیں حکم فرمایا کہ آپ اپنے درس کو قلم بند کراکر مرتب فرمادیں، انشاء اللہ اساتذہ کرام اور طلبہ عزیز کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

حضرت مفتی محمد طاہر صاحب مدظلہ العالی نے کام شروع کیا، جس کی پہلی جلد الحمدللہ مکمل ہوگئی، حضرت مولانا عاقل صاحب زیدمجدہ ہی کے مشورہ سے ''مِصْفاة اليَنابيع '' نام تجویز کیا گیا، الحمدللہ یہ شرح اسم بامسمیٰ ہے، تشریح صاف شفاف، آسان اورتشفی بخش ہے، نہ اختصار مخل ہے نہ تطویل ممل ہے، اور ینابیع ومراجع کے حاشیہ میں حوالجات بھی موجود ہیں، جس کی مدد سے اصل کتاب تک رسائی آسان ہے، اورکتاب کے شروع میں ۷۶ صفحہ کا قیمتی مقدمہ ہے جس میں بعض ضروری عناوین بالکل نئے انداز میں مؤلف زیدمجدہ نے قائم فرمائے ہیں، یہ مقدمہ گویا کہ دریا کو کوزہ میں سمودیا گیا ہے، نیز مقدمۃ العلم اورمقدمۃ الکتاب کو جامع ہونے کے ساتھ افادۂ عامہ پر بھی مشتمل ہے، جیسے ایک عنوان ''آداب الطالبین'' ہے، جو ہرطالب علم کے لئے ضروری اورمفید تر ہے۔

مولانا موصوف کی اس سے قبل حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کے افادات پر مشتمل ''الاشباہ والنظائر '' کی شرح

"**عقود الجواهر**" کی دوجلدیں منظر عام پر آچکی ہیں جوطلبہ افتاء ومفتیان کرام کے نزدیک منظور ومقبول ہیں، یقیناً یہ سب حضرت رحمہ اللہ ہی کا فیضان اور خصوصی توجہ کی برکت ہے **اللھم زد فزد.**

امید ہے کہ ان شاء اللہ یہ محنت بھی عنداللہ وعندالناس قبولیت کا مرتبہ حاصل کرلے گی، دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ موصوف کی اس خدمت کو بے انتہا قبولیت عطا فرمائے اور اساتذہ وطلبہ ہر ایک کے لئے خوب خوب نافع بنائے اور اس شرح کی جلد تکمیل کی توفیق فرمائے۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

وصلی اللہ علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

وأنا العبد

محمد ابراہیم
جوہانسبرگ (ساؤتھ افریقہ)

پیش لفظ

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

الحمدللہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین وعلی من تبعھم باحسان إلی یوم الدین ......امابعد

بحمداللہ اِس زمانہ میں علم کے وسائل وذرائع ماضی کی بہ نسبت کثیر ہیں، اسی لئے اب علم کی تحصیل بہت سہل وآسان ہوگئی ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ علم کی راہ میں جس قدر سہولتیں وآسانیاں پیدا ہورہی ہیں اتنی ہی علمی پختگی میں کمی واقع ہوتی جارہی ہے، بالخصوص علوم عربیہ ''نحو، صرف، معانی، بیان، بدیع وغیرہ میں عموماً وہ استعداد پیدانہیں ہوپاتی جوعلوم مقصودہ ''قرآن وحدیث اوران سے مستنبط شدہ علوم کو کما حقہ سمجھنے کے لئے درکار ہے **إلاماشاء اللہ فالی اللہ المشتکیٰ وھو المستعان.**

اِسی وجہ سے موجودہ دور میں علماء نے کتبِ درس نظامی کی اردو شروحات پرتوجہ مبذول فرمائی ہے، ورنہ قدیم زمانہ میں اردوشروحات کارواج نہ تھا۔

درسِ نظامی کے نصاب کے مطابق طلباء کے لئے حدیث کی ابتدائی کتاب مشکوۃ شریف ہے، لیکن اس کتاب کو حق تعالیٰ شانہ نے انتہائی مقبولیت عطافرمائی ہے، یہ کتاب ہمیشہ اہل علم کی توجہ کا مرکز رہی بلکہ وقتِ تالیف سے آج تک عوام وخواص سب کے لئے مرجع بنی ہوئی ہے، اورصحاح ستہ کے درس کے لئے موقوف علیہ کا درجہ رکھتی ہے۔

مظاہرعلوم سہارنپور میں تقریباً بارہ سال تک اس کادرس (مکمل مشکوۃ کابھی اوراخیر کے چند سال جلد اول کا) احقر سے متعلق رہا، نمونۂ اسلاف شیخ کامل حضرت مولانا سید محمد عاقل صاحب دامت برکاتہم شیخ الحدیث وناظم مظاہرعلوم سہارنپور نے اپنے حسنِ ظن کی بناپر احقر کے سبق پراطمینان کااظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''میں یہ چاہتاہوں کہ تمہارا یہ درس شرح کی صورت میں آجائے جس سے دیگر مدارس کے طلباء واساتذہ بھی استفادہ کرسکیں اس لئے اس کی شرح کا کام شروع کرو''۔

بندہ اپنی علمی کم مائیگی کی بات سوچ کر خاموش رہ گیا، لیکن حضرت دامت برکاتہم متعدد مواقع پر یہ بات دہراتے

رہے، بالخصوص جب ''عقود الجواھر شرح الاشباہ والنظائر '' کی جلد اول بندہ کی طرف سے طبع ہوکر آئی اس وقت حضرت نے شرح مشکوۃ کے لئے تقاضہ کے طور پر امر فرمایا، اس وقت دل میں یہ بات آئی کہ اگر چہ احقر کی وہ صلاحیت نہیں ہے جو مشکوۃ جیسی اہم کتاب کی شرح کے لئے درکار ہے، لیکن جب حضرت باربار اِس طرف توجہ دلا رہے ہیں تو بہت ممکن ہے کہ حق تعالیٰ شانہ اپنے فضل سے اِس ناتواں سے یہ عظیم خدمت لے لے، کیونکہ مشہور ہے'' قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید'' کہ اہل اللہ جو کہتے ہیں وہ نورِفراست سے دیکھ کر کہتے ہیں، اور جب اللہ چاہتا ہے تو مکڑی سے بھی کام لے لیتا ہے۔

چنانچہ اللہ پر بھروسہ کر کے حضرت دامت برکاتہم کی سرپرستی میں تقریباً ایک سال قبل باقاعدہ شرح کے طور پر کام شروع کیا گیا، تاوقتِ تحریر الحمدللہ کتاب العلم کے آخر تک کی احادیث کی تشریح وتحقیق مکمل ہوگئی ہے جو جلد اول کے طور پر طباعت کے لئے تیار ہے۔

چونکہ حضرت کا مقصود وقت کی ضرورت کی وجہ سے مشکوۃ کی ایک متوسط شرح ہے، جس میں نہ طوالتِ ممل ہو، جو اکتاہٹ کا سبب بنے، نہ اختصارِ مخل ہو کہ ضرورت کے مضامین بھی ناقص رہ جائیں اور طلباء تشنگی محسوس کریں، اس لئے اِس شرح میں توسط واعتدال کو قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے، اِسی بات کو ذہن میں رکھ کر ارادہ یہ ہے اور تخمینہ بھی یہی ہے کہ تقریباً چھ جلدوں میں اِس شرح کی تکمیل ہوجائے، اس شرح میں درج ذیل امور ملحوظ ہیں:

(۱) کتب حدیث کی تدریس کا جو طرز مدارس میں رائج ہے اس سے پورے طور پر مناسبت پیدا ہونے کے لئے حدیث کے مبادیاتِ عشرہ کا بیان کافی نہیں، بلکہ ابتدائی اور بھی کچھ مباحث ایسے ہیں جن سے طلباء کو واقف ہونا ضروری ہے، مثلاً تدوینِ حدیث کے مراحل، منکرینِ حدیث کے شبہات کا جواب، علم الحدیث فی الہند، تعلق علم الفقہ بعلم الحدیث، مقام الامام الاعظم ابی حنیفۃ فی الحدیث، وغیرہ امور ایسے ہیں جن میں عام طلبہ اخیر تک بھی تشنگی محسوس کرتے ہیں، اِس ضرورت کا احساس کر کے کتاب کے شروع میں ایک بسیط ومفصل مقدمہ تحریر کیا گیا، اس کے مطالعہ سے طلباء کے قلوب میں حدیث کی اہمیت پیدا ہوگی، ذوق وشوق بڑھے گا اور ان کی بصیرت میں اضافہ ہوگا۔

(۲) مشکوۃ کے کتب وابواب کا باہمی ربط، مشکوۃ کی ایک خصوصیت ''حسن ترتیب'' ہے یعنی مشکوۃ میں کتاب اور باب کے لفظ سے تراجم (عنوانات) قائم کر کے ان کے تحت ایک خاص ترتیب سے روایات کو لایا گیا ہے، یہ ترتیب بہت اہمیت کی حامل ہے، اِس شرح میں لفظ کتاب کے عنوان کے تحت تفصیلی ربط اور لفظ باب کے عنوان کے تحت جزئی وخصوصی ربط اہتمام کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، تاکہ پوری کتاب کے مضامین مرتب طور پر ذہن نشین ہوں۔

(۳) حدیث کی عبارت مع اعراب لکھ کر بامحاورہ ترجمہ۔

(۴) ہر حدیث کے راوی کا تعارف اور ان کے احوال کا تذکرہ۔

(۵) تشریح حدیث، مشکوۃ شریف طلباء کے لئے پہلی کتاب ہے اسلئے تشریحی امور کے لئے جامع، مرتب لیکن سلسیس اور واضح تعبیر لائی گئی ہے تا کہ حدیث کا مفہوم بخوبی واضح ہو جائے۔

(٦) اہم تشریحی مضامین پر ذیلی عنوانات قائم کئے گئے ہیں، تا کہ عنوان ہی سے حدیث کا خلاصہ اور اس کے اجمالی مضامین سمجھ میں آ جائیں، عنوان کے بعد مضمون کی تشریح کی گئی ہے، کیونکہ اجمال کے بعد تفصیل سے بات اوقع فی النفس ہو جاتی ہے۔

(۷) ضرورت کی جگہ کلماتِ حدیث کی لغوی وصرفی تحقیق۔

(۸) حدیث سے مستنبط ہونے والے فقہی مسائل کی توضیح اور مفتی بہ قول کی نشاندہی۔

(۹) اختلافی مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف، ان کے دلائل، اور راجح دلیل کی تعیین۔

(۱۰) حاشیہ میں احادیث مشکوۃ کی تخریج اور تشریحی مضامین کے حوالہ جات۔

(۱۱) حدیث سے مستنبط ہونے والے فوائد ونکات۔

(۱۲) عبرت وموعظت پر مشتمل روایات کے بیان کے موقعہ پر طلباء کو تنبیہ اور بعض مقامات میں موقعہ کی مناسبت سے اکابر کے واقعات، تا کہ علم پر عمل کا جذبہ پیدا ہوتا رہے۔

حدیث کے طالب علم کے لئے یہ سب امور ضروری ہیں لیکن اِس شرح میں ان امور کو اختصار کے ساتھ اِس طور پر لانے کی سعی کی گئی ہے کہ قاری اکتاہٹ میں مبتلا نہ ہو اور وہ توسط واعتدال ختم نہ ہو جو اس شرح میں بطور خاص ملحوظ ہے۔

احادیث کے حل وتوضیح کے لئے مشکوۃ المصابیح کی بنیادی شروحات ''مرقاۃ المفاتیح، شرح طیبی، لمعات التنقیح، فتح الالٰہ فی شرح المشکوۃ لابن حجر المکی'' وغیرہ تو خاص طور پر زیر نظر ہیں، ان کے علاوہ خود مصابیح السنہ کی درج ذیل قدیم شرحوں سے بھی استفادہ کیا جا رہا ہے۔

۱:-كتاب الميسّر، لشهاب الدين فضل الله بن حسن التوربشتي الحنفي متوفى ٦٠٠ھ۔

۲:-تحفة الابرار، قاضي ناصر الدين عبدالله بن عمر البيضاوي متوفى ٦٨٥ھ۔

۳:-المفاتيح في شرح المصابيح و مُظهِر الدين الحسين بن محمود بن الحسن الزيداني الحنفي متوفى ٧٢٧ھ۔

٤:- شرح المصابيح محمد بن عبداللطيف بن عبدالعزيز بن ملك الرومي الحنفي متوفى ٨٥٤ھ.

حضرت اقدس مولانا محمد عاقل صاحب زید مجدہم ہی کے مشورہ سے کتاب کا نام ''مِصْفاۃ الیَنابیع'' تجویز کیا گیا ہے،

ینابیع: ینبوع کی جمع ہے، بمعنی پانی کا چشمہ، اور مِصْفاۃ؛ صفایصفو سے اسم آلہ کا صیغہ ہے، اس کے معنی ہیں چھاننے کا آلہ، معنی ہوئے چشموں کے پانی کو چھاننے کا آلہ، چَھلنا (بڑی چھلنی) مشکوۃ اور مصابیح السنہ کی بنیادی شروحات چشمہ ہیں، زیر نظر شرح میں انکا خلاصہ اور ماحصل مہذب وملخص کر کے پیش کیا گیا ہے تا کہ مِصفاۃ (اس شرح) کے مطالعہ سے قاری کو ینابیع (بنیادی شروحات) تک رسائی حاصل ہو سکے اوران کو سمجھنے کی لیاقت پیدا ہو جائے۔

اِس شرح کی ترتیب میں عزیزِ مکرم مفتی بشیر احمد سلمہ معین مفتی واستاذ مظاہر علوم کا اور تخریج وحوالہ جات میں عزیزِ مکرم مفتی محمد اسرار سلمہ استاذ مظاہر علوم کا بڑا مخلصانہ تعاون رہا ہے **فجزاهما الله احسن الجزاء.**

ظاہری اسباب کے لحاظ سے اِن دونوں حضرات کے تعاون سے احقر کے لئے یہ عظیم خدمت ممکن ہوئی، مفتی بشیر احمد سلمہ احقر کی **الاشباه والنظائر** کی شرح "**عقود الجواهر**" کے بھی معاون ومرتب ہیں، حق تعالی شانہ ہر دو کے علم وعمل میں برکت دے، حدیث کے برکات وثمرات عطا فرمائے، ان کو مزید علمی خدمات کی توفیق بخشے۔

اخیر میں احقر حق تعالی شانہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے محض اپنے فضل وکرم سے اِس عاجز وناتواں کو اِس عظیم ومبارک خدمت کی توفیق مرحمت فرمائی، کیونکہ حدیث پاک کی خدمت بہت بڑی دولت اور عظیم نعمت ہے، اس کی کریمانہ ذات سے کیا بعید ہے کہ وہ روزِ قیامت حدیث کے خدمت گذاروں میں حشر فرمادے، **والله ذو الفضل العظيم.**

اللہ کی بارگاہ میں التجا ہے کہ وہ عافیت وسہولت کے ساتھ اس شرح کی تکمیل فرمائے اور اس کو اپنی رضا کے حصول کا ذریعہ اور آخرت کا ذخیرہ بنائے اور اس کے نفع کو عام وتام فرمائے۔

العبد محمد طاہر عفا اللہ عنہ

مظاہر علوم سہارنپور ۲۳/۷/۱۴۴۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مُقَدِّمَة

اساتذہ کا ہمیشہ سے معمول رہا ہے کہ اصل کتاب کو شروع کرنے سے پہلے کچھ باتیں بطور مبادیات بیان فرماتے ہیں کچھ چیزیں اس فن سے متعلق ہوتی ہیں جس میں وہ کتاب ہے اور کچھ نفس کتاب سے متعلق ہوتی ہیں، ان دونوں کو مبادیات کہا جاتا ہے، یعنی شروع کی باتیں۔ فن سے متعلق چیزوں کو ''مقدمۃ العلم'' اور کتاب سے متعلق امور کو ''مقدمۃ الکتاب کہتے ہیں'' (مقدمہ بکسر الدال وانفتح دونوں صحیح ہیں راجح بکسر الدال ہے[1])

زیر نظر کتاب مشکوۃ المصابیح حدیث کی اہم اور بلند پایہ کتاب ہے اس لئے یہاں بھی کچھ باتیں نفسِ فن سے متعلق اور کچھ نفسِ کتاب سے متعلق بیان کی جائیں گی۔

مبادیات سے پہلے تین بحثیں بطور آداب کے بیان ہوں گی: (۱) **بحث بداية الدرس في يوم الأربعاء**، (۲) **بحث فضيلة العلم**، (۳) **بحث آداب الطالبين.**

(۱) بحث بداية الدرس في يوم الأربعاء

ہمارے مشائخ رحمہم اللہ کا عام تعامل بدھ کے دن اسباق کی ابتداء کرنے کا رہا ہے، اس سلسلہ میں صاحبِ ہدایہ کے شاگرد علامہ زرنوجیؒ نے اپنے استاذ صاحبِ ہدایہ کی عادت نقل کی ہے: ''**كَانَ أُسْتَاذُنَا الشَّيْخُ الإِمَامُ بُرْهَانُ الدِّيْنِ رَحِمَهُ اللّٰهُ يُوْقِفُ بِدَايَةَ السَّبَقِ عَلٰى يَوْمِ الْأَرْبِعَاءِ**''[2] کہ ہمارے استاذ یعنی صاحبِ ہدایہ سبق کی ابتداء کو بدھ کے دن پر موقوف رکھتے تھے، اور دلیل میں اپنی سند سے یہ حدیث بیان کرتے تھے: **مَامِنْ شَيْئٍ بُدِئَ يوم الأربعاءِ إلَّا وَقَدْ تَمَّ**[3] کہ بدھ کے دن جو کام شروع کیا جاتا ہے وہ تکمیل تک پہنچتا ہے۔

---

(۱) تاج العروس ۱۳۹/۳۳، ط: دار الکتب العلمیہ بیروت.
(۲) تعلیم المتعلم ص ۸۵۔ ط: مکتبہ عکاظ دیوبند.
(۳) تعلیم المتعلم ص ۸۵.

یوم الاربعاء میں درس کی ابتداء والی حدیث پر اشکالات اور جوابات:

لیکن علامہ سخاویؒ نے اس روایت پر دو اعتراض کئے ہیں، پہلا اعتراض کیا: لم أقف له على أصل یعنی مجھے اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ملی، اور دوسرا اعتراض کیا کہ یہ روایت طبرانی کی اس حدیث کے معارض ہے: ''یوم الأربعاء یوم نحس مستمر'' کہ بدھ کا دن منحوس ہے، اس میں یوم الاربعاء کو منحوس کہا گیا ہے؟(۱)

ملا علی قاریؒ نے دونوں اعتراضوں کا جواب دیا ہے، انہوں نے فرمایا: علامہ سخاوی کا ''لم أقف له على أصل'' کہنا اپنے علم کے اعتبار سے ہے، اس لئے کہ صاحبِ ہدایہ جیسا فقیہ محدث ایک حدیث اپنی سند سے مرفوعاً بیان کر رہا ہے، اور ان کے شاگرد صراحةً فرما رہے ہیں کہ وہ اپنی سند سے حدیث بیان کرتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے تو یہ اس حدیث کے ثبوت کے لئے کافی ہے؛ اگرچہ متداول کتبِ حدیث میں وہ روایت نہ ملے، اور طبرانی کی مذکورہ روایت ضعیف ہے اور اگر صحیح بھی ہو تو اس کا محمل یہ ہے کہ بدھ کے دن قومِ عاد پر عذاب نازل کیا گیا، جس کے نتیجہ میں کافر ہلاک ہوگئے، مگر مؤمنین محفوظ رہے، پس یہ دن کفار کے حق میں منحوس ہوا اور مؤمنین کے حق میں مبارک ہوا۔(۲)

اس کی تائید حضرت جابر بن عبداللہؓ کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں کہ غزوہ خندق کے موقعہ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجدِ فتح میں پیر، منگل اور بدھ کے دن دعاء فرمائی، بدھ کے دن ظہر وعصر کے درمیان وہ دعا قبول ہوئی اور کفار کو شکست ہوئی، حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد جب بھی مجھے کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا ہے تو میں بدھ کے دن ظہر وعصر کے درمیان دعا کرتا ہوں، وہ دعا مجھے قبول ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔(۳)

صاحبِ ہدایہ اور اکابر کے اس معمول کی تائید میں بعض علماء نے حضرت جابرؓ کی یہ حدیث بھی ذکر فرمائی،

---

(۱) المقاصد الحسنة في بيان كثير من الاحاديث المشتهرة على الألسنة ص ٥٧٤، الرقم ٩٤٣. ط: دار الكتاب العربي بيروت، والحديث: أخرجه الطبراني في الأوسط ٢٤٣/١، برقم (٧٨٧)٦/٢٨٣ برقم (٦٤٢٢) ط: دار الحرمين القاهرة.

(۲) الأسرار المرفوعة في الأحاديث الموضوعة (٣٠٢/١)

(۳) رواه البخاري في الأدب المفرد ص ٥٥-٥٥٨ (٧٠٤) ط: دار ابن كثير بيروت، وأحمد في مسنده ٤٢٥/٢٢ (١٤٥٦٣) ط: مؤسسة الرسالة بيروت، ونصه: "أن النبي صلى الله عليه وسلم دعا (بقیہ: اگلے صفحہ پر)

''إن الله خلق النور يوم الأربعاء[۱] '' کہ اللہ نے نور کو چہارشنبہ کے دن پیدا فرمایا اور ظاہر ہے کہ علم بھی سراسر نور ہے اس لئے بھی چہارشنبہ کے دن اسباق کی ابتداء قرینِ قیاس ہے۔

پیر کے دن اسباق کی ابتداء:

بعض مرتبہ دوشنبہ (پیر کے دن) اسباق کو شروع کیا جاتا ہے، یہ بھی مناسب ہے، ابونعیم اصبہانی نے تاریخ اصبہان میں حضرت انسؓ کے واسطہ سے ایک روایت نقل فرمائی ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے: ''اطلبوا العلم يوم الإثنين فإنه ميسّر لصاحبه[۲]''، یعنی پیر کے دن سے طلب علم کا آغاز کرو، کہ یہ صاحبِ علم کے لئے سہولت کا باعث ہے۔

(۲) بحث فضيلة العلم

آدمی جس چیز کو حاصل کرنے کا قصد کرے اس کی فضیلت اور اہمیت معلوم ہونی چاہئے، عظمت واہمیت معلوم ہونے سے اس کی رغبت اور شوق پیدا ہوتا ہے، پھر انسان محنت ومجاہدہ کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔

علم دین کے بے شمار فضائل قرآن وحدیث میں وارد ہوئے ہیں، چند فضائل یہ ہیں:

(۱) توحید، اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے، اس کو بیان کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلاۤئِكَةُ وَاُولُو الْعِلْمِ الآية'' [۳] یعنی اللہ تعالیٰ گواہی دیتے ہیں اس بات کی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور علم والے بھی گواہی دیتے ہیں، اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ نے توحید کے لئے اپنی اور ملائکہ کی شہادت کے ساتھ اہل علم کی شہادت کو شامل فرمایا، جو اہل علم کے لئے بڑے شرف ومجد کی چیز ہے۔

گذشتہ صفحہ کا بقیہ: في مسجد الفتح ثلاثا: يوم الإثنين ويوم الثلاثاء ويوم الأربعاء، فاستجيب له يوم الأربعاء بين الصلاتين فعرف البِشر في وجهه، قال جابر: فلم ينزل بي امرمهم غليظ الاتوخَّيتُ أي: تحريتُ وقصدت. تلك الساعة، فأدعوا فيها فأعرف الإجابة''

(۱) أخرجه مسلم في صحيحه ۲ / ۳۷۱، كتاب التوبة.

(۲) أخرجه أبونعيم الأصبهاني بسنده عن أنسؓ في ''تاريخه'' ورواته ثقات ۱ / ۴۰۸. ط: دار الكتب العلميه بيروت.

(۳) آل عمران: ۱۸.

(۲) اہل علم کی غیر اہل علم پر برتری کو بیان کرتے ہوئے اللہ جل شانہ فرماتا ہے: ''قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّـذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لايَعْلَمُوْن[1]''یعنی آپ فرمادیجئے کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟

اہل علم کی بلندی درجات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''يَـرْفَـعِ الـلّٰـهُ الَّـذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَات[2]''یعنی اللہ تعالیٰ تم میں سے ایمان والوں کے اور ان کے درجات بلند کرے گا جن کو علم دیا گیا۔

(۳) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مَـنْهُـوَمَـانَ لايَشْبَعَـانِ صَـاحِـبُ الْعِلْمِ وَصَـاحِـبُ الـدُّنْيَـا، وَلايَسْتَوِيان، أماصاحبُ الْعِلْمِ: فَيَزْدَادُ رِضاً للرّحمانِ واما صاحبُ الدّنيا فَيَتَـمَـادىٰ فـي الطُّغْيان[3]''یعنی دو حریص ایسے ہیں جو کبھی سیراب نہیں ہوتے ایک علم کا حریص اور ایک مال کا حریص، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ حریصِ علم کے لئے اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور مال کا حریص سرکشی میں بڑھتا رہتا ہے۔

مال کے مقابلہ علم کی فضیلت کی وجوہِ سبعہ:

(۴) حضرت علیؓ نے علم کا مال سے تقابل فرمایا اور سات وجہوں سے علم کی افضلیت کو ثابت فرمایا: وہ سات وجوہ یہ ہیں:

(۱)''العلمُ ميراثُ الأنبياءِ والمالُ ميراثُ الفَراعِنة''علم انبیاء علیہم السلام کی میراث ہے، اور مال فرعونوں کی میراث ہے۔

(۲)''العـلـمُ لايـنـقُـص بـالنفقة والمالُ ينقُص''علم خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا اور مال کم ہوتا رہتا ہے۔

(۳)''يَـحـتـاجِ المالُ إلى الحافظ والعلمُ يُحفَظ صاحبَه''مال حفاظت کرنے والے کا محتاج ہے جبکہ علم خود علم والے کی حفاظت کرتا ہے۔

(۱) الزمر: ۹۔

(۲) المجادلة: ۱۱.

(۳) رواه الدارمي في سننه ۱/۱۰۸ رقم: ۳۳۲. ط: مكتبه دار الإيمان، سهارنپور.

(۴)''إذامات الرجلُ يَبقىٰ مالُه والعلم يَدْخُل مع صاحبه قبرَه ''جب آدمی مرجاتا ہے تو مال ساتھ چھوڑ دیتا ہے، جبکہ علم اپنے ساتھی کے ساتھ قبر میں داخل ہوکر ساتھ رہتا ہے۔

(۵)''المالُ يَحْصُل للمؤمن والكافر والعلمَ لايَحْصُلُ إلاللمؤمن ''مال مؤمن اورکافر سب کو حاصل ہوجاتا ہے، جبکہ علم (معرفت الٰہی) صرف ایمان والے کو حاصل ہوتا ہے۔

(۶)''جميعُ الناسِ يَحْتَاجُون إلى صاحبِ العلمِ في أمرِ دِيْنِهم ولايَحْتَاجُوْن إلى صاحبِ المال ''دینی معاملات میں سب لوگ اہل علم کے محتاج ہیں جبکہ ایسی عمومی حاجت مال والوں سے لوگوں کی وابستہ نہیں ہے۔

(۷)''العلم يُقَوِّي الرجلَ على المرور على الصراط والمالُ يَمْنَعُه ''علم پل صراط پر گذرنے میں قوت دے گا اور مال وہاں گذرنے سے مانع بن جائے گا۔[1]

حقیقت یہی ہے کہ جب آدمی کو علم کا چسکا لگ جاتا ہے اور قلب علم کی لذت سے آشنا ہوجاتا ہے، تو اس کی نظر میں دنیا ومافیہا کی کوئی وقعت وحیثیت باقی نہیں رہتی۔

حضرت علیؓ کا ہی شعر ہے:

رَضِيناقسمةَ الجبّارِ فينا لنا علمٌ وللأعداء مالٌ

فإنّ المالَ يفنيٰ عن قريبٍ وإنّ العلمَ يبقىٰ لايزالُ[2]

یعنی ہم اپنے رب جبار کی تقسیم پر راضی ہیں ہم کو اس نے علم دیا اور دشمنوں کو مال (جس کے حقوق ادا نہ کئے جائیں) کیونکہ مال عنقریب ختم ہوجائے گا اور علم ہمیشہ باقی رہے گا۔

(۵)امام محمدؒ نے فرمایا''لوكان الناسُ كُلُّهم عبيدي لأعْتَقْتُهُم وتَبَرَّأتُ عن وَلائِهم [3]'' اگر تمام لوگ میرے غلام باندی ہوں تو میں تمام کو آزاد کردوں اوران کی ولاء (میراث) سے بھی بری ہوجاؤں، (مگر مشغلۂ علم نہ چھوڑوں)

(۶)علامہ زرنوجیؒ نے فرمایا ہے:

---

(۱) التفسير الكبير،مفاتيح الغيب للرازي۲/۴۰۳ (البقرة: ۳۱،ط:دارإحياء التراث العربي بيروت)

(۲) تعليم المتعلم ص ۷۰۔

(۳) تعليم المتعلم ص ۳۰.

تعلَّمْ فإنّ العلمَ زَيْنٌ لأهله وفَضْلٌ وعُنْوَانٌ لكلِّ مَحَامِدِ
وكُنْ مُسْتَفِيداً كلَّ يومٍ زيادةً من العلم واسبَحْ في بِحَارِ الفوائد (۱)

یعنی علم حاصل کرو کہ علم اہل علم کے لئے زینت ہے اور فضیلت ہے اور ہر عمدہ خصلت کی دلیل ہے، اور علم سے روزانہ خوب مستفید ہوتے رہو اور فائدوں کے سمندر میں تیرتے رہو۔

اگر عذاب دینا ہوتا تو علم عطاء نہ کیا جاتا:

(۷) امام محمدؒ کا انتقال ہوا کسی نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کس حال میں انتقال ہوا؟ تو فرمایا "کتاب المکاتب" کا ایک مسئلہ سوچ رہا تھا، اسی دوران روح نکل گئی اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا، خواب دیکھنے والے نے پوچھا وہاں کیا گذری؟ فرمایا: کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا گیا اے محمد! اگر تمہیں عذاب دینا ہوتا تو ہم اپنا علم تمہارے سینہ میں نہ رکھتے۔ (۲)

(۸) انسان جو اشرف المخلوقات ہے وہ اسی علم کی وجہ سے ہے ورنہ اکل، شرب، جماع، شجاعت وغیرہ اوصاف تو جانوروں میں بھی ہوتے ہیں، بلکہ انسانوں سے زیادہ ہوتے ہیں اور علم سے مرادعلمِ دین ہے جس کا اطلاق عموماً تین علوم پر ہوتا ہے، تفسیر، حدیث اور فقہ۔

(۳) آداب الطالبین

آداب کی شریعت میں بہت اہمیت ہے، ہر کام کے کچھ آداب ہوتے ہیں آداب کا لحاظ کرکے کام کیا جائے تو وہ ثمر آور ہوتا ہے، علامہ زرنوجیؒ نے فرمایا ہے کہ: طالبِ علم کو چاہئے کہ آداب کا لحاظ رکھے کیونکہ جو شخص آداب میں کوتاہی کرتا ہے وہ سنتوں سے محروم کردیا جاتا ہے، اور جو سنتوں سے محروم ہوجائے اس کو فرائض سے محروم کردیا جاتا ہے، اور جو فرائض میں کوتاہی کرے وہ آخرت سے محروم کردیا جاتا ہے۔ (۳)

علم کے بہت آداب ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) اخلاص النیة:

طالبِ علم اللہ کو راضی کرنے کی نیت کرے، اپنی آخرت کو سنوارنے کی نیت کرے، اپنے سے صفتِ

(۱) تعلیم المتعلم ص ۳۴، ط: مکتبہ عکاظ دیوبند.
(۲) در مختار ۱/۸۔
(۳) تعلیم المتعلم ص: ۱۱۷۔

جہل کوختم کرنے کی نیت کرے، احیائے اسلام ،ابقائے دین اور خود عمل کرنے اوردوسروں تک پہنچانے کی نیت کرے، جاہ وشہرت مقصود نہ ہو، اگرکسی نے جاہ ونا موری کے لئے علم حاصل کیا تو یہ علم نافع نہیں ہوگا، بلکہ وبالِ جان ہوگا،حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:''مَنْ طَلَبَ العلمَ لِيُجَارِيَ بِهِ العلماءَ اولِيُمارِيَ به السفهاءَ أويَصْرِفَ بهِ وُجُوهَ الناسِ إليه أدخلهُ اللّٰهُ النارَ''[۱]یعنی جو اس لئے علم حاصل کرے گا تاکہ علماء سے مقابلہ آرائی کرے یا جاہلوں سے جھگڑے کرے یالوگوں کے چہروں کواپنی طرف پھیرے یعنی لوگوں کواپنی طرف متوجہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کوجہنم میں داخل کرے گا۔

لہٰذا تحصیل علم سے ان میں سے کوئی بھی بات مقصود نہو، نہ علماء سے مقابلہ آرائی، نہ جہلاء سے بحث ومباحثہ، اور نہ شہرت، البتہ بغیر نیت کے اللہ تعالیٰ شہرت دیدے تو الگ بات ہے۔

اسی طرح مال جمع کرنا بھی مقصود نہ ہو، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:''من تعلم علماً مما يُبْتَغٰى بِهِ وَجْهُ اللّٰهِ لايتعلَّمُهُ إلا ليُصيب بـه عرضَ الدنيا لم يجدْ عَرَفَ الجنة يومَ القيامةيعنى ريحَها''[۲]یعنی جوشخص وہ علم جس سے اللہ کی رضا وخوشنودی کوطلب کیا جاتا ہے(یعنی علم دین) دنیا کا ساز و سامان جمع کرنے کےمقصد سے حاصل کرے تو وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو بھی نہ پاسکے گا۔

اس لئے طالب علم پہلے اپنی نیت کو درست کرے، نیت کی درستگی سے ہی عمل عنداللہ مقبول ہوتا ہے، حضرت امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح بخاری کا آغاز حدیث''إنـما الاعـمـال بالنيات ''سے فرما کر اسی بات پر تنبیہ فرمائی ہے کہ ہرعمل میں نیت اورارادہ کو درست کر لینا چاہئے، کیونکہ اگر نیت درست نہ ہوتو عمل گو اچھا ہو،مگر عنداللہ قبولیت سے محروم رہتا ہے، علامہ زرنوجیؒ نے ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ بہت سے اعمال بظاہر شکل وصورت میں دنیوی امور کے مشابہ ہوتے ہیں لیکن حسنِ نیت کی وجہ سے وہ اعمال عبادت بن کر قرب الٰہی کا ذریعہ بنتے ہیں، اور بہت سے اعمال اپنی ظاہری شکل وصورت میں اعمالِ آخرت کے مشابہ ہوتے ہیں لیکن فسادِ نیت کی وجہ سے بےسود اور رائیگاں ہوجاتے ہیں۔(۳)

---

(۱) مشكوة شريف ۱ / ۳٤، نقلاً عن الترمذى ۲ / ۹٤ وابن ماجه ۱ / ۲۲.

(۲) مشكوٰة ۱ / ۳٤ – ۳٥ .نقلاً عن سنن أبى داود ۲ / ٥۱٥ وابن ماجه ۱ / ۲۲ واحمد ۲ / ۳۳۸ (۸٤۳۸)

(۳) تعليم المتعلم ص ۳۰.

علماء سے تبلیغ علم کے بارے میں سوال ہوگا:

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مجھے روایت پہنچی ہے کہ یوم قیامت علماء سے تبلیغ علم کے بارے میں سوال ہوگا جیسا کہ انبیاء علیہ السلام سے تبلیغِ دین کے بارے میں سوال ہوگا(۱) لہٰذا اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے علم حاصل کیا جائے۔

(۲)احترام العلم و العلماء:

علماء سے مراد اساتذہ اور علم سے مراد اسباب علم ہیں، یعنی وہ تمام چیزیں جن سے علم کی وجہ سے تعلق ہوتا ہے، جیسے استاذ، کتاب، قلم، کاپی وغیرہ سب کا ادب واحترام نہایت ضروری ہے، علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ قلم کا برادہ نالی وغیرہ گندی جگہ میں ڈالنا ممنوع ہے(۲) علامہ زرنوجیؒ نے لکھا ہے کہ طالب علم، علم سے منتفع ہو ہی نہیں سکتا جب تک علم، علماء اور اساتذہ کا احترام نہ کرے، جس شخص نے جو حاصل کیا ہے وہ ادب واحترام کی بدولت حاصل کیا ہے، اور جو گرا ہے وہ بے حرمتی سے گرا ہے: "مَاوَصَلَ مَنْ وَصَلَ إلا بالحُرْمَةِ وماسَقَطَ مَنْ سَقَطَ إلا بِتَرْكِ الْحُرْمَة "نیز فرمایا ہے کہ آدمی گناہ کرنے سے کافر نہیں ہوتا مگر دین کے کسی جزء کی بے حرمتی کرنے سے کافر ہوجاتا ہے۔(۳)

از خدا خواہیم توفیقِ ادب بے ادب محروم گشت از فضل رب

(۳)اهتمام الحضور فی الدرس:

سبق میں حاضری کا اہتمام ہونا چاہئے، مواظبت میں اللہ نے برکت رکھی ہے اسی سے علم حاصل ہوتا ہے، اگر مواظبت اور درس کی پابندی ہو تو طالب علم چاہے غبی ہو اللہ اس سے کام لے لیتا ہے۔

امام ابو یوسفؒ کی پابندیِ درس:

امام ابو یوسفؒ امام صاحب کی مجلس میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، ایک روز امام صاحب نے

(۱)مقدمۂ أوجز ۱/۵۵، الفائدة الثانية في شرافة ذاک العلم وأهله والثناء عليهما، ت: الدکتور تقی الدين الندوي.

(۲)شامی ۱/۳۲۲مطبوعہ مکتبہ زکریا، دیوبند

(۳) تعلیم المتعلم ص ۳۵.

ان سے فرمایا: ''کُنتَ بليداً فَأَخرَجَتک المواظبة'' کہ تم کند ذہن تھے لیکن مواظبت اور پابندی نے تم کو بلند مرتبہ پر پہنچادیا۔(۱)

صاحب آداب المتعلمین نے ''مناقب موفق'' کے حوالہ سے امام ابویوسفؒ کا یہ بیان نقل کیا ہے:

مات ابنٌ لي فلم أَحضُرْ جِهَازَه ولا دفنَه وتركتُه على جيراني وأقربائي مَخافةَ أن يفوتَني من أبي حنيفةَ شيئٌ ولا تَذْهَب حسرتُه عني یعنی میرے بچہ کا انتقال ہوگیا لیکن میں نہ اس کی تجہیز وتکفین میں شریک ہوسکا اور نہ تدفین میں، اور میں نے اس اندیشہ سے یہ کام اپنے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے سپرد کردیا کہ امام ابوحنیفہؒ کے درس کا کوئی حصہ چھوٹ نہ جائے جس کی حسرت ختم نہ ہو(۲)

اس لئے طالب علم خوب اہتمام سے سبق میں حاضر ہو، ناغہ نہ کرے کہ اس سے بے برکتی ہوتی ہے، دل اکھڑ جاتا ہے، شوق میں کمی آتی ہے، حضرات اکابرؒ نے فرمایا ہے کہ ایک روز سبق ناغہ کرنے سے چالیس روز کی برکت اٹھ جاتی ہے، اور ہمارے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ فرماتے تھے کہ میں نے اس کو محسوس بھی کیا ہے۔

(٤) المشقة في تحصيل العلم:

علم کی دولت حاصل کرنے کے لئے ہرطرح کی تکالیف اور مشقتوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے رہنا چاہئے، دنیا کی ادنی شئ بھی محنت ومشقت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، تو پھر علم جیسی عظیم الشان چیز بلامحنت ومشقت کیسے حاصل ہوسکے گی؟ علم کی راہیں جبھی کھلتی ہیں جب آدمی اس کے لئے مشقت اٹھائے، حضرت یحیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خطاب کیا: ''يايحيٰ خُذِ الكتابَ بِقُوَّةٍ (۳)'' کہ اے یحیٰ! کتاب قوت کے ساتھ پکڑو، جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تحصیل علم کے لئے طاقت وہمت درکار ہے۔

ایک بزرگ یحیٰ بن کثیر کا قول ہے ''لايُستطاع العلمُ براحةِ الجِسْم (۴)'' کہ تن پروری کے ساتھ

(١) تعليم المتعلم للزرنوجی ص ٦٨.

(٢) آداب المتعلمين ص٦٤.

(۳) مریم: ۱۹.

(٤) رواه مسلم (۱/۲۲۳)

علم حاصل نہیں ہوتا، نیز امام شافعیؒ نے فرمایا ہے: ’’لایُفلِحُ من طَلَبَ هذا العلمَ بالتملّل وغِنَى النّفسِ ولكن من طَلَبَهُ بذِلَّةِ النفسِ وضِيقِ العَيْشِ وخدمةِ العلمِ أَفْلَحَ‘‘ یعنی جو شخص کسل اور لاپرواہی کے ساتھ علم حاصل کرنا چاہے وہ کامیاب نہیں ہوگا، ہاں جو اپنے نفس کو ذلت میں ڈال کر معاشی تنگی برداشت کرکے اور علم (یعنی علماء) کی خدمت کرتے ہوئے علم طلب کرے وہ بے شک علم حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔(۱)

عزمِ مصمم، عملِ پیہم اور بلند ہمتی ایسے امور ہیں جن سے مشکل چیز بھی آسان ہوجاتی ہے اور دور کی چیز بھی نتیجۃً قریب ہوجاتی ہے، اس لئے طالب علم کو اپنا عزم پختہ اور ہمت بلند رکھنا چاہئے اور محنت وکوشش میں کمی نہیں کرنا چاہئے، علامہ زرنوجیؒ فرماتے ہیں:

الجد يُدْنِي كل أمر شاسعٍ والجد يفتح كل باب مغلقٍ(۲)

یعنی محنت وکوشش ہر دور کی چیز کو نزدیک کردیتی ہے، محنت وکوشش ہر بند دروازہ کو کھول دیتی ہے۔

مغل بادشاہ بابر کا ایک واقعہ:

بابر بادشاہ نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو ناکام ہوا، پھر حملہ کیا پھر ناکام ہوا، جس کی وجہ سے مایوسی میں ڈوب گیا، اسی دوران اس نے دیکھا کہ ایک چیونٹی کھانے کا ذرہ لے کر اپنے سوراخ میں پہنچنے کے لئے دیوار پر چڑھتی ہے اور نیچے گرجاتی ہے، پھر چڑھتی ہے پھر گرجاتی ہے، یہ اس کو دیکھتا رہا اور اس کے چڑھنے اور گرنے کو بھی گنتا رہا، یہاں تک کہ وہ ننانویں مرتبہ چڑھی اور گری، بالآخر وہ اپنے سوراخ میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئی، اس سے اس کو عبرت حاصل ہوئی، چنانچہ اس نے پھر حملہ کیا اور کامیاب ہوگیا۔(۳)

علامہ زرنوجیؒ فرماتے ہیں:

بِقَدْرِ الْكَدِّ تُكْتَسَبُ الْمَعَالِيْ وَمَنْ طَلَبَ الْعُلٰى سَهِرَ اللَّيَالِيْ
تَرُوْمُ الْعِزَّ ثُمَّ تَنَامُ لَيْلاً يَغُوْصُ الْبَحْرَ مَنْ طَلَبَ اللآلِيْ(٤)

(۱) مقدمه أوجز ۱/۲۳٤.

(۲) تعليم المتعلم ص ۷۰.

(۳) ملفوظات فقيه الأمت ج۳ ص۱٤۳، بعنوان: (بابر کی چیونٹی سے عبرت)

(٤) تعليم المتعلم ص ۷۱.

یعنی محنت وکوشش کے بقدر بلند مرتبے حاصل ہوتے ہیں، جوشخص بلند مرتبہ حاصل کرنا چاہے وہ راتوں کو (مطالعہ میں) بیدار رہتاہے، تو عزت کا خواہشمند ہے اور پھر رات کو سونے میں گذارتاہے، (حالانکہ) جوشخص سمندر سے بیش قیمت موتی حاصل کرنا چاہے اس کوسمندر میں غوطے لگانے پڑتے ہیں۔

(۵)الاحتراز عن المعاصی:

گناہوں سے احتراز اورتقوی کا اہتمام، یہ بہت بڑا ادب ہے، حقیقی علم کی دولت حاصل کرنے کے لئے تقوی بنیادی شرط ہے، اس کے بغیر علم کے الفاظ اورمعلومات میں تو اضافہ ہوسکتا ہے مگرعلم کی حقیقت حاصل نہیں ہوسکتی، کیونکہ علم اللہ تبارک وتعالیٰ شانہ کا نور ہے اس کے لئے پاک محل چاہئے، اگرقلب معاصی کی گندگی میں ملوث ہوگا توعلم کا نورقلب میں نہیں اترے گا۔

سوءِ حفظ سے بچنے کے لئے امام شافعیؒ کومعاصی سے اجتناب کی تلقین:

حضرت امام شافعیؒ کا واقعہ مشہور ہے، انہوں نے اپنے استاذ امام وکیع سے سوءِ حفظ کی شکایت کی تو انہوں نے معاصی سے بچنے کی تاکید فرمائی:

شَكَوْتُ إِلٰى وكيعٍ سوءَ حِفْظِي　　فَأَوْصَانِيْ إلى تَرْكِ المَعَاصِي
فإنّ العلمَ فضلٌ من إلهي　　وفضلُ اللهِ لايُعْطىٰ لعاصٍ[1]

یعنی میں نے امام وکیعؒ سے حافظہ کے کمزور ہونے کی شکایت کی تو انہوں نے ترک معاصی کا حکم دیا، کیونکہ علم اللہ کا نور ہے اور اللہ کا نور گنہ گار کونہیں دیا جاتا۔

علماء نے فرمایاہے کہ: جوشخص زمانۂ طالب علمی میں بھی گناہوں میں مبتلا رہتاہے تو تین مصیبتوں میں سے کوئی ایک مصیبت ضرور آتی ہے (۱) یا جوانی میں اس کا انتقال ہوجاتا ہے، (۲) یا وہ ناقدرے لوگوں میں چلا جاتا ہے، (۳) یا بادشاہوں اورامراء کی چاپلوسی کرتاہے، غرض یہ کہ اس کے علم سے خلقِ خدا کو فائدہ نہیں ہوتا۔[2]

---

(۱)تعلیم المتعلم ص ۱۲۸ .دیوان الامام الشافعی ص۱۳ .

(۲)تعلیم المتعلم ص ۱۲۱ .

(٦)الثبات و الصبر:

صبر کے معنی ہیں: ''حبس النفس علی مایکرہ''، یعنی نفس کو ناگوار امور پر جمانا، اس کی تین قسمیں ہیں: (۱) صبر عن المعاصی، یعنی گناہوں سے رکنا (۲) صبر علی الطاعات، یعنی طاعات پر جمنا، (۳) صبر علی البلایا والمصائب، یعنی آفات ومصیبتوں سے دلبرداشتہ نہ ہونا، طالب علم کو تینوں قسم کا صبر اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے، صبر اور ثابت قدمی کے بعد ہی علم حاصل ہوتا ہے۔

تحصیل علم کے مراحل ومراتب:

سفیان ثوریؒ نے حصول علم کی ترتیب یہ بیان فرمائی ہے: ''**أول العلم النية ثم الاستماع، ثم الإنصات، ثم الفهم، ثم الحفظ، ثم العمل، ثم النشر**''[1] بعض نے اس مقولہ کی نسبت عبداللہ بن مبارکؒ کی طرف کی ہے اور بعض نے اور اشخاص کی طرف۔ اس مقولہ میں علم نافع کے حصول کے مراتب ومراحل کا بیان ہے کہ تحصیل علم کا پہلا مرحلہ نیت کی درستگی ہے اور پھر استاذ کی بات کو توجہ سے سننا ہے، پھر اس کے مطلب کو سمجھنے کے لئے اس میں غور وفکر کرنا ہے پھر اس کو یاد کرنا اور ذہن نشین کرنا ہے، پھر اس علم کے تقاضہ پر عمل کرنا ہے، پھر اس علم کو پھیلانا اور اس کی تبلیغ کرنا ہے، ان مراحل کی تکمیل کے بعد علم کی حقیقت حاصل ہوتی ہے۔

ہمارے حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ اس مقولہ کو کثرت سے بیان فرماتے تھے، اور مذکورہ مراحل کی توضیح وتشریح واقعات کی روشنی میں دلچسپ انداز میں بیان فرماتے تھے، طوالت کے خوف سے تفصیل کو یہاں ترک کیا جارہا ہے، حضرتؒ کے مواعظ میں اس کو دیکھا جاسکتا ہے۔[2]

مقدمة العلم

مقدمۃ العلم میں حضراتِ اکابر عموماً تین چیزیں بیان کیا کرتے تھے جنکو امور ثلاثہ کہا جاتا ہے تعریف، موضوع اور غرض وغایت، ان تین چیزوں کو فی الجملہ مناسبت پیدا ہونے کے لئے بیان کیا جاتا تھا تاکہ علم علی وجہ البصیرۃ حاصل ہو، اس کے بعد انحطاط شروع ہوا، طبیعتوں میں کاہلی اور غفلت آنے لگی تو حضراتِ اکابر نے فرمایا کہ اب مناسبت پیدا ہونے کے لئے محض تین چیزیں کافی نہیں، چنانچہ پھر حضراتِ اکابر

(۱) جامع بيان العلم وفضله ١/ ٤٧٦ – ٤٧٨ ''باب منازل العلماء'' مطبوعہ دار ابن جوزیہ۔

(۲) مواعظ فقيه الأمت: ١/ ٢٩٢ (مراتب علم)

آٹھ چیزیں بیان کرنے لگے، جن کو مناطقہ کی اصطلاح میں ''رؤس ثمانیہ'' کہاجاتا ہے، اس کے بعد اساتذہ نے دوکا اضافہ اورکیا اورکل دس چیزیں بیان کرنے لگے جن کو''مبادیاتِ عشرہ'' کہاجاتا ہے، یعنی دس ابتدائی باتیں، کسی نے ان کوشعر میں یوں بیان کیا ہے:

إن مبادِيَ كلِّ فنٍّ عشرةٌ　　الحدُّ والموضوعُ ثم الثمرةُ
وفضلُه ونسبةٌ والواضعُ　　الاسمُ والاستمدادُ وحكمُ الشارع
ومسائلُ والبعضُ بالبعض اكتفىٰ　　ومن دَرَى الجميعَ حاز الشرفا (۱)

لیکن دس ہی ضروری نہیں، اس سے زیادہ اوراس سے کم کوبھی بیان کیا جاسکتا ہے، اصل یہ ہے کہ فن سے طلبہ میں مناسبت پیدا ہوجائے، یہاں مشکوۃ کے شروع میں مبادیات عشرہ کو بیان کیا جائے گا، اورکتاب کی اہمیت کے پیش نظر مزید سات باتیں بیان کی جائیں گی، اس طرح مقدمۃ العلم کے تحت کل سترہ باتوں کا بیان ہوگا اورمقدمۃ الکتاب کا بیان اس کے بعدہو گا، وہ مزید سات باتیں یہ ہیں: (۱) قسمۃ وتبویب (۲) مرتبۂ علم حدیث (۳) حجیۃ الحدیث ومکانتہ فی التشریع الاسلامی (۴) تعلق علم الفقہ بعلم الحدیث (۵) مقام الامام أبي حنیفۃؒ فی الحدیث، (٦) علم الحدیث فی الہند (۷) بیان الإسناد۔

(۱) حدیث اورعلم حدیث

یہاں دوچیزیں ہیں: حدیث اورعلم حدیث، دونوں الگ الگ ہیں، علم حدیث ایک کلی ہے جس کے تحت بہت ساری انواع ہیں اور ہرنوع مستقل علم ہے، مثلاً علم اسماء الرجال، علم الجرح والتعدیل، علم مختلف الحدیث ومشکلہ، علم ناسخ الحدیث ومنسوخہ، علم غریب الحدیث، علم أسباب ورود الحدیث، علم روایۃ الحدیث، علم درایۃ الحدیث وغیرہ، یہ سب علم حدیث کی انواع ہیں، جن کے لئے ''علوم الحدیث'' جمع کا لفظ بولا جاتا ہے۔

یہاں تمام انواع کو بیان نہیں کیا جائے گا، ہمارے سامنے جو کتاب ہے یعنی مشکوۃ شریف، یہ علمِ روایت حدیث سے تعلق رکھتی ہے، یہاں اسی کی تعریف بیان کرنا مقصود ہے، ضمناً حدیث اورعلمِ درایت حدیث کی تعریف بھی کی جائے گی، مناسب ہے کہ پہلے حدیث کی تعریف جانی جائے، اس کے بعدعلم روایۃ الحدیث اوردرایۃ الحدیث کی۔

(۱) جمعها محمدبن علي الصبان كما في الكوكب الوهاج شرح صحيح مسلم ۱/۳۹، لمحمد الهرري، ط: دار المنهاج. حاشية الصبّان على شرح شيخه الملّوي على السلّم ص ۳۳ (مخطوط)

حدیث کی لغوی واصطلاحی تعریف:

حدیث کے لغوی معنی ہیں: کلام اور گفتگو خواہ قلیل ہو یا کثیر، اور خواہ کسی بھی قسم کا کلام ہو اور قائل کوئی بھی ہو، اور جمع اس کی ''احادیث'' ہے۔[1]

اور حدیث کے اصطلاحی معنی یہ ہیں: **هو أقوال النبی صلی الله علیه وسلم وأفعاله وأحواله وتقریراته.** یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ اقوال، افعال، احوال اور تقریرات حدیث ہیں۔

اس تعریف میں چند باتیں وضاحت طلب ہیں:

(۱) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال واحوال دو قسم کے ہیں: اختیاریہ اور غیر اختیاریہ، اختیاریہ: جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اختیار سے کیا، غیر اختیاریہ: جس میں آپ کے اختیار کو دخل نہ ہو، جیسے آپ علیہ الصلوۃ والسلام کے اخلاق، آپ کا حلیہ مبارک، قد، چہرہ وغیرہ جن کو ''شمائل'' اور ''احادیثِ صفت'' بھی کہا جاتا ہے۔

(۲) تقریر کے معنی آتے ہیں: ثابت کرنا، مضبوط کرنا، تائید کرنا، اور کسی کام کو ہوتا دیکھ کر اس پر نکیر نہ کرنا، اور تقریرِ نبی علیہ السلام کا مفہوم یہ ہے کہ کسی امتی نے آپ علیہ الصلوۃ والسلام کے سامنے کوئی کام کیا اور آپ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی، نہ اس وقت اور نہ بعد میں، اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ''تقریر'' کہا جاتا ہے اور جو چیز اس طرح ثابت ہو اس کے بارے میں بھی یہ کہا جائے گا کہ وہ حدیث سے ثابت ہے، اور آپ علیہ السلام کے قول وفعل کی طرح وہ بھی حجت شمار ہوگی، کیونکہ نبی کی شان سے یہ بعید ہے کہ اس کے سامنے کوئی ناجائز کام کیا جائے یا اس کے علم میں کسی کا ناجائز عمل آئے اور وہ اس پر نکیر نہ فرمائے، لہٰذا پیغمبر کا اس پر سکوت اختیار کرنا اس کے جائز ہونے کی دلیل ہے۔[2]

---

(۱) الصحاح للعلامة الجوهری فی مادة ح دث.

(۲) جیسے: عن عمرو بن العاصؓ قال: احتلمت في ليلة باردة في غزوة ذات السلاسل فأشفقت إن اغتسلت أن أهلک، فتيممت ثم صليت بأصحابي الصبح فذكروا ذلک لرسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: ياعمرو! صليت بأصحابک وأنت جنب؟ فأخبرته وبالذي منعني من الاغتسال، فضحک رسول الله صلى الله عليه وسلم ولم يقل شيئا. (ابوداود ۱/۴۸)

(۳) حضرات فقہاء غیر اختیاری افعال واحوال کو حدیث شمار نہیں کرتے، جبکہ محدثین دونوں کو حدیث کہتے ہیں، کیونکہ فقہاء کا مقصد احادیث سے مسائل کو مستنبط کرنا ہے اور وہ اختیاری افعال واحوال سے ہی ہوسکتے ہیں، غیر اختیاری افعال واحوال سے کوئی مسئلہ مستنبط نہیں ہوتا، اس لئے فقہاء ان کو حدیث نہیں کہتے اور نہ ان کو فقہی احکام کا ماخذ مانتے ہیں اور محدثین کا مقصد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب شدہ تمام چیزوں کو جمع کرنا ہے، **حتی الحركات والسكنات في اليقظة والمنام قبل البعثة وبعدها**، اور غیر اختیاری افعال واحوال اسی طرح بعثت سے قبل کے افعال واحوال بھی آپ علیہ الصلاۃ و السلام کی طرف منسوب ہیں اس لئے حضرات محدثین ان کو بھی حدیث کی تعریف میں داخل مانتے ہیں۔

تعریف علم روایۃ الحدیث:

علامہ عینیؒ وکرمانیؒ نے اس کی تعریف یہ کی ہے: **هو علمٌ يُعرفُ به أقوالُ رسول الله صلى الله عليه وسلم وأفعالُه وأحوالُه** یعنی وہ علم جس کے ذریعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اوراحوال کا علم ہو۔

اس تعریف پر علامہ سیوطی نے یہ تبصرہ کیا ہے ''**هذا الحدُّ مع شموله لعلمِ الاستنباطِ غيرُ محرَّرٍ** ''(۱) یعنی یہ تعریف واضح، منقح اور مانع عن دخول الغیر نہیں ہے، کیونکہ یہ تعریف ''علمِ استنباط'' پر بھی صادق آتی ہے، اسی طرح یہ تعریف سیرت کی ہر کتاب پر بھی صادق آتی ہے، خواہ وہ کتاب اردو میں ہو یا عربی میں، سند سے ہو یا بلاسند کے، کیونکہ ان کے ذریعہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اوراحوال معلوم ہوجاتے ہیں، اسی لئے خود علامہ سیوطیؒ نے اس کی ایک دوسری تعریف فرمائی ہے جو جامع مانع ہے وہ یہ ہے:

''**علمٌ يَشتملُ على نقلِ أقوالِ النبيِ صلى الله عليه وسلم وأفعالِه وروايتِها وضَبْطِها وتحريرِ ألفاظِها**''(۲) یعنی علم روایت حدیث وہ فن ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کی نقل وروایت اوران کا ضبط ہو اوران کے الفاظ کی تحقیق ہو۔

اس تعریف میں ''احوال'' کا لفظ موجود نہیں، جو غالباً اختصاراً حذف کیا گیا ہے، ایسے ہی ''تقریرات'' کا

(۱) التدریب ۲/ ۲۹.

(۲) تدریب الروای ۲/ ۱۲–۱۳.

لفظ بھی مذکور نہیں، لیکن ''تقریرات''''افعال'' میں آسکتی ہیں، اس لئے کہ ''تقریر'' کہتے ہیں سکوت اور ترک نکیر کو اور یہ بھی **فعلٌ من الافعال** ہے۔[1] لہٰذا اس لحاظ سے ''تقریرات'' افعال میں داخل ہوں گی۔

بعض نے علم روایت حدیث کی تعریف یہ کی ہے: ''**الحدیث - فی اصطلاحِ جمهورِ المحدثین - يُطْلَقُ على قول النبی صلى الله عليه وسلم وفعله وتقريره وكذلک يطلق على قول الصحابی وفعله وتقريره وعلى قول التابعی وفعله وتقريره.**'' [2]

اس تعریف سے ظاہر ہے کہ صحابہؓ وتابعین کے اقوال وافعال بھی حدیث میں داخل ہیں، چنانچہ جمہور کے یہاں حدیث کا یہی عام مفہوم ہے اور بعض نے حدیث کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے اقوال وافعال کے ساتھ خاص کیا ہے اور تابعین کے اقوال وافعال پر ''اثر'' کے لفظ کا اطلاق کیا ہے۔

تعریفِ علم درایۃ الحدیث:

علم درایۃ الحدیث کو ''علم اصول حدیث'' اور ''مصطلح الحدیث'' کہتے ہیں، حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تعریف یہ فرمائی ہے جو نہایت مختصر وجامع ہے: ''**معرفة القواعد المُعَرِّفة بحال الراوي والمروي**'' [3] یعنی فن درایت حدیث ان قواعد واصول کا جاننا ہے جن کے ذریعہ رواۃ اور روایات کے احوال پہنچانے اور پرکھے جاسکیں۔

اسی تعریف کو علامہ سیوطی نے اپنے ''الفیہ'' میں اس طرح بیان کیا ہے:

علْمُ الحديثِ ذو قوانينَ تُحَد   يُدرىٰ بها أحوالُ متنٍ وسند

فذانک الموضوعُ والمقصودُ   ان يُعْرَف المقبولُ والمردودُ [4]

ان دو اشعار میں علم اصول حدیث کی تعریف، موضوع، غرض وغایت تینوں چیزیں آگئیں، یعنی علم اصول حدیث اُن چند قوانین کا نام ہے جن سے حدیث کی سند اور متن کے احوال معلوم ہوں، اور یہی دو چیزیں

(۱) الدر المنضود ۱/۹.

(۲) انظر: مقدمة الشيخ عبدالحق المحدث الدهلوی ص۳.

(۳) النكت على ابن الصلاح ۱:۲۲۵.

(٤) الفيّة السيوطی ص ۳.

یعنی متن اور سند اِس علم کا موضوع ہیں اورغرض اِس فن کی یہ ہے کہ مقبول اور مردود روایات کی معرفت حاصل ہوجائے کہ کونسی حدیث مقبول اور قابلِ استدلال ہے اور کونسی مردود وغیر معتبر ہے۔

اورعلامہ سیوطیؒ نے اس کی ایک مفصل تعریف یہ بھی فرمائی ہے:

ھو علم یعرف منه حقیقةُ الروایة وشروطُھا وأنواعُھا وأحكامُھا وحالُ الرواة وشروطُھم وأصنافُ المرویات ومایتعلق بھا. (۱)یعنی علم درایۃ الحدیث وہ علم ہے جس کے ذریعہ روایت حدیث کی حقیقت، اس کی شرطیں، اس کی اقسام واحکام اور رواۃ کے احوال اوران کی (روایات کے معتبر ہونے کی) شرطیں اورروایات کی اقسام اوران سے متعلقہ دیگر امور کی معرفت حاصل ہو۔

اکثر محدثین کے یہاں علم درایۃ الحدیث کا یہی مفہوم ہے جس کی رو سے علم داریۃ الحدیث کا اطلاق اس علم پر ہوتا ہے جس میں حدیث کے درجہ اوراس کے رواۃ کے احوال سے بحث ہو اور علامہ طاش کبری زادہ (۹۶۸ھ) نے اس کی تعریف یہ کی ہے: **علم درایة الحدیث علم یبحث فیه عن المعنی المفھوم من الفاظ الحدیث وعن المراد منھا مبینا علی قواعد العربیة وضوابط الشریعة ومطابقا لاحوال النبی علیه الصلاة والسلام** یعنی علم درایت حدیث وہ علم ہے جس میں الفاظ حدیث کے معنی ومفہوم اورعربی قواعد، شرعی ضوابط اور نبی علیہ السلام کے احوال کے مطابق اس کی مراد واضح کی جائے۔

اس تعریف کی رو سے علم درایۃ الحدیث کا اطلاق حدیث کے معنی ومراد سے واقف کرانے والے علم پر ہوگا مگر حدیث کا معنی ومفہوم روایتِ حدیث کے ضمن میں بھی معلوم ہوجاتا ہے اس لئے عام محدثین نے مستقل فن کی حیثیت سے اس کو ذکر نہیں کیا۔

(۲)الموضوع

علامہ کرمانیؒ جو بڑے محدث ہیں اورحافظ ابن حجرؒ اورعلامہ عینیؒ وغیرہ سب سے مقدم ہیں انہوں نے شرح بخاری میں علم حدیث کا موضوع یہ بتایا ہے:"ذات رسول الله صلی الله علیه وسلم"(۲) اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے ہی اس فن میں بحث کی جاتی ہے۔

(۱)التدریب ۲/ ۱٤ ت: الشیخ عوامه حفظه ط دار الیسر.

(۲) "شرح البخاري"للعلامة الکرماني ۱/ ۱۲.

علم حدیث کے موضوع پر علامہ کافیجیؒ کا اشکال اور اس کا جواب:

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے استاذ علامہ کافی جیؒ ہمیشہ اس بات پر تعجب کرتے تھے کہ کرمانی نے موضوعِ علمِ حدیث آپ کی ذات کو کیسے قرار دیا؟ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو انسان ہیں اور انسان لحم وشحم سے مرکب ہوتا ہے اور لحم وشحم سے مرکب ہونے کی حیثیت سے بدنِ انسانی علمِ طب کا موضوع ہے؟ علامہ سیوطیؒ نے اپنے استاذ کا یہ اعتراض نقل کیا ہے اور اس پر سکوت اختیار فرمایا ہے، شراح حدیث نے علامہ سیوطیؒ کے اپنے استاذ کے اس اشکال کو نقل کرنے کے بعد خود ان کے خاموش رہنے پر تعجب کیا ہے، کیونکہ اس کا جواب واضح ہے، وہ یہ کہ آپ کی ذات کی دو حیثیتیں ہیں: ''من حیث إنه إنسان ومن حیث إنه رسول''، علامہ کرمانیؒ نے جو ذات رسول کو موضوع قرار دیا وہ رسول ہونے کی حیثیت سے قرار دیا ہے نہ کہ لحم وشحم سے مرکب انسان ہونے کی حیثیت سے اور ظاہر ہے کہ اس میں کوئی اشکال یا تعجب کی بات نہیں ہے۔(۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک مطلق علم حدیث کا موضوع ہے، اور علم روایت حدیث چونکہ علم حدیث کی ایک خاص نوع ہے اس لئے حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ اس کا موضوع بھی خاص بیان فرمایا کرتے تھے وہ یہ ہے: ''**الروایات والمرویات من حیث الاتصال والانقطاع**'' یعنی آپ علیہ السلام کی احادیث مبارکہ اپنے شیخ سے سماع یا عدم سماع کے لحاظ سے، کیونکہ ''علم روایت حدیث'' کا مقصود یہی ہے کہ امت میں احادیث مبارکہ **سماعاً من الشیخ** پہنچیں۔(۲)

(۳) الثمرة

غرض وغایت کا مفہوم اور فرق:

یہاں پر دو لفظ ہیں: غرض اور غایت، غرض کہتے ہیں: **مالأجله الفعل** کو یعنی جس شئ کو حاصل کرنے کے لئے کوئی کام کیا جائے، پھر اس کام پر جو شئ مرتب ہوتی ہے اس کو ''غایت'' کہا جاتا ہے، پھر وہ مرتب ہونے والی شئ اگر آدمی کی منشاء کے مطابق ہے تو وہ ''غرض'' بھی ہے اور ''غایت'' بھی اور اگر وہ منشاء کے خلاف ہے

(۱) مقدمۂ اوجز ۱/۵۵ (الفائدة الثانية في موضوعه).

(۲) المصدر السابق.

تو اس کو غایت یعنی نتیجہ تو کہا جائے گا، لیکن غرض نہیں کہیں گے، لہٰذا غرض خاص او رغایت عام ہوئی، جیسے تاجر حصول نفع کے لئے تجارت کرتا ہے پھر اس تجارت پر کبھی نفع مرتب ہوتا ہے اور کبھی نقصان، تو اس نقصان کو غایت تو کہیں گے لیکن غرض نہیں کہہ سکتے۔

تحصیل علم حدیث کے اغراض وفوائد:

علم روایت حدیث کی متعدد اغراض بیان کی گئی ہیں، مگر ان میں تضاد نہیں ہے وہ سب بیک وقت مقصود اور حاصل ہوسکتی ہیں:

(۱) ان بشارتوں، فضیلتوں اور دعاؤں کو حاصل کرنا جو حدیث کے پڑھنے اور پڑھانے والوں کے لئے وارد ہوئی ہیں، مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''نَضَّر اللہُ امرأً سَمِعَ مَقَالتی فَوَعَاها وأَدَّاهَا فَرُبَّ حاملُ فقهٍ غيرُ فقيهٍ وربَّ حامل فقهٍ إلى من هو أفقه منه''[۱] اس میں نضر اللہ خبر بھی ہوسکتی ہے اور دعا بھی، خبر ہونے کی صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ جو حدیث پڑھاتا ہے اللہ اس کو تروتازہ اور خوش حال رکھتا ہے اور دعا ہونے کی صورت میں یہ مفہوم ہوگا کہ: اللہ تعالیٰ حدیث پڑھانے والوں کو سرسبز و شاداب رکھے، چنانچہ علماء نے فرمایا ہے کہ: ''مامن رجلٍ يَطْلَبُ الحديثَ إلا كان في وَجْهه نَضْرَةٌ''، یعنی جو شخص حقیقی معنی میں طالب حدیث ہوتا ہے اس کے چہرہ پر ایک رونق ہوتی ہے، جو اس نبوی دعا کا اثر ہوتی ہے۔

نیز مذکورہ حدیث کے اگلے جملہ میں دوسروں تک روایت پہنچانے کا فائدہ بھی بیان فرمایا گیا ہے، وہ یہ کہ بسااوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ لوگ جن کو روایت پہنچائی جارہی ہے وہ روایت پہنچانے والے سے زیادہ فہیم اور سمجھدار ہوتے ہیں، یعنی بعض شاگرد فہم وحفظ وغیرہ اوصاف میں استاذ سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں جس کی بناء پر وہ حدیث سے ایسے مسائل ونکات مستنبط کر لیتے ہیں کہ جن تک پہنچانے والے کے ذہن کی رسائی نہیں ہوتی، جبکہ حدیث کی نقل وروایت سے یہی مقصود ہے۔

ایک حدیث میں ہے ''إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَكْثَرُهُمْ عَلَيَّ صَلاةً''[۲]، یعنی قیامت کے دن میرے سب سے قریب وہ ہوں گے جو مجھ پر سب سے زیادہ درود پڑھتے ہوں، ابن حبان نے فرمایا ہے

(۱) أخرجه الترمذي ۲/۹۵، باب ماجاء في الحث على تبليغ السماع.

(۲) أخرجه الترمذي في الصلوة، باب ماجاء في فضل الصلوة على النبي صلى الله عليه وسلم ۱/۱۱۰.

کہ اس کا مصداق محدثین ہیں، اس لئے کہ ان کا رات دن کا مشغلہ حدیث ہے[1] ان ہی حضرات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی آنے پر درود پڑھنے اور لکھنے کی سب سے زیادہ سعادت حاصل ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے "اللهم ارْحَمْ خُلَفَائِي" اے اللہ میرے خلفاء کے ساتھ رحم کا معاملہ فرما، صحابہؓ نے پوچھا: "يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ خُلَفَاءُ كَ؟ قَالَ الَّذِيْنَ يَرْوُوْنَ أَحَادِيْثِيْ يُعَلِّمُوْنَهَا النَّاس [2]" یعنی میرے خلفاء وہ ہیں جو میری احادیث کو روایت کرتے ہیں اور لوگوں کو ان کی تعلیم دیتے ہیں۔

یہ دعائیں اور بشارتیں ہیں جو احادیث میں وارد ہوئی ہیں ان کا مصداق بننے کے لئے علم حدیث پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔

(۲) دوسری غرض ہے فہم قرآن اور عمل بالقرآن ،اس لئے کہ احادیث کے بغیر قرآن کو سمجھنا ممکن نہیں اور نہ ہی عمل کرنا ممکن ہے، کیوں کہ قرآن میں احکام شریعت کے اصول بیان کئے گئے ہیں، پھر ان کی تفصیل وتشریح احادیث میں ذکر کی گئی ہے، پس چونکہ احادیث کے بغیر قرآن کا فہم اور اس پر عمل ممکن نہیں اس لئے علم حدیث پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔[3]

(۳) "معرفة كيفية الاقتداء بالنبي صلى الله عليه وسلم" یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور پیروی کا طریقہ جاننے کے لئے علم حدیث پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔[4]

(۴) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ: میرے نزدیک حدیث کی سب سے بہتر غرض ہے محبوب کے کلام سے لطف اندوز ہونا، کیونکہ مقولہ مشہور ہے: "مَنْ أَحَبَّ شيئاً أَكْثَرَ ذِكْرَه" کہ جس سے محبت ہوتی ہے اس کا بکثرت تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(۵) شارح ابوداؤد علامہ محمود بن محمد خطاب السبکیؒ نے غرض بیان کی ہے: "الاحترازُ عن الخطأ فی نَقْلِ ماأضيفَ إلَى النبي صلى الله عليه وسلم" یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی چیز کے غلط انتساب سے محفوظ ہونا، کیونکہ کلام رسول اور غیر کلام رسول میں امتیاز وہی حضرات کرسکتے ہیں جو فن حدیث

(۱) مقدمۂ أوجز ص ۱/۵۶.

(۲) مجمع الزوائد للهيثمي عن ابن عباس ۱/۱۲۶.

(۳) الدر المنضود ۱/۱۲.

(٤) المصدر السابق ۱/۱۲.

سے واقف ہوں۔ [1]

(۲) بعض علماء نے یہ غرض بیان کی ہے: "التحلي بالآداب النبوية والتَّوقيّ عما يَكْرَهُه ويَنْهاه" یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق واوصاف کے ساتھ اپنے آپ کو آراستہ کرنا اور جو چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناپسند تھیں ان سے بچنا اور یہی آپ علیہ السلام کا مقصدِ بعثت بھی ہے۔

(٤) الاسم

حدیث کی وجوہِ تسمیہ:

اسم کا مطلب ہے وجہ تسمیہ: حدیث کی وجہ تسمیہ بھی متعدد ہیں:

(۱) حدیث بمعنی حادث ہے جو قدیم کی ضد ہے، اللہ کا کلام یعنی قرآن قدیم ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اس کے بالمقابل حادث ہے، اس لحاظ سے حدیث کو حدیث کہا جاتا ہے۔

(۲) حدیث کے معنی کلام اور گفتگو کے ہیں، چونکہ احادیث مبارکہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اور گفتگو ہیں اس لئے ان کو "حدیث" کہا جاتا ہے اس پر سوال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث تو فعل کے قبیل سے بھی ہیں تو احادیثِ فعلی کیسے حدیث کا مصداق بنیں گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تغلیباً احادیث فعلی بھی اس کا مصداق ہیں۔

(۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد روایات میں خود اپنے کلام کو حدیث کہنا ثابت ہے، جن میں سے ایک روایت حدیث کی اغراض کے ذیل میں بھی گذر چکی ہے، اس میں یہ مذکور ہے "الذين يروون احاديثي يعلمونها الناس" پس چونکہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کلام کو حدیث کہا ہے اس لئے اس کو حدیث کہا جاتا ہے، یہ وجہ تسمیہ سب سے بہتر ہے۔

(۴) قرآن کریم میں ہے: واما بنعمة ربک فحدث (الضحیٰ:۱۱) یعنی آپ اپنے رب کے انعامات کو بیان کیجئے، اس "نعمة" میں آپ پر نازل ہونے والی وحی اور قلب پر وارد ہونے والے علوم ومعارف اور مسائل واحکام بھی داخل ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے بیان وتبلیغ کا حکم صیغۂ تحدیث کے ذریعہ دیا، اس لئے آپ علیہ السلام کی بیان فرمودہ تعلیمات کو "حدیث" کہا جاتا ہے۔ [2]

---

(۱) المنهل العذب المورود ۱/۳ مطبعة الاستقامة، القاهرة، مصر.

(۲) فتح الملهم ۱/۵.

سنت، خبر اور اثر کا مفہوم ومصداق

حدیث کے علاوہ کچھ اور الفاظ بھی بولے جاتے ہیں مثلاً سنت، خبر اور اثر، یہ الفاظ باہم مترادف ہیں یا مختلف؟ اس کی تفصیل درجِ ذیل ہے:

(۱) سنت:

بعض نے اس کو حدیث کا مترادف قرار دیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ حدیث کا اطلاق صرف قول پر ہوتا ہے اور سنت کا اطلاق آپ علیہ السلام کے اقوال، افعال اور احوال سب پر ہوتا ہے، لہٰذا حدیث خاص ہے اور سنت عام۔

(۲) خبر:

اس کے بارے میں علماء کے تین قول ہیں:

(۱) حدیث وخبر دونوں مترادف ہیں۔

(۲) دونوں میں تباین کی نسبت ہے، یعنی حدیث وہ بات جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اور خبر وہ بات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ سے منقول ہو۔

(۳) بعض نے کہا کہ خبر عام ہے اور حدیث خاص ہے، حدیث اس چیز کو کہا جاتا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اور خبر عام ہے خواہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ سے منقول ہو دونوں کو خبر کہا جائے گا۔

(۳) اثر:

ایک لفظ ہے اثر، اثر کا اطلاق محدثین کے یہاں حدیث مرفوع وموقوف دونوں پر ہوتا ہے، اسی لئے امام طحاوی نے اپنی کتاب کا نام "شرح معانی الآثار" رکھا ہے، جس میں مرفوع وموقوف دونوں قسم کی روایات ہیں، اور بعض نے دونوں کو مباین قرار دیا ہے، بایں معنی کہ وہ موقوف یعنی صحابہ کے اقوال وافعال کو "اثر" قرار دیتے ہیں اور مرفوع یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال وغیرہ کو "حدیث" کہتے ہیں۔

(٥)الاستمداد

یعنی اس فن کا ماخذ کیا ہے؟ تو فنِ حدیث کا ماخذ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اوراحوال ہیں۔

(٦)حکم الشارع

یعنی اس فن کو حاصل کرنے کا شرعی درجہ کیا ہے؟ تو واضح رہے کہ تمام علوم شرعیہ کا حکم ایک ہی ہوتا ہے کہ ہرعلاقہ میں ان کا جاننا فرض کفایہ ہے،علم حدیث کاحکم بھی یہی ہے۔

(٧)الفضیلة

فضیلت دوقسم کی ہوتی ہے: ایک نقلی اور ایک عقلی،علمِ حدیث کی فضیلت نقلی اغراض کے بیان میں پیچھے گذرچکی ہے،عقلی فضیلت کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ حدیث سیدالاولین والآخرین کا کلام ہے، جومخلوق میں سب سے افضل ہیں،تو آپ کا کلام بھی سب سے افضل ہوگا اوراس کی تحصیل بھی سب سے زیادہ باعث فضیلت ہوگی۔

علم حدیث؛افضل العلوم:

تدریب الراوی میں علامہ سیوطیؒ نے تحریرکیاہے کہ حدیث افضل العلوم ہے،(١)لیکن ''الاتقان'' میں انھوں نے علم تفسیر کو افضل کہاہے(٢)صحیح بات یہ ہے کہ علم حدیث افضل ہے، اس لئے کہ کسی بھی فن کی افضلیت موضوع،غرض اوراحتیاج کے اعتبار سے ہوتی ہے،علم حدیث کا موضوع حضورصلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بہ حیثیت وصف رسالت ہے، اوراس کی اغراض بھی اہم ہیں،نیزحدیث کی طرف احتیاج بھی سب سے زیادہ ہے،خودتفسیر کے لئے بھی حدیث کی احتیاج ہے،لہٰذااس لحاظ سےعلم حدیث ہی افضل ہے۔(٣)

(٨)النسبة

فن روایت حدیث کی نسبت یعنی اس کی جنس کونسی ہے؟ ملحوظ رہے کہ علوم کی اجناس مقرر ہیں: اولاً

---

(١)التدریب ٢/١٢٣، نصه: فإن علم الحدیث أفضل القرب.

(٢)الإتقان فی علوم القرآن ص٤/١٩٩،ت محمدأبوالفضل إبراهیم، ط الهیئته المصریة العامة لکتاب.

(٣)تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں مقدمۂ اوجزص١/٥٥—٦٥۔

علم کی دوقسمیں ہیں:عقلیہ اور نقلیہ، پھرنقلیہ کی دوقسمیں ہیں: شرعیہ اورغیرشرعیہ، پھرشرعیہ کی دوقسمیں ہیں: اصلیہ اورفرعیہ، اس کی وضاحت یہ ہے کہ بعض علوم شرعی ہوتے ہیں اور بعض غیرشرعی جیسے علم سحر، اور بعض نقلی ہوتے ہیں اور بعض عقلی جیسے منطق، پھربعض علوم اصلی ہوتے ہیں اور بعض فرعی، جیسے علم فقہ، پس فن حدیث کی نسبت یہ ہے کہ وہ شرعی، نقلی اور اصلی ہے۔(۱)

(۹)الواضع

کتابتِ حدیث اورتدوینِ حدیث؛مفہوم اورفرق:

یہ کچھ طویل بحث ہے، اولاً تدوین حدیث کے معنی سمجھنے چاہئیں، تدوینِ حدیث کا مطلب ہے: احادیث کوکتابی شکل میں جمع کرنا، احادیث حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدوّن نہیں ہوئیں، بلکہ دورصحابہ میں بھی تدوین کا سلسلہ نہیں تھا، البتہ کتابت حدیث کا وجوددورصحابہ میں ملتاہے، چنانچہ بعض صحابہ احادیث کولکھ لیا کرتے تھے،مگر یہ تدوین سے علیحدہ چیز ہے،خلیفۂ راشدحضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں ۹۹ھ میں تدوین احادیث کی ابتداء ہوئی ہے، اب سوال یہ ہے کہ حضرات صحابہ نے اپنے زمانہ میں احادیث کو مدون کیوں نہیں کیا؟ حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنے زمانہ میں قرآن کوتومدون کیا مگراحادیث کو انہوں نے بھی مدون نہیں کیا؟ صحابۂ کرام کی احادیث کو مدون نہ کرنے کی کئی وجوہات ہیں:

دورنبوی میں حدیث مدون نہ کئے جانے کی وجوہات:

(۱)حضرات صحابہؓ نے اپنے زمانہ میں جمع قرآن کا فریضہ انجام دیاتھا تو انہوں نے جمع احادیث کو مناسب نہیں سمجھا، اس لئے کہ اگرجمع حدیث کا کام بھی کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ ناقص العقل لوگ احادیث کے صحیفوں کوکلام اللہ کا درجہ دیدیتے، گویا کہ قرآن وحدیث کے خلط کا احتمال تھا، اس لئے ان حضرات نے جمعِ احادیث کا کام نہیں کیا۔

(۲)حضرات صحابہ کوحضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا سے عشق ومحبت تھی،انہوں نے آپ

(۱)هدى الساري مقدمة فتح الباري، الفصل الأول ص ٦.

صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح سیکھا کہ آپ احادیث بیان فرماتے اور صحابہ انہیں حفظ کرلیا کرتے تھے، عموماً لکھتے نہیں تھے، تو ان حضرات نے اپنے شاگردوں کے لئے یہی طریقہ پسند کیا کہ وہ بھی احادیث کو حفظ یاد کریں، حضرت ابوسعید خدریؓ کے بارے میں مروی ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے شاگردوں کو حکم دیا: ''كَانَ نبيُّناصلى الله عليه وسلم يُحَدِّثُ فنَحفَظُ فاحفظُوا كماكُنّا نَحُفَظ ''(۱)

(۳) ان حضرات کے حافظے بہت قوی تھے، انہوں نے اپنے حافظے سے احادیث کی حفاظت کی، انہوں نے لکھنے کی اور تدوین کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی، پس ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے ان کو مدون نہیں کیا۔

تدوینِ حدیث:

پھر جب صحابہ وتابعین دنیا سے رخصت ہونے لگے تو اس بات کا اندیشہ محسوس ہوا کہ صحابہ وتابعین کے سینوں میں جو احادیث محفوظ ہیں وہ ضائع نہ ہوجائیں، اس ضرورت وخطرہ کو سب سے پہلے عمر بن عبدالعزیزؒ نے محسوس کیا اور انہوں نے اپنے زمانہ کے علماء کو جمعِ احادیث کا حکم دیا، عمر بن عبدالعزیزؒ کی پیدائش علی اختلاف الاقوال ۶۲ھ یا ۶۳ھ میں ہوئی، ۹۹ھ میں آپ خلیفہ بنائے گئے اور دوسال کے بعد ہی یعنی ۱۰۱ھ میں آپ کی وفات ہوگئی، عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زیر اثر بلاد کے حفاظ حدیث کو لکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو جمع کیا جائے، تاریخ اصبہان میں ہے ''كتب عـمـرُ بن عبدالعزيز إلى الآفاقِ أنْظُروا حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فاجْمَعُوْا ''(۲) اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے خاص طور پر ابوبکر محمد بن حزمؒ کے نام خط لکھا جو مدینہ منورہ کے قاضی وامیر تھے، حضرت امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں ''باب كيف يقبض العلم '' کے تحت لکھا ہے ''كتب عـمـرُ بـن عبدالعزيز إلى أبي بكر بن حزمٍ: أنْظُرْ ماكان من حديثِ رسول الله صلى الله عليه وسـلـم فاكْتُبُهُ لي فإني خِفْتُ دُروسَ العلمِ وذهابَ العلماء ''(۳) چنانچہ اس زمانہ کے علماء نے جمع احادیث کا کام انجام دیا۔

---

(۱) تاريخ دمشق ۲۰/ ۳۹۲ مكتبه دارالفكر.

(۲) تاريخ أصبهان ۱/ ۳٦٦ دارالكتب العلمية بيروت.

(۳) بخاري شريف ۱/ ۲۰.

اوراس سلسلہ میں سب سے نمایاں دوشخصوں کا نام سامنے آتا ہے: ایک امام زہری اور دوسرے ابوبکر محمد بن حزم الانصاری (زہری کا نام ہے محمد بن مسلم بن عبیداللہ بن عبداللہ بن شہاب الزہری المتوفی ۱۲۵ھ، ابوبکر کا نام ہے ابوبکر محمد بن عمرو بن حزم الانصاری المتوفی ۱۲۰ھ) یہی دونوں حضرات حدیث کے مدون ہیں، ان دونوں کا زمانہ ایک ہے اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سے سب سے پہلے کس نے یہ فریضہ انجام دیا؟ اور مدون اول کا سہرا کس کے سر ہے؟ امام مالک، سیوطی اور ابن حجر وغیرہ کی رائے امام زہری کے بارے میں ہے، اورامام بخاری کا میلان ابوبکر بن حزم کی طرف ہے،ابن عبدالبر نے ''**جامع بيان العلم وفضله**'' میں امام زہری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے ہم کو احادیث کے جمع کرنے کا حکم دیا ''**فكَتَبْنَاها دفتراً دفتراً**'' تو ہم نے احادیث کے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے۔[1]

تدوینِ حدیث کے ادوار اور مناہج:

حضرت شیخؒ نے لامع الدراری[2] کے مقدمہ میں ابن حجر کے واسطے سے تدوینِ حدیث کے چار دور نقل فرمائے ہیں۔

(۱) تدوینِ حدیث کا پہلا دور ''تدوین علی الاطلاق'' ہے جس میں احادیث کو مضامین کی رعایت کے بغیر بلا کسی ترتیب کے کتابی شکل میں جمع کر دیا گیا اور یہ کام پہلی صدی ہجری کے اخیر میں ہوا۔

(۲) دوسرا دور ''تدوین علی الابواب'' کا ہے یعنی احادیث کے ذخیرہ میں سے ایک ایک قسم کے مضمون کی احادیث کو الگ الگ باب میں جمع کر دیا جائے مثلاً طہارت سے متعلق روایات کو کتاب الطہارۃ میں، نماز سے متعلق احادیث کو کتاب الصلوۃ میں جمع کر دیا جائے وغیرہ، اس کام کو انجام دینے والے چند ہم عصر علماء تھے؛ جن میں سے کچھ نام یہ ہیں، امام مالک مدینہ طیبہ میں، ابن جریج مکہ مکرمہ میں، معمر بن راشد الیمنی یمن میں، امام ابوحنیفہ، سفیان ثوری اور عبداللہ بن مبارک کوفہ میں۔

(۳) تیسرا دور ''تدوین علی المسانید'' کا ہے، مسانید: مُسْنَد کی جمع ہے، مسند: کتب حدیث کی انواع میں سے ایک نوع کا نام ہے چنانچہ ''مُسْنَد'' حدیث کی اس کتاب کو کہا جاتا ہے کہ جس میں احادیث کو علی ترتیب اسماء الصحابہ جمع کیا جائے اور مضمون کا کچھ لحاظ نہ کیا جائے مثلاً ابوبکرؓ کی تمام روایات کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے،

(۱) ۱/ ۳۳۱ (كتاب العلم) مطبوعه: دار ابن الجوزي المملكة العربية السعودية.

(۲) ص ۲۸.

اس کے بعد حضرت عمرؓ کی مرویات کو جمع کر دیا جائے خواہ وہ کسی بھی مضمون سے متعلق ہوں، یہ کام سب سے پہلے عبیداللہ بن موسیٰ العبسی اورنعیم بن حماد الخزاعی نے انجام دیا، اس کے بعد پھر بہت سی مسانید لکھی گئیں مثلاً مسند احمد، مسند بزار، مسند ابوداؤد الطیالسی، مسند ابویعلی وغیرہ۔

(۴) چوتھا دور ''تدوین علی الصحاح'' کا ہے یعنی صحیح احادیث کو یکجا جمع کر دیا جائے، اب تک جو احادیث جمع کی گئیں تھیں ان میں احادیث صحیحہ وضعیفہ کا امتیاز نہیں تھا، اگر کوئی صحیح حدیث سے استدلال کرنا چاہے تو امتیاز کرنا بہت مشکل تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ ذخیرۂ احادیث میں سے صحیح احادیث کو الگ جمع کر دیا جائے، امام بخاری کے استاذ اسحاق بن راہویہ کی مجلس میں ایک روز یہ بات سامنے آئی تو انہوں نے فرمایا کہ اگر یہ کام ہوجائے تو اچھا ہے، امام بخاری نے اسی وقت عزم کرلیا اور بخاری شریف میں خوب چھان پھٹک کے بعد صحیح احادیث کی ایک معتد بہ مقدار کو جمع فرمایا،[1] پھر امام مسلم نے بہت سی احادیث کو صحیح مسلم شریف میں جمع فرمایا، ان کے بعد بہت سے حضرات نے صحاح کو الگ جمع کیا۔

(۱۰) المسائل

مسائل حدیث کیا ہیں؟ حدیث شریف کے مسائل ہیں: ''جميع مايتعلق بأحواله صلى الله عليه وسلم قولاً أو فعلاً أو تقريراً أو صفةً ''یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلقہ تمام امور، آپ کے احوال، اقوال، افعال، تقریرات اور صفات۔

مبادیات عشرہ کا بیان یہاں ختم ہوا، اب کچھ اور مزید باتیں بیان کی جاتی ہیں:

(۱) القسمة و التبويب

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سے مصنف جب کتاب کو شروع کرتا ہے تو کہتا ہے میری یہ کتاب اتنے ابواب اور اتنی فصول پر مشتمل ہوگی، اسی طرح مضمون کے لحاظ سے علم کی بھی تقسیم اور تبویب ہوتی ہے مثلاً علم منطق کے مضامین دو ہیں: تصورات اور تصدیقات، علم بلاغت کے مضامین تین ہیں معانی، بیان اور بدیع، ان کو ابوابِ علم کہا جاتا ہے، علم حدیث کے ابواب (مضامین) کتنے ہیں اور کیا ہیں؟

(۱) سير اعلام النبلاء ۱۲/ ۴۰۱.

ابواب ومضامینِ حدیث اوران کامختصر تعارف وتشریح:

حضرات محدثین نے علمِ روایتِ حدیث کے آٹھ مضامین بیان فرمائے ہیں، جو یہ ہیں: (۱) عقائد (۲) احکام (۳) تفسیر (۴) تاریخ (۵) رِقاق (۶) مناقب (۷) آداب (۸) فتن، حدیث کی کتابوں میں انہی آٹھ قسم کے مضامین بیان کئے جاتے ہیں۔

تمام احادیث میں سے ہر حدیث انہی میں سے کسی سے متعلق ہوگی، کوئی حدیث ان ابواب ثمانیہ سے خارج نہیں ہوگی، حدیث کی جو کتاب ان ابواب ثمانیہ پر مشتمل ہو اس کو ''جامع'' کہا جاتا ہے، جیسے امام بخاری کی الجامع الصحیح، اسی طرح ترمذی شریف بھی جامع ہے۔

مشکوٰۃ شریف جامع ہے یا نہیں؟ شیخ یونس جونپوریؒ کا جواب:

ہماری یہ کتاب مشکوۃ شریف جامع ہے، یا نہیں؟ اس میں سات مضامین کی روایات تو موجود ہیں البتہ تفسیر کا بیان باقاعدہ نہیں ہے، تو اس کو جامع کہا جائے گا یا نہیں؟ جن حضرات نے جامع ہونے کے لئے آٹھ مضامین کی تقیید فرمائی ان کے مطابق یہ جامع نہیں ہوگی، میں نے حضرت شیخ یونس صاحبؒ سے اس بارے میں استفسار کیا تو حضرت نے فرمایا: کہ میں نے بھی یہ بات حضرت شیخ زکریاؒ سے معلوم کی تھی تو حضرت شیخ نے فرمایا تھا کہ ہاں مشکوۃ شریف جامع ہے، اور بتایا تھا کہ یہ آٹھ کی اصطلاح شاہ عبدالعزیزؒ کے زمانہ سے شروع ہوئی ہے، حضرات متقدمین کے یہاں جو کتاب حدیث کے مختلف ومتعدد مضامین پر مشتمل ہو اس کو جامع کہا جاتا تھا، آٹھ کی قید نہ تھی، پس متقدمین کی تعریف کے لحاظ سے مشکوۃ شریف جامع ہے، پھر حضرت شیخ یونس صاحبؒ نے فرمایا کہ اس کے بعد سے ابتک تمھارے علاوہ کسی نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا۔

مذکورہ آٹھوں مضامین کی کچھ تفصیل ذیل میں درج ہے:

(۱) عقائد:- احادیث متعلقہ بالعقائد کو ''علم التوحید'' بھی کہا جاتا ہے، بہت سے محدثین نے اس مضمون سے متعلق باقاعدہ کتابیں تصنیف فرمائیں ہیں، اس بارے میں امام بیہقی کی کتاب ''الاسماء والصفات'' معروف ومشہور ہے۔

(۲)احکام:- اس سے مراد ''احادیث متعلقہ بالحلال والحرام'' ہیں حدیث کی جس کتاب میں یہ احادیث ابواب فقہیہ کی ترتیب پر مذکور ہوں اس کو ''سنن'' کہا جاتا ہے۔

(۳)تفسیر:- احادیث متعلقہ بالتفسیر کو ''علم التفسیر'' کہا جاتا ہے، اس کے بارے میں بھی بہت سے علماء نے کتابیں لکھی ہیں مثلاً سیوطی کی **الدر المنثور**، تفسیر ابن کثیر، تفسیر ابن جریر وغیرہ۔

(۴) تاریخ:- تاریخ کے دو حصے ہیں:

(الف) ایک حصہ وہ ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے حالات بیان کیے گئے ہیں مثلاً انبیاء سابقین کے حالات، امم سابقہ کے حالات، آسمان و زمین اور ملائکہ وغیرہ کی تخلیق کا بیان، تو وہ احادیث جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سے پہلے کے حالات کو بیان فرمایا ان کو ''بدء الخلق'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(ب) دوسرا حصہ وہ ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے وفات تک کے حالات اور آپ کے آل واصحاب کے حالات کو بیان کیا گیا ہے، اس کو ''سیرت'' کہا جاتا ہے، جیسے سیرۃ ابن ہشام، سیرۃ المصطفیٰ، مدارج النبوۃ، زاد المعاد لابن القیم وغیرہ۔

(۵) رِقاق:- یہ رقیق کی جمع ہے بمعنیٰ مرقِّق (نرم کرنے والی چیز) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ وامت کو بہت سی ایسی نصیحتیں فرمائیں جن سے دل نرم ہوجاتا ہے، ایسی احادیث کو ''رقاق'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، بہت سے حضرات اس کے لئے ''علم السلوک والزہد'' کا عنوان لاتے ہیں۔

(۶) مناقب:- یہ مَنْقَبۃ کی جمع ہے بمعنیٰ فضیلت، عظمت وشرافت، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص خاص صحابہ اور خاص خاص قبائل کے فضائل بیان فرمائے، ان کو ''مناقب'' کہا جاتا ہے۔

(۷) آداب:- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرت کے بہت سے آداب بیان فرمائے، جو روایات ان آداب سے متعلق ہوں ان کو ''کتاب الآداب'' کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے اور اس موضوع پر بھی مستقل تصانیف موجود ہیں، جیسے امام بخاری کی کتاب **الادب المفرد**.

(۸) فتن:- یہ فتنہ کی جمع ہے، قیامت تک جو فتنے آنے والے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ان فتنوں سے آگاہ فرمایا، ان کو ''کتاب الفتن'' میں بیان کیا جاتا ہے۔[1]

(۱) مقدمۃ لامع ص ٤٣.

(۲)مرتبة علم الحديث

علم کا مرتبہ دو اعتبار سے ہوتا ہے: ایک فضیلت وشرافت کے اعتبار سے، اس لحاظ سے علم حدیث کا مرتبہ بتادیا گیا کہ یہ افضل العلوم ہے، دوسرے پڑھنے وپڑھانے کے اعتبار سے، اس لحاظ سے علوم دو قسم کے ہیں (۱) علوم عالیہ (۲) علوم آلیہ جیسے نحو، صرف، معانی اور بیان وغیرہ، چوں کہ علوم شرعیہ عربی زبان میں ہیں اس لئے نحو صرف وغیرہ کو بطور آلہ کے پڑھایا جاتا ہے تا کہ عجمی لوگ علوم شرعیہ کو سمجھ سکیں۔ اس دوسرے اعتبار سے علم حدیث علوم عالیہ میں سے ہے۔

(۳)حجية الحديث ومكانتها في التشريع الإسلامی

یعنی حدیث کا حجت ہونا اور شریعت اسلامیہ میں اس کا مقام ومرتبہ

اہل قرآن (منکرین حدیث) کارد:

جمہور امت کے نزدیک دلائل شرعیہ چار ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس، قرآن کریم کے بعد حدیث، اسلامی احکام اور تعلیمات کا دوسرا بڑا مأخذ ہے، بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے حدیث کی حجیت کا انکار کیا، سب سے پہلے دوسری صدی ہجری میں معتزلہ نے احادیث کو مطلقاً ظنی قرار دیا، حالانکہ بہت سی احادیث قطعی ہوتی ہیں، مگر ان پر عقلیت غالب تھی، جس کے نتیجہ میں انہوں نے بہت سی احادیث کا سرے سے انکار ہی کردیا، اس کے بعد ہر زمانہ میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوتے رہے جنہوں نے حجیت احادیث کا انکار کیا، ماضی قریب میں پاکستان میں غلام احمد پرویز وغیرہ نے منکرینِ حدیث کی جماعت کی باقاعدہ بنیاد ڈالی، اورانہوں نے اپنے گمان کے اعتبار سے اپنے لئے ایک اچھا نام ''اہلِ قرآن'' تجویز کیا، اس فرقہ نے ''حسبنا كتاب الله'' کا نعرہ لگایا، ان لوگوں کا مقصد حقیقت میں اپنے آپ کو شرعی قیودات سے آزاد کرنا تھا، قرآن کریم میں تو اجمالی احکام ہیں، ان کی تفصیلات وقیودات احادیث میں وارد ہوئی ہیں، انہوں نے کہا کہ نبی کی حیثیت محض سفیر کی ہوتی ہے، اس کا کام صرف قرآن کو پہنچادینا ہے اور نبی کا احترام محض سفیر ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، مطاع ہونے کی وجہ سے نہیں، اس قسم کی نامعقول باتیں انہوں نے کہی ہیں۔

ہر زمانہ کے علماء نے ان کی تردید کی ہے، اس زمانہ میں بھی ان کے رد میں بہت سی کتابیں لکھی گئی

ہیں، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی ''نصرة الحدیث'' اس موضوع پر عمدہ کتاب ہے، تفصیلات انھیں کتابوں میں ہیں البتہ ان کتب کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

حجیت حدیث کے بارے میں کئے گئے شبہات وسوالات

ان لوگوں نے جو حدیث کا انکار کیا تو ان کو کچھ شبہات پیش آئے اور انہوں نے احادیث کے حجت ہونے پر کچھ سؤالات اٹھائے:

(۱) قرآن؛ جامعیت کی وجہ سے کسی تفسیر کا محتاج نہیں!

پہلا سوال یہ ہے کہ قرآن تو جامع ہے، اس میں ہر چیز کا بیان موجود ہے، خود قرآن میں ہے ''تبیاناً لکل شیٔ[1]'' جب قرآن جامع ہے تو اس کے لئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں، اس کی تفسیر کرنا جامعیت کے منافی ہے۔

(۲) احادیث؛ زمانۂ نبوی ﷺ کے بعد مدوّن ہونے کی وجہ سے معتبر نہیں!

دوسرا سوال یہ ہے کہ احادیث کی تدوین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہوئی ہے، چنانچہ ۹۹ھ میں تدوین ہوئی، جیسا کہ گزر چکا، گویا ایک صدی کے بعد احادیث کو مدون کیا گیا ہے، پس جو کلام متکلم کی وفات کے سو سال بعد لکھا اور مرتب کیا گیا ہو وہ کیونکر قابل قبول ہوسکتا ہے؟ اس طویل مدت میں سہو ونسیان کا قوی امکان ہے۔

(۳) قرآن قطعی اور احادیث ظنی!

(۳) تیسرا سوال یہ ہے کہ قرآن قطعی ہے اور احادیث ظنی ہیں تو ظنی چیز؛ قطعی چیز کی تفسیر کیسے ہوسکتی ہے؟

(۴) حدیث محض ایک تاریخ!

چوتھا سوال یہ ہے کہ حدیث کی حیثیت تاریخ کی ہے اور تاریخ کو کوئی حجت نہیں مانتا۔

شبہات کے جوابات:

حضرات علماء نے چاروں شبہات اور سوالوں کا معقول اور مدلل جواب دیا ہے، جو یہ ہے:

(۱) من سورة النحل: رقم الآية ۸۹.

قرآن کے جامع ہونے کا صحیح مفہوم:

(۱) اول سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن بلاشبہ جامع ہے، لیکن جامع ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں تمام مسائل وجزئیات آگئے ہیں، بلکہ جامعیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے الفاظ مختصر اور بہت سے علوم ومعارف پر مشتمل ہیں، قرآن کریم میں اصول مجملہ اور کلیات مختصرہ کا بیان ہے، قرآن کریم کی حیثیت ''دستوراساسی'' کی سی ہے، جس میں کلیات کا بیان ہوتا ہے اور پھر دستوراساسی کی تشریح کی جاتی ہے، چنانچہ احادیث کے ذریعہ قرآن کریم کی تشریح کی گئی ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم نازل ہوا، قرآن پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داریوں کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ''وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِم''[۱] ایک جگہ فرمایا گیا: ''وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ''[۲] ان آیات میں واضح کردیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا بنیادی مقصد آپ پر نازل ہونے والی کتاب کی تفسیر وتشریح ہے۔

چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے قرآن کی تفسیر وتشریح فرمائی، اس تفسیر کا نام ''حدیث'' ہے، اگر حدیث نہ ہوتی تو قرآن کو سمجھنا ممکن نہ تھا، امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے: ''لولا الحديث لَمَا فَهِمَ مِنَّا أَحَدٌ القرآنَ''[۳] یعنی اگر حدیث شریف نہ ہوتی تو ہم میں سے کوئی قرآن کو نہ سمجھ پاتا، اور حضرت امام شافعیؒ سے منقول ہے: ''جَمِيْعُ مَاتَقُوْلُهُ الأَئِمَّةُ شَرْحٌ للسنةِ وجميعُ مافى السنةِ شرحٌ للكتاب''[۴] یعنی ائمہ دین جو کچھ فرماتے ہیں وہ سنت کی شرح ہے اور جو سنت میں بیان کیا گیا ہے وہ سب کتاب اللہ کی شرح ہے۔

نیز حضرات صحابہؓ کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی، وہ اسلوب قرآن سے بہتر طور پر آشنا تھے، اُن تمام حالات وواقعات کا براہ راست مشاہدہ کرنے والے تھے جن میں قرآن نازل ہوا، مگر اس کے باوجود حدیث کے بغیر قرآن کو سمجھنے میں ان سے غلطی ہوتی تھی، حضرت عدیؓ بن حاتم کا واقعہ مشہور ہے کہ سحری کھانے سے

---

(۱) من سورة البقرة رقم الآية: ۱۲۹۔

(۲) من سورة النحل: ٤٤.

(۳) حاشية فيض البارى ۱ / ۳۲۰۔

(٤) الإتقان فى علوم القرآن ٤ / ۲۸ النوع الخامس والستون الإكليل فى استنباط التنزيل ص ۱۱.

متعلق آیت کریمہ ”حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الاَسْوَدِ[۱]“، میں خیط ابیض اور خیط اسود سے حقیقی معنی مراد ہونا سمجھ کر دو دھاگے سیاہ وسفید تکیہ کے نیچے رکھ لئے، جب روشنی سے دونوں کا رنگ نظر آنے لگا، اس وقت کھانا پینا بند کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عدی تمہارا تکیہ تو بڑا لمبا ہے کہ جس میں رات اور دن سما گئے؟ کیونکہ یہاں دو دھاگوں سے رات کی تاریکی اور دن کی سفیدی مراد ہے۔[۲]

اس قسم کی غلط فہمیوں کی کچھ مثالیں خود مشکوۃ میں بھی آئیں گی، پس بغیر حدیث کے قرآن کو سمجھنا ممکن نہیں، لہٰذا یہ تشریح وتفسیر جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے قرآن کی جامعیت کے منافی نہیں ہے۔

تاریخ حفاظت حدیث:

(۳) سوال ثانی کا جواب سمجھنے کے لئے کئی چیزیں سمجھنا ضروری ہے:

(الف) اللہ نے قرآن کریم میں حفاظت قرآن کا وعدہ فرمایا ہے ”اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ[۳]“ علماء نے فرمایا ہے کہ اس آیت میں حدیث وفقہ اور دیگر علوم شرعیہ سب کی حفاظت کا وعدہ ہے، صرف الفاظ کی حفاظت مراد نہیں، اس لئے کہ حدیث وفقہ قرآن ہی کے معانی ہیں، ظاہر ہے کہ ذکر سے اگر صرف الفاظِ قرآنی مراد ہوں تو یہ حفاظت ناتمام ہوگی، کیونکہ اگر کسی کتاب کے الفاظ تو محفوظ ہوں، لیکن معانی محفوظ نہ ہوں تو اس کو محفوظ نہیں سمجھا جاتا، لہٰذا قرآن کے الفاظ بھی محفوظ اور اس کے معانی بھی محفوظ۔

حق تعالیٰ شانہ نے ان معانی کی حفاظت اس عجیب وغریب انداز سے فرمائی کہ صحابہ کے قلوب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے پناہ محبت اور عشق ڈال دیا، عاشق؛ معشوق کی ہر ادا کو محفوظ کرتا ہے، اس عشق کی وجہ سے صحابہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام حالات کو محفوظ کیا اور امت تک پہنچایا، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم بھی دیا تھا کہ میری احادیث کو یاد کرو اور قرآن میں بھی اطاعتِ رسول کا حکم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو اسوہ قرار دیا گیا، ان سب وجہوں سے صحابہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ہر حال کو محفوظ کیا، اللہ نے ان کو سمندر جیسا حافظہ عطا فرمایا تھا، اکثر صحابہ وتابعین کو اپنے طویل نسب نامے اور بڑے بڑے قصیدے ازبر یاد تھے، اس خداداد حافظہ کے ذریعہ انہوں نے احادیث کو محفوظ رکھا، امام ابوزرعہ رازی نے

(۱) البقرۃ: ۱۸۷.

(۲) مسلم ۱/ ۳۴۹ (۱۰۹۰) لفظہ: إن وسادک لعریض إنما هو سواد اللیل وبیاض النهار.

(۳) سورۃ الحجر رقم الآیۃ، ۹.

فرمایا کہ مجھے دولاکھ حدیثیں ایسی یاد ہیں جیسے عام آدمی کو "قل ھو اللہ" یاد ہوتی ہے، [۱] اور بعض افراد کو تمام حدیثیں یاد تھیں۔

(ب) ایک ہے تدوین حدیث اور ایک ہے کتابت حدیث، دونوں میں فرق ہے کما مر، تدوین تو بیشک بعد میں ہوئی، لیکن نفسِ کتابتِ حدیث کا سلسلہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی سے شروع ہو چکا تھا، حضرات صحابہ کے نزدیک حفاظتِ حدیث کا مدار اگرچہ حافظہ پر تھا، لیکن اسی کے ساتھ بہت سے صحابہ احادیث کو انفرادی طور پر لکھ بھی لیتے تھے، بہت سی احادیثِ صحیحہ اس پر دال ہیں، اگرچہ ابتداء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو لکھنے کی ممانعت فرمائی تھی جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہے: "لاتکتبوا عَنّي غيرَ القرآن فمن كتبَ عنی غيرَ القرآن فَلْيَمْحُه [۲]" یعنی مجھ سے قرآن کے سوا کچھ مت لکھو، اور جس نے کچھ لکھا ہو وہ اس کو مٹادے، لیکن یہ ممانعت عارضی اور وقتی تھی تاکہ قرآن کے ساتھ حدیث کا التباس نہ ہو جائے، پھر جب یہ اندیشہ ختم ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث لکھنے کی اجازت دے دی۔

صحابہ میں کتابت حدیث کا رواج اور اس کے چند واقعات:

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں "مامِنْ أصحابِ النبی صلی الله علیه وسلم أحدٌ أكثر حديثاً مِنّي الا ماكان من عبدِاللهِ بن عمرو بن العاصِ فإنه كان يَكْتُبُ ولاأكْتُبُ [۳]" یعنی صحابہ کرام میں سے کوئی بھی مجھ سے زیادہ احادیث روایت کرنے والا نہیں ہے بجز حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کے، اس لئے کہ وہ لکھتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔

لیکن اس پر یہ اشکال ہے کہ اس حدیث کا مقتضی تو یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو کی مرویات حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات سے زائد ہونی چاہئیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے، حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ احادیث کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے، (۵۳۷۴) [۴] اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے صرف

(۱) سیر اعلام النبلاء ۱۳ / ۶۸ والطبقات الکبری ۱ / ۶۵۔

(۲) مسلم شریف۔

(۳) بخاری شریف ۱ / ۲۱۔

(٤) سیر اعلام النبلاء ۱۲ / ۶۳۲۔

سات سو کے قریب حدیثیں مروی ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی فتوحات کے بعد حضرت عبداللہؓ بن عمرو کا زیادہ تر قیام مصر یا طائف میں رہا ہے، اوران دونوں جگہوں کی طرف علماء کی رحلت علمیہ اتنی نہیں تھی جتنی مدینہ منورہ کی طرف تھی، اور حضرت ابوہریرہؓ کا قیام مدینہ منورہ میں تھا، وہاں طالبین؛ علم حدیث حاصل کرنے کے لئے کثرت سے جاتے تھے، اس لئے ابوہریرہؓ سے روایت کرنے والوں کی تعداد دنیا میں بہت ہوئی اوران کی روایات عالم میں خوب نشر ہوئیں۔

حدیث کی کتابوں میں کتابتِ حدیث کے متعدد واقعات ملتے ہیں:

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کو لکھا کرتا تھا، قریش نے مجھے اس سے منع کیا اور کہا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت سی مرتبہ غصہ کی حالت میں ہوتے ہیں اور بعض مرتبہ فرط خوشی میں، اس لئے ہر بات لکھنے کے قابل نہیں ہوتی، عبداللہ بن عمرو نے اس کا تذکرہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کہ میں آپ کی احادیث کو لکھتا ہوں اور قریش مجھے منع کرتے ہیں، اس پرآں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اُكْتُبْ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَايَخْرُجُ مِنْهُ اِلَّاحَقٌّ''، یعنی لکھا کرو، کیونکہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس زبان سے ہرحال میں حق ہی نکلتا ہے۔[1]

(۲) ابوجحیفہ نے حضرت علیؓ سے سوال کیا کہ آپ کے پاس کوئی خصوصی کتاب ہے؟ اس سوال کا منشاء یہ تھا کہ حضرت علیؓ کے بارے میں بہت سے لوگ یہ کہتے تھے کہ ان کے پاس مخصوص علوم ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کچھ خاص وصیتیں فرمائی ہیں، جیسا کہ روافض کا یہی نظریہ ہے، حضرت علیؓ نے فرمایا ''لا، إلا كتابُ اللّٰه أوفَهْمٌ أعطِيَهُ رجلٌ مسلم أومافي هذه الصحيفة''[2]، یعنی میرے پاس کتاب اللہ ہے اور وہ فہم ہے جو ایک مسلمان کو عطا کی جاتی ہے اور کچھ احکام وہ ہیں جو اس صحیفہ میں ہیں اس کے سوا کچھ نہیں، اور یہ کہہ کر حضرت علیؓ نے اپنی تلوار کی میان سے ایک تحریر نکالی جس میں دیت وقصاص اور قیدیوں سے متعلقہ کچھ احکام اور یہ کہ کسی مسلمان کو کافر کی وجہ سے قتل نہ کیا جائے وغیرہ امور تحریر تھے۔

(۱) ابوداود ۲/ ۵۱۳۔

(۲) بخاری شریف. ۱/ ۲۱.

(۳) فتح مکہ کے موقعہ پر ایک رجل خزاعی نے ایک رجل لیثی کو قتل کر دیا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم محترم کی حرمت وتعظیم کے بارے میں رقت آمیز خطبہ دیا، سامعین پر اس کا بہت اثر ہوا، یمن کے ایک شخص ابوشاہ حاضر ہوئے اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھے لکھ دیجئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اکتبوہ لأبی شاہ'' یہ خطبہ ان کو لکھ کر دیا جائے۔(۱)

(۴) عبداللہ بن عکیم الجہنی مدینہ سے باہر رہا کرتے تھے، فرماتے ہیں ''أتانا کتاب نبي الله صلی الله علیه وسلم قبل موته بشهر ان لاتنتفعوا بمیتة باهاب ولابعصب(۲)'' یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خط آپ کی وفات سے ایک ماہ پہلے اس بارے میں ہم تک پہنچا کہ تم لوگ مردار کی کچی کھال اور پٹھے سے انتفاع مت حاصل کرو۔

(۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے صحابہ کو مختلف مقامات پر عامل وگورنر بنا کر بھیجا تھا، اوران کو بہت سے تفصیلی احکام زکوۃ وفرائض وغیرہ کے لکھ کر دیئے تھے، جیسے عمرو بن حزم الانصاری، اور دیگر عمالِ صحابہ کو بھی خطوط لکھ کر دیئے ہیں، ان خطوط کو محفوظ رکھا گیا، ان میں سے بہت سے خطوط محدثین نے کتبِ حدیث میں نقل فرمائے ہیں۔

اس تفصیل سے منکرینِ حدیث کے دوسرے سوال کا جواب واضح ہوگیا کہ احادیث بھی قرآن کریم کی طرح دورِ نبوی میں قید کتابت میں آچکی تھیں۔

احادیث کے ظنی ہونے کا مفہوم:

(۳) سوالِ ثالث کا جواب یہ ہے کہ تمام احادیث کو ظنی کہنا درست نہیں ہے، بلکہ احادیث تین قسم کی ہیں: احادیث متواترہ، احادیث مشہورہ اور اخبار آحاد، متواترہ سے علم یقینی بدیہی کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور مشہورہ سے علم یقینی نظری کا فائدہ ہوتا ہے اور اخبار احاد سے ظن کا فائدہ ہوتا ہے، لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ظن دو معنی میں استعمال ہوتا ہے:

(۱) تخمینہ اور اٹکل سے کہی ہوئی بات، بے دلیل وبے تحقیق بات، یہ معنیٰ یہاں مراد نہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ''اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ، اِنَّ الظَّنَّ لَايُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا'' (النجم:۲۸)

(۱) بخاری شریف ۱ / ۲۲.

(۲) ترمذی ج۱ / ۳۰۳.

(۳)غالب گمان، اخبار آحاد کے ظنی ہونے سے یہی معنیٰ مراد ہیں، اور غالب گمان سے جو بات کہی جائے وہ شرعاً وعقلاً ہر دولحاظ سے حجت ومعتبر ہے، چنانچہ تحویلِ قبلہ کی آیت نازل ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد اس کی خبر لے کر اہلِ قبا کے پاس پہنچا، تو انہوں نے شخص واحد کی خبر پر نماز میں ہی اپنا رخ بدل دیا، اسی طرح صحابہؓ کی ایک جماعت کو ایک شخص نے شراب کے حرام ہونے کی خبر دی تو حضرات صحابہؓ نے شراب کے برتن تک توڑ دیئے، حضرت امام شافعیؒ نے اس نوع کے متعدد واقعات نقل کر کے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی کے واقعات سے خبر واحد کی حجیت ثابت ہے، اور دنیاوی امور ومعاملات میں بھی اگر کوئی معتبر شخص کسی کے پاس پیغام پہنچائے تو اس کا اعتبار کر کے معاملات کو انجام دیا جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر خبر واحد کا اعتبار نہ کیا جائے تو دین ودنیا دونوں کا نظام معطل ہو جائے۔(۱)

حدیث وتاریخ کا فرق:

(۴)سوال رابع کا جواب یہ ہے کہ حدیث وتاریخ میں بڑا فرق ہے، تاریخی روایت میں سند کا اہتمام نہیں ہوتا، برخلاف حدیث کے کہ ہر حدیث کی سند کتب حدیث میں موجود ہے، پھر حدیث کو قبول کرنے کے لئے حضرات محدثین نے بڑے منضبط قواعد وضع فرمائے ہیں، سند کے تمام راویوں کی دیانت وصداقت کا جائزہ لیا جاتا ہے، اس کا حافظہ کس معیار کا ہے؟ یہ جانچا جاتا ہے، سند متصل ہے یا نہیں؟ اور راویوں کی کڑیاں باہم مربوط ہیں یا نہیں؟ روایت کے سند یا متن میں شذوذ یا علت تو نہیں ہے؟ غرضیکہ احادیث کی جانچ پڑتال کے لئے حضرات محدثین کا وضع کردہ ایسا نظام ہے کہ دنیا بھر کی تاریخ ایسا نظام پیش کرنے سے قاصر ہے، تاریخی روایات کے لئے یہ نظام نہیں ہے اس لئے حدیث کو تاریخ پر قیاس کرنا سراسر مغالطہ ہے۔

(٤) تعلق علم الفقة بعلم الحديث

اہل حدیث (منکرین فقہ) کا رد:

یعنی فقہ کا حدیث سے تعلق، اس سے پہلی بحث میں ایک فرقہ کا رد تھا جو اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہتے ہیں، اس مبحث میں بھی ایک فرقہ کا رد ہے جو اپنے آپ کو اہلِ حدیث کہتے ہیں، یہ لوگ ظاہر حدیث پر عمل

(۱)الرسالة للشافعي: باب الحجة في تثبيت الخبر الواحد، ت: أحمدشاكر ط:مكتبه الحلبي.

کرنے کو ضروری قرار دیتے ہیں اور حدیث کے **اصل** مغز یعنی فقہ ودرایت کا انکار کرتے ہیں، اس قسم کے لوگ بھی ہر زمانہ میں رہے ہیں، آج کے زمانہ کے غیر مقلدین نے لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کیا کہ فقہ کا قرآن وحدیث سے تعلق نہیں ہے، فقہ الگ چیز ہے، مگر یہ مغالطہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ حدیث وفقہ کا باہم گہرا ربط ہے، فقہ؛ حدیث کا مغز ہے اور حدیث کا ثمرہ وخلاصہ ہے، احادیث کا **اصل** مقصود فقہ ہی ہے، حدیث گزر چکی ہے ''**نَضَّرَ الله امرأً......الحدیث**'' اس روایت میں حاملین حدیث کو فقاہت کی وجہ سے ہی دعادی گئی ہے، علماء نے حدیث وفقہ کے باہمی گہرے ارتباط کو مختلف مثالوں سے سمجھایا ہے، بعض علماء نے فرمایا: ''**الحدیثُ بغیرِ الفقهِ کَشَجَرٍ بلاثَمَرٍ**'' کہ حدیث بغیر فقہ کے اس طرح ہے جیسے درخت بغیر پھل کے، علامہ خطابی نے معالم السنن میں حدیث وفقہ کی مثال بنیاد اور عمارت کے ساتھ دی ہے کہ حدیث بمنزلۂ بنیاد اور فقہ بمنزلہ عمارت کے ہے، جو عمارت مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو وہ بے بھروسہ اور کمزور ہوتی ہے، اور جس بنیاد پر عمارت تعمیر نہ کی جائے وہ ویران اور اجاڑ ہوتی ہے۔(۱)

حضرت اقدس شاہ ولی اللہؒ نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں حدیث وفقہ کی مثال چھلکے ومغز اور سیپ وموتی سے دی ہے، پھل کے اوپر چھلکا اور اندر مغز یعنی گودا ہوتا ہے، حدیث شریف چھلکا اور فقہ اسکے مغز (گودے) کی طرح ہے، اسی طرح حدیث شریف سیپ اور فقہ اندر کے موتی کی طرح ہے۔(۲)

اصل میں تفقہ کے ذریعہ فقہاء نے متعارض احادیث میں تطبیق دی ہے، مثلاً ایک شخص نے سوال کیا روزہ کی حالت میں بیوی کو بوسہ دینا جائز ہے یانہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، ایک اور شخص نے اسی طرح کا سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی، اس کی تطبیق فقہاء نے بیان فرمائی کہ جس کو ممانعت فرمائی وہ جوان تھا اور جس کو اجازت دی وہ بوڑھا تھا۔

اس سے فقہ کی اہمیت اور معنویت ظاہر ہے، واقعہ یہ ہے کہ اگر فقہ وتفقہ نہو تو انسان احادیث کے گھنے اور گہرے جنگل میں گم ہوکر رہ جائے جیسا کہ عبداللہ بن وہب سے مروی ہے کہ میں نے احادیث بہت جمع کرلی تھیں جس کی وجہ سے میں حیران وپریشان ہوگیا تھا، پھر میں نے ان کو مالک ولیث کے سامنے پیش

(۱) معالم السنن للخطابی شرح أبی داؤد ۱ر ٤، مطبوعه بیروت.

(۲) حجة الله البالغه ۱ر ٤، مطبوعه بیروت.

کرنا شروع کیا تو وہ دونوں میری رہنمائی فرماتے کہ یہ حدیث لو، یہ چھوڑ دو یہ ناسخ ہے، یہ منسوخ ہے۔ (۱)

(۵) مقام الإمام أبي حنيفةؒ في الحديث

(یعنی علم حدیث میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی جلالتِ شان)

یہ ایک مسلم اور ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بڑے بڑے علماء حدیث نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مقام بلند کا بھرپور اعتراف کیا ہے، اس کے لئے مناقبِ ابی حنیفہ پر جو کتب تصنیف کی گئی ہیں ان کی مراجعت کی جاسکتی ہے، یہاں اس بارے میں صرف چند حضرات کے اقوال وآراء پیش کی جاتی ہیں:

امام اعظم کے بارے میں اکابر محدثین کی آراء:

مکی بن ابراہیم امام بخاری کے جلیل القدر استاذ ہیں، جن سے امام بخاری کی اکثر ثلاثیات مروی ہیں، یہ امام ابوحنیفہ کے شاگرد ہیں، تہذیب الکمال میں حافظ یوسف جمال الدین المزی نے امام ابوحنیفہ کے بارے میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے: ''کان أعلم أهل زمانه (۲)'' یعنی امام صاحبؒ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم تھے، اس زمانہ میں مطلق علم کا اطلاق علم حدیث پر ہی ہوتا تھا، اس لئے مطلب یہ ہوا کہ امام صاحب اپنے زمانہ میں علم حدیث کے سب سے بڑے عالم تھے۔

مشہور محدث یزید بن ہارون فرماتے ہیں کہ: ''أدركتُ ألفاً من الشيوخ وكَتَبْتُ منهم فما وجدتُ أفقَهَ ولا أورَعَ ولا أعلَمَ من خمسةٍ، أولهم أبو حنيفة (۳)'' یعنی میں ایک ہزار شیوخ سے ملا اوران سے میں نے احادیث لکھیں، لیکن پانچ شیوخ سے زیادہ کسی کو علم وورع والا نہیں پایا، اوران پانچ میں سب سے پہلے امام ابوحنیفہؒ ہیں۔

حافظ ذہبیؒ نے امام ابوداؤد سے نقل کیا ہے: ''إن أباحنيفة كان إماما (۴)'' کہ ابوحنیفہ امام تھے۔

(۱) اثر الحديث الشريف فى اختلاف الأئمة الفقهاء ص ۸۲، از شيخ محمد عوامه.

(۲) تهذيب الكمال. (۱۰/ ۳۱۶ برقم ۷۳-۷) ط: دار الكتب العلمية بيروت.

(۳) الجواهر المضينه فى طبقات الحنفيه (۱/ ۲۹) ط: میر محمد کتب خانہ کراچی۔

(٤) تذكرة الحفاظ (۱/ ۱۲۷ برقم: ۱۶۳، ط: دار الكتب العلميه بيروت)

امام ابوحنیفہؒ کے شیوخ وتلامذہ اور امام صاحب کے بارے میں ان کے تأثرات:

امام ابوحنیفہ کے تبحر فی علم الحدیث کا اندازہ ان کے شیوخ وتلامذہ پر نظر ڈالنے سے ہوسکتا ہے، حافظ ابوالحجاج مزی نے تہذیب الکمال میں امام ابوحنیفہؒ کے ۷۴ شیوخ شمار کیے،(۱) حافظ سیوطیؒ نے تبییض الصحیفۃ میں ۷۶ شیوخ کا تذکرہ کیا ہے،(۲) ملاعلی قاری نے امام ابوحنیفہ کے شیوخ کی تعداد چار ہزار بتائی ہے،(۳) پھر وہ شیوخ بھی بعد کے محدثین میں سے کسی کو حاصل نہ ہوسکے، کیونکہ امام صاحب کے شیوخ میں یا تو صحابہ ہیں یا پھر تابعین اور تبع تابعین اس سے نیچے کے رتبہ کا کوئی شیخ نہیں ہے، امام صاحب نے حضرت عامر بن شراحیل الشعبی سے علم حدیث حاصل کیا، حافظ ذہبی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:(۴) ''هو أكبر شيخ لأبي حنيفةؒ''، امام شعبی وہ ہیں جنہوں نے پانچ سو صحابہ سے علم حدیث حاصل کیا، ایک مرتبہ امام شعبی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات بیان فرمارہے تھے اتنے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ پاس سے گذرے تو شعبی کی باتیں سن کر انہوں نے فرمایا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا ہوں لیکن شعبی کو غزوات کا مجھ سے زیادہ علم ہے۔(۵)

امام اعظم کے اساتذہ میں ابراہیم بن محمد المنتشر، قاسم بن عبدالرحمٰن (حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے پوتے)، قتادہ، نافع، طاؤس بن کیسان، عکرمہ، عطاء ابن ابی رباح، عمرو بن دینار، عبداللہ بن دینار اور امام شیبان النحوی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے جلیل القدر تابعین اور اساطین امت داخل ہیں۔(۶)

آپ کے شاگردوں میں بھی بڑے بڑے ائمہ حدیث نظر آتے ہیں، آپ کے خصوصی شاگردوں میں عبداللہ ابن مبارک ہیں، جن کا قول ہے: ''لولا أن اللّٰه أعانني بأبي حنيفةَ وسفيانَ لكنتُ كسائرِ الناسِ(۷)''، یعنی اگر اللہ تعالیٰ ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوری کے ذریعہ میری اعانت نہ کرتا تو میں بھی عام لوگوں کی

(۱) تهذيب الكمال (۱۰/۲۰۹-۲۱۰ برقم ۷۰۷۳)
(۲) تبييض الصحيفة في مناقب أبي حنيفة (من ص ۲۱ إلى ص ٤٦)
(۳) شرح مسند أبي حنيفة، لملا علي القاري (ص۸)
(٤) تذكرة الحفاظ (۱/۶۳ برقم ۷۶) في ترجمة الشعبي عامر بن شراحيل.
(٥) المصدر السابق ۱/٦٤.
(٦) تهذيب الكمال ۱۰/۳۰۹-۳۹۰ وسير أعلام النبلاء ٦/۳۹۲.
(۷) تهذيب التهذيب (۸/۵۱۷)(۷٤۳۳).

طرح ہوتا، جرح وتعدیل کے مشہور امام یحی بن سعید القطانؒ بھی امام صاحب کے شاگرد ہیں، حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے قول پر ہی فتویٰ دیا کرتے تھے، حافظ ابن حجر نے یحی بن سعید القطان کا قول نقل کیا ہے: ''**قد أخذنا بأكثر أقواله** [۱]'' یعنی ہم نے امام ابوحنیفہؒ کی اکثر آراء واقوال کو اختیار کیا الجواہر المضیہ [۲] میں یحیٰ ابن معین کے حوالہ سے یحیٰ ابن سعید القطان کا یہ قول نقل کیا ہے: ''**جالَسْنا و اللهِ أباحنيفةَ و سَمِعْنَا منه و كنتُ و اللهِ اذا نَظَرْتُ إليه عَرَفْتُ في وجهِهِ أنه يتقّي اللهَ عزوجل** [۳]'' یعنی ہم امام ابوحنیفہؒ کی مجلس میں بیٹھے اوران سے احادیث سنیں، اور میں بخدا جب بھی ان کو دیکھتا تو چہرے سے پہچان لیتا کہ ان میں اللہ عزوجل کا خوف ہے۔

نیز امام شافعیؒ کے استاذ خاص حضرت وکیع بن جراحؒ بھی امام صاحب کے شاگرد ہیں اور امام صاحب سے انہوں نے نوسو(۹۰۰) احادیث روایت کی ہیں، ابن عبدالبر نے ''الانتقاء'' [۴] میں یحی بن معین سے نقل کیا ہے کہ وہ بھی امام صاحب کے قول پر فتویٰ دیا کرتے تھے، ان کے علاوہ مشہور محدثین میں سے حفص بن غیاث النخعی، یحی ابن زکریا، مسعر بن کدام، ابوعاصم النبیل، قاسم بن معن، علی بن مسہر، عبدالرزاق بن ہمّام جیسے جلیل القدر محدثین نے امام صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، جس محدث کے شیوخ وتلامذہ میں اس مرتبہ کے حضرات موجود ہوں اس کے بارے میں یہ کہنا کہ علم حدیث میں اس کا پایہ بلند نہ تھا کتنا بڑا ظلم ہے!

''کتاب الآثار'' حدیث کی اولین کتاب:

امام ابوحنیفہؒ کے مآثر علمیہ میں ان کی ''کتاب الآثار'' علم حدیث میں ان کے عظیم المرتبت ہونے کی شاہد ہے، یہ کتاب فقہی ابواب پر حدیث کی سب سے پہلی مرتب کتاب ہے، امام سیوطی نے تبییض الصحیفۃ [۵] میں فرمایا ہے کہ علم حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کی یہ فضیلت کچھ کم نہیں کہ انہوں نے ابواب فقہیہ کی

(۱)سیر اعلام النبلاء ۶/۳۹۸، تہذیب الکمال ۳۱۴۱۰ وتہذیب التہذیب ۸/۵۱۷ ط: دار الفکر بیروت.

(۲)الجواهر المضيئة في طبقات الحنفية (۲/۲۱۲في ترجمة يحي القطان)

(۳)تاريخ بغداد ۱۳/۳۵۱: درالكتب العلمية بيروت.

(٤)الانتقاء في فضائل الأئمة الثلاثة الفقهاء (ص ۲۱۱)

(٥)تبييض الصحيفة (ص ۱۱٦)

ترتیب پر سب سے پہلے حدیث کی کتاب تالیف فرمائی، یہ فضیلت کسی اور کو حاصل نہیں ہوسکی، امام اعظمؒ کی یہ کتاب مؤطا مالک کے لیے مأخذ کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ حافظ ذہبی نے باقاعدہ سند کے ساتھ مشہور محدث عبدالعزیز دراوردی کا قول نقل کیا ہے، ''**كان مالك يَنْظُرُ في كتبِ أبي حنيفة ويَنْتفعُ بها**'' یعنی امام مالک امام ابوحنیفہؒ کی کتابیں دیکھتے اور ان سے مستفید ہوتے تھے۔

حدیث کی دوسری کتب کی طرح ''کتاب الآثار'' کے بھی بہت سے راوی ہیں جن میں سے چار مشہور ہیں، (۱)امام ابو یوسف (۲)امام محمد (۳)امام زفر (۴)امام حسن بن زیاد، علامہ موفق مکی نے ''مناقب الامام الاعظم'' میں ابوبکر بن محمد کا قول نقل کیا ہے: ''**اِنْتَخَبَ أبو حنيفة من أربعين ألفِ حديثٍ**''(۱) یعنی امام صاحبؒ نے چالیس ہزار احادیث میں سے منتخب کرکے کتاب الآثار لکھی، علامہ موفق ہی نے حافظ ابویحی زکریا بن یحی نیشاپوری کی مناقب ابوحنیفہ کے حوالہ سے ان کی سند کے ساتھ یحی بن نصر سے نقل کیا ہے: ''**سَمِعتُ أباحنيفةَ يقولُ: عندي صناديقُ من الحديثِ ماأخرجتُ منها الاالشيْ اليسيرُ الذي يُنْتَفَع به**'' کہ میں نے امام ابوحنیفہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ: میرے پاس حدیث کے صندوق کے صندوق ہیں، میں نے ان میں سے صرف اتنی احادیث بیان کی ہیں جن سے لوگ مستفید ہوسکیں۔(۲)

مسانیدِ امام اعظمؒ:

''کتاب الآثار'' امام صاحب کی واحد تصنیف ہے، اس کے علاوہ بڑے بڑے محدثین نے امام ابوحنیفہ کی روایات کو جمع کرکے مسند ابی حنیفہ کے نام سے مرتب کیا ہے، مسند لکھنے والوں میں حافظ ابن عساکر، حافظ ابوالعباس الدوری، حافظ ابن مندہ حتی کہ حافظ ابن عدی بھی شامل ہیں، جو شروع میں امام صاحب کے بڑے مخالف تھے، بعد میں جب امام طحاوی کے شاگرد بنے تو امام صاحب کی جلالتِ قدر کا اندازہ ہوا، اس وقت اپنے سابقہ نظریہ کی تلافی کے طور پر ''مسند ابی حنیفہ'' مرتب فرمائی۔

اس طرح مسندِ ابی حنیفہ کے نام سے سترہ یااس سے زائد کتابیں لکھی گئیں جن کو بعد میں علامہ ابن خسرو نے ''**جامع مسانيد الإمام الأعظم**'' کے نام سے جمع فرمادیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب پر قلیل الحدیث ہونے کا الزام سفید جھوٹ ہے جس کی تعصب یاناواقفیت کے سوا کوئی اور تاویل نہیں ہوسکتی۔

(۱)مناقب ابی حنیفه للموفق بن احمدالمکی(۱/۱۵۱)

(۲)مناقب أبي حنيفة للموفق ۱/۱۵۱.

امامِ اعظم سے صحاح ستہ میں کوئی روایت کیوں مروی نہیں؟

امام صاحب پرایک اعتراض یہ کیاجاتاہے کہ ان کی روایات صحاحِ ستہ میں موجودنہیں ہیں، اس سے یہ معلوم ہوتاہے کہ ائمہ ستہ کے نزدیک وہ قابلِ استدلال نہ تھے،لیکن یہ اعتراض بہت سطحی اورعامیانہ ہے، ائمہ ستہ کا کسی جلیل القدر امام سے اپنی کتاب میں روایت کو درج نہ کرنا اس کی تضعیف کومستلزم نہیں، کیونکہ کھلی ہوئی بات ہے کہ امام بخاری نے امام شافعی کی بھی کوئی روایت نہیں لی ہے، بلکہ امام احمد بن حنبل جوامام بخاری کے استاذ ہیں اورجن کی صحبت انہوں نے بہت اٹھائی ہے ان کی بھی صحیح بخاری میں صرف دوروایتیں ہیں،ایک تعلیقاً منقول ہے اوردوسری کسی کے واسطے سے روایت کی ہے،اسی طرح امام مسلم نے اپنی صحیح میں امام بخاری سے کوئی روایت نقل نہیں کی حالانکہ وہ انکے استاذ ہیں، نیز امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں امام مالک کی صرف تین روایات ذکر کی ہیں حالانکہ امام مالک کی سند اصح الاسانید شمار کی جاتی ہے، کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ امام شافعی، امام مالک، امام احمد تینوں ضعیف ہیں۔

اس معاملہ میں حقیقت وہ ہے جو علامہ زاہد الکوثری[1] نے بیان کی ہے کہ درحقیقت ائمہ حدیث کے پیش نظر یہ بات تھی کہ وہ ان احادیث کوزیادہ سے زیادہ محفوظ کریں جن کے ضائع ہونے کا خطرہ تھا، جبکہ ائمہ اربعہ کے تلامذہ اورمقلدین کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ان کی روایات کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں تھا،اس لیے انہوں نے اس کی حفاظت کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں کی،اوران سے احادیث روایت نہیں کیں۔

امام ابوحنیفہؒ پرقلیل الروایۃ ہونے کا الزام:

کچھ متعصب لوگوں نے الزام لگایا کہ امام ابوحنیفہؒ حدیث میں کمزوروکم مایہ تھے، وہ قیاس کو حدیث پرترجیح دیتے ہیں،بعض نے کہا کہ امام صاحب کوکل پچاس حدیثیں یادتھیں،بعض نے کہا کہ آپ کوصرف سترہ حدیثیں یادتھیں، یہ اعتراضات کئے گئے ہیں، علمائے احناف نے مدلل طریقہ پران سب کا جواب دیاہے اوران اقوال پرجرح فرمائی ہے،اس پرسب کا اتفاق ہے کہ امام صاحب مجتہد تھے اورمجتہد کی شرائط

(۱)شروط الائمۃالخمسۃ فی ثلث رسائل ص ۱۶ حاشیہ.

میں سے بڑی شرط یہ ہے کہ اس کو احکام کی تمام روایات معلوم اور یاد ہوں اور اس کو علم حدیث میں پوری بصیرت حاصل ہو، امام صاحب مجتہد تھے اور آپ نے بذریعۂ اجتہاد تراسی (۸۳) ہزار مسائل بیان فرمائے، اگر آپ کو صرف سترہ یا پچاس حدیثیں یاد تھیں تو اتنے مسائل کہاں سے بیان فرمائے؟

مصنف ابن ابی شیبہ میں ایک فصل قائم کی گئی ہے جس کا عنوان یہ ہے: ''یہ فصل امام ابوحنیفہؒ کے ان مسائل کے بیان میں ہے جو حدیث کے خلاف ہیں'' انھوں نے ایسے مسائل کی تعداد ایک سو پچیس شمار کرائی ہے۔(۱)

اگرچہ علماء نے ان کے جوابات بھی دیئے ہیں اور احادیث سے ان کو مدلل کیا ہے، مگر پھر بھی تراسی ہزار میں سے ۱۲۵ کے علاوہ تمام حدیث کے موافق ہیں، تو سوال یہ ہے کہ یہ سب مسائل حدیث کے مطابق کیسے ہوگئے؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ سب الزام ہے اور حاسدین کی کرم فرمائی ہے۔

حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی اور ایک غیر مقلد کا ایک دلچسپ واقعہ:

ہمارے مفتی صاحب (حضرت مفتی محمود صاحبؒ) نے سنایا تھا کہ ایک غیر مقلد آیا اور کہا کہ امام صاحب ضعیف تھے، حضرت نے فرمایا کہ: تم نے امام صاحب سے کشتی کی تھی جس سے پتہ چلا ہو کہ وہ ضعیف تھے؟ اور وہ کیا، ہر انسان ضعیف ہے! خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''خُلِقَ الانْسَانُ ضَعِيفًا(۲)''، اس نے کہا کہ نہیں یہ مطلب نہیں، بلکہ وہ حدیث میں ضعیف تھے، حضرت نے فرمایا کہ کس نے کہا؟ اس نے کہا کہ حافظ ذہبی نے ''میزان الاعتدال'' میں لکھا ہے، حضرت نے فرمایا کہ حافظ ذہبی نے تو نہیں لکھا، اس نے کہا کہ انہوں نے لکھا ہے، حضرت نے فرمایا کہ حافظ ذہبی نے نہیں لکھا، بلکہ وہ کسی غیر مقلد کا تصرف ہے، جس کی صورت یہ ہوئی کہ کسی غیر مقلد نے ''میزان الاعتدال'' کے حاشیہ میں امام صاحب کی تضعیف کا جملہ لکھا، پھر جب وہ کتاب عرب میں چھپی تو بعض نے حاشیہ کی عبارت کو متن کی عبارت سمجھ کر کتاب میں شامل کر دیا، اس نے کہا کہ اس کے برعکس بھی تو ہوسکتا ہے، حضرت نے فرمایا کہ برعکس نہیں ہوسکتا کہ وہ جملہ متن میں ہو اور کسی نے وہاں سے نکال کر حاشیہ پر لکھ دیا ہو، کیونکہ ایسا کون کرے گا؟ حنفی یا غیر مقلد؟ غیر مقلد ایسا نہیں کرسکتا کہ امام صاحب کی تضعیف سے متعلق متن میں کوئی جملہ ہو اس کو متن سے نکال کر حاشیہ میں لائے اور

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ ۲۰/۵۳، کتاب الرد علی ابی حنیفةؒ.

(۲) النساء: ۲۸.

اپنی بات کو کمزور کرے، رہا حنفی سوا گر اس کا بس چلے گا تو اس جملہ کو نہ متن میں چھوڑے گا نہ حاشیہ میں۔

پھر حضرت نے فرمایا کہ حافظ ذہبی نے ایسا نہیں لکھا، اس کی میرے پاس تین دلیلیں ہیں: (۱) حافظ ذہبی نے میزان کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ میں اس کتاب میں ائمہ متبوعین جیسے ائمہ اربعہ، ان کا تذکرہ نہیں کروں گا کیوں کہ ائمہ اربعہ کی ثقاہت مسلم ہے،(۱) (۲) دوسری دلیل یہ ہے کہ میزان الاعتدال کی شرح ہے ''لسان المیزان'' جو حافظ ابن حجر نے لکھی ہے اس میں یہ عبارت موجود نہیں ہے، (۳) تیسری دلیل یہ ہے کہ حافظ ذہبی نے اپنی کتاب تذکرۃ الحفاظ میں امام صاحب کو حفاظِ حدیث میں شمار کیا ہے(۲) اور محدثین کی اصطلاح کے اعتبار سے حافظ اس کو کہا جاتا ہے جس کو ایک لاکھ حدیثیں سنداً ومتناً یاد ہوں، پس یہ کس طرح ممکن ہے کہ حافظ ذہبی اپنی ایک کتاب میں امام صاحب کو حافظ الحدیث لکھیں اور دوسری کتاب میں ان کو ضعیف کہیں، یہ ویسے ہی امام صاحب کے بارے میں افواہیں ہیں۔

ائمہ دین پر جرح معتبر نہیں:

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے ''مقدمۂ اوجز'' میں فرمایا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ پر جرح کی گئی ہے، لیکن مطلق جرح معتبر نہیں، علماء جرح وتعدیل نے جرح کے کچھ قاعدے مقرر فرمائے ہیں، ان کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، ورنہ بڑے سے بڑے محدث کی عدالت وثقاہت ثابت نہ ہوسکے گی، کیونکہ تمام بڑے ائمہ پر کسی نہ کسی کی جرح ضرور موجود ہے، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ پر یحی بن معین نے، امام مالک پر ابن ابی ذئب نے، امام احمد بن حنبل پر امام کرابیسی نے، امام بخاری پر امام ذہلی نے، امام اوزاعی پر امام احمد بن حنبل نے جرح کی ہے، ابن حزم نے امام ترمذی اور ابن ماجہ کو مجہول کہا ہے، امام نسائی پر بہت سے علماء نے تشیع کا الزام عائد کیا ہے اور انھیں مجروح قرار دیا ہے، یہ منکرین حدیث کا فرقہ اسی وجہ سے پیدا ہوا، انھوں نے جب یہ دیکھا کہ ہر امام پر کسی نہ کسی نے جرح کی ہے تو ان کی روایا تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور سرے سے حدیث کے ہی منکر ہوگئے۔

علماء جرح وتعدیل کا مقررہ اصول ہے کہ جس شخص کی امامت وعدالت حدتواتر کو پہنچی ہوئی ہو اس کے

(۱) میزان الاعتدال ۱/۱۱۳ ط: دارالکتب العلمیه، -الطبعیة الثانیة.

(۲) تذکرة الحفاظ ۱/۱۲۷(۱٦۳)

بارے میں ایک دو افراد کی جرح معتبر نہیں ہوگی،(۱) امام ابوحنیفہؒ کی عدالت و امامت بھی حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہے، بڑے بڑے ائمہ حدیث نے آپ کے علم وتقوی کو خراج تحسین پیش کیا ہے، اس لئے امام صاحب پر چند افرادِ آحاد کی جرح کا کچھ اعتبار نہیں۔

امام صاحب کے تلامذہ کی خدمات حدیث:

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں نے حدیث کی بڑی خدمت کی ہے، علماء نے لکھا ہے کہ بخاری شریف میں بائیس ثلاثیات ہیں (یعنی وہ حدیث جس میں مصنفِ کتاب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک صرف تین راوی ہوں) اوران بائیس کے اکثر راوی حنفی ہیں،(۲)

امام مالک نے ''موطا'' لکھی، اس میں انہوں نے تین چیزیں ذکر کیں ہیں: احادیث مرفوعہ، آثارِ صحابہ اور عملِ اہلِ مدینہ، نیز اس میں بہت سی احادیث امام صاحب کے مسلک کے بھی خلاف ہیں، امام محمد نے بھی '' موَطا'' لکھی اوراس میں انہوں نے امام صاحب کے مسلک کے مطابق احادیثِ مرفوعہ کو درج کیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ '' موَطا مالک'' کی جو احادیث امام صاحب کے مسلک کے خلاف تھیں ان کا جواب بھی دیا ہے، اس طرح سے ''موطا مالک'' میں کوئی حدیث مرفوع ایسی نہیں ہے جس کا جواب ''موطا محمد'' میں نہ ہو، امام محمد نے ''کتاب الآثار'' روایت کی، جس میں انہوں نے امام مالک کے مقابلہ میں آثارِ صحابہ ذکر کئے ہیں، اور امام محمد نے ''کتاب الحجۃ'' بھی تصنیف کی جس میں امام صاحب کے مسلک کے مطابق اہل مدینہ کا تعامل درج کیا ہے، اس طرح امام محمد نے امام مالک کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حدیث کی خدمت انجام دی اور امام ابوحنیفہ کے مسلک کو مدلل ومبرہن فرمایا۔

نیز پہلے گزر چکا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اپنی ''کتاب الآثار'' کو چالیس ہزار حدیثوں سے منتخب کر کے لکھا ہے، لہذا امام صاحب پر حدیث میں کم مائیگی کا اعتراض ناواقفیت کی وجہ سے یا حسد وتعصب کی وجہ سے ہے، البتہ یہ صحیح ہے کہ امام صاحب سے روایات کم منقول ہیں جس کی کئی وجہیں ہیں:

---

(۱) تاج السبکیؒ نے فرمایا: "الصواب عندنا أن من ثبتت إمامته وعدالته وكثر مادحوه ومزكوه، وندر جارحوه، وكانت هناك قرينة دالة على سبب جرحه، من تعصب مذهبي أوغيره فإنا لانلتفت إلى الجرح فيه ونعمل فيه بالعدالة" (قاعدة في الجرح والتعديل للسبكي ص١٩)

(۲) مقدمة اللامع ص٢٩.

امام اعظم کے قلیل الروایۃ ہونے کی وجوہ:

(۱) آپ کا اکثر وقت استنباط واجتہاد میں مشغول رہتا تھا، کیونکہ اس زمانہ میں اس کی بہت زیادہ ضرورت تھی، لہذا بیانِ احادیث کا موقعہ آپ کو کم ملتا تھا۔

(۲) امام صاحب کے نزدیک روایت حدیث کے لئے شرائط بہت سخت تھیں، ابن الصلاح نے اپنے مقدمہ میں بیان فرمایا: کہ بعض سلف کے یہاں بیان حدیث میں بہت تشدد تھا ان میں سے امام ابوحنیفہ اورامام مالک بھی ہیں، ان حضرات کا مذہب یہ ہے کہ محدث کے لئے ایسی ہی روایت بیان کرنا جائز ہے جواس کو حفظ یاد ہو، اگر احادیث اس کی کاپی وغیرہ میں درج ہیں تو ان کو دیکھ کر بیان کرنا جائز نہیں، بخلاف جمہور کے کہ ان کے یہاں توسع تھا، بعض سلف کے یہاں یہ تشدید برسبیلِ احتیاط تھی کہ مبادا'' مَنْ قَالَ عَلَيَّ مَالَمْ أقُلْه'' کی وعید میں داخل ہوجائیں، لہذا حدیث کو جاننا الگ ہے اورروایت کرنا الگ چیز ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے حضرت ابوبکرؓ اورحضرت ابوہریرۃؓ، حضرت ابوبکرؓ سے روایات بہت کم منقول ہیں حالانکہ آپ سب سے زیادہ احادیث کو جاننے والے تھے، انہوں نے ہی سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی، لیکن ان کے اوقات امور سلطنت میں مشغول رہتے تھے، اس لئے بیانِ حدیث کا موقع کم ملتا تھا، برخلاف ابوہریرۃؓ کے کہ اگرچہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بہت کم رہے، چنانچہ وہ فتحِ خیبر کے بعد ۷ھ میں مسلمان ہوئے اورصرف چار سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے لیکن سب سے زیادہ انہی سے احادیث منقول ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو تعلیم وتعلم کے لئے وقف کردیا تھا۔

امام اعظمؒ پرقیاس کونص پرمقدم کرنے کا اعتراض:

امام ابوحنیفہ پرسب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ قیاس کونصوص پرمقدم کرتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات واقعہ کے بالکل خلاف ہے، امام صاحب تو بعض اوقات ضعیف حدیث کی وجہ سے بھی قیاس کوچھوڑ دیتے ہیں جیسا کہ آگے آئے گا، شیخ عبدالوہاب شعرانی نے جوخود شافعی المسلک ہیں اس سلسلہ میں اپنی کتاب ''المیزان الکبریٰ'' میں ایک مستقل فصل قائم کی ہے ''فصلٌ في بيان ضعفِ قولِ من نَسَبَ الإمامَ أباحنيفةَ إلى أنه يُقَدِّمُ القياسَ على حديثِ رسولِ الله صلى الله عليه و سلم'' اس

فصل میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ اس قسم کا کلام ان لوگوں سے صادر ہوا ہے جو امام ابوحنیفہ سے تعصب رکھتے ہیں، وہ لوگ اپنے دین میں کمزور ہیں، کلام میں غیر محتاط ہیں، اور عنداللہ جواب دہی سے غافل ہیں، حالانکہ قرآن کریم میں واضح فرمادیا گیا ہے ''اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولا الآیہ (۱)'' پھر انہوں نے فرمایا کہ امام ابوجعفر الشیزاماری نے سند متصل کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل فرمایا: ''كَذَبَ واللهِ وافترىٰ علينا من يقولُ عنّا إننا نُقَدّم القياسَ على النصِ، وهل يحتاجُ بعدالنصِّ إلى القِياسِ، وكان رضي الله عنه يقول إننا نَنْظُر أولاً في دليل تلكَ المسئلةِ من الكتابِ والسنةِ وأَقْضِيةِ الصحابةِ، فان لم نَجدُ دليلاً قِسْنا حينئذ...... الخ (۲)'' یعنی ہمارے اوپر جھوٹ کہا اور بہتان باندھا اس شخص نے جو ہمارے متعلق یہ کہے کہ ہم قیاس کو نص پر مقدم کرتے ہیں، نص کے بعد قیاس کی ضرورت کہاں رہ جاتی ہے، ہم درپیش مسئلہ کے لئے اولا کتاب، سنت، اور صحابہؓ کے فیصلوں کو اوران کے اقوال کو دیکھتے ہیں اگر ان سب میں مسئلہ مصرح نہ ہو اس وقت مجبوری میں قیاس کرتے ہیں الخ۔

حضرت شیخ زکریاؒ نے مقدمۂ اوجز میں لکھا ہے کہ حضرت امام صاحبؒ سے متعدد طرق سے ان کے متعدد شاگردوں نے جن میں عبداللہ ابن مبارک بھی ہیں نقل فرمایا کہ: امام صاحب اولاً کتاب اللہ پر نظر فرماتے ہیں، کتاب اللہ میں مسئلہ نہ ملے تو حدیث کو دیکھتے ہیں، حدیث میں بھی نہ ملے تو اقوال صحابہ سے دلیل تلاش کرتے ہیں، اقوال صحابہؓ اگر مختلف ہوں تو ان میں سے جو قول کتاب وسنت کے زیادہ قریب ہوتا ہے اس کو اختیار فرماتے ہیں، اگر قولِ صحابی بھی نہ ملے تو پھر تابعین کے اقوال کو اختیار نہیں فرماتے بلکہ اس وقت اجتہاد فرماتے ہیں۔

ابن حجرؒ مکی شافعی نے فرمایا کہ درحقیقت امام صاحب کے متعلق ترجیحِ قیاس کی بات ان لوگوں نے کہی ہے جو امام صاحب کے اصول وقواعد سے ناواقف ہیں۔

امام اعظمؒ کے یہاں قبولِ روایت کی شرائط:

امام ابوحنیفہؒ کے یہاں مسائل کے استنباط واجتہاد کے لئے کچھ قاعدے اور ضابطے مقرر ہیں، جن پر انہوں نے اپنے مذہب کی بنیاد رکھی ہے، ان میں سے چند اصول یہ ہیں۔

(۱) من سورة الإسراء: ٣٦.

(۲) مقدمة الأوجز ١/١٨٩–١٩٢.

(۱) خبرِ واحد اگر متفق علیہ اور اجماعی اصول کے خلاف ہو تو خبرِ واحد کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

(۲) راوی کا عمل اگر اپنی روایت کردہ حدیث کے خلاف ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ یہ حدیث منسوخ ہے، یا راوی کے نزدیک اس سے راجح دلیل ثابت ہو جانے کی وجہ سے مرجوح ہے۔

(۳) موضعِ عمومِ بلوی میں راوی کا تفرد (یعنی عام صحابہؓ کا اس حدیث کو روایت نہ کرنا) بھی روایت میں نسخ وغیرہ کا احتمال پیدا کرتا ہے، اسی لئے جمہور علماء نے بھی حدیث الجمع بین الصلوتین للمطر کو قابلِ عمل قرار نہیں دیا ہے۔

(۴) روایاتِ شہیرہ کی رو سے حدود وکفارات شبہ کی وجہ سے ساقط ہو جاتے ہیں، اس لئے ان کو واجب کرنے میں خبرِ واحد معتبر نہ ہوگی۔

(۵) جس مسئلہ میں خبرِ واحد وارد ہوئی ہے اگر وہ مسئلہ صحابہ کے درمیان مختلف فیہ ہو اور صحابہ میں سے کسی نے بھی اس روایت کو مستدل نہ بنایا ہو تو وہ روایت بھی نسخ وغیرہ کے احتمال کی وجہ سے قابلِ عمل نہ ہوگی۔

(۶) خبرِ واحد کا عموم قرآن کے خلاف ہونا؛ کیونکہ امام صاحب کے نزدیک خبرِ واحد کی وجہ سے آیتِ قرآنیہ میں نسخ وتخصیص جائز نہیں ہے۔

(۷) خبرِ واحد کا روایاتِ مشہورہ کے معارض ہونا" وغیر ذالک من القواعد التی بنی علیها مذهبه"۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے بغیر قوی اور واضح دلیل کے کسی خبرِ واحد کو ترک نہیں فرمایا ہے، اس لئے ترجیحِ قیاس کا الزام بے بنیاد ہے، ابن حزم نے لکھا ہے کہ تمام احناف کا اس پر اتفاق ہے کہ ضعیف حدیث قیاس سے اولی اور مقدم ہے۔[1]

قیاس؛ شجرِ ممنوعہ نہیں:

امام صاحب کی مجلس لگی ہوئی تھی آپ نے ایک مسئلہ کے بارے میں قیاس فرمایا، اس پر ایک شخص نے کہا کہ اس قیاس بازی کو چھوڑو، کیوں کہ سب سے پہلے قیاس ابلیس نے کیا تھا، اس پر امام صاحب نے

(۱) (ملخص از مقدمه أوجز ۱/ ۱۸۹–۱۹۲)

تحمل کے ساتھ فرمایا: ''یافلانُ! وضعتَ الکلامَ فی غیر موضِعِه'' کہ تم نے یہ بات بے موقعہ کہی، کیونکہ ابلیس نے اپنے قیاس سے اللہ کے حکم کو رد کیا تھا اس لئے وہ کافر قرار پایا، اور ہم جو قیاس کرتے ہیں وہ اللہ کے حکم کی تلاش کے لئے اور اس کی اتباع کے لئے کرتے ہیں، اگر قرآن وحدیث میں کوئی مسئلہ غیر منصوص مسئلہ کے موافق ہوتا ہے تو ہم اس کو اس پر قیاس کرتے ہیں، پس ہمارا مقصود تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کا اتباع ہے تو ہم ابلیس کے مساوی کیسے ہوجائیں گے! اس پر اس شخص نے امام صاحب سے معافی مانگی اور آپ کو دعا دی ''نَوّرَ اللهُ قلبَکَ کمانوّرتَ قلبی''[1]

امام اعظم کے یہاں ضعیف حدیث کو قیاس پر ترجیح:

ابن حزم کے حوالہ سے اوپر بتایا جاچکا ہے کہ احناف کے یہاں تو حدیث اگرچہ ضعیف ہو اس کو قیاس پر مقدم کیا جائے گا، احناف کی کتبِ فقہ میں اس کی سینکڑوں مثالیں ہیں مثلاً ''القهقهة فی الصلوة'' کہ امام صاحب کے یہاں یہ ناقضِ وضو ہے، جمہور کے یہاں نہیں، جمہور نے کہا ہے کہ خروجِ نجاست سے وضو ٹوٹتا ہے، اور قہقہہ فی الصلوۃ سے خروج نجاست نہیں ہوتا ہے، احناف کہتے ہیں کہ قہقہہ فی الصلوۃ کا ناقض ہونا خلافِ قیاس حدیث سے ثابت ہے جس کا واقعہ مشہور ہے،[2] یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے مگر اس کو قیاس پر ترجیح دی گئی۔

مقدمہ مشکوۃ میں ہے کہ مرسل حدیث جمہور کے یہاں حجت نہیں ہے مگر احناف ومالکیہ کے یہاں مرسل روایت بھی حجت اور قیاس پر مقدم ہے، لہٰذا امام صاحب پر ترجیح قیاس علی الحدیث کا الزام سراسر غلط ہے۔

احناف کو ''اصحاب الرائے'' کہنے کی وجہ:

اب سوال یہ ہے کہ جب احناف کے یہاں قیاس کو ترجیح نہیں تو پھر احناف کو ''اصحاب الرائے'' کیوں کہا جاتا ہے، ملاعلی قاری نے اس کی وجہ یہ تحریر کی ہے: ''لـدقة رأيهـم وحذاقة عقلهم'' یعنی ان کی دقت رائے اور مہارت عقل کی بناپر،[3] گویا کہ یہ لقب مذمت کے طور پر نہیں بلکہ مدح کے طور پر ہے، لیکن جن کے ذہن میں فتور ہے وہ اس کا اطلاق احناف پر مذمت کے طور پر کرتے ہیں فإلی الله المشتکی۔

(۱) مقدمۂ اوجز ۱/۱۸۹–۱۹۲.

(۲) سنن دارقطنی ۱/۲۹۰ ج۳ ۶۰ ط مؤسسة الرسالة بیروت.

(۳) مقدمۂ أوجز ص۱/۱۸۹–۱۹۲.

(٦) علم الحديث فی الهند

یہ مبحث بیانِ اسناد کی تمہید ہے، حضرات اساتذہ نے فرمایاہے کہ اُن اکابر کا ہم پراحسان ہے جوعلم حدیث کو حجاز سے لائے، اگر چہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی اسلام ہندوستان پہنچ گیا تھا جیسا کہ بعض کتب تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بلکہ صحابہ کے زمانہ تک بھی ہندوستان میں اسلام کا چرچہ نہیں ہوا تھا، یہاں اسلام زیادہ تر تاجروں کے ذریعہ سے پھیلا ہے چنانچہ تبع تابعین میں سے ایک محدث ابوجعفر ربیع بن صبیح سعدی البصری المتوفی ۱۶۰ھ،[۱] ہندوستان میں گجرات کے علاقہ بھروچ میں تشریف لائے اور وہاں انہوں نے احادیث بیان کرنا شروع کی، مگر دسویں صدی ہجری تک ہندوستان میں علم حدیث کا چرچہ نہیں ہوا، یہاں علوم عقلیہ منطق فلسفہ وغیرہ کا زور تھا، دسویں صدی ہجری تک ''مشارق الانوار'' مولفہ ابوالفضائل حسن بن محمد الصاغانی الحنفی پڑھائی جاتی تھی، دسویں صدی ہجری میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ مکہ مکرمہ علم حاصل کرنے کے لئے تشریف لے گئے، پھر ہندوستان آئے، انہوں نے حدیث کی خوب خدمت کی اور خاص طور پر مشکوٰۃ شریف پرانہوں نے بہت محنت کی، اصول حدیث کے بارے میں ایک مقدمہ لکھا، جو''مقدمۂ مشکوۃ'' کے نام سے مشہور ہے اور مشکوۃ کے شروع میں ملحق ہے، یہ مقدمہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا ہے، بعض لوگ اس مقدمہ کو صاحبِ مشکوٰۃ کا سمجھتے ہیں حالانکہ ایسانہیں ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے مشکوۃ کی دوشرحیں لکھیں، ایک عربی زبان میں: ''**لمعات التنقیح**'' اوردوسری فارسی زبان میں: ''**اشعة اللمعات**'' سنہ ۱۰۵۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

لیکن آپ کے زمانہ تک ہندوستان میں مشکوٰۃ کا ہی درس ہوا، صحاح ستہ یہاں نہیں آئیں، گیارھویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اس میدان میں اترے، آپ کی وفات ۱۱۷۶ھ میں ہے، آپ نے عرب جاکر حرمین کے علماء سے بالخصوص شیخ ابوطاہر مدنی سے علم حدیث حاصل کیااورآپ ہی صحاح ستہ کو اوران کی اجازت حدیث کو ہندوستان لے کرآئے پھر ہندوستان میں صحاح ستہ کا بھی درس ہونے لگا، برصغیر کے تمام علماء کی سند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تک پہنچتی ہے، اسی لئے آپ کو''مرکز الاسانید'' فی الہند کہاجاتاہے۔

---

(۱)انظر ترجمته مفصلاً فی السیر ۷/ ۲۸۷ — ۲۸۹.

آپ کی وفات کے بعد آپ کے صاحب زادے کبار محدثین ہوئے، بڑے صاحب زادے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ آپ کے جانشین مقرر ہوئے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی نے حدیث کی بڑی خدمت انجام دی اور آپ کے ہزاروں شاگرد ہوئے، ان میں سے خاص شاگرد دو ہوئے ہیں: (۱) شاہ اسحاق مہاجر مکیؒ، جو آپ کے نواسے بھی ہوتے ہیں (۲) مولانا رشید الدین کشمیری ثم الدہلوی، پھر شاہ اسحاقؒ کے مشہور شاگرد شاہ عبدالغنی مجددیؒ ہوئے، اور شاہ عبدالغنی مجددیؒ کے دو اہم شاگرد ہوئے: (۱) حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (۲) حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ، پھر ان دونوں کے شاگردوں میں علماء دارالعلوم ومظاہر علوم ہیں، دارالعلوم اور مظاہر علوم کے ذریعہ حدیث کی خوب خدمت ہوئی حتی کہ اہل عرب نے بھی اس کا اعتراف کیا۔[۱]

(۷) بیان الإسناد و اهميته

اسناد کے معنی ہیں: حدیث کو نقل در نقل ترتیب کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچانا، یہ اسناد امت محمدیہ کی خصوصیت ہے، کیونکہ امم سابقہمیں اپنے دین کی باتیں سند کے ساتھ بیان کرنے کا اہتمام نہ تھا، سب سے پہلے سند کا اہتمام امت محمدیہ نے کیا، علماء امت نے سند کی اہمیت بیان فرمائی، اور اس کی اہمیت کو مختلف مثالوں سے سمجھایا، عبداللہ ابن المبارکؒ نے فرمایا: "**الإسْنَادُ من الدينِ ولولاالإسْنَادُ لَقَالَ مَنْ شَاءَ مَاشَاءَ**" [۲] کہ اگر اسناد نہ ہوتی تو ہر شخص جو چاہتا بیان کردیا کرتا، محمد بن سیرین کا قول امام مسلم نے نقل کیا ہے: "**إن هذا العلمَ دينٌ فانظُروا عمَّنْ تأخذُونَ دِيْنَكم**" [۳] "یعنی یہ علم (علم شریعت) دین ہے، لہٰذا غور کرلیا کرو کہ کس سے دین حاصل کررہے ہو؟ بعض حضرات نے فرمایا: **السَّنَدُ للعالمِ كالسَّيفِ للمقاتِلِ** [۴] "یعنی عالم کے لئے سند مجاہد کے لئے تلوار کے مثل ہے، بعض نے کہا "**السَّنَدُ للمحدِّثِ كالسُّلَّم للصاعِدِ**" یعنی محدث کے لئے سند اوپر چڑھنے والے کے لئے سیڑھی کے درجہ میں ہے۔

سند کی اہمیت معلوم ہوجانے کے بعد اب ہم اپنی سند بیان کرتے ہیں، علمائے ہند کی کتب حدیث کی

(۱) معظم هذا المبحث في العناقيد الغالية للشيخ عبدالرشيد النعماني.

(۲) رواه مسلم في مقدمته ص ۱۲.

(۳) اخرجه مسلم في مقدمته ص ۱۱.

(٤) لم أجد هذا القول بلفظه بل أجده هكذا: قال سفيان الثوري: الإسناد سلاح المؤمن إذا لم يكن معه سلاح فبأي شيء يقاتل، أخرجه ابن حبان في المجروحين ۱ / ۳۱ .

جو سندیں ہیں ان کے تین دور ہیں: پہلا دور ہم سے لے کر حضرت شاہ ولی اللہؒ تک، دوسرا دور شاہ ولی اللہؒ سے لیکر صاحبِ کتاب تک، تیسرا دور صاحبِ کتاب سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک، ذیل میں تینوں ادوار کی سندیں درج ہیں:

پہلا دور:

میں نے یہ کتاب حضرت مولانا جمیل احمد صاحب مجاہد پوری سہارنپوریؒ مظاہری، صدر مدرس مدرسہ خادم العلوم باغوں والی، ضلع مظفرنگر، سے پڑھی، انہوں نے یہ کتاب حضرت مولانا امیر احمد صاحب کاندھلویؒ سے پڑھی، انہوں نے حضرت مولانا منظور خاں صاحبؒ سے پڑھی، انہوں نے حضرت مولانا عبداللطیف صاحب سے پڑھی، انہوں نے حضرت مولانا ثابت علی صاحب سے پڑھی، انہوں نے حضرت مولانا مظہر صاحب نانوتویؒ سے پڑھی، انہوں نے استاذ الکل حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ سے پڑھی، انہوں نے حضرت مولانا رشید الدین کشمیریؒ ثم الدہلوی سے پڑھی، انہوں نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے پڑھی، انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہؒ سے پڑھی۔

دوسرا دور:

حضرت شاہ ولی اللہ سے لیکر صاحبِ کتاب تک کی سند حضرت شاہ صاحب کے ایک رسالہ "الارشاد الی مهمات الإسناد" میں بھی چھپی ہوئی ہے، اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدثؒ دہلوی نے اپنے رسالہ "العجالة النافعة" میں اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے مصنف کتاب یعنی صاحب مشکوۃ تک کی سند اس طرح نقل کی ہے:

إسناد مشكوة المصابيح لولي الدين محمد بن عبدالله الخطيب التبريزیؒ:

يرويه مسند الهند الشاه ولي الله، عن الشيخ أبي طاهر محمد ابن إبراهيم الكردي المدني، عن أبيه الشيخ إبراهيم الكردي المدني، عن الشيخ أحمد القُشاشي، عن الشيخ أحمد بن عبدالقدوس الشنّاوي، عن السيد غضنفر بن السيد جعفر النهروالي عن الشيخ محمد سعيد المعروف بمير كلان، عن الشيخ السيد نسيم الدين المعروف بميرک شاه، عن والده السيد جمال الدين عطاء الله بن السيد غياث الدين فضل الله بن السيد

عبدالرحمن، عن عمه السيد أصيل الدين عبدالله بن عبدالرحمن، عن شرف الدين عبدالرحيم بن عبدالكريم الجرهي الصديقي، عن إمام الدين علي بن مبارك الشاه الساوجي الصديقي، عن مؤلف الكتاب ولي الدين محمد بن عبدالله الخطيب التبريزي، كذاذكر هذا السند الشاه عبدالعزيز الدهلوي في العجالة النافعة.[1]

تیسرا دور:

صاحبِ مشکوۃ؛ حدیث نقل فرمانے کے بعد اس کتاب کا حوالہ تحریر فرماتے ہیں جہاں سے وہ حدیث لیتے ہیں، اور اس کتاب میں حدیث کی مکمل سند لکھی ہوئی ہے، اس طرح ہم سے لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک سند متصل ہوجاتی ہے۔

مقدمة الكتاب

کتاب سے متعلق چند باتیں ہیں (۱)تعارفِ مشکوۃ، نام اور وجہ تسمیہ (۲)وجوہ الفرق بین المصابیح والمشکوۃ (۳)روایات اور کتب وابواب کی تعداد(۴)مرتبۂ کتاب (۵)خصائص مشکوۃ(۶)مأخذ مشکوۃ(۷)شروحِ مشکوۃ (۸)حالاتِ صاحب مصابیح وصاحب مشکوۃ۔

(۱) تعارف مشكوة المصابيح

کتاب کا نام ''مشکوۃ المصابیح'' ہے، ''المصابیح'' پر الف لام مضاف الیہ کے عوض میں ہے، اصل میں تھا مصابیح السنۃ، مصابیح: مصباح کی جمع ہے بمعنی چراغ، اور مشکوۃ بمعنی طاق، جس میں چراغ رکھا جاتا ہے، اور طاق بھی ایسا جو صرف ایک طرف سے کھلا ہوا ہو، جس کو ''طاقِ غیرنافذہ'' کہا جاتا ہے، اس میں چراغ رکھا جائے تو اس کی روشنی زیادہ ہوتی ہے، اب ترجمہ ہوگا: چراغوں کا طاق، امام بغویؒ صاحبِ مصابیح نے

(۱)العناقيد الغالية من الأسانيد العالية/١٦٧۔

وفي ''العجالة النافعة'' للمحدث الشاه عبدالعزيز الدهلوي: سيد غضنفر بن سيد جعفر ''النهر واني'' بالنون المعجمة بدل ''النهر والي'' نسبة الى النهر وان وكذا الشيخ محمد سعيد معروف ''بهر كلان'' مكان ''مير كلان'' انظر العجالة النافعة بالفارسية/ ٢٩ط: مطبع مجتبائي١٣٤٨هـ۔

احادیث کوتشبیہ دی روشن چراغوں کے ساتھ، مشکوۃ ان احادیث کے ایک بڑے مجموعہ کو شامل ہے تو گویا کہ روشن چیز (احادیث) کو طاق (مشکوۃ) میں رکھ دیا گیا ہے جس سے اس افادیت میں اضافہ ہوگیا، جیسا کہ چراغ کو طاق میں رکھنے سے اس کی روشنی بڑھ جاتی ہے، گویا کہ یہ کتاب اسم با مسمی ہوئی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ امام بغویؒ نے ایک کتاب ''مصابیح السنۃ'' کے نام سے تحریر فرمائی، جس میں احادیثِ احکام کو ابواب فقہیہ کی ترتیب پر مرتب فرمایا، یہ کتاب احادیثِ احکام کے بارے میں بہت جامع تھی، لیکن امام بغویؒ نے اس کتاب میں سندوں کو ذکر نہیں کیا حتی کہ صحابی کا نام بھی ذکر نہیں کیا، اور نہ ہی احادیث کے ماٰخذ اور حوالوں کو ذکر کیا، اس کی وجہ سے مصابیح السنۃ کی احادیث کو تلاش کرنا بہت مشکل ہوتا تھا، اور بعض حضرات کو اس کی بعض احادیث پر ضعیف ہونے کا بھی شبہ تھا، امام بغویؒ نے اس میں ہر باب کے تحت دو عنوان قائم فرمائے: (۱) الصحاح (۲) الحسان، ''الصحاح'' کے عنوان کے تحت وہ صحیحین (بخاری ومسلم) کی حدیث یا دونوں میں سے کسی ایک کی حدیث کو ذکر کرتے ہیں، اور ''الحسان'' کے تحت سنن خمسہ (ترمذی، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی) کی روایات کو لاتے ہیں، پس کل یہ سات کتابیں ہوئیں، انہی سات کتابوں کی احادیث ''مصابیح السنۃ'' میں ذکر کی گئیں ہیں، جن کو ''اصولِ سبعہ'' بھی کہا جاتا ہے، مشکوۃ میں جب اصول کا لفظ بولا جائے تو اس سے یہی سات کتابیں مراد ہوتی ہیں، بعد میں علامہ خطیب تبریزی اور ان کے استاذ علامہ شرف الدین حسین بن محمد طیبی کا مشورہ ہوا کہ ''مصابیح السنۃ'' کو ایک خاص نہج پر مرتب کرنا چاہیئے، چنانچہ اس کام کا قرعۂ فال شاگردِ محترم علامہ خطیب تبریزی کے نام نکلا، علامہ خطیب تبریزی نے ''مصابیح السنۃ'' کی احادیث کو بہت سے تغیرات کے ساتھ بڑی محنت وعرق ریزی سے ایک خاص نہج پر مرتب فرمایا، اور اس کا نام مشکوۃ المصابیح رکھا، مصابیح السنہ اور مشکوۃ میں کیا فرق ہے؟ یہ ایک اہم بحث ہے، اس لئے دوسری بحث کا عنوان یہی ہے جو درج ذیل ہے:

(۲) وجوہ الفرق بین المصابیح والمشکوۃ

مشکوۃ ومصابیح میں کئی فرق پائے جاتے ہیں:

(۱) ذکرِ صحابی: مشکوۃ میں روایت کرنے والے صحابی کا ذکر ہے، اور مصابیح میں ان کا ذکر نہیں ہے۔

(۲) ماٰخذ وذکرِ حوالہ: مشکوۃ میں احادیث کے ماخذ وحوالہ کا اہتمام کیا گیا ہے، جبکہ مصابیح السنہ میں

ماخذ وحوالہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

(۳) بیاض چھوڑنے کا اہتمام: مصابیح السنہ میں بعض روایات ایسی تھیں جو خطیب تبریزی کو کہیں نہیں ملیں، نہ صحاح میں نہ حسان میں تو صاحبِ مشکوۃ نے وہاں خالی جگہ چھوڑ دی تاکہ بعد میں آنے والے لوگ اس حدیث کو باحوالہ کردیں، اس خالی جگہ کو" بیاض" کہا جاتا ہے، بعد میں بہت سے علماء اور شراح نے بہت سی بیاضوں کو پُر کیا ہے لیکن ابھی بھی کچھ بیاضیں خالی ہیں۔

(۴) تبدیلِ عنوان: صاحبِ مشکوۃ نے "الصحاح" کی جگہ الفصل الاول اور" الحسان" کی جگہ الفصل الثانی کا عنوان قائم کیا۔

(۵) اضافۂ فصل ثالث: صاحب مشکوۃ نے باب کے مضمون کی مناسبت سے کچھ احادیث کا اضافہ بھی کیا ہے، جن کو وہ فصلِ ثالث کا عنوان قائم کرکے ذکر کرتے ہیں، اس فصل ثالث میں صاحب مشکوۃ صحیحین اور سنن خمسہ کے علاوہ دیگر کتابوں کی احادیث بھی لاتے ہیں، مشکوۃ میں کل کتنی کتابوں کی احادیث ہیں اس کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔

(۶) حدیثِ موقوف ومقطوع: مصابیح السنہ میں بالقصد واصالۃً احادیثِ مرفوعہ ہی بیان کی گئی تھیں جبکہ صاحبِ مشکوۃ فصلِ ثالث میں اصالۃً احادیثِ موقوفہ ومقطوعہ کو بھی ذکر کرتے ہیں۔

(۷) حذفِ تکرار: مصابیح السنہ میں بہت سی روایات مکرر تھیں، صاحب مشکوۃ نے اس تکرار کو ختم کیا اور روایت کو صرف کسی ایک جگہ درج فرمایا۔

(۸) اختصارِ حدیث: امام بغوی نے مصابیح السنۃ میں بعض احادیث کو بہت طوالت کے ساتھ ذکر کیا حالانکہ باب اور ترجمہ کی وضاحت کے لئے اس کا بعض حصہ بھی کافی ہوسکتا تھا، ایسے مواقع پر صاحبِ مشکوۃ نے حدیث کے اس حصہ کو جو باب کے مناسب نہیں تھا حذف کرکے حدیث کو مختصر کردیا۔

(۹) تکمیلِ حدیث: امام بغوی نے بعض احادیث کو مختصراً ذکر کیا تھا حالانکہ حدیث کا بقیہ حصہ بھی باب اور ترجمہ کے مناسب تھا اور اس حصہ کے بغیر حدیث کے سمجھنے میں خلل واقع ہوتا تھا، نیز وہ بقیہ حصہ موقع کے لحاظ سے کثیر الفوائد بھی تھا، صاحبِ مشکوۃ نے ایسے مقامات پر حدیث کا بقیہ حصہ بھی ذکر کرکے حدیث کو مکمل فرمادیا۔

(۱۰) تبدیلِ حوالہ: بعض جگہ صاحب مشکوۃ مقررہ اصطلاح کے خلاف فصلِ اول میں سنن کا حوالہ دیتے

ہیں، ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ حدیث ان کو صحیحین میں نہ ملے، اور فصلِ ثانی میں بعض مرتبہ صحیحین کا حوالہ دیتے ہیں، یہ اس وقت کرتے ہیں جب کہ وہ روایت ان کو صحیحین میں مل جائے۔

(۱۱) اختلافِ متن : بعض مرتبہ صاحبِ مشکوٰۃ، مصابیح میں مذکور متنِ حدیث میں تغیر کرتے ہیں، یہ اس موقع پر کرتے ہیں جب کہ اصولِ سبعہ میں ان کو وہ حدیث ان الفاظ کے علاوہ سے ملتی ہے جن الفاظ کے ساتھ امام بغوی نے ذکر کی ہے، اور ایسے موقع پر ''وجدت خلاف هذه الرواية في الأصول'' کہہ کر تنبیہ بھی فرما دیتے ہیں۔

(۱۲) عدمِ وجدان فی کتب الاصول: بعض مرتبہ صاحب مشکوۃ کو کوئی روایت کتب اصول میں نہیں ملتی، تو مصنف کتب اصول کے بجائے جہاں سے وہ حدیث ملتی ہے اس کا حوالہ دیتے ہیں اور یوں کہتے ہیں: ''ماوجدت هذه الرواية في كتب الأصول''

(۱۳) بیان ضعف ونکارت: صاحب مشکوۃ بعض جگہ حدیث کے ضعف ونکارت کو بھی بیان کرتے ہیں اور علت کی بھی نشان دہی فرماتے ہیں۔

(۳) روایات اور کتب وابواب کی تعداد

مصابیح السنہ کی کل روایات چاہزار چارسو چونتیس (۴۴۳۴) ہیں، ان میں دوہزار چارسو چونتیس (۲۴۳۴) صحاح کی اور دوہزار (۲۰۰۰) حسان کی احادیث ہیں، اور مشکوۃ میں علامہ خطیب تبریزی نے فصل ثالث کے عنوان سے پندرہ سوگیارہ (۱۵۱۱) احادیث کا اضافہ کیا ہے، اس طرح مشکوۃ شریف میں کل احادیث کی تعداد پانچ ہزار نوسو پینتالیس (۵۹۴۵) ہے اور مشکوۃ میں لفظ ''کتاب'' کا عنوان انتیس (۲۹) مقامات پر ہے اور ان کتابوں کے تحت تین سو ستائیس (۳۲۷) ابواب ہیں، اور ابواب کے تحت درج فصلوں کی تعداد دس سواڑتیس (۱۰۳۸) ہے۔

(۴) مرتبۂ کتاب

اس کے لئے پہلے انواع کتب حدیث کو سمجھنا ہوگا، حضرات محدثین کے یہاں حدیث کی کتابیں لکھنے کے مختلف اسالیب اور انداز ہیں، اس لحاظ سے کتب حدیث کی مختلف انواع ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

انواعِ کتبِ حدیث:

(۱) **الجامع**: حدیث کی وہ کتاب جو حدیث کے آٹھوں مضامین پر مشتمل ہو۔

(۲) **السنن**: وہ کتاب جس میں احادیث احکام ابواب فقہیہ کی ترتیب پر مذکور ہوں جیسے سنن ترمذی۔

(۳) **المسند**: حدیث کی وہ کتاب جس میں احادیث کو علی ترتیب اسماء الصحابہ بیان کیا جائے۔

(۴) **المستدرک**: وہ کتاب جو دوسری کتاب سامنے رکھ کر لکھی جائے اور اس میں وہ حدیث ذکر کی جائے جو اس دوسری کتاب میں ہونی چاہئے کہ وہ اس کی شرائط کے مطابق ہے، مثلاً بخاری کا مستدرک لکھنا ہو، تو بخاری کی شرائط کو سامنے رکھیں اور وہ احادیث جو شرط بخاری پر ہوں مگر بخاری میں نہ ہوں ان کو جمع کیا جائے، جیسے ''مستدرک حاکم'' یہ صحیحین کا استدراک ہے۔

(۵) **مشیخة**: وہ کتاب جس میں احادیث کو علی ترتیب اسماء الشیوخ لکھا جائے۔

(۶) **المعجم**: وہ کتاب جس میں رواۃ حدیث کو، یا شیوخ مصنف کو حروف ہجاء کی ترتیب پر مرتب کرکے، ہر ایک کے ترجمہ کے تحت ان کی احادیث ذکر کی گئی ہوں، جیسے امام طبرانی کی معاجم۔

(۷) **الأربعون**: وہ کتاب جس میں چالیس احادیث مذکور ہوں خواہ کسی بھی مضمون کی ہوں، اس کو اردو میں ''چہل حدیث'' کہا جاتا ہے۔

(۸) **تعالیق**: وہ کتاب جس میں احادیث کے صرف متون کو لکھا جائے اور سندوں کو حذف کردیا جائے، مثلاً امام بغوی کی مصابیح السنۃ۔

(۹) **المسلسلات**: وہ کتاب جس میں احادیثِ مسلسلہ ہوں، اور مسلسل وہ حدیث ہے جس میں رواۃ کسی خاص وصف میں از اول تا آخر مشترک ہوں۔

(۱۰) **الجزء**: وہ کتاب جس میں کسی ایک مسئلہ سے متعلق احادیث کو جمع کیا گیا ہو جیسے حضرت شیخ زکریاؒ کی ''جزء حجۃ الوداع'' اور امام بخاری کی ''جزء رفع الیدین'' وغیرہ[1]۔

کتبِ حدیث کی ایک اور تقسیم:

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے ''عجالۂ نافعہ'' کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے، جس میں

(۱) ان اصطلاحات کے لئے مقدمہ'' لامع الدراری'' اور محمد ابو اللیث الخیر آبادی کی'' تخریج الحدیث نشأته ومنهجيته'' کی مراجعت فرمائیں۔

حضرت شاہ صاحب نے احادیث کے قابل استدلال وغیر قابل استدلال اور صحت وضعف کے اعتبار سے کتبِ حدیث کی چار قسمیں بیان فرمائی ہیں:

(۱) وہ کتاب جس کی تمام احادیث صحیح ہوں مثلاً بخاری، مسلم، موطا امام مالک، صحیح ابن خزیمہ وغیرہ۔

(۲) وہ کتاب جس کی تمام روایات گو صحیح نہ ہوں، البتہ اس کی تمام روایات قابل استدلال اور صالح للأخذ ہوں جیسے ترمذی، ابوداؤد، نسائی، طحاوی۔

(۳) وہ کتاب جس میں قابل استدلال اور غیر قابل استدلال دونوں طرح کی احادیث ہوں جیسے ابن ماجہ، مصنّف عبدالرزاق وغیرہ۔

(۴) وہ کتاب جس کی تمام احادیث پر ضعف اور نکارت کا حکم ہو جیسے مسند فردوس۔

مذکورہ بالا انواع کے لحاظ سے ''مشکوٰۃ المصابیح'' ''سنن'' میں شمار ہے کہ اس کی ترتیب فقہی ہے، اور ''التعالیق'' میں بھی داخل ہے کہ اس میں حدیث کی اسانید مذکور نہیں ہیں، نیز شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی تقسیم کے لحاظ سے دوسرے درجہ کی کتب میں شمار ہے جس کی تمام روایات قابل استدلال واحتجاج ہیں۔

(۵) خصائص مشکوۃ

ہر مصنف کا ذوق تصنیف جدا ہوتا ہے، اس کی کتاب اس کا مظہر ہوتی ہے، اسی وجہ سے ایک موضوع پر تحریر کی جانے والی کتابیں بھی الگ الگ افادیت کی حامل ہوتی ہیں، ''لایغنی کتاب عن کتاب'' جو جملہ مشہور ہے وہ اسی پس منظر میں کہا گیا ہے، حدیث کی مشہور چھ کتابیں جو ''صحاح ستہ'' کے نام سے معروف ہیں ان میں درج احادیث تقریباً یکساں ہیں مگر ان کے مصنفین کے ذوق کے اختلاف کے سبب ہر کتاب کی شانِ افادیت دوسرے سے ممتاز ہے۔

پیش نظر کتاب ''مشکوۃ المصابیح'' جو احادیث رسول کا ایک گلدستہ ہے اس کی بھی کچھ منفرد خصوصیات ذیل میں بیان کی جاتی ہیں:

(۱) اس کتاب میں متعدد معروف کتب حدیث سے جن کا بیان پہلے آچکا ہے احادیث کا انتخاب کرکے ان کو ایک خاص ترتیب سے جمع کیا گیا ہے، اس طرح یہ ایک کتاب کئی کتابوں کے قائم مقام اور ''دریا بکوزہ'' کا مصداق ہوگئی ہے۔

(۲)اس کتاب میں احادیث کے ذکر وبیان کی ترتیب نہایت متوازن اور چوکس ہے، بعض اہل نظر کا کہنا ہے کہ اس میں جو حدیث جہاں درج ہے اگر اس کو وہاں سے ہٹا دیا جائے تو پوری کتاب میں کہیں اوراس کو اندراج کی جگہ نہ مل سکے گی۔

(۳)اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں متعلقہ موضوع کے بارے میں وارد مختلف ومتنوع احادیث کو یکجا کر دیا گیا ہے، جس سے اس موضوع کے بارے میں کامل بصیرت حاصل ہوجاتی ہے، اورشریعت کا مجموعی مزاج بھی سامنے آجاتا ہے چنانچہ بعض اہل نظر کا کہنا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی بے نظیر کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا ماخذ یہی ''مشکوۃ المصابیح'' ہے، اس کے ابواب کی احادیث کے مجموعے کو پیش نظر رکھ کر شاہ صاحبؒ نے شریعت کے مزاج ومنشاء اوراحکام شریعت کے اسرارورموز کو واضح فرمایا ہے۔

(۴)اس کتاب میں دین وشریعت کے تمام موضوعات اورمضامین کے استقصاء کی کوشش کی گئی ہے، جیسا کہ اس میں مذکور کتب وابواب کی فہرست سے واضح ہے۔

(۵)یہ کتاب اطناب ممل اورایجاز مخل ہردو سے پاک اورتوسط واعتدال کا عمدہ نمونہ ہے، جس کی وجہ سے تمام علمی حلقوں میں اس کو پذیرائی حاصل رہی ہے۔

(۶)اس کتاب میں مذکوراحادیث سہل الحصول ہیں، ان کو یاد کرنا اورسمجھنا دشوار نہیں، اس لئے بہت سے افراد واشخاص اس کے حافظ بھی گزرے ہیں اوربہت سے دینی گھرانوں میں عورتوں کو بھی اس کے پڑھانے کا معمول رہا ہے۔

(۷)مصنفؒ نے یہ کتاب اس نقطۂ نظر سے ترتیب دی ہے کہ حدیث کے ابتدائی طالب علم کے لئے دیگر کتب حدیث سے استفادہ کے لئے زینہ بن سکے اوراس کے سامنے احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اجمالی خاکہ وتعارف آجائے، مصنفؒ کے اس خیال کو اللہ تعالیٰ نے ایسا حقیقت میں مبدل فرمایا کہ تمام دینی مدارس وجامعات میں یہ کتاب اسی نقطۂ نظر سے داخل نصاب ہے اوراس کو موقوف علیہ کا درجہ حاصل ہے، اس کے بعد ہی دیگر کتب حدیث پڑھائی جاتی ہیں۔

(۸)اس کتاب کو اس نقطۂ نظر سے بھی ترتیب دیا گیا کہ عام مسلمان دین وشریعت سے قریب ہوں اوران کی عملی زندگی کا رخ صحیح ہو، چنانچہ اس لحاظ سے بھی یہ کتاب انتہائی مفید ہے،اسی لئے صوفیاء کرام کے یہاں خانقاہوں میں اس کا باضابطہ درس ہوتا تھا اوراس کی روشنی میں سالکین کو سلوک کے مدارج

طے کرائے جاتے تھے، اور جس وقت انگریزوں سے جہاد ہو رہا تھا سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ مجاہدین کی جماعتوں اور حلقوں میں اس کا درس دیا کرتے تھے، جس سے ان کے اعمال واخلاق کی تہذیب کے ساتھ ان میں جذبۂ جہاد کی تحریک وتحریض بھی ہوتی۔

(٦) مأخذ مشکوٰۃ

یہ کتاب مصنفؒ نے ''مصابیح السنۃ'' کو پیش نظر رکھ کر مرتب کی ہے، اس لحاظ سے اس کتاب کا اصل ماخذ یہی کتاب ہے، مگر صاحب مصابیح نے احادیث کے مأخذ وحوالجات ذکر نہیں فرمائے، مصنفؒ نے تتبع وتلاش کر کے ان احادیث کے مأخذ ومصادر کو اس کتاب میں درج فرمایا، اس کے علاوہ ''فصل ثالث'' میں درج تمام احادیث مصنفؒ کا ہی اضافہ ہیں، اس طرح اس کتاب میں جن کتابوں کی مرویات جمع کی گئی ہیں اور ان مرویات کی اسنادی حیثیت کی وضاحت کے لئے جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے ہماری ناقص تتبع کے مطابق ان کی مجموعی تعداد (۴۲) کو پہنچ جاتی ہے، ان میں سے بیشتر کتابیں وہ ہیں جن کی مرویات اور احادیث اس کتاب میں ذکر کی گئی ہیں، پھر ان میں سے کچھ مصادر اصلیہ ہیں اور کچھ مصادر غیر اصلیہ، اور بعض کتابیں وہ ہیں کہ ان کے حوالہ سے صرف احادیث کی اسنادی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔

مصنفؒ نے خطبۂ کتاب میں ان میں سے کچھ مشہور مؤلفین ومحدثین کے اسماء ذکر کئے ہیں، ذیل میں اس کتاب کے تمام مأخذ ومصادر اور ان کے مؤلفین کے اسماء ذکر کئے جاتے ہیں:

<u>مصادر اصلیہ:</u>

(۱) ''صحیح بخاری''، اس کا پورا نام ''الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول الله صلى الله عليه وسلم وسننه وايامه'' ہے، اور اس کے جامع ومؤلف: امیر المؤمنین فی الحدیث ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ الجعفی البخاری (متوفی: ۲۵٦ھ) ہیں۔

(۲) ''صحیح مسلم'' اس کا اصل نام ''المسند الصحيح المختصر من السنن بنقل العدل عن العدل عن رسول الله صلى الله عليه وسلم'' ہے، اس کے جامع ومؤلف: ابوالحسن عساکر الدین مسلم بن الحجاج القشیری النیساپوری (متوفی ۲٦۱ھ) ہیں۔(۱)

(۱) انظر: تحقيق اسمى الصحيحين للشيخ عبدالفتاح ابوغده.

یہ دونوں کتابیں ''صحیحین'' کے نام سے معروف ہیں۔

(۳) ''سنن ابی داؤد'' اس کا اصل نام ''کتاب السنن'' ہے اور اس کے مؤلف وجامع: ابوداود سلیمان بن اشعث بن اسحاق الازدی السجستانی (متوفی ۲۷۵ھ) ہیں۔

(۴) ''سنن ترمذی'' اس کا پورا نام ''الجامع المختصر من السنن عن رسول الله صلی الله علیه وسلم ومعرفة الصحیح والمعلول وماعلیه العمل'' ہے، اوراس کے جامع ومؤلف: ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن موسیٰ بن ضحاک السلمی الترمذی البوغی (متوفی ۲۷۹ھ) ہیں۔

(۵) ''سنن نسائی'' اس کا اصل نام ''المجتبی من السنن الکبری'' ہے، ابوعبدالرحمٰن احمد بن علی بن شعیب (متوفی ۳۰۳ھ) اس کے مؤلف وجامع ہیں۔

(۶) ''سنن المصطفی لابن ماجه'' یہ ''سنن ابن ماجه'' کے نام سے معروف ہے، جوابوعبداللہ محمد بن یزید بن عبداللہ الربعی القزوینی (متوفی ۲۷۳ھ) المعروف بابن ماجہ کی تالیف وتصنیف ہے۔

یہ چاروں کتابیں ''سنن اربعہ'' کے نام سے مشہور ہیں، نیز ان مذکورہ چھ کتابوں کو ''صحاح ستہ'' کہا جاتا ہے، جو تغلیبی نام ہے۔

(۷) ''مؤطاامام مالک'' یہ مشہور امام مجتہد: ابوعبداللہ امام دارالہجرۃ مالک بن انس الاصبحی المدنی (متوفی ۱۷۹ھ) کی تالیف ہے اوراسی نام سے معروف ہے۔

(۸) ''سنن دارمی'' اس کو ''مسند دارمی'' بھی کہاجاتا ہے، یہ ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن الفضل بن بہرام بن عبدالصمد الدارمی السمرقندی (متوفی ۲۵۵ھ) کی تالیف ہے۔

(۹) ''مسند احمد'' یہ ابوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل بن ہلال بن اسد الشیبانی (متوفی ۲۴۱ھ) کی تالیف ہے، جومشہور امام ہیں۔

(۱۰) ''السنن الکبری''

(۱۱) ''شعب الایمان''

(۱۲) ''دلائل النبوة''

(۱۳) ''المدخل الی علم السنن''

(۱۴) ''کتاب البعث والنشور''

(۱۵)''الدعوات الکبیر''

یہ چھ کتابیں: ابوبکر احمد بن الحسین بن علی بن موسی الخراسانی (متوفی ۴۵۸ھ) المعروف بالإمام البیہقی کی تالیف ہیں۔

(۱۶)''سنن دارقطنی ''اس کا اصل نام''کتاب السنن ''ہے، جو ابوالحسن علی بن عمر بن احمد البغدادی الدارقطنی (متوفی ۳۸۵ھ) کی تالیف ہے۔

(۱۷)''صحیح ابن خزیمه ''اس کا اصل نام''مختصر المختصر من المسند الصحیح عن النبی صلی اللہ علیه وسلم ''ہے، جو ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمۃ السلمی النیسابوری (متوفی ۳۱۱ھ) کی تالیف ہے۔

(۱۹)''سنن سعید بن منصور ''یہ ابوعثمان سعید بن منصور بن شعبہ الخراسانی الجوزجانی (متوفی ۲۲۷ھ) کی تالیف ہے اوراسی نام سے معروف ہے۔

(۲۰)''المجتبی ''اس کا پورانام''المجتبی عن السنن الماثورة''ہے اور یہ امام دارقطنی کی تالیف ہے، جن کا تذکرہ اوپرآ چکا ہے، یہ ان کی ''کتاب السنن'' کے علاوہ دوسری تصنیف ہے۔

(۲۱)''شرح السنة'' یہ محی السنۃ ابومحمد حسین بن مسعود بن محمد ابن البغوی (متوفی ۵۱۶ھ) کی تالیف ہے، اس کتاب میں مؤلفؒ نے اپنی اسانید سے روایات نقل کرکے ان کی شرح فرمائی ہے، اس لحاظ سے یہ بڑی اہم کتاب ہے،''مصابیح السنة'' کے مؤلف بھی یہی بزرگ ہیں۔

(۲۲)''مسند الامام الشافعی '' یہ ان روایات کا مجموعہ ہے جو امام شافعیؒ سے مروی ہیں، ان کی مختلف کتابوں سے جمع کرکے اس''مسند''میں ان کو درج کیا گیا ہے، صاحب مشکوۃ نے امام شافعیؒ کے حوالہ سے جو روایات نقل کی ہیں عموماً وہ اس میں موجود ہیں۔

(۲۳)''عمل الیوم واللیلة'' یہ امام نسائی کی تالیف ہے، جن کا تذکرہ اوپرآ چکا ہے۔

(۲۴)''حلیة الاولیاء وطبقات الاصفیاء '' یہ ابونعیم احمد بن عبداللہ الاصبہانی (متوفی ۴۳۰ھ) کی تالیف ہے اوراسی نام سے معروف ہے۔

(۲۶)''التاریخ الکبیر '' یہ امام بخاریؒ کی تالیف ہے۔

(۲۷)''الاستیعاب لابن عبدالبر ''اس کا اصل نام''الاستیعاب فی معرفة الاصحاب''

ہے، جوابوعمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر النمر ی القرطبی (متوفی ۴۶۳ھ) کی تالیف ہے، جس میں انہوں نے صحابہ کرام کے احوال وآ ثار جمع فرمائے ہیں اوراپنی سند سے جابجاان کی احادیث بھی ذکر کی ہیں۔

مصادر غیر اصلیہ:

(۲۸) ''**التجرید للصحاح الستة**'' یہ ابوالحسن امام الحرمین رزین بن معاویہ العبدری السَّرقُسْطی الاندلسی (متوفی ۵۳۵ھ) کی تالیف ہے، جس میں انہوں نے صحاح ثلاثہ (بخاری، مسلم، مؤطا امام مالک) اورسنن ثلاثہ (سنن ابی داؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی) کی روایات کو حذفِ اسانید کے ساتھ جمع کیا ہے، ''رواہ رزین'' سے یہی کتاب مراد ہوتی ہے۔

(۲۹) ''**جامع الاصول فی احادیث الرسول**'' یہ مجدالدین ابوالسعادات مبارک بن محمد الشیبانی الجزری المعروف بابن الاثیر (متوفی ۶۰۶ھ) کی تالیف ہے، جودراصل رزین بن معاویہؒ کی مذکورہ کتاب التجرید للصحاح کی مزید تہذیب وتکمیل ہے۔

(۳۰) ''**الجمع بین الصحیحین**'' یہ ابوعبداللہ محمد بن ابی نصرفتوح بن عبداللہ بن فتوح بن حمید الازدی الحمیدی الاندلسی القرطبی (متوفی ۴۸۸ھ) کی تالیف ہے، جس میں انہوں نے صحیح بخاری اورصحیح مسلم کی روایات کوجمع کیا ہے۔

(۳۱) ''**کتاب الأذکار للنووی**'' اس کتاب کا پورانام ''**حلیة الأبرار وشعار الأخیار فی تلخیص الدعوات والأذکار المستحبة فی اللیل والنهار**'' ہے، جوشارح مسلم محی الدین ابوزکریا یحی بن شرف بن مری الدمشقی الشافعی (متوفی ۶۷۶ھ) کی تالیف ہے۔

(۳۲) ''**المنتقی**'' اس کا پورانام ''**المنتقی من الاخبار فی احادیث الأحکام**'' ہے، یہ علامہ ابن تیمیہؒ کے دادا ابوالبرکات مجدالدین عبدالسلام بن عبداللہ بن خضر بن محمد بن تیمیہ الحرانی (متوفی ۶۵۲ھ) کی تالیف ہے، جو''مجدابن تیمیہ''اور''ابن تیمیہ الاکبر'' بھی کہے جاتے ہیں، اس کتاب میں انہوں نے صحیحین، سنن اربعہ اورمسند احمد کی احادیث کوجمع کیا ہے۔

(۳۳) ''**کتاب الوفاء لابن الجوزی**'' اس کا اصل نام ''**الوفاء فی فضائل المصطفی**'' ہے، جوابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن محمد الجوزی القرشی البغدادی (متوفی ۵۹۷ھ) کی تالیف ہے۔

(۳۴)''ریاض الصالحین'' اس کتاب کا پورا نام ''ریاض الصالحین من کلام سیدالمرسلین'' ہے، جوشارح مسلم امام نوویؒ کی تصنیف ہے۔

وہ مأخذ جن سے احادیث کی اسنادی حیثیت کی وضاحت کے لئے استفادہ کیا گیا:

(۳۵)''الأربعون للنووية'' یہ شارح مسلم امام نووی کی تالیف ہے، جس میں انہوں نے چہل حدیث جمع کی ہیں۔

(۳۶)''شرح مسلم للإمام النووی'' اس کا اصل نام ''المنهاج فی شرح صحیح مسلم ابن الحجاج'' ہے

(۳۷)''معالم السنن'' یہ ابوسلیمان احمد بن محمد الخطابی البستی (متوفی ۳۸۸ھ) کی تصنیف کردہ سنن ابوداوٗد کی شرح ہے، اکثر وبیشتر اس کے حوالہ سے مصنفؒ نے احادیث کی اسنادی حیثیت کو واضح کیا ہے اور بسااوقات روایت بھی اس کی جانب منسوب کی ہے۔

کچھ اور مأخذ:

(۳۸)''کتاب الزهد الكبير'' یہ امام بیہقی کی تالیف ہے۔

(۳۹)''المستدرک علی الصحیحین'' یہ ابوعبداللہ الحاکم (متوفی ۴۰۵ھ) کی تالیف ہے، جس میں انہوں نے وہ روایات جمع کی ہیں جو صحیحین کی شرط کے مطابق ہونے کے باوجود صحیحین میں مذکور نہیں۔

(۴۰)''مسند ابی داود الطیالسی'' یہ ابوداؤدسلیمان بن داؤد بن الجارودالطیالسی البصری (متوفی ۲۰۴ھ) کی تالیف ہے۔

یہ تینوں کتابیں وہ ہیں جن کے حوالہ سے مصنفؒ نے کوئی حدیث اس کتاب میں نقل نہیں فرمائی، لیکن ان احادیث میں سے جن کے آگے مصنفؒ نے بیاض چھوڑ دیا ہے کچھ احادیث ان کتابوں میں مذکور ہیں، اس لحاظ سے ان کتابوں کو بھی اس کے مأخذ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

(۴۱)''الصحیح للإسماعیلی'' یہ ابوبکراحمد بن ابراہیم بن اسماعیل المعروف بابی بکر الاسماعیل (متوفی ۳۷۱ھ) کی تالیف ہے، امام حمیدیؒ کے حوالہ سے اس کتاب سے بھی مصنفؒ نے روایت نقل کی ہے۔

(۴۲)''مسائل حرب الکرمانی'' یہ ابومحمد حرب بن اسماعیل بن خلف الکرمانی (متوفی ۲۸۸ھ) کے ان مسائل ومرویات کا مجموعہ ہے، جوانہوں نے امام احمد بن حنبلؒ اورامام اسحاق بن راہویہؒ سے سماعت کئے ہیں، مصنفؒ نے محمد ابن تیمیہؒ کی ''المنتقی'' کے حوالہ سے اس سے بھی روایت نقل فرمائی ہے۔

(۷)شروح مشکوٰۃ

اللہ تعالیٰ شانہ نے اس کتاب کوقبولیت عامہ سےنوازاہے، ہرزمانہ میں یہ کتاب علماء کی توجہ کا مرکز رہی ہے اورسارے عالم میں اس کے تعلیم وتعلم اوردرس وتدریس کا سلسلہ برابرجاری ہے، اسی لئے اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں،ان میں سے بہت سی نایاب ہیں اور بہت سی موجود ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱)''الکاشف عن حقائق السنن ''جو''طیبی'' کے نام سے مشہورہے، یہ شرح عرصہ سے نایاب تھی، اب بہت سی جگہوں سے چھپی ہے، جومؤلف کتاب علامہ تبریزی کے استاذ علامہ شرف الدین طیبیؒ [1] کی تحریرکردہ ہے، درسِ نظامی میں صرف دوکتابیں ایسی ہیں کہ استاذ نے اپنے شاگرد کی کتاب کی شرح لکھی: مشکوۃ شریف،اوردوسرے کنزالدقائق کہ اس کی شرح علامہ زیلعی نے''تبیین الحقائق'' کے نام سے تحریرفرمائی، جوصاحبِ کنزعلامہ نسفیؒ کے استاذ ہیں۔

(۲)مرقاۃالمفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح: یہ نورالدین ابوالحسن علی بن سلطان المعروف بملاعلی قاری (متوفی ۱۰۱۴ھ) کی تصنیف ہےاورحل مشکوۃ کے لئے سب سے بہترشرح ہے۔

(۳)لمعات التنقیح: شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (متوفی ۱۰۵۲ھ) کی شرح ہےاورعربی زبان میں ہے۔

(۴)اشعۃ اللمعات: یہ بھی شیخ عبدالحق بن سیف الدین محدث دہلویؒ کی شرح ہےاوراس کی زبان فارسی ہے۔

(۵)التعلیق الصبیح: حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلویؒ کی تحریرکردہ شرح ہے۔

(۶)مظاہرحق قدیم: علامہ نواب قطب الدین بن محی الدین شاہ جہاں آبادی(متوفی ۱۲۸۹ھ) کی ہے، یہ مشکوۃ کا ترجمہ ہے،جس کوحضرت شاہ اسحاق مہاجر مکیؒ نے لکھا تھا، انکے شاگردنواب صاحب نے اس پرکچھ اضافہ کیا اوریہ انہی کی طرف منسوب ہوا،اس کی اردوجب پرانی ہوگئی تو اس کو جدید اردومیں منتقل کیا گیاجس کا نام''مظاہرحق جدید'' رکھا گیا، یہ سب شروحات شائع اوردستیاب ہیں۔

(۱)هو الشيخ الحسين بن محمد بن عبدالله الطيبي المتوفى ٧٤٣ﻫ.

(٨) حالات صاحبِ مصابیح وصاحب مشکوٰۃ

صاحب مصابیح: - آپ کا نام حسین بن مسعود الفراء البغوی ہے، کنیت ابو محمد، لقب رکن الدین اور محی السنہ ہے اور نسبت بغوی ہے، آپ محی السنہ اور بغوی سے زیادہ مشہور ہیں، الفراء آپ کے والد ماجد کی صفت ہے، یہ فَرْوٌ بمعنی پوستین یعنی چمڑا سے ماخوذ ہے، آپ کے والد پوستین فروش یا پوستین دوز تھے، یہ فراء نحوی کے علاوہ ہیں، بغوی نسبت ہے بغ کی طرف اور یہ بغشور کا مخفف ہے اور معرب ہے باغ پور کا، جو خراسان کے شہروں میں سے ایک شہر تھا، یہ مرکب امتزاجی وبنائی ہے، مرکب امتزاجی میں کبھی جز واول کی طرف نسبت کی جاتی ہے، اس لئے بغوی ہوا، ورنہ بغشوری ہونا چاہئے تھا، جیسے معدیکرب کے رہنے والے کو معدی کہاجاتا ہے، بعلبک کے رہنے والے کو بعلی کہاجاتا ہے، سوال یہ ہوتا ہے کہ بغ کی طرف نسبت ہے توبغی ہونا چاہئے تھا واو کہاں سے آیا؟ بعض حضرات نے کہا کہ یہ واوَزائد ہے، بعض نے کہا کہ بغی بمعنی زانیہ سے امتیاز کے لئے واو زائد کیا گیا ہے۔

آپ نے ''مصابیح السنہ'' سے پہلے علم حدیث میں ''شرح السنہ'' لکھی اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی، اور آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے خوش ہوکر فرمایا ''أحیاک الله کما أحییتَ سنتی'' اسوقت سے آپ کا لقب محی السنہ ہوا، اس کے بعد آپ نے ''مصابیح السنہ'' لکھی۔

۴۳۵ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، بڑے بڑے محدثین وفقہاء سے علم حاصل کیا، فقہ میں آپ کے مشہور استاذ قاضی حسین بن محمد ہیں، اور حدیث میں یعقوب بن محمد الصیرفی اور ابوالحسن داود بن علی الجوہری ہیں، آپ مذہباً شافعی تھے، آپ انتہائی جلیل القدر عالمِ دین، فنِ قراءت کے ماہر، مفسر، محدث، عابد، زاہد اور سادہ مزاج بزرگ تھے، قائم اللیل وصائم النہار تھے، بغیر سالن کے روٹی کھایا کرتے تھے، اخیر میں روٹی کے ساتھ روغن زیتون استعمال کرنے لگے تھے، مصابیح السنہ کے علاوہ تفسیر میں ''معالم التنزیل'' حدیث میں **الجمع بین الصحیحین** اور فقہ میں فتاوی بغوی وغیرہ آپ کی یادگار ہیں، اللہ نے آپکو اصابتِ رائے سے نوازا تھا، اسّی سال کی عمر میں ۵۱۶ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (۱)

(۱) انظر ترجمته في سير أعلام النبلاء ۱۹/ ۴۳۹ وتذكرة الحفاظ ۴/ ۱۲۵۷-۱۲۵۹.

صاحب مشکوۃ:- آپ کا نام محمد، کنیت ابوعبداللہ، والد کا نام عبداللہ، لیکن آپ نے ''اکمال'' میں اپنے والد کا نام عبیداللہ لکھا ہے اور یہی صحیح ہے، الخطیب ،العمری، التبریزی، لقب ولی الدین ہے، خطیب تبریزی سے مشہور ہیں، آپ تبریز کی جامع مسجد میں مدت تک خطیب رہے، اس لئے ''خطیب تبریزی'' کہلاتے ہیں، اور عمری اس لئے کہ آپ عمر بن عبدالعزیزؒ کی اولاد سے ہیں، آپ آٹھویں صدی ہجری کے علماء ومشائخ میں سے ہیں، آپ نے اپنے استاذ علامہ طیبی کے مشورہ سے مشکوۃ المصابیح لکھنا شروع کی اور ۷۳۷ھ میں رمضان المبارک کے اخیر جمعہ کو اس سے فراغت پائی، پھر مشکوٰۃ المصابیح میں جن راویوں کے نام آئے ان کے حالات کے سلسلہ میں ایک رسالہ لکھا جس سے ۷۴۰ھ میں فارغ ہوئے، جو''الکمال فی اسماء الرجال'' کے نام سے مشکوۃ المصابیح کے اخیر میں ملحق ہے۔

۷۴۳ھ میں وفات ہوئی، بعض نے سن وفات ۷۴۱ھ اور بعض نے ۷۴۸ھ لکھا ہے، مشکوۃ شریف جتنی مشہور ہے اتنے ہی آپ کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔(۱)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ، نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّآتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلا مُضِلَّ لَہٗ، وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلاھَادِیَ لَہٗ.

ترجمہ : تمام تعریفیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لئے ہیں، ہم اسی کی تعریف کرتے ہیں، اور اسی سے مدد ومغفرت کے طلبگار ہیں، اور ہم اپنے نفس کی برائیوں اور اپنی بداعمالیوں سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ جس کو ہدایت عطا فرمائے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں ہے، اور جس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ گمراہی میں چھوڑ دے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔

تشریح عبارت

بسملہ وحمدلہ اوراس سے کتاب کے آغاز کی وجوہات:

مصنفؒ نے بسملہ اور حمدلہ سے اپنی کتاب کوشروع فرمایا اس کی کئی وجہیں ہیں:

(۱)انظر :ترجمۃ فی الأعلام للزرکلي ۶/ ۲۳۶.

(۱)اقتداءً بکتاب اللہ تعالیٰ کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے بھی اپنی کتاب کو بسملہ وحمدلہ سے شروع فرمایا ہے۔

(۲)عملاً بالحدیث یعنی حدیث پر عمل کرنا بھی مقصود ہے، بسملہ سے ابتداء کے بارے میں بھی حدیث وارد ہوئی ہے ''كُلُّ أمرٍ ذي بالٍ لا يُبدأُ فيه ببسم الله الرحمن الرحيم أقطع''[1] اور حمد سے متعلق بھی حدیث ہے ''كل كلام لا يبدأُ فيه بحمدالله فهو أجزمُ''[2] ان پر عمل کرنے کے لئے کتاب کا آغاز کیا گیا ہے۔

ایک مشہور اشکال وجواب:

اس پر مشہور اشکال ہوتا ہے کہ ایک حدیث میں بسملہ سے شروع کرنے کا حکم دیا اور دوسری میں حمدلہ سے شروع کرنے کا حکم ہے، حالانکہ ابتداء تو کسی ایک چیز سے ہوسکتی ہے، معاً دو چیزوں سے ابتداء محال ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں حدیثوں کا مقصود ابتداء بالذکر ہے، اور ذکر میں بسملہ وحمدلہ دونوں داخل ہیں، لہٰذا دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے، چنانچہ مسند احمد اور دارقطنی کی ایک روایت میں ذکر اللہ کے الفاظ ہی آئے ہیں ''كل أمر ذي بال لم يبدأ بذكر الله أقطع''[3]

(۳)اتباع سلف صالحین کہ وہ اپنی کتابوں کو بسملہ وحمدلہ سے ہی شروع فرماتے تھے۔

تکرار حمد کی وجوہات:

الحمدلله نحمده الخ :-حمد کے لئے مصنفؒ دو جملے لائے ہیں الحمدلله اور نحمده، اول جملہ اسمیہ اور ثانی جملہ فعلیہ ہے، اس تکرار کی متعدد وجہیں حضرات شراح نے بیان فرمائی ہیں:

(۱)اللہ کی حمد اللہ کے انعامات کے مطابق ہونی چاہئے، اللہ کے انعامات بندوں پر بار بار بھی ہوتے رہتے ہیں اور کچھ انعامات ہمیشہ رہتے ہیں، گویا کہ ان میں تجدد بھی ہے اور استمرار بھی، مصنف پہلا جملہ اسمیہ لائے کہ وہ استمرار پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا جملہ فعلیہ لائے جو حدوث وتجدد پر دلالت کرتا ہے، پس حمد انعامات کے مطابق ہوگئی۔

---

(۱)الدر المنثور للسيوطي ۱/ ۲٦ مطبوعه دار الفكر بيروت.

(۲)أخرجه أبو داود: كتاب الأدب، باب الهدي في الكلام ۲/ ٦٦٥ (٤٨٤٠)

(۳)مسند أحمد ۲/ ۳۰۹ (۸٦۹۷)، مطبوعه القاهره، دارقطني ۱/ ۲۳٥ (۸۷۲) مطبوعه دار الإيمان سهارنفور.

(۲) بعض نے کہا کہ الحمدللہ گویا کہ ایک دعوی ہے اور نحمدہ اس کی دلیل ہے کہ ہم اللہ کی حمد بیان کرتے ہیں۔

(۳) بعض حضرات نے کہا کہ پہلے جملہ الحمدللہ میں ازل سے ابدتک تمام حامدین کا تذکرہ ہے، ان حامدین کے زمرہ میں ہم سب بھی داخل ہوجائیں اس لئے اس کے بعد نحمدہ کا جملہ لکھا۔

(۴) بعض نے کہا کہ دوسرا جملہ نحمدہ فرقۂ جبریہ پرردکرنے کے لئے لایا گیاہے، جوانسان کو مجبور محض مانتے ہیں (اس کی تفصیلات آگے آئیں گی) یعنی اللہ نے ہمیں بھی حمد کا اختیار دیاہے، جیسا کہ اس حمدیہ جملہ سے ظاہر ہے۔

پھر نحمدہ میں جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیاہے اس کی دووجہیں ہیں:

(۱) یہ تواضع اوراظہار عجز کے لئے ہے کہ حمد ایسی اہم چیز ہے کہ میں تنہااس پرقادرنہیں ہوں، لہٰذا ہم سب ملکراس کی حمد کرتے ہیں۔

(۲) بعض نے کہا کہ جمع کا صیغہ عام ہے، مقبولین وغیرمقبولین سب کوشامل ہے،پس یہ صیغہ اس لئے لایا گیا تاکہ حمد مقبولین کے ساتھ ہماری حمد بھی شامل ہوجائے اوران کی برکت سے ہماری حمد بھی قبول ہوجائے، کیونکہ مقبولین کی حمد عموماً قبول ہوتی ہے اور اللہ کی رحمت سے یہ بعید ہے کہ مقبولین کی حمد کو قبول فرماویں اورغیرمقبولین کی حمد کورد کردیاجائے۔

ونستعینہ :-ماقبل میں حمد کو بیان کیا جوایک عظیم الشان چیز ہے، اللہ کی مدد کے بغیر بندہ اس کوانجام نہیں دے سکتاہے، اس لئے اس کی ادائیگی میں اللہ سے مدد طلب کی، اس کا مفعول ثانی عام ہے "**ای فی المہمات کلہا**" جس میں حمد بھی داخل ہے۔

ونستغفرہ :-اس سے پہلے جوحمد بیان کی، ظاہر ہے کہ اس میں قصوررہا ہوگا، اللہ کی شایان شان ہماری حمد نہیں ہوسکتی، ہم کیا؟ حضور سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "**اللّٰھم لاأُحصِی ثناءً علیک أنتَ کما أثنیتَ علی نفسِک**" اے اللہ میں تیری ایسی تعریف بیان نہیں کرسکتا جیسا کہ تو نے خود اپنی تعریف کی ہے، پس ادائیگی حمد میں جوقصور رہا "نستغفرہ" کے ذریعہ اس قصور کی معافی چاہی گئی ہے۔

شرورنفس سے پناہ اوراقسام نفس:

ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا:- اللہ کی حمد سے بندہ کواس کانفس روکتاہے، لہٰذا نفس کے شر سے

پناہ طلب کی جارہی ہے۔

نفس تین قسم کا ہوتا ہے: (۱) نفس امارہ، (۲) نفسِ لوامہ، (۳) نفس مطمئنہ، قرآن کریم میں تینوں نفوس کا تذکرہ موجود ہے، ''إن النفسَ لأمّارةٌ بالسوءِ[۱]'' یقیناً نفس تو بہت زیادہ برائی کا حکم دینے والا ہے، اس میں نفس امارہ کا تذکرہ ہے، ''ولاأقسم بالنَّفْس اللَّوَّامة[۲]'' اور قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی، اس میں نفس لوامہ کا تذکرہ ہے، ''یأیتها النفسُ المطمئنةُ ارْجِعِي الى ربِّکِ راضيةً مَّرْضِيَّةً[۳]'' اے اطمینان والے نفس تو اپنے رب کی طرف واپس چل، تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی، اس آیت میں نفس مطمئنہ کا بیان ہے۔

نفس امارہ انسان کو برائی پرآمادہ کرتا ہے اور بھلائی سے روکتا ہے، نفس لوامہ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان جب اللہ کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے تو نفس اپنی برائیوں کو انسان کے سامنے پیش کرتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ برائیاں انسان کو آئینہ میں عکس کی طرح محسوس ومشاہد ہونے لگتی ہیں، اگرانسان پھربھی ان برائیوں سے رک نہیں پاتا ہے تو نفس اس کو ملامت کرتا ہے، اور یہ اچھی صفت ہے، اور نفس مطمئنہ وہ ہے جسے اللہ کے ذکر کے بغیر سکون نصیب نہ ہو، جیسے مچھلی کو پانی کے بغیر چین وقرار نہیں ملتا، اس کو جنت کی بشارت سنائی گئی ہے، ان نفوس ثلثہ میں سے اول یعنی نفس امارہ برا اور مذموم ہے اور لوامہ ومطمئنہ محمود اور مطلوب ہیں۔

نفس تو درحقیقت ایک ہی ہے مگر اس کی صفات وکیفیات میں تغیر ہوتا رہتا ہے، اس لحاظ سے اس کی اقسام متعدد ہوجاتی ہیں۔

سیئات اعمالنا:- جمع ہے ''سیئۃ'' کی، ''**شرور انفسنا**'' سے نفس کی باطنی برائیاں اور ''**سیئات اعمالنا**'' سے ظاہری برائیاں مراد ہیں۔

من یهده الله فلامضل له الخ:- ہدایت کے معنی ہیں نرمی اور شفقت کے ساتھ راہ دکھانا، اس کی دو قسمیں مشہور ہیں ''**إرائة الطريق** او **ايصال إلى المطلوب**[۴]'' یہاں دوسرے معنی مراد ہیں اسی وجہ

---

(۱) یوسف: ۵۳.

(۲) القیامہ: ۲.

(۳) الفجر:

(٤) شرح التهذيب ص ۲.

سے فرمایا ''من يهده الله فلامضل له''

وَأَشْهَدُ اَنْ لَّاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ شَهَادَةً تَكُوْنُ لِلنَّجَاةِ وَسِيْلَةً، وَلِرَفْعِ الدَّرَجَاتِ كَفِيْلَةً، وأَشْهَدُ أَنَّ محمداً عبدُهٗ ورسولُهٗ، الَّذى بَعَثَهٗ وَطُرُقُ الإِيْمَانِ قَدْ عَفَتْ آثَارُهَا، وخَبَتْ أَنـوارُهـا، ووَهَنَتْ أَرْكَانُها، وجُهِلَ مَكَانُها؛ فَشَيَّدَ—صلواتُ اللّٰهِ وَسَلامُهٗ عَلَيْهِ — مِنْ مَعَالِمِهَا مَاعَفَا، وشَفىٰ مِن العَلِيْلِ فِي تَائِيْدِ كَلِمَةِ التَّوْحِيْدِ مَنْ كَانَ عَلىٰ شَفَا، وأوضَحَ سَبِيلَ الهِدَايَةِ لِمَنْ أَرَادَ أن يَّسْلُكَهَا، وَأَظْهَرَ كُنُوْزَ السَّعَادَةِ لِمَنْ قَصَدَأَنْ يَّمْلِكَهَا.

تــرجــمــه:-اور میں گواہی دیتاہوں کہ اللہ عز وجل کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، ایسی گواہی جونجات کے لئے وسیلہ اور درجات کی بلندی کے لئے ضامن ہو، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، جن کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس وقت مبعوث فرمایا جب ایمان کی راہوں کے نشانات مٹ چکے تھے، اور اس کی روشنیاں بجھ چکی تھیں، اور اس کے ستون کمزور پڑ چکے تھے اور اس کی جگہیں نامعلوم ہوچکی تھیں، پس حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مٹے ہوئے نشانوں کو بلند اور مستحکم فرمایا، اور کلمۂ توحید کی تعلیم کے ذریعہ اس بیمار کو شفاء بخشی جو ہلاکت کے کنارہ جا پہنچا تھا اور اس شخص کے لئے ہدایت کے راستہ کو روشن کیا جو اس پر چلنے کا ارادہ رکھتا ہو اور نیک بختی کے خزانے اس شخص کے لئے ظاہر کئے جو ان کے مالک ہونے کا ارادہ کرتا ہو۔

تشریح عبارت

واشهد أن لاإله الخ:-ماقبل میں حمد کا بیان تھا اس سے ایمان ثابت ہوا اب شہادت کے ذریعہ اس ایمان کی تکمیل کی جارہی ہے۔

حمد، استغفار وغیرہ امور ظاہری ہیں، دوسرے لوگوں میں بھی ان کے پائے جانے کا حکم لگایا جاسکتا ہے، اسلئے مصنف نے ان امور کو بہ صیغۂ جمع بیان فرمایا، جبکہ شہادت؛ اگرچہ اس کا اظہار زبان کے ذریعہ ہوتا ہے، لیکن اصلاً وہ فعل قلبی ہے، اس کے وجود کو کہ کس کے اندر ہے اور کس کے اندر نہیں؟ اللہ ہی جانتا ہے، اس لئے مصنف اس کے لئے جمع کے بجائے واحد متکلم کا صیغہ لائے ہیں(۱)

(۱) المرقاة شرح المشكاة ۱/۴۹ – ۵۰، ط أشرفيه.

حضور ﷺ کے اسماء گرامی اور محمد نام رکھنے کی وجہ:

محمداً:- یہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم شخصی ہے جو صفت سے منقول ہوکر آیا ہے، یہ نام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے شریفہ میں سب سے مشہور نام ہے، اس کے علاوہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اسمائے گرامی ہیں جن کی تعداد بعض علماء نے ننانوے اور بعض نے تین سو بیان کی ہے(١) امام سیوطیؒ کا اس موضوع پر مستقل رسالہ ہے جس کا نام ''**البهجة السوية في الأسماء النبوية**'' ہے، اس میں انھوں نے آپ علیہ السلام کے پانچ سو سے زائد اسمائے صفاتی بیان فرمائے ہیں۔(٢)

علامہ ابن العربی مالکیؒ نے شرح ترمذی میں بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ہزار نام ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے ساتویں روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب نے بطور تفاؤل آپ علیہ السلام کا نام ''محمد'' رکھا، عبدالمطلب سے معلوم کیا گیا کہ آپ نے اپنے بیٹے کا نام ''محمد'' کیوں رکھا، حالانکہ آپ کے اجداد میں کسی کا نام محمد نہیں تھا اور آپ کی قوم میں محمد نام رکھنے کا رواج بھی نہیں؟ توانہوں نے کہا ''**أردتُ أن يَحْمَدَه اللهُ في السماء وخَلْقُه في الأرض**'' مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں اور اللہ کی مخلوق زمین میں ان کی تعریف کریں گے(٣) چنانچہ ان کی یہ توقع برحق ثابت ہوئی، بعض علماء نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی کا نام محمد نہیں رکھا گیا سوائے چھ یا پندرہ لوگوں کے، حافظ ابن حجرؒ نے ان میں سے کچھ کا تذکرہ کیا ہے۔(٤)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا مشہور نام ''احمد'' ہے یہ نام آپ علیہ السلام سے پہلے کسی کا نہیں رکھا گیا۔(٥)

آپ علیہ السلام کی دو مشہور صفات:

عبده ورسوله: یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صفتیں مذکور ہیں عبد اور رسول، عبدیت ورسالت

(١) شرح الحموی علی الأشباه والنظائر (المسمّٰی غمز عیون البصائر) ١/ ٣٢، ط: المكتبة الفيصل، ديوبند.
(٢) المرقاة شرح المشكاة ١٠/ ٥٥٤ ط اشرفيه ديوبند، یہ رسالہ مطبوع ہے۔
(٣) فتح الباری /مبعث النبی صلی الله علیه وسلم ٧/ ١٩٥ (٣٨٥١) مطبوعه شيخ الهند ديوبند.
(٤) فتح الباری /ماجاء في اسماء رسول الله صلى الله عليه وسلم ٦/ ٦٨٧ (٣٥٣٢)
(٥) البداية والنهاية: ذكر نسبه الشريف: ٢/ ٣١٩. ط احياء التراث العربي، بيروت.

میں سے رسالت کا مقام اگر چہ اونچا ہے اور یہ مراتبِ بشریت میں اعلیٰ ترین مرتبہ ہے، مگر بندہ کا اصل مقام ومرتبہ عبدیت ہے، اس لئے اس کو رسالت پر مقدم کیا، قرآن کریم میں بھی سب سے زیادہ اعزاز واکرام کے موقع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ''عبد'' کا لفظ ہی استعمال فرمایا گیا ہے: ''سبحان الذی أسری بعبده الخ''

بعض نے کہا کہ عبدیت میں توجہ من المخلوق إلی الخالق ہوتی ہے اور رسالت میں توجہ من الخالق الی المخلوق ہوتی ہے، پس اس لحاظ سے عبدیت؛ رسالت سے افضل ہے اور اس لئے اس کو مقدم کیا گیا۔

آپ علیہ السلام کی بعثت کے وقت انسانوں کی حالتِ زار:

الذی بعثه: - یہاں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کا اور بعثت کے وقت لوگوں کی عمومی گمراہی اور ان کی حالتِ زار کا بیان ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایسی ضرورت کے وقت ہوئی جبکہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رہبری کے بڑے محتاج تھے، اس وقت ضلالت وجہالت کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، لوگ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کو بھول چکے تھے، صحیح رہبری کا وجود نہیں تھا، عیسائیوں کے کچھ راہب تھے انہوں نے بھی لوگوں کی بے نیازی سے تنگ آ کر خلوت اور گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنے لگے تھے، ہدایت کا پیغام لے کر عامۃ الناس کے سامنے آنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔

ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ شانہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر مبعوث فرمایا، آپ علیہ السلام نے ہدایت کے ان مٹے ہوئے نشانات کو واضح فرمایا اور لوگ جو شرک وکفر کی وجہ سے جہنم کے کنارہ پر جا پہنچے تھے ان کو وہاں سے نکالا، یہ ہے مقصد بعثت۔

طرق الأیمان قد عفت آثارها: -''طرق ایمان'' سے مراد انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین ہیں کہ ان کے نشانات مٹ چکے تھے۔

وخبت أنوارها: ''انوار'' سے مراد انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات وہدایات ہیں۔

ووهنت أركانها: ''ارکان'' اس سے مراد توحید، رسالت اور بعث بعد الموت ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے ارکان یہی ہیں۔

وجهل مکانها: اس سے مراد علم وہدایت کی جگہیں ہیں، جیسے مسجد، مدرسہ، خانقاہ وغیرہ، مراد یہ ہے کہ دینی مراکز بھی ختم ہوگئے تھے یا ان کی طرف رجوع باقی نہ رہا تھا۔

فشید صلوات الله علیه وسلامه: یہاں سے یہ بتارہے ہیں کہ ایسے حالات میں آپ علیہ السلام نے کیا کیا؟ آپ نے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا احیاء فرمایا اور ان کو استحکام بخشا، لوگوں کے دلوں میں ایمانی تخم کی آبیاری فرمائی، اور کفر وشرک میں مبتلا ہونے کی وجہ سے لوگ جو جہنم کی دہلیز تک پہنچ گئے تھے کلمۂ توحید کی تلقین کرکے انکو جہنم کے عذاب سے بچایا اور طلبگاروں کے لئے اعمال صالحہ، اخلاق حمیدہ اور قوانین شرعیہ کو واضح کیا تاکہ وہ ان کو اختیار کرکے ابدی سعادت حاصل کرسکیں۔

وشفی من العلیل: ''علیل'' سے شرک وکفر کا بیمار مراد ہے۔

اس مضمون میں آیت کریمہ ''وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا[1]'' (اور تم آگ کے گڑھے کے کنارہ پر تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں وہاں سے بچالیا) کی جانب تلمیح واشارہ ہے۔

> **أمابعدُ، فإنَّ التمسُّكَ بِهَدْيِه لايَسْتَتِبُّ إلاّ بالاقتِفَاءِ لِمَا صَدَرَ مِنْ مِشْكَاتِه، والاِعْتِصَامَ بحبلِ اللّٰه لايَتِمُّ إلاّبِبيانِ كَشفِه.**
>
> **ترجمہ:** بہرحال حمد وصلوۃ کے بعد؛ (جاننا چاہئے) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو اختیار کرنا معتبر نہیں ہوسکتا مگر اس وقت جبکہ اس کا کامل اتباع کیا جائے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارکہ سے صادر ہوا، اور اللہ کی رسی یعنی قرآن کریم کو مضبوطی سے پکڑنا تام اور مکمل نہیں ہوسکتا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور تفسیر سے۔

تشریح عبارت

امابعد: موقعِ استعمال اور اولین متکلم:

أمــابـعـد: یہ کلمۂ فصل ہے جو ایک کلام کو دوسرے کلام سے ممتاز کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے، ماقبل میں حمد وثنا اور مقصد بعثت کا بیان تھا اور آگے حدیث کی ضرورت کا بیان ہے، ''امابعد'' کے ذریعہ ان دونوں

(۱) آل عمران: ۳: ۱۰۳۔

مضمونوں میں امتیاز کیا گیا ہے۔

یہ کلمہ سب سے پہلے راجح قول کے مطابق حضرت داؤد علیہ السلام نے استعمال فرمایا، ''وَفَصْلَ الْخِطَابِ [۱]'' کے نام سے ان پر جس انعامِ خداوندی کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے اس سے یہی مراد ہے۔ [۲]

بعض نے کہا کہ اولاً حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ کلمہ استعمال کیا، بعض نے سحبان بن وائل کا نام لیا، بعض نے یعرب بن قحطان کا اور بعض نے کعب بن لؤی کا۔ [۳]

بیانِ ضرورتِ حدیث:

فان التمسک بهديه: مصنفؒ نے خطبہ میں چار باتیں ذکر کی ہیں: (۱) ضرورت حدیث، (۲) وجہِ تالیفِ کتاب، (۳) ماخذ کتاب، (۴) وجوہ الفرق بین المشکاۃ والمصابیح، اس عبارت میں ضرورت حدیث کو بیان کیا جارہا ہے، حدیث کی ضرروت دووجہوں سے ہے:

(۱) اول یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو امت کے لئے نمونہ قرار دیا گیا ہے، قرآن کریم میں ہے ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ'' اس لئے ہر شخص اس بات کا مکلّف ہے کہ آپ علیہ السلام کی سیرت کو اختیار کرے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو اختیار کرنا اس وقت ہوسکتا ہے جب کہ مشکوۃِ نبوت سے جو باتیں صادر ہوئی ہیں یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ان کا اتباع کیا جائے۔

''صدر من مشكوته'' میں آپ علیہ السلام کے قلب منور کو روشن چراغ کے ساتھ اور سینۂ مبارکہ کو طاقچہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

(۲) دوسری وجہ اعتصام بالقرآن ہے، باری تعالیٰ کا امر ہے ''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعاً''، ''حبل

(۱) سورة ص: ۲۰.

(۲) فتح الباری ج۲ ص۴۹۷ (رقم الباب: ۲۹)

(۳) لمعات التنقيح ج ا ص ۱۳۹. التعليق الصبيح ۱/ ۳. لفظ ''امابعد'' کی تحقیق وتفصیل کے لئے علامہ موسیٰ روحانی کی کتاب ''النجم السعد فی مباحث أمابعد'' ملاحظہ فرمائیں۔

اللہ" سے مراد قرآن کریم ہے کمافی روایۃ الترمذي،[(۱)] اور قرآن کریم پرعمل اور اس کا اعتصام اسی وقت ہوسکتا ہے جب احادیث کے ذریعے اس کی توضیح وتفسیر کی جائے۔

حضرت عمرانؓ بن حصین نے ایک موقعہ پرایک شخص کو حدیث کی ضرورت واہمیت بتاتے ہوئے فرمایا "إنک رجلٌ أحمقُ أتَجدُ في كتابِ اللهِ الظهرَ أربعاً لاتَجْهَرُ فيها بالقرأةِ ثم عَدَّدَ إليه الصلوةَ والزكوةَ ونحوهذا الخ[(۲)]"، یعنی تم احمق آدمی ہو کیا تم اللہ کی کتاب قرآن کریم میں یہ صراحت پاتے ہو کہ ظہر (کی فرض نماز) میں چار رکعات ہیں اور ان میں قرأت سرّا ہے، پھرانھوں نے نماز کیساتھ زکوۃ وغیرہ کو بھی اسی طرح گنوایا، یعنی قرآن کریم میں شریعت کے احکام اجمالی طور پر بیان ہوئے ہیں، ان کی تفصیلات احادیث میں ہیں، لہٰذا قرآن پرعمل احادیث کے بغیر ہرگز نہیں ہوسکتا۔

وَكَانَ كِتَابُ الْمَصَابِيْحِ الَّذِيْ صَنَّفَهُ الإمامُ مُحيِي السُّنَّةِ قَامِعُ الْبِدْعَةِ، أَبُوْمُحَمَّدٍ الْحُسَيْنُ ابْنُ مَسْعُوْدٍ الْفَرَّاءِ الْبَغوِيُّ رَفَعَ اللّٰهُ دَرَجَتَهُ أَجْمَعَ كِتَابٍ صُنِّفَ فِيْ بَابِهٖ، وَأَضْبَطَ لِشَوَارِدِ الاَحَادِيْثِ وَأَوَابِدِهَا.

ولَمَّا سَلَكَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ طَرِيْقَ الاخْتِصَارِ، وحَذَفَ الْأَسَانِيْدَ، تَكلَّمَ فِيْهِ بَعْضُ النُّقَّادِ، وَإِنْ كَانَ نَقْلُهُ– وإنَّه مِنَ الثِّقَاتِ– كَالإِسْنَادِ، لٰكِنْ لَيْسَ مَافِيْهِ أَعلامٌ كَالاغْفَالِ، فَاسْتَخَرْتُ اللّٰهَ تعالىٰ، وَاسْتَوْفَقْتُ مِنْهُ، فَأَعْلَمْتُ مَاأَغْفَلَهُ، فأَوْدَعْتُ كُلَّ حَدِيثٍ مِنْهُ فِي مَقَرِّهٖ، كما رَوَاهُ الأَئِمَّةُ الْمُتْقِنُوْنَ، والثِّقَاتُ الرَّاسِخُونَ، مِثْلُ أَبِي عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ إِسْمَاعِيْلَ الْبُخَارِيِّ، وَأَبِيْ الْحُسَيْنِ مُسْلِمِ بْنِ الحَجَّاجِ الْقُشَيْرِيِّ، وأَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ مَالِكِ بْنِ أَنسٍ الْأَصْبَحِيِّ، وأَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ إِدْرِيْس الشَّافِعِيِّ، وَأَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ أَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ حَنْبَلِ الشَّيْبَانِيِّ، وَأَبِيْ عِيْسىٰ مُحَمَّدِ بْنِ عِيسىٰ التِّرْمِذِيِّ، وَأَبِي دَاوُدَ سُلَيْمَانَ بن الأشعثِ السِّجِسْتَانِيِّ، وأَبِي عبدِالرَّحْمٰنِ أَحْمَدَ بْنِ شُعَيْبِ النَّسَائِيِّ، وَأَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ يَزِيْدَ بْنِ مَاجه القَزْوِيْنِيِّ، وَأَبِيْ مُحَمَّدٍ

(۱)ترمذی شریف ۲/۱۱۸، باب ماجاء فی فضل القرآن ،ابواب فضائل القرآن.

(۲)انظر: الجامع لاحکام القرآن للقرطبی۱/۱۸.

عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالرَّحمٰنِ الدَّارِمِيِّ، وَأَبِي الْحَسَنِ عَلِيِّ بْنِ عُمَرَالدَّارَقُطْنِيِّ، وَأَبِيْ بَكْرٍ أَحْمَدَ بْنِ حُسَيْنِ الْبَيْهَقِيِّ وَأَبِي الْحَسَنِ رَزِيْنِ بنِ مُعَاوِيَةَ الْعَبْدَرِيِّ وغَيْرِهِم وقَلِيْلٌ مَّاهُوَ.

ترجمہ:-اور''کتاب المصابیح''جس کو امام محی السنۃ قامع البدعۃ ابومحمد حسین ابن مسعود الفراء البغوی،-اللہ ان کے درجات کو بلند فرمائے- نے تصنیف کیا تھا،اپنے موضوع پر تصنیف کی گئی کتابوں میں جامع ترین کتاب ہے اور نادر ومشکل المعنی احادیث اس میں سب سے زیادہ درج کی گئی ہیں،مگر چونکہ (اس میں) مصنفؒ نے (نقل حدیث کے وقت) اختصار کے طریقہ کو اختیار کیا،اور سندوں کو حذف کر دیا تو اس پر بعض ناقدین نے اعتراض کیا،اگر چہ مصنف کا حدیث کو بغیر سند کے نقل کرنا ایسا ہے جیسے سند کو ذکر کرنا؛ کیونکہ وہ ثقہ اور معتمد محدثین میں سے ہیں،لیکن پھر بھی بے نشان چیز اس چیز کے درجہ میں نہیں ہوتی جس میں نشان ہو؛اس لئے میں نے اللہ تعالیٰ شانہ سے خیر وتوفیق طلب کی اور میں نے نشان لگا دیا ان چیزوں پر جن کو امام بغویؒ نے بے نشان چھوڑ دیا تھا،اور میں نے ہر حدیث کو اس کی جگہ (باب) میں رکھا اس کے مطابق جیسا کہ اس کو متقن، ثقہ اور راسخ علماء ومحدثین مثلاً امام بخاری،مسلم، مالک،شافعی،محمد بن احمد بن حنبل شیبانی، ترمذی، ابوداود، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، دارقطنی،بیہقی اور رزین بن معاویہ عبدری رحمۃ اللہ علیہم نے روایت کیا ہے ان ائمہ ومحدثین کے علاوہ کچھ دوسرے محدثین بھی ہیں (جن کی کتابوں سے احادیث نقل کی گئی ہیں) مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔

تشریح عبارت

وجہِ تالیفِ کتاب:

وکان کتاب المصابیح الخ: یہاں سے کتاب کی وجہ تالیف بیان کی گئی ہے،فرماتے ہیں کہ امام محی السنۃ علامہ بغوی کی کتاب ''مصابیح السنۃ'' فن حدیث میں سب سے زیادہ جامع کتاب تھی، کیونکہ احادیثِ احکام کتب اصول میں منتشر ومتفرق تھیں،ہر کس وناکس کو ان کے مواقع اور مظان کا علم نہیں تھا، امام بغویؒ نے ان احادیث کو ایک خاص ترتیب سے جمع فرمایا،اسی طرح وہ احادیث جو مشکل المعنی تھیں اور ان کی

مراد واضح نہیں تھی ان کو بھی بطور خاص مصنفؒ نے اس کتاب میں جمع فرمایااور ترجمۃ الباب کے ذریعہ ان کی مراد واضح فرمائی، نیز انھوں نے کتب حدیث میں سے منتخب کرکے ایسی اہم روایات کو بھی ''مصابیح السنۃ'' میں درج فرمادیا جن سے طالبین میں داعیۂ عمل پیدا ہو، اور سالکین کے منازل ومدارج میں ترقی ہو،اس لحاظ سے امام بغوی کی ''مصابیح السنۃ'' حدیث کی نہایت جامع ومفید کتاب تھی،مگراس میں مصنفؒ نے کچھ اختصار سے کام لیا تھا، چنانچہ حدیث کی سند ذکر نہیں کی گئی،اس کے مصادراور مراجع کو بیان نہیں کیا گیا، نیز بہت سے مقامات پر متن میں بھی اختصار کردیا،جبکہ مقام کا تقاضہ تھا کہ حدیث کا مکمل متن مذکور ہو، اس وجہ سے بہت سے اہل علم نے اس کے طرز پر اشکال فرمایا اوراس کی ترتیب پرنظرثانی کی ضرورت محسوس فرمائی، مصنفؒ اوران کے استاذ علامہ طیبیؒ نے اس بارے میں باہم مشورہ کیا اور طے کیاکہ کتاب پرنظرثانی کرکے اس کو ازسرنومرتب کیا جائے اور جوخامیاں ہیں ان کی تلافی کی جائے اس طرح یہ کتاب منصۂ مشہود پرآئی۔

شوارد الاحادیث: جمع ہے ''شاردۃ'' کی،بمعنی بھاگنے والی اونٹنی، بہت سی احادیث کتب اصول میں موجود تھیں، لیکن طلباء کو ان کے مواقع معلوم نہ تھے، گویا کہ وہ احادیث طلبہ کے لئے بھاگے ہوئے اونٹ کی طرح تھیں، ''مصابیح السنۃ'' میں وہ روایات خاص ترتیب سے آنے کی وجہ سے طلباء کومعلوم ہوگئیں، گویا بھاگنے والا اونٹ قابو میں آ گیا۔

أوابدها: جمع ہے ''آبدۃ'' کی،بمعنی وحشی جانور، جیسے نیل گائے، ہرن وغیرہ، جوانسان کو دیکھ کر بدکتے ہیں اورانسانوں کے لئے غیرمانوس ہیں،مطلب یہ ہے کہ بہت سی احادیث طلبہ کو اگرچہ معلوم تھیں لیکن انکی دلالت اپنے معنی مرادی پرواضح نہیں تھی، گویا وہ احادیث طلباء کے لئے مانوس نہ تھیں، امام بغوی جب ان کو مناسب باب میں لے آئے توان کی دلالت معنی مرادی پرواضح ہوگئی اوروہ احادیث طلبہ کیلئے مانوس ہوگئیں، مثلاً کوئی حدیث نواقض وضوء سے متعلق ہے،لیکن اس کا مضمون صراحۃً ناقض وضوکا نہیں ہے، امام بغوی نے اس کونواقض وضوء کے باب میں بیان کیا تو طلبہ کومعلوم ہوگیا کہ یہ حدیث نواقض وضوء سے متعلق ہے۔

تکلم فیہ بعض النقاد الخ:اس جملہ میں شراح کے درمیان یہ بحث چھڑی ہے کہ ''فیہ'' کی ضمیرکا مرجع کیا ہے؟ ملاعلی قاری کی تشریح کے مطابق اس کا مرجع ''مصابیح السنۃ'' کی بعض احادیث ہیں، گویا عبارت یوں ہے''**تکلم أي طعن في بعض أحاديث كتابه باعتبار ذلك الحذف**''جس کا مطلب یہ ہے کہ مصابیح السنۃ میں احادیث کی سند محذوف ہونے کی وجہ سے اس کی بعض حدیثوں پر اعتراض ہوا۔

اس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ اعتراض تو سند کے راویوں کی وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ راوی غیر معتبر ہونے کی وجہ سے روایت قابل اعتراض ہوتی ہے، سند کو ذکر کرنے یا نہ کرنے سے اس پر فرق نہیں پڑتا، پھر حذفِ اسانید کو اعتراض کی بناء قرار دینا کہاں صحیح ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض روایات میں سند کا محذوف ہونا بھی اعتراض کا ذریعہ بن جاتا ہے مثلاً روایت کی سند، دو ہوں ایک صحیح دوسری غیر صحیح، اگر اس کی صحیح سند کو بیان کر دیا جائے تو طالب کو تسلی ہو جائے گی، اگر سند مطلقاً حذف کر دی جائے تو جس شخص کے علم میں محض دوسری (ضعیف) سند ہے وہ اس روایت کو ضعیف سمجھ کر اعتراض کرے گا، مثلاً حدیث ''المرأ علی دین خلیله'' جو مشکوٰۃ شریف [1] میں بھی آئی ہے، سراج الدین القزوینی نے اس کو موضوع کہا ہے، امام ترمذی نے حسن کہا ہے اور امام نووی نے صحیح کہا ہے، اگر اس کو بغیر سند کے ذکر کیا جائے تو جس شخص نے محض سراج الدین قزوینی کا کلام دیکھا ہوگا وہ اس کو موضوع قرار دے کر اعتراض کرے گا۔ [2]

وان کان نقله وانه من الثقات کالاسناد الخ: فرماتے ہیں کہ امام بغوی اگر چہ بڑے ثقہ ہیں اور انکی شخصیت بہت معتمد ہے، ان کا بغیر سند کے روایات کو نقل کرنا ذکرِ سند کے درجہ میں ہے کہ ایسا قابلِ اعتماد شخص غیر معتبر روایات کو نقل نہیں کرے گا، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ''**لیس ما فیه اعلام کالأغفال**'' یعنی بغیر نشان والی زمین نشان والی زمین کے برابر نہیں ہوتی۔ ''**اعلام**'' ''علمٌ'' کی جمع ہے بمعنی نشان والی زمین اور ''**اغفال**'' ''غفل'' کی جمع ہے بمعنی بے نشان زمین۔

وضاحت اس کی یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں مسافر آدمی اپنی منزل پر پہنچنے کے لئے بیابان جنگلوں کی مسافت کو قطع کرتا تھا، ان جنگلات میں بعض راستوں میں نشانات بنے ہوتے تھے جس کی وجہ سے مسافر بھٹکتا نہیں تھا، اور بعض راستوں میں راہنمائی کے ایسے نشانات نہیں ہوتے تھے ان میں بھٹکنے کا قوی احتمال رہتا تھا، امام بغویؒ نے بھی ''مصابیح السنہ'' میں چونکہ سندوں کا اور مصادر وماٰخذ کا ذکر نہیں کیا، جس کی وجہ سے اس کا حال بھی اس بے نشان راستہ کا ہو گیا جس میں راہرو کے بھٹکنے کا امکان رہتا ہے۔

مشکوۃ المصابیح کا طرزِ تالیف:

فاستخرت الله تعالی الخ: یہاں سے کتاب کی ترتیب اور طرز تالیف اور ان تغیرات کا بیان ہے

(۱) مشکوة ص ٤٢٧.

(۲) دیکھئے: مرقاة شرح مشکاة ٧/ ٢٢٤ ترمذی شریف ٢/ ٦٣ (٢٣٦٨)

جومصنف علامہ نے مصابیح السنہ میں فرمائے ہیں، فرماتے ہیں کہ: میں نے اس سلسلہ میں استخارہ کیا اوراللہ سے توفیق مانگی، چنانچہ اللہ پر بھروسہ کرکے مصابیح السنۃ پرنئی ترتیب سے کام شروع کیا، اوراس نئی ترتیب میں ایک اہم کام یہ کیا کہ ہرحدیث کے شروع میں روایت کرنے والے صحابی کانام اورآخرمیں اس کی تخریج کرنے والے امام (محدث) کا نام بیان کردیا جس سے حدیث شریف کا اصل حوالہ معلوم ہوگیا، البتہ اس نئی ترتیب میں مصابیح السنۃ کی اصل ترتیب کو باقی رکھا، چنانچہ مصابیح السنۃ میں جوحدیث جس کتاب اورجس باب کے تحت بیان کی گئی تھی نئی ترتیب (مشکوۃ) میں بھی اس حدیث کواسی کتاب اوراسی باب کے تحت درج کیا گیا۔

یہاں مصنفؒ نے دو جملے ذکر کئے ہیں: ''**فأعلمتُ ماأغْفَلَهُ** ''اور''**فاودعتُ كلَ حديث الخ**'' مشکوۃ شریف کے نسخے ان دوجملوں کی تقدیم وتاخیر کے بارے میں مختلف ہیں، اکثرنسخوں میں''**فاعلمت**'' مقدم ہے اور''**فاودعت**'' اس کے بعد ہے، لیکن اس صورت میں اس جملہ کا آئندہ مذکورعبارت''**کمارواه الأئمه**'' سے ارتباط صحیح نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ اس صورت میں ظاہری مطلب یہ ہوتا ہے کہ مصابیح السنۃ اور مشکوۃ میں احادیث کی وضع وترتیب میں جویکسانیت پائی جاتی ہے، یہ ان ائمہ حدیث کی ترتیب کے مطابق ہے جن کے نام صاحب مشکوۃ بعد کی عبارت میں بیان کررہے ہیں، حالانکہ یہ بات واقعہ کے خلاف ہے، ترتیب کا ان حضرات سے کوئی تعلق نہیں، یہ ترتیب تو صاحب مشکوۃ کی اپنی اختیارکردہ ہے۔

اور''**مرقاة**'' اور''**التعليق الصبيح**'' میں مشکوۃ شریف کا جونسخہ لیا گیاہےاس میں''**فاودعت**'' پہلے ہے اور''**فاعلمت**'' بعد میں، اس صورت میں مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں نے حدیث کے شروع میں روایت کرنے والے صحابی کا نام اورحدیث کے آخرمیں تخریج کرنے والے امام کا نام اس کے مطابق لکھا جس طرح ائمۂ حدیث نے اس حدیث کواپنی کتابوں میں روایت کیاہے، یہ مطلب بالکل درست ہے اس لیے یہی نسخہ راجح ہے، موجودہ متداول نسخہ جس میں فاعلمت مقدم ہے مرجوح ہے۔

کمارواہ الأئمة المتقنون الخ: یہ ان ائمہ متقنین کا تذکرہ ہے جن سے مشکوۃ میں احادیث لی گئی ہیں: ہم ان کتابوں اوران کے مصنفین کا تذکرہ''مقدمہ میں''ماٰخذ مشکوۃ'' کےعنوان کےتحت کرچکے ہیں۔

وقليلٌ ماهو الخ: یعنی مذکورہ مصنفین کے علاوہ جن سے اس کتاب میں روایات لی ہیں وہ مصنفین کم ہیں، مطلب یہ ہے کہ مذکورہ مصنفین کی روایات بکثرت اس کتاب میں ذکرکی گئی ہیں اوران کے علاوہ مصنفین سے لی گئی روایات کی تعداد قلیل ہے، چنانچہ بعض مصنفین سے صرف ایک دو روایات لی گئی ہیں۔

وإِنِّي إِذا نَسَبْتُ الحَدِيْثَ إِلَيْهِمْ كَأَنِّي أَسْنَدْتُ إِلى النَّبِيِّ صلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؛ لأَنَّهُمْ قَدْ فَرَغُوْا مِنْهُ، وأَغنَوْ نا عَنْهُ، وَسَرَدْتُ الْكُتُبَ وَالأَبْوَابَ كَماسَرَدَهَا، واقْتَفَيْتُ أَثَرَهُ فِيْهَا، وَقَسَّمْتُ كَلَّ بَابٍ غَالِباً عَلٰى فُصُوْلٍ ثلاثةٍ: أَوَّلُها مَاأَخْرَجَهُ الشَّيْخَانِ أَوْأَحَدُهُمَا، وَاكْتَفَيْتُ بِهِمَا وَإِنِ اشْتَرَكَ فِيْهِ الْغَيْرُ؛ لِعُلُوِّ دَرَجَتِهِمَا فِي الرِّوَايَةِ.

وَثَانِيُهَا: مَاأَوْرَدَهُ غَيْرُهُمَا مِنَ الأَئِمَّةِ الْمَذْكُوْرِيْنَ.

وَثَالِثُهَا: مَااشْتَمَلَ علىٰ مَعْنَى الْبَابِ مِنْ مُلْحقاتٍ مُنَاسِبَةٍ مَعَ مُحَافَظَةٍ عَلَى الشَّرِيْطَةِ؛وَإِنْ كَانَ مَأْثُوْراً عَنِ السَّلَفِ والْخَلَفِ.

ترجمه:- اور جب میں نسبت کروں حدیث شریف کی ان ائمہ ومحدثین کی طرف، تو گویا میں نے اس کی سند پہنچادی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک؛ کیونکہ ان حضرات نے اپنی کتابوں میں سند بیان فرمادی ہے اور ہم کو اس سے مستغنی کردیا ہے، اور میں نے کتب وابواب کی ترتیب وہی رکھی جو صاحب مصابیح علامہ بغویؒ نے رکھی تھی، اور اس سلسلہ میں ان ہی کے نقش قدم کی میں نے پیروی کی ہے اور میں نے ہر باب کو عموماً تین فصلوں پر تقسیم کیا ہے، پہلی فصل ان روایتوں کے لئے ہے جن کو حضرت امام بخاری ومسلم دونوں یا کسی ایک نے اپنی سند سے ذکر فرمایا ہے اگرچہ ان حدیثوں میں بعض ایسی بھی تھیں جن کو دوسرے محدثین نے بھی روایت کیا ہے (لیکن اس فصل میں صرف حضرات شیخینؒ کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے) کیونکہ روایت کے سلسلہ میں حضرات شیخینؒ کا درجہ تمام محدثین سے بلند ہے، اور دوسری فصل میں وہ احادیث نقل کی ہیں جن کو حضرات شیخینؒ کے علاوہ دوسرے مذکورہ ائمہ میں سے کسی اور نے روایت کیا ہے، اور تیسری فصل میں احادیث کے علاوہ صحابہ وتابعین کے ان اقوال وآثار کو بھی جمع کیا گیا ہے جو باب کے مناسب اور لائق تھے (لیکن ان کی نقل میں بھی) مذکورہ شرائط کی رعایت کی گئی ہے۔

تشریح عبارت

ایک اشکال وجواب:

وإنی إذانسبت الحدیث الخ:- یہ ایک اعتراض کا جواب ہے، وہ یہ کہ اس کتاب میں جیسا کہ

مصنفؒ نے فرمایا حدیث کا ماخذ اور ناقلِ حدیث صحابی کے تذکرہ کا اہتمام کیا گیا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ حدیث کی مکمل سند تو اس میں بھی ذکر نہیں کی گئی ہے، حالانکہ اسی وجہ سے امام بغوی پر اعتراض ہوا تھا، پس حذف اسناد جو بناءِ اعتراض تھی وہ یہاں بھی موجود ہے؟

علامہ تبریزیؒ اس کا جواب دیتے ہیں کہ میں نے حدیث نقل کرنے کے بعد اس کی نسبت ان ائمہ متقنین کی طرف کردی ہے جن کی کتابیں اپنے مصنفین کے نام سے معروف ومشہور ہیں، اوران کتابوں میں اس حدیث کی مکمل سند مذکور ہے، پس یہ ایسا ہوگیا گویا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک اس کی سندذکرکردی، کیونکہ وہ حضرات اس حدیث کی مکمل سند لکھ چکے ہیں، لہٰذا اب ہمیں سند کے بیان کی حاجت نہیں۔

وسردت الکتب الخ: علامہ فرماتے ہیں کہ چونکہ مصابیح السنۃ کی ترتیب اور تبویب نہایت مناسب اور عمدہ تھی اس لئے اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں کیا گیا اور اس بارے میں صاحب مصابیح کی مکمل اتباع کرتے ہوئے کتب وابواب کو اسی کے طرز اور ترتیب کے مطابق ذکر کیا گیا ہے۔

مصابیح السنۃ اور مشکوۃ المصابیح میں فرق:

وقسمت کل باب غالباً الخ: -یہاں سے مصابیح السنہ اور مشکوۃ کے مابین وجوہ فرق کا بیان ہے، اس بارے میں دوفرق ماقبل میں آ گئے، ایک ذکرصحابی اور دوسرا بیان ماخذ جیسا کہ ''**فأعلمت ماأغفله**'' اور ''**إذانسبت الحدیث الیھم**'' سے یہ دونوں باتیں مفہوم ہوئیں۔

اس عبارت میں مزید تین فرق مذکور ہیں، چنانچہ تیسرا فرق ہے: تبدیل عنوان، یعنی امام بغوی نے مصابیح السنہ میں دوعنوان ''الصحاح'' اور ''الحسان'' قائم فرمائے تھے، اور ''الصحاح'' کے تحت صحیحین کی اور ''الحسان'' کے تحت سنن خمسہ: ترمذی ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی کی روایات کو ذکر کیا گیا تھا، مگر مشکوۃ شریف میں ''الصحاح'' کی جگہ ''الفصل الاول'' اور ''الحسان'' کی جگہ ''الفصل الثانی'' کاعنوان قائم کیا گیا، نیزفصل اول کی احادیث کے لئے صرف شیخین کے حوالہ پراکتفاء کیا گیا اگرچہ مذکورہ ائمہ میں سے دیگر حضرات نے بھی اس کو روایت کیا ہو، اس لئے کہ شیخین کا درجہ باقی ائمہ حدیث سے بڑھا ہوا ہے، لہٰذا ان کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں۔

چوتھا فرق ہے: اضافۂ فصل ثالث، علامہ خطیب تبریزی نے مشکوۃ شریف میں فصل ثالث کا اضافہ

کیااور باب کی مناسبت سے اس میں بہت سی احادیث ذکرفرمائیں،اس طرح پندرہ سوگیارہ (۱۵۱۱) احادیث کا مشکوۃ شریف میں اضافہ کیا گیا،پھران اضافہ شدہ احادیث میں بھی وہ شرط واہتمام ملحوظ رکھا گیاجوفصل اول اورثانی میں رکھا گیاتھا، یعنی فصل ثالث میں بھی اول وثانی کی طرح راویِ حدیث صحابی کا نام اور ماخذ حدیث ذکرکیا گیاہے۔

پانچواں فرق: اتیان احادیث موقوفہ ومقطوعہ، مصنف فصل ثالث میں احادیث مرفوعہ کی طرح احادیث موقوفہ ومقطوعہ کوبھی اصالۃً لاتے ہیں مصابیح السنۃ میں موقوف ومقطوع روایات اصالۃً ذکرنہیں کی گئی تھیں۔

عبارت میں مذکور''سلف وخلف'' سے مرادصحابہ اورتابعین ہیں صحابی کی حدیث''موقوف'' کہلاتی ہے اورتابعین کی ''مقطوع''، ''سلف وخلف'' کایہی مفہوم راجح ہے، بعض نے ''سلف'' سے قرون ثلاثہ کے حضرات اور''خلف'' سے ان کے بعد کے حضرات مراد لئے ہیں، لیکن مصنف کے کلام میں یہ اصطلاح مراد نہیں؛ کیونکہ فصل ثالث میں تابعین کے بعد والوں کی روایات نہیں ہیں۔

ثُمَّ إِنَّکَ إِن فَقَدْتَّ حَدِیْثاً فِيْ بَابٍ؛ فَذٰلِکَ عَنْ تَکْرِیرٍ أُسْقِطُهٗ، وَإِنْ وَجَدْتَّ آخَرَ بَعْضَهٗ مَتْرُوْکاً عَلَیٰ اخْتِصَارِهٖ، أَوْمَضْمُوْماً إِلَیْهِ تَمَامُهٗ؛ فَعَنْ دَاعِی اِهْتِمَامٍ أَتْرُکُهٗ وَأُلْحِقُهٗ، وَإِنْ عَثَرْتَ عَلٰی اخْتِلَافٍ فِي الْفَصْلَیْنِ مِنْ ذِکْرِغَیْرِالشَّیْخَیْنِ فِي الْأَوَّلِ وَذِکْرِهِمَا فِي الثَّانِيْ؛ فَاعْلَمْ أَنِّي بَعْدَ تَتَبُّعِيْ کِتَابَيِ "اَلْجَمْعِ بَیْنَ الصَّحِیْحَیْنِ" لِلْحُمَیْدِيِّ وَ"جَامِعِ الْأُصُوْلِ" اِعْتَمَدْتُ عَلٰی صَحِیحَيِ الشَّیْخَیْنِ وَمَتْنَیْهِمَا.

ترجمہ:- پھرتحقیق کہ اے مخاطب اگرکسی باب میں کوئی حدیث تو نہ پائے تو(یہ سمجھا جائے کہ) میں نے تکرارکی وجہ سے اس کو ساقط کردیا (یعنی نقل نہیں کیا) اوراگر پاؤتم کسی حدیث کوکہ اس کا بعض حصہ اختصارکی وجہ سے حذف کردیاگیاہے یا اس میں بقیہ حصہ شامل کرکے اس حدیث کی تکمیل کردی گئی ہے تو یہ حذف کرنا اورتکمیل کرناخاص مقصد کے تحت ہے، اوراگرتم دونوں فصلوں میں اختلاف پرمطلع ہویعنی فصل اول میں غیرشیخین کی احادیث ذکرہوں اورفصل ثانی میں شیخین کی احادیث، توجان لیجئے کہ (یہ اختلاف غلطی اورغفلت کی وجہ سے نہیں ہواہے)؛ بلکہ یہ میں نے حمیدی کی کتاب''الجمع بین الصحیحین'' اور(ابن الاثیرکی)

کتاب ''جامع الاصول ''میں خوب تلاش وتحقیق کے بعد کیا ہے، اوراس سلسلہ میں میں نے (مصابیح السنۃ کے بجائے) بخاری ومسلم کے صحیح اوراصل نسخوں اوران کے متن پراعتماد کیا ہے۔

تشریح عبارت

ثـم إنـک إن فقدت حديثا الخ: یہ چھٹا فرق ہے حذفِ تکرار: یعنی یہ کہ مصابیح السنہ میں بہت سی احادیث مکرر تھیں، علامہ خطیب تبریزی نے ایسی حدیث کو کسی ایک جگہ ذکر کیا اور باقی مقامات سے اس کو حذف کردیا، البتہ جن مقامات سے حذف کیاوہاں حوالہ دے دیا کہ ہم نے اس روایت کو فلاں باب میں ذکر کردیا ہے۔

وان وجـدت آخـر بـعـضـه الخ: یہ ساتواں فرق ہے: اختصارِ حدیث، یعنی امام بغوی نے بعض احادیث کو بہت طوالت کے ساتھ ذکر کیا تھا، حالانکہ باب کے مناسب اس کا صرف بعض حصہ تھا، علامہ تبریزیؒ نے جوحصہ باب کے مناسب نہ تھا اسکو حذف کرکے حدیث کومختصر کردیا۔''بعضہ''''آخر''سے بدل بعض ہے۔

اومضموما اليه تمامه الخ :- یہ آٹھواں فرق ہے: تکمیل حدیث ،امام بغوی نے بعض احادیث کومختصراً ذکرکیا اوربعض حصہ کوچھوڑ دیا تھا حالانکہ چھوڑا ہوا حصہ بھی باب کے مناسب تھا اوربغیراس کے حدیث کا مطلب سمجھنا بھی دشوارتھا، صاحب مشکوۃ نے اس باقی حصہ کو ذکرکرکے حدیث کومکمل فرمادیا، مصنف فرماتے ہیں کہ یہ دونوں کام یعنی اختصارحدیث وتکمیل حدیث کسی وجہ وباعث کی بناپر کئے گئے، اور وجہ وہی ہے جوذکرکی گئی۔

وان عثـرت عـلى اختلاف فى الفصلين الخ :- یہ نواں فرق ہے: تبدیل حوالہ، اس کا حاصل یہ ہے جیساکہ پہلے آچکا کہ امام بغویؒ مصابیح السنۃ کی فصل اول میں صحیحین کی اورفصل ثانی میں سنن خمسہ کی روایات لاتے ہیں اورعلامہ خطیب تبریزی اسی کے مطابق حوالہ بھی تحریر فرماتے ہیں،البتہ بعض مرتبہ فصل اول کی کسی روایت کے لئے بجائے صحیحین کے سنن کا حوالہ دیتے ہیں، اوریہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ روایت صحیحین میں نہ ملے، مگرنہ ملنے کی وجہ تتبع وتلاش کی کمی نہیں، کیونکہ صاحب مشکوۃ نے تتبع وتلاش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، چنانچہ اپنے تتبع کے طرز کے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں ایسے موقع پراس حدیث کواولاً امام حمیدی کی ''الـجـمع بين الصحيحين ''میں، اورعلامہ ابن الاثیرجزری کی ''جامع

الاصــول ‘‘میں تلاش کرتا ہوں؛ کیونکہ ان دونوں کتابوں میں صحیحین کی روایات کو سند کے بغیر اور مکررات کو حذف کرکے جمع کیا گیا ہے، نیز جامع الاصول میں صحیحین کے ساتھ ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور موطا مالک کی روایات کو بھی جمع فرمایا گیا ہے، جب وہ حدیث ان دونوں کتابوں میں نہیں مل سکی تو محض ان میں تلاش پر اکتفاء نہیں کیا؛ کیونکہ ممکن ہے کہ امام حمیدی اور علامہ جزری کو نقل کرنے میں سہو ہو گیا ہو، اور وہ روایت ان حضرات سے نقل کرنے میں رہ گئی ہو،اس لئے پھر میں نے بخاری،مسلم کے اصل نسخوں کو اور ان کتابوں کے متون کو غور سے اور گہری نظر سے دیکھا، خود بخاری،مسلم میں بھی جب وہ روایت نہیں ملی تو پھر کامل وثوق ہو گیا کہ یہ روایت صحیحین میں نہیں ہے،اس کمال تتبع کے بعد میں نے اس روایت کے لئے غیر صحیحین کا حوالہ دیا۔

مصنفؒ کے کلام میں ’’إعتـمـدت‘‘ کا مطلب یہی ہے کہ اس روایت کی صحیحین کی طرف نسبت نہ کرنے میں میں نے خود صحیحین کو بہ نظرِ عمیق دیکھنے پر اعتماد کیا،محض ’’جمعین‘‘ میں نظر ڈالنے پر اکتفاء نہیں کیا۔

کبھی اس کا برعکس ہوتا ہے کہ فصل ثانی کی حدیث صحیحین میں مل گئی،اس وقت اس کے لئے سنن کے بجائے صحیحین کا حوالہ دیتے ہیں۔

وإِنْ رَأَيْتَ اخْتِلافاً فِيْ نَفْسِ الْحَدِيْثِ فَذٰلِكَ مِنْ تَشَعُّبِ طُرُقِ الْأَحَادِيْثِ، وَلَعَلِّيْ مَااطَّلَعْتُ عَلىٰ تِلْكَ الرِّوَايَةِ الَّتِيْ سَلَكَهَا الشَّيْخُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، وَقَلِيْلاً مَّاتَجِدُ أَقُوْلُ مَاوَجَدْتُ هٰذِهِ الرِّوَايَةَ فِيْ كُتُبِ الْأُصُوْلِ أَوْوَجَدْتُ خِلافَهَا فِيْهَا، فَإِذَا وَقَفْتَ عَلَيْهِ فَانْسُبِ الْقُصُوْرَإِلَيَّ لِقِلَّةِ الدِّرَايَةِ، لاإِلىٰ جَنَابِ الشَّيْخِ رَفَعَ اللّٰهُ قَدْرَهُ فِي الدَّارَيْنِ، حَاشَالِلّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ، رَحِمَ اللّٰهُ مَنْ إِذَا وَقَفَ عَلىٰ ذٰلِكَ نَبَّهَنَا عَلَيْهِ، وَأَرْشَدَنَا طَرِيْقَ الصَّوَابِ. وَلَمْ آلُ جُهْداً فِي التَّنْقِيْرِ وَالتَّفْتِيْشِ بِقَدْرِالْوُسْعِ وَالطَّاقَةِ، وَنَقَلْتُ ذٰلِكَ الاخْتِلافَ كَمَا وَجَدْتُ، وَمَاأَشَارَ إِلَيْهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ مِنْ غَرِيْبٍ أَوْضَعِيْفٍ أَوْغَيْرِهِمَا، بَيَّنْتُ وَجْهَه غَالِباً، وَمَالَمْ يُشِرْإِلَيْهِ مِمَّافِيْ الْأُصُوْلِ فَقَدْ قَفَّيْتُهُ فِيْ تَرْكِهِ إِلَّا فِيْ مَوَاضِعَ لِغَرَضٍ، وَرُبَّمَاتَجِدُ مَوَاضِعَ مُهْمَلَةً، وَذٰلِكَ حَيْثُ لَمْ أَطَّلِعْ عَلىٰ رَاوِيْهِ فَتَرَكْتُ الْبَيَاضَ، فَإِنْ عَثَرْتَ عَلَيْهِ فَأَلْحِقْهُ بِه، أَحْسَنَ اللّٰهُ جَزَاءَكَ.

ترجمہ :-اور اگر نفسِ حدیث میں آپ کو اختلاف نظر آئے،تو یہ حدیث کی سندیں مختلف ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ میں اس روایت پر مطلع نہ ہوسکا ہوں جس کو شیخ نے

اختیار فرمایا ہے، اورایسا تم کو بہت کم ملے گا کہ میں نے کہا ہو کہ یہ روایت مجھے اصول کی کتابوں میں نہیں ملی ہے یااس کے خلاف ملی ہے؛ (جومصابیح السنہ میں ہے) اگرایسا ملے تو قصور کی نسبت کم علمی کے سبب میری طرف کیجئے نہ کہ شیخ (رفع اللہ قدرہ فی الدارین) کی طرف، ان کواس سے منزہ سمجھا جائے (پھرکسی وقت) وہ روایت مل جائے تواللہ سبحانہ وتعالی رحم فرمائے اس شخص پرجسے وہ روایت معلوم ہواورہمیں مطلع کرے اوردرستگی کاراستہ دکھائے، اورمیں نے تحقیق وتدقیق اورتلاش وجستجو میں یعنی وسعت وطاقت کے مطابق کوشش کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی،اوریہ اختلاف جیساپایا ویسا ہی نقل کردیا، اورجن احادیث کی طرف حضرت شیخؒ (علامہ بغوی) نے ضعیف یاغریب ہونے کا اشارہ فرمایاہے میں نے ان کا سبب بیان کردیاہے، اورجن احادیث (اسنادی حیثیت) کی جانب شیخ نے کوئی اشارہ نہیں فرمایا،تو میں نے بھی شیخ کی پیروی کرتے ہوئے اسے چھوڑدیا مگربعض مقامات پرمیں نے کسی مقصد سے توضیح کردی ہے۔

اورکچھ مقام ایسے بھی آپ کوملیں گے کہ جہاں حدیث کے بعد کتاب کا حوالہ نہیں دیاگیا ہے کیونکہ باوجود تحقیق وتلاش کے میں راوی پرمطلع نہیں ہوسکا،لہٰذاوہ جگہ میں نے خالی چھوڑدی ہے پس اگرتم کواس کا حوالہ مل جائے تواس کوخالی جگہ میں شامل کردینا، اللہ تمہیں جزاءخیرعطاءفرمائے۔

تشریح عبارت

وان رأیت اختلافا الخ:- دسواں فرق ہے: اختلاف متن،بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ امام بغوی نے مصابیح السنہ میں حدیث کے جوالفاظ ذکر کئے ہیں صاحب مشکوۃ کووہ الفاظ نہیں ملے، بلکہ دوسرے الفاظ ملے، مصنف کوجوالفاظ ملے انہوں نے مشکوۃ میں انہیں الفاظ کے ساتھ حدیث نقل فرمائی، اس اختلاف کی وجہ تعددِ اسناد ہے کہ سندوں کے مختلف ہونے سے الفاظ بھی بدل جاتے ہیں،امام بغوی کے سامنے جوسند تھی وہ ہمیں نہیں مل سکی،لہٰذا اس میں کسی کی کوتاہی نہیں ہے۔

وقلیلا ماتجد اقول الخ:- گیارھواں فرق: عدم وجدان فی کتب الأصول، بعض مرتبہ مصابیح السنہ کی حدیث صاحب مشکوۃ کوکتب اصول سبعہ میں کہیں نہیں ملتی ہے تواس وقت جہاں سے ملتی ہے اس کا حوالہ دیتے ہیں اورفرماتے ہیں ''ماوجدتُ هذه الروايةَ في كتبِ الأصول ''اورکبھی مصابیح السنہ کی کوئی

حدیث مصنف کو اس کے برعکس ملتی ہے جوامام بغوی نے نقل کی ہے اس وقت مصنف حدیث کو اس طرح نقل فرماتے ہیں جس طرح ان کو ملی ہے اور پھر یوں کہتے ہیں ''وجدتُ خلافَھافی کتب الأصول''

اس کے متعلق نہایت ادب کالحاظ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ میرے تتبع وتلاش کی کمی ہے اس میں شیخ کا قصور نہیں، حاشا وکلا وہ اس قصور سے بری ہیں، میں نے بہت جستجو اور تلاش کی مگر جب اصولِ سبعہ میں وہ روایت نہیں ملی یا برعکس ملی، تو جس طرح اختلاف پایا اس کا اظہار کرکے اسی طرح نقل کردیا، اگر کسی شخص کو وہ روایت صاحب مصابیح السنۃ کی نقل کے مطابق مل جائے تو وہ شخص میری زندگی میں مجھے مطلع کردے، اور میری وفات کے بعد اس کا حوالہ لکھ دے۔

''حاشا'' اسمائے افعال میں سے ہے بمعنی مضارع ای أنزهه۔

ومـاأشـار اليـه رضـی الـلـه عنه الخ:– بارھواں فرق: بیان وجہ نوعیت حدیث، امام بغوی بعض احادیث کی نوعیت کو بیان کرتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے، غریب ہے وغیرہ، مگر اس کی وجہ بیان نہیں کرتے مگر میں اکثر وبیشتر اس کی وجہ بیان کردیتا ہوں، وجہ بیان کرنے سے مراد حوالہ دینا ہے، مثلاً یہ کہ امام ترمذی نے اس کو ضعیف کہا ہے وغیرہ، البتہ کہیں ضعیف وغیرہ کی وجہ کو بھی بتاتے ہیں۔

ومـالـم يشـر إليـه الخ:– تیرھواں فرق: بیان حیثیت فی بعض الحدیث، بعض احادیث کی حیثیت کتب اصول میں مذکور تھی یعنی ضعیف وغریب ہوناوغیرہ، مگر امام بغوی نے اسکی حیثیت کو بیان نہیں کیا تو میں بھی ان کی اتباع میں اس کی حیثیت بیان نہیں کرتا، لیکن بعض جگہ بیان کرتا ہوں اور ایسا کسی غرض کی وجہ سے ہوتا ہے وہ یہ کہ مثلاً مصابیح السنۃ کی بعض احادیث کو بعض لوگوں نے منکر کہا ہے، حالانکہ امام ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے وغیرہ، لہٰذا مصنف اس کی حیثیت بیان کرتے ہیں تاکہ ان لوگوں کا رد ہوجائے جنھوں نے اس کو منکر یا موضوع کہا ہے۔

وربماتجد مواضع مهملة الخ:– چودھواں فرق ترک بیاض، مصابیح السنہ کی بعض احادیث ایسی تھیں جو صاحب مشکوۃ کو کتب حدیث میں کہیں نہیں مل سکیں، اس وقت صاحب مشکوۃ حوالہ کی جگہ کو خالی چھوڑ دیتے ہیں، اس خالی جگہ کو بیاض کہا جاتا ہے، مصنف التماس کرتے ہیں کہ اگر کسی کو ان بیاضوں کا حوالہ مل جائے تو اس کو کتاب میں درج کردیں، پہلے بیاضیں زیادہ تھیں بعد میں شراح نے بہت سی بیاضوں کو پُر کیا ہے لیکن اب بھی چند بیاضیں باقی ہیں۔

وَسَمَّيْتُ الْكِتَابَ " بِـ مِشْكَاةِ الْمَصَابِيْحِ "وَأَسْأَلُ اللّٰهَ التَّوْفِيْقَ، والْإِعَانَةَ، وَالْهِدَايَةَ، وَالصِّيَانَةَ، وَتَيْسِيْرَ مَاأَقْصِدُهُ، وَأَنْ يَّنْفَعَنِيْ فِي الْحَيَاةِ وَبَعْدَالْمَمَاتِ، وَجَمِيْعَ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ، حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الوَكِيْلُ، وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ إلَّا بِاللّٰهِ العَزِيْزِالحَكِيْمِ .

ترجمہ: اوراس کتاب کا نام میں نے مشکاۃ المصابیح رکھا ہے۔

اور میں اللہ تعالیٰ شانہ سے ہی توفیق، مدد، ہدایت، حفاظت اوراپنے مقصد میں آسانی کے لئے دعاء کرتاہوں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ شانہ زندگی میں اورمرنے کے بعد مجھے اور ہر مسلمان مرد اورعورت کو نفع پہنچائے اوراللہ تعالیٰ ہی مجھ کو کافی ہے اور بہترین کارساز ہے اور برائی سے بچنے کی قوت اورنیک کام کرنے کی طاقت صرف اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہے جو بڑا زبردست اورحکمت والا ہے۔

حدیث النیۃ

(۱)عَنْ عُمَرَبْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلَّى اللّٰه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّمَاالأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ،وإِنَّمَالامْرِئٍ مَّانَوٰى؛ فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُه إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ ورَسُوْلِهٖ، وَ مَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا أَوِامْرَأَةٍ يَتزَوَّجُها فَهِجْرَتُهُ إِلىٰ مَاهَاجَرَ إِلَيْهِ. (متفق علیہ[1])

ترجمہ: حضرت عمر بن خطابؓ سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ

(۱) أخرجه البخاری فی سبعة مواضع:باب كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم ۱/۲ برقم۱، وكتاب الإيمان،باب ماجاء إن الأعمال بالنية والحسبة ولكل امرئ مانوى ۱/۱۳برقم۵٤ وكتاب العتق، باب الخطأ والنسيان فى العتاقة والطلاق ۱/۳٤۳ برقم ۲٤٦۰ وكتاب مناقب الأنصار، باب هجرة النبى صلى الله عليه وسلم وأصحابه إلى المدينة ۱/۵۵۱برقم ۳۷٦۰، وكتاب النكاح، باب من هاجر أوعمل خيراً لتزويج امرأة فله مانوى ۲/۷۵۹ برقم ٤۸۷۹، وكتاب الأيمان والنذور، باب النية في الأيمان ۲/۹۸۹برقم ٦٤۳۳، وكتاب الحيل، باب فى ترك الحيل وإن لكل امرئ مانوى فى الأيمان ۲/۱۰۲۰برقم ٦٦۸۵،ومسلم في الإمارة ۲/۱٤۰–۱٤۱.

علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: سوائے اس کے نہیں کہ اعمال کے حکم کا مدار نیت پر ہے اور سوائے اس کے نہیں کہ آدمی کے لئے وہی ہے جس کی وہ نیت کرے، لہٰذا جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہو تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول کے لئے ہی شمار ہوگی اور جس شخص کی ہجرت دنیا کے لئے ہو کہ اس کو حاصل کرلے یا کسی عورت کے لئے ہو کہ اس سے نکاح کرلے تو اس کی ہجرت اسی کے لئے شمار ہوگی کہ جس کے لئے اس نے ہجرت کی ہے۔

تشریح حدیث

اب اصل کتاب کو شروع کیا جارہا ہے، اصل تو کتاب الایمان کو شروع کرنا تھا لیکن ایک خاص وجہ کی بنا پر اس حدیث سے کتاب کا آغاز کیا گیا ہے جس کا بیان آگے آرہا ہے۔

یہ حدیث بہت اہم ہے، اس سے متعلق چند مباحث ہیں: (۱) حدیث کی جلالت شان اور وجہ تقدیم، (۲) نوعیت حدیث، (۳) حدیث کا شان ورود، (۴) راویٔ حدیث کے مختصر حالات، (۵) اختلاف روایت فی الجملۃ الأولی، (۶) شرحِ کلماتِ حدیث۔

(۱) جلالت شان ووجہ تقدیم حدیث:

یہ حدیث حضرات محدثین کے یہاں انتہائی عظمت وجامعیت رکھتی ہے، حضرت امام احمد ابن حنبل نے اس حدیث کے متعلق فرمایا "**إنه ثلث العلم**" امام شافعیؒ نے فرمایا: "**إنه يدخل فيه نصف العلم**" اور بعض نے کہا: "**إنه ربع العلم**[۱]"

حضرت امام بیہقیؒ نے ثلث علم کہنے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ اعمال تین قسم کے ہوتے ہیں: (۱) اعمال متعلقہ بالجنان (۲) اعمال متعلقہ باللسان (۳) اعمال متعلقہ بالجوارح، اس حدیث میں اعمال متعلقہ بالجنان کا بیان ہے، کیونکہ نیت عمل قلبی ہے، لہٰذا یہ حدیث ثلث علم ہوئی،[۲] امام شافعیؒ کے نصف علم قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ اعمال دو قسم کے ہیں (۱) اعمال قلبی (۲) اعمال بدنی، اس حدیث میں اعمال قلبی کا بیان ہے اس لئے اس کو نصف علم فرمایا،[۳] جن حضرات نے اس روایت کو ربع علم کہا ہے اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے

(۱) فيض الباري على صحيح البخاري ۱/ ۸۰ مطبوعه المكتبة الأشرفيه ديوبند.
(۲) لمعات التنقيح ۱/ ۱٦٦.
(۳) لمعات التنقيح ۱/ ۱٦٦.

کہ تمام احادیث کا خلاصہ اور نچوڑ چار حدیثیں ہیں: (۱)''من حسن إسلام المرء ترکه مالایعنیه'' (۲)''اتقوا الشبهات'' (۳) احادیث زہد جن میں دنیا کی فنائیت اور دنیا سے بے رغبتی کو بیان کیا گیا ہے، جن کا بیان کتاب الرقاق میں آتا ہے (۴)''إنما الأعمال بالنیات'' چونکہ یہ حدیث بھی ان چار میں سے ایک ہے اس لئے اس کو ربع علم فرمایا۔

اس حدیث کی اہمیت کے پیش نظر حضرات محدثین کے یہاں اس کا باقاعدہ نام بھی تجویز ہے، چنانچہ اس کے دونام ہیں (۲) حدیث النیۃ (۲) طَلیعة کتب الحدیث (کتب حدیث کا مقدمہ) اس کو مقدمۃ الجیش بھی کہہ سکتے ہیں؛ اس لئے کہ حضرات محدثین کی عادت ہے کہ عموماً وہ اپنی کتابوں کی ابتداء اسی حدیث سے فرماتے ہیں، حتی کہ بخاری شریف کی ابتداء بھی اسی حدیث سے ہوئی ہے، عبدالرحمٰن بن مہدی نے تو اس چیز کو باقاعدہ ادب بتایا کہ کتاب کی ابتداء مذکورہ روایت سے ہو، وہ فرماتے ہیں: ''یَنبَغِي لِمَنْ صَنَّفَ کتاباً أن یَبدأ فیه بهذا الحدیث تنبیهاً للطالب علی تصحیح النیة ''(۱) یعنی طالب علم کو تصحیح نیت پر تنبیہ کرنے کے لئے مصنف کتاب کو اپنی تصنیف کا آغاز حدیث النیۃ سے کرنا چاہیئے، علامہ خطیب تبریزیؒ نے بھی اسی بات پر تنبیہ کے لئے کہ طالب علم اول وہلہ میں اپنی نیت درست کرلے اس حدیث سے اپنی کتاب کا آغاز کیا ہے۔

طلب علم کی نیت ومقصد کیا ہو؟

علم نافع حاصل ہونے کے لئے نیت کا صحیح ہونا ضروری ہے، نیت ہونی چاہئے رضائے باری تعالیٰ کی، آخرت کو سنوارنے کی، اور اقامت دین کی، نیز یہ نیت ہو کہ اپنی ذات سے صفت جہل دور ہوجائے اور ہمارے واسطے سے دوسروں کا بھی جہل دور ہوجائے، جاہ اور مال کو حاصل کرنا مقصود نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس پر سخت وعید آئی ہے، حدیث شریف میں ہے ''مَنْ طَلَبَ العِلْمَ لِیُجَارِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ، أَوْلِیُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ، أویصرفَ بهِ وجوهَ الناسِ إلیه أدخلهُ اللّٰهُ النارَ ''(۲)، تحصیل علم کا مقصد مال کی ذخیرہ اندوزی بھی نہ ہو ورنہ ایسا شخص جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا کماورد في الحدیث: مَنْ تَعَلَّمَ علماً

(۱) شرح الطیبی ۱ / ۷۵ مطبوعہ زکریا دیوبند.

(۲) أخرجه الترمذي ۲ / ۹۴، وابن ماجه ۱ / ۲۲، حدیث شریف کا ترجمہ ص۶ پر ملاحظہ فرمائیں۔

مـما يُبْتَغٰى به وجهُ اللهِ لايَتَعَلَّمَه إلا ليصيب به عرضاً من الدنيالم يَجِدْ عَرَفَ الجنةِ يوم القيامة يعني ريحَها.⁽¹⁾

تصحیح نیت کا طریقہ:

ہمارے استاذ حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ فرماتے تھے کہ نیت عمل قلبی ہے اس لئے بار بار اس کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، نیت میں کچھ کمی محسوس ہوتو بندہ اس کو دور کرنے کی کوشش کرتا رہے اس طرح بار بار نیت کی کمی کو دور کرنے کی کوشش کرتا رہے گا تو اللہ کی مدد آئے گی، اور ایک وقت آئے گا کہ انشاء اللہ اخلاص حاصل ہوجائے گا۔

(۲) نوعیت حدیث:

یہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح اورغریب ہے، اوربخاری شریف میں اس سند سے مروی ہے:

حميدي عن سفيان عن يحى بن سعيد عن محمد بن إبراهيم التيمى عن علقمة عن عمر بن الخطابؓ قال: قال: رسول الله صلى الله عليه وسلم إنما الاعمال الخ.

حمیدی سے علقمہ تک اس سند کے تمام رواۃ اعلی درجہ کے ثقہ ہیں، لہذ یہ حدیث صحیح ہے، مگرغریب بھی ہے، اس لئے کہ حضرت عمرؓ سے اس حدیث کونقل کرنے والے محض علقمہ ہیں، اگر چہ حضرت عمرؓ اس حدیث کو منبر پرسنایا کرتے تھے، لیکن اتفاق ہے کہ ان سے روایت کرنے والے صرف علقمہ ہیں، اسی طرح علقمہؒ سے نقل کرنے والے محمد بن ابراہیم تنہاہیں، اوران سے نقل کرنے والے یحی بن سعید ہیں یہ بھی تنہاء ہیں، ،یحی ابن سعید سے نقل کرنے والی ایک بڑی جماعت ہے جن کی تعداد بعض نے ڈھائی سو (۲۵۰) اوربعض نے تین سوبیان کی ہے، پس سند کے آخری حصہ کے لحاظ سے یہ روایت مشہور بلکہ متواتر ہوگئی ہے لیکن ابتداء کے کئی طبقوں میں راوی تنہا تنہا ہیں اورحدیث پرحکم اقل کے اعتبار سے لگایا جاتا ہے، پس کئی طبقوں میں راوی کے متفرد ہونے کی وجہ سے یہ حدیث غریب ہے۔⁽²⁾

---

(۱) أخرجه أبوداود ۲/ ۵۱۵ وابن ماجه ۱/ ۲۲، ترجمہ ص۶ پردیکھیں۔

(۲) فتح الباري ۱/ ۱۲ (۱) ط: شيخ الهند ديوبند، وفتح الإله ۱/ ۱۶٤، ط: بيروت.

(۳) شانِ ورود حدیث:

امام طبرانی نے سندِ جید کے ساتھ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے نقل فرمایا ہے کہ جب ہجرت کا حکم نازل ہوا تو صحابہ کرامؓ اخلاص کے ساتھ ہجرت کرنے لگے، مکہ میں ایک عورت تھی قَیْلہ ام قیس، ایک صحابی نے اس عورت کو نکاح کا پیغام دیا، وہ ہجرت کر کے مدینہ آ گئی، نکاح نہیں کیا، اُن صحابی نے مکہ مکرمہ سے دوبارہ نکاح کا پیغام بھیجا تو ام قیس نے ہجرت کی شرط لگائی، چنانچہ ان صحابی نے نکاح کی وجہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث ارشاد فرمائی، ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ: اس کے بعد سے ہم ان صحابی کو ''مہاجر ام قیس'' کہنے لگے، حضرات محدثین ان صحابی کا نام بیان نہیں کرتے ہیں۔ (۱)

(۴) راویٔ حدیث حضرت عمرؓ کے احوال:

حدیث کے راوی مشہور صحابی حضرت عمر فاروقؓ ہیں ان کا مختصر تعارف بیان کیا جاتا ہے:

آپ کا نام عمر ہے، والد کا نام خطاب ہے، ابوحفص کنیت ہے، فاروق لقب ہے، بمعنی فرق کرنے والے، اس لقب کی وجہ بعض حضرات نے یہ بیان کی ہے کہ حضرت عمرؓ کے اسلام قبول کرنے سے پہلے مسلمان چُھپے چُھپے رہا کرتے تھے، آپ کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو قوت ملی اور پھر مسلمان شعائر اسلام کا اظہار کرنے لگے، گویا کہ آپ حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والے ہوگئے، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ایک یہودی اور منافق کا کسی معاملہ میں جھگڑا تھا، دونوں اپنے مقدمہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں لے گئے، اس معاملہ میں یہودی حق پر تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق میں فیصلہ فرمایا، اس منافق نے کہا کہ: ہم حضرت عمرؓ سے بھی فیصلہ کرائیں گے، حضرت عمرؓ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قاضی تھے، چنانچہ یہ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس آئے، یہودی نے سارا واقعہ بتایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ بھی سنا دیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا: ٹھہرو، پھر اندر جا کر تلوار لائے اور اس منافق کی گردن اڑا دی اور فرمایا کہ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو نہ مانے اس کا فیصلہ یہی تلوار ہے، اس

(۱) المعجم الکبیر ۶/۱۰۳ (۸۵۴۰) مطبوعہ ابن تیمیہ، القاہرہ. قال الحافظ: لم نقف علی تسمیۃ مہاجر أم قیس، ونقل ابن دحیہ أن اسمہا: قیلۃ، وقال العلامۃ القنوجي في عون الباري لم یسم ھذا الرجل أحد لمن صنف في الصحابۃ فیما رأیتہ. (مرعاۃ المفاتیح ۱/۱۸۵)

وقت یہ آیت شریفہ نازل ہوئی: ''اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَااُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِهٖ وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِیْدًا''،(۱) یعنی (اے پیغمبر!) کیا تم نے ان لوگوں کونہیں دیکھا جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ وہ اس کلام پر بھی ایمان لے آئیں ہیں جوتم پرنازل کیا گیاہے اوراس پر بھی جوتم سے پہلے نازل کیا گیا تھا، (لیکن) ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنا مقدمہ فیصلہ کے لئے طاغوت کے پاس لیجانا چاہتے ہیں حالانکہ ان کو حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ اس کاکھل کرانکار کرے اور شیطان چاہتاہے کہ انھیں بھٹکا کر پرلے درجہ کی گمراہی میں مبتلا کردے۔

اور جبرئیل علیہ السلام نے ایک موقع پر فرمایا: ''إن عمر فرق بين الحق و الباطل ''پس اسی وقت سے آپ کا لقب فاروق ہوگیا۔(۲)

آپ چالیس لوگوں کے بعد ۶ھ نبوی میں اسلام لائے، واقعہ اصحاب فیل کے تیرہ سال بعد آپ پیدا ہوئے، جب آپ اسلام لائے تو یہ آیت شریفہ نازل ہوئی ''یٰاَیُّهَاالنَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ(۳) '' اے نبی! آپ کو اللہ تعالی کافی ہے اور وہ مومنین کافی ہیں جو آپ کے پیچھے چل رہے ہیں، آپ کے اسلام لانے کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے جو مشہور ومعروف ہے، اسلام لانے کے بعد سے آپ برابر دین کی خدمت اور اشاعت میں لگے رہے، ۱۳ھ میں آپ خلیفہ مقرر ہوئے اور آپ کے زمانہ خلافت میں بڑی بڑی فتوحات ہوئیں، نئے نئے شہر وجود میں آئے، فارس کا علاقہ، شام کا علاقہ، اور روم کے بہت سے علاقے آپ کے زمانۂ خلافت میں ہی فتح ہوئے، ساڑھے دس سال آپ کی خلافت رہی، مغیرہ بن شعبہ کے غلام فیروز ابولؤلؤ نے صبح کی نماز میں دھوکہ سے آپ کو برچھا مارا، سخت زخمی ہوئے، بالآخر ماہ رجب بروز بدھ ۲۳ھ میں آپ کی وفات ہوئی، حضرت صہیبؓ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی، بہت سی احادیث آپ سے مروی ہیں، علماء نے ان کی تعداد ۵۳۷ بیان کی ہے، بخاری ومسلم میں آپ سے ۸۱ حدیثیں مروی ہیں۔(۴)

---

(۱) النساء ٦٠.

(۲) بیضاوی شریف ۲/۲۰۷ مطبوعه درالفكر بيروت.

(۳) الأنفال: ٦٤.

(٤) الإصابة ٤/٣-٥(٥٧٣٦) وسير أعلام النبلاء ٢٨/٧١-١٣٧.

(۵) اختلاف الروایات فی الجملۃ الأولیٰ:

اس جملہ میں پانچ ضبط وارد ہوئے ہیں: (۱) **إنما الأعمال بالنیات** (۲) **إنما الأعمال بالنیة** (۳) **الأعمال بالنیات** (۴) **الأعمال بالنیة** (۵) **العمل بالنیة**.

(۶) شرحِ کلماتِ حدیث

''**انما**'' کلمۂ حصر ہے، حصر کہتے ہیں ''**إثبات الحکم للمذکور ونفیه ماعداہ**'' یعنی شئ مذکور کے لئے حکم کو ثابت کرنا اور اس کے علاوہ سے نفی کرنا۔

''**الاعمال**'' جمع ہے عمل کی، ایک ہے عمل اور ایک ہے فعل، دونوں کے معنی کام کے ہیں لیکن عمل اور فعل میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ اس میں دونوں قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ عمل اور فعل دونوں مترادف ہیں، دوسرا قول یہ ہے کہ دونوں میں فرق ہے، پھر ان میں دو فرق بیان کئے گئے ہیں:

(۱) عمل کا تعلق مکلّف وذی عقل کے ساتھ ہوتا ہے بخلاف فعل کے کہ وہ عام ہے کہ اس کا تعلق غیر ذی عقل کے ساتھ بھی ہوتا ہے، اسی لئے فعل البہائم کہا جاتا ہے نہ کہ عمل البہائم۔[1]

(۲) بعض نے کہا کہ عمل میں دوام اور استمرار پر بھی دلالت ہوتی ہے فعل میں دوام واستمرار پر دلالت نہیں ہوتی، اسی لئے قرآن کریم میں بار بار'' **عملوا الصالحات** '' آیا ہے'' **فعلوا الصالحات** '' نہیں آیا، کیونکہ اعمال صالحہ میں دوام واستمرار مطلوب ہے تب ہی جنت کا دخول اولی حاصل ہو سکے گا، محض ایک مرتبہ عمل کی انجام دہی سے جنت کا دخول اولی حاصل نہیں ہوگا۔

عمل کی مختلف اقسام اور ان میں نیت کے احکام:

اس کے بعد سمجھنا چاہئے کہ عمل دو قسم کا ہوتا ہے: اختیاری اور اضطراری، یہاں پر اعمال سے مراد اعمال اختیاریہ ہیں، اضطراری اعمال کا تعلق نیت سے نہیں ہوتا، پھر اعمال شرعیہ کی دو قسمیں ہیں: مقصودہ اور غیر مقصودہ، اعمال مقصودہ سے نماز روزہ وغیرہ عبادات مراد ہیں اور اعمال غیر مقصودہ سے وسائل جیسے وضوء، غسل، طہارت ثوب وبدن، وغیرہ مراد ہیں، کیونکہ یہ امور نماز کے وسائل ہیں، مقصود بالذات نہیں، حضرات

(۱) تاج العروس، وعمدة القاری ۱/ ۵۰.

شوافع کے یہاں دوسری قسم کے اعمال میں سے وضواورغسل میں بھی نیت شرط ہے احناف کے یہاں صرف اعمال مقصودہ میں نیت ضروری ہے وضواورغسل میں نیت شرط نہیں ہے، کیونکہ یہ اعمال مقصودہ نہیں ہیں۔

پھرعمل کی اور تین قسمیں ہیں:(۱)معاصی (۲)طاعات، (۳)مباحات، معاصی کا ارتکاب ہرحال میں گناہ ہے، چاہے نیت کچھ بھی ہو، چنانچہ اگرغریبوں کی امداد کی نیت سے چوری کی جائے یالوگوں سے سود لیاجائے تب بھی یہ گناہ ہی رہیں گے، طاعات میں نیت موثر ہوتی ہے اصل ثواب کے اعتبار سے بھی اورزیادتی ثواب کے اعتبار سے بھی، جیسے نمازاورروزہ وغیرہ کہ ان کوادا کرنے میں ثواب اسی وقت ہے جب صحیح نیت سے ان کوانجام دیاجائے، پھرنیت میں جس قدرحسن ہوگا اتنا ہی ثواب میں اضافہ ہوگا، مباحات میں بھی نیت موثر ہوتی ہے،اصلاً تو مباحات میں نہ ثواب ہے اور نہ گناہ، مگرحسن نیت کی وجہ سے مباحات پرثواب ہوگا، جیسے کھانا اس نیت سے کھائے کہ اس سے حاصل ہونے والی قوت کواحیائے دین میں استعمال کرے گا تواب یہ کھانا بھی عبادت بن جائے گا۔[۱]

بالنیات: میں''باء'' استعانت کے لئے ہے اوربعض نے مصاحبت کے لئے بتلایاہے یعنی نیت عمل کے مقارن اورساتھ ساتھ ہونی چاہئے، اسی طرح مصاحبت کا مطلب یہ بھی ہے کہ نیت عمل کے اخیرتک باقی رہنی چاہئے، اس پراشکال ہوگا کہ بہت سے اعمال میں نیت تقدیماًاورتاخیراً بھی کافی ہوجاتی ہے اسی طرح نیت کا اخیرتک بقاء بھی لازم نہیں؟[۲]

اس کا جواب یہ ہے کہ مقدم ومؤخرنیت بھی حکماً مقارن ہی سمجھی جاتی ہے اسی طرح اگرافتتاح عمل کے بعدمنافیٔ صلوۃ عمل نہ کیاجائے تو یہ بھی حکماً مصاحبت ہے۔

نیت کا مفہوم اورنیت وارادہ میں فرق:

نیت کےلغوی معنی ہیں قصد وارادہ اورشرعی معنیٰ ہیں: **تـوجّـهُ القلبِ نحوَ الفعلِ ابتغاءً لِمَرْضَاةِ الله تعالیٰ**، یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کےحصول کے لئےکسی فعل کی جانب قلب کا متوجہ ہونا۔

ایک ہےنیت اورایک ہے ارادہ، ان دونوں میں فرق ہے، نیت میں نیت کرنے والے کی غرض کو

(۱)''التعليق الصبيح'' ۱/ ۱۰۔

(۲)المرقاة ۱/ ۹٤۔الاشباه والنظائر لابن نجيم ص ٣٦،ط:دراکتب العلميه.

دخل ہوتا ہے اور ارادہ میں ارادہ کرنے والے کی غرض کا دخل ضروری نہیں ہے، اس لئے ارادہ کی نسبت اللہ کی طرف ہوتی ہے ''فَعَّالٌ لِّمَايُرِيْد '' نیت کی نسبت اللہ کی طرف نہیں ہوتی، اس لئے کہ اللہ کے افعال معلل بالاغراض نہیں ہیں۔

مصنفؒ نے یہاں اس حدیث کے مختلف صیغوں میں سے ''الأعمال بالنيات '' کا صیغہ ذکر کیا ہے، جس میں اعمال ونیات ہر دو لفظ جمع کے ساتھ ہیں، یہ اصطلاح میں ''مقابلة الجمع بالجمع'' کہلاتا ہے جو ''انقسام الاحاد علی الاحاد'' کو متضمن ہوتا ہے ،اس لحاظ سے حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہر عمل پر اس کی اپنی نیت کے لحاظ سے حکم ہوگا، اگر وہ اچھی نیت سے کیا گیا ہے تو مفید ثواب ہوگا اور اگر نیت درست نہیں ہے تو مستحق عقاب، نیز دونوں جمع کے الفاظ لانے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر متعدد نیات کے ساتھ کوئی عمل ہو تو وہ اگر چہ دیکھنے میں ایک عمل ہو مگر نیت کے تعدد کے لحاظ سے اس میں متعدد اعمال کی انجام دہی کا ثواب ہوگا، مثلا کوئی شخص نماز کے لئے مسجد جائے اور وہ اعتکاف، لوگوں کی خبر گیری اور تعلیم وتعلم وغیرہ کی مختلف نیتیں کرے تو اس کو نیت کے مطابق محض ایک عمل پر یہ سب ثواب حاصل ہونگے۔

بالنیات کا متعلق:

''إنما الاعمال بالنيات ''یعنی اعمال کا اعتبار شرعاً نیت پر ہے، یہاں اعمال کا وجود حسی مراد نہیں ہے کیونکہ وجود حسی تو بغیر نیت کے بھی ہو جاتا ہے، مثلاً ایک شخص سیر وتفریح کے لئے اسٹیشن کے راستہ پر چلا، مقصود اس کا اسٹیشن جانا نہیں ہے لیکن اس راستہ پر چلنے کی وجہ سے اسٹیشن پہنچ ہی جائے گا، حالانکہ قصد اسٹیشن جانے کا نہیں تھا، پس جب اعمال کا حسی وجود مراد نہیں ہے تو یہاں ایک لفظ کی تقدیر ضروری ہے جس سے نفی کا تعلق ہو جائے، جو نفی کلمہ حصر (إنــمـا) سے مفہوم ہورہی ہے، نیز وہ لفظ جار مجرور (بالنيات) کا متعلَّق بھی بن جائے چنانچہ وہ لفظ بعض نے ''تصح ''اور بعض نے ''تثاب''مقدر مانا ہے۔

حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک وضو اور غسل میں نیت شرط صحت ہے اس لئے حضراتِ شوافع تـصـح کی تقدیر کو راجح قرار دیتے ہیں، اور عند الاحناف وضو وغسل میں نیت حصولِ ثواب کی شرط ہے نہ کہ صحت کی، اس لئے احناف تثاب کی تقدیر کو راجح مانتے ہیں۔

مگر ''تثــاب'' کا لفظ عبادات مقصودہ کو شامل نہیں، کیونکہ ان میں نیت شرط صحت ہے نہ کہ محض شرط

ثواب، پس اس صورت میں یہ حدیث حنفیہ کے مذہب کے مطابق عبادات مقصودہ میں نیت کے شرط صحت ہونے کا متدل نہیں بن سکے گی، اسی وجہ سے حضرت اقدس سہارنپوریؒ نے بذل المجہود میں اس کا متعلَّق فعلِ اعتبار کو قرار دے کر ''تعتبر'' کا لفظ مقدر مانا ہے، اس صورت میں حدیث کے معنی یہ ہوئے کہ شرعی طور پر اعمال نیت کے ساتھ معتبر ہیں، بغیر نیت کے معتبر نہیں، معتبر ہونا صحت کے لحاظ سے ہو یا ثواب کے لحاظ سے، پس یہ لفظ اپنے عموم کے اعتبار سے تمام اعمال کو شامل ہوجائے گا، اعمال خواہ عبادات مقصودہ ہوں کہ نیت ان میں معتبر ہے شرط صحت ہونے کے لحاظ سے، خواہ عبادات غیر مقصودہ (وسائل یعنی وضو غسل طہارت وغیرہ) ہوں کہ نیت ان میں شرطِ ثواب کے لحاظ سے معتبر ہے، خواہ امور مباحہ ہوں جیسے اکل وشرب وغیرہ کہ حسن نیت کی وجہ سے ان کی حیثیت طاعت کی ہوجاتی ہے۔

کن اعمال میں نیت کی حیثیت شرط صحت کی اور کن اعمال میں شرط ثواب کی ہے؟ اس کی تفصیل اور دلائل کتبِ اصول میں ہیں، لیکن یہ حدیث اپنی جامعیت کے لحاظ سے نیت کی ان مختلف حیثیتوں میں سے ہر ایک کے لئے بنیاد ہے، پس لفظِ تعتبر کی تقدیر سے یہ حدیث ایک انفرادی شان کی حامل ہوجاتی ہے فللّٰہ درّ الشیخ السہارنفوري.

حدیث پر تکرار مضمون کا اشکال اور اس کے جوابات:

وإنما لامرئ ما نوی إلخ : یہ حدیث کا دوسرا جملہ ہے اس کے مضمون کا حاصل وہی ہے جو پہلے جملہ کا ہے کہ آدمی کو وہی چیز ملتی ہے جس کی وہ نیت کرے، گویا دونوں جملوں کے مضمون میں تکرار ہے اور یہ تکرار موجب اشکال ہے، اس اشکال کے کئی جواب دیئے گئے ہیں اور دونوں جملوں میں کئی طرح کا فرق بیان کیا گیا ہے:

(۱) پہلے جملہ ''إنما الأعمال بالنیات'' میں قاعدہ کلیہ کا بیان ہے اور دوسرے جملہ ''وإنما لامرئ ما نوی'' آئندہ مضمون کیلئے تمہید ہے۔

(۲) بعض نے یہ جواب دیا کہ پہلے جملہ میں ضرورتِ نیت کا بیان ہے اور دوسرے جملہ میں کیفیت وکمیت نیت کا بیان ہے، یعنی آدمی جتنی اچھی نیت کرے گا اور جتنے کاموں کی نیت کرے گا اسی قدر ثواب کا مستحق ہوگا۔

(۳) بعض نے کہا کہ پہلے جملہ میں نفس نیت کا بیان ہے اور دوسرے جملہ میں تعیین نیت کا بیان ہے مثلاً ایک شخص نماز کی نیت کرنا چاہتا ہے تو ایک ہے نفس نماز کی نیت، اور ایک ہے تعیین نیت کہ کونسی نماز پڑھ رہا ہے اور دونوں ہی نیتیں مطلوب ہیں۔

(۴) بعض نے کہا کہ اول جملہ کا تعلق عمل کے ساتھ ہے اور ثانی جملہ کا تعلق عاملین کے ساتھ ہے۔

(۵) بعض نے کہا کہ نیت کی اہمیت کی وجہ سے تکرار کیا گیا ہے، لہٰذا یہ تکرار بے فائدہ نہیں ہے۔

نیت صحیحہ وفاسدہ کی تمثیل:

فمن كانت هجرته إلى الله الخ: اس جملہ میں نیت صحیحہ اور نیتِ فاسدہ کی مثال بیان کی گئی ہے کہ جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہو تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول کے لئے ہی شمار ہوگی اور وہ اس عمل پر اجر وثواب کا مستحق ہوگا، اور جس نے دنیا کو حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے مقصد سے ہجرت کی اس کی ہجرت ان ہی چیزوں کے لئے شمار ہوگی، اس پر اجر وثواب کا مستحق نہیں ہوگا بلکہ گناہ ذمہ میں آ سکتا ہے۔

اور اگر ہجرت کرنے میں دونوں مقاصد پیش نظر ہوں تو پھر غلبہ کا اعتبار ہوگا جو مقصد غالب ہو اسی کے لئے اصل ہجرت شمار ہوگی، اور یہ صرف ہجرت ہی کی تخصیص نہیں، بلکہ ہر وہ عمل جس میں دین و دنیا کی دونوں نیتیں جمع ہو جائیں اس میں غلبۂ نیت کے لحاظ سے حکم ہوگا۔

ہجرت کے معنی اور اس کی اقسام اور احکام:

"**الهجرة**"، ہجر سے سے ماخوذ ہے اس کے لغوی معنی ہیں چھوڑنا، ترک کرنا، ہجرت کی دو قسمیں ہیں: (۱) ہجرت باطنی (۲) ہجرت ظاہری، ہجرت باطنی سے مراد ہے گناہوں کو چھوڑنا حدیث شریف میں وارد ہوا ہے "**اَلْمُهَاجِرَ مَنْ هَجَرَ مَانَهَى اللّٰهُ عَنْهُ**" یعنی اصل مہاجر وہی ہے جو معاصی اور مناہی چھوڑے، یہ ہجرت باطنی ہر شخص پر لازم اور فرض ہے اور ہجرت ظاہری کے معنی ہیں اللہ کی رضاء کے لئے اور اقامت دین کے لئے اپنے وطن کو چھوڑنا۔

پھر ہجرت ظاہری کی بھی دو قسمیں ہیں (۱) **هجرة من دار الكفر الىٰ دار الاسلام** (۲) **هجرة من دار الخوف الى دار الامن**. حضرات صحابہؓ نے دونوں قسم کی ہجرت فرمائی ہے، وہ حضرات مکہ مکرمہ سے

مدینہ طیبہ گئے، یہ ہجرت کی پہلی قسم ہے اور بہت سے صحابہؓ حبشہ تشریف لے گئے، حبشہ دارالاسلام نہیں تھا، لیکن مسلمانوں کو وہاں امن حاصل تھا، اس لئے یہ ہجرت کی دوسری قسم ہے۔

ابتدائے اسلام میں ہجرت من مکۃ الی المدینۃ فرض تھی، کیونکہ شریعت کا منشا یہ تھا کہ تمام مسلمان مدینہ طیبہ میں جمع ہوجائیں تاکہ مسلمانوں کی قوت مجتمع ہوجائے اور کفار کو شکست دی جاسکے، اس ہجرت کو ابتداء میں ایمان کی علامت قرار دیا گیا تھا، ۸ھ میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوگیا تو پھر اس ہجرت کا حکم ختم ہوگیا، چنانچہ فرمادیا گیا ''لاہجرۃ بعدالفتح''[۱] کہ اب اس ہجرت کی ضرورت نہیں رہی، کیونکہ مکہ مکرمہ خود دارالاسلام بن گیا۔

لیکن سرے سے ہجرت منسوخ نہیں ہوئی، بلکہ مخصوص حالات میں ہجرت کرنا ہمیشہ فرض ہے، حدیث شریف میں ہے: ''**لاتنقطع الهجرة حتى تنقطع التوبة**''[۲] کہ ہجرت کا حکم اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جبتک توبہ کا دروازہ بند نہ ہوجائے، قبیل قیامت طلوع الشمس من مغربہا ہوگا اس کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہوگا، وہ مخصوص حالات جن میں ہجرت کرنا فرض ہے یہ ہیں کہ: آدمی اپنے وطن میں احکام شرعیہ پر عمل نہ کرسکے، مذہبی آزادی حاصل نہ ہو، کفار آڑے آتے ہوں، ایسی صورت میں اگر مسلمان طاقتور ہوں تو ان پر جہاد کرنا فرض ہوتا ہے اور اگر مسلمان طاقتور نہیں ہیں تو پھر ہجرت فرض ہوگی بشرطیکہ ہجرت کے اسباب مہیا ہوں اور کوئی جائے ہجرت موجود ہو۔

ایک ہجرت استحبابی ہوتی ہے کہ اپنے وطن میں بھی دین پر عمل پیرا ہے وہاں احکام شرعیہ کے عمل پر کوئی پابندی نہیں ہے اس کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں آپ علیہ الصلوۃ والسلام کے شہر کی طرف ہجرت کرے، یہ مستحب ہے جیسا کہ ہمارے متعدد اکابر نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی ہے حضرت سہارنپوریؒ، حضرت شیخ زکریاؒ اور حضرت حاجی امداداللہؒ کی ہجرت اسی نوع کی تھی۔(۳)

مذکورہ روایت میں اللہ کی طرف ہجرت کرنے سے مقصود اخلاص کی تعلیم دینا ہے کہ جو شخص ہجرت الی

(۱)صحيح البخاري ۱/۳۹۱(۲۷۸۳)(۲۸۲۵)صحيح مسلم ۲/۱۳۱(۱۸٦٤)

(۲)سنن أبي داؤد ۱/۳۳٦(۲٤۷۹)

(۳)ملاحظہ ہو: المرقاة شرح المشكاة ۱/٤٤، الموسوعة الفقهية، مادة: هجرة.

الرسول یعنی ہجرت الی المدینہ کرے وہ اخلاص کے ساتھ کرے، بعض نے کہا کہ یہ بتانا مقصد ہے کہ ہجرت إلی اللہ ہجرت الی الرسول ہے، جس طرح فرمایا گیا: ''من يطع الرسول فقد أطاع الله''(۱)

ایک نحوی اشکال اوراس کے جوابات:

''فمن كانت هجرته'' اس جملہ کی ترکیب پر اشکال ہے اس میں اول جملہ شرط اور ثانی جزاء ہے اور یہاں شرط وجزا میں اتحاد ہو رہا ہے حالانکہ شرط وجزا میں تغایر ضروری ہے؟ اس کے کئی جوابات ہیں:

(۱) یہاں جانب شرط میں ایک قید ملحوظ ہے اسی طرح جانب جزا میں بھی ایک قید ملحوظ ہے، گویا عبارت یوں ہے، ''فمن كانت هجرته إلى اللهِ ورسولِه قصداً ونيةً فهجرته إلى اللهِ ورسولِه ثمرةً وقبوليةً'' ان قیود سے شرط وجزا میں تغائر ہوگیا۔(۲)

(۲) بعض نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں: ''فمن كانت هجرته إلى اللهِ ورسولِه في الدنيا فهجرته إلى الله ورسوله في الآخرة'' یہاں بھی متعلق بدل جانے سے شرط وجزا میں مغایرت پیدا ہوگئی۔(۳)

(۳) بعض نے کہا کہ شرط وجزا کا یہ اتحاد مضمون میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے ہے، جیسے مشہور مقولہ ہے: شعری شعری، اب مطلب یہ ہوگا ہجرت وہی معتبر ہے جو اللہ اوراس کے رسول کے لئے ہو۔(۴)

حدیث میں ''امرأۃ'' کی وجہ تخصیص:

ومن كانت هجرته الى دنيا الخ: یہ نیت فاسدہ کی مثال ہے، اس جملہ میں اشکال کیا گیا ہے کہ لفظ ''دنیا'' میں عورت بھی داخل ہے پھر عورت کا تذکرہ الگ سے کیوں کیا گیا؟ اس کے جوابات یہ ہیں:

(۱) شان ورود میں عورت کا ہی تذکرہ ہے اس لئے عورت کا تذکرہ الگ سے کیا گیا ہے۔(۵)

---

(۱) النساء: ۸۰.

(۲) المرقاة ۱/۱۰۱.

(۳) المرقاة ۱/۱۰۱ والتعليق الصبيح ۱/۱۰۔

(٤) المرقاة ۱/۱۰۲ والتعليق الصبيح ۱/۱۰.

(٥) المرقاة ۱/۱۰۲.

(۲) تمام دنیا فتنہ ہے لیکن عورت بڑا فتنہ ہے، قرآن کریم نے بھی عورتوں کے مکر کو بڑا کہا ہے ''إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ'' اورشیطان کے مکر کو ضعیف قرار دیا ''إِنَّ كَيْدَالشَّيْطَانَ كَانَ ضَعِيْفاً'' نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مَاتركتُ بعدي فتنةً أَضَرَّ على الرجال من النساءِ''(۱) کہ: میرے بعد مردوں کے لئے سب سے خطرناک فتنہ عورتیں ہیں، پس عورت کا مکر زیادہ خطرناک ہونے کی وجہ سے عورت کا صریح تذکرہ لایا گیا۔(۲)

دوسرا سوال یہاں یہ ہے کہ اول جملہ میں جزا میں اللہ اور رسول کا لفظ مکرر بولا گیا ہے ضمیر پر اکتفاء نہیں کیا گیا اور دوسرے جملہ میں دنیا اور امرأۃ کی ضمیر پر اکتفا کیا گیا دوبارہ انکا لفظ ذکر نہیں کیا گیا، تو وجہ فرق کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اللہ ورسول کا نام متبرک ہے اور اس میں لذت ہے برخلاف دنیا اور امرأۃ کے کہ یہ نام لینے کی چیز نہیں ہیں۔

دنیا؛ معنی اور مصداق:

دنیا: ''دنیا'' کے مشتق منہ میں دو احتمال ہیں: (۱) ایک یہ کہ یہ مشتق ہے دُنُوٌّ سے جس کے معنی ہیں قریب ہونا؛ مشتق اور مشتق منہ میں مناسبت یہ ہے کہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں قریب ہے۔

(۲) یہ مشتق ہے ''دناء ۃ'' سے دناءۃ کے معنی ہیں کمینہ ہونا، اس صورت میں مشتق اور مشتق منہ کی مناسبت ہے یہ کہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں کمینی اور حقیر ہے۔(۳)

دنیا کسے کہتے ہیں؟ اس میں تین قول ہیں (۱) بعض نے کہا کہ ہر وہ چیز جو اللہ کے ذکر سے غافل کردے وہ دنیا ہے (۲) بعض نے کہا ما علی الارض کو دنیا کہتے ہیں (۳) بعض نے کہا کہ ما سوا اللہ کو دنیا کہا جاتا ہے۔(۴)

---

(۱) البخاری (٥٠٩٦) ومسلم (٢٧٤٠)

(۲) المرقاۃ ۱/۱۰۲۔

(۳) المرقاۃ ۱/۱۰۳ والمقدمة للشیخ عبدالحق الدهلوي: ص۷.

(٤) فتح الباری ۱/۱۹، اورعمدۃالقاري ۱/۵۲ میں لکھا ہے: واختلف في حقيقتها فقيل: ماعلى الأرض من الهوا والجو وقيل كل المخلوقات من الجواهر والأعراض والأولى أولى.

متفق علیہ : اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرات شیخین یعنی امام بخاری ومسلم دونوں نے اس حدیث شریف کی ایک ہی صحابی سے تخریج کی ہے۔(۱)

کِتَابُ الإِیْمَانِ

مصنفؒ نے تصحیح نیت پر تنبیہ کرنے اوراخلاص وللّٰہیت پیدا ہونے کی غرض سے حدیث نیت سے کتاب کوشروع فرمایا،اب اصل مقصودیعنی ایمانیات کوشروع کیاجارہاہے، اس کے لئے کتاب الایمان کے الفاظ سے ترجمہ قائم کیا، اس ترجمہ میں دولفظ ہیں ایک کتاب اور دوسرے ایمان ، ان دونوں سے متعلق چند مباحث ہیں: (۱)مشکوۃ کے کتب وابواب کی اجمالی ترتیب اور ان کا باہمی ربط،(۲) کتاب، باب اور فصل کے لغوی واصطلاحی معنی،(۳)ایمان سے متعلق چند مباحث۔

مشکوۃ کے کتب وابواب کی ترتیب اوران کاباہمی ربط:

مشکوۃ شریف میں کتاب کے لفظ سے بہت سے تراجم ہیں،ان میں سب سے پہلے کتاب الایمان کولایاگیا ہے،وجہ اس کی یہ ہے کہ شریعت کا حصہ دو چیزیں ہیں(۱)ایمان (۲)اعمال، ایمان اصل الاصول ہے اوراعمال واحکام پرمقدم ہے،کوئی عمل بغیرایمان کے مقبول نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی عمل سے پہلے ایمان کو بیان کیاہے، اس لئے مصنفؒ نے بھی ایمان کی بحث کومقدم کیاہے، ایمان کے بعد درجہ ہے اعمال واحکام کا،احکام شرعیہ تین قسم کے ہیں(۱)عبادات محضہ (۲)معاملات محضہ (۳) ایسے احکام جودونوں سے مرکب ہیں جیسے نکاح، ان میں پہلی قسم کا درجہ مقدم ہے اس لئے ایمان کے بعدعبادات محضہ کو بیان کیاجائے گا، اس میں یہ اعمال ہیں نماز،روزہ، زکوۃ اورحج، ان میں سب سے اہم اورمہتم بالشان نماز ہے، لہٰذا عبادات محضہ میں سب سے پہلے نماز کو بیان کیاجائے گا،لیکن نماز کے لئے طہارت شرط ہے، اور شرطِ شئی شئی سے مقدم ہوتی ہے، اس لئے ایمان کے بعدطہارت کو بیان کریں گے،عبادات محضہ کے بیان سے فراغت کے بعد دوسرے نمبرپر معاملات محضہ کو بیان کیاجائے گا، چنانچہ حج کے بعدبیوع کابیان لائیں گے، معاملات محضہ کے بعد ایسے احکام کوشروع کیا جائے گا جن میں عبادت ومعاملہ دونوں کاپہلو ہو جیسے نکاح اوراس کے متعلقات، اس کے بعد زواجر کوپھرآداب کواس کے بعدفتن کو، پھرسب سے اخیرمیں

(۱)فیض القدیر ۱/ ۳۰ (۴۰۸۴)

مناقب صحابہ کو بیان کیا جائے گا، تفصیلی ربط آگے اپنے مقام پر آئے گا۔

کتاب، باب اور فصل کے معنی:

''کتاب'' بروزن فعال باب مفاعلت کا مصدر ہے اس باب کا مصدر مُفاعلۃ اور فِعال دونوں وزن پر آتا ہے، کتاب کے دو معنی ہیں(۱) لکھنا (۲) جمع کرنا ،عنوان کے طور پر جب لفظ کتاب آتا ہے تو وہاں بہت سے مسائل لکھے اور جمع کئے ہوئے ہوتے ہیں، اصطلاحِ مصنفین میں کتاب سے مراد ایسے مسائل کا مجموعہ ہے جو جنس میں تو متحد ہوں لیکن انواع انکی مختلف ہوں، باب کے تحت ایسے مسائل ہوتے ہیں جن کی نوع متحد ہو البتہ صنف مختلف ہو، جیسے حیوان ایک جنس ہے جو تمام حیوانات کو شامل ہے لیکن اس کے تحت انواع مختلف ہیں جیسے انسان، بقر، غنم وغیرہ، پھر تمام انسانوں کی نوع ایک ہے البتہ صنف مختلف ہیں جیسے مرد وعورت۔

ترجمہ میں دوسرا جز ہے: الایمان، اس سے متعلق چند مباحث ہیں:(۱) ایمان کے لغوی وشرعی معنی، (۲) ایمان کی حقیقت میں ائمہ کا اختلاف، (۳) ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے یا نہیں، (۴) ایمان واسلام میں فرق ہے یا نہیں؟

(۱) ایمان کے لغوی وشرعی معنی:

''ایمان'' باب افعال کا مصدر ہے، مجرد میں اس کا مصدر اَمنٌ آتا ہے، جو لازم ومتعدی دونوں طرح مستعمل ہوتا ہے، جس کے معنی ہیں محفوظ کرنا اور محفوظ ہونا، باب افعال میں اس کے معنی ہوئے تصدیق کرنا، مجرد اور مزید فیہ میں مناسبت پائی جاتی ہے جو یہاں بھی ہے، وہ یہ کہ جب کوئی شخص کسی کی تصدیق کرتا ہے تو مصدِّق، مصدَّق کو تکذیب سے محفوظ کر دیتا ہے اور مصدَّق محفوظ ہو جاتا ہے۔

اور ایمان کے شرعی معنی ہیں: ''**التصديق بما عُلِمَ بالضرورة أنه من دينِ محمد صلى الله عليه وسلم** '' یعنی ان سب چیزوں کی تصدیق کرنا جن کے بارے میں بدیہی طور پر معلوم ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہیں۔

''تصدیق'' کا مطلب ہے کہ جو باتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ان کو دل سے سچا تسلیم کرے لہٰذا جو ان کو دل سے سچ تسلیم نہ کرے خواہ اس کو ان کا علم ومعرفت ہو وہ مؤمن نہیں ہوگا۔

''ضروری'' ہونے کا مفہوم اور حکم:

''بالضرورۃ'' سے مراد ایسے احکام ہیں جو قطعی ہوں ثبوتاً بھی اور دلالۃً بھی اور وہ عوام وخواص میں مشہور ہوں اور ہر عالم وجاہل ان سے واقف ہو، خواہ فرض وواجب نہ ہوں، مثلاً نماز، روزہ، حج، مسواک وغیرہ، چنانچہ ایسی قطعی چیز کا انکار کرنے والا شخص کافر ہوگا، اور جو احکام قطعی ہوں؛ مگر اس درجہ مشہور ومعروف نہوں تو ان کے منکر کو اول وہلہ میں کافر نہیں کہا جائے گا، بلکہ پہلے اس کو تبلیغ کی جائے گی اور اس کا قطعی ہونا اس کے سامنے واضح کیا جائے گا، اس کے بعد بھی وہ انکار پر قائم رہے تب اس کے کفر کا فیصلہ کیا جائے گا۔ (۱)

نیز جو احکام ضروری یا قطعی نہ ہوں بلکہ ظنی ہوں، خواہ ثبوت کے لحاظ سے ظنی ہوں یا دلالت کے لحاظ سے، ان کی تصدیق نفسِ ایمان کے تحقق کے لئے شرط نہیں، کوئی اگر ان کی تصدیق نہ کرے وہ ایمان سے خارج قرار نہیں پائے گا۔

اور عوام وخواص میں شہرت سے مراد یہ ہے کہ دینی شعور رکھنے والی عوام میں سے اکثریت اس سے واقف ہو، لہذا جن لوگوں کو دینی شعور نہ ہو وہ اگر کسی دینی مسئلہ سے ناواقف ہوں تو ان کی ناواقفیت کے باوجود وہ مسئلہ ''ضروری'' شمار کیا جائے گا اور اس کا منکر کافر ہوگا، ایسے ہی عوام میں سے ہر ہر فرد کا واقف ہونا بھی ضروری نہیں اکثر عوام کا واقف ہونا بھی کافی ہے، لہٰذا جس مسئلہ سے اکثر عوام واقف ہے اس کا منکر بھی کافر قرار پائے گا۔ (۲)

کفر کے لغوی واصطلاحی معنی:

کفر: ایمان کی ضد ہے اس کے معنی ہیں چھپانا، کافر کو کافر اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں کو چھپاتا ہے۔

اور اصطلاح شرع میں کفر کہتے ہیں: ''**عدم التصديق بماعلم بالضرورة أنه من دين محمد صلى الله عليه وسلم**'' یعنی جو امور ایسے ہیں کہ ان کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا حصہ ہونا

(۱) جواهر الفقه ۱/ ۱۱۳، ۱۱۴.

(۲) الفتاوى الحديثية ص ۱٤۱، اكفار الملحدين ص ۲.

ضروری یا قطعی طور پر ثابت ہے ان میں سے کسی ایک امر کو بھی دل سے سچا تسلیم نہ کرنا کفر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ محض کسی ایک امر قطعی کے انکار سے انسان کافر ہو جائے گا، تحقق کفر کے لئے تمام قطعیات کا انکار ضروری نہیں، البتہ تحقق ایمان کے لئے جملہ قطعیات پر ایمان رکھنا شرط ہے۔

بعض نے کفر کی تعریف انکار کے ساتھ کی: ''الانکار بما علم بالضرورۃ أنہ من دین محمد الخ''، لیکن یہ تعریف مخدوش ہے، اس لئے کہ جو شخص نہ تصدیق کرے اور نہ انکار کرے اس پر کیا حکم لگایا جائے گا؟ اس سے تو منزلۃ بین المنزلتین لازم آئے گا جو معتزلہ کا مذہب ہے۔

ضروریات دین میں تاویل بھی کفر ہے:

''ضرورۃ'' کا مفہوم اور اس کا حکم تو اوپر ایمان کی تعریف کے ذیل میں ذکر کر دیا گیا، یہاں یہ واضح رہے کہ یہ بھی عدم تصدیق اور انکار میں داخل ہے کہ کوئی شخص دین کے ضروری اور قطعی احکام میں کوئی ایسی تاویل یا ان کا وہ مفہوم بیان کرے جو تواتر واجماع کے خلاف ہو، جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے متبعین ختم نبوت کے انکار کے ساتھ اس کا وہ مفہوم بیان کرتے ہیں جو تواتر واجماع کے خلاف ہے، اس بناء پر وہ کافر اور خارج از اسلام ہیں۔

اقسام کفر اور ان کا مفہوم:

پھر کفر کی چار قسمیں ہیں (۱) کفر انکار (۲) کفر جحود، (۳) کفر عناد، (۴) کفر نفاق۔

کفر انکار یہ ہے کہ آدمی دل اور زبان دونوں سے انکار کرے، جیسے کفار مکہ دل وزبان دونوں سے انکار کرتے تھے۔

کفر جحود یہ ہے کہ قلب میں تو معرفت ہو، مگر زبان سے اقرار نہ کرے، جیسے کفر ابلیس اور علمائے یہود کا کفر، علماء یہود دل سے معرفت رکھتے تھے جیسا کہ ان کے متعلق قرآن کریم میں ہے: ''الذین آتینھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابنائھم''، یعنی جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ ان کو اتنی اچھی طرح جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔[1]

(۱) سورۃ البقرہ: ۱٤٦.

کفر عنادیہ ہے کہ قلب میں معرفت ہے زبان سے اقرار بھی ہے لیکن قبول نہ کرے جیسے کفر ابوطالب۔
کفر نفاق یہ ہے کہ قلب میں انکار ہو لیکن اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے زبان سے اقرار کرے جیسے کفر منافقین۔

(۲)حقیقتِ ایمانِ شرعی اور مختلف مذاہب:

ایمان کی حقیقت کے بارے میں امت کا اختلاف ہوا ہے، اسی وجہ سے امت میں مختلف فرقے بنے، ان فرقوں میں سے چند کی حقیقت اور ایمان کے بارے میں ان کے مسلک کو یہاں بیان کیا جاتا ہے:

(۱)فرقہ جہمیہ: ان کے نزدیک ایمان نام ہے صرف معرفت قلبی کا، دل سے تصدیق، زبان سے اقرار، اعمال کا امتثال اور معاصی سے اجتناب ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے یہاں ضروری نہیں، لیکن یہ بالکل غلط ہے کیونکہ پھر تو علماء یہود بھی مومن شمار ہوں گے کہ یہ معرفت قلبی انھیں حاصل تھی، کمامر۔

(۲)فرقۂ مرجئہ: اس کا کہنا ہے کہ ایمان کی حقیقت صرف تصدیق قلبی ہے، باقی کچھ اور لازم نہیں کما ہو مذہب الجہمیہ، ارجاء بمعنی پیچھے ہٹانا یہ لوگ اعمال کو انکے درجہ سے پیچھے ہٹاتے ہیں اسی وجہ سے ان کو ''مرجئہ'' کہا جاتا ہے۔

(۳)فرقہ کرّامیہ: ان کا عقیدہ ہے کہ ایمان کی حقیقت محض اقرار باللسان ہے اس کے علاوہ کچھ اور لازم نہیں کما ہو مذہب الجہمیہ والمرجئہ۔

ان تینوں فرقوں کے یہاں ایمان ایک بسیط شئے ہے، یعنی یہ ایمان کی حقیقت شئے واحد قرار دیتے ہیں، جو ہر فرقہ کے یہاں الگ ہے کمامر۔

(۴)حضرت امام ابوحنیفہؒ حضرات متکلمین، شیخ ابوالحسن اشعری اور شیخ ابومنصور ماتریدی یہ سب حضرات فرماتے ہیں کہ ایمان نام ہے تصدیق قلبی کا اور اقرار باللسان دنیا میں اجراء احکام اسلامیہ کے لئے اور عمل بالارکان کمالِ ایمان کے لئے شرط ہے، یہ دونوں ایمان کا رکن نہیں ہیں۔

الحاصل ان حضرات کے یہاں عمل بالارکان ایمان کی حقیقت میں تو داخل نہیں ہے مگر مکمِّلِ رکن ہے، یعنی کمال ایمان کے لئے لازم ہے، جبکہ فرقۂ مرجئہ اور دیگر فرقے عمل بالارکان کو نہ نفس ایمان کا جز مانتے ہیں اور نہ کمال ایمان کے لئے لازم قرار دیتے ہیں، بعض لوگوں نے متکلمین اور احناف پر مرجئہ ہونے کا الزام لگایا ہے جو حقیقت شناسی پر مبنی نہیں ہے۔

(۵) اکثر فقہائے احناف فرماتے ہیں کہ ایمان نام ہے تصدیق قلبی اوراقرار باللسان دونوں کے مجموعہ کا، گویا کہ اقرار باللسان بھی ایمان کارکن ہے، لیکن رکن اصلی نہیں ہے، رکن زائد ہے، اسی لئے اقرار باللسان بعض صورتوں میں ساقط ہوجاتا ہے جیسے گونگے سے اور مُکرَہ سے۔

مگر یہ اختلاف اس وقت ہے جب کہ اقرار باللسان کا مطالبہ نہ کیا جائے اوراگراقرار باللسان کا مطالبہ کیا جائے تو پھراقرار باللسان بالاتفاق رکن ہے اس کے بغیر آدمی مسلمان شمار نہیں ہوگا۔(۱)

(۲) جمہور محدثین، ائمہ ثلاثہ، معتزلہ اورخوارج کہتے ہیں کہ ایمان نام ہے تین چیزوں کے مجموعہ کا: (۱) التصدیق بالجنان (۲) الاقرار باللسان (۳) العمل بالارکان، پھرایمان ان تمام اجزاء پر برابری کے ساتھ صادق آتا ہے یا تفاوت کے ساتھ، یعنی متواطی ہے یامشکک؟ اس میں اختلاف ہے:

جمہورمحدثین اورائمہ ثلاثہ نے فرمایا: کہ اجزاءِ ایمان کی حیثیت میں تفاوت ہے، اگر تصدیق قلبی فوت ہوجائے اوراقرار موجود ہے تو وہ شخص منافق ہے اوراگر اقرار باللسان بھی فوت ہوجائے تو وہ کافرِ مجاہر ہے اوراگر عمل بالارکان فوت ہوجائے البتہ تصدیق واقرار موجود ہوتو ایسا شخص فاسق ہوگا، گویا ایمان ان کے یہاں کلی مشکک ہے کہ اپنے افراد پرکمی زیادتی کے ساتھ صادق آتا ہے، سب اجزاء کا درجہ برابر نہیں۔

معتزلہ وخوراج کے یہاں ایمان کلی متواطی ہے اوراس کے تینوں اجزاء کا درجہ مساوی ہے ان میں سے کوئی ایک بھی فوت ہوجائے تو وہ شخص مومن نہیں ہے، پھرایسے شخص کے متعلق معتزلہ وخوارج کے مابین اختلاف ہے کہ وہ کافر ہوا یانہیں؟ خوارج کہتے ہیں کہ کافر ہے اورمعتزلہ کہتے ہیں کہ نہ مومن ہے نہ کافر، بلکہ منزلۃ بین المنزلتین ہے، یہ کل آٹھ قول ہوگئے۔

---

(۱) اقرار باللسان کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ دنیامیں احکام اسلام (وراثت، ولایت، شہادت، امامت، اور تدفین فی مقابرالمسلمین وغیرہ) کے اجراء کے لئے اقرار باللسان شرط ہے، اس کے بغیر دنیا میں کوئی شخص مسلمان شمار نہیں ہوگا، خواہ وہ کسی عذر ومجبوری کی بناء پراقرار باللسان سے عاجز ہو، اورآخرت میں مسلمان شمار ہونے کے بارے میں یہ تفصیل ہے کہ: (۱) اگرکسی عذرشرعی کی بناء پراقرار باللسان نہ کیا ہو، مثلاً گونگا ہو، یااس کی مہلت نہ مل سکی ہو کہ تصدیق قلبی کے بعد فوراً انتقال ہوگیا ہو، یااقرار باللسان کرنے کے بارے میں جان کاخوف ہو اس قسم کے اعذار کی وجہ سے اقرار باللسان نہیں کیا تو آخرت میں بہرحال مسلمان شمار ہوگا، اوراگر بلاعذرشرعی کے اقرار باللسان نہیں کیا تو اس کی دوصورتیں ہیں: (الف) اس سے اقرار باللسان کا مطالبہ کیا گیا تھا، اس کے باوجود اقرار نہیں کیا تو بالاتفاق آخرت میں مسلمان شمار نہیں ہوگا، اورخلود فی النار کا مستحق ہوگا، (ب) خودبھی اقرار نہ کیا اورنہ کسی نے مطالبہ کیا، اس کے حکم میں اختلاف ہے: جمہورمحدثین فرماتے ہیں یہ بھی خلود فی النار کا مستحق ہے اوراحناف ومتکلمین کے نزدیک یہ مسلمان شمار ہوگا اورنجات پائے گا (فتح الملہم ۱/۴۱۰، درس مسلم از مفتی رفیع عثمانی ۱/۱۸۲)

احناف اور جمہور محدثین کے مذہب میں فرق اور اس کی وجہ:

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ احناف اور جمہور محدثین کا جو اختلاف ہے وہ لفظی ہے کہ احناف نے عمل بالارکان کو جزء اصلی نہیں مانا، اور جمہور محدثین بھی اس کو جزء اصلی نہیں مانتے، بلکہ جزء زائد مانتے ہیں، اس لئے عمل بالأرکان فوت ہوجانے کی صورت میں احناف اور ائمہ ثلثہ نتیجہ پر متفق ہیں، چنانچہ ایسے شخص پر سب کے یہاں فاسق ہونے کا حکم لگایا جائے گا نہ کہ کافر ہونے کا، اور در حقیقت احناف اور جمہور محدثین کا یہ اختلاف زمانہ کے مختلف ہونے کی وجہ سے تعبیر کے فرق پر محمول ہے کہ امام صاحب کے زمانہ میں معتزلہ کا زور تھا جو عمل بالارکان کو ایمان کا جزو مانتے تھے، لہٰذا امام صاحب نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ عمل ایمان کا جزو نہیں ہے، اور جمہور محدثین کے زمانہ میں مرجئہ کا زور تھا جو عمل بالارکان کے قائل ہی نہ تھے، ان کی تردید کے لئے جمہور محدثین نے فرمایا کہ عمل بالارکان بھی ایمان کا جزو ہے۔

(۳) ایمان میں کمی یا زیادتی ہوتی ہے یا نہیں؟:

امام صاحب اور متکلمین فرماتے ہیں ایمان میں کمی زیادتی نہیں ہوتی **الایمان لایزید و لاینقص**، اور ائمہ ثلاثہ و جمہور محدثین فرماتے ہیں کہ ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے، ان کی دلیل ہے "**وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيْمَاناً**" جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور ترقی دیتی ہیں[۱] اصل میں یہ اختلاف پہلے اصولی اختلاف پر متفرع ہے کہ امام صاحب اور متکلمین کے یہاں ایمان مفرد ہے اور مفرد میں کمی بیشی نہیں ہوتی اگر اس میں کمی ہوجائے تو وہ چیز ہی فوت ہوجائے گی اور ائمہ ثلثہ و محدثین کے یہاں ایمان مرکب ہے اور مرکب میں کمی بیشی ہوسکتی ہے۔

امام صاحب کی طرف سے مذکورہ آیت کریمہ کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں ایمان کی زیادتی سے "مومن بہٖ" کی زیادتی مراد ہے، یعنی سو آیات نازل ہوئیں تو مومنین کا ان پر ایمان تھا، پھر مزید دس آیتیں اور نازل ہوئیں تو مومنین کا ان پر بھی ایمان ہوگیا، تو یہ زیادتی "مومن" بہ کے اعتبار سے ہوئی نہ کہ نفس ایمان کے اعتبار سے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اصل ایمان میں زیادتی مراد نہیں ہے بلکہ کمال ایمان میں زیادتی مراد ہے،

(۱) سورة الأنفال، رقم الآية: ٢.

اعمال سے کمال ایمان اورنور ایمان میں زیادتی ہوتی ہے اصل ایمان اپنے حال پر رہتا ہے۔

(۴) ایمان واسلام میں فرق:

علماء کے درمیان اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے کہ ایمان اوراسلام میں فرق ہے یا نہیں؟ چنانچہ بعض علماء نے فرمایا کہ ایمان واسلام دونوں مترادف ہیں، قوم لوط کے بارے میں اللہ نے فرمایا ''فَأَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ '' پس ہم نے نکال لیا ان مومنین کو جو اس بستی میں تھے، آگے فرمایا ''فَمَاوَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ[۱] '' کہ اس میں (بستی میں) ایک گھر کے سوا ہم نے کسی اورگھر کو مؤمن نہیں پایا، ان آیات میں ایک ہی قوم کو پہلے مؤمنین سے تعبیر کیا ہے اور پھر مسلمین سے، معلوم ہوا کہ ایمان اوراسلام دونوں مترادف ہیں۔

جمہور علماء نے فرمایا کہ ایمان واسلام میں فرق ہے، کہ ایمان نام ہے طاعت وانقیاد باطنی کا اور اسلام نام ہے طاعت وانقیاد ظاہری کا، یہی صحیح ہے، قرآن کریم کی اس آیت سے دونوں میں فرق کا ہونا بداہۃً ثابت ہے ''قَالَتِ الاعْرَابُ امَنَّا قَلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا أَسْلَمْنَا '' یعنی یہ دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں ان سے کہو کہ تم ایمان تو نہیں لائے البتہ یہ کہو کہ ہم اسلام لے آئے۔ [۲]

اسلام اورایمان کا مذکورہ فرق مفہوم کے لحاظ سے ہے کہ مفہوم میں دونوں کے تغائر ہے لیکن مصداق کے اعتبار سے دونوں میں تلازم ہے کہ اسلام کے لئے ایمان لازم اورایمان کے لئے اسلام لازم ہے، چنانچہ انقیاد باطنی، انقیاد ظاہری کے بغیر اورانقیاد ظاہری، انقیادی باطنی کے بغیر معتبر نہیں، حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ نے فرمایا ہے کہ ایمان واسلام میں تلازم ہے، مبدأ دونوں کا الگ ہے مگر منتہی دونوں کا ایک، کہ ایمان تصدیق قلبی سے شروع ہوتا ہے اورطاعت ظاہری پر منتہی ہوتا ہے اوراسلام طاعت ظاہری سے شروع ہوتا ہے اورطاعت باطنی پر منتہی ہوتا ہے، [۳] حدیث جبرئیل جو آئندہ آرہی ہے اس سے بھی دونوں میں فرق کا ہونا ثابت ہے کہ ایک سوال اسلام کے متعلق ہے اورایک ایمان کے متعلق۔

(۱)سورة الذاريات:٣٦.

(۲)سورة الحجرات :١٤.

(۳)فيض البارى ١ /١٤٢، ١٤٣ .مطبوعه أشرفيه ديوبند.

قول اول کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ وہاں اسلام اور ایمان کا متحد ہونا مصداق کے لحاظ سے ہے اور مصداق کے لحاظ سے دونوں میں تلازم ہے کمامر۔

اَلفَصْلُ الاوَّلُ

۲/۱ عَنْ عُمَرَبْنِ الخَطَّابِ رضي الله عنه قَالَ : بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ، إِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيْدُ بَيَاضِ الثِيَابِ،شَدِيْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ، لايُرَى عَلَيْهِ أَثَرُالسَّفَرِ، وَلايَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ، حَتّٰى جَلَسَ إِلَى النَبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،فَأَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ إِلَى رُكْبَتَيهِ، وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلٰى فَخِذَيْهِ،وَقَالَ: يامُحَمَّدُ! أَخْبِرْنِي عَنِ الإِسْلامِ، قَالَ: اَلإِسْلامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَّاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وأَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَ تُقِيْمَ الصَّلاةَ ، وتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ، وتحُجَّ الْبَيْتَ إِن اسْتَطَعْتَ إِلَيهِ سَبِيْلاً، قَالَ: صَدَقْتَ؛ فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ ويُصَدِّقُهُ! قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ الإِيْمَانِ، قَالَ: أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلائِكَتِهِ، وَكُتُبِهِ، وَرُسُلِهِ، وَالْيَوْمِ الآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ، قَالَ: صَدَقْتَ .قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ الإِحْسَانِ، قَالَ: أَنْ تَعْبُدَاللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فإِنَّهُ يَرَاكَ، قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ، قَالَ: مَاالْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ" قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَاتِها . قَالَ: أَنْ تَلِدَ الأَمَةُ رَبَّتَهَا وَأَنْ تَرَى الْحُفَاةَ العُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ" قَالَ: ثُمَّ انْطَلَقَ، فَلَبِثْتُ مَلِيًّا،ثُمَّ قَالَ لِيْ:" ياعُمَرُ! أَتَدْرِيْ مَنِ السَائِلُ"؟ قلتُ: اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: فإِنَّهُ جِبْرَئِيْلُ، أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ ، رَوَاهُ مُسْلِمٌ(۱) ورواه أَبُوْهُرَيْرَةَ مَعَ اخْتِلافٍ، وَفِيْهِ: وَإِذَا رَأَيْتَ الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الصُّمَّ الْبُكْمَ مُلُوْكَ الأَرْضِ، فِيْ خَمْسٍ لايَعْلَمُهُنَّ إِلَّا للّٰه. ثُمَّ قَرَأَ "إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ"اَلآيَةُ، مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ(۲)

(۱)أخرجه مسلم في الإيمان،۱/۲۷.

(۲) أخرجه البخاري في الإيمان ،باب سؤال جبرئيل النبي صلى الله عليه وسلم عن الايمان الخ ۱/۱۲ برقم ۳٦، وفي التفسير، باب قوله تعالىٰ: إن الله عنده علم الساعة ۲/۷۰٤ برقم ٤٥۹۱، ومسلم في الإيمان، باب بيان الإيمان والإسلام والإحسان ۱/۲۹، برقم ٥.

ترجمہ: حضرت عمر بن الخطابؓ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ اس دوران کہ ایک دن ہم حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھے اچانک ایک شخص ہمارے درمیان آیا جس کے کپڑے نہایت سفید اور بال نہایت سیاہ تھے، اس شخص پر آثار سفر نظر نہیں آرہے تھے (جس سے یہ سمجھا جاتا کہ یہ شخص کہیں سے سفر کرکے آیا ہے اور اجنبی ہے) اور نہ ہی ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا تھا (جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مقامی شخص نہیں تھا) وہ شخص حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت قریب آکر بیٹھا اور اس نے اپنے گھٹنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں سے ملا دیئے اور اپنے دونوں ہاتھ اپنی دونوں رانوں پر رکھ لئے اور عرض کیا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! مجھ کو اسلام کے بارے میں خبر دیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ گواہی دے تو اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور تو نماز قائم کرے، (اور اگر صاحب نصاب ہو تو) زکوۃ اداء کرے، رمضان المبارک کے روزے رکھے اور بیت اللہ کا حج کرے اگر بیت اللہ جانے کی استطاعت پاوے، اس شخص نے یہ سن کر کہا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سچ فرمایا (حضرت عمرؓ فرماتے ہیں) کہ ہمیں اس کی حالت پر تعجب ہوا کہ یہ شخص (لاعلم آدمی کی طرح پہلے تو) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتا ہے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کی تصدیق بھی کرتا ہے (جیسے اس کو ان باتوں کا پہلے سے علم ہو) پھر اس شخص نے عرض کیا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ مجھے ایمان کی حقیقت بتائیں، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: (ایمان یہ ہے کہ) تو تصدیق کرے اللہ کی اور اس کے فرشتوں کی اور اس کی کتابوں کی، اور اس کے رسولوں کی اور قیامت کے دن کی اور ایمان لاوے تقدیر پر کہ اچھا برا، سب کچھ نوشتۂ تقدیر کے مطابق ہے، اس شخص نے (یہ سنکر) کہا: (آپ صلی اللہ علیہ وسلم) نے سچ فرمایا (پھر) اس شخص نے عرض کیا کہ اب آپ مجھے احسان کے متعلق خبر دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ شانہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، اور اگر ایسا ممکن نہ ہو (یعنی اتنا حضور قلب میسر نہ ہوسکے) تو پھر (یہ دھیان میں رکھو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے، پھر اس شخص نے عرض کیا کہ قیامت کے بارے میں مجھے بتایئے (کہ کب آئے گی؟) آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے

فرمایا کہ اس بارے میں مسئول عنہ سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا، پھراس نے کہا اچھا مجھے خبردیں قیامت کی کچھ نشانیوں کے بارے میں، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا (کہ قیامت کی علامت یہ ہے کہ) باندی اپنی مالکہ کو جنے اورتم دیکھوگے برہنہ پا، برہنہ جسم، نادار وفقیر اور بکریاں چرانے والوں کو عالیشان عمارات ومکانات میں فخر وغرور کرتے ہوئے (حضرت عمرؓ فرماتے ہیں) اس کے بعد وہ شخص چلا گیا اور میں چند دن ٹھہرا رہا (یعنی فوراً اس کے بارے میں دریافت نہیں کیا) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی مجھ سے فرمایا اے عمر! جانتے ہو سوال کرنے والا وہ شخص کون تھا؟ میں نے عرض کیا اللہ اوراس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا یہ جبرئیل علیہ السلام تھے (جو اس طریقہ سے) تم لوگوں کو تمہارا دین سکھانے آئے تھے، امام مسلمؒ نے اس حدیث کو اپنی کتاب صحیح مسلم میں اپنی سند سے بیان فرمایا ہے، حضرت ابوہریرہؓ نے بھی اس روایت کو چند الفاظ کے اختلاف وفرق کے ساتھ بیان کیا ہے (ان کی روایت کے آخری الفاظ یہ ہیں) **واذرایت الخ** کہ جب تم برہنہ پا، برہنہ جسم، اور بہرے گونگے لوگوں کو زمین پر حکمرانی کرتے دیکھو (تو سمجھ لو قیامت قریب ہے) قیامت ان پانچ چیزوں میں سے ایک ہے جن کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے، اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: "**ان اللہ عندہ علم الساعۃ وینزل الغیث**" آخر تک، (جس کا ترجمہ یہ ہے کہ: اللہ ہی کو قیامت کا علم ہے اور بارش کا، کہ کب برسائے گا اور وہی حاملہ کے پیٹ کی چیزوں کو جانتا ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کام کرے گا، اور کسی شخص کو معلوم نہیں کہ کس زمین میں اسے موت آئے گی، بے شک اللہ تعالیٰ ہی جاننے والا اور خبردار ہے) (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

عن عمر بن الخطابؓ قال بینماالخ :یہ حدیث جبرئیل ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس لگی ہوئی تھی اور صحابہ بیٹھے ہوئے تھے کہ اجنبی شخص کی شکل میں حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور چند سوالات کئے، اسلام کے بارے میں سوال کیا

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب دیا، ایمان کے بارے میں سوال کیا، احسان کے بارے میں سوال کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام کے جوابات ارشاد فرمائے، قیامت کے وقت کے بارے میں سوال کیا اس کے جواب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معذرت فرمادی، البتہ علامات قیامت کے بارے میں سوال کیا تو اس کا جواب مرحمت فرمایا۔

حدیث کی جامعیت:

علماء نے فرمایا کہ یہ روایت بہت جامع ہے، اس روایت میں پوری شریعت کا خلاصہ آ گیا ہے، تمام عبادات ظاہرہ وباطنہ اس میں آ گئی ہیں، کیونکہ دین کا خلاصہ تین چیزیں ہیں: عقائد، اعمال اور اخلاص واحسان، جس کو سلوک وتصوف بھی کہاجاتا ہے، اس حدیث میں یہ تینوں چیزیں آ گئیں ہیں، اس لئے یہ حدیث باقی تمام احادیث کے لئے بمنزلہ متن کے اور باقی احادیث اس کے لئے بمنزلہ شرح کے ہیں، اورحدیث نیت بمنزلہ بسم اللہ کے ہے، جیسے سورہ فاتحہ کہ اس میں قرآن کریم کے تمام اجمالی مضامین آ جانے کی وجہ سے وہ بمنزلہ متن کے اور باقی قرآن بمنزلہ اس کی شرح کے ہے۔

حدیث کے اسماء:

اس حدیث کی جامعیت کی وجہ سے اس کے متعدد نام رکھے گئے ہیں: (۱)ام الاحادیث (۲) ام السنۃ (۳)ام الجوامع (۴)اورمشہور نام حدیث جبرئیل ہے۔

حدیث پاک کا شان ورود:

اس حدیث کا شان ورود یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ اپنی ضرورت اوراپنی اصلاح نفس کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کیا کرتے تھے، منافقین، مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے، چنانچہ وہ بھی مجلس میں حاضر ہوتے، وہ لوگ وقت کوضائع کرنے اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان کرنے کے لئے بے ڈھنگے سوالات کرتے تھے، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: ''یَـاَیُّھَـاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْالاتَسْئَلُوْ ا عَنْ اَشْیَاءَ الــخ ''اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں سوالات نہ کیا کرو جو اگرتم پر ظاہر کردی جائیں توتمہیں ناگوار ہوں۔(۱)

(۱)سورۃ المائدۃ: ۱۰۱۔

اس آیت کے نزول کے بعد منافقین کے سوالات کا سلسلہ بند ہو گیا، لیکن خوف کی وجہ سے صحابہ نے بھی سوالات بند کر دیئے کہ اللہ کا عتاب نہ آ جائے، لیکن اس سے صحابہؓ کو پریشانی ہوئی کیونکہ ان کو مختلف دینی ضرورتیں پیش آتی رہتی تھیں، اس لئے ان کی تمنا رہتی تھی کہ کوئی شخص آ کر دین کے بارے میں سوالات کرے، آپ علیہ السلام جواب دیں جس سے ہمیں بھی علم حاصل ہو، دیہاتی لوگ آداب سے واقف نہیں ہوتے اور بڑوں کے یہاں ان کی گرفت بھی نہیں ہوتی، اس لئے وہ بے تکلف سوال کرتے ہیں، جس سے سننے والوں کو زیادہ فائدہ ہوسکتا تھا، اس بناء پر صحابۂ کرام کسی ایسے شخص کے منتظر تھے، اسی دوران ایک روز جبرئیل علیہ السلام ایک اجنبی انسان کی شکل میں تشریف لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ سوالات کئے جو حدیث میں مذکور ہیں۔ (۱)

بینــــمـــا: اس کی اصل "بین" ہے جو ظرف ہے، اس میں میم اور الف کا اضافہ ہوا ہے، الف کا اضافہ اشباع اور تحسین صوت کے لئے ہے، میم بھی اسی وجہ سے زائد کیا گیا ہے۔

عـنـد: ظرف ہے اور اس کا متعلق محذوف ہے "نـحـن حـاضــرون عند الخ" اور "حاضرون" "نحن" کی خبر ہے۔

ذات یــوم: ذات کا اضافہ تحسین کلام کے لئے ہے، بعض نے کہا کہ "الیوم" کا استعمال مطلق وقت کے معنیٰ میں بھی ہوتا ہے، وہ وقت خواہ دن ہو یا رات، جب اس لفظ کو دن کے ساتھ خاص کرنا منظور ہوتا ہے تو ذات کا لفظ بڑھا دیا جاتا ہے، یہاں یہی بتانے کے لئے "ذات" کا لفظ بڑھایا گیا ہے۔

طلع: بمعنی وَرَدَ و دَخَل، اس شخص کی آمد کو طَلَعَ سے تعبیر کیا، اس سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ آنے والے شخص کا چہرا انتہائی روشن و نورانی تھا، اس لئے کہ اہل عرب نورانی چیز کے آنے کو طلوع سے تعبیر کرتے ہیں، جیسے طلوع شمس، طلوع قمر، طلوع نہار، رات اندھیرے والی ہوتی ہے اس لئے طلوع لیل نہیں کہا جاتا۔

رجلٌ: کی تنوین تعظیم کے لئے ہے "ای رجـلٌ عـظـیـمٌ" یعنی ذی وقار ذی وجاہت شخص تھا، مراد اس سے حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔

(۱) مسلم شریف ۱/۲۹، والمرقاۃ ۱/۱۰۷۔

شــدیـد بیــاض الثیــاب : یہ اضافت لفظیہ ہے کہ صیغۂ صفت کی اضافت اپنے معمول کی طرف ہورہی ہے، اصل عبارت تھی: ''شـدیـدٌ بیـاضٌ ثیابُـه ''اور الثیـاب کا الف لام عوضی ہے اس کی اصل تھی: ''ثیابه'' یعنی آنے والے شخص کے کپڑے نہایت سفید تھے۔

طلبہ کو سفید کپڑوں کا اہتمام کرنا چاہئے:

اس سے معلوم ہوا کہ سفید کپڑا پہننا بالخصوص طلبہ کے لئے مستحب ہے خاص طور سے بڑوں کی خدمت میں جاتے وقت اس کا لحاظ زیادہ مناسب ہے، اگر سفید کپڑے میسر نہ ہوں تو پھر صاف ستھرے ضرور ہوں۔

شدید سواد الشعر : ابن حبان کی روایت میں ہے شدید سواد اللحیه [۱] کہ ڈاڑھی کے بال کالے تھے یعنی وہ نوجوان تھے۔

تحصیل علم کا زمانہ:

معلوم ہوا کہ تحصیل علم کا اصل وقت عنفوان شباب ہے کہ وہ قوت کا زمانہ ہوتا ہے،اس وقت الفاظ ومعانی کوذہن میں بٹھانا ان کو یادکرنا اور متحضر رکھنا سہل ہوتا ہے بڑھاپے میں حافظہ واعصاب کمزور ہوجاتے ہیں،سہو ونسیان کا غلبہ ہونے لگتا ہے۔ [۲]

لایــری الـخ :اس پر سفر کے آثار نظر نہیں آرہے تھے اور نہ ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا تھا، یعنی وہ شخص مدینہ کا نہیں تھا بلکہ کوئی مسافر تھا لیکن اس پر سفر کے آثار یعنی جسم وکپڑوں پر گردوغبار بھی نہیں تھا۔ یہ بات حضرت عمرؓ نے بطور تعجب کہی کہ پھر آخر یہ آنے والا کون ہے؟

یہاں سوال یہ ہے کہ اگر حضرت عمرؓ نے ان کو نہیں پہچانا تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ حضرات صحابہؓ میں سے کسی نے بھی نہ پہچانا ہو، پھر وہ سب کے پہچاننے کی نفی کیوں کررہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس شخص کے آنے پر حضرات صحابہؓ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے فنظر بعضنا الی بعض اس لئے حضرت عمرؓ نے سب کی طرف سے نفی کی ہے۔ [۳]

(۱)صحیح ابن حبان ۱/۳۹۰(۱٦۸).

(۲)المرقاة ۱/۱۰۸، مطبوعه اشرفیه دیوبند.

(۳)مرقاة ۱/۱۰۸، مطبوعه اشرفیه دیوبند.

اورخود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کب پہچانا؟ اس سلسلہ میں اگرچہ زین العرب نے فرمایا کہ آپ علیہ السلام نے اول وہلہ میں پہچان لیا تھا، لیکن حافظ ابن حجر نے بعض صریح روایات کی روشنی میں فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس وقت پہچانا جب جبرئیل علیہ السلام چلے گئے۔ (۱)

حتی جلس الخ: حتیٰ غایت کے لئے آتا ہے یہاں اس کا مغیا محذوف ہے، معنی یہ ہیں ''**لایعرفه مناأحد فاستأذن فاذن حتی جلس الخ**''

طالب علم کے لئے بیٹھنے کے آداب:

آنے والاشخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب بیٹھا، معلوم ہوا کہ طالب علم کو استاذ کے قریب بیٹھنا چاہئے، سائل کو مسئول کے قریب ہونا چاہئے، پھر بیٹھنے کی ہیئت بتائی کہ وہ دوزانو بیٹھا، معلوم ہوا کہ دوزانو بیٹھنا ادب ہے، اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں سے اپنے گھٹنے ملائے یہ تو بظاہر خلاف ادب ہے؟ لیکن ایسا اس لئے کیا تا کہ صحابہؓ اشتباہ میں رہیں کہ آنے والاکوئی دیہاتی ہے۔

فخذیه: اس کی ضمیر کا مرجع ''رجلٌ'' ہے کہ اس نے اپنی رانوں پر ہاتھ رکھے، لیکن نسائی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: **وضع کفیه علی فخذیه** (۲) کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رانوں پر ہاتھ رکھے لیکن یہ تو بے ادبی ہے پھر ایسا کیوں کیا؟ تو ایسایا تو کمالِ توجہ حاصل کرنے کے لئے کیا یا تعمیہ واشتباہ کے لئے کیا۔

یامحمد: اس شخص نے خطاب میں محمد کا لفظ استعمال کیا جو بظاہر بے ادبی ہے، مگر یہ بھی اشتباہِ حال کے لئے کہا تا کہ اس شخص کا دیہاتی پن ظاہر ہو اور کوئی پہچان نہ سکے، ملاعلی قاریؒ نے فرمایا کہ ہوسکتا ہے کہ محمد یہاں صفتی معنی میں ہو، یعنی وہ ذات جن کی تعریف کی گئی۔ (۳)

علاوہ ازیں مسند ابی حنیفہ میں اس موقعہ پر یارسول اللہ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، نیز مسند ابی حنیفہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حاضری کے وقت سلام کیا اور آپ علیہ السلام نے جواب دیا۔ (۴)

---

(۱) مرقاة ۱/۱۰۸، مطبوعه اشرفیه دیوبند. فتح الباری ۱/۱۵۷ مطبوعه شیخ الهند فی آخر المبحث تحت عنوان ''تنبیهات''

(۲) سن نسائی ۲/۲۲۹ (٤٩٩٠)

(۳) المرقاة ۱/ ۱۵، مطبوعه مکتبه امدادیه، ملتان پاکستان.

(٤) مسند الإمام أبي حنيفة: ص ۲۱: برقم ۱.

اخبرني عن الاسلام: بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ماہیت اسلام معلوم کرنا مقصود تھا، لیکن حقیقۃً مقصد اعمالِ اسلام معلوم کرنا تھا، جیسا کہ جواب اور تصدیق جواب سے معلوم ہورہا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں اولاً شہادتین کو بیان فرمایا کیونکہ اس کے بغیر کوئی بھی عمل معتبر مقبول نہیں ہے۔

پھر نماز کو بیان فرمایا، اس کے لئے **تقیم الصلوۃ** فرمایا **تصلی الصلوۃ** نہیں، کیونکہ اقامت کے معنی ہیں: کسی چیز کو سیدھا کھڑا کرنا،(۱) پس اقامت صلوۃ کا حاصل یہ ہے کہ نماز کے فرائض، واجبات اور سنن و مستحبات کا لحاظ کرکے نماز پڑھی جائے اور اس پر مواظبت بھی ہو، بندوں سے منجانب اللہ ایسی ہی نماز مطلوب ہے اسی لئے مقام مدح میں **والمقیمین الصلوۃ** فرمایا گیا ہے اور مقام ذم میں **فویل للمصلین** بولا گیا، کیونکہ مطلق نماز پڑھنا بسا اوقات خراب طریقہ پر بھی ہوتا ہے۔

اس موقعہ پر مسلم میں ''الصلاۃ'' کے ساتھ ''المکتوبۃ'' کی قید بھی وارد ہے، لہٰذا یہاں بھی ''الصلاۃ'' سے صلاۃ مفروضہ مراد ہوگی، اور یہ ''صلاۃ نافلۃ'' سے احتراز ہوگا، کیونکہ وہ ارکان اسلام میں شمار نہیں۔(۲)

حج کی استطاعت کا مفہوم:

یہاں اعمال اسلام کو بتاتے ہوئے حج میں ''استطاعت'' کی قید لگائی حالانکہ استطاعت تو زکوۃ، صوم اور رمضان میں بھی ضروری ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ حج میں ایک خاص قسم کی استطاعت ضروری ہے اور وہ ہے زاد وراحلہ پر قادر ہونا، اور بدن کا صحیح ہونا گویا کہ استطاعت بدنی و مالی دونوں ضروری ہیں، اسی لئے عند الاحناف نابینا پر حج فرض نہیں، خواہ وہ مالدار ہو، امام شافعیؒ کے یہاں استطاعت مالی شرط ہے بدنی نہیں، اس لئے ان کے یہاں نابینا پر بھی حج فرض ہے، امام مالک کے یہاں استطاعت بدنی ضروری ہے مالی ضروری نہیں ہے، لہٰذا ان کے یہاں صحیح البدن فقیر پر بھی حج فرض ہے، ایسا شخص حج کے لئے کماتا ہوا جائے جہاں مال ختم ہوجائے وہاں ٹھہر جائے اور کمائے پھر آگے چلے اسی طرح مکہ مکرمہ تک پہنچے۔

فعجبنا: سائل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کی تصدیق کی، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں تعجب ہوا کہ سوال بھی کررہا ہے اور تصدیق بھی! کیوں کہ سوال تقاضا کرتا ہے عدم علم کا اور تصدیق تقاضا کرتی ہے

(۱) تفسير البيضاوي ۱/۱۱۵ ط: دار الفكر.

(۲) مسلم ۱/۲۹، كتاب الايمان.

سبقت علم کا، ان دونوں کا جمع ہونا یقیناً موجب حیرت وتعجب تھا۔

ایمان کیا ہے:

اخبرنی عن الإيمان :اس نے دوسرا سوال کیا جو ایمان کے متعلق ہے، صاحب مشکوۃ نے یہاں تغیر کیا ہے، مصابیح السنۃ میں ایمان کا سوال پہلے ہے اور اسلام کا سوال دوسرے نمبر پر ہے۔ (۱)

امام بغویؒ کے ایک تسامح پر تنبیہ:

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ روایت دو صحابہؓ سے مروی ہے حضرت عمرؓ سے اور حضرت ابو ہریرہؓ سے، حضرت عمرؓ کی روایت مسلم کی ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت متفق علیہ ہے، ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ایمان کا تذکرہ پہلے اور اسلام کا بعد میں ہے، امام بغوی نے مصابیح السنۃ میں حدیث عمرؓ کے الفاظ نقل کئے ہیں، اور سوال پہلے ایمان کا نقل کیا حالانکہ ان کی حدیث میں اسلام کا سوال مقدم تھا، یہ امام بغوی کو تسامح ہوا، صاحب مشکوۃ نے اس کو صحیح کیا اور مسلم کی روایت کے مطابق مشکوۃ میں روایت درج فرمائی۔

ایک اشکال وجواب:

أن تؤمن بالله الخ : یہاں اشکال ہے کہ ایمان کے متعلق سوال کیا جارہا ہے اور ایمان کے لفظ سے ہی اس کا جواب دیا جارہا ہے یہ تو تعریف الشئ بنفسہ ہے جو ناجائز ہے؟

جواب: الایمان میں ایمان سے مراد ایمانِ شرعی ہے یعنی " **التصديق بماعلم بالضرورة أنه من دين محمد** " اور أن تؤمن میں ایمان کے لغوی معنی مراد ہیں کہ تصدیق کرے تو اللہ کی اس کے رسولوں کی اسکی کتابوں کی، الحاصل سوال میں ایمان کے شرعی معنی مراد ہیں اور جواب میں لغوی معنی، اس لئے یہ تعریف الشی بنفسہ نہیں ہے۔

ایمان باللہ اور اس کے تحت داخل امور:

ایمان باللہ میں تین چیزیں داخل ہیں:

(۱) اللہ کے وجود کو تسلیم کرے، اس کا انکار نہ کرے جیسا کہ دہریہ انکار کرتے ہیں۔ وجود باری تعالیٰ کے

(۱) المفاتيح شرح المصابيح ١ / ٤٠.

بہت دلائل ہیں: ''اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ الخ (۱)'' زمین میں اور خود انسان کی ذات میں وجود باری تعالی کی نشانیاں موجود ہیں، ''وفی الأرض آیات للمؤقنین وفی انفسکم افلا تبصرون (۲)'' اس بدن انسانی میں عقلاء حیران ہیں، دماغ کی رگوں کی حقیقت تک اب تک بھی ڈاکٹر نہیں پہنچ سکے، اگر بدن انسانی کی رگوں کو پھیلایا جائے تو دور تک ان کا پھیلاؤ ہو جائے، حلق میں سانس کی نلکی الگ ہے، اور کھانے کی نلکی الگ ہے غذا کھانے کی نلکی میں جاتی ہے، غذا کا کوئی ذرہ اگر سانس کی نلکی میں چلا جائے تو پھندہ لگ جاتا ہے مگر غذا کا از خود کھانے والی نلکی میں ہی جانا خدا کی قدرت کا کھلا مشاہدہ ہے، غرض یہ کہ وجود باری تعالی پر بے شمار دلائل ہیں، مشہور ہے کہ ایک چرواہے نے وجود باری پر استدلال کرتے ہوئے کہا:

البعرة تدل على البعير والاقدام تدل على المسير
فالسماء ذات البروج والأرض ذات الفجاج
كيف لاتدل على اللطيف الخبير

یعنی مینگنیاں اونٹوں کے گذرنے پر اور نشاناتِ قدم لوگوں کے چلنے پر دلالت کرتے ہیں، تو برجوں والا آسمان اور پہاڑوں والی زمین اللہ لطیف وخبیر کی جانب کیسے رہنمائی نہیں کرے گا۔

مگر یہ نشانیاں اہل دانش کو نظر آتی ہیں، ایک بوڑھی عورت سے پوچھا گیا کہ تو نے اللہ کو کس طرح پہچانا؟ اس نے کہا کہ میں نے اس چرخہ سے اللہ کو پہچانا کہ یہ بغیر چلائے نہیں چلتا، تو زمین وآسمان کا یہ مضبوط نظام بغیر چلانے والے کے کیسے چل سکتا ہے، کسی نے کہا:

وفي كل شئ له آية تدل على أنه واحدٌ

ہر چیز میں ایک نشانی ہے جو اللہ کے ایک ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

(۲) وحدانیت کی تصدیق کرے کہ وہ اکیلا اس کائنات کا خالق ہے، اور وہ تنہا اس کے نظام کو چلا رہا ہے اور وہی تنہا عبادت کا مستحق ہے، قرآن میں ہے: ''لَوْ کَانَ فِیْهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (۳)'' اگر آسمان

(۱) البقرة: ۱٦٤.

(۲) الذاريات: ۱۹—۲۰.

(۳) سورة الانبياء: ۲۲.

وزمین میں اللہ کے سوا دوسرے خدا ہوتے تو دونوں درہم برہم ہوجاتے، پس کائنات کے نظام کی درستگی اس کے صانع وخالق کے ایک ہونے کی بیّن دلیل ہے۔

(۳) اللہ کے لئے صفات کمالیہ کو ثابت مانے اور نقائص کی نفی کرے، اوراس کی صفات کو مخلوق کے مشابہ نہ سمجھے۔

ایمان بالملائکہ اور لفظ ''ملائکۃ'' کی تحقیق:

وملائکتہ :یہ مَلَکٌ کی جمع ہے، یہ اصل میں **ملئکٌ** تھا اس میں قلب مکانی ہوا ہے، اصل تھا: مئلک جو ألوکة سے ماخوذ ہے بمعنیٰ پیغام رسانی، ألوکہ میں قلب مکانی ہوا تو ملئک ہوگیا پھر تخفیف کی وجہ سے ہمزہ حذف کردیا گیا۔ (۱)

ایمان بالملائکہ یہ ہے کہ ان کے وجود کو تسلیم کرے، یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ انسان کے اندر جو جذباتِ خیر پائے جاتے ہیں انہیں کو ملائکہ کہا جاتا ہے، ان کے معصوم ہونے کا عقیدہ رکھے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ''**لایعصون اللہ الخ**''، ان کے مختلف المرتبہ ہونے کو تسلیم کرے کہ درجہ کے لحاظ سے کوئی بڑا ہے کوئی چھوٹا۔ (۲)

آسمانی کتابوں پر ایمان:

وکتبــــہ : ایمان بالکتب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ نے بہت سے رسولوں کو بھیجا اوران پر کتابیں نازل فرمائیں، ان تمام کتابوں پر اجمالاً ایمان لاوے یعنی یہ کہ وہ سب اللہ کا کلام ہے اوران میں جو کچھ فرمایا گیا وہ برحق ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ کل ۱۰۴ کتابیں نازل ہوئیں ، دس آدم علیہ السلام پر، پچاس شیث علیہ السلام پر، تیس ادریس علیہ السلام پر، دس ابراہیم علیہ السلام پر، ایک داود علیہ السلام پر ایک موسیٰ علیہ السلام پر، ایک عیسیٰ علیہ السلام پر اور ایک آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یعنی قرآن پاک جو ان میں سب سے افضل ہے۔ (۳)

(۱) المرقاۃ ۱/ ۱۱۶.

(۲) المرقاۃ ۱/ ۱۱۶.

(۳) المرقاۃ ۱/ ۱۱۷.

رسولوں پر ایمان:

ورسله: رسولوں پر بھی ایمان رکھنا ضروری ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت اور اپنے احکامات ان تک پہنچانے کے لئے کچھ انسانوں کا انتخاب کیا، ان میں سے کچھ کا تذکرہ قرآن کریم میں ہے اور اکثر کا تذکرہ قرآن کریم میں نہیں ہے، ان کے بارے میں اجمالی طور پر بتلایا گیا ہے، پس یہ ایمان رکھنا ضروری ہے کہ اللہ کی طرف سے رسول بھیجے گئے، اور قرآن کریم میں جن کی تعیین کردی گئی ان کو بالتعیین رسول ماننا ضروری ہے اور جن کی تعیین نہیں کی گئی ان پر اجمالی ایمان ضروری ہے کہ جس کو بھی رسول بنایا گیا وہ برحق تھا۔

یوم آخرت پر ایمان اور اس کا مصداق:

والیـــوم الآخـــر: اس سے مراد قیامت کا دن ہے، قبروں سے اٹھنے تک اور پھر وہاں سے دخول جنت اور دخول جہنم تک کے زمانہ کو ''یوم آخر'' کہا جاتا ہے، زمانہ اس کے بعد بھی ہوگا لیکن اس کے بعد رات نہیں ہوگی طلوع وغروب کا یہ نظام نہیں ہوگا، اس لئے اس وقت کو یوم آخر قرار دیا گیا۔

اس پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے وقوع کو تسلیم کرے اور اس میں حساب وکتاب، قیام میزان اور جنت وجہنم کی تصدیق کرے۔ (۱)

تقدیر پر ایمان:

وتـؤمن بالقدر الخ: مباحث قدر اگلے باب میں آئیں گے، ایمان بالقدر کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ ہو چکا یا ہو رہا ہے اور آئندہ جو کچھ ہوگا وہ سب اللہ کو ازل سے معلوم ہے، اور اللہ ہی کے ارادہ وخلق سے ہر چیز کا وجود ہے، اس نے یہ سب کچھ پہلے ہی مقدر فرمادیا تھا، اسی تقدیر کے مطابق یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

اعادۂ عامل کی وجہ:

پھر ملائکہ، رسل، کتب وغیرہ پر ایمان کو بیان کرتے ہوئے عامل کا اعادہ نہیں کیا اور تقدیر پر ایمان کو بیان کرتے ہوئے عامل (یعنی ''تؤمن'') کا اعادہ کیا ہے، حالانکہ بذریعۂ عطف اس کو بھی بیان کیا جاسکتا تھا؟ اس

(۱) المفاتیح ۱/۴۳، فتح الإله ۱/۱۹۵-۱۹۶، شرح الطیبی ۱/۸۸.

کی دو وجہیں ہیں:

(۱) ایمان بالقدر ایک محیرالعقول عقیدہ ہے اس لئے عامل کا اعادہ کیا گیا ہے۔

(۲) ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے کہ ماقبل کے مومن بہ ایسے ہیں کہ ان کا کسی بھی طرح انکار موجب کفر ہے اور تقدیر کا انکار علی الاطلاق موجب کفر نہیں، بلکہ اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ تقدیر کے باب میں فرقۂ جبریہ اور فرقۂ قدریہ اختلاف کرتے ہیں، جبریہ کا کہنا یہ ہے کہ افعال کا خلق اللہ کرتا ہے بندہ کا سب بھی نہیں ہے، انھوں نے بندہ کو مجبور قرار دیا، اور فرقۂ قدریہ کا کہنا یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے، افعالِ عباد میں اللہ کی قدرت مؤثر نہیں ہے، انہوں نے تقدیر کا سرے سے انکار کردیا، اسکا حاصل یہ ہوا کہ جبریہ وقدریہ دونوں نے تقدیر کا انکار کیا پس ان پر کیا حکم لگایا جائے گا؟

اس میں تفصیل یہ ہے کہ فرقۂ جبریہ میں سے اگر کوئی بندہ کے مکلّف ہونے کا انکار کرے تو وہ کافر ہے اور اگر محض اللہ کی تعظیم کی وجہ سے جبر کا قائل ہے اور بندہ کے مکلّف ہونے کا صراحۃً انکار نہیں کرتا تو وہ مبتدع ہے، اسی طرح قدریہ میں سے اگر کوئی شخص اللہ کی صفت خلق میں حقیقی شرکت کا عقیدہ رکھے تو یہ کفر ہے، اور اگر تقدیر کا منکر اس لئے ہے کہ فعل قبیح کی نسبت اللہ کی طرف لازم نہ آئے، تو وہ مبتدع ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ انکار تقدیر علی الاطلاق کفر نہیں ہے، اس فرق کی وجہ سے اس مومن بہ کو الگ بیان کیا اور عامل کا اعادہ کیا گیا۔(۱)

احسان کا مفہوم اور عمل کے طریقے:

قال فأخبرني عن الإحسان الخ: سائل نے تیسرا سوال احسان کے بارے میں کیا، احسان کے معنی ہیں: احسان العمل یعنی کسی کام کو اچھے طریقہ سے انجام دینا، سائل کا مقصد یہ ہے کہ ارکان خمسہ اور دیگر اعمال کو عمدہ طریقہ پر ادا کرنے کی صورت کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے دو طریقے بتائے ایک اعلی اور دوسرا ادنی:

اعلی طریقہ یہ ہے کہ استحضاری کیفیت اتنی بڑھ جائے گویا بندہ اللہ کو دیکھ رہا ہے، صوفیاء کی اصطلاح میں اس کو "استغراق ومشاہدہ" کہا جاتا ہے، اس حالت میں جو عبادت ادا کی جائے گی وہ نہایت اعلی درجہ کی

(۱) المرقاة ۱/۱۱٦.

ہوگی، جیسے غلام آقا کے احکام کی تعمیل اس وقت کرے جب وہ سامنے ہواور غلام کواوراس کے کام کو دیکھ رہا ہو، اس وقت غلام خوش اسلوبی سے وظائفِ خدمت انجام دیتا ہے، اسی طرح بندہ جب یہ محسوس کرے کہ میں مولیٰ کے سامنے ہوں اوروہ میرے ہرکام اور ہرحرکت کو دیکھ رہا ہے اس وقت اس کی بندگی میں ایک خاص شانِ نیاز مندی پیدا ہوگی اورعبادت عمدہ کیفیت کے ساتھ ادا ہوگی۔

ادنی طریقہ یہ ہے کہ اگراس قدر استحضاری کیفیت حاصل نہ ہوتو پھراس عقیدہ کو تازہ کرلیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے کما قال اللہ تعالیٰ: ''**اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرَى الآيه**'' اس عقیدہ کے استحضار سے بھی عبادت شاندار ادا ہوگی، جیسے مکتب کا مدرس بچوں کے درمیان ہواور بچوں پراس کی نظر ہوتواس وقت زیادہ توجہ سے پڑھتے ہیں، اوراگر وہ وہاں سے اٹھ کر استنجاء کے لئے چلا جائے اورروشن دان سے بچوں کو دیکھے اور بچے اس کو نہ دیکھ رہے ہوں مگر بچوں کو یقین ہو کہ ان کی ہرحالت استاذ کی نگاہ میں ہے تواس وقت بھی بچے دنگا فساد نہیں کریں گے اورسکون سے پڑھیں گے، لیکن ظاہر ہے کہ استاذ سامنے ہونے کی صورت میں زیادہ توجہ سے پڑھتے ہیں، اس دوسرے درجہ کو ''مراقبہ واستحضار'' کہا جاتا ہے۔ (۱)

تصوف کے لئے قرآن کریم میں یہی احسان کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے لہٰذا یہ تصوف قرآن وسنت سے ثابت اورمشروع امر ہے، بدعت نہیں ہے، جیسا کہ بعض حقیقت سے ناآشنا لوگوں کا خیال ہے۔

قیامت کب آئے گی:

قال فاخبرنی عن الساعة الخ : ای عن وقت قیام الساعة، دنیا کی تخلیق کا مقصد خالق کی عبادت ہے، یہ مقصد اسلام، ایمان اوراحسان سے حاصل ہوگیا، اس لئے اب دنیا کے خاتمہ یعنی قیامت کے متعلق سوال کیا جارہا ہے، یہ سوال صحابہ بھی کیا کرتے تھے اورکفار بھی، لیکن صحابہؓ حصول علم کے لئے اورکفار ازراہِ انکار سوال کرتے، کیونکہ کفار کے لئے قیامت کا عقیدہ ہی سب سے زیادہ حیران کن تھا ورنہ وہ اللہ کوتو مانتے تھے، ان کا اشکال یہ تھا کہ ہزاروں سال پہلے مرے ہوئے لوگوں کو کون زندہ کرے گا؟ ''**مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِىْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ**'' اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ نے کفار کا سوال نقل فرما کراس کا نہایت معقول جواب مرحمت فرمایا ہے، بہرحال لوگ سوال کرتے تھے کہ قیامت کب

(۱) المرقاۃ ۱/۱۲۰–۱۲۱ء فتح الإله ۱/۱۱،۲۰۱۱،۲۰۲، شرح الطیبی ۱/۹۲–۹۶ لمعات ۱/۲۰۷–۲۱۱.

آئے گی؟ جبرئیل علیہ السلام نے بھی یہ سوال کیا۔

الساعة: بمعنیٰ مطلق وقت، غیر معین زمانہ، قرآن وحدیث کی اصطلاح میں اس سے قیامت مراد ہے۔ (۱)

ماالمسئول عنها بأعلم من السائل: جبرئیل علیہ السلام نے قیامت کے بارے میں سوال کیا حالانکہ ان کو معلوم تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قیامت کا علم نہیں ہے؟ اس میں اس بات کی تعلیم دینا مقصود ہے کہ جس چیز کا علم نہ ہو اس کے بارے میں لاعلمی ظاہر کرنے میں شرم نہیں محسوس کرنی چاہئے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لاعلمی ظاہر فرمادی۔

یہاں شراح نے لکھا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے سوال کے جواب میں لاأدری فرمانے کے بجائے مذکورہ تعبیر اس لئے اختیار فرمائی کہ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ کسی بھی سائل اور کسی بھی مسئول کو قیامت کا علم نہیں ہے۔ (۲)

"**ماالمسئول عنهاباعلم**" اس جملہ میں حرف نفی معنیٰ اسم تفضیل پر داخل ہے اور جب صیغہ تفضیل پر نفی داخل ہوتی ہے تو نفس فعل کی نفی نہیں ہوتی بلکہ زیادتی کی نفی ہوتی ہے، اس لئے یہاں سوال یہ ہے کہ کیا قیامت قائم ہونے کا کچھ علم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور جبرئیل علیہ السلام کو حاصل تھا کہ جس کی بنا پر زیادۃِ علم کی نفی کرنا صحیح ہوجائے؟

جواب یہ ہے کہ قیام قیامت کے تحقق کا نفس علم آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور جبرئیل علیہ السلام دونوں کو تھا اس سے زیادہ (قیامت کے معین وقت) کا علم کسی کو نہ تھا اس لئے صیغہ تفضیل پر نفی داخل کرکے زیادتی کی نفی کی جارہی ہے۔

آپ علیہ السلام کے عالم الغیب ہونے کے بریلوی عقیدے کی تردید:

آپ علیہ السلام کے اس جملہ "**ماالمسئول عنها بأعلم من السائل**" سے اس کی بھی نفی ہوجاتی ہے کہ آپ علیہ السلام کو علم غیب حاصل تھا جیسا کہ بریلوی حضرات اس کے قائل ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو أنباء الغیب یعنی آئندہ وپچھلی بہت سی اخبار وواقعات کا علم عطاء کیا گیا تھا نہ یہ کہ مطلق علم غیب آپ کو

(۱) شرح الطیبی ۱/۹۶، مرقاۃ ۱/۱۲۲، فتح الالہ ۱/۲۰۶.

(۲) المرقاۃ ۱/۱۲۳ فتح الالہ ۱/۲۰۶-۲۰۷.

حاصل تھا، ورنہ پھر آپ یہ نہ فرماتے: "ماالمسئول عنها باعلم من السائل" علم غیب یہ ہے کہ "جميع ماكان ومايكون إلى يوم القيامة" کا علم ہو، ایک ایک جزئی اور ایک ایک ذرہ کا علم ہو، جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت جو سب سے بڑا حادثہ ہے اسی کا علم نہ تھا، پھر یہ دعوی کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ آپ کو علم غیب تھا۔

علاماتِ قیامت اور اس کی اقسام:

قال فاخبرني عن أماراتها الخ: قیامت کے وقت کے بارے میں سوال کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معذرت فرمائی تو سائل نے قیامت کی ان علامات وآثار کے متعلق سوال کیا جن کا وقوع قیامت سے پہلے ہوگا، اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی علامات بعیدہ بیان فرمائیں۔

علامات قیامت دوقسم کی ہیں: (۱) علامات قریبہ، جو عین قرب قیامت میں ظاہر ہوں گی، (۲) علامات بعیدہ، جن کا وقوع قیامت سے پہلے ہوگا۔

یہاں جواب میں چند علامات بعیدہ کو بیان فرمایا گیا ہے:

(۱) باندی آقا کو جنے گی:

ان تلد الأمة ربتها الخ: یعنی باندی جنے گی اپنے آقا و مالکہ کو، اس کے تین مطلب بیان کئے گئے ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ یہ کنایہ ہے اولاد کے نافرمان ہونے سے، اولاد نافرمان بہت ہوگی بلکہ والدین پر حکمرانی کرے گی، جیسے آقا غلام اور باندی پر حکم چلاتا ہے، تو "الأمة" سے مراد ہوگی "ماں" اور "ربة" سے مراد ہوگی اولاد، "ربة" بمعنی مؤنث اولاد اور جب مونث اولاد حکم چلائے گی تو مذکر تو بدرجہ اولیٰ حکم چلائے گی۔ (۱)

(۲) بعض نے کہا کہ یہ کنایہ ہے کثرت فتوحات سے، یعنی فتوحات بہت ہوں گی، مسلمان بہت سے ممالک کو فتح کریں گے، اور فتوحات جب بہت ہوں گی تو باندیاں بھی بہت ہوں گی، یہاں تک کہ باندی سے بچہ ہوگا پھر باپ مرجائے گا اور وہ بچہ اپنے باپ کے تمام اموال کا مالک بنے گا، یہاں تک کہ اپنی ماں پر بھی تسلط قائم کرے گا اور اس کو پتہ بھی نہیں ہوگا کہ یہ میری والدہ ہے۔ (۲)

---

(۱) فتح الإله ۱/۲۱۰، المرقاة ۱/۱۲۵.

(۲) شرح الطيبي ۱/۹۷، فتح الإله ۱/۲۰۹، المرقاة ۱/۱۲٤، لمعات التنقيح ۱/۲۱۱-۲۱۳.

(۳) بعض نے کہا کہ یہ کنایہ ہے کثرت جہالت سے، کہ جہالت کی وجہ سے لوگ ام ولد کی بھی بیع کریں گے (ام ولد وہ باندی جس سے آقا نے وطی کی ہو اوراس سے بچہ ہوا ہو، یہ آقا کے مرنے کے بعد آزاد ہوتی ہے اوراس کی بیع جائز نہیں ہے) اور جب آدمی اپنی ام ولد کی بیع کرے گا تو وہ ام ولد فروخت ہوتے ہوئے مختلف ہاتھوں میں پہنچے گی، یہاںتک کہ ایک مدت کے بعد اس کی بھی نوبت آجائے گی کہ اس ام ولد کا جو بچہ تھا جو اپنے باپ کے پاس رہ گیا تھا وہ بڑا ہو کر اس اپنی ماں کو ایک باندی سمجھ کر خریدے گا، نہ اس باندی کو خبر ہوگی کہ یہ میرا بیٹا ہے اور نہ اس بیٹے کو خبر ہوگی کہ یہ میری باندی ہے، تو جب بیٹے نے اس ماں کو خرید لیا تو اس خریدنے کی وجہ سے (ظاہراً) اس کا ''رب'' (مالک) ہوجائے گا اور یہاں پر یہ بات صادق آئے گی کہ باندی نے اپنے مولیٰ کو جنا۔(۱)

(۲) ذلیل لوگ عزت والے ہوجائیں گے:

وأن تری الحفاۃ العراۃ الخ: یعنی ذلیل لوگ عزیز ہوجائیں گے اور وہ تکبر اور فخر میں مبتلا ہوں گے اور عزیزوں کو ذلیل کیا جائے گا۔ ''حفاۃ'' جمع ہے ''حافی'' کی جس کے پاس جوتا نہ ہو، یعنی ننگے پیر، ''عراۃ'' جمع ہے ''عاری'' کی، بمعنی جس کے بدن پر کپڑا نہ ہو، ''عالۃ'' جمع ہے عائل کی بمعنی فقیر و محتاج، ''رعاء'' جمع ہے ''راعی'' کی بمعنی چرواہا، اس قسم کے نادار اور معمولی درجہ کے لوگ عالیشان عمارتیں بنوائیں گے اوران کی وجہ سے فخر کریں گے۔(۲)

''تطاول'' باب تفاعل سے ہے، اس باب میں تقابل کے معنی پائے جاتے ہیں، یعنی ہر شخص یہ چاہے گا کہ میرا مکان محلّہ میں سب سے نمایاں ہو، کم سے کم پڑوسی کے مقابلہ میں میرا مکان اچھا ہو، کچھ وقت سے عمارتوں کی طرف لوگوں کی توجہ بہت زیادہ ہوگئی ہے جس کے پاس چار پیسے آجاویں اس کو سب سے پہلے مکان بنانے کی فکر ہوتی ہے، باقی تمام حاجتیں پیچھے چھوڑ دی جاتی ہیں، البتہ طویل اوراونچی عمارت بنانا بطور تقابل وتفاخر کے ناپسندیدہ ہے، اگر ضرورۃً طویل اور اونچی عمارت بنائی جائے اس میں کچھ حرج نہیں۔

قال فلبثت ملیا الخ: حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ وہ شخص چلا گیا پھر میں کچھ عرصہ تک ٹھیرا رہا، آپ

---

(۱) فتح الالہ ۱/۲۰۹، المرقاۃ ۱/۱۲۵، لمعات التنقیح ۱/۲۱۴.

(۲) المرقاۃ ۱/۱۲۵.

صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں استفسار نہیں کیا، مــلیــاً: بمعنیٰ زمانۂ طویل، مگر یہاں اس سے مراد تین دن ہیں، اس لئے کہ ابوداؤد کی ایک روایت میں ''ثــلثة ایـام'' کے الفاظ آئے ہیں،[۱] اور مطلب یہ ہے کہ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا کہ جانتے ہو وہ سائل کون تھا؟ میں نے کہا اللہ ورسولہ اعلم کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔

اللہ ورسولہ اعلم کا مفہوم ومقصد:

حضرات صحابہ کا یہ ادب تھا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات پوچھتے تو خواہ وہ بات معلوم ہو پھر بھی کہتے تھے اللــہ ورسولـہ أعلم، مقصد یہ ہوتا تھا کہ ہمارا علم ناقص ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا جواب بتائیں گے تو کامل علم حاصل ہوگا، اس جملہ کی عبارت ہوتی ہے **اللہ ورسولہ کل منهما أعلم۔**

سوال: اشکال ہوگا کہ حق تعالیٰ شانہ اعلم ہے، وہ عالم الغیب ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو عالم الغیب نہیں ہیں، پھر اعلم ہونے میں آپ کو کیسے شریک کیا؟

جواب: اس جیسے کلام میں اعلم کا تعلق ہر چیز سے نہیں ہوتا، بلکہ اسی جملہ سے تعلق ہوتا ہے جس میں گفتگو ہو رہی ہے، یہاں مراد یہ ہے کہ سائل کو اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں، رسول کے حق میں تمام چیزوں کا زیادہ جاننا مراد نہیں ہے۔

اتاكم يعلمكم دينكم: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ وہ جبرئیل تھے جو تم کو تمہارا دین سکھانے کے لئے آئے تھے، اصل دین تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا، جوابات آپ نے دیئے، لیکن جبرئیل کی طرف نسبت سبب اور ذریعہ ہونے کے اعتبار سے ہے۔

تاریخ حدیث جبرئیل:

یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اخیر عمر میں حجۃ الوداع سے قبل پیش آیا؛ چنانچہ بعض روایات میں صراحت ہے: **بينما نحن عند رسول الله صلى الله عليه وسلم في آخر عمره.**[۲] اور اخیر عمر میں

---

(۱) أبوداود ۲/ ٦٤٥، فيه: ''فلبثت ثلاثا'' نسائی ۲/ ۲۲۹ میں یہی الفاظ ہیں، ترمذی شریف ۲/ ۸۸ میں یہ الفاظ ہیں ''قال عمر فلقيني النبي صلى الله عليه وسلم بعد ذلک بثلاث''

(۲) المرقاة ۱/ ۱۰۷ اشرفيه ديوبند.

آنے کا مقصد یہ تھا کہ ابتک دین کی جو باتیں تفصیلاً آچکی تھیں ان کا اجمالی خاکہ اخیر میں پیش کردیا جائے تاکہ صحابہؓ اس کو محفوظ کرلیں اوران کو استحضار میں سہولت ہوجائے۔ (۱)

ایک اشکال اوراس کا جواب:

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کے جانے کے بعد ہی بتادیا تھا کہ یہ جبرئیل تھے حالانکہ حضرت عمرؓ کی روایت میں تین دن کے بعد بتانا مذکور ہے جیسا کہ اوپر گذرا؟ جواب یہ ہے کہ اختتام مجلس پر بہت سے صحابہ چلے گئے تھے کچھ باقی رہ گئے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا حضرت ابوہریرہؓ وہیں رہنے والوں میں تھے ان کو اسی وقت علم ہوگیا، حضرت عمرؓ چلے گئے تھے اس لئے ان کو تین دن بعد علم ہوا، پس انھوں نے اپنے علم کے لحاظ سے تین دن کی بات نقل فرمائی۔

حضرت عمرؓ اورحضرت ابوہریرہؓ کی روایت کا فرق:

ورواه ابوهريرة مع اختلاف الخ : یہ روایت حضرت عمرؓ کے علاوہ ابوہریرہؓ سے بھی مروی ہے مگر دونوں میں کچھ فرق ہے:

(۱) حضرت عمرؓ کی روایت اَفرادِ مسلم میں سے ہے جیسا کہ مصنف نے اس کے بارے میں فرمایا: "**ورواه مسلم**" اورحضرت ابوہریرہؓ کی روایت متفق علیہ ہے، یعنی بخاری ومسلم دونوں نے اس کو روایت کیا ہے۔

(۲) دونوں میں الفاظ کا بھی فرق ہے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں **الحفاة العراة** کے ساتھ **الصم البكم ملوک الأرض** کے الفاظ بھی آتے ہیں، **ملوک الارض** رأیت کا مفعول ثانی ہے کہ نااہل اور ذلیل لوگ زمین کے بادشاہ ہوں گے، بہرے سے مراد وہ شخص ہے جو حق بات کے سننے سے بہرا ہو، اور گونگے سے مراد وہ ہے جو اپنی زبان سے حق بات نہ کہتا ہو۔

(۳) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں یہ عبارت بھی ہے: **فی خمس الخ** جس کی تقدیر عبارت ہے: **متفکرین فی خمس، الخ** کہ یہ ذلیل اورکم عقل لوگ ان پانچ چیزوں میں غور وفکر کرنے لگیں گے جن کا علم اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں ہے، جو اس آیت میں مذکور ہیں: "**اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ**

(۱) المرقاة ۱/۱۰۷ اشرفیہ دیوبند.

وَيَعْلَمُ مَافِي الاَرْحَامِ وَمَاتَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَداً وَمَاتَدْرِیْ نَفْسٌ بِأَیِّ أَرْضٍ تَمُوْتَ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (۱)'' (بلاشبہ اللہ ہی کو قیامت کا علم ہے، اور وہی بارش برساتا ہے، اور وہی اس کو جانتا ہے جو رحم مادر میں ہے، اور وہی جانتا ہے کہ کون انسان کل کیا کرے گا اور کس کی کہاں موت آئے گی، بیشک اللہ علم والا اور باخبر ہے) یعنی یہ لوگ ان چیزوں میں بھی رائے زنی کریں گے اور اپنے کو بڑا سمجھیں گے۔

بعض نے کہا کہ فی خمس کا تعلق **ماالمسئول عنها بأعلم من السائل** سے ہے أي: **علم قيام الساعة في خمس لايعلمهن الخ** یعنی قیامت کا علم ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کو صرف اللہ جانتا ہے ان امور خمسہ کو ''مفاتیح الغیب'' کہا جاتا ہے۔

محکمۂ موسمیات کی پیش گوئی اور الٹراساؤنڈ کی تحقیق:

اس زمانہ میں اشکال ہوتا ہے کہ سائنس داں حضرات آنے والے ایام میں بارش اور موسم کا رخ کیا رہے گا؟ یہ چیزیں پہلے ہی بتادیتے ہیں نیز الٹراساؤنڈ کے ذریعہ رحم مادر کی بات بتاتے ہیں تو پھر ان کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کہاں خاص رہا؟

جواب یہ ہے کہ سائنس والوں کی خبروں میں اکثر تخلف ہوتا ہے، یہ خبریں آئے دن غلط ثابت ہوتی ہیں، اس لئے یہ علم غیب نہیں بلکہ ظن اور اندازہ کی چیزیں ہوتی ہیں، علم میں تخلف نہیں ہوتا، نیز **يعلم مافي الارحام** میں یہ سب داخل ہے کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ رحم مادر میں کیا ہے؟ بچہ ہے یا کوئی اور چیز ہے؟ بچہ ہے تو وہ مذکر ہے یا مؤنث؟ ایک ہے یا دو؟ مؤمن ہے یا کافر؟ پستہ قد ہے یا طویل القامت وغیر ذالک من الصفات؟ الٹراساؤنڈ سے ان چیزوں کو معلوم کرنا ممکن نہیں ہے۔ (۲)

وماتدري نفس الخ: کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا، بسا اوقات آدمی کل کے لئے ارادہ کرتا ہے کسی کام کا، لیکن بخار آگیا، کوئی حادثہ ہوگیا، انتقال ہوگیا، غرضیکہ اس کام کو نہیں کر پاتا۔

فسخ ارادہ معرفت الٰہی کا ذریعہ:

ایک عارف نے دوسرے عارف سے پوچھا کہ تم نے اللہ کو کیسے پہچانا؟ انہوں نے کہا کہ کائنات کی علامات سے

(۱) لقمان: ۳٤.

(۲) المرقاة ۱/ ۱۲۹.

(آسمان وزمین کی تخلیق وغیرہ) انہوں نے کہا کہ تم نے کچھ نہیں پہچانا، دوسرے عارف نے کہا کہ آپ نے اللہ کو کیسے پہچانا؟ انہوں نے فرمایا: عرفتُ ربِّی بفسخِ العَزَائِم. میں نے اپنے رب کوارادوں کے فسخ کے ذریعہ پہچانا کہ میں ایک چیز کا ارادہ کرتا ہوں، لیکن اس کو نہیں کرپاتاہوں، بلکہ بسااوقات ارادہ ہی بدل جاتاہے، جس سے ثابت ہوتاہے کہ اپنی باگ ڈورکسی اورذات کے قبضہ میں ہے۔

۳/۲: وعَنِ ابنِ عُمَرؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وسَلَّمَ: ''بُنِيَ الإِسْلامُ علٰی خَمْسٍ: شها دَةِ أَن لَّآإِلٰهَ إِلاّ اللّٰهُ وأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، وَإِقَامِ الصَّلاةِ، وَإِیْتَاءِ الزَّکَاةِ، وَالْحَجِّ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ'' (متفق علیہ)(۱)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پرہے (۱) اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اورحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اوراس کے رسول ہیں، (۲) نماز قائم کرنا (۳) زکوۃ ادا کرنا (۴) حج کرنا (۵) رمضان کے روزے رکھنا۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

راوی حدیث حضرت ابن عمرؓ کے احوال:

آپ کا اسم گرامی عبداللہ ہے، حضرت عمرؓ کے صاحبزادے ہیں، نبوت سے تقریباً ایک سال پہلے پیداہوئے اور۷۳ھ میں وفات ہوئی، باپ اور بیٹے دونوں صحابی ہیں، لہٰذا ان کے نام کے ساتھ ''رضی اللہ عنہما'' پڑھیں گے، اپنے والدکیساتھ ہی اسلام میں داخل ہوئے اورمکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی، غزوۂ بدر میں صغرسنی کی وجہ سے واپس کردیئے گئے، ان کی پہلی شرکت غزوۂ خندق میں ہوئی۔

آپ پر زہد کا بہت غلبہ تھا زندگی میں ایک ہزار غلام آزاد کئے، علماء نے فرمایا کہ: عمراورعبداللہ بن عمران دونوں پردنیا کبھی غالب نہیں آئی، سنت سے حددرجہ عشق تھا اورسنت کے اتباع کی ہمیشہ کوشش کرتے تھے، ایک مرتبہ مکہ سے مدینہ منورہ آتے وقت ایک جگہ سواری سے اترے اورتھوڑی دیربیٹھے اورچل دیئے، خادم کے

(۱) أخرجه البخاري في الإيمان، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم "بني الإسلام على خمس" ۱/۶ برقم ۸، والتفسير، باب قوله تعالى وقاتلوهم حتى لاتكون فتنة ويكون الدين كله لله ۲/۶۴۸ برقم ۴۳۳۰ تعليقاً، ومسلم في الإيمان، باب بيان أركان الإسلام ودعائمه العظام ۱/۳۲.

استفسار پر فرمایا: کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے گزرے تھے اور یہاں پیشاب کیا تھا، اس لئے میں بھی اتباع میں بیٹھ گیا، اگر چہ فی الحال مجھے تقاضہ نہ تھا، حجاج بن یوسف کے زمانہ میں آپکی وفات ہوئی، وفات کا سبب یہ ہوا کہ ایک دن حجاج خطبہ دے رہا تھا، نماز میں تاخیر ہورہی تھی، آپ نے فرمایا ''إن الشمس لاینتظرک '' یہ بات اس کو بہت ناگوار گزری، وہ آپ سے اندراندر دشمنی رکھنے لگا، اورایک شخص کو آپ کے پیچھے لگادیا، اس شخص نے زہر میں بجھے ہوئے تیر سے آپ کے پیر میں خراش لگائی جس سے زہر پورے بدن میں پھیل گیا، اسی کے نتیجہ میں آپ وفات پاگئے اور شہادت کا درجہ حاصل ہوا۔(۱)

اسلام اور ارکانِ اسلام کی تمثیل:

بني الاسلام علی خمس الخ: حدیث جبرئیل میں اسلام کا ذکر آیا؛ اسلام ایک غیرمحسوس چیز ہے حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی، کہ غیرمحسوس چیز کو محسوس کے ساتھ مثال دے کر سمجھاتے تھے کہ مثال سے بات زیادہ سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ قوت عقلیہ تو معنوی اموکا ادراک کرلیتی ہے، لیکن قوت وہمیہ کا ادراک محسوسات کی حدتک ہے، اس لئے خالص معنوی چیز کے بارے میں عقل اور وہم کا نزاع رہتا ہے، قوت عقلیہ اسکو تسلیم کرلیتی ہے، وہمیہ نہیں، معنوی چیز کی محسوس کے ساتھ مثال بیان کردی جائے تو قوتِ وہمیہ بھی اس کو تسلیم کرلیتی ہے، عقل اور وہم کا نزاع ختم ہوکر وہ مضمون اوقع فی النفس ہوجاتا ہے۔ (۲)

شراح نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں اسلام اور اعمال کے باہمی ربط اور شریعت میں ان کی حیثیت اور درجہ بتانے کے لئے اسلام کو خیمہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے؛ کیوں کہ اہل عرب کو خیمہ کے ساتھ بہت تلبس تھا، جب خیمہ قائم کیا جاتا ہے تو اس کے لئے پانچ لکڑیاں چاہئیں، چار کونوں میں اور ایک بیچ میں، جو لکڑی موٹی اور بڑی ہوتی ہے اس کو بیچ میں گاڑا جاتا ہے، اس کو ''عمود'' کہتے ہیں، پھر چاروں کونوں پر چار لکڑیوں کو گاڑا جاتا ہے، ان سے خیمہ کی رسیوں کو باندھ دیا جاتا ہے، خیمہ کی اگر یہ پانچوں لکڑیاں قائم ہوں تو خیمہ اچھے طریقہ سے قائم ہوگا، لیکن اگر چاروں میں سے کوئی لکڑی ٹوٹ جائے تو اس طرف سے خیمہ سمٹ جائے گا، اس میں نقص پیدا ہوجائے گا اور اس کا فائدہ کم ہوجائے گا، لیکن خیمہ بہرحال قائم رہے گا، کیونکہ بیچ کی

(۱) الإصابه ۳/ ۲۰۳ــ۲۰۸ مطبوعه دار الفکر، والمرقاة ۱/ ۱۳۰ مطبوعه أشرفیه دیوبند.

(۲) فتح الإله ۱/ ۲۲۰، المرقاة ۱/ ۱۳۱.

لکڑی جو اصل ہے وہ قائم ہے اور اگر بیچ والی لکڑی گر جاوے تو خیمہ ہی گر جائے گا۔

یہی مثال ہے اسلام اور دین کی کہ یہ خیمہ کے مشابہ ہے، اللہ کی وحدانیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت بیچ کی لکڑی اور ''عمود'' کی طرح ہے، اسلام کے قیام کا مدار اسی پر ہے، نماز، زکوۃ، روزہ اور حج چار لکڑیوں کے درجہ میں ہیں، اب اگر کسی شخص میں یہ پانچوں باتیں پائی جائیں گی وہ دین میں پختہ ہوگا اور اس کا دین مضبوطی کے ساتھ قائم رہے گا اور اگر ان اعمال میں سے کسی میں خلل پیدا ہوگیا تو اسلام میں نقص پیدا ہوجائے گا، وہلم جراً؛ لیکن اگر خدانخواستہ شہادت اور تصدیق بھی ختم ہوگئی تو اسلام ہی ختم ہوجائے گا۔(۱)

علامہ کرمانیؒ نے ذکر کیا ہے کہ حسن بصری اور مشہور شاعر فرازدق ایک جنازہ میں جمع ہوئے حسن بصریؒ نے پوچھا: ''ماأعَدتَّ لمثل هذه الحالةِ؟ کہ اس حال کے لئے تم نے کیا تیاری کی ہے؟ فرازدق نے جواب دیا: **شهادة ان لااله الا الله**، حسن بصری نے فرمایا: **هذا العمود، فاين الأطناب** یعنی یہ تو عمود ہے، اطناب کہاں ہیں؟ کیونکہ خیمہ سے مکمل استفادہ کے لئے فقط درمیانی لکڑی (عمود) کافی نہیں۔

حدیث پاک میں مذکور مثال سے یہ تعلیم دینا مقصود ہے کہ جو شخص اپنے اسلام کو کامل بنانا چاہے وہ ان ارکانِ خمسہ کی محافظت کرے۔(۲)

ایک اشکال اور جواب:

اس حدیث پر ایک اشکال یہ ہے کہ ارکان اسلام تو ان پانچ کے علاوہ اور بھی ہیں، مثلاً جہاد وغیرہ، تو پھر ان پانچ پر کیوں اکتفاء کیا گیا؟

اس کے دو جواب ہیں: (۱) مشہور یہی پانچ ارکان ہیں، پس بر بناء شہرت ان کا تذکرہ ہے۔

(۲) عبادات دو قسم کی ہیں: قولی اور فعلی، پھر فعلی بھی دو قسم کی ہیں: ایجابی اور سلبی، پھر ایجابی کی تین اقسام ہیں: بدنی، مالی اور مرکب من المال والبدن، قولی: شہادتین ہیں، سلبی: روزہ ہے، فعلی ایجابی بدنی: نماز ہے، فعلی ایجابی مالی: زکوۃ ہے اور فعلی ایجابی مرکب من المال والبدن: حج ہے، پس تمام انواعِ عبادات کی ایک ایک مثال اس حدیث میں پیش کی گئی ہے۔

---

(۱) فتح الإله ۱/ ۲۲۰، المرقاة ۱/ ۱۳۱.

(۲) الكواكب الدراري شرح البخاري للكرماني ۱/ ۸۰ مطبوعه بيروت.

حلِّ عبارت:

عبارت میں خمس کا مضاف الیہ خصال یا دعائم ہے جو محذوف ہے،(۱) شهادة اوراس کے معطوفات پرتینوں اعراب جاری ہوسکتے ہیں، خمس سے بدل ہونے کی بناپرجر، اعنی فعل مقدر کا مفعول بہ ہونے کی وجہ سے نصب اوراحداها مبتدا مقدر کی خبر ہونے کی بناپر رفع آئے گا۔

٤ /٣:وعَن أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: الإِيْمَانُ بِضْعٌ وسَبْعُوْنَ شُعْبَةً، فأَفضَلُها قَولُ لاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ و أَدْنَاهَا إِماطَةُ الأَذىٰ عَنِ الطَّرِيْقِ وَالْحَياءُ شعبةٌ مِّنَ الإِيْمَانِ. (متفق علیہ:)(۲)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: ایمان کی شاخیں ستر سے کچھ زیادہ ہیں، ان میں سب سے افضل درجہ کی شاخ زبان و دل سے اس بات کا اقرار و اعتراف کرنا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اورسب سے کم درجہ کی شاخ کسی تکلیف دہ چیز کو راستہ سے ہٹادینا ہے اور حیاء ایمان کی ایک بڑی شاخ ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

راوی حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کے احوال:

ابو ہریرہ کنیت ہے، ان کے نام میں بہت اختلاف ہے، ۳۰رقول ہیں، راجح یہ ہے کہ جاہلیت میں آپ کا نام عبدِ شمس یاعبدِ عمرو تھا اوراسلام لانے کے بعد آپ کانام عبداللہ یاعبدالرحمٰن ہوا،ان دونوں میں بھی راجح عبدالرحمٰن بن صخر ہے کماقاله الحاكم وابن حجر العسقلانی (۳) لیکن آپ کی کنیت ہی نام پرغالب رہی ہے۔

(۱)فتح الإله ۱ / ۲۲۱، میں ہے (خمس)أي: خمس دعائم كما في رواية أوقواعد أوخصال، وفي رواية لمسلم بالتاء؛ أي خمسة اشياء أوأركان أوأصول.

(۲)أخرجه البخاري في الإيمان،باب أمور الإيمان وقول الله عزوجل وليس البرأن تولوا وجوهكم قبل المشرق والمغرب الآية ۱ /٦ برقم ۹، ومسلم فيه، باب بيان عدد شعب الإيمان وأفضلها وأدناها الخ ۱ /٤٧برقم ٥٧–٥٨.

(۳)تقريب التهذب (٨٤٢٦)، فتح الإله ۱ /٢٢٦،والمرقاة ۱ /۱۳۳.

ھریرۃ، ھرۃ کی تصغیر ہے بمعنیٰ بلّی، ان کی یہ کنیت کیوں پڑی؟ حالانکہ کنیت تو باپ یا بیٹے کی وجہ سے ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں کسی چیز کے ساتھ تلبس کی وجہ سے بھی کنیت پڑ جاتی ہے اوراس وقت لفظ اب ''والا'' کے معنی میں ہوتا ہے، جیسے حضرت علیؓ کی کنیت ابوتراب تھی، جس کا سبب یہ ہوا کہ ایک روز حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ سے ناراض ہوکر باہر آ گئے اور مٹی پر لیٹ گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا **قم یاأباتراب**، اسی طرح حضرت انسؓ ایک روز حمزہ نامی ایک گھاس کاٹ رہے تھے، اس لئے آپ کی کنیت ہی ابوحمزہ ہوگئی۔

بعض نے کہا کہ آپ بچپن میں بلی کے ساتھ کھیل رہے تھے اس پر ان کے والد نے کہا: ابوہریرہ، لیکن راجح بات وہ ہے جس کو علامہ ابن عبدالبر نے خود ابوہریرہؓ کے حوالہ سے نقل فرمایا کہ اسلام لانے کے بعد ایک مرتبہ میں بلی کے بچے کو آستین میں لئے ہوئے تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا اور فرمایا: **ماھذہ ؟** یہ کیا ہے؟ تو میں نے عرض کیا کہ بلی کا بچہ ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **یاأباھریرۃ وفی روایۃ ابن اسحاق: أنت ابوھریرۃ۔**[1]

آپ قبیلہ دوس کے تھے نبوت سے گیارہ سال قبل پیدا ہوئے، ۷ھ میں فتح خیبر کے موقع پر اسلام لائے، ان کو چار سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میسر آئی لیکن صحابہ میں سب سے زیادہ احادیث ان ہی کے واسطہ سے مروی ہیں، ان کی روایات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) ہے،[2] صحیح اورراجح قول کے مطابق ۵۹ھ میں آپ کی وفات ہوئی، جنت البقیع میں مدفون ہیں۔[3]

ابوہریرۃ منصرف ہے یا غیر منصرف:

''ابوہریرہ'' منصرف ہے یا غیرمنصرف؟ اس میں بھی اختلاف ہے، بقول بعض یہ منصرف ہے کہ فقط ''ھریرۃ'' علَم نہیں ہے، لہٰذا دوسبب نہ ہونے کی وجہ سے منصرف ہوگا، ضابطہ کی بات تو یہی ہے، مگر چونکہ یہ کلمۂ واحدہ کے طور پر بولا پڑھا جاتا ہے اوراس لحاظ سے اس میں تانیث وعلمیت موجود ہے، تواس کو غیر

(۱) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ۲ / ۷۰.

(۲) فتح الإلہ ۱ / ۲۲۷ مرقاۃ ۱ / ۱۳٤ میں ہے: "وبلغ مارواہ خمسۃ آلاف وثلثمأۃ وأربعۃ وستین"

(۳) فتح الإلہ ۱ / ۲۲۷، المرقاۃ ۱ / ۱۳٤.

منصرف ہی قرار دیا جائے گا۔[۱]

ایمان کے مختلف اور متعدد شعبے:

اس حدیث شریف میں بھی تمثیل ہے کہ ایمان کو تشبیہ دی گئی ہے مضبوط جڑ والے اور ہرے بھرے کثیر شاخوں والے درخت کے ساتھ، ایسے درخت کا سایہ گھنا ہوتا ہے، اس کا فائدہ بہت ہوتا ہے، اس کے سایہ سے کافی لوگ منتفع ہوتے ہیں اور پھل دار درخت ہو تو شاخیں کثیر ہونے کی وجہ سے پھل بھی زیادہ آتے ہیں، اگر اس کی شاخیں کاٹی جاتی رہیں تو اس میں نقص آتا رہے گا، اس کی منفعت کم ہوتی رہے گی، لیکن نفس درخت باقی رہے گا، اگر اس کے تنے کو ہی ختم کر دیا جائے تو درخت ہی ختم ہو جائے گا، یہی حال ایمان کا ہے کہ اس کی جڑ تصدیق قلبی اور شہادت ہے اور اعمال اس کی شاخوں کے درجہ میں ہیں، پس جو شخص اپنے ایمان کو کامل و مکمل کرنا چاہے تو تصدیق قلبی کے ساتھ ساتھ اعمال کو بھی مکمل طور پر اختیار کرے، اگر اعمال میں نقص ہوگا تو ایمان میں بھی نقص پیدا ہوگا، اگرچہ نفس ایمان باقی رہے گا، لیکن اگر تصدیق قلبی ختم ہو جائے تو ایمان ہی ختم ہو جائے گا۔

الایمان: اس میں الف لام کمال کے معنی میں ہے، مطلب یہ ہے کہ ایمان کامل کرنے کے لئے ان تمام اعمال کو اختیار کرے۔

بضع: ایک روایت میں **بضعة** ہے بضع اور بضعة دونوں میں راجح با کا کسرہ ہے اور فتحہ بھی جائز ہے بمعنی قطعہ، درمیان، حصہ، اس کا اطلاق کس عدد پر ہوتا ہے؟ اس میں کئی اقوال ہیں، راجح یہ ہے کہ تین اور دس کے درمیان کے اعداد پر اطلاق ہوتا ہے۔ (۲)

شعبة: اس سے مراد شاخ اور خصلت ہے، یعنی اعمال ایمان۔[۳]

اختلاف روایت اور اس کے اسباب:

ایک روایت میں اس کے بجائے "سبع و سبعون شعبة"[۴] اور ایک روایت میں "ست و سبعون

(۱) المرقاة ۱/۱۳۳.

(۲) انظر تفصيله فی تحفة الأبرار للبيضاوی ۱/۳۵ والمفاتيح فی شرح المصابيح ۱/۵۸ للزيدانی.

(۳) فتح الإله ۱/۲۲۸.

(٤) المرقاة ۱/۳٤.

شعبة"(۱) اور ایک روایت میں "بضع وستون شعبة "(۲) اور ایک روایت میں "اربعة وستون بابا" یہ کل پانچ روایتیں ہوگئیں۔

پہلی تینوں روایتوں میں کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ "بضع" کا اطلاق تین سے لیکر نو تک کے عدد پر ہوتا ہے جس میں سات بھی داخل ہے، لیکن روایت رابعہ وخامسہ پر اشکال ہوگا؟ اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) عدد قلیل عدد کثیر کے منافی نہیں ہوتا کیوں کہ ستر میں ساٹھ بھی پایا جاتا ہے، بغیر ساٹھ کے ستر کا تحقق نہیں ہوتا۔(۳)

(۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اولاً کم کا علم دیا گیا، پھر زیادہ کا علم دیا گیا اس لئے پہلے کم کو پھر زیادہ کو بیان فرمایا۔(۵)

(۳) "ستر سے زیادہ" سے تحدید مقصود ہے یا تکثیر؟ اس سلسلہ میں علامہ طیبی نے فرمایا کہ اظہر یہ ہے کہ تکثیر مقصود ہے، اس طرح کے الفاظ عربی اور اردو دونوں زبانوں میں کثرت کے لئے بولے جاتے ہیں کہا جاتا ہے "میں تیرے پاس بیسیوں مرتبہ آیا" (وغیرہ) تکثیر مراد ہونے کی صورت میں دونوں عددوں میں منافات کا سوال نہیں ہوگا۔(۶)

(۴) بعض نے کہا کہ بعض اعمال بعض کے مشابہ ہوتے ہیں جیسے زکوۃ، صدقۂ فطر، اور صدقۂ نافلہ بعض رواۃ نے ان کو تین اور بعض نے ایک شمار کیا، ظاہر ہے اس طرح تعداد کم زیادہ ہوجائے گی۔(۷)

فأفضلها: میں فاء تفصیلیہ اور تفریعیہ دونوں ہوسکتا ہے، یعنی اس میں ماقبل کے اجمال کی تفصیل اور ماقبل کے اصول پر تفریع دونوں احتمال ہیں جیسا کہ ظاہر ہے، اور مطلب یہ ہے کہ ایمان کے ستر سے اوپر اعمال ہیں، مگر ان میں سب سے افضل عمل لا الہ الا اللہ کہنا ہے، پھر یہاں "قول" کہا کیوں کہ نفس لا الہ

---

(۱) رواه ابوعوانة في صحيحه.

(۲) كما في رواية البخاري ۱/ ٦.

(۳) المرقاة ۱/ ۱۳٤.

(٤) أخرجه الترمذي في سننه في في ابواب الايمان، باب في استكمال الايمان وزيادته ونقصانه.

(٥) شرح مصابيح السنة ص ۲۹، لابن الملك الرومي الحنفي.

(٦) شرح الطيبي للمشكاة ۲/ ٤۳۹.

(۷) شرح مصابيح السنة ص ۲۹، لابن الملك الرومي الحنفي.

الا اللہ تو ایمان کی جڑ ہے جبکہ یہاں مقصد اعمال کو بتانا ہے اس لئے قول کا لفظ لایا گیا۔ اور اس کے ساتھ محمد رسول اللہ نہیں کہا اختصار کی وجہ سے، ورنہ مراد پورا کلمہ ہے۔ (۱)

وأدناها: یہ یا تو "دنوّ" سے ماخوذ ہے بمعنی قرب، اس وقت معنی ہوں گے (اقرب) یعنی ایمان سے سب سے زیادہ قریب خصلت تکلیف دہ چیز کو راستہ سے ہٹانا، اور مراد اقرب سے اسہل وآسان ہے۔

یا ادنی "**دنــائة**" سے ماخوذ ہے بمعنی کم درجہ ہونا یہی راجح ہے، یعنی ایمان کا سب سے کم درجہ عمل راستہ سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا ہے۔ (۲)

"إماطة الأذى" کی تین تفسیریں:

اماطة الأذى الخ: شراح نے فرمایا کہ اس جملہ کی تین تفسیریں ہیں:

(۱) تکلیف دہ چیز کا راستہ سے ہٹانا یہ خدمت خلق ہے اور اللہ کی مخلوق پر ترحم ہے کہ کسی کو ضرر نہ پہنچے لہذا ضرر والی چیز راستہ سے ہٹادی جائے۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ تکلیف دہ چیز کو راستہ میں ڈالا ہی نہ جائے۔ (۳)

اعلی درجہ یہ ہے کہ دونوں تفسیروں کے تقاضہ پر عمل کیا جائے، اگر تمہاری ہمت اور ظرف کم ہے تکلیف دہ چیز کو ہٹانے کا جذبہ نہیں ہے تو کم سے کم یہ کرو کہ تکلیف دہ چیز راستہ میں نہ ڈالو۔

راستوں کی صفائی اور ہمارا طرز عمل:

مگر یہ ایمانی شعبہ آج ہمارے طلبہ اور خود مدارس سے ندارد ہے، طلبہ کا مدرسہ کے صحن میں تھوک اور ناک کی ریزش ڈالنا روزمرہ کا معمول ہے، یہ نہایت فکر کی بات ہے، ہمیں تعلیم راستہ سے گندگی ہٹانے کی دیجارہی ہے اور ہم اس کے برعکس راستہ میں گندگی پھینک رہے ہیں، **فالی الله المشتكى**۔

(۳) حضرات صوفیاء نے فرمایا ہے کہ اذی سے نفس کو تکلیف پہنچانے والی چیز یعنی اخلاق رذیلہ اور طریق سے طریق سلوک مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو شخص اخلاق رذیلہ کو اپنے نفس سے نکالے گا طریق سلوک اس کے لئے آسان ہوجائے گا، کیونکہ اخلاق رذیلہ تعلق مع اللہ سے مانع ہوتے ہیں۔ (۴)

---

(۱) تحفة الابرار ۱/۳۵ والمرقاة ۱/۳٤.
(۲) المرقاة ۱/۱۳٤.
(۳) المرقاة ۱/۱۳۵، والمفاتيح ص ٦٣.
(٤) تحفة الأبرار ۱/۳۹.

صرف افضل اورادنی شعبہ کو ذکر کرنے کی وجہ:

ایمان کے ستر سے اوپر اعمال ہیں لیکن یہاں صرف افضل اورادنی کو بیان کیا، بعض نے اس کی وجہ بیان کی کہ ''قول لاالہ الا اللہ'' سے اشارہ ہے حقوق اللہ کی طرف اور ''إماطة الأذى عن الطريق '' سے حقوق العباد کی طرف اشارہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایمان کو کامل کرنے کے لئے حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ادائیگی ضروری ہے، گویا اجمالاً ایمان کے تمام شعبوں کا ذکر اس میں آ گیا ہے۔

حیاء کا مفہوم، اقسام اور علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ؟:

والحياء شعبة من الايمان: سوال ہوتا ہے کہ ''**بضع وسبعون شعبة**'' میں حیاء بھی داخل ہے تو پھر اس کو الگ سے کیوں بیان کیا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ حیاء ایسی خصلت ہے جو باقی سب شعبوں پر آدمی کو ابھارتی ہے اس لئے حیا کو خاص طور سے بیان کیا ہے، یہ تخصیص بعد التعمیم ہے۔

حیاء کی دو قسمیں ہیں (۱) حیائے طبعی، (۲) حیائے ایمانی۔

حیائے طبعی کہتے ہیں ''**هو تغَيّرٌ وانكِسارٌ يعترِي المرءُ من خَوْفِ مايُلامُ ومايُعَابُ عليه**'' یعنی طبیعت کی شکستگی اور احساسِ ندامت جو قابل ملامت یا قابل عیب فعل کے اندیشہ سے پیدا ہو، اور حیاء ایمانی طبیعت کا وہ انفعال واحساس جو غیر مشروع فعل کے اندیشہ سے پیدا ہو۔

یہ حیاء انسان کو گناہوں سے روکتی ہے اس لئے حیاء ایمانی کی تعریف بایں الفاظ بھی کی جاتی ہے: ''**هو خُلُقٌ يَمْنَعُ الشخصَ من الفعلِ القبيحِ بسبب الإيمانِ كالحياء من كَشْفِ العورةِ**'' یہاں حیاء سے حیائے ایمانی مراد ہے، اس حیاء کا جتنا غلبہ ہوتا ہے اسی قدر آدمی گناہوں سے بچتا ہے، وہ یہ سوچتا ہے کہ میں ایسا کروں گا تو اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا، اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ''**إذافاتك الحياء فافعلْ ماشئتَ**'' لہٰذا یہ حیاء ایمان کا ایک بڑا شعبہ ہے۔[1]

ایمان کے باقی شعبے:

یہاں ایمان کے شعبوں میں سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین شعبوں کی خود وضاحت فرمائی، باقی شعبے کونسے ہیں؟ اس کی تفصیل یکجا کسی حدیث میں موجود نہیں، البتہ حضراتِ محدثین نے ان کے احاطہ

(۱) شرح الطيبى ۱/۱۰۷، وفتح الإله ۱/۲۲۹ والمرقاة ۱/۱۳۵–۱۳۶.

کی کوشش کی ہے، امام بیہقیؒ کی ''شعب الایمان'' اس موضوع کی مشہور کتاب ہے، ہمارے اکابر میں سے حضرت تھانویؒ کا ''فروع الایمان'' نامی رسالہ اسی بارے میں ہے، مشہور محدث ابوحاتم ابن حبان البُستی نے سب سے زیادہ اس بارے میں تحقیق وتدقیق فرمائی ہے اوراس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ''بضع وسبعون '' سے تحدید ہی مراد ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مدت تک تتبع کیا اورتمام طاعات کی فہرست تیار کی تو وہ ۷۷ سے بہت زائد نکلیں، پھر میں نے ان طاعات کو جمع کیا جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ''من الایمان '' قرار دیا ہے تو وہ ۷۷ سے کم ہوئیں، پھر میں نے وہ طاعات جمع کیں جن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ''من الإیمان '' فرمایا ہے، تو وہ بھی ۷۷ سے کم نکلیں، پھر میں نے قرآن اوراحادیث میں ''من الإیمان '' کے حوالہ سے مذکور تمام طاعات وصفات کو جمع کیا تو وہ کل ۷۷ ہوئیں، نہ کم نہ زیادہ، ان تمام ۷۷ شعبوں کو انہوں نے اپنی کتاب ''وصف الایمان وشعبه '' میں درج فرمایا ہے، خلاصہ ان کا یہ ہے کہ ایمان کامل: تصدیق قلبی، اقرار باللسان اورعمل بالارکان کے مجموعہ کا نام ہے، تصدیق قلبی سے متعلقہ شعبے ۳۰ رہیں، اقرار باللسان سے متعلقہ شعبے سات ہیں اوراعمال سے متعلقہ شعبے ۴۰ ہیں، اس طرح یہ کل ۷۷ شعبے ہوجاتے ہیں، علامہ عینیؒ نے عمدۃ القاری میں ان ستتر شعبوں کا ذکر فرمایا ہے۔[1]

۵ / ٤: وعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ، وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَانَهَى اللّٰهُ عَنْهُ، هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِيْ[2]، ولمسلم[3] قَالَ إِنَّ رَجُلاً سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرٌ قَالَ: مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: کامل مسلمان وہ شخص ہے جس کے ہاتھ اورزبان (کی ایذاء) سے مسلمان محفوظ رہیں اورکامل مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑدے جن سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے منع فرمایا ہے، یہ الفاظ بخاری

(۱)عمدۃالقاری ۱ / ۲۰۰–۲۰۲، قاضی بیضاویؒ نے بھی تحفۃ الابرار ۱/ ۳٦-۳۹ میں تفصیل سے ان شعبوں کا ذکر فرمایا ہے۔

(۲)أخرجه البخاري في الإيمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده ۱ / ٦ برقم ۱۰، والرقاق، باب الإنتهاء عن المعاصي ۲ / ۹٦۰ برقم ٦۲۳۵.

(۳)أخرجه مسلم في الإيمان، باب بيان تفاضل الإسلام وأى اموره أفضل ۱ / ٤۸.

شریف کے ہیں اور مسلم شریف کے الفاظ یہ ہیں: حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے فرمایا کہ ایک شخص نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ مسلمانوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

تشریحِ حدیث

احوال عبداللہ بن عمروؓ:

عبداللہ نام ہے، والد کا نام عمرو بن عاص ہے، اس اسم میں عمرو بفتح العین ہے ماقبل میں عمر بالضم تھا (رسم الخط کا قاعدہ یہ ہے کہ عمر کے بعد واو ہوتو عَمرو بفتح العین پڑھا جائے گا، واوَ نہ ہوتو عمر بضم العین پڑھا جائے گا، پھر عمرو میں حالت رفعی میں واو لکھا جاتا ہے اور حالت نصبی میں الف لکھا جاتا ہے)۔

عاص بن وائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین دشمنوں میں سے تھا، کفر کی حالت میں ہی مارا گیا، عمرو اس کے بیٹے تھے جو فتح مکہ سے قبل اسلام لائے، پھر جلیل القدر صحابی بنے، حضرت عمرو کے بیٹے عبداللہ ہیں، یہ وہی عبداللہ بن عمرو ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کثرت سے لکھا کرتے تھے جیسا کہ مقدمۃ العلم میں آچکا، یہ اپنے والد سے بھی پہلے مسلمان ہوگئے تھے، اپنے والد سے ۱۱یا۱۲ یا ۱۳سال چھوٹے تھے، بہت جفا کش تھے، عبادت کا بہت شوق تھا، رات بھر عبادت کرتے، دن کو روزہ رکھتے اس کی وجہ سے کمزور ہوگئے تھے اس پر ان کے والد حضرت عمرو نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نصیحت کی اور فرمایا ''**إن لنفسک علیک حقاً وإن لأھلک علیک حقاً وان لزورک علیک حقاً**''

<u>۶۵ھ یا ۳۷ھ</u> میں ''مکہ مکرمہ'' یا ''طائف'' یا ''مصر'' میں آپ کا انتقال ہوا، راجح طائف ہے سات سو روایات ان کے واسطہ سے مروی ہیں، حالانکہ ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ان کی مرویات مجھ سے زیادہ ہیں، لیکن ان کی مرویات کم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ طائف میں رہتے تھے وہاں طالبین کم آتے تھے حضرت ابو ہریرہؓ مدینہ منورہ میں رہتے تھے جہاں طالبین زیادہ آتے تھے۔ (۱)

(۱) سیر أعلام النبلاء ۳/ ۷۹-۹۴ والمرقاة ۱/ ۱۳۷.

کامل مسلمان:

ماقبل کی دونوں حدیثوں میں ایمان کومثال سے سمجھایا گیا تھا حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں خیمہ کے ساتھ اور ابو ہریرہؓ کی حدیث میں شاخوں والے درخت کے ساتھ تشبیہ دے کر،اب یہاں یہ فرمارہے ہیں کہ محض عبادات سے اسلام کامل نہیں ہوگا بلکہ عبادات کے ساتھ حقوق العباد کوبھی ادا کرنا ضروری ہے۔

المسلم : اس میں الف لام کمال کے معنی کے لئے ہے،[1] یعنی کامل مسلمان وہ ہے جس ہاتھ وزبان سے تمام لوگ محفوظ رہیں،اس حدیث میں اعلی درجہ کی فصاحت ہے کہ ایک ہی مادہ کے تین لفظ استعمال کئے گئے ہیں:**المسلم** ،**سلم** اور**المسلمون**۔

ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ **المسلمون** کالفظ تغلیباً ہے ورنہ **المسلمات** بھی اس حکم میں داخل ہیں، اسی طرح مسلمان کی قید بھی اتفاقی ہے ورنہ بلاوجہ کافر کو تکلیف پہنچانا بھی جائز نہیں ہے،پس **المسلمون** سے''الناس''مراد ہے[2] چنانچہ ابن حبان کی روایت میں الناس کا ہی لفظ وارد ہوا ہے،[3] بلکہ حیوانات کوبھی بلاوجہ تکلیف پہنچانا جائز نہیں، جیسا کہ معروف حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک عورت کومحض اس بنیاد پرجہنم میں داخل فرمایا کہ اس نے بلی پالی تھی،مگراس کے کھانے پینے کا کچھ خیال نہ کرتی تھی۔[4]

ہاتھ اورزبان کی وجہ تخصیص:

اس روایت میں ہاتھ اورزبان بول کرتمام ذات مرادلی گئی ہے کہ اپنی ذات سے کسی کوتکلیف نہ پہنچائے، اور ان دونوں عضوکو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے اکثر افعال کا صدورانہی دونوں سے ہوتاہے،پھران دونوں میں زبان کومقدم کیا کیونکہ ہاتھ کے مقابلہ میں زبان سے تکلیف زیادہ پہنچتی ہے کہ ہاتھ سے مارتے رہنے سے خودہی تھک جائے گا برخلاف زبان کے، کہ وہ صبح سے شام تک چلتی رہتی ہے،

(۱)المرقاة ۱/۱۳۷.

(۲)المرقاة ۱/۱۳۷.

(۳)صحیح ابن حبان ۱۱/۲۰٤ت:شعیب الأرنؤوط نسائی شریف ۲/۲۳۰(٤٥٩٥)اورمسنداحمد ۱۱/٦٥۸(۷۰۸٦)میں بھی''الناس''ہی کا لفظ وارد ہوا ہے۔

(٤)مسلم:باب تحریم قتل الهرة (۲۲٤۲) .

نیز ہاتھ سے صرف حاضر کو تکلیف پہنچائی جاسکتی ہے اور زبان سے حاضر وغائب دونوں کو تکلیف پہنچائی جاسکتی ہے نیز ہاتھ کا زخم جلدی بھر جاتا ہے برخلاف زبان کے زخم کے کہ وہ نہیں بھرتا ہے، شاعر نے کہا ہے۔ ؎

جراحاتُ السِّنانِ لها التیامٌ ولایَلْتَامُ ماجَرَحَ اللسانُ

اصل مہاجر:

المهاجر من هجر الخ:المهاجر پر بھی الف لام کمال کے معنی کے لئے ہے، ماقبل میں ہجرت کی دو قسمیں بیان کی تھیں: (۱) ظاہری (۲) باطنی، یہاں باطنی مراد ہے، یہ جملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے حال کی مناسبت سے ارشاد فرمایا، صحابہ ہجرت کرکے مدینہ آچکے تھے اس پر فرمایا کہ کمال اسلام کے لئے یہ ظاہری ہجرت کافی نہیں ہے، بلکہ گناہوں کو چھوڑنا بھی ضروری ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملہ فتح مکہ کے بعد اس وقت ارشاد فرمایا جب یہ اعلان فرمایا تھا: **لاهجرة بعدالفتح** تو اس سے بعض صحابہ کو جو ہجرت نہ کرسکے تھے رنج ہوا، انکی تسلی کے لئے آپ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا۔

هذا لفظ البخاری: یہ بخاری کے الفاظ تھے، مسلم کی روایت میں ہے کہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ کون مسلمان بہتر ہے؟ تو اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بات ارشاد فرمائی، مضمون دونوں کا ایک ہے کہ آدمی اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔

آدمی کو بے ضرر بن کر رہنا چاہئے:

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ''**مَن اَکَلَ طَیِّباً وعَمِلَ فی سَنَّةٍ وأَمِنَ الناسُ بَوَائقَه دَخَلَ الجنَّةَ**''،(۱) جس شخص نے حلال رزق کھایا، سنت طریقہ پر عمل کیا اور لوگ اس کے شر سے امن میں رہے تو وہ جنت میں داخل ہوگا، جس سے یہ ثابت ہوا کہ آدمی کو بے ضرر بن کر رہنا چاہئے، لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں بعض کی طبیعت میں کجی ہوتی ہے، فتنہ پرداز ہوتے ہیں، لوگ اس کی طرف سے ڈرے رہتے ہیں، اس سے خطرہ لگا رہتا ہے، کہ پتہ نہیں کس ضرر میں مبتلا کردے، ایسا شخص اچھا نہیں ہے، اور بعض لوگ بے ضرر ہوتے ہیں، سب لوگ ان کی طرف سے مطمئن رہتے ہیں، اس کی طرف سے خطرہ محسوس نہیں کرتے، ایسا آدمی اللہ

(۱) رواه الترمذی، بحواله مشکوة ص: ۳۰، باب الاعتصام بالکتاب والسنة.

کے یہاں پسندیدہ ہے، وہ اللہ کا مقرب ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل بہتر ہے؟ تو فرمایا کہ اللہ پرایمان رکھنا اوراس کے راستہ میں جہاد کرنا، پھر پوچھا: کونسا غلام آزاد کرنا افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جوبیش قیمت ہواوراپنے مالک کو زیادہ عزیز ہو، راوی نے پوچھا کہ اگرایسانہ ہوسکے؟ تو فرمایا کہ کسی ایسے شخص کی مدد کرنا جس کی کمائی اس کے گھروالوں کو ناکافی ہو، راوی نے پوچھا کہ اگر یہ بھی نہ ہوسکے؟ تو فرمایا کہ پھر اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچائے، مطلب یہ کہ فراخ دلی تو یہ ہے کہ خلق خدا کو فائدہ پہنچائے اوراگر اتنا ظرف نہیں ہے تو کم ازکم اپنی ذات سے کسی کو نقصان نہ پہنچائے یہ بھی صدقہ ہے۔(۱)

ایذارسانی کی ممانعت سے مستثنیٰ صورتیں:

ملاعلی قاریؒ نے فرمایا کہ کسی کو تکلیف پہنچانا درست نہیں، یہ حکم اس وقت ہے جبکہ غرض فاسد ہو، اگر صحیح غرض سے کوئی عمل کیا جائے اوراس سے کسی کو تکلیف پہنچے تو کچھ مضائقہ نہیں جیسے کفار سے جہاد کرنا، شریعت کے حدود وتعزیرات قائم کرنا، استاذ کا شاگرد کو، والدین کا اولاد کو اصلاح کے مقصد سے تنبیہ وتوبیخ کرنا وغیرہ ممانعت میں داخل نہیں، کیونکہ یہاں مقصد ایذاء نہیں، بلکہ اصلاح ہے۔(۲)

طلبہ کو نصیحت:

مشکوۃ میں احادیثِ عمل ہیں، لہٰذا جو حدیث سامنے آتی رہے طالب علم اس پرعمل کرتا رہے، طالب علمی کے زمانہ میں عمل کی عادت نہ بنی تو بعد میں سنبھلنا مشکل ہوتا ہے۔

۷/۶: وَعَـن أنـسٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :لايُؤمِنُ أحدُكُم حتّٰى أكونَ أَحَبَّ إِلَيهِ مِن وَالِدِهِ وَوَلدِهِ والنَّاسِ أَجْمَعِينَ، متفق عليه.(۳)

(۱) رواه البخاري ومسلم، بحواله مشكوة ص:۲۹۳، كتاب العتق.

(۲) مرقاة ۱/۱۳۸.

(۳) أخرجه البخاري في الإيمان باب حب رسول الله صلى الله عليه وسلم من الإيمان ۱/۷ برقم ۱۵، عن انس بلفظه وعن ابى هريرة بنحوه ومسلم فيه، باب وجوب محبة الرسول صلى الله عليه وسلم أكثر من الاهل والولد والوالد ۱/۴۹ برقم ۷۰.

ترجمه: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن (کامل) نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔ (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

احوال انس بن مالکؓ:

انس بن مالک بن النضر الانصاری الخزرجی النجاری، کنیت ابوحمزہ ہے، یہ خادم رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اس وقت حضرت انسؓ دس سال کے تھے، ان کے والد مالک بن نضر ہیں، ان کا کفر پر انتقال ہوا، اس کے بعد ان کی والدہ ام سلیمؓ نے ابوطلحہ انصاریؓ سے نکاح کرلیا، حضرت انسؓ ان کے ربیب تھے، ان کی والدہ ام سلیم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خالاؤں میں سے ہیں، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لئے اپنے صاحبزادے حضرت انس کو پیش کیا، چنانچہ وہ برابر حضور کی خدمت میں رہے، دس سال تک انھوں نے خدمت کی، ایک روز ان کی والدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور عرض کیا کہ یارسول اللہ یہ آپ کا چھوٹا سا خادم ہے آپ اس کے لئے دعا فرمائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار دعائیں دیں: "**اللهم بارک في ماله، وولده، وأطل عمره، واغفر ذنبه**" یا اللہ ان کے مال میں، اولاد میں، اورعمر میں برکت دے اوران کی مغفرت فرما۔

حضرت انسؓ فرماتے تھے کہ ان میں سے تین دعاؤں کی قبولیت میں نے اپنی زندگی میں دیکھ لی، میرا باغ سال میں دومرتبہ پھل دیتا ہے حالانکہ دیگرلوگوں کے باغات میں ایک مرتبہ پھل آتا ہے، اولاد میں خوب برکت ہوئی، چنانچہ اولاد اور اولاد الاولاد میں سے اٹھانوے بچوں کو اپنے ہاتھ سے دفن کرچکا ہوں اورجوموجود ہیں وہ اس سے بھی زیادہ ہیں، ان کی عمر ۱۰۴ سال کی ہوئی یہاں تک کہ وہ اپنی زندگی سے اکتانے لگے تھے، بصرہ میں آخری صحابی حضرت انسؓ ہی تھے، چوتھی دعا کے بارے میں فرمایا کرتے تھے "**وأرجوا الرابعة**" کہ چوتھی دعا کی قبولیت کا بھی اللہ سے امیدوار ہوں، **۹۳ھ** میں بصرہ میں آپ کی وفات ہوئی۔(۱)

---

(۱) الإصابه ۱/ ۱۱۱–۱۱۳، المرقاة ۱/ ۱۳۹، مطبوعه أشرفيه ديوبند.

کمال ایمان کے لئے حبِّ نبوی اور حقوقِ نبوی کی ادائیگی ضروری:

اس حدیث میں بھی کمال ایمان کا بیان ہے کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہ ہوگا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والدین واولاد سے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں، لہٰذا جس شخص کو اس کے والدین اور اولاد وغیرہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب ہوں اس کا ایمان ناقص ایمان ہوگا، علامہ ابن بطالؒ نے تحریر کیا ہے کہ جب انسان کو ایمان کا کمال حاصل ہوجاتا ہے تو اسے اس کا ادراک ہوجاتا ہے کہ ان تمام چیزوں میں سب سے زیادہ حق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ راہ حق کی ہدایت اور گمراہی سے نجات حاصل ہوئی،[1] اس لحاظ سے ''احب'' ''احق'' کے معنی میں ہوگا، اور مطلب یہ ہے کہ کمال ایمان اس وقت حاصل ہوگا جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حق سب سے زیادہ سمجھا جائے اور سب سے زیادہ اس کی ادائیگی کی سعی ہو۔

اقسام محبت اور ان کا مفہوم:

شراح نے فرمایا کہ محبت دو قسم کی ہوتی ہے (۱) حب طبعی (۲) حب عقلی، حب طبعی سے مراد میلان نفسی وقلبی ہے، یہ غیر اختیاری چیز ہے، اور حب عقلی یہ ہے کہ مقتضائے عقل کو مقتضائے طبیعت پر غالب کردے، جیسے مریض کے لئے کڑوی دوا کہ وہ اس کو ناپسند ہونے کے باوجود یہ سوچ کر استعمال کرتا ہے کہ میرا فائدہ اسی میں ہے، یہاں حدیث میں یہی حب عقلی مراد اور مطلوب ہے، طبعی میلان چاہے جہاں ہو، یعنی جی نہ چاہنے اور ظاہری مفاد کے خلاف ہونے کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تقاضۂ محبت کو ترجیح دیجائے اور آپ کا اتباع کیا جائے۔

اسبابِ محبت:

یہ محبت اللہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ ہونی چاہئے، وجہ اس کی یہ ہے کہ مناشی (اسباب) محبت چار ہیں اور وہ چاروں اسباب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر کمال کے درجہ میں پائے جاتے ہیں، وہ اسباب یہ ہیں: جمال، کمال، نوال اور خصال، جمال یعنی حسن وخوبصورتی، کمال یعنی طبعی صلاحیت، نوال بمعنی عطاء بخشش اور خصال بمعنی اخلاق حمیدہ۔

---

(۱) شرح صحیح بخاری لابن بطال ٦/٩٦.

(۱) جمال نبوی:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال سب سے زیادہ تھا، کتب حدیث میں شمائل کے تحت اس کا باقاعدہ باب آتا ہے، حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ میں نے چاندنی رات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد میں بیٹھے ہوئے دیکھا، میں کبھی چاند کی طرف دیکھتا اور کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کہ دونوں میں کون زیادہ خوبصورت ہے، بالآخر میری طبیعت نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی چاند سے زیادہ خوبصورت ہیں۔(۱)

(۲) کمال نبوی:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ کمال والے بھی تھے، اسی وجہ سے آپ کو اولین وآخرین کا سردار بنایا گیا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''أنا سید ولد آدم ولا فخر(۲)''

(۳) نوالِ نبوی:

آپ کی عطاوبخشش بھی سب سے زیادہ تھی، جو کچھ آتا آپ فوراً خرچ فرمادیا کرتے تھے، خود قناعت کی زندگی گزاری، غزوہ حنین میں بڑا مال حاصل ہوا، ایک ایک کو کئی کئی سو بکریاں دیں، واپسی میں کچھ دیہاتی لوگوں نے آپ سے مال کا مطالبہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لئے کچھ بھی لیکر نہ آئے اس لئے کچھ نہ تھا تو معذرت فرمائی، اعرابی لوگ مطالبہ واصرار کرتے ہوئے آپ سے اتنا چمٹے کہ آپ خاردار درختوں میں پہنچ گئے، حضرات صحابہؓ فرماتے ہیں کہ رمضان میں آپ کی عطا تیز ہوا کی طرح ہوجاتی تھی۔ (۳)

(۴) خصالِ نبوی:

اچھے اخلاق بھی آپ کے سب سے زیادہ تھے حتی کہ قرآن نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نمونہ بتایا اور آپ کے اخلاق کی تعریف کی، ارشاد خداوندی ہے ''**إِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم**'' یعنی بے شک آپ اخلاق کے اعلی درجہ پر فائز ہیں۔

---

(۱) شمائل ترمذی ص ۲/فی خلق رسول الله صلی الله علیه وسلم.

(۲) سنن ابن ماجه(٤٣٠٨)، سنن ترمذی(٣١٤٨) میں یه الفاظ هیں ''أنا سید ولد آدم یوم القیامة ولا فخر''

(۳) فتح الملهم ١/٤٢٦.

معیارِ محبت:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل محبت کے بغیر آدمی کامل مسلمان نہیں ہوسکتا، اوراس کا پتہ تقابل کے وقت چلے گا کہ وقت آوے تو اپنی ہرچیز پرحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ترجیح دے، اگرایسا نہ کرے گا تو قرآن کریم میں اس پرسخت وعید بیان کی گئی ہے، ارشاد باری ہے: ’’قُلْ اِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَاَبْنَائُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنَ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ، فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ[1]‘‘یعنی اے پیغمبر لوگوں سے کہدو کہ اگرتمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان اوروہ مال ودولت جوتم نے کمایاہے اوروہ کاروبار جس کے تمہیں مندا ہونے کا اندیشہ ہے اوروہ رہائشی مکان جوتمہیں پسند ہیں تمہیں اللہ اوراس کے رسول سے اوراس کے راستہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کردے۔

محبت کے درجات:

حضرات علماء نے لکھاہے کہ اللہ ورسول سے محبت کے دودرجے ہیں:

(۱)واجب: وہ یہ کہ ان سے اتنی محبت ہوجس سے انسان فرائض وواجبات بجالائے اورمنکرات ومعاصی سے بچتارہے، یہ محبت کا ادنی درجہ ہے، اگراس درجہ محبت نہیں ہےتوانسان گنہ گارہوگا، بعض عارفین سے پوچھا گیا کہ اللہ ورسول سے محبت کا مفہوم اورمعیار کیاہے؟ توانہوں نے کہا: تمام احوال میں ان کی اطاعت، لہٰذا اگراطاعت نہیں ہےتو وہ محبت نہیں، محض محبت کا دعوی ہے۔

(۲)مستحب، یعنی اس قدرمحبت ہوکہ انسان ان کی پسندکاہرکام بجالانے کی کوشش کرے، حتی کہ نوافل ومستحبات کا بھی اہتمام ہواوران کی ناپسند ہرچیز سے بچے، حتی کہ مکروہات کا بھی ارتکاب نہ کرے اوران کے ہرفیصلہ پرراضی وصابررہے، محبت کا یہ اعلی ترین درجہ ہے اوراس کو’’درجۂ مقربین‘‘ کہا جاتاہے۔[2]

---

(۱)التوبة: ۲٤.

(۲)اختيار الاولى فى شرح حديث اختصام اعلاء الاعلى لابن رجب الحنبلى ۱/۱۲٦.

فوائدحدیث:

(١)اس حدیث پاک میں والد کا ذکر تغلیباً ہے ورنہ والدہ بھی اس میں داخل ہے، نیز والد کو ولد پر مقدم کیا اس لئے کہ والد حقیقۃً مقدم ہوتا ہے، مسلم شریف کی روایت میں ولد مقدم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عموماً ولد کی محبت زیادہ ہوتی ہے۔ (١)

(٢) حضرات صحابہؓ کی عادت شریفہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر نصیحت کو اپنے اوپر منطبق کیا کرتے تھے، چنانچہ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس حدیث کو اپنے اوپر منطبق کیا اور غور کر کے فرمایا کہ یارسول اللہ مجھے آپ کی محبت سب سے زیادہ ہے سوائے اپنی ذات کے، اپنی ذات کی محبت اپنے اندر زیادہ پاتا ہوں، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عمر! ابھی تمہارا ایمان مکمل نہیں ہے، حضرت عمرؓ نے تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کہ یارسول اللہ اب آپ کی محبت میرے اندر اپنی ذات سے بھی زیادہ ہے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت سنائی کہ اب تمہارا ایمان کامل ومکمل ہوگیا۔ (٢)

سوال یہ ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے اندر اس قلیل لحظہ میں تبدیلی کیسے آگئی ؟اس کا جواب دیتے ہوئے عام شراح نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ اولاً یہ سمجھے کہ یہاں محبت سے حب طبعی مراد ہے، اس لئے اولاً یہ کہا کہ اپنی ذات کی محبت زیادہ ہے، پھر اس وقفہ میں غور کیا تو سمجھ گئے کہ حب عقلی مراد ہے، اس لئے دوسری مرتبہ میں عرض کیا آپ کی محبت ہی زیادہ ہے۔

لیکن ملاعلی قاریؒ نے دوسری وجہ تحریر فرمائی ہے وہ یہ کہ جب حضرت عمرؓ نے صاف گوئی سے کام لیا اور اپنا روحانی مرض کھول کر بیان کردیا، تو اس صاف گوئی اور صدق کی برکت سے اللہ نے اس کمی کو دور فرمادیا اوران کے اندر اپنے محبوب کی محبت زیادہ پیدا فرمادی، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ بھی شامل تھی، تو اچانک یہ ترقی وعروج صدق گوئی کی وجہ سے ہوا۔ (٣) تبدیلی کی یہ وجہ زیادہ راجح اور قرین قیاس ہے۔

(٣) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جس کا بھی ایمان ہے اس کے دل میں آپ کی محبت ضرور ہوتی ہے،

---

(١) مسلم شريف ١/ ٤٩ (١٨٠) فتح الملهم ١/ ٤٢٧.

(٢) بخاری ٢/ ٩٨١ (٦٦٣٢)

(٣) المرقاة ١/ ١٣٩.

البتہ اس کے درجات میں تفاوت ہوتا ہے، حضرات صحابہ کوآپ سے سب سے زیادہ محبت تھی، اس درجہ کوتو کوئی نہیں پہنچ سکتا، مگر جولوگ بظاہر دیندار نظر نہیں آتے ہیں اور معاصی میں ڈوبے رہتے ہیں ان میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ جب کبھی ان کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ آتا ہے تو وہ ''ماہی بے آب'' کی طرح تڑپ اٹھتے ہیں، اعداء اسلام اگر نبی علیہ السلام کی شان میں کوئی گستاخی کرتے ہیں تو سب سے پہلے ایسے ہی لوگ آواز بلند کرتے ہیں، جوقلوب میں حب رسول پنہاں ہونے کی علامت ہے، بس اس طرف توجہ چاہئے کہ اس حب رسول سے آدمی عملی زندگی میں فائدہ اٹھائے۔

۸ / ۷ : وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ثَلاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلاوَةَ الإِيْمَانِ: مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَمَنْ أَحَبَّ عَبْداً لايُحِبُّهُ، إِلاَّ لِلّٰهِ، وَمَنْ يَكْرَهُ أَنْ يَعُوْدَ فِيْ الْكُفْرِ بَعْدَ أَنْ أَنْقَذَهُ اللّٰهُ مِنْهُ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُلْقٰى فِي النَّارِ. (متفق علیہ [1])

ترجمہ : اورحضرت انسؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین باتیں جس میں ہوں گی وہ ان کی وجہ سے ایمان کی حلاوت ولذت محسوس کرے گا، (۱) جس کو اللہ اور اس کا رسول ان کے سوا (ہر چیز سے) زیادہ محبوب ہوں، (۲) اور جو کسی شخص سے صرف اللہ کے لئے محبت رکھتا ہو (۳) اور جس کو کفر میں لوٹنا جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس سے خلاصی عطاء فرمادی ایسا ناپسند ہوجیسا کہ وہ آگ میں ڈالا جانا ناپسند کرتا ہے۔

تشریح حدیث

ایمان کی حلاوت اوراس کے اسباب:

اس روایت کے راوی بھی حضرت انسؓ ہیں، اس حدیث پاک میں بھی کمال ایمان کا بیان ہے اورایمان کوایک شیریں اورمیٹھی چیز کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور پھر بطریق استعارہ بالکنایہ حلاوت ومٹھاس اس کے لئے ثابت کی گئی ہے، چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین باتیں جس میں موجود ہوں گی

(۱) أخرجه البخاري ۱ / ۷ برقم ۱٦ بنحوه و ۷–۸ برقم بلفظه سوى "بهن" و ۲ / ۸۹۲ في الأدب برقم ٥۸۰٦ بنحوه، و ۲ / ۱۰۲٦ برقم ٦٦۷۳، في الإكراه بنحوه ومسلم ۱ / ٤۹ برقم ٦۷–٦۸ بنحوه فيه لفظة "بهن"

وہ ایمان کی حلاوت کو پالے گا وہ تین باتیں یہ ہیں: (۱) اللہ اوراس کا رسول دوسری سب چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں، (۲) کسی بندہ سے صرف اللہ کے لئے محبت کرے، (۳) اللہ نے جب کفر سے نجات دیدی تو اب وہ کفر کو ایسا ناگوار سمجھے جیسے آگ میں ڈالا جانا ناگوار ہوتا ہے۔

ثلث من کن فیہ وجد بھن حلاوۃ الایمان: ثلث پر تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے ای ثلث خصالٍ۔ (۱)

حلاوت کی اقسام اور حدیث میں اس کا مصداق:

حلاوت کی تین قسمیں ہیں: (۱) حلاوت حسی (۲) حلاوت معنوی (۳) حلاوت اخروی، حلاوت حسی یہ ہے کہ فی الحقیقت منہ میں مٹھاس محسوس ہوجائے، حلاوت معنوی یہ ہے کہ حساً تو معلوم نہ ہو، البتہ طاعات میں لذت آنے لگے، اور حلاوت اخروی سے مراد جنت کی نعمتیں ہیں۔

صوفیائے محدثین کے یہاں اس روایت میں حلاوت حسی مراد ہے، لیکن یہ چیز ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتی، جب تعلق مع اللہ قوی ہوتب حسی حلاوت محسوس ہوتی ہے، چنانچہ بعض اہل اللہ سے منقول ہے کہ ذکر کے وقت ان کی زبان میں مٹھاس ہوتی ہے، اور فقہائے محدثین کے یہاں حلاوت معنوی مراد ہے یعنی طاعات وعبادات میں لذت آنے لگے گی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ''**جُعِلَتْ قُرَّۃ عُیْنِیْ فی الصلوۃِ** (۲)'' کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے اسی پس منظر میں وارد ہوا ہے، اور بعض نے کہا کہ حلاوت اخروی مراد ہے یعنی یہ تین خصلتیں جس میں ہوں وہ جنت میں داخل ہوگا اور وہاں کی نعمتوں کی حلاوت پائے گا، تینوں قسمیں بھی بیک وقت مراد لی جاسکتی ہیں۔ (۳)

(۱) اللہ ورسول کی محبت ہر چیز سے بڑھ کر ہو:

من کان اللہ ورسولہ احب الیہ مماسواھما: یعنی سب چیزوں پر اللہ ورسول کی محبت غالب ہو اور وہ ہر چیز پر اللہ ورسول کی اطاعت کو ترجیح دیتا ہو، جیسا کہ پچھلی حدیث میں گذرا۔

---

(۱) یاموصوف کے عوض میں ہے أي: خصال ثلث کما في شرح الطیبي ۱/۱۱۰۔

(۲) مسند أحمد ۱۹/۳۰۵ (۱۲۲۹۳) ط: الرسالۃ، سنن النسائي: کتاب عشرۃ النساء /باب حب النساء، رقم (۳۹٤۰)

(۳) المرقاۃ ۱/۱۳۹.

ایک اشکال اور جواب:

اس پر اشکال ہے کہ ایک حدیث میں اللہ اوراس کے رسول کے لئے ایک ضمیر لانے پرنکیر آئی ہے ایک خطیب نے کہا تھا: **من يطع الله ورسوله فقد رشد ومن يعصهما فقد غوى** تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **بئس الخطيب أنت** [1]، کیونکہ اس سے شرک کا واہمہ ہوتا ہے جبکہ یہاں خود ایک ضمیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمائی ہے؟

علامہ عزالدین بن عبدالسلام نے اس کا جواب دیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا کرے تو ایہام شرک کی وجہ سے ممنوع ہے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ممنوع نہیں، کیونکہ وہاں ایہام شرک نہیں ہے، موسی شاہین صاحب فتح المنعم نے فرمایا کہ عزالدین کا یہ جواب خیرالاجوبہ ہے۔[2]

(۲) کسی بندہ سے صرف اللہ کے لئے محبت ہو:

ومن احب عبداً الخ: جوشخص کسی سے صرف اللہ کے لئے محبت کرے کوئی ذاتی غرض مقصود نہ ہو، اورمحبت کا منشا صرف اللہ ہو، خاندان وبرادری، رنگ ونسل اورعلاقہ وملک، منشاءِ محبت نہ ہو، نیز صرف اس لئے محبت ہو کہ اس میں دینی خوبی وکمال موجود ہے یا اس سے دینی فائدہ حاصل ہوتا ہے، یہ بہت افضل شخص ہے اللہ اس کو اپنے عرش کے سائے میں رکھیں گے، اسی طرح کسی سے نفرت اوربغض ہوتو وہ بھی اللہ کی وجہ سے ہو، یہ عمل بھی اللہ کو بہت زیادہ پسند ہے۔

ابوبکر صدیق کا جذبۂ حبّ نبوی:

حضرات صحابہ کی زندگی میں اس کی بہت مثالیں ملتی ہیں، حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے حضرت عبدالرحمٰن بن اَبی بکر جنگ بدر میں کفار کے ساتھ تھے، مسلمان ہونے کے بعد ایک مرتبہ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے عرض کیا: اباجان بدر میں کئی مرتبہ آپ میری تلوار کی زد میں آگئے تھے، مگر میں نے باپ سمجھ کر چھوڑ دیا، حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا: بیٹا! اگر تو میری تلوار کی زد میں ایک مرتبہ بھی آجاتا تو میں تجھے نہ چھوڑتا

(۱) صحيح مسلم (۸۷۰)، سنن أبي داود (۱۰۹۹، ٤٩٨١)، سنن نسائي (۳۲۷۹)

(۲) فتح المنعم بشرح صحيح مسلم ۱/۱٦۲، وانظر لأجوبة اخرى: شرح الطيبي ۱/۱۱۷، عمدة القاری ۱/۲۲۹ — ۲۳۰.

اور بیٹا ہونے کا خیال نہ کرتا، اسی طرح ایک مرتبہ ان کے والد نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کردی جس پر حضرت ابوبکرؓ نے ان کو ایسا طمانچہ رسید کیا کہ وہ گر پڑے، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، آپ نے ابوبکر سے باز پرس کی، اس پر ابوبکر نے فرمایا کہ: اگر میرے قریب تلوار ہوتی تو ان کی گردن اڑا دیتا۔(۱)

(۳) کفر آگ میں ڈالے جانے کی طرح ناپسند ہو:

ومن یکرہ ان یعود فی الکفر الخ: یعنی کفر سے نجات سے حاصل ہوجانے کے بعد اس کو کفر میں لوٹنا آگ میں ڈالے جانا جیسے ناگوار ہو، یہ بات کہ "کفر سے نجات کے بعد" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے حال کے مناسبت سے ارشاد فرمائی تھی کہ اکثر صحابہ کفر سے اسلام میں داخل ہوئے تھے ورنہ اگر کوئی پہلے سے مسلمان ہو اور کفر اختیار کرنے کو ایسا ہی ناپسند کرتا ہو اس کے لئے بھی یہی فضیلت ہے، لیکن ایسے شخص کے لحاظ سے "**یعود**" "**یصیر کافرا**" کے معنی میں ہوگا۔(۲)

قصۂ حضرت عبداللہ بن حزافہ:

تاریخ میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ: حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک لشکر روم کی جانب جہاد کے لئے بھیجا گیا جس کا امیر عبداللہ بن حزافہ کو مقرر کیا گیا، جو صحابی تھے اتفاق ایسا ہوا کہ مسلمانوں کی فوج کو شکست ہوگئی اور بادشاہ نے مسلمانوں کو گرفتار کرلیا، جس میں امیر لشکر عبداللہ بن حدافہؓ بھی تھے، بادشاہ نے ان کو بلاکر کہا کہ: تم میرے سامنے اپنے نبی کی تکذیب اور اسلام سے دستبرداری کا اعلان کرو، انہوں نے فرمایا: اگر مر کے دوبارہ زندہ ہوجاؤں تب بھی ایسا نہیں کرسکتا، اس نے کہا: میں تمہیں دردناک طریقہ پر قتل کردوں گا، انہوں نے فرمایا: ٹکڑے کردو تب بھی تمہاری مراد پوری نہیں ہوسکتی، اس نے پھر کہا: تمہیں عبرتناک موت دوں گا، مگر یہ پھر بھی اپنی بات پر جمے رہے، اس کے بعد اس کافر بادشاہ نے کڑھائی منگوائی اور اس میں تیل ڈلواکر کھولایا، جب وہ خوب کھول گیا، تو اس میں ایک قیدی کو ڈال دیا جو فوراً جل بھن کر ختم ہوگیا، بادشاہ نے یہ کرنے کے بعد عبداللہ بن حزافہؓ کو دیکھا تو وہ رونے لگے، بادشاہ نے سوچا کہ شاید موت کے ڈر سے رو

(۱) انظر: تفسیر قرطبی: ۱۷/ ۳۰۷ خطبات محمود: ۳/ ۱۰۸.

(۲) المرقاۃ ۱/ ۱۴۲.

رہے ہیں، مگر انہوں نے فرمایا: کہ میں اس انجام کی وجہ سے نہیں رو رہا ہوں، بلکہ اس لئے رو رہا ہوں کہ میرے پاس صرف ایک جان ہے، کاش سو جانیں ہوتیں تو میں ان کو بھی اسی طرح اللہ کے راستے میں قربان کردیتا، بادشاہ ان کے اس عزم واستقلال سے حیرت زدہ رہ گیا اور اس کے دل میں کچھ نرمی آئی تو اس نے کہا: اچھا صرف اتنا کرو کہ میری پیشانی کو بوسہ دے دو، میں تمہیں چھوڑ دونگا انہوں نے کہا کہ: اگر میرے سب ساتھیوں کو چھوڑ دو تو میں اس کے لیے تیار ہوں، وہ اس پر آمادہ ہوگیا، عبداللہ بن حذافہؓ نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی کو بوسہ دے دیا اور اپنے تمام ساتھیوں کو چھڑا لیا، جب قافلہ مدینہ پہنچا تو حضرت فاروق اعظمؓ نے مدینہ سے باہر ان کا استقبال کیا اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا، اور فرمایا کہ: اس لئے بوسہ دے رہا ہوں کہ تم نے ایک بوسہ کے ذریعہ تمام مسلمانوں کو چھڑا لیا۔(١)

٩ / ٨ وَعَنِ الْعَبَّاسِ بنِ عَبدِالْمُطَّلِبِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ذَاقَ طَعْمَ الإِيمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا، وَبِالإِسْلامِ دِيْناً، وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلاً، رواه مسلم.(٢)

ترجمہ: حضرت عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ سبحانہ وتعالی کو رب ماننے پر اسلام کو اپنا دین ماننے پر اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے پر راضی ہوگیا اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا۔ (مسلم)

تشریح حدیث

احوال حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب:

اس حدیث کے راوی حضرت عباس بن عبدالمطلب ہیں، جو جلیل القدر صحابی ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا ہیں، آپ طویل قد سفید رنگ اور خوبصورت تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں دو سال بڑے تھے، جب وہ مسلمان ہوگئے تو کسی نے پوچھا کہ آپ بڑے ہیں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم؟ تو انہوں نے بہت مؤدبانہ اور سنجیدہ جواب دیا: ''هو أكبرُ و أنا أَسَنُّ''، یعنی مرتبہ کے لحاظ سے وہ بڑے ہیں اور عمر میری زیادہ ہے۔

(١) الإصابه ٣ / ١٨١ بتصرف يسير.

(٢) أخرجه مسلم في الإيمان، باب الدليل على أن من رضي بالله رباً وبالإسلام دينا وبمحمد رسولاً ١ / ٤٧.

حضرت عباسؓ غزوۂ بدر سے پہلے ہی مسلمان ہوگئے تھے، لیکن اپنے اسلام کا اظہار نہیں کیا تھا، حتی کہ غزوۂ بدر میں کفار کے ساتھ آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا حال معلوم تھا اس لئے آپ نے اعلان کردیا تھا کہ عباسؓ کو قتل نہ کرنا، بلکہ قید کرلینا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، پھر انھوں نے فدیہ دیا اور واپس مکہ مکرمہ آگئے اور مکہ آکر اسلام کا اعلان کیا اور پھر ہجرت کی۔

حضرت عباسؓ زمانۂ جاہلیت میں بھی رئیس اور سردار تھے، خانہ کعبہ میں زمزم پلانے کا کام آپ کے ذمہ تھا اور مسجد حرام کے متولی تھے، اسلام لانے سے پہلے بھی اسلام کے ہمدرد تھے، ۱۲؍رجب یا ۱۲؍رمضان میں بروز جمعہ ۳۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔(۱)

ایمان کی ذائقہ رسی کے اسباب:

اس حدیث پاک میں بھی ایمان کو شیریں چیز کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس شخص میں تین باتیں موجود ہوں وہ ایمان کا ذائقہ چکھ لے گا، (۱) جو اللہ سے راضی ہو رب ہونے کے اعتبار سے (۲) اور اسلام سے راضی ہو دین ہونے کے اعتبار سے (۳) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے راضی ہو نبی ہونے کے اعتبار سے۔

(۱) اللہ کو رب ماننا:

بالله ربا: اللہ سے راضی ہو یعنی اللہ کو رب ماننے پر راضی ہو، اس کے دو مطلب ہیں:

(۱) اللہ کو رب مانتا ہو، اس پر خوش ہو بلکہ فخر ہو۔

(۲) اللہ کے رب ہونے پر قناعت اختیار کرے کہ اللہ کو ہی اپنا رب مانے، کسی کو اس کا شریک تسلیم نہ کرے، تمام امور کا مالک اور متصرف اللہ کو ہی قرار دے۔ (۲)

(۲) اسلام کو دین ماننا:

وبالإسلام دينا: اسلام سے راضی ہو یعنی احکام اسلامیہ پر خوش دلی کے ساتھ عمل کرے اور اس پر شرح صدر ہو اور اس کو نجات کے لئے کافی سمجھتا ہو، کسی اور دین کی طلب نہ ہو۔

---

(۱) الإصابة ۳/ ۱٤٦، والمرقاة ۱/ ۱٤۳.

(۲) شرح الطيبى ۱/ ۱۱۹ والمرقاة ۱/ ۱٤۳.

(۳) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننا:

وبمحمد رسولاً: اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے راضی ہو یعنی آپ کو اپنا رسول ورہنما مانتا ہو، صرف آپ کی ذات کو قابلِ اتباع سمجھتا ہو، آپ کی سنتوں پر خوش دلی سے عمل کرتا ہو، جسمیں یہ باتیں ہوں وہ ایمان کا ذائقہ چکھ لے گا یعنی اسلام پر شرح صدر اور ایمان کی لذت اس کو نصیب ہوگی۔

بعض روایات میں ہے کہ جو شخص ان الفاظ کو صبح وشام تین، تین مرتبہ پڑھے تو اس کو اللہ کی رضا نصیب ہوگی۔(۱)

۱۰/۹ وعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ، لايَسْمَعُ بِيْ أَحَدٌ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ، يَهُوْدِيٌّ وَلانَصْرَانِيٌّ، ثُمَّ يَمُوْتُ، وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِيْ أُرْسِلْتُ بِهٖ إِلَّا كَانَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ. (رواه مسلم)(۲)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے اس امت میں سے خواہ یہودی ہو یا نصرانی جو بھی میری رسالت کی خبر سنے گا اور پھر اس شریعت پر ایمان لائے بغیر مرجائے جس کو لیکر مجھے بھیجا گیا ہے تو وہ جہنمیوں میں سے ہوگا۔ (مسلم)

تشریح حدیث

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عامہ کا بیان:

اس حدیث میں ایمان کا بیان ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے عام ہونے کا بیان ہے

(۱) عن أبي سلام خادم النبي صلى الله عليه وسلم، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: ما من مسلم أو انسان أو عبد يقول حين يمسي وحين يصبح ثلاث مرات: رضيت بالله رباً وبالإسلام دينا وبمحمد نبيا، إلا كان حقا على الله أن يرضيه يوم القيامة، الترغيب والترهيب للمنذرى ۱/۲۵٦ (۹۷۱)

(۲) أخرجه مسلم في الإيمان، باب وجوب الإيمان برسالة نبينا محمد صلى الله عليه وسلم إلى جميع الناس ونسخ الملل بملة ۱/۸٦ برقم ۲٤۰.

پہلے انبیاء مخصوص قوموں اور خطوں کی طرف مبعوث کئے جاتے تھے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ''قُلْ يآأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعًا''

والذی نفس محمد صلی الله علیه و سلم بیده الخ: اس حدیث شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے میری بعثت عام ہے جس شخص تک بھی میری بعثت کی خبر پہنچی اور وہ ایمان نہ لایا تو وہ نجات نہیں پائیگا، یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر ارشاد فرمائی، تاکہ بات میں تاکید اور پختگی پیدا ہوجائے اور اس قسم میں جو ''بیــده'' کا لفظ آیا ہے، یہ متشابہات میں سے ہے، جس کا صحیح مفہوم اللہ ہی کو معلوم ہے، سمجھنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ اس سے مراد اللہ کی قدرت وتصرف ہے۔ (۱)

امت کی اقسام اور حدیث میں اس کا مصداق:

لایسمع بی أحد من هذه الأمة الخ: امت کی دو قسمیں ہیں (۱) امت دعوت (۲) اور امت اجابت، امت اجابت سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو قبول کیا اور امت دعوت سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کرنا ضروری ہے یعنی تمام انسان، یہاں یہی دوسری قسم مراد ہے کہ ہر شخص جس تک آپ کی آمد کی خبر پہنچے تو وہ آپ پر ایمان لائے، ورنہ جہنمی ہوگا، اور اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ اس کے پاس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت نہ پہنچی ہو وہ اس وعید میں داخل نہیں ہوگا، البتہ موحد ہونا اس کا بھی ضروری ہے، اس لئے کہ توحید کا مسئلہ عقلی ہے۔ (۲)

یہود ونصاریٰ کی وجہِ تخصیص:

اس حدیث میں یہودی ونصرانی کی تخصیص کی گئی ہے، کیونکہ باقی لوگوں کے لئے حکم کو اولویت کے ساتھ ثابت کرنا مقصود ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اگر یہود ونصاریٰ آپ پر ایمان نہیں لائیں گے تو وہ جہنمی ہوں گے، کیوں کہ اگرچہ یہود ونصاریٰ اپنے اپنے زمانہ میں دین سماوی پر تھے، اسی پر عمل کرنے میں ان کی

(۱) شرح الطیبی ۱/ ۱۲۲-۱۲۳، المرقاۃ ۱/ ۱٤٥.

(۲) المصدران السابقان.

نجات تھی، مگر آپ کی بعثت کے بعد ان کا دین منسوخ ہوگیا،تو جب ان کے لئے بھی آپ کی بعثت پر ایمان لانا ضروری ہے، تو دوسرے لوگ جو دین سماوی پر نہیں ہیں ان کے لئے تو بدرجۂ اولی آپ کی رسالت پر ایمان لانا ضروری ہوگا۔

ثم یموت: اس میں ''ثم'' استبعاد کے لئے ہے کہ اتنے بڑے پیغمبر آنے کے باوجود بھی ان پر ایمان نہ لائے یہ انتہائی مستبعد اور موجب تعجب بات ہے۔

سید احمد بریلویؒ اور ایک سادھو کا واقعہ:

حضرت مولانا سید احمد بریلویؒ ہمارے اکابر میں سے ہیں،ان کے مرید تھے: حضرت مولانا سید اسماعیل شہیدؒ اور حضرت مولانا سید عبدالحی بڈھانوی، ایک مرتبہ دہلی میں ہندوؤں کا میلہ لگا ہوا تھا، اس میں یہ تینوں گئے، وہاں پہنچ کر حضرت سید احمد صاحبؒ نے ان دونوں سے فرمایا کہ جا کر دیکھو کوئی کام کا آدمی ہے؟ یہ حضرات گھومنے لگے، ایک جگہ دیکھا کہ کئی سادھو بیٹھے ہیں، واپس آ کر بتلایا کہ ایک سادھو ہے، وہ کچھ کام کا معلوم ہوتا ہے، فرمایا: اچھا چلو دیکھیں کون ہے؟ تینوں اس سادھو کے پاس پہنچے اس حال میں کہ وہ ننگا تھا، ان حضرات کو دیکھ کر فوراً اس نے اپنے بدن پر کپڑا لپیٹا اور استقبال کے لئے کھڑا ہوگیا، یہ تینوں حضرات جا کر اس کے پاس بیٹھ گئے اور اس سے کہا: تم خدا کتنے مانتے ہو؟ اس نے کہا کہ میں موحد ہوں، مولانا سید احمد صاحبؒ نے فرمایا کہ رسول کو مانتے ہو اس نے کہا: نہیں، فرمایا: کیوں نہیں؟ کہا: ضرورت نہیں؛ اس لئے کہ رسول ذریعہ ہوتا ہے خدا تک پہنچنے کا اور میں خود ہی خدا تک پہنچا ہوا ہوں کہ موحد ہوں، اس کے بعد مولانا سید احمد صاحبؒ نے ہاتھ اوپر کو کیا تو ہاتھ میں ایک پھل آیا، اس کو کاٹا اور خود کھایا اور سادھو کو بھی کھلایا، سادھو نے بھی اسی طرح ہاتھ اوپر کو کیا اس کے ہاتھ میں بھی ایک پھل آ گیا، اس کے بعد مولانا سید احمد صاحبؒ نے دوبارہ ہاتھ اوپر کو کیا تو ہاتھ میں ایک پیالی آئی اور ایک چھری، سادھو نے بھی ایسا ہی کیا،اس کے ہاتھ میں بھی ایک پیالی اور چھری آ گئی، مولانا نے چھری سے اپنے ہاتھ کی نس کھول کر اس پیالی میں خون نکالا اور اس پیالی کو مٹی میں دفن کر دیا، سادھو نے بھی اپنے ہاتھ کی نس سے خون نکال کر پیالی کو مٹی میں دبا دیا، کچھ دیر بعد مولانا نے اپنی پیالی نکالی، سادھو نے بھی اپنی پیالی نکالی، تو دیکھا کہ حضرت مولانا والا خون تو مشک کی طرح مہک رہا ہے اور سادھو کے خون میں کیڑے پڑ گئے، بدبو آنے لگی، تب مولانا سید

احمد صاحبؒ نے اس سے فرمایا کہ: زمین کے اوپر رہتے ہوئے تم کو رسول کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، زمین کے نیچے یعنی مرنے کے بعد تم کو رسول کی ضرورت پڑے گی، اس سادھو نے کہا کہ آپ نے ٹھیک کہا، مولانا نے کہا پھر کیا دیر ہے؟ اس نے کہا کچھ نہیں، فوراً کلمہ پڑھا: **لاإلـه الا الـلـه محمد رسول الله صلی الله علیه و سلم**، اور مسلمان ہوگیا۔ (۱)

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری ہے اس کے بغیر نجات حاصل نہیں ہوگی، جیسا کہ حدیث کا مضمون بھی یہی ہے۔

۱۱ / ۱۰ وَعَنْ أَبِیْ مُوْسَی الْأَشْعَرِیِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: ثَلٰثَةٌ لَهُمْ أَجْرَانِ: رَجُلٌ مِن أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنَ بِنَبِیِّهٖ وَآمَنَ بِمُحَمَّدٍ، وَالْعَبْدُ الْمَمْلُوْكُ إِذَا أَدَّی حَقَّ اللّٰهِ وَحَقَّ مَوَالِیهِ، وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهٗ أَمَةٌ يَطَأُهَا، فَأَدَّبَهَا فَأَحْسَنَ تَأْدِيْبَهَا، وعَلَّمَهَا فَأَحْسَنَ تَعْلِيْمَهَا، ثُمَّ أَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا: فَلَهٗ أَجْرَانِ. (متفق علیہ)(۲)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ تین شخص ایسے ہیں کہ جن کیلئے دوہرا اجر ہے (۱) اہل کتاب میں سے وہ شخص جو ایمان لایا اپنے نبی پر اور پھر ایمان لایا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر (۲) غلام جبکہ وہ ادا کرے اللہ سبحانہ وتعالی کا حق بھی اور اپنے آقاؤں کا حق بھی (۳) وہ شخص جس کی کوئی ایسی باندی تھی جس سے وہ وطی کرتا تھا، پس اس نے اس کو اچھے طریقہ پر ادب سکھایا اور اچھے طریقہ پر تعلیم دی اس کے بعد اس کو آزاد کر کے اس سے نکاح کرلیا تو اس شخص کے لئے بھی دوہرا اجر ہے۔ (بخاری ومسلم)

---

(۱) ملفوظات فقیه الامت ۳ / ۱۵٦.

(۲) أخرجه البخاری فی "العلم" ۱ / ۲۰ برقم ۹۷، وفی "العتق" ۱ / ۳٤٦ برقم ۲٤۷٤، وفی الجهاد ۱ / ٤۲۲ برقم ۲۹۱۹ بنحوه، وفی "کتاب الانبیاء" ۱ / ٤۹۰ برقم ۳۳۳۰ بنحوه وفی "النکاح" ۲ / ۷٦۱، برقم ٤۸۹۲ ومسلم فی "الإیمان" ۱ / ۸٦ برقم ۲٤۱ و"النکاح" ۱ / ٤٦۰ مختصراً.

تشریحِ حدیث

احوال ابوموسی اشعری:

آپ جلیل القدر صحابی ہیں اسم گرامی عبداللہ بن قیس ہے، ''اشعری''اشعر کی طرف منسوب ہے، جویمن کا ایک قبیلہ ہے، اسی نسبت سے مشہور ہیں، پتلے دبلے اور پستہ قد تھے، چہرے پر بال نہیں تھے، اور نہایت عمدہ قرآن پڑھتے تھے، مکہ مکرمہ میں ایمان لائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی ہجرت نہیں کی تھی کہ انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، پھر ۷ھ میں فتح خیبر کے سال اصحاب سفینہ کے ہمراہ مدینہ طیبہ آئے، گویا کہ ذوہجرتین ہیں ۲۰ھ میں حضرت عمرؓ نے ان کو بصرہ کا والی مقرر کیا تھا، حضرت عمرؓ نے ضابطہ بنایا تھا کہ کسی کو ایک سال سے زائد عامل مقرر نہیں کیا جائیگا، مگر ان کو چار سال تک عامل مقرر کیا، پھر حضرت عثمانؓ نے ان کو بصرہ سے ہٹا کر کوفہ کا والی مقرر فرمایا، انہوں نے ہی اہواز شہر کو فتح کیا، ۵۲ھ میں ۶۲ سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔ (۱)

حدیث کی باب سے مطابقت:

اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تین قسم کے لوگوں کو دوہرا اجر ملتا ہے، ایک وہ جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر سن کر آپ کے اوپر بھی ایمان لایا، ایمان کا بیان اسی جملہ میں ہے اور مقصد یہ ہے کہ گذشتہ نبیوں پر ایمان لانے والے بھی آپ پر ایمان لائیں، ان کا یہ فریضہ بھی ہے اور فضیلت والا عمل بھی، باب کے مناسب صرف یہی جملہ ہے، باقی دونوں جملوں کا مضمون الگ ہے، روایت الباب میں کسی ایک جز کا باب کے مطابق ہونا بھی کافی ہے، حدیث کے ہر ہر جز کا مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔

دوہرے اجر کے مستحق لوگ:

ثلثة لهم اجران: اس میں تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے ای ثلثة أشخاص یعنی تین طرح کے لوگ دوہرے اجر کے مستحق ہیں۔ (۲)

---

(۱) الإصابة ۳/ ۲۷۳.

(۲) شرح الطيبي ۱/ ۱۲۵.

(۱) پہلا شخص:

رجل من اھل الکتاب الخ :''اہل کتاب'' سے یہود ونصاریٰ دونوں مراد ہیں یعنی یہود میں سے جوشخص موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا یا نصاریٰ میں سے جو شخص عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لایا اس کو دوہرا اجر ہے، بعض روایات میں رجل من اھل الکتابین [۱] اور بعض میں تورات و انجیل کی صراحت ہے۔[۲]

بعض نے کہا کہ اہل کتاب سے یہاں نصاریٰ مراد ہیں، یہود نہیں، [۳] اس لئے کہ دین موسیٰ تو منسوخ ہوگیا تھا دین عیسیٰ کی وجہ سے، اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا معتبر نہیں، لہٰذا اہل کتاب سے نصاریٰ مراد ہونگے نہ کہ یہود۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ نصرانیت نے یہودیت کو منسوخ کیا یا نہیں؟ اس میں علماء کی دونوں رائے ہیں، جو حضرات ملتِ نصرانیہ کو ناسخ کہتے ہیں ان کے قول پر یہود کو دوہرا اجر نہیں ملے گا۔

جمہور فرماتے ہیں کہ اہل کتاب سے یہود و نصاریٰ دونوں مراد ہیں، اس لئے کہ ظاہراً دونوں کا ایک ایک نبی پر ایمان تھا، اور ظاہری ایمان دونوں کا صحیح تھا، اگرچہ حقیقۃً تو ان میں سے کسی کا بھی ایمان درست نہیں تھا، کیوں کہ نصاریٰ بھی تثلیث کے قائل تھے، جمہور ہی کا قول راجح ہے۔[۴]

(۲) دوسرا شخص:

والعبد المملوک اذا ادی حق اللہ و حق موالیہ: دوسرا شخص وہ غلام ہے جو اپنے آقا کے حق کو بھی ادا کرے اور اللہ تعالیٰ کے حق کو بھی ادا کرے یعنی احکامات الٰہیہ کی بھی پابندی کرے، اس کے لئے بھی دوہرا اجر ہے۔

''عبد'' کے ساتھ ''مملوک'' کی قید لگائی گئی ہے، اس لئے کہ اللہ کے بندے تو سب ہیں پس

(۱) مسند احمد ۳۶ / ۵۷۰ (۲۲۲۳٤) فیه: ''من أسلم من أهل الکتابین''

(۲) نسائی شریف ۲ / ۲٦١.

(۳) شرح الطیبی ۱ / ۱۲۵.

(٤) فتح الباری ۱ / ۲٤۰، المرقاۃ ۱ / ۱٤٦۔

''عبدؔ'' کے یہاں عام معنی مراد نہیں ہیں بلکہ وہ مملوک کے معنی میں ہے، اس لئے **مملوک** کی قید لگائی گئی ہے۔ [1]

موالیه: جمع مولیٰ بمعنی آقا، اس کو جمع لانے کی وجہ کیا ہے؟ بعض نے فرمایا کہ اس سے عبد مشترک مراد ہے کہ وہ کئی آقاؤں کے حق کو ادا کرتا ہے، بعض نے کہا ہے کہ'' عبد مشترک'' مراد لینے کی ضرورت نہیں، بسا اوقات غلام یکے بعد دیگرے کئی کئی لوگوں کی ملکیت میں جاتا ہے اس لحاظ سے جمع لایا گیا اور مطلب یہ ہے کہ وہ جس کی ملک میں بھی جاتا ہے اس کے حق کو ادا کرتا ہے۔ [2]

(۳) تیسرا شخص:

رجل کانت عنده امة الخ: تیسرا شخص وہ ہے جس کے پاس ایک باندی تھی خدمت کے لئے اور وہ اس سے وطی بھی کرتا تھا، لیکن اس کی اس نے اچھی تربیت کی اور اس کو تعلیم دی، پھر اس کو آزاد کر دیا اور پھر اس سے نکاح بھی کر لیا، تو اس کے لئے بھی دو اجر ہیں، ایک اجر ہے تربیت و تعلیم پر اور ایک اجر اعتاق وتزوج پر، یہی مطلب راجح ہے، باندی عموماً آقا کی خدمت میں لگی رہتی ہے، مگر اس نے اسکا وقت فارغ کیا اور اس کو ادب سکھایا، یعنی معاشرت کے آداب سکھائے اور احکام شرعیہ کی تعلیم دی پھر مزید احسان یہ کیا کہ اس کو آزاد کر دیا اور پھر مزید برآں خود ہی اس سے نکاح بھی کر لیا، اس لئے اس کو دوہرا اجر ملے گا۔

مذکورہ اشخاص کی وجہ تخصیص:

یہاں سوال ہوتا ہے کہ مذکورہ تین قسم کے لوگوں کے لئے دوہرا اجر بتایا ہے؛ حالانکہ ان کے کام بھی دو ہیں اور ہر وہ شخص جو دو کام کرے اس کو دو ہی اجر ملتے ہیں، جو شخص نماز پڑھے اور روزہ بھی رکھے اس کو دو اجر ملیں گے، پس ان تین افراد کی کیا خصوصیت ہوئی؟ اس سوال کے متعدد جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) ظاہر میں یہ وہم ہوسکتا تھا کہ ان تینوں کو ایک ہی اجر ملے دو اجر نہ ملیں، اس وہم کو دور کرنے کے لئے دوہرے اجر کی صراحت فرمائی، وہم اس لئے ہوسکتا ہے کہ پہلے شخص کو اپنے نبی پر ایمان لانے پر اجر نہیں ملنا چاہئے، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کے بعد ان کی شریعت منسوخ ہو چکی تھی، یہود کی

(۱) فتح الإله ۱/ ۲٦٥.

(۲) فتح الإله ۱/ ۲٦٥.

بھی اور نصاریٰ کی بھی، اور منسوخ چیز معتبر نہیں ہوتی، ایسے ہی غلام کو آقا کی خدمت پر ثواب نہیں ملنا چاہئے کیوں کہ آقاء کی خدمت تو اس کے ذمہ میں لازم ہے، کہ آقاء اس کا نفقہ برداشت کرتا ہے، اسی طرح تیسرے شخص کو تزوج پر اجر نہیں ملنا چاہئے، کیونکہ اس میں اپنی خواہش کی تکمیل ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وہم کو دور فرمایا اور واضح فرمایا کہ ان لوگوں کو ہر دو کاموں پر ثواب ملے گا، کیونکہ تینوں اشخاص کے یہ دونوں کام ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کام کے ساتھ دوسرے کام کو انجام دینا بہت مشکل ہوتا ہے، مثلاً اپنے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب کو اختیار کرنا بڑا مشکل امر ہے، غلام عموماً آقا کی خدمت میں لگے رہتے ہیں ان کو عبادت کا موقعہ کم ملتا ہے، مگر پھر بھی اللہ کی عبادت کی ادائیگی اہم بات ہے، اسی طرح باندی سے لوگ خدمت لیتے ہیں، اس کو کون ادب وتعلیم سکھاتا ہے اور کون ان سے خود نکاح کرتا ہے، مگر اس شخص نے ایسا کیا، اس لئے ان تینوں کو دوہرا اجر ملے گا۔(۱)

(۲) بعض نے کہا کہ أجـــــران سے مراد ہے دو عملوں میں سے ہر عمل پر دوہرا اجر ملے گا، اب خصوصیت ظاہر ہے۔(۲)

(۳) اور بعض نے کہا کہ ان تین قسم کے لوگوں کو پوری زندگی ہر ہر عمل پر دوہرا اجر ملتا رہے گا، اب تو خصوصیت کا کیا ہی کہنا ہے۔(۳)

۱۲/۱۱ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضي الله عنهما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أُمِرتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوا أَن لاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ، وَيُؤتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَ هُمْ وَأَمْوَالَهُمْ، إِلَّا بِحَقِّ الإِسْلَامِ، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ. (متفق علیه(۴)) إِلَّا أَنَّ مُسْلِماً لَمْ يَذْكُرْ ''إِلَّا بِحَقِّ الإِسْلَامِ''

(۱) المرقاة ۱/۱٤٦. تین کی قید احترازی نہیں ہے اور بھی کچھ حضرات ایسے ہیں جن کو دوہرا اجر ملتا ہے ازواج مطہرات کے بارے میں اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا ''ومن يقنت منكن لله ورسوله وتعمل صالحاً نؤتها اجرها مرتين'' علامہ سیوطی علیہ الرحمہ نے ایک مستقل رسالے (مطلع البدرين فيمن يؤتى أجره مرتين) میں ان کو جمع کیا ہے، جن کی تعداد تقریباً (۳۵) تک پہنچتی ہے۔

(۲) المرقاة ۱/۱٤٨.

(۳) المرقاة ۱/۱٤٨.

(٤) أخرجه البخاري في الإيمان، باب فإن تابوا وأقاموا الصلاة الخ ۱/۸ برقم ۲٥ ومسلم فيه، باب الأمر بقتال الناس حتى يقولوا لاإله إلا الله محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم ۱/۳۷ برقم ۳٦.

تــرجـمــہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں قتال کروں کفار سے، یہاں تک کہ وہ اس بات کی گواہی دینے لگیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اورمحمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اورنماز پڑھنے لگیں اورزکوۃ ادا کرنے لگیں، پس جب وہ ایسا کرنے لگیں گے تو انہوں نے اپنی جان اور مال کو مجھ سے بچالیا،مگرحق اسلام کی وجہ سے (یعنی اسلامی ضابطہ کے تحت جو باز پرس ہوگی وہ اب بھی باقی رہے گی) اسکے بعد ان کے باطن کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے(بخاری ومسلم) مسلم شریف کی روایت میں''إلابحق الاسلام'' کے الفاظ نہیں ہیں۔

تشریح حدیث

محض زبانی اقرار پرایمان کاحکم:

ایمان کا بنیادی رکن تصدیق قلبی ہے، اوروہی اسلام وایمان عنداللہ مقبول ومعتبر ہے جوصدقِ قلب سے ہو،مگربعض صورتوں میں صرف ظاہر پراعتماد کرتے ہوئے ایمان واسلام کاحکم لگادیا جاتا ہے۔

ان میں سے ایک صورت وہ ہے جوعموماً جنگ کے دوران پیش آتی ہے کہ اگرکوئی کافریاجماعتِ کفارکلمۂ اسلام پڑھ لے اوراسلامی احکام کی تعمیل کا وعدہ کرلے توپھران کے اس اقرار ووعدہ پراعتماد کرتے ہوئے ان کومسلمان سمجھا جائے گا اوران سے جنگ وقتال کوروک دیا جائے گا، اگرانہوں نے ایسا محض اپنی جان ومال بچانے کے لئے کیاہوتو ان کاحساب وکتاب اللہ کے حوالہ کردیا جائیگا ان کوکافرسمجھ کران کوقتل کرنا اوران کا مال لینا جائزنہیں ہوگا، اس لئے کہ ہم ظاہرکے مکلّف ہیں اوردل کے اندرکا حال جاننا ہمارے لئے ممکن بھی نہیں، پس ہم ظاہر پراعتماد کریں گے۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ نے ایک جنگ کے دوران ایک کافرکوکلمہ پڑھ لینے کے باوجودقتل کرڈالا، یہ سوچ کرکہ اس نے جان بچانے کے لئےکلمہ پڑھاہے نہ کہ صدقِ قلب سے، آپ علیہ السلام کو جب اس کی خبرہوئی تو آپ نے سخت غصہ کا اظہارکرتے ہوئے فرمایا: افلا شققت عن قلبه ؟یعنی اگرمسلمان ہونے کا مدارصرف دل پرہےتوتم نے اس کے سینہ کو چیرکرکیوں نہ دیکھ لیا![1]

(۱)بخاری: کتاب المغازی، باب بعث النبی صلی الله علیه وسلم اسامة بن زید الی الحرقات من جهینة، ومسلم: کتاب الایمان، باب تحریم قتل الکافر بعد قوله لااله الا الله.

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ جوکلمۂ اسلام پڑھ لے اس کو مسلمان قرار دیا جائے گا، خواہ اس کے دل میں اسلام ہو یا نہ ہو، الا یہ کہ خود اسی سے ایسی بات سرزد ہو جائے جو منافیٔ اسلام ہو۔

جزیہ کا ذکر کیوں نہیں؟

یہاں سوال ہوتا ہے کہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ کفار کو اولاً اسلام کی دعوت دی جائے اگر اسلام قبول کرلیں تو وہ مسلمان شمار ہوں گے، اور اگر اسلام قبول نہ کریں تو ان پر جزیہ پیش کیا جائے گا، اگر وہ جزیہ دینا منظور کرلیں تب بھی قتال نہ ہوگا اور اگر جزیہ پر بھی آمادہ نہ ہوں پھر قتال کیا جائے گا، یہاں روایت میں جزیہ کا تذکرہ نہیں ہے، محض اسلام قبول نہ کرنے پر قتال کا حکم مذکور ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حکمِ دنیا کے اعتبار سے جزیہ کلمہ ہی کے حکم میں ہے، کیونکہ کلمہ قبول کرنے کا مقصد اسلام کا غلبہ ہے، جزیہ منظور کرنے سے بھی اسلام کا غلبہ ہوتا ہے، لہٰذا صراحۃً اگرچہ اس کو ذکر نہیں کیا ہے البتہ کلمہ کے ضمن میں اس کا تذکرہ آ گیا ہے۔ (۱)

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ ''الناس'' کا الف لام عہد خارجی کے معنی کے لئے ہے اور اس سے خاص مشرکین عرب مراد ہیں جن سے جزیہ نہیں لیا جائے گا وہ یا تو اسلام قبول کریں یا پھر ان سے قتال کیا جائے گا۔ (۲)

کیا بے نمازی اور زکوۃ نہ دینے والے کو قتل کیا جائے گا؟

اس حدیث پاک میں اسلام کے ظاہری اعمال کا ذکر ہے، اس کا مفہوم مخالف نکلتا ہے کہ اگر کوئی ایمان لائے لیکن نماز قائم نہ کرے اور زکوۃ ادا نہ کرے تو اس کو بھی قتل کیا جائے گا، چنانچہ امام نووی نے اس روایت سے استدلال فرماتے ہوئے تحریر کیا کہ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ تارک صلوۃ عامداً کو قتل کیا جائے گا، (۳) اس لئے ائمہ ثلثہ ایسے شخص کو واجب القتل کہتے ہیں، البتہ وجہ قتل میں اختلاف ہے، امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا کہ بلا عذر نماز کو چھوڑنے والا مرتد ہے، حدیث میں ہے: ''**مَنْ تَرَکَ الصلوۃَ متعمِّداً**

(۱) فتح الباری ۱/۷۷ شیخ الهند، النکت علی صحیح البخاري لابن حجر ۱/۲۸۹ ط المکتبة الإسلامیة القاهرة.

(۲) شرح النووي علی مسلم ۱/۳۸.

(۳) شرح النووي علی مسلم ۱/۳۸.

فَقَدْ کَفَرَ'' اس لئے وہ واجب القتل ہوگا، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ تارک صلوۃ مرتد تو نہیں ہے، البتہ حداً اس کو قتل کیا جائے گا، جیسے زانی محصن کہ بطور سزا کے رجم کیا جاتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ ایسا شخص نہ مرتد ہے نہ واجب القتل ہے، البتہ اس کو جیل میں بند کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ توبہ کرے یا وہیں مرجائے، یہی حکم مانع زکوۃ کا ہے کہ اگر وہ زکوۃ کا منکر ہے تو وہ مرتد ہے اور اس پر ارتداد کا حکم جاری ہوگا، لیکن اگر وہ منکر تو نہیں ہے مگر دینے سے منع کرتا ہے تو اس سے جبراً وصول کی جائے گی اور اس کو تعزیر بھی کی جائے گی، مگر قتل نہیں کیا جائے گا۔

احناف اس استدلال کے جواب میں کہتے ہیں کہ اس حدیث کے ابتدائی حصہ میں اسلامی سزاؤں کا بیان نہیں، اسلامی سزاؤں کو تو روایت کے اخیر حصہ میں ''الا بحق الاسلام'' کہہ کر بیان فرمایا ہے، روایت کے ابتدائی حصہ میں تو جنگ بندی کا بیان ہے اور مطلب یہ ہے کہ کفار کی فتنہ پردازی کی وجہ سے ان سے جہاد وقتال ہوتا ہے، اگر جنگ کے دوران وہ مسلمان ہوجائیں تو پھر جنگ بند کردینی ضروری ہے، کیونکہ جہاد کا مقصد اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی کے راستہ پر ڈالنا ہے، پس جو شخص اللہ کے دین کو قبول کرلے اور اللہ کی بندگی کو قبول کرکے شریعت کے قانون پر چلنا منظور کرلے اس کے ساتھ جہاد کے کوئی معنی نہیں، اقامت صلوۃ اور ایتاء زکوۃ کا تذکرہ بطور مثال ہے بدنی عبادت میں سے اہم (نماز) کو لیا ہے اور مالی عبادت میں سے بھی اہم (زکوۃ) کو لیا، مراد پورا دین اسلام قبول کرنا ہے محض کلمہ پڑھ لینا مراد نہیں ہے۔

الابحق الاسلام: اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اگر لوگ کوئی ایسا جرم کریں جسکی سزا اسلام کے قانون میں جان یا مال لینا ہو تو اس کو وہ سزا دیجائے گی، ایمان لانے سے اور مسلمان کہلانے سے وہ قانونی گرفت سے بچ نہ سکیں گے، مسلم شریف میں یہ لفظ نہیں ہے، البتہ اس میں ''الابحقها'' ہے، جس کا مفہوم یہی نکلتا ہے۔

وحسابهم على الله: اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کلمہ پڑھ کر اور اللہ کی بندگی قبول کرکے اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرے ہم اس کو مسلمان مان کر جنگ بند کردیں گے، اور اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا معاملہ کریں گے لیکن اگر حقیقت میں اس کی نیت میں کھوٹ ہے اور اس کے قلب میں ایمان نہیں ہے تو اس کا حساب آخرت میں اللہ تعالیٰ لیں گے کہ وہ دلوں کے راز سے واقف ہیں۔

ایک مشہور اعتراض اوراس کا جواب:

یہ حدیث اوراس جیسی دیگر احادیث وآیات کولیکر اعداءِ اسلام کی طرف سے ایک مشہور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام تنگ نظر اورپُرتشدد مذہب ہے، وہ لوگوں کوآزادی کے ساتھ کسی اورمذہب پرعمل پیرانہیں دیکھنا چاہتااورانہیں زبردستی اسلام میں شمولیت پرمجبورکرتاہے، چنانچہ اس حدیث میں بھی یہی کہا گیاہے کہ اگرلوگ شہادتین کااقرارنہ کریں اوراسلامی احکام قبول نہ کریں توان سے قتال کیاجائے تاآنکہ وہ اس پرآمادہ ہوجائیں، تو اسلام دنیا میں تلوار کے زور سے پھیلایاجاتا رہاہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض اسلامی احکام وقوانین سے ناواقفیت اوران کے ناقص مطالعہ پر مبنی ہے، اس لئے کہ خوداسلامی شریعت میں یہ طے ہے کہ: (الف) جن کفار سے صلح ہوجائے ان سے تعرض نہ کرو: ''وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا''[1] (ب) جوکفار دارالاسلام میں امان لےکرآنا چاہیں انہیں امان دو: وَإِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ[2] (ج) جواسلام کی ماتحتی قبول کرکے جزیہ دینے پرآمادہ ہوجائیں ان کی جان ومال کی حفاظت کرو: حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ[3] یہ وہ صورتیں ہیں جن میں کافروں پرتلوار اٹھانا مسلمانوں پرتلوار اٹھانے کےمثل ہے، اسلام تنگ نظرہوتایااس کا مقصد لوگوں کوزبردستی مسلمان بنانا ہوتا تو پھروہ ان صورتوں میں کافروں پرتلوار اٹھانے کو کیوں منع کرتا۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں حدیث میں ''النَّاس'' سے مراد جملہ کفارومشرکین نہیں ہے بلکہ وہ کفارومشرکین مراد ہیں جونہ جزیہ دےکراسلام کی ماتحتی قبول کریں اورنہ کسی قسم کی صلح پرآمادہ ہوں اوروہ مسلمانوں کے لئے خطرہ بن رہے ہوں تو ایسے کفارومشرکین سے جنگ وجہاد کاحکم ہے کیونکہ جب ان سے کسی قسم کا معاہدہ نہیں تو وہ بھی مسلمانوں پرجب چاہے حملہ آورہوسکتے ہیں، لہٰذا مسلمانوں کوبھی اجازت ہے کہ اگروہ اسلام اورمسلمانوں کے لیے خطرہ بن رہے ہوں ان کا سرکچل دیں، غورکیاجائے کہ اس میں کونسا تشدداورظلم ہے؟ ساری دنیا کا اصول یہی ہے کہ جوخطرہ بن رہاہے اس سے تحفظ کی سعی کی جائے

(۱)الأنفال: ٦١.

(۲)التوبة: ٦.

(۳)التوبة:

عقل ودانش کا تقاضہ بھی یہی ہے۔

۱۳/۱۲ وعن انسٍ ؓ أنہ قال: قال رسولُ الله صلی الله علیه وسلم مَن صلّٰی صلاتَنا، واستقبلَ قِبْلَتَنا، وأَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا فذلک المسلمُ الذی له ذِمةُ الله وذِمة رسولِه فلاتُخفِروا اللهَ فی ذِمتِه. (رواہ البخاری)(۱)

ترجمہ : حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ہماری نماز کی طرح نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرے اور ہمارے ذبیحہ کو کھائے تو وہ مسلمان ہے جس کیلئے اللہ سبحانہ وتعالی اور اس کے رسول کا عہدوامان ہے، پس تم اللہ سے خیانت مت کرو اس کے عہدوامان کے بارے میں۔ (بخاری)

تشریح حدیث

علاماتِ اسلام:

اس حدیث میں اسلام کی علامات اور مسلمان ہونے کی ظاہری شناخت اور پہچان بیان کی گئی ہے اور مقصد یہ ہے کہ جو آدمی ظاہر میں اعمالِ اسلام کو اختیار کرے گا وہ مسلمان شمار ہوگا اور اللہ ورسول کی ذمہ داری میں آجائے گا، یعنی اس کے جان ومال محفوظ ہوجائیں گے، لہٰذا دیگر مسلمانوں کے لئے ان کے جان ومال سے تعرض جائز نہیں ہوگا ورنہ یہ بدعہدی شمار ہوگی۔

من صلی صلاتنا : ہماری جیسی نماز پڑھے یعنی یہود ونصاریٰ جیسی نماز نہ پڑھے کہ ان کی نماز مسلمانوں کی نماز سے الگ ہوتی ہے، چنانچہ یہود کی نماز میں رکوع نہیں ہوتا، اس کے علاوہ اور بھی کئی چیزوں میں فرق ہے۔

واستقبل قبلتنا : اسلام کی ایک امتیازی اور بہت کھلی ہوئی علامت بتائی کہ خانۂ کعبہ کو اپنا قبلہ مانے، یہ امتیازی علامت اس لئے ہے کہ اپنے قبلہ کو ہر شخص پہچانتا ہے چاہے اس کو نماز کا علم نہ ہو، مگر اپنے قبلہ کا علم ضرور ہوتا ہے، مسلمانوں کا قبلہ خانہ کعبہ، یہود کا قبلہ بیت المقدس اور نصاری کا قبلہ جہت مشرق ہے، من صلی صلوتنا میں استقبال قبلہ بھی داخل ہے لیکن یہ اسلام کی کھلی ہوئی علامت ہے اس لئے اس کو الگ سے

(۱) أخرجه البخاری فی الصلاة، باب فضل استقبال القبلة یستقبل بأطراف رجلیه القبلة ۱/۵٦ برقم ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱.

بیان کیا گیا ہے۔

واکــل ذبیـحتـنـا: تیسری ظاہری علامت اسلام کی یہ ہے کہ ہمارے ذبیحہ کو کھائے، مراد عبادات وعادات دونوں میں مسلمانوں کا اتباع کرنا ہے۔

یہ اوراس سے پہلی حدیث دونوں اس میں مشترک ہیں کہ بعض صورتوں میں ظاہر حال کے لحاظ سے اسلام کا حکم لگادیا جاتا ہے، ایک صورت کا بیان اس سے پہلی حدیث میں ہوا کہ جو ظاہر میں کلمہ پڑھ لے اوراحکامِ اسلام کی پابندی کا عہد کرلے اس کو مسلمان شمار کیا جائے گا، اور دوسری صورت کا بیان اس حدیث میں ہے کہ جو اسلام کی ظاہری تعلیمات کو اپنالے اور مسلمانوں کے شعائر کو اختیار کرلے اس کو بھی مسلمان قرار دیا جائے گا اوران کے دل کا حال اللہ کے حوالہ کردیا جائے گا۔

قادیانی کافر کیوں؟

یہاں اشکال ہے کہ مذکورہ تین کام کرنے والا شخص مسلمان ہے اوراللہ کے عہد میں ہے تو پھر قادیانیوں پر کفر کا حکم کیوں لگایا جاتا ہے جبکہ انکے اندر تینوں امور پائے جاتے ہیں؟ نیز متکلمین کے یہاں باقاعدہ ضابطہ ہے ''لانُـکـفِّر احداً من أهلِ ا لقبلةِ'' کہ ہم اہل قبلہ کی تکفیر نہ کریں گے، قادیانی بھی خانہ کعبہ کو اپنا قبلہ تسلیم کرتے ہیں، پھران پر کفر کا حکم کیوں ہے؟

جواب: متکلمین کی اصطلاح میں ''اہل قبلہ'' سے وہ شخص مراد ہوتا ہے، جو تمام ضروریات دین (قطعی احکام) کی تصدیق کرے، لہٰذا اگر کوئی شخص ضروریات دین میں سے کسی ایک چیز کا بھی منکر ہو تو وہ اہل قبلہ میں سے نہیں ہے، اس حدیث کی بھی مراد یہی ہے کہ جو دین کے بدیہی احکام کی تصدیق کرے وہ مسلم ہے، یہ تینوں امور بدیہیات دین میں سے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جو دین کی بدیہی اورضروری باتوں کا معترف ہو جن میں یہ تینوں اموربھی داخل ہیں اس کو مسلمان قرار دیا جائے گا، قادیانی ضروریات دین میں سے ختم نبوت کا انکار کرتے ہیں،اس لئے وہ مسلمان نہیں ہیں، اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ جو ان تینوں کو اختیار کرے اس کو ہر حال میں مسلمان کہا جائے گا، خواہ وہ دوسرے کسی بھی قطعی حکم کا منکر ہو، اس لئے کہ قطعیاتِ دین صرف انہی تین میں منحصر نہیں ہے، ان تین کا تذکرہ تو بطور مثال ہے۔

اہل قبلہ کا صحیح مفہوم:

نیز متکلمین کے ضابطہ میں بھی ''بـذنـب'' کی قید ہے اوراس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ارتکاب معاصی اور عملی کوتاہیوں کی وجہ سے کسی کی تکفیر نہیں کریں گے اوراس کو اہل قبلہ سے خارج نہیں کریں گے، جیسا کہ معتزلہ اورخوارج کرتے ہیں ، البتہ اگرکوئی قطعیات دین اورمسلماتِ دین کا منکر ہوتو اس کو اہل قبلہ سے خارج قرار دیاجائے گا اوراس کی تکفیر کی جائے گی، پس اس ضابطہ کی رو سے قادیانی بھی اہل قبلہ میں شمار نہیں ہوں گے، مذکورہ ضابطہ سے متعلق یہ تفصیل شرح عقائد کی شرح ''نبراس'' میں موجود ہے۔(۱)

فلاتخفروا الله في ذمته: یہ ''اخفریخفراخفاراً'' سے ہے،جس کے معنی بدعہدی کرنے کے ہیں۔

فوائد حدیث:

(۱)اس حدیث سے استقبال قبلہ کی اہمیت وعظمت ظاہر ہے، کہ اس کو اسلام وغیراسلام کے مابین حدفاصل اوراس کے اختیار کرنے والے کی جان ومال کومحفوظ اور مامون قرار دیا گیا ہے۔

(۲)نماز کے ساتھ استقبال قبلہ کے تذکرہ سے اس کانماز کے لئے شرط ہونا بھی معلوم ہوتا ہے، چنانچہ اس پرائمہ اربعہ کا اتفاق ہے، الا یہ کہ مصلی استقبال قبلہ سے عاجز ہو یا خارج مصرسواری پرنفل نماز پڑھ رہاہو۔

(۳)مسلمانوں کا ذبیحہ کھانا بھی اسلام کی علامات میں سے ہے، چنانچہ بعض قومیں مثلاً یہود ومجوس وغیرہ مسلمانوں کا ذبیحہ نہیں کھاتے۔

۱۴/۱۳ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: أَتٰی أَعْرَابِيٌّ النبيَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ دُلَّنِي عَلٰى عَمَلٍ إِذَا عَمِلْتُهُ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ، قَالَ: تَعْبُدُاللّٰهَ، وَلاتُشْرِكُ بِهٖ شَيئاً، وتُقِيْمُ الصلوةَ المكتوبةَ، وَتُؤَدِّي الزَّكوةَ الْمَفْرُوْضَةَ، وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ، قَالَ: وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لاأَزِيدُ عَلٰى هٰذَا شَيْئاً ولاأَنْقُصُ مِنْهُ، فَلَمَّا وَلّٰى قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهُ أَن يَنْظُرَ إِلىٰ رجلٍ من أَهْلِ الجنةِ فَلْيَنْظُرْ إِلٰى هذا. (متفق علیہ)(۲)

---

(۱)نبراس ص:۲۴۹.

(۲)أخرجه البخاري في "الزكوة" باب وجوب الزكوة وقول الله عزوجل وأقيموا الصلاة وآتوالزكاة ۱/۱۸۷ برقم ۱۳۸۱ ومسلم في الإيمان،باب السؤال عن أركان الإسلام ۱/۳۰ برقم ۱۵.

ترجمہ : حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک دیہاتی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اورعرض کیا کہ یارسول اللہ مجھے کوئی ایسا عمل بتادیجئے کہ اس کے کرنے سے میں جنت میں داخل ہوجاؤں، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ اللہ کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، فرض نماز پڑھو، فرض زکوۃ اداء کرو، اور رمضان کے روزے رکھو۔ (یہ سن کر) اس دیہاتی نے کہا کہ قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں اس پر نہ کچھ زیادہ کروں گا اور نہ اس میں سے کچھ کم کروں گا، پس جب وہ دیہاتی واپس چلا گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کو اس بات سے خوشی ہو کہ وہ کسی جنتی آدمی کو دیکھے وہ اس شخص کو دیکھ لے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

اعمالِ ایمان اوران کی فضیلت:

اس حدیث میں اعمال ایمان کا بیان ہے اعمال ایمان سے ایمان میں پختگی آتی ہے اس لحاظ سے حدیث الباب کی کتاب الایمان سے مناسبت ہے۔

یہاں حدیث شریف میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک دیہاتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اورسوال کیا کہ مجھے ایسا عمل بتادیجئے کہ جس سے میں جنت میں داخل ہوجاؤں، اس نے بہت اخلاص کے ساتھ سوال کیا، حضور نے جواب دیا کہ اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اس کے علاوہ آپ نے اس کو نماز، زکوۃ اورروزہ کی بھی تلقین کی، اس نے جواب میں بلاکم وکاست تعمیل کا عہد کیا، جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جنت کی بشارت سنائی۔

اعرابی: یہ قبیلہ قیس کے ایک شخص ہیں، ان کا نام لقیط بن صبرہ ہے، ان کے اجداد میں ایک شخص کا نام منتفق ہے اس لئے لقیط بن صبرہ کو ابن المنتفق بھی کہا جاتا ہے۔(۱)

دخلت الجنۃ : دخول جنت سے مراد جنت کا دخول اولی ہے، اس لئے کہ جنت کا مطلق داخلہ تو ہر مومن کو حاصل ہوگا۔

---

(۱) عمدة القاري ٨ / ٢٤٢.

ایک تعارض کا حل:

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کا داخلہ اعمال کے سبب سے ہے؛ حالانکہ ایک حدیث میں ہے: ''مامن أحدٍ یَدْخُل الجنةَ الا بفضلِ اللهِ الخ''یعنی جنت میں جو بھی داخل ہوگا وہ محض فضل الٰہی سے داخل ہوگا، اعمال کی بناء پر نہیں، اس پر حضرات صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا آپ بھی اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہیں جائیں گے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں میں بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ مجھے اپنی مغفرت ورحمت میں چھپالیں،(۱) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دخول جنت فضل الٰہی سے ہوگا، اعمال کی بنیاد پر نہیں ہوگا؟ دونوں روایتوں کے مقتضا میں تعارض ہوا، اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) کسی چیز کی ایک ہوتی ہے علت تامہ اور ایک ہوتا ہے سبب، علت تامہ کے بعد معلول کا وجود یقینی ہوتا ہے اور سبب کے پائے جانے کے بعد مسبب کا پایا جانا ضروری نہیں، دخول جنت کے لئے علت تامہ تو اللہ کا فضل ہے اور اعمال سبب ہیں، حدیث الباب میں سبب کا بیان ہے اور دوسری حدیث میں علتِ تامہ کا، لہٰذا کوئی منافات نہیں۔

(۲) دخول جنت کے دو سبب ہیں: ایک قریب دوسرا بعید، سبب قریب ایمان واعمال ہیں اور سبب بعید فضل خداوندی ہے، بخاری شریف کی مذکورہ حدیث میں سبب بعید کا بیان ہے اور یہاں روایت میں سبب قریب کا، نصوص میں زیادہ تر سبب قریب کا ذکر آتا ہے۔

(۳) ایک ہے نفس دخول جنت اور ایک ہے جنت میں اعلی مراتب کا حصول، نفسِ دخولِ جنت اللہ کے فضل سے ہوگا اور اعلی مراتب کا حصول اعمال کی بنا پر ہوگا۔

(۴) اصل قاعدہ تو یہی ہے کہ دخول جنت فضل الٰہی کی وجہ سے ہوگا، لیکن عادت اللہ یہی ہے کہ فضل اسی پر کیا جاتا ہے جو اعمال بھی اختیار کرے، اس لحاظ سے اعمال بھی دخول جنت کا سبب ہوئے۔

تعبد: مضارع کا صیغہ ہے بمعنی امر أی اُعبدالله ، اہل عرب مبالغہ کے مقصد سے امر کی جگہ صیغہ مضارع لاتے ہیں، گویا مخاطب کو ایک بات کا حکم دیا گیا اور مخاطب نے اس پر عمل بھی کرلیا اور اب متکلم اس کی خبر دے رہا ہے۔

---

(۱) بخاری شریف ۲/۸٤۷ (٥٦٧٣)، ۲/۹٥۷ (٦٤٦٣)

بعض علماء نے کہا کہ یہاں عبادت سے مراد توحید ہے، حضرت ابن عباسؓ نے تو ضابطہ بیان کیا ہے کہ قرآن میں جہاں بھی لفظ عبادت آیا ہے اس سے توحید مراد ہوتی ہے، اسی وجہ سے اگلے جملہ میں اس کی ضد شرک کی نفی کی گئی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اعرابی کا سوال اعمال کے متعلق تھا لہٰذا عبادت سے اعمال ہی مراد ہیں، اس وقت شرک نہ کرنے سے مراد شرک خفی ہوگا، شرک جلی کہا جاتا ہے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا ذات یا صفات میں، اور شرک خفی سے مراد ریاء ہے یعنی اعمال کو ریاکاری سے پاک رکھا جائے، اگر اعمال مراد ہیں تو مابعد کے جملے تخصیص بعد التعمیم کے قبیل سے ہونگے۔

المکتوبة: بمعنی لکھی ہوئی چیز، لکھا جاتا ہے ضروی چیز کو اور فرض بھی ضروری ہے لہٰذا ''الصلوۃ المکتوبة'' سے مراد فرض نماز ہے۔

المفروضة: اس سے صدقات نافلہ کو نکال دیا گیا اور صوم میں فرض کی قید نہیں لگائی، اس لئے کہ رمضان کے روزے فرض ہی ہوتے ہیں، یہاں تفنن کے لئے تین اعمال کے ساتھ تین الگ الگ قیدیں لائی گئی ہیں جبکہ مراد تینوں کی ایک ہے۔

ایک سوال وجواب:

لاأزید علی هذا شیئا الخ: یہاں یہ سوال ہے کہ ''**لاانقص منه**'' کہنا تو صحیح ہے، لیکن ''**لاأزید علی هذا**'' کہنے سے تو اعمال نافلہ کی نفی ہو جاتی ہے، حالانکہ شریعت میں اعمال نافلہ بھی مطلوب ہیں، بلکہ رفع درجات کے لئے اعمال نافلہ ضروری ہیں؟ اس سوال کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) اہل عرب اس جیسا جملہ'' زیادۃ اہتمام فی العمل'' کے لئے بولتے ہیں، اس کے حقیقی معنی (زیادتی) مراد نہیں ہوتے، گویا اس نے کہا کہ میں ان اعمال کی خوب پابندی کرونگا، یہی جواب راجح ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ اس اعرابی کا مقصود ''**لاازید علی هذا**'' سے یہ تھا کہ میں اپنی طرف سے ان اعمال پر اضافہ نہیں کروں گا کہ یہ تو بدعت ہے، ہاں اگر آپ مزید اعمال بتائیں تو میں ان پر بھی عمل کروں گا۔

(۳) یہ شخص اپنے قبیلہ کا نمائندہ تھا، تو اس کا مقصد یہ تھا کہ میں اپنی قوم کے سامنے اتنا ہی بیان

کروں گا جتنا آپ نے بتایا ہے، اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہوں گا۔

(۴) مقصود یہ تھا کہ فرائض میں کمی بیشی نہیں کروں گا، چنانچہ بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "**والله لاازید و لاانقص مما فرض الله تعالی علی شیئا**"(۱)

قال النبی صلی الله علیه وسلم من سره الخ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ اس کا جنتی ہونا معلوم ہوگیا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جنتی ہونے کی بشارت دی، یا اس کے جذبۂ اخلاص کی بناپر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے بارے میں جنتی ہونے کا ظن غالب ہوگیا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت سنائی، ایسے بہت سے صحابہ کرامؓ ہیں جن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی ہونے کی بشارت سنائی ہے، جن میں عشرۂ مبشرہ مشہور ہیں۔

اس حدیث میں صرف تین اعمال بیان فرمائے گئے ہیں، حج وجہاد کا ذکر نہیں کیا گیا، اس لئے کہ جہاد ہر وقت نہیں ہوتا اور حج فرض ہوا ہے ۹ھ یا ۱۰ھ میں، اس وقت تک حج کی فرضیت نہیں ہوئی تھی۔

۱۵ / ۱۴ وعن سفیانَ عبدِالله الثقفِيّ قال: قلت : یارسولَ الله! قُل لی فی الإسلام قولاً لاأسأل عنه أحداً بعدَکَ وفی روایة غَیْرَکَ قال: قُل "آمنتُ بالله" ثُمَّ اسْتَقِمْ. (رواہ مسلم (۲))

ترجمه: - حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے اسلام کی کوئی ایسی (جامع) بات بتادیجئے کہ آپ کے بعد مجھے کسی دوسرے سے معلوم کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ (زبان اوردل سے) اس بات کا اقرار کرو کہ میں اللہ پر ایمان لایا ہوں، اور پھر اس پر قائم رہو۔ (مسلم)

تشریحِ حدیث

احوال سفیان ثقفی:

ثقفی: ثقیف کی طرف نسبت ہے جو طائف میں ایک قبیلہ تھا، والد کا نام عبداللہ اور دادا کا نام ربیعۃ ہے،

(۱) رواہ البخاري في صحیحه، في کتاب الصوم، باب وجوب صوم رمضان ۱ / ۲۵۴ (۱۸۵۳)

(۲) أخرجه مسلم فی الإیمان باب جامع أوصاف الإسلام ۱ / ۴۸.

یہ متأخرالاسلام صحابی ہیں، بعض نے ان کے صحابی ہونے کاانکار کیا ہے لیکن راجح یہ ہے کہ یہ صحابی ہیں، ان کے واسطہ سے پانچ روایات منقول ہیں، حضرت عمرؓ نے ان کو طائف کا گورنر مقرر فرمایا تھا۔[۱]

ایمان پر استقامت کا بیان:

اس حدیث میں بھی ایمان کا بیان ہے اوراس پر استقامت کا حکم دیا گیا ہے، راوی حدیث سفیان بن عبداللہ ثقفی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ مجھے اسلام کے بارے میں ایسی جامع اور مکمل بات بتائیں جس میں سارے دین کا خلاصہ آجائے اور پھراس کے متعلق آئندہ کسی سے سوال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے: قل لي في الإسلام أي فيما يكمل به الإسلام.

حدیث کی اہمیت وجامعیت:

یہ بہت اہم سوال ہے، شراح نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جوجواب دیاوہ سوال سے بھی زیادہ اہم ہے، ملاعلی قاری نے اس روایت کواصول اسلام پر مشتمل ہونے کی وجہ سے جوامع الکلم سے قراردیا ہے[۲] چنانچہ حدیث کے دوجملوں نے پورے دین کا احاطہ کرلیا ہے۔

آمنت بالله: اس سے صرف اللہ پرایمان لانے کا حکم دینا مقصود نہیں، بلکہ جمیع مؤمن بہ پرایمان لانے کا حکم دینا مقصود ہے اورایمان کے تقاضوں اورحکموں پرعمل کرنا بھی اس میں داخل ہے، اس لئے کہ جب بندہ صحیح معنی میں اللہ پرایمان لاتا ہے تو اللہ کو اپنا خالق ومالک اورخود کو اللہ کا غلام مانتا ہے اور غلام کا کام ہوتا ہے کہ اپنے مالک کے تمام اوامر کو بجالائے اور اس کے تمام نواہی سے بچے، اورحقوق اللہ وحقوق العباد سب ادا کرے۔

استقامت کے معنی اوراس کی اہمیت:

ثم استقم: اس جملہ میں ایمان اوراس کے مقتضیات پرثابت رہنے کا حکم دیا گیا، استقامت کے معنی ہیں کسی چیز کو درست کرنا، یہاں مراد ہے اعمال صالحہ پر مداومت وپابندی کرنا، استقامت بہت اہم چیز ہے، امام فخرالدین رازی نے فرمایا ہے: الإستقامةُ امرٌ صَعْبٌ یعنی استقامت بہت مشکل امر ہے، کیونکہ آدمی

(۱) الإصابه ۲/ ۳۵٦–۳۵۷، والمرقاة ۱/ ۱۵٤.

(۲) المرقاة ۱/ ۱۵٤.

بعض مرتبہ جوش وجذبہ میں بڑا عمل شروع کرتا ہے پھر جب جذبہ اور جوش کم ہوجاتا ہے تو عمل میں کمی کردیتا ہے اور بسااوقات چھوڑ بیٹھتا ہے، یہ کمال نہیں ہے، بلکہ عمل پر استقامت کمال کی چیز ہے، اسی وجہ سے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے: ''خَیْرُالعملِ مادِیْم علیه وإن قَلَّ'' کہ سب سے بہتر عمل وہ ہے جس پر مداومت ہو، گو عمل کم ہو۔

حضرات صوفیا فرماتے ہیں کہ ''الإستقامةُ خیر من ألفِ کرامةٍ'' یعنی استقامت ہزار کرامتوں سے افضل ہے، اور امام غزالی نے فرمایا کہ: شریعت پر استقامت دُنیا میں پل صراط پر چلنے سے زیادہ مشکل ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ضعف لاحق ہوگیا تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ ''شَیَّبْتَ'' یعنی آپ بوڑھے ہوگئے؟ تو آپ نے فرمایا: ''شَیَّبَتْنِی هُوْدُ وأمثالُها'' کہ مجھے سورۂ ھود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کردیا، اور سورۂ ھود میں استقامت کا حکم دیا گیا ہے: ''فاستقم کماامرت''۔

١٦/١٥ وعن طلحةَ بنِ عبیدِاللّٰهِ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إلی رسولِ الله صلی الله علیه وسلم مِنْ أهل نَجْدٍ، ثائرَالرأسِ، نَسْمَعُ دوِيَّ صوتِه ولانَفْقَهُ مایقول، حتی دَنا من رسولِ الله صلی الله علیه وسلم، فإذا هویَسْأل عن الإسلامِ، فقال رسولُ الله صلی الله علیه وسلم'' خمسُ صَلَوٰتٍ فی الیومِ واللیلةِ'' فقالَ: هَل عليَّ غَیْرُهُنَّ؟ فقال: لا، إلاَّ أنْ تَطَوَّعَ، قال رسولُ الله صلی الله علیه وسلم: ''وَصِیَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ'' فقال هلْ عَلَيَّ غَیْرُهُ؟ قال: لاإلاَّ أنْ تَطَوَّعَ قَالَ: وَذَکَرَلَهُ رسولُ الله صلی الله علیه وسلم الزکاةَ، فقال هلْ عَلَيَّ غیرُها؟ فقال: لا، إلاَّ أنْ تَطَوَّعَ قَالَ فَأَدْبَرَالرَّجلُ وهو یقول: والله لاأَزِیْدُ عَلٰی هذا، ولاأَنْقُصُ منه، فقال رسو ل الله صلی الله علیه وسلم: ''أفْلَحَ الرَّجُل إنْ صَدَقَ'' (متفق علیہ(١))

ترجمه :- حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ سے مروی ہے کہ نجد والوں میں سے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، جو پراگندہ بال تھا، ہم اس کی آواز کی بھنبھناہٹ تو سن رہے تھے، لیکن (دور ہونے کی وجہ سے) یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے یہاں تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ گیا تو اچانک (ہم نے سنا) کہ اسلام کے (فرائض کے)

(١) أخرجه البخاری فی اربعة مواضع، ''الإیمان'' ١/١١ برقم ٤٦، و''الصوم'' ١/٢٥٤ برقم ١٨٣٥، و''الشهادات'' ١/٣٦٨ برقم ٢٦٠١، و''الخیل'' ٢/١٠٢٨ برقم ٦٦٨٨، ومسلم فی الإیمان ١/٣٠.

بارے میں سوال کر رہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: رات دن میں پانچ نمازیں فرض ہیں، اس شخص نے عرض کیا، ان پانچ نمازوں کے علاوہ کچھ اور نمازیں بھی مجھ پر فرض ہیں؟ آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے ارشاد فرمایا نہیں، الا یہ کہ تم نفل نماز پڑھو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور ماہ رمضان کے روزے (فرض ہیں) اس شخص نے عرض کیا ان روزوں کے علاوہ کیا کچھ اور روزے بھی میرے اوپر لازم ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں مگر یہ کہ نفل روزے رکھنا چاہو، راوی کا بیان ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد اس کے سامنے زکوۃ کا ذکر فرمایا، اس نے عرض کیا کہ: کیا اس کے علاوہ بھی مجھ پر کوئی صدقہ لازم ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں الا یہ کہ نفلی صدقہ کرنا چاہو، راوی کہتے ہیں کہ: اس کے بعد وہ شخص واپس چلا گیا، دراں حالیکہ وہ کہہ رہا تھا کہ: خدا کی قسم! میں اس پر نہ تو کچھ زیادہ کروں گا اور نہ اس میں کچھ کمی کروں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: وہ شخص کامیاب ہوگیا اگر اس نے سچ کہا۔ (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

احوال طلحہ بن عبیداللہ اوران کے قبولِ اسلام کا واقعہ:

یہ جلیل القدر صحابی ہیں، عشرۂ مبشرہ اوراولین اسلام قبول کرنے والوں میں سے ہیں، قریشی ہیں، حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، جس کا واقعہ یہ پیش آیا کہ:

یہ بُصریٰ کے بازار میں گئے ہوئے تھے وہاں کسی راہب نے آواز لگائی کہ کیا تم لوگوں میں کوئی اہل حرم میں سے بھی ہے؟ انہوں نے کہا میں ہوں، اس پر اس نے پوچھا کہ کیا تم میں کوئی احمد نامی شخص ظاہر ہوا ہے؟ انھوں نے کہا کون احمد؟ اس نے کہا: احمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب، اور یہ ان کے ظہور کا مہینہ ہے، اور وہ آخری نبی ہوں گے جو حرم میں ظاہر ہوں گے اور مدینہ ہجرت کریں گے، تم ان پر ایمان لانے میں سبقت کرنا، طلحہ فرماتے ہیں کہ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی، میں فوراً مکہ آیا اور لوگوں سے پوچھا کہ کوئی واقعہ تو پیش نہیں آیا؟ لوگوں نے کہا کہ: محمد نے نبوت کا دعوی کیا ہے اور ابن ابی قحافہ (ابوبکر) نے ان

کی اتباع کرلی، فرماتے ہیں کہ میں ابوبکر کے پاس پہنچا اور وہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے اور میں نے فوراً اسلام قبول کرلیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو راہب کا یہ پورا واقعہ سنایا۔

یہ غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوسکے، اس کا افسوس رہا، اس لئے غزوۂ احد میں بڑی دلیری کے ساتھ لڑے، بدر کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی ان کو ایک مہم پر روانہ فرمایا تھا، جس کی بناء پر ان کو بھی بدر کے مال غنیمت سے حصہ دیا گیا، غزوۂ احد میں کفار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نرغہ میں لے لیا تھا اور چاروں طرف سے تیر آرہے تھے تو حضرت طلحہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ڈھال بن گئے تھے حتی کہ ان کا ہاتھ شل ہوگیا اور بدن پر ۷۵ زخم تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طلحہ نے یہ جاں نثاری کا مظاہرہ کرکے اپنے لئے جنت واجب کرلی۔ ۳۶ھ میں جنگ جمل میں شہید ہوئے اور بصرہ میں مدفون ہوئے، آپ کی عمر ۶۴ سال ہوئی۔(۱)

ایک صحابی کا اعمالِ ایمان کے بارے میں سوال:

اس حدیث پاک میں بھی اعمال ایمان کا بیان ہے اور اس میں ابوہریرہؓ کی حدیث کی طرح ایک واقعہ مذکور ہے کہ اہل نجد میں سے ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور مختلف سوالات کئے اور ان پر پابندی و استقامت کا وعدہ کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی سرخروئی کی بشارت سنائی۔

ان آنے والے شخص کا نام ضمام بن ثعلبہ تھا(۲) یہ قبیلہ ''بنوبکر بن سعد'' کی طرف سے آئے تھے، جو عرب کا بہت بڑا قبیلہ تھا، عرب کے دو علاقہ ہیں ایک بلندی کا ہے اور دوسرا کچھ نشیب و پستی کا ہے، جیسے مغربی یوپی اور مشرقی یوپی، عرب کے بلند علاقہ کو ''نجد'' اور پستی کے علاقہ کو ''تہامہ'' اور دونوں کے درمیان کا علاقہ ''حجاز'' کہلاتا ہے، حجاز بمعنی حائل، درمیان کی آڑ۔

ثائر الراس : اس کے بال پراگندہ تھے جیسا کہ مسافروں کے ہوا کرتے ہیں، اس میں مضاف الیہ محذوف ہے ''**ثائر شعر الرأس**'' اکہ حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے یا صفت ہونے کی بنا پر مرفوع ہے، اور روایت مشہور ہے۔(۳)

---

(۱) الاصابة ۳/ ۸٤–۸٦.

(۲) فتح الإله ۱/ ۲۸٥.

(۳) لمعات ۱/ ۲۳۸.

نسمع دوی صوتہ : یعنی ہم اس کی آواز کی بھنبھناہٹ تو سن رہے تھے لیکن بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی، دوی: بمعنی شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ۔

حتی دنا الخ : راوی کہتے ہیں کہ وہ شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کے بارے میں سوال کر رہا ہے، پہلے دوری کی وجہ سے سوائے آواز کے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، بعض نے کہا کہ یہ شخص قبیلہ کا قاصد بن کر کچھ سوالات لے کر آیا تھا تو وہ ان سوالات کا جلدی جلدی تکرار کر رہا تھا اس وجہ سے بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

فاذا ھو یسأل عن الإسلام : بہر حال اس نے اسلام کے بارے میں سوال کیا، بظاہر ماہیتِ اسلام کے بارے میں سوال تھا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعمالِ اسلام بتائے اس لئے کہ آپ کو معلوم تھا کہ یہ مسلمان ہے، یا پھر اس کا مقصد اعمال کے بارے میں ہی سوال کرنا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں، نماز کے بارے میں سب سے پہلے اس لئے بتایا کہ کہ وہ اول فریضۂ اسلام ہے، اس نے پوچھا اس کے علاوہ کچھ اور؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا، **الا ان تطوع**، یعنی نہیں الا یہ کہ تم نفل نماز پڑھنا چاہو تو جتنا چاہے پڑھو۔

وتر کا حکم:

حضرات صاحبین اور ائمہ ثلاثہ نے اس جملہ سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ وتر کی نماز واجب نہیں ہے، بلکہ سنت ہے، کیونکہ فرض نمازوں کے علاوہ کو تطوع فرمایا ہے، امام صاحبؒ کے یہاں وتر واجب ہے، ان کی طرف سے اس روایت کے دو جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب وتر کی نماز کا وجوب نہیں ہوا تھا، وتر میں بطور وجوب تاکید بعد میں آئی ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ تر عشاء کی نماز کے تابع ہے، مستقل نماز نہیں ہے، اسی وجہ سے عشاء کے فرض کے بغیر وتر کی ادائیگی درست نہیں، اس لحاظ سے "**خمس صلوت**" میں عشاء کو بیان فرمایا تو اس کے ضمن میں وتر بھی آگیا۔

إلاأن تطوع : یہ جمہور کے یہاں استثناء منقطع ہے، کیوں کہ مستثنیٰ منہ میں فرض کا بیان ہے اور مستثنیٰ میں نفل کا اور فرض و نفل دونوں کی جنس الگ ہے۔

بعض احناف نے اس کو مستثنیٰ متصل کہا ہے اوراس کے معنی بیان کئے ہیں: **الا أن تشـــرع فـــي التـــطـــوع** یعنی پانچ نمازوں کے علاوہ اگر کسی نفل کو شروع کردے تو شروع کرنے سے یہ نماز بھی واجب ہوجائے گی اوراس کی تکمیل لازم ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''**لاتبطلوا اعمالكم**''، یہ احناف کا مذہب ہے، امام شافعی کے یہاں نفل نماز شروع کرنے سے واجب نہیں ہوتی، اس تفسیر کے لحاظ سے عند الاحناف یہ استثناء متصل ہے کہ اول میں بھی ضروری نمازوں کا بیان ہے اور بعد میں بھی۔ (۱)

وصيام شهر رمضان: پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ رمضان کے روزے بیان کئے، اس نے سوال کیا کہ اس کے علاوہ کچھ اورروزے بھی لازم ہیں؟ فرمایا: نہیں الا یہ کہ نفل روزہ رکھو۔

وذكر له الخ: راوی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوۃ کا بھی ذکرفرمایا، یہاں تعبیر بدل دی کیونکہ راوی کو بعینہ الفاظ یادنہیں رہے، اس لئے **ذكر له** کہہ کرمضمون بیان کیا، اورحج کا حکم نہیں دیا کیونکہ حج اس وقت تک فرض نہیں ہوا تھا۔ (۲)

قال فأدبر الرجل الخ: راوی کا بیان ہے کہ جب وہ شخص جانے لگا تو اس نے کہا کہ: واللہ! میں اس پرنہ اضافہ کروں گااورنہ ہی ان اعمال میں کمی کروں گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ شخص کامیاب ہوگیا اگراس نے سچ کہا، ''**لاأزيد على هذا** ''میں وہی سوال اور جوابات ہوں گے جو اس سے قبل حضرت ابوہریرۃؓ کی حدیث میں آئے۔

ایک اشکال اوراس کا حل:

افلح الرجل ان صدق: سابق واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کوحتمی طور پر جنت کی بشارت دی تھی اور یہاں فلاح کو معلق کیا ہے صدق پر، یہ فرق کیوں ہے؟ جواب یہ ہے کہ علماء کا اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ دونوں واقعے الگ ہیں یا ایک ہی واقعہ ہے، اگرواقعے الگ ہیں تو کوئی اشکال نہیں، کیونکہ پہلے شخص کوحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حتمی طور پر جنت کی بشارت دی بذریعہ وحی معلوم ہوجانے کی وجہ سے، اور یہاں حتمی طور پر معلوم نہیں ہوسکا تھا اس لئے حتمی بات ارشاد نہیں فرمائی۔

اوربعض نے یہ فرق بتایا کہ حدیث ابوہریرۃؓ میں آنے والے شخص کو جنت کی بشارت دی گئی اور یہاں

(۱)شرح الطيبى ۱/ ۱۳۷،فتح الإله ۱/ ۲۸۷،المرقاة ۱/ ۱۵۸، لمعات التنقيح ۱/ ۲۳۹.

(۲)شرح الطيبى ۱/ ۱۳۸.

فلاح کو ثابت فرمایا گیا اور فلاح؛ دخول جنت سے اعلیٰ درجہ کی چیز ہے، کیونکہ ''فلاح'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی ناراضگی سے محفوظ رہتے ہوئے جنت میں داخلہ ملے اور دخولِ جنت کی بشارت کے ساتھ ناراضگی بھی جمع ہوسکتی ہے، بایں معنی کہ اولاً عتاب وعذاب ہو پھر جنت کا داخلہ حاصل ہو، پس حصول فلاح کے لئے جو اعلیٰ درجہ ہے اس قسم کی تقیید درست ہے۔(۱)

بعض نے کہا کہ یہ دونوں واقعے ایک ہیں صرف راوی کے الفاظ کا فرق ہے، اس پر اشکال ہوگا کہ پھر شخص واحد پر دو مختلف حکم کیوں کر لگائے گئے؟ جواب یہ ہے کہ وہ شخص جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رہا اس وقت تک آپ نے فلاح کو صداقت کی قید کے ساتھ مقید فرمایا تاکہ اس کے اندر تکبر وعجب پیدا نہ ہو، جب وہ چلا گیا اور عجب کا اندیشہ نہ رہا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دخول جنت کی حتمی بشارت دی۔

خلاصہ یہ نکلا کہ اولاً اس شخص کی کامیابی کے بارے میں غیر حتمی بات ارشاد فرمائی گئی اور پھر حتمی طور پر کامیابی کی بشارت دیدی گئی، پس ایک راوی نے غیر حتمی بات کو نقل کیا اور دوسرے راوی نے حتمی بات کو روایت کیا۔ (۲)

۱۷/۱۶ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: إِنَّ وَفْدَ عَبْدِالقَيْسِ لَمَّا اَتَوا النبيَ صلى الله عليه وسلم؛ قال رسولُ اللّٰه صلى الله عليه وسلم: "مَنِ القومُ؟ أومَنِ الوفدُ؟" قالوا: ربيعةُ. قال: مرحباً بالقومِ او :بالوفد، غَيْرَخَزَايا ولانَدَامَى قالوا: يارسولَ الله! إنَّا لانَسْتَطِيْعُ أَنْ نَأتِيَکَ إلَّا في الشهرِالْحَرَام، وبَيْنَنا وبينکَ هَذَا الْحَيُّ مِنْ كُفَّارِ مُضَرَ؛ فَمُرْنَا بأمرٍ فصلٍ، نُخْبِرُ به مَنْ وَارَئِنَا، وَنَدْخُلُ بِهِ الجنةَ،وسَألُوْهُ عَنِ الأَشْرِبَة، فَأَمَرَهُمْ بِأَرْبَعٍ، ونَهاهم عن أربعٍ: أَمَرَهُمْ بالإيمانِ باللهِ وَحْدَهُ،قَالَ: أَتَدْرُوْنَ مَاالإِيْمَانُ بِاللّٰهِ وَحْدَهُ؟ قالوا: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَم، قَالَ: شهادةُ أَنْ لاإِلٰهَ إلَّا اللّٰهُ وأَنَّ محمداً رسولُ اللهِ، وإقامُ الصلوةِ، وإيتاءُ الزكاةِ، وصيامُ رمضانَ، وأن تُعْطُوْا مِنَ المَغْنَمِ الخُمُسَ، ونَهَاهُمْ عَنْ أربعٍ: عن الحَنْتَمِ، والدُّبَّاءِ والنقيرِ، والمزفَّتِ وقال: "اِحْفَظُوْ هُنَّ وَأَخْبِرُوْا

(۱)فتح الإله ۱/۲۸۹، والمرقاة ۱/۱۵۹.

(۲)فتح الإله ۱/۲۸۹، والمرقاة ۱/۱۵۹.

بهن مَنْ وَرَاءَ كم " (متفق علیہ[1]) ولفظه للبخاري.

ترجمہ : حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ وفد عبدالقیس جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کون لوگ ہیں ؟یافرمایا کس قبیلہ کا وفد ہے؟ ان لوگوں نے عرض کیا کہ قبیلہ ربیعہ کے افراد ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خوش آمدید دراں حالیکہ تمہارے لئے نہ رسوائی ہے اور نہ شرمندگی اہل وفد نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ! چونکہ ہمارے اورآپ کے درمیان کفارِ مضر کا قبیلہ پڑتا ہے اس لئے ہم آپ کی خدمت میں صرف اُس مہینہ میں آسکتے ہیں جس میں لڑنا حرام ہے، لہٰذا آپ ہمیں ایسی واضح بات بتادیجئے جس پر ہم خود بھی عمل کریں اور ان لوگوں کو بھی بتائیں جن کو ہم اپنے پیچھے چھوڑ کر آئے ہیں اوراس پرعمل کرنے سے ہم جنت میں داخل ہوجائیں، (اس کے بعد) انہوں نے شراب کے برتنوں کے متعلق بھی پوچھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا اور چار باتوں سے منع فرمایا (اول) اللہ جل شانہ کی وحدانیت پر ایمان لانے کا حکم دیا اور فرمایا کیاتم جانتے ہو کہ اللہ کی وحدانیت پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟ وفد والوں نے عرض کیا کہ اللہ اوراس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں، (پھر) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (۱) (اللہ کی وحدانیت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ) اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں ،(۲) پابندی سے نماز پڑھنا (۳) زکوۃ دینا، (۴) ماہ رمضان کے روزے رکھنا اور یہ کہ تم اداکرومال غنیمت میں سے خمس، اورچار برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا (۱) ہرے رنگ کا گھڑا، (۲) تونبی (۳) لکڑی کھود کر بنایاہوا برتن (۴) تارکول پھرا ہوا برتن، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان باتوں کو اچھی طرح یادکرلو اور جولوگ تمہارے پیچھے ہیں (وطن میں) ان کو یہ باتیں بتاؤ۔ (بخاری ومسلم) اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔

(۱) أخرجه البخاری فی عشرة مواضع: الإيمان ۱/۱۳ برقم ۵۳، و"العلم" ۱/۱۹ برقم ۸۸، و"مواقيت الصلوة" ۱/۷۵ برقم ۵۱۷ و"الزكاة" ۱/۱۸۸ برقم ۱۳۸۲، و"فرض الخمس" ۱/۴۳۶ برقم ۲۹۹۶، و"المناقب" ۱/۴۹۸ برقم ۳۳۸۷، و"المغازی" ۲/۶۲۶ برقم ۴۱۹۴ و۴۱۹۵ و"الأدب" ۲/۹۱۲ برقم ۵۹۳۵، و"كتاب أخبار الأحاد" ۲/۱۰۷۹ برقم ۶۹۷۵ و"التوحيد" ۲/۱۱۲۸ برقم ۷۲۵۵. ومسلم فی موضعين "الإيمان" ۱/۳۳ برقم: ۲۳، ۲۴، ۲۵ و"الأشربه" ۲/۱۶۵.

تشریحِ حدیث

احوال ابن عباسؓ:

انکانام عبداللہ ہے، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں[1] صغارصحابہ میں سے ہیں، ہجرت سے تین سال پہلے پیداہوئے اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت۱۰یا۱۳یا۱۵سال کی عمرتھی لیکن فہیم بہت تھے،حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دعا دی تھی: **اللهم فقِّهْهُ فی الدین وعَلِّمه التاویلَ**، اس لئے یہ امت کے مفسرقرآن بنے اورترجمان القرآن کے نام سے مشہور ہوئے،ان کو''**حبر العرب**'' اور''**حبر الأمة**'' بھی کہاجاتاہے،''**بسطة فی العلم والجسم**'' کے مصداق تھے،علم جتنا وسیع تھاجسم بھی اسی طرح وسیع تھا،لکھاہے کہ جب بیٹھتے تھےتو دوآدمیوں کی جگہ لے کر بیٹھتے تھے۔

انھوں نے جبرئیل علیہ السلام کوبھی دومرتبہ دیکھاہے، ان کی مرویات بہت ہیں،[2] ان میں بعض ایسی ہیں جوانہوں نے خودسنی ہیں اوربہت سی روایات دیگرصحابہؓ سے سنی ہیں جن کاعموماً وہ نام نہیں لیتے تھے،صحابہؓ سب عادل ہیں اس لئے نام لینا ضروری بھی نہیں،۶۸ھ میں عبداللہ ابن زبیرؓ کے زمانہ میں طائف میں آپ کا انتقال ہوا۔[3]

قبیلہ عبدالقیس اورخدمت نبوی میں اس کی آمد:

ان وفد عبدالقیس الخ :زمانۂ جاہلیت میں عرب میں دوبھائی تھےایک ربیعہ اورایک مضر، یہ دونوں نزاربن معد بن عدنان کےلڑکے تھے، پھران دونوں کی اولاد بہت ہوئی اورہرایک کا باقاعدہ ایک قبیلہ بن گیا،ان دونوں کی طرف وہ قبیلے منسوب ہوئے، پھرقبیلہ ربیعہ میں ایک شخص ہوا:عبدالقیس، اِس قبیلہ کو

---

(۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خالوبھی ہوتے ہیں کیونکہ ان کی والدہ لبابہ بنت الحارث ام المؤمنین حضرت میمونہؓ کی بہن ہیں،مرقاۃ۱/۱۵۹۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی کل مرویات۱۶۶۰ہیں متفق علیه ۷۵ماانفرد به البخاری ۱۲۰،اورماانفرد به مسلم۹ہیں (تلقیح فهوم اهل الأثر فی عیون التاریخ والسیر ص۲۶۳، ط–دارارقم،بیروت)

(۳)الاصابة ۳/۲۲۹–۲۳۶، اصابہ میں لکھاہے ''توفي عبدالله بن عباس بالطائف، فجاء طائر أبيض فدخل بين النعش والسرير، فلما وضع فی قبره سمعنا تاليا يتلو''یاایتهاالنفس المطمئنة الآیة وهكذا فی السير ۳/۳۵۸، ت شعيب الارنؤوط، ط مؤسسة الرسالة''

اس کی طرف بھی منسوب کیا جاتا ہے، گویا کہ ربیعہ قبیلہ کا جد اعلی وابعد اور عبدالقیس جد اقرب ہے، یہ لوگ بحرین (قطیف اور ہجر) میں آباد تھے ان دونوں قبیلوں یعنی ربیعہ ومضر کی باہم دشمنی تھی، زمانہ جاہلیت میں اکثر قبائل عرب کا یہی حال تھا۔ (۱)

''وفد'' کہا جاتا ہے اس جماعت کو جو کسی قبیلہ یا بادشاہ کی طرف سے کسی حاکم یا بادشاہ کے پاس کسی مشترک غرض سے جاویں، یہ وافد کی جمع ہے بمعنی آنے والے، وفد عبدالقیس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، یہ آنے والے ایک روایت کے مطابق ۱۴ تھے اور ایک روایت میں چالیس کی تعداد آئی ہے لیکن تطبیق یہ ہوگی کہ مجموعی تعداد ۴۰ تھی اور ان میں سے اشراف چودہ تھے۔ (۲)

یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو مرتبہ آئے ہیں، پہلے ۵ھ یا ۶ھ میں اور دوسری مرتبہ ۹ھ میں، ۹ھ میں عرب کے اکثر قبائل اسلام لا چکے تھے کہ وہ اہل مکہ کے قبول اسلام کا انتظار کررہے تھے، ۸ھ میں مکہ فتح ہوگیا اہل مکہ مسلمان ہوگئے اسکے بعد عرب کے اکثر قبیلے اسلام میں داخل ہوگئے، پھر ان کے اندر جذبہ پیدا ہوا کہ احکامِ اسلام معلوم کرنے کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائیں، چنانچہ ۹ھ میں مختلف وفود آپ کے پاس آئے، اسی وجہ سے ۹ھ کو ''عام الوفود'' کہا جاتا ہے اس حدیث میں راجح یہ ہے کہ وفد عبدالقیس کی پہلی آمد مراد ہے۔ (۳)

حدیث کا شان ورود اور وفد کے آنے کا مقصد:

مدینہ منورہ میں کسی جگہ ایک واقعہ پیش آیا کہ قبیلہ ربیعہ کے ایک شخص تھے منقذ بن حبان، یہ بحرین سے مدینہ تجارت کے لئے آتے تھے، ایک روز بیٹھے ہوئے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں سے گزر ہوا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے تعظیماً، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی یہ ادا پسند آئی، آپ نے پوچھا کہ تم منقذ بن حبان ہو؟ انھوں نے عرض کیا جی ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم ربیعہ قبیلہ کے ہو؟ انھوں نے کہا: ہاں، پھر آپ نے فرمایا کہ: تمہارا سردار منذر الاشج ہے؟ انھوں نے عرض کیا: جی ہاں، منقذ نے معلوم کیا کہ: آپ کو یہ تمام باتیں کیسے معلوم ہوئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

(۱) المرقاة ۱/۱۶۰۔

(۲) فتح الباری ۱/۱۶۴ ط مکتبہ شیخ الهند دیوبند.

(۳) فتح الباری ۱/۱۶۴.

فرمایا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دعوتِ اسلام دی، انہوں نے اسلام قبول کرلیا، پھرآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نماز سکھائی اوران کے قبیلہ کے نام ایک دعوتی خط بھی دیا، یہ واپس گئے اوراپنے گھر میں چپکے سے نماز پڑھنے لگے، ان کی بیوی جو مُنذر سردار کی بیٹی تھی اس نے اپنے والد سے اس کا تذکرہ کیا، انہوں نے منذر کو بلایا اورصورتِ حال دریافت کی، انھوں نے ساراواقعہ بیان کیا اورحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خط بھی پیش کیا جس سے منذر مسلمان ہوگئے، پھرمنذر چونکہ سردار تھے،انہوں نے قبیلہ کےلوگوں کو خط سنایا، چنانچہ ان کا پوراقبیلہ مسلمان ہوگیا۔

ان کو اسلام کے تفصیلی احکام معلوم نہ تھے، لہٰذا احکام اسلامیہ معلوم کرنے کی غرض سے قبیلہ کی طرف سے ایک وفد تیار ہوا اور یہ وفد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جس میں خود منذر بھی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ مشرق کے اچھے لوگ تمہارے پاس آرہے ہیں ''لمعات'' میں ہے کہ مدینہ منورہ پہنچتے ہی یہ لوگ اپنی سواریوں سے زیارت نبوی کے شوق میں نیچے کود پڑے اور بہت رواں دواں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جذبات کا مشاہدہ فرماتے رہے، اس وفد کے جوسردار تھے یعنی اشج انہوں نے پہلے غسل کیا صاف ستھرے کپڑے پہنے پھرمسجد میں دورکعت ادا کیں، پھرآپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہایت خشوع وخضوع اورسکون وقار کے ساتھ حاضر ہوئے، اس پرآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف فرمائی کہ تم میں دو صفتیں ایسی ہیں جو اللہ کو پسند ہیں،ایک حلم ووقار اورایک اناءۃ یعنی کام میں جلدی نہ کرنا، ان کے چہرے پر کچھ گڑھے سے تھے جوزخم نما تھے، اس لئے ان کو''منذر اشج'' کہا جاتا تھا، اشج بمعنی زخمی چہرے والا، بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مانوس کرنے کے لئے باوجود معلوم ہونے کے پوچھا''**من القوم**'' یافرمایا**من الوفد**؟ یہ شک بعض نے ابن عباس کی طرف منسوب کیا اوربعض نے اس کو منسوب کیا ہے شعبہ راوی کی طرف۔ (۱)

مرحباً بالقوم اوبالوفد: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آمد پران کوان الفاظ سے مبارکباد دی، یہ ظرف ہے جوظرف زمان بھی ہوسکتا ہے اورظرف مکان بھی ای **أتی القوم مکاناً واسعاً أو زماناً واسعاً** یعنی تم کوٹھہرانے کے لئے جگہ بھی کافی ہے اورملاقات کے لئے وقت بھی خوب ہے،تمہارے آنے سے

(۱)مرقاۃ ۱/ ۱٦٠ مطبوعہ اشرفیہ دیوبند.فتح الباري ۱ / ۱٦٤ مكتبه شيخ الهند ديوبند، رقم ۵۳.

کوئی تنگی نہیں ہے۔ (۱)

غیـر خزایاو لا ندامی : ''خزایا'' جمع ہے، خزیان کی بمعنی رسوائی، اورندامی جمع ہے ندمان کی بمعنی شرمندہ، دونوں حال واقع ہیں اورمعنی یہ ہیں کہ عرب کے اکثر قبائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اورصحابہؓ سے دشمنی رکھتے تھے، بہت سے صحابہؓ کو یہ قبائلی لوگ سفرمیں شہید کردیتے تھے، پھر بعد میں جب یہ لوگ مسلمان ہوتے تو ان کو پہلے فعل پر ندامت ہوتی، مگرقبیلہ ربیعہ ازخود مسلمان ہوگیا،اس لئے یہ ندامت والی چیز ان کو پیش نہیں آئی، نیز ان سے جہاد نہیں کیا گیا، اس لئے ان کو قتل وقید کی صعوبتیں پیش نہیں آئیں، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے **غیر خزایاو لاندامی** فرمایا۔ (۲)

بعض علماء نے کہا کہ یہ جملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کے طور پر فرمایا ہے کہ تمہیں کوئی رسوائی وشرمندگی پیش نہ آئے۔

مالانستطیع ان ناتیک الخ : بہرحال جب وہ مانوس ہوگئے تو ان کا حوصلہ کھلا اورآنے کا مقصد بیان کیا، اس کے لئے پہلے تمہید قائم کی کہ ہم آپ کے پاس صرف ''شہرحرام'' میں آسکتے ہیں، کیونکہ درمیان میں قبیلہ مضر ہے جس سے ہماری لڑائی ہے، ربیعہ کے لوگ بحرین کی طرف رہتے تھے، وہاں سے مدینہ آنے کے لئے درمیان میں مضر کا قبیلہ تھا جو اُن کو قدیم عداوت کی بناء پر ستایا کرتے تھے، لیکن اہل عرب اشہرحرم کی تعظیم کرتے تھے اوراس میں قتل وقتال کو ناجائز سمجھتے تھے، اشہرحرم : ذی قعدہ، ذی الحجہ، اورمحرم اوررجب کے مہینے ہیں، اسلام نے ابتداء میں ان کی حرمت کو باقی رکھا پھر اس میں نسخ وارد ہوا (۳) یہاں حدیث میں ''**الشهـرالحرام**'' واحد ہے کیونکہ مضرصرف رجب کی تعظیم کرتے تھے جبکہ دیگر اہلِ عرب چاروں ماہ کی تعظیم کرتے تھے، اسی وجہ سے بہت سی روایات میں رجب کی نسبت مضر کی طرف کی جاتی ہے: رجبُ مُضَر، اس لئے انھوں نے کہا کہ: یارسول اللہ ہم صرف اسی ایک مہینہ میں حاضر ہوسکتے ہیں۔

(۱)شرح الطیبی ۱/۱۳۸، وفتح الإله ۱/۲۹۲۔

(۲)شرح الطیبی ۱/۱۳۸-۱۳۹، فتح الإله ۱/۲۹۲، والمرقاة ۱/۱٦۰.

(۳)فتح الاله ۱/۲۹٤.

وفد کی تعلیمِ دین کی درخواست:

فمرنابأمر فصل الخ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حکم دیں امر فصل کا،"**فصل**" مصدر ہے اسم فاعل یامفعول کے معنی میں ہے، پہلی صورت میں معنی ہونگے: **بـامـر فـاصـل بين الحق و الباطل** یعنی فیصلہ کن باتیں بیان فرمادیں، یامعنی ہونگے **بـأمر مفصول** یعنی واضح احکامات، جن میں پیچیدگی نہو، کہ ہم پڑھے لکھے نہیں ہیں، تاکہ ہم ان باتوں کو واپس جاکر قبیلہ والوں کو بتاسکیں اورایسی بنیادی باتیں ہوں جن پرعمل کرکے ہم جنت میں داخل ہوجائیں۔

نیز انہوں نے اپنے معاشرہ سے متعلق ایک سوال کیا کہ شراب کے جوبرتن مشہور تھے "حنتم، دباء وغیرہ" ان میں نبیذ بنانا جائز ہے یانہیں؟ "**سـألوه عن الأشربة**" سے ظروف اشربہ مراد ہیں، جس کا قرینہ یہ ہے کہ راوی حدیث حضرت ابن عباس سے نبیذ بنانے کے متعلق سوال کیا گیا تھا، اس کے جواب میں انہوں یہ حدیث سنائی تھی، جس سے معلوم ہوا کہ اس حدیث میں وفد عبدالقیس کے سوال کا مقصد ان ظروف میں نبیذ بنانے کے بارے میں معلوم کرنا تھا نہ کہ نفس شراب کے بارے میں، گویا عبارت یوں ہے: "**وسألوه عن حكم ظروف الأشربة**"(۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا، اورچارقسم کے برتنوں کو استعمال کرنے کی بالخصوص ان میں نبیذ بنانے کی ممانعت فرمائی۔

چار باتوں کا حکم:

امرهم بالايمان بالله وحده: اولاً اجمالی طور پر بتایا تاکہ یادرکھنے میں سہولت ہو، پھرتفصیل فرمائی، سب سے پہلے ایمان باللہ وحدہ کاحکم دیا، اوران سے معلوم بھی کیا کہ ایمان باللہ وحدہ جانتے ہوکیا ہے؟ ان لوگوں نے لاعلمی ظاہر کی توآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وحدانیت کی اوررسالت کی شہادت دینا، نماز قائم کرنا، زکوۃ دینا اورروزہ رکھنا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجمالی طور پر ان کو ارکانِ اسلام سے آگاہ کردیا، تفصیل بیان نہیں فرمائی، اس لئے کہ اعمال کی تفصیلی کیفیت خود حضوراورصحابہ کے عمل کودیکھ کرہی معلوم ہوسکتی تھی، اس کولفظوں میں سمجھانامشکل ہے، اس کے بعد مال غنیمت میں سے خمس اداکرنے کا بھی حکم دیا۔

(۱) المرقاة ۱/۱۶۱.

ایک سوال اور جواب:

سوال ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا بقول راوی لیکن تفصیل میں پانچ باتیں مذکور ہیں یعنی (۱) شہادتین، (۲) اقامت صلوۃ، (۳) ایتاء زکوۃ، (۴) صوم رمضان اور (۵) اداء خمس، تو اجمال اور تفصیل میں فرق ہے؟

اس کے کئی جواب ہیں: (۱) قاضی بیضاوی نے فرمایا ہے کہ یہ پانچوں باتیں ایمان باللہ کی شرح ہیں یعنی یہ سب مل کر ایک ہی بات ہوئی، باقی تین باتیں یا تو راوی بھول گیا یا اس نے اختصاراً چھوڑ دیا۔[1]

مگر یہ جواب سیاق حدیث کے لحاظ سے درست معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ راوی ''اربـــــع'' کی تصریح کر رہا ہے اس تصریح کے بعد پھر چاروں کا ذکر نہ کرنا یا بھول جانا مستبعد ہے۔

(۲) اصل مقصود تو اخیر کے چار احکام بتانا تھا ایمان باللہ کا حکم بطور تبرک وتمہید ہے کیونکہ وہ لوگ مسلمان تھے ان کو ایمان لانے کا حکم دینا ضروری نہ تھا۔[2]

(۳) ابن بطال رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چار باتوں کا حکم فرمایا تھا وہ شہادتین، اقامت صلوۃ، ایتاء زکوۃ اور صوم رمضان ہیں پھر ان کے حال کے مناسب بطور زیادتِ افادہ ایک مزید بات خمس والی بتائی گئی، جیسے ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ ہم جنگل میں اونٹ چرانے جاتے ہیں اور چھاگل میں پینے کے لئے پانی لیجاتے ہیں، پس اگر آہستہ سے خروج ریح ہوجائے تو کیا وضو کئے بغیر نماز پڑھ سکتے ہیں؟ کیونکہ پانی تھوڑا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إذا فَسَا أحدُكم فليتوَضَّأْ ولا تأتوا النساءَ في أدبارِهن:[3] جب تم میں سے کوئی گوز مارے تو چاہئے کہ وضو کرے اور تم عورتوں سے پچھلی راہ میں صحبت مت کرو، یہ آخری بات ان صاحب نے نہیں پوچھی تھی، یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بتائی، کیونکہ الشيئ يذكر بالشيئ بات سے بات نکلتی ہے، اسی طرح یہاں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار باتوں کا وعدہ فرمایا تھا، اولاً وہ چار باتیں بتائیں پھر خیال آیا کہ ان کی مضر قبیلہ کے ساتھ جنگیں ہوتی رہتی ہیں یہ لوگ اب مسلمان ہوگئے اب آئندہ ان کی جنگ اسلام وکفر کے

(۱) تحفة الأبرار ۱/۵۱.

(۲) شرح الطيبى ۱/۱٤۱، والمرقاة ۱/۱٦۳.

(۳) رواه الترمذى وابوداؤد، بحواله مشكوة ص ٤٠.

لحاظ سے ہوگی اس میں جو مال حاصل ہوگا اس کی حیثیت مالِ غنیمت کی ہوگی اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مزید یہ بھی بتایا کہ تمہیں جو مال غنیمت حاصل ہواسکا پانچواں حصہ مرکزی حکومت کو بھیجو۔ (۱)

ابن بطال کی ہی رائے راجح ہے، کیونکہ ان کو ایمان باللہ کا باقاعدہ حکم دیا ہے، پھر وہ تمہید کیسے ہوسکتی ہے؟ رہا یہ امر کہ جب وہ مسلمان تھے تو ان کو ایمان باللہ کا حکم کیوں دیا؟ جواب یہ ہے کہ ایمان کا حکم ان لوگوں کو پیش نظر رکھ کر دیا ہے جواس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، اس وفد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ ہمیں جامع بات بتائیں تاکہ ہم خود بھی اس پرعمل کریں اور قبیلہ کے جولوگ وطن میں ہیں ان کو بھی اس کی دعوت دیں، قبیلہ کے جولوگ وطن میں تھے وہ سب مسلمان نہ تھے، بعض ان میں سے کافر تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کوملحوظ رکھ کر پہلا حکم ایمان باللہ کا دیا یعنی جولوگ ابھی مسلمان نہیں ہوئے ان کوتبلیغ اس طرح کی جائے کہ پہلے ان سے شہادتین کااقرار کرا لیا جائے اس کے بعد نماز روزہ، زکوۃ اوراداءِ خمس کا حکم دیا جائے، تم خود بھی اوروہ بھی اس پرعمل پیرا ہوں۔

چار برتنوں میں نبیذ بنانے کی ممانعت:

ونهاهم عن اربع: چونکہ وفد نے شراب کے برتنوں کے بارے میں خاص طور سے پوچھا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چار برتنوں سے منع فرمایا جوشراب کے خاص برتن تھے، وہ چار برتن یہ ہیں: (۱)**حنتم**: یہ حنتمۃ کی جمع ہے اس کے معنی ہیں: روغنی گھڑا (گھڑے پر روغن کردیا جائے) (۲)**الدباء**: سوکھا کدّو، جو برتن کے طور پر استعمال ہوتا ہے، اردو میں اس کو "تونبی" کہتے ہیں، یہ ایک قسم کا تلخ کدو ہوتا ہے جس کا چھلکا بہت موٹا ہوتا ہے اس کا گودا نکال لیا جاتا ہے پھر وہ برتن کا کام دیتا ہے، (۳)**النقیر**: بمعنی منقور، **نقر ینقر** کے معنی ہیں: کریدنا، کھودنا، لوگ درخت کے تنے کرید کر برتن بناتے تھے، پھراس میں نبیذ بناتے تھے، (۴)**المزفت**: تارکول پھیرا ہوا گھڑا۔ (۲)

وجہ ممانعت اوراس میں اختلافِ ائمہ:

ان چار برتنوں میں نبیذ بنانے کی ممانعت کی علت کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے، امام مالکؒ اورامام احمدؒ

(۱) شرح ابن بطال ۱ی/۱۱۹، ط: مکتبة الرشد، الریاض.
(۲) ازتحفة القاری ۱/۳۰۰.

کے نزدیک علت ہے احتمال تخمر یعنی ان برتنوں میں مسامات نہیں تھے جب گھڑے پر تارکول پھیر دیا جاتا ہے یا رنگ دیا جاتا ہے تو اس کے مسامات بند ہوجاتے ہیں اور تونبی اور لکڑی کے برتن میں مسامات ہوتے ہی نہیں، اس لئے ان میں جلدی گرمی پیدا ہوجاتی ہے اور چیز جلدی سڑ جاتی ہے، اس میں نشہ پیدا ہوجاتا ہے اور پتہ نہیں چلتا کہ نشہ ہوگیا ہے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان برتنوں میں نبیذ بنانے سے منع فرمایا، یہ علت ابھی بھی پائی جاتی ہے اِس لئے ممانعت بھی باقی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اورامام شافعیؒ کے یہاں تذکر خمر علت ہے کہ اگر شراب کے برتن گھر میں رہیں گے تو جب بھی ان پر نظر پڑے گی شراب یاد آئے گی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے برتن استعمال کرنے کی ممانعت فرمادی، پھر جب طبیعتیں شراب سے ہٹ گئیں اوران برتنوں سے شراب کی طرف لوگوں کا دھیان جانا بند ہوگیا تو وہ علت باقی نہیں رہی، پس ممانعت بھی ختم ہوگئی، اس کی دلیل مسلم شریف کی ایک حدیث ہے جس میں فرمایا گیا ہے: **نَهَيْتُكم عن النبيذِ إلافي سَقاءٍ، فاشرَبُوا في الأَسْقِيةِ كلِها ولاتَشْرَبوامُسْكراً**(۱) یعنی میں نے تمہیں کچھ برتنوں میں نبیذ پینے سے منع کیا تھا، پس اب سب برتنوں میں پی لیا کرو البتہ نشہ آور نبیذ مت پیا کرو۔

الحاصل امام مالک اورامام احمد کے نزدیک ان ظروف میں نبیذ بنانے کی ممانعت ابھی بھی باقی ہے اورامام ابوحنیفہ وامام شافعی کے نزدیک **منسوخ** ہوچکی ہے اوراب ان میں نبیذ بنائی جاسکتی ہے۔

شراب کی خالی بوتلوں کا حکم:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شراب کے برتن کو اگر پاک وصاف کرلیا جائے تو دوسری چیزوں میں اس کا استعمال درست ہے پس شراب کی خالی بوتلوں کو پاک کرکے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

وقال احفظوهن واخبروهن من ورائكم: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ان احکامات کو یاد رکھو اور غائبین کو بھی اس سے باخبر کرو، گویا کہ عمل اور دعوت کو ان کے ذمہ میں لازم کردیا۔

۱۸/۱۷ وعَنْ عُبَادَةَ بنِ الصَّامِتِ رضي الله عنه قال: قالَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم وَحَوْلَهُ عِصابةٌ منْ أصحابه: "بَايِعُوْنِي علىٰ أَن لاتُشْرِكُوْا باللّٰهِ شَيْئاً،

(۱) مسلم شريف ۲/۱٦٦.

وَلاتَسْرِقُوْا، وَلاتَـزْنُـوْا، ولاتَـقْتُـلُـوْا أَوْلادَكُـمْ، وَلاتَـأْتُوا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهُ بينَ أَيْدِيْكُمْ وأَرْجلِكُمْ، وَلاتَعْصُوْا فى مَعْرُوْفٍ، فَمَنْ وَفَى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْـئاً فَعُوْقِبَ بِهٖ فِي الدُّنْيَا، فَهُوَ كَفَارَةٌ لَهٗ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شيْئاً، ثم سَتَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ، فَهُوَ إِلَى اللّٰهِ،إِنْ شاءَ عَفَا عَنْهُ، وَإِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ، فَبَايَعْنَاهُ عَلٰى ذٰلِكَ"(۱)(متفق علیہ)

ترجمہ :-حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دراں حالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد حضرات صحابہؓ کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی تھی کہ: مجھ سے بیعت کرو اس بات پر کہ تم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کروگے، چوری نہیں کروگے، زنا نہیں کروگے، اپنے بچوں کو (فقر کے ڈر سے) قتل نہیں کروگے، کسی پر بہتان نہیں لگاؤگے، جس کو تمہارے ہاتھوں اور پیروں نے گھڑا ہو، اور صحیح بات میں نافرمانی نہیں کروگے، پس تم میں سے جوشخص اس عہد واقرار کو پورا کرے گا تو اس کا اجر خدا کے ذمہ ہے اور جوشخص (سوائے شرک کے) ان میں سے کسی گناہ میں مبتلا ہوجائے اور پھر دنیا میں اسے اس گناہ کی سزا بھی مل جائے (حد وغیرہ جاری ہوجائے) تو یہ سزا اس کے گناہ کے لئے کفارہ ہوجائے گی، اور اگر اللہ سبحانہ وتعالی نے ان میں سے کسی چیز کا ارتکاب کرنے والے کی ستر پوشی فرمائی (دنیا میں سزا نہ ملی) تو پھر یہ اللہ کے حوالہ ہوگا، اگر چاہیں گے تو اس کو معاف فرمادیں گے اور اگر چاہیں گے تو اس کو عذاب دیں گے (راوی کہتے ہیں کہ) ہم نے ان سب باتوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی۔(بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

احوال عبادة بن صامت:

جلیل القدر انصاری صحابی ہیں، بیعت عقبہ اولی وثانیہ میں شریک تھے، اوران بارہ نقباء (نگرانوں)

(۱)أخرجه البخاری فی احدى عشرة مواضع: "الإيمان" ۱/۷ برقم ۱۸ "والمناقب" ۱/۵۵۰ برقم۳۷۵۴، و۳۷۵۵، و"المغازی" ۲/۵۷۰ برقم ۳۸۵۵، و"التفسير" ۲/۷۲٦ برقم ٤۷۰۵ و"الحدود"۲/۱۰۰۳ برقم ٦۵۲٦، و"فيه أيضاً" ۲/۱۰۰٤ برقم ٦۵٤۳، و"الديات" ۲/۱۰۱۵ برقم ٦٦۰۸، و"الأحكام" ۲/۱۰٦۹ برقم ٦۹۱۱و"فيه أيضاً"۲/۱۰۷۱، برقم ٦۹۱۱، و"التوحيد"۲/۱۱۲برقم ۷۱٦۸.ومسلم فی "الحدود"۲/۷۳.

میں شامل ہیں جو حضور نے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقعہ پر اہلِ مدینہ کے لئے مقرر فرمائے تھے، قدیم الاسلام ہیں، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت فرمانے سے قبل اسلام لائے، ابوالولید کنیت ہے، تفقہ فی الدین کا مرتبہ حاصل تھا، دیگر صحابہ بھی اس کا اعتراف کرتے تھے، ۳۴ھ میں فلسطین میں انتقال ہوا ہے۔(۱)

شانِ ورودحدیث:

ہجرت سے قبل آنخضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلِ مدینہ سے کچھ خفیہ ملاقاتیں ہوئیں، پہلی ملاقات ۱۱رنبوی میں حج کے موقعہ پر ہوئی، یہ چھ افراد تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت پیش کی، انہوں نے مدینہ میں یہود کی زبانی کچھ سن رکھا تھا، اس لئے فوراً اسلام قبول کرلیا اور مدینہ پہنچ کر آپ کا تعارف کرایا، جس سے پورے مدینہ میں آپ کی شہرت پھیل گئی، دوسری ملاقات اس سے آئندہ سال یعنی ۱۲رنبوی میں حج ہی کے موقعہ پر ہوئی، اس مرتبہ ۱۲رلوگ مدینہ سے آئے، جن میں سے کچھ وہی تھے جو سال گزشتہ آئے تھے اور کچھ نئے تھے جن میں حضرت عبادۃ بن الصامت بھی تھے، جو اس روایت کے راوی ہیں، یہ ملاقات منی میں ایک گھاٹی میں ہوئی، حضور نے ان کو بیعت بھی فرمایا جن میں آپ نے ان سے چند باتوں کا عہد وپیمان لیا جو یہاں مذکور ہیں، اس روایت میں حضرت عبادۃ بن الصامتؓ نے اسی واقعۂ بیعت اور امور بیعت کا تذکرہ فرمایا ہے، یہ ملاقات وبیعت کتب سیرت میں ''بیعت عَقَبہ اولیٰ'' کے نام سے معروف ہے۔

۱۳نبوی میں حج کے موقعہ پر پھر تیسری ملاقات ہوئی، اس مرتبہ مدینہ سے آنے والے مسلمانوں کی تعداد ۷۵رتھی جن میں دوعورتیں بھی تھیں، یہ ملاقات بھی منی کی اسی گھاٹی میں ہوئی جہاں پچھلے سال ملاقات ہوئی تھی، اس مرتبہ قبولیت اسلام اور بیعت کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ ہجرت فرمانے کے بارے میں بھی گفتگو اورمشاورت ہوئی اور بالآخر ہجرت کی بات طے پاگئی، ہجرت سے قبل مدینہ میں اسلامی امور کی انجام دہی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی راہ ہموار کرنے کے لئے آپ نے بارہ نقیب (نگراں) بھی مقرر فرمائے، جن میں ایک عبادہ بن الصامت بھی تھے، یہ ''بیعت عقبہ ثانیہ'' کہلاتی ہے۔

بعض سیرت نگاروں نے پہلی ملاقات کے موقعہ پر بھی بیعت کا تذکرہ کیا ہے، اس لحاظ سے کل تین

(۱) الاصابہ ۳/۵۰۵۔

بیعتیں ہوجائیں گی، مگر معروف یہی ہے کہ صرف دوسری اور تیسری ملاقات پر بیعت ہوئی، پہلی ملاقات میں صرف قبول اسلام ہوا تھا، بیعت نہیں ہوئی تھی۔ (۱)

ایمان اوراعمالِ ایمان پر بیعت:

اس حدیث میں حضرت عبادہؓ بیعت عقبہ اولی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ منی کی گھاٹی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد صحابہ کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ چند باتوں پر مجھ سے بیعت کرو اور بیعت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ بیعت کے بعد جو شخص اس عہد و پیمان کا لحاظ کرے گا تو اللہ اس کو اجر وثواب سے نوازیں گے اور جو شخص عہد و پیمان کا خیال نہیں کرے گا اور کسی گناہ کا ارتکاب کرے گا اور دنیا میں امیر المؤمنین کو اس گناہ کا پتہ چل گیا اور اس پر ثبوت قائم ہوجانے کی وجہ سے حد جاری کردی گئی تو دنیا کی یہ سزا اس کے لئے کفارہ ہوجائے گی اور اگر دنیا میں معلوم نہ ہوا اور اس پر حد جاری نہ ہوئی تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے چاہے اس کو معاف کرے یا سزا دے۔

عصابة : بمعنی بڑی جماعت، دس سے لیکر چالیس افراد تک کی جماعت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، یہ **عصب** سے ہے بمعنی مضبوط وقوی کرنا، ایسی جماعت میں بعض بعض کی قوت کا سبب بنتا ہے، اس لئے اتنی بڑی جماعت کو "عصابة" کہتے ہیں۔ (۲)

مفہومِ بیعت:

بایعونی علی ان لاتشرکوا الخ : "**بایعونی**" باب مفاعلہ سے امر کا صیغہ ہے اس کا مصدر مبایعت ہے اور مجرد میں **بیعة** مصدر ہے، معنی ہیں ہاتھ پر ہاتھ مارنا، عقد بیع بھی اسی سے ہے، اس لئے کہ اہل عرب جب کسی چیز کی خرید وفروخت کرتے تھے تو متعاقدین میں سے ہر ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتا تھا، بیعت میں بھی یہی ہوتا ہے کہ عہد کرنے والا اپنا ہاتھ اس شخص کے ہاتھ میں دیتا ہے جس سے عہد کر رہا ہے اور اس سے معاہدہ کی مضبوطی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ (۳)

---

(۱) سیرت النبی شبلی نعمانی ۱/ ۱۵۷.

(۲) المرقاۃ ۱/ ۱٦٤.

(۳) شرح الطیبی ۱/ ۱٤۲.

اقسام بیعت:

اسلام میں بیعت چار قسم کی ہوتی ہے (۱)بیعت اسلام (۲)بیعت خلافت (۳)بیعت علی الجہاد (۴)بیعت طریقت۔

بیعت اسلام یہ ہے کہ کوئی کافر کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام لائے، جیسے صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔

بیعت خلافت یہ ہے کہ انتظامی اور سیاسی امور میں اطاعت وفرمانبرداری کی بیعت کرنا، جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کی، اسی طرح حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی، بعد میں خلفاء وامراء میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔

بیعت علی الجہاد یہ ہے کہ امیر کے ہاتھ پر یہ عہد کیا جائے کہ ہم تمہارے ساتھ مل کر کفار سے جہاد کریں گے لڑائی کے وقت پشت نہیں پھیریں گے، چاہے جان چلی جائے، جیسے صحابہ نے صلح حدیبیہ کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔

بیعت طریقت یہ ہے کہ کسی متبع سنت صاحبِ نسبت بزرگ کے ہاتھ پر اپنے گناہوں سے توبہ اور احکامِ شریعت کا عہد کیا جائے، اس کو ''بیعت سلوک'' بھی کہا جاتا ہے۔

بیعت سلوک کے بارے میں مختلف نظریات:

بیعت سلوک کے تعلق سے لوگوں میں تین نظریے پائے جاتے ہیں: (۱)غیر مقلدین سلفیوں اور دیگر بعض فرقوں کا خیال ہے کہ بیعت سلوک بے اصل ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں، (۲)بریلوی کہتے ہیں کہ آخرت میں نجات کے لئے بیعت ضروری ہے، جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیر شیطان ہے، (۳)تیسرا نظریہ علماء دیوبند کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ بیعت سلوک کا ثبوت قرآن وحدیث سے ہے، نجات اخروی کے لئے بیعت سلوک ضروری نہیں، نجات کا مدار ایمان اور اعمال صالحہ پر ہے، البتہ بیعت کے دو بڑے فائدے ہیں:

(۱)عبادت کا اہتمام بالخصوص نفل اعمال کی زیادتی اور اس کے ذریعہ جنت میں بلند درجات حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، نفل اعمال کا اہتمام آدمی خود بھی کرسکتا ہے لیکن تجربہ یہ ہے کہ از خود مکمل کامیابی

نہیں ملتی، اگر خود کو کسی کے سپرد کردے تو یہ مقصد آسانی سے حاصل ہوسکتا ہے۔

(۲) اخلاقِ رذیلہ سے انخلاء اور اخلاقِ حسنہ کے ساتھ مزین ہونا جسے کتاب وسنت میں تزکیہ سے تعبیر کیا گیا، یہ مقصد بھی بیعت سلوک کے ذریعہ بآسانی حاصل ہوتا ہے۔

حدیث مذکور میں اسی ''بیعت سلوک'' کا تذکرہ ہے کیونکہ اس میں صحابہ سے بیعت لی گئی، یہ کافر نہیں تھے، لہٰذا یہ نہ بیعت اسلام ہے نہ بیعت جہاد اور نہ بیعتِ خلافت، بلکہ بیعت طریقت کے اعمال کا تذکرہ ہے، قرآن کریم میں سورۂ ممتحنہ کی آیت ''یاایھاالنبی اذا جائک المؤمنات الخ'' میں بھی یہی بیعت مذکور ہے، ان اعمال کی تفصیل اور اس بیعت کی دفعات یہ ہیں:

(۱) ولاتسرقوا: چوری مت کرنا، اس لئے کہ اسلام میں مال بھی جان ہی کی طرح محترم ہے، ''سرقہ'' کہتے ہیں: أخذ مال الغیر خفیة کو، اس کے مباحث آگے آئیں گے۔

(۲) ولاتزنوا: زنا مت کرنا کیونکہ اسلام عزتوں کا محافظ ہے۔

(۳) ولاتقتلوا اولادکم: کسی کو ناحق قتل نہیں کرنا، بالخصوص اپنی اولاد کو، اہل عرب زمانۂ جاہلیت میں اپنی اولاد کو فقر کے خوف سے قتل کرتے تھے اور بیٹیوں کو عار کے خوف سے قتل کردیا کرتے تھے، جس میں قتل نفس، قطع رحمی اور فساد عقیدہ متعدد مفاسد پائے جاتے ہیں، ویسے تو کسی کے بھی قتل کی اجازت نہیں، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کی تخصیص اس لئے کی کہ اہل عرب کے یہاں یہ جرم عام تھا۔

قتل اولاد کی مختلف صورتیں:

شراح نے فرمایا ہے کہ قتل اولاد میں ضمناً وہ تمام صورتیں داخل ہیں جس میں اضاعتِ ماء ہو، اور اضاعت ماء کی تین صورتیں یا تین درجے ہیں:

(۱) منع حمل، یعنی ایسی کوئی تدبیر کرنا، جس سے منی رحم میں نہ پہنچے، قدیم زمانہ سے اس کی جو صورت چلی آتی ہے، وہ ''عزل'' ہے، یعنی رحم سے باہر منی خارج کردینا، حدیث میں بھی اس کو ''وأدِ خفی'' کہا گیا ہے، اس لئے یہ صورت مکروہ وناپسندیدہ ہے گو جائز ہے۔

(۲) اسقاط حمل، یعنی حمل قرار پاجانے کے بعد اس کو گرادینا، اس کا حکم یہ ہے کہ حمل چار ماہ یا اس سے زیادہ کا ہوچکا ہو تو اس کو ساقط کرنا مطلقا ناجائز ہے، گو کوئی عذر ہو، حتی کہ عورت کی جان کو خطرہ ہو تب

بھی جائز نہیں، اس لئے کہ عورت کی جان کو تو صرف خطرہ ہے اوراسقاط کی صورت میں بچہ یقینی طور پر مرجائے گا، اوراگرحمل کو ابھی چار ماہ نہیں ہوئے تو اگرکوئی عذرہو تو اس کے اسقاط کی گنجائش ہے، بلاعذر گنجائش نہیں۔

(۳)قطع نسل، یعنی ایسی کوئی تدبیر کرنا جس سے آئندہ کبھی اولاد پیدانہ ہومثلاً نسبندی یا بچہ دانی نکلوادینا، یہ بالکل ناجائز اورحرام ہے۔(۱)

بہتان وغیبت کا مفہوم وفرق:

(۴) **ولاتاتوا ببهتان الخ**: کسی پر بہتان نہ باندھو، بہتان کہتے ہیں: ''**الكذب الذی يَبْهَت السامعَ**'' ایسا جھوٹ جوسننے والے کو حیرت میں ڈالدے، پس کسی کی طرف ایسی برائی کی نسبت کرنا جوواقعۃً اس میں موجود نہ ہو''بہتان'' ہے، اورکسی کے پس پشت ایسی برائی کرنا جواس میں موجود ہو''غیبت'' کہلاتا ہے۔

تفترونه بين ايديكم: (ہاتھ وپیروں کے درمیان گھڑنا)اصلاً یہ عورت کی صفت ہے،بعض عورتیں جن کو بچہ نہیں ہوتا وہ کسی اورشخص کا بچہ چراکر کہتی ہیں کہ یہ میرابچہ ہے، اوربچہ ہاتھ وپیروں کے درمیان یعنی پیٹ سے پیدا ہوتاہے اس لئے دوسرے کے بچے کو اپنا قرار دینے کو''**بهتان مفترىٰ بين ايدى وارجل**'' سے تعبیر کرتے ہیں، یہاں یہ لفظ بولا گیا ہے مردوں کے لئے ،لہٰذا ایدی واَرجل سے مراد ہے: انفس ہے ای **لاتاتوا ببهتان تفترونه من عند أنفسكم** یعنی اپنے آپ گھڑکرکوئی بات کسی کی طرف منسوب نہ کرو، چونکہ آدمی کے اکثر افعال ہاتھ وپیر سے ہی صادر ہوتے ہیں اس لئے''ایدی وارجل'' بولکر''انفس'' یعنی ذات مراد لی گئی ہے۔(۲)

(۵) **ولاتعصوا الخ**: ''معروف''ایسی بات جس کوشریعت نے پسند کیا ہو،مطلب یہ ہے کہ کسی بھی شرعی حکم کی تم نافرمانی نہ کرو،خواہ اس معروف کے خلاف کرنے کا حکم کوئی بھی دے، استاذ، شیخ، یاحاکمِ وقت کسی کی بھی خلاف معروف میں اطاعت جائز نہیں، **لاطاعةَ لمخلوقٍ فی معصيةِ الخالق**.(۳)

ان امور پرحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی اورفرمایا اس کے بعد دوطرح کے لوگ ہوں گے،

(۱)جواهر الفقه ۷/ ۸۰.

(۲)شرح الطيبى ۱/ ۱٤۳، وفتح الاله ۱/ ۲۹۸.

(۳)فتح الاله ۱/ ۲۹۹.

بعض تو اس عہد کا لحاظ رکھیں گے اور ان جرائم سے بچیں گے ان کا اجر اللہ پر ہوگا ''علی'' لزوم کے لئے ہے لیکن یہ لزوم بطور تفضّل واحسان اور ایفاء وعدہ کے لحاظ سے ہے ورنہ اللہ پر کوئی چیز لازم نہیں، اور بعض وہ ہوں گے جو اس عہد کا لحاظ نہیں کریں گے، پس ان کا یہ جرم اگر ثابت ہوگیا اور دنیا میں اس کی حد جاری ہوگئی تو وہ حد کفارہ ہوجائے گی، اور اگر دنیا میں اللہ نے پردہ پوشی کرلی تو اب اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہوگا، ان شاء عفا عنه وان شاء عذبه۔

حدود رافعِ اثم ہیں یا نہیں؟

فهو كفارة له الخ : ائمہ اربعہ کے درمیان اختلاف ہے کہ حدود رافعِ اثم ہیں یا نہیں؟ یعنی حدود کے اجراء سے گناہ ختم ہوجاتا ہے یا نہیں؟ ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ حدود رافع اثم ہیں، اور احناف فرماتے ہیں کہ حدود رافع اثم نہیں، بلکہ محض زجر وتوبیخ کے لئے ہیں، عنداللہ گناہ معاف ہونے کے لئے توبہ شرط ہے۔

جمہور علماء کی دلیل یہی حدیث ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **فهو كفارة له**، امام صاحب اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس میں ایک قید ملحوظ ہے: **ان تاب** اور یہ قید خود قرآن کریم سے ثابت ہے، ارشاد باری ہے: ''**وَالَّذِينَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصِنٰتُ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً وَلَاتَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَداً وَاُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا الخ**'' یعنی جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور پھر اس پر چار گواہ نہ پیش کرسکیں تو ان کے اسی کوڑے لگائیں جائیں اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کی جائے اور یہ لوگ فاسق ہیں سوائے ان کے جو توبہ کرلیں۔ اس آیت میں حدقذف جاری ہونے کے بعد بھی ان کو فاسق کہا گیا ہے اور فسق کا حکم ختم ہونے کے لئے توبہ کو ضروری قرار دیا ہے، معلوم ہوا کہ گناہ معاف ہونے کے لئے توبہ ضروری ہے۔

اسی طرح قطاع طریق کی سزا بیان فرمائی گئی ''**انما جزاءُ الذين يُحاربون اللهَ ورسولَه الخ**'' اس آیت میں اجراء حد میں چار باتوں کا اختیار دیا گیا ہے یعنی قطاع طریق پر چار قسم کی سزائیں جاری کی جاسکتی ہیں، اگلی آیت میں سزا کا مقصد بیان فرمایا: ''**اولئک لهم خزیٌ فی الدنیا ولهم فی الآخرةِ عذابٌ عظيمٌ**'' حدود اگر کفارہ ہوجاتی ہیں تو پھر آخرت میں عذاب عظیم کیوں قرار دیا گیا ہے؟ لہٰذا صرف

اجراء حدود سے گناہ معاف نہیں ہوتا، اس کے لئے مستقلا توبہ ضروری ہے۔

یہاں حدیث میں توبہ کی قید اس لئے مذکور نہیں ہے کہ آدمی پر جب حد جاری ہوتی ہے تو اکثر وبیشتر وہ توبہ کرہی لیتا ہے اور عموماً توبہ کا تحقق ہوجاتا ہے یعنی حد کے ساتھ فعلی توبہ شامل ہوہی جاتی ہے، اس اعتبار سے حدود کو گناہوں کے لئے کفارہ کہا گیا ہے، ورنہ تمام کبائر کے لئے جیسا کہ ضابطہ ہے توبہ ضروری ہے۔

خوارج ومرجئہ کی تردید:

إن شاء عفاعنه: کہ اگر اللہ چاہے تو اس کو معاف کردے، اس میں معتزلہ وخوارج کی تردید ہے جو کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ اسلام سے خارج ہے، اگر ایسا ہوتا تو اس کی معافی نہ ہوتی۔

وإن شـــاء عــاقبــه: کہ چاہے ان کو عذاب دے، اس میں تردید ہے مرجئہ کی، جو کہتے ہیں کہ گناہوں سے کچھ نقصان نہیں ہوتا، اگر ایسا ہوتا تو ان کو عذاب دینے کی بات نہ کہی جاتی۔

١٩ / ١٨ وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ: خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ أَضْحٰى أَوْفِطْرٍ إِلَى الْمُصَلّٰى، فَمَرَّ عَلَى النِّسَاءِ، فَقَالَ: "يَامَعْشَرَ النِّسَاءِ! تَصَدَّقْنَ، فَإِنِّيْ أُرِيْتُكُنَّ أَكثرَ أَهْلِ النَّارِ" فَقُلْنَ: وَبِمَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ، وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ، مَارَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِيْنٍ أَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ إِحْدَاكُنَّ، قُلْنَ: وَمَانُقْصَانُ دِيْنِنَا وَعَقْلِنَا؟ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قال: "أَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ؟" قُلْنَ: بَلٰى، قَالَ "فَذٰلِكَ مِنْ نُقْصَانِ عَقْلِهَا، قَالَ: أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ؟" قُلْنَ: بَلٰى، قَالَ: "فَذٰلِكَ مِنْ نُقْصَانِ دِيْنِهَا" (متفق علیہ[1])

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایک مرتبہ) عیدالاضحیٰ یا عید الفطر کے موقع پر عیدگاہ کی طرف نکلے، آپ کا گزر عورتوں کے پاس سے ہوا، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: اے عورتوں کی جماعت! تم صدقہ وخیرات کرو، کیونکہ

(١) أخرجه البخاري في أربعة مواضع: "الحيض" ١ / ٤٤ برقم ٣٠٢ و"الزكاة" ١ / ١٩٧ برقم ٤٤١، و"الصوم" ١ / ٢٦١ برقم ١٩٠٩، و"الشهادات" ١ / ٣٦٣ برقم ٢٥٨٤. ومسلم في موضعين: "الإيمان" ١ / ٦٠ و"صلاة العيدين" ١ / ٢٩٠.

جہنم میں مجھے عورتیں زیادہ دکھائی گئیں، عورتوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیوں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لعن طعن بہت کرتی ہو اور اپنے شوہروں کی نافرمانی اور ناشکری کرتی رہتی ہو، اور میں نے عقل ودین میں کمزور ہونے کے باوجود ہوشیار مرد کو بیوقوف بنا دینے میں تم سے زیادہ کسی کو نہیں دیکھا، عورتوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہماری عقل اور ہمارے دین میں کیا کمی ہے؟ آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: کیا ایک عورت کی گواہی مرد کی آدھی گواہی کے برابر نہیں ہے؟ عورتوں نے عرض کیا: جی ہاں! ایسا ہی ہے، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: یہ عورت کے عقل کے نقص کی وجہ سے ہے، اور کیا ایسا نہیں ہے کہ جس وقت عورت حیض کی حالت میں ہوتی ہے تو نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں! ایسا ہی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اس کے دین میں نقصان کی وجہ سے ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

احوال ابوسعید الخدریؓ:

جلیل القدر صحابی ہیں، صغار صحابہ میں سے ہیں، نام سعد بن مالک بن سنان الانصاری الخدری ہے، ''خُدر'' انصار کا ایک قبیلہ تھا، اس کی طرف منسوب ہوکر خدری کہلاتے ہیں، غزوۂ احد میں کم سنی کے باعث شریک نہیں ہوسکے، لیکن اس کے بعد تمام غزوات میں شریک ہوئے، نوعمر صحابہ میں سب سے زیادہ فقیہ شمار ہوتے تھے، نیز حفاظ وفضلائے صحابہ میں سے ہیں اور کثیر الروایۃ ہیں، ۶۴ھ میں وفات ہوئی۔ (۱)

ربط حدیث:

اس حدیث میں ایمان کے مثبت اور منفی دونوں طرح کے اعمال مذکور ہیں، مثبت عمل: صدقہ اور منفی عمل: اکثارِ لعنت اور کفرانِ عشیر ہے، اس لئے اس حدیث کی کتاب الایمان سے مناسبت مثبت اور منفی دونوں لحاظ سے ہے۔

(۱) ان کی کل مرویات: ۱۱۷۰ ہیں، متفق علیہ ۴۳ ہیں، ماانفرد بہ البخاری ۱۶ اور ماانفرد بہ مسلم ۵۲ ہیں، (سیر اعلام النبلاء ۳/۱۴۲ ط مؤسسة الرسالة)

عورتوں کی جہنم میں کثرت اوران کوصدقہ کی تلقین:

خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم في اضحى او فطر الخ :حضرت ابوسعید خدریؓ واقعہ بیان کررہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عید کی نماز کے لئے نکلے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عیدالاضحیٰ اورعیدالفطر کی نماز عیدگاہ میں پڑھتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزرعورتوں کی جماعت کے پاس سے ہوا، اس زمانہ میں عورتیں بھی عیدگاہ جایا کرتی تھیں، لیکن منبر سے دوررہتی تھیں جس کی وجہ سے خطبہ نہیں سن پاتی تھیں، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس گئے اورنصیحت کی کہ صدقہ کیا کرو کیوں کہ مجھے جہنم میں عورتیں زیادہ دکھائی گئی ہیں۔

معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت وجہنم کا مشاہدہ کیا ہے،شب معراج میں تو حتمی ہے نیز ایک مرتبہ سورج گہن کی نماز پڑھارہے تھے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جنت وجہنم کی مثالی شکل پیش کی گئی، جس کی تفصیل آگے آئے گی، ممکن ہے کہ اس حدیث میں اسی وقت کا دیکھنا مراد ہو، نیز دیکھنے سے بطور وحی یا بطور مکاشفہ کے مطلع ہونا بھی مراد ہوسکتا ہے۔

نماز عیدگاہ میں پڑھنا سنت ہے:

یہ بھی معلوم ہوا کہ عید کی نماز عیدگاہ میں پڑھنا مسنون ہے اگرچہ عذر کی وجہ سے مسجد میں بھی جائز ہے۔

عورتوں کا لعنت وملامت کرنا:

فقلن وبم يارسول الله؟ عورتوں نے سوال کیا کہ یارسول اللہ ایسا کیوں؟ یعنی جہنم میں ہماری تعداد زیادہ کیوں ہوگی؟ اس کا جواب دیا کہ تم میں دوبڑی خرابیاں ہیں، ایک لعنت ملامت زیادہ کرتی ہوحتی کہ بعض مرتبہ اپنی اولاد کو بھی لعنت کرتی ہو، یہ بڑی خرابی ہے، کیونکہ لعنت کا مطلب ہے اللہ کی رحمت سے دور ہونے کی بددعا کرنا،کسی کو کیا حق ہے کہ اللہ کی رحمت سے کسی کو دور کرے، اللہ کی رحمت تو وسیع ہے۔

لعنت کا حکم:

علماء نے لکھا ہے کہ کسی کی زندگی میں اس کا نام لے کراس پرلعنت کرنا جائز نہیں، خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر، اور جوکفر پرمرا ہو یا کسی کا کفر پرمرنا یقینی ہو بایں طور کہ نص سے اس کا علم ہوجائے کہ یہ کفر پرمرے

گا تو اس پر لعنت کرنا درست ہے، جیسے ابولہب اور اس کی بیوی اور ابلیس، اور کسی کو متعین کیے بغیر لعنت کو کسی وصف پر معلق کر کے لعنت کرنا جائز ہے خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ، جیسے **لعنۃ اللہ علی الکاذبین** وغیرہ۔ [1]

عورتوں کا ناشکری کرنا:

دوسری خرابی جو عورتوں میں ہوتی ہے، وہ شوہر کی نافرمانی ہے، **عشیر** جس کے ساتھ زندگی گزاری جائے، یہاں کفر کے لغوی معنی مراد ہیں یعنی ناشکری و ناقدری کرنا، حدیث میں ہے کہ ان کی ناشکری کا عالم یہ ہے کہ تم زندگی بھر ان پر احسان کرتے رہو اور اتفاقاً کوئی ناگوار بات پیش آجائے تو کہتی ہیں "**ما رأیت خیرا منک قط** [2]" کہ مجھے تیری طرف سے کبھی کوئی خیر حاصل نہیں ہوئی، یہ لعن طعن اور ناشکری عورتوں کی گھٹی میں ہے، اس سے پوری حفاظت ناممکن ہے، چنانچہ اس کی تلافی کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صدقہ کا حکم دیا کہ اس سے گناہ معاف ہوں گے اور اللہ کا غضب دور ہوگا، حدیث میں ہے: **ان الصدقۃ تطفئ غضب الرب.** [3] کہ صدقہ اللہ تعالیٰ کے غصہ کو ٹھنڈا کرتا ہے، صدقہ کا یہ حکم واجب اور نفل دونوں قسم کے صدقات کو شامل ہے، نیز عورتوں کو صدقہ کا حکم اس وجہ سے بھی دیا گیا کہ عورتوں میں بخل اور حب دنیا زیادہ ہوتا ہے۔

عورتوں کی ایک خوبی:

ما رأیت من ناقصات عقل و دین الخ : پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں ایک دنیوی خوبی ہے، مگر وہ خوبی بھی اپنے اندر مفسدہ لئے ہوئے ہے کہ تم عقل و دین کے نقص کے باوجود اچھے اچھے مردوں کو اپنے جال میں پھنسا لیتی ہو، اسی لئے ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے: "**ما ترکتُ بعدی فتنہ اضرَّ علی الرجال من النساء** [4]" کہ میں نے اپنے بعد مردوں کے لئے عورتوں سے بڑا فتنہ نہیں چھوڑا۔

---

(۱) شرح الطیبی ۱/۱۴۶.
(۲) کمافی روایۃ البخاری ۱/۹(۲۹)
(۳) رواہ الترمذی واحمد وابن ماجہ، بحوالہ مشکوۃ ص ۱۴.
(٤) بخاری شریف ۲/۷۶۳(۵۰۹۶)، مسلم ۲/۳۵۲،(۲۷٤۰)

اللُّبُّ: بمعنی خالص عقل، جس میں خواہش نفس کی آمیزش نہ ہو، "الرجل الحازم" بمعنی سمجھدار، ہوشیار، محتاط آدمی، عورت اپنے حسن وجمال اوراپنی نزاکت کی وجہ سے مردکو اپنے قبضہ میں کرلیتی ہے، عورتوں میں برائی کا مادہ زیادہ ہے اور مرد اس کی برائی کو جلدی قبول کرتا ہے، لیکن عورت مرد کی خوبی کو جلدی قبول نہیں کرتی۔

ایک سوال وجواب:

یہاں سوال یہ ہے کہ "مارأيت من ناقصات عقل ودين الخ" میں "منكن" کے بجائے "احداكن" کیوں فرمایا، جب کہ یہ خصلت تقریباً سب عورتوں میں پائی جاتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جب ایک عورت اتنا کام کرسکتی ہے تو ساری عورتوں کا کیا حال ہوگا خود اندازہ لگالو۔(۱)

ومانقصان عقلنا ودیننا: پھر عورتوں نے پوچھا کہ: یارسول اللہ! ہمارے عقل ودین میں کمی کیسے ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی وجہ بتائی کہ عورت کی گواہی مرد کی نصف گواہی کے برابر ہوتی ہے جس کی وجہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی: "أن تَضِلَّ اِحدٰيهُما فتُذَكِّر احديهُما الاخرى(۲)" کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلائے یعنی عورتوں کا حافظہ نسبتاً کمزور ہوتا ہے، اس لئے دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے قائم مقام قرار دی گئی، یہ نقصان عقل کی علامت ہے، عورتوں نے اس کا اقرار کیا، اور عورتیں حالت حیض میں نماز وروزہ سے محروم رہتی ہیں، یہ نقصان دین ہے، یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقصان عقل کو نقصان دین پر مقدم فرمایا، اسلئے کہ عورتوں میں نقصانِ عقل فطری اور جبلی امر ہے اس لئے وہ مقدم ہے اور نقصان دین ایک امر حادث ہے، امر حادث مؤخر ہوتا ہے۔(۳)

شراح فرماتے ہیں کہ عورتوں کا یہ سوال "ومانقصان ديننا وعقلنا" اس سے خود ان کا نقصانِ عقل ثابت ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو عقل کو مقدم کیا تھا اوران عورتوں نے دین کو مقدم کیا، کلام

(۱) المرقاة ۱/۱۶۷-۱۶۸.

(۲) سورة البقرة، رقم الاية ۲۸۲.

(۳) شرح الطيبى ۱/۱۴۶.

نبوی کی ترتیب کا لحاظ بھی ان سے نہیں ہو پایا۔(۱)

کچھ اور سوال و جواب:

سوال: اشکال ہوگا کہ بعض عورتیں مردوں سے بھی زیادہ عقلمند ہوتی ہیں اور بعض مرد بیوقوف ہوتے ہیں؟

جواب: یہ حکم جنس کے اوپر ہے کہ عورت کی جنس مرد کی جنس کے مقابلہ میں کم عقل والی ہوتی ہے، اَفرادِ عورت پر حکم لگانا مقصود نہیں ہے، جیسے **الرجل خير من المرأة.**

سوال: حیض آنا تو غیر اختیاری چیز ہے، اس کی وجہ سے نقصان دین کیوں ہوا؟

جواب: حیض اگرچہ غیر اختیاری چیز ہے اور حیض کے زمانے میں نماز وروزہ کو ترک کرنے سے عورت گنہ گار نہیں ہوگی، لیکن بہر حال ثواب میں کمی ہوگی، پس نقص تو ہے ہی۔(۲)

۲۰/۱۹ وعن أبي هريرةؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَالَ اللّٰهُ تَعَالىٰ: كَذَّبَنِيْ ابنُ آدَمَ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ، وَشَتَمَنِيْ ولم يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ؛ فَأَمَّا تَكْذِيبُه إِيَّايَ فَقَوْلُه: لَنْ يُعِيْدَنِيْ كَمَابَدَأَنِي، وَلَيْسَ أَوَّلُ الْخَلْقِ بِأَهْوَنَ عَلَيَّ مِنْ إِعَادَتِهٖ، وأَمَّا شَتْمُهُ إِيَّايَ: فقولُه: اتَّخَذَاللّٰهُ وَلَداً وأَنَا الأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِيْ لَمْ أَلِدْ وَلَمْ أُوْلَدْ وَلَم يَكُنْ لِي كُفُواً أَحَدٌ، وفي روايةِ ابن عباسٍ: وَأَمَّاشَتْمُهُ إِيَّايَ فَقَوْلُهُ: لِيْ وَلَدٌ، وَسُبْحَانِيْ أَنْ أَتَّخِذَ صَاحبةً أَوْوَلَداً. (رواه البخاری(۳))

ترجمه: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ابن آدم مجھے جھٹلاتا ہے، حالانکہ اس کو یہ زیبا نہیں ہے، اور مجھے برا کہتا ہے، حالانکہ یہ اس کو زیبا نہیں ہے، پس اس کا مجھے جھٹلانا تو یہ ہے کہ وہ کہتا ہے جس طرح اللہ نے مجھے

(۱) المرقاة ۱/۱۶۷.

(۲) شرح الطيبي ۱/۱۴۶.

(۱) أخرجه البخاري في "بدألخلق" ۱/۴۵۳ برقم ۳۰۸۹ و"التفسير" ۲/۷۴۳ برقم ۴۷۸۴، وفيه أيضاً ۲/۷۴۴ برقم ۴۷۸۵، ورواية ابن عباسؓ: فقد أخرجه البخاري في "التفسير" "باب قوله تعالى: وقالوا اتخذ الله ولداً سبحانه ۲/۶۴۴ برقم: ۴۲۹۷"

(اس دنیامیں) پہلی بار پیدا کیا ہے اس طرح وہ (آخرت میں) مجھے دوبارہ ہرگز پیدانہیں کرسکتا ہے، حالانکہ پہلی مرتبہ پیدا کرنا آسان نہیں ہے دوسری مرتبہ پیدا کرنے کے بنسبت (یعنی دونوں برابر ہیں)اوراس کا مجھ کو برا کہنا یہ ہے: کہ وہ کہتا ہے اللہ نے بیٹا بنارکھا ہے، حالانکہ میں تنہا اور بے نیاز ہوں نہ میں نے کسی کو جنااور نہ مجھے کسی نے جنا اور نہ کوئی میرا ہمسر ہے، اورابن عباسؓ کی روایت میں اس طرح ہے اور انسان کا مجھے برا کہنا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ کا بیٹا ہے حالانکہ میں اس سے پاک ہوں کہ کسی کو بیوی یا بیٹا بناؤں۔ (بخاری)

تشریح حدیث

ربط حدیث:

اس حدیث میں منافی ایمان دواعمال کا بیان ہے، لہٰذا کتاب الایمان سے مناسبت باعتبار ضد کے ہے، اور وہ اعمال یہ ہیں: بنی آدم کا تکذیب الٰہی اور بنی آدم کا شتم الٰہی۔

حدیث قدسی کا مفہوم اوراس کے وحدیثِ نبوی کے درمیان فرق:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: قال الله تعالىٰ الخ: یہ حدیث قدسی ہے۔

حدیث قدسی: وہ حدیث ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "**قال اللــه تـعالىٰ**" کہہ کر بیان کریں، شراح نے فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو تین طرح کا کلام سنایا (۱) کلام الٰہی (قرآن کریم) (۲) حدیث قدسی (۳) حدیث نبوی، اور یہ تمام کلام اللہ کی جانب سے ہے، اللہ کا پاک ارشاد ہے "**ومایںطق عن الهوى الخ**"

تینوں کلاموں میں فرق یہ ہے جوکلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم پرنازل ہوا اوراس کے الفاظ ومعانی **على وجه الاعجاز والتحدى** اترے اورامت میں تواتر کے ساتھ پھیلے، وہ کلام الٰہی یعنی قرآن کریم ہے، اورحدیث قدسی وہ کلام ہے جس کے الفاظ ومعانی دونوں اللہ کی طرف سے آئے لیکن **عـلـى وجـه الاعجاز والتحدى** نہیں، نیز امت میں وہ تواتر کے ساتھ بھی نہیں پھیلے، اورحدیث نبوی کہتے ہیں کہ معانی تو اللہ کی طرف سے ہوں اور ان معانی کوتعبیر کرنے کے لئے الفاظ کا انتخاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

کیاہو۔(۱)

منافی ایمان دواعمال:(۱) تکذیب الٰہی

کذّبنی ابن آدم الخ :''ابن آدم'' یہ لفظ تحقیر کے لئے ہے کہ نطفہ سے پیدا ہوا اور بات بہت بڑی کرتا ہے، پہلا منافی ایمان عمل تکذیب الٰہی ہے،اللہ کی تکذیب یہ ہے کہ انسان حشر کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ مرنے کے بعد دوبارہ پیدانہیں کرسکتا، اور انکارِ حشر اللہ کی تکذیب کو مستلزم ہے، کیونکہ قرآن کی سینکڑوں آیات میں حشر کا اثبات ہے، پس جو شخص حشر کا انکار کرے گا گویا اس نے کلام اللہ کا انکار کیا اور کلام اللہ اللہ کی صفت ہے اور صفت کا انکار موصوف کا انکار ہوتا ہے۔

ولیس اول الخلق باھون :اللہ فرماتا ہے کہ دوبارہ پیدا کرنا پہلے کے مقابلہ میں کچھ بھی مشکل نہیں ہے، کیونکہ پہلے بغیر نمونہ کے پیدا کیا تھا اور بغیر نمونہ کے کوئی چیز پیدا کرنا نمونہ موجود ہونے کے مقابلہ میں نسبۃً مشکل ہوتا ہے، لہٰذا جب اللہ نے پہلی مرتبہ پیدا کردیا تو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہوگا؟

(۱) اورقرآن کریم اورحدیث قدسی میں چندفرق ہیں:

(۱) قرآن کریم حدیث قدسی سے افضل ہے کیونکہ اس کے نظم والفاظ اللہ کی طرف سے علی وجہ الاعجاز اترے ہیں۔

(۲) قرآن کریم حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے نازل ہوا ہے جبکہ حدیثِ قدسی کبھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے تو کبھی خواب والہام کے ذریعہ بھی آئی ہے۔

(۳) قرآن کریم پورا کا پورا متواتر ہے جبکہ تمام احادیثِ قدسیہ متواتر نہیں ہیں۔

(۴) قرآن کریم ہمیشہ کے لئے ایک معجزہ ہے جبکہ حدیث قدسی ایسی نہیں ہے۔

(۵) قرآن کریم میں کسی بھی قسم کی غلطی ممکن نہیں ہے جبکہ حدیث قدسی میں امکان ہے کہ کوئی راوی غلط روایت کردے۔

(۶) قرآن کریم کی نماز میں تلاوت کی جاتی ہے حدیث قدسی ایسی نہیں ہے۔

(۷) محدث کا قرآن کریم کا چھونا اور جنبی کا اس کو پڑھنا ممنوع ہے جبکہ حدیث قدسی کے سلسلہ میں یہ ممانعت نہیں ہے۔

(۸) قرآن کریم کی تلاوت پر ثواب کا ملنا ثابت ہے اور حدیث قدسی کے لئے اس طرح کی کوئی فضیلت وارد نہیں ہے۔

(۹) قرآن کریم سورتوں، آیات، احزاب اور پاروں میں تقسیم شدہ ہے جبکہ حدیث قدسی کی یہ صورتحال نہیں ہے۔

(۱۰) حدیث قدسی کو روایت بالمعنی بیان کرنا جائز ہے جبکہ قرآن کریم میں تلاوت بالمعنی جائز نہیں ہے، (**الصحیح المسند من الاحادیث القدسیة ص:٤، الاتحافات السنیة ص:٥**)۔

پھر یہ تعبیر بھی لوگوں کو سمجھانے کے لئے ہے کہ تمہارے اعتبار سے کسی چیز کو پہلی مرتبہ پیدا کرنا مشکل ہے کہ اس میں نمونہ نہیں ہوتا ہے، ورنہ اللہ کے حق میں اولِ خلق اور اعادۂ خلق دونوں برابر ہیں، کیونکہ وہاں تو صرف کلمۂ ''کن'' پر اثر مرتب ہوتا ہے، لہٰذا جب تمھیں یہ تسلیم ہے کہ پہلی مرتبہ اللہ نے پیدا کیا تھا تو دوبارہ پیدا کرنے میں تمھیں کیا استعجاب واستبعاد محسوس ہوتا ہے؟

(۲) شتم الٰہی:

وامــا شَتْـمُهُ إياي الخ: منافی ایمان دوسرا عمل ہے شتم الٰہی کرنا، شتم کے معنی ہیں کسی کی طرف ایسی بات منسوب کرنا جو اس کے لئے موجب عیب وتحقیر ہو، جس کو اردو میں ''گالی'' کہتے ہیں، اللہ کے لئے اولاد کا قائل ہونا جیسا کہ یہود حضرت عزیر کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا اور مشرکین ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں، یہ اللہ کو شتم کرنا اور عیب کی نسبت اللہ کی طرف کرنا ہے، کیونکہ العیاذ باللہ اگر اللہ کی اولاد ہے تو وہ اللہ کی ہم جنس ہوگی یا خلاف جنس، اگر ہم جنس ہے تو تعدد قدماء لازم آئے گا جو عند العقلاء باطل ہے، نیز خود پیدا ہونا قدیم ہونے کے منافی ہے، اور اگر وہ اولاد خلاف جنس ہے تو خلاف جنس اولاد کا ہونا انسانوں میں بھی معیوب اور موجب حقارت ہے، تو اللہ کے حق میں موجب عیب وحقارت کیوں نہیں ہوگا، اس لئے اللہ کے لئے اولاد کا قائل ہونا شتم ہے۔

الأحد: جو ذات وصفات میں یکتا ہو، **الصمد**: وہ ذات جو کسی کی محتاج نہ ہو اور باقی سب لوگ اس کے محتاج ہوں، اگر اللہ کے لئے اولاد مانی جائے تو نعوذ باللہ اللہ کا محتاج ہونا بھی لازم آئے گا، کیونکہ اولاد کی ضرورت احتیاج کی وجہ سے ہوتی ہے۔

حضرت سہارنپوریؒ کا ایک شبہ اور حضرت گنگوہیؒ کا جواب:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا: ''**وقالوا اتخذ الله ولداً سبحانه**'' حضرت سہارنپوریؒ نے حضرت گنگوہیؒ کو اپنا شبہ لکھ کر بھیجا کہ (**اتخذ الله ولداً**) مشرکین کا مقولہ ہے اور **سبحانه** ان کی تردید کے لئے اللہ کا قول ہے، تو دونوں کے درمیان وقفِ لازم ہونا چاہئے؟ تاکہ دونوں کے درمیان امتیاز ہوجائے، حضرت گنگوہیؒ نے جواب دیا کہ یہ مشرکین کا ایسا خطرناک قول ہے کہ اس کی تردید بلا وقف لازم

ہے(۱) اللہ کا پاک ارشاد ہے: تَكَادُ السَّمٰوٰتُ وَالارْضِ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا، أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَداً. (۲) یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے ولد ہونے کا دعویٰ ایسی خطرناک بات ہے کہ اس کی وجہ سے آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہوجائے اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیں (کچھ بعید نہیں)

وفی روایۃ ابن عباس الخ: یہ روایت ابوہریرہؓ اور ابن عباسؓ دو صحابہ سے مروی ہے، ابن عباسؓ کی روایت کے الفاظ ابوہریرہؓ کی روایت سے کچھ مختلف ہیں، اس لئے مصنف نے ان کو علیحدہ سے ذکر کیا ہے۔

۲۰ / ۲۱ وَعَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: يُؤْذِيْنِي ابْنُ آدَمَ: يَسُبُّ الدَّهْرَ، وَأَنَا الدَّهْرُ، بِيَدِي الْأَمْرُ، أُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ. (متفق علیہ)(۳)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ شانہ نے ارشاد فرمایا کہ انسان مجھے تکلیف پہنچاتا ہے، زمانہ کو برا کہتا ہے، حالانکہ میں زمانہ ہوں، میرے ہاتھ میں امور ہیں، شب و روز کو میں الٹتا پلٹتا ہوں۔ (بخاری و مسلم)

تشریح حدیث

یہ بھی حدیث قدسی ہے اور اس میں بھی منافی ایمان ایک عمل کا بیان ہے۔

ابن آدم کا اللہ تعالیٰ کو اذیت پہنچانا:

یؤذینی ابن آدم الخ: اللہ تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ ابن آدم مجھے اذیت پہنچاتا ہے، اس طرح کہ جب کوئی نقصان ہوتا ہے یا مرض لاحق ہوتا ہے تو زمانہ پر لعن طعن کرتا ہے، امام خطابیؒ نے لکھا ہے کہ اہل عرب کا مزاج تھا کہ جب بھی کوئی جانی و مالی نقصان ہوتا تو "یاخیبۃ الدھر" (وائے ناکامی زمانہ) جیسے الفاظ سے زمانہ پر سب وشتم کرتے، اور ایسا کہنے والے دو قسم کے لوگ تھے، بعض وہ جو خدا کے وجود کے قائل

(۱) ملفوظات فقیہ الامت ۱/۱۱۳.

(۲) سورۃ مریم: ۶۰، ۶۱.

(۳) أخرجه البخاری فی "التفسیر" ۲/۷۱۵ برقم ٤٦٤٠ و"الأدب" ۲/۹۱۳ برقم ٥٩٤٠ و"التوحید" ۲/۱۱۱٦ برقم ۷۱۹۱، ومسلم فی "کتاب الألفاظ من الأدب وغیرها" ۲/۲۳۷.

نہیں تھے، تمام حوادثات وانقلابات میں زمانہ ہی کو موثر سمجھتے تھے، اس لئے جوبھی نقصان ہوتا تو کہتے: ''ومایھلکنا الا الدھر''اوربعض وہ تھے کہ جوتمام اموراللہ کے ہی قبضہ وقدرت میں جانتے تھے،مگر آفات وبلایا کی نسبت انہیں اللہ کی طرف کرنا پسندنہیں تھا، اس وجہ سے انہیں زمانہ کی طرف منسوب کرکے زمانہ پرلعن طعن کرتے۔[1]

اللہ تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کازمانہ پرسب وشتم مجھ پرسب وشتم ہے، کیونکہ زمانہ میں ہی ہوں، یعنی زمانہ میں جوکچھ ہورہاہے وہ میرے ارادہ ومشیت سے ہورہاہے، رات ودن کی تبدیلی اوران میں رونما ہونے والے انقلابات سب میری جانب سے ہیں، زمانہ تومحض ان کا جائے وقوع اورمحلِ اظہار ہے لہٰذا لوگ اس سے اجتناب کریں۔

زمانہ کو برابھلا کہنے کاحکم:

اگرکوئی زمانہ کوموثرحقیقی سمجھ کر برابھلا کہےتو یہ کفرہے اورایسا شخص دہریہ ہے اوراگرکوئی زمانہ کومؤثر حقیقی سمجھے بغیرایسا کہےتو یہ بھی ممنوع وناجائز ہے تاہم وہ کافرنہیں ہوگا کہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف برائی منسوب نہیں کی۔

وانا الدھر: اس کی ترکیب میں دواحتمال ہیں: (۱) یہ مبتداوخبرہوں، اس صورت میں ''الدھر'' مرفوع ہوگا، اوراصل عبارت ہوگی: **انا خالق الدھر، أو مُصرّفه**، مضاف کوحذف کرکے مضاف الیہ کواس کے قائم مقام کردیا، (۲) الدھرکوظرف قراردیں اورمنصوب پڑھیں ای **انا أُقَلِّبَ اللیلَ والنھارَمدۃَ الدھر**، پہلا احتمال راجح ہے۔

قاضی عیاضؒ نے لکھاہے کہ اس روایت کی بناء پربعض حضرات نے ''الدہر'' کو اسماء الٰہی میں شمارکیاہے، مگرمحققین نے اس کی تردید کی ہے اورکہاہے کہ ''دہر'' اللہ کا نام نہیں ہے، بلکہ دنیا کی از ابتداء تاانتہاء مدت کا نام ہے۔[2]

---

(۱)معالم السنن للخطابي ٤/١٥٨، عمدۃ القاری ١٥/٣٠٨(٦١٨١).

(۲)عمدۃالقاری ١٣/٣٠٦-٣٠٧(٤٨٢٦)وإكمال المعلم٧/١٨٢(٢٢٤٦)

ایک سوال وجواب:

سوال: ایذاء کہتے ہیں: ''إیصال المکروہ إلی الغیر''، یعنی کسی کے ساتھ تکلیف دہ اور ناگوار معاملہ کرنے کو، اور جس کو ایذاء پہنچائی جاتی ہے وہ کمزور ومتاثر ہوتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس سے منزہ ہے، اس کے دو جواب ہیں:

(۱) ایذاء کے لئے تأذی لازم نہیں ہے، یعنی یہ ضروری نہیں کہ تکلیف پہنچ بھی جاوے، بلکہ مراد یہ ہے کہ بندہ تکلیف پہنچانا چاہتا ہے اور بری کوشش کرتا ہے لیکن وہ تکلیف پہنچتی نہیں ہے، محض مشاکلت صوری کی وجہ سے ''یؤذینی'' استعمال کیا گیا ہے۔

(۲) ایذاء کے دو معنی ہیں: ابتدائی وانتہائی، ابتدائی معنی وہی ہیں جو مذکور ہوئے اور انتہائی معنی ہیں: غضب وناراضگی، یہاں یہی انتہائی معنی مراد ہیں، کہ بندہ مجھ کو ناراض کرتا ہے۔[1]

۲۱ / ۲۲ وَعَنْ أَبِیْ مُوْسَی الْأَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَاأَحَدٌ أَصْبَرَ عَلٰی أَذًی يَسْمَعُهُ مِنَ اللّٰهِ يَدْعُوْنَ لَهُ الوَلَدَ، ثُمَّ يُعَافِيهِمْ وَيَرْزُقُهُمْ. (متفق علیه)[2]

ترجمه: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ: حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تکلیف دہ بات پر اللہ تعالیٰ سے زیادہ صبر وتحمل کرنے والا کوئی نہیں، لوگ اس کے لئے بیٹا تجویز کرتے ہیں وہ پھر بھی ان کو عافیت دیتا ہے اور روزی پہنچاتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

اس حدیث میں بھی اللہ کی طرف اولاد کی نسبت کی شناعت وقباحت کا اور حق تعالیٰ شانہ کے غایت حلم وصبر کا بیان ہے۔

اللہ کی طرف اولاد کی نسبت اور اللہ کا حلم وصبر:

ما احد أصبر علی أذی الخ: اللہ سے زیادہ تکلیف کی بات پر صبر کرنے والا کوئی نہیں، صبر کہتے ہیں:

---

(۱) شرح النووي ۲/۲۳۷ (۲۲٤٦) وشرح المشکاة للطیبی ۱/۱۵۳–۱۵٤ (۲۲) وفتح الباری ۸/٤۸٤ (٤۸۲٦)

(۲) أخرجه البخاري ۲/۱۰۹۷ (۷۳۷۸) ومسلم ۲/۳۷٤ (۲۸۰٤)

حبس النفس علی ماتکرہ. یعنی جوبات نفس کوناگوار ہواس کو برداشت کرنا، اللہ سے زیادہ ناگوار بات برداشت کوئی نہیں کرسکتا، العیاذ باللہ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے اولاد بنائی ہے جیسے یہود عزیرعلیہ السلام کواورنصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اورمشرکین ملائکہ کو اللہ کی بیٹی قرار دیتے تھے، یہ اتنی خطرناک بات ہے کہ اس کی وجہ سے آسمان وزمین کا پھٹ کرگرجانا اورنظام عالم کا تہ وبالا ہوجانا مستبعد نہیں، مگراللہ تعالیٰ بندوں کی ان باتوں پرصبر کرتا ہے اوراس کی وجہ سے ان کی ضروریات نہیں روکتا، بدستوران کومصائب وتکالیف سے نجات دیتارہتاہے، اوران کوروزی بہم پہنچاتارہتاہے، مخلوق میں کوئی بھی اس درجہ صبرنہیں کرسکتا۔

ایک سوال وجواب:

یہاں حدیث میں صبرکی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے جس سے اللہ کا ناگواری سے متأثر ہونا لازم آئے گا، حالانکہ حق تعالیٰ شانہ متأثر ہونے سے منزہ ہے؟

جواب: یہ صبرکے ابتدائی معنیٰ ہیں اورانتہائی معنی ہیں تاخیر العذاب عن مستحقہ کہ مستحقِ عذاب سے عذاب کومؤخرکرنا، یہاں یہی معنی مراد ہیں۔

اسم الٰہی صبوروحلیم کے معنی اوردونوں میں فرق:

اس معنی کی رو سے اللہ تعالیٰ کا ایک نام ''صبور'' بھی ہے اوراس کے ہم معنی ایک دوسرانام ''حلیم'' بھی ہے، مگردونوں میں فرق ہے، ''حلیم'' میں ''صبور'' کی بہ نسبت صفت رحمت زائد ہے، اس لئے کہ ''صبور'' کا مطلب ہے عذاب کومؤخرکرنے والا، جس کا مفہوم یہ ہوا کہ بعد میں عذاب ہوسکتا ہے، اور''حلیم'' کے معنی ہیں عذاب پرقدرت کے باوجود درگزرکرنا اور بالکل معاف کردینا۔ یہاں یہی معنیٰ مراد ہیں۔ (۱)

۲۳/ ۲۴ وَعَنْ مُعَاذٍؓ قَالَ :كُنْتُ رِدْفَ النَّبِيِّ صلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى حِمَارٍ، لَيْسَ بَيْنِىْ وَبَيْنَهٗ إلا مُؤَخِّرَةُ الرَّحْلِ، فَقَالَ: "يامُعاذُ! هَلْ تَدْرِيْ مَاحَقُّ اللّٰهِ عَلٰى عِبَادِهٖ؟ وَمَاحَقُّ العباد عَلَى اللّٰهِ؟ "قلتُ: اللّٰهُ ورسولُه اَعْلَمُ، قال: فَإِنَّ حقَّ اللّٰهِ عَلَى العِبَادِ أَنْ يَعْبُدُوْهُ وَلايُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئاً، وَحَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ أَنْ لايُعَذِّبَ مَنْ

(۱) شرح النووی ۲/ ۲۷۴.

لایُشْرِکُ بِہٖ شَیْئاً قُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ !أَفَلا أُبَشِّرُبِہِ النَّاسَ؟ قال: لاتُبَشِّرْھُمْ فَیَتَّکِلُوْا. (متفق علیہ)(۱)

ترجمہ: حضرت معاذؓ سے مروی ہے کہ (ایک سفر میں) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک گدھے پر (جس کا نام عفیر تھا) بیٹھا ہوا تھا، میرے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف کجاوہ کا پچھلا حصہ حائل تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معاذ! جانتے ہو بندوں پر اللہ کا کیا حق ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ جانتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کرے اور کسی کو اس کا شریک نہ مانے، اور اللہ پر بندوں کا حق یہ ہے کہ جس نے کسی کو اللہ کا شریک نہیں قرار دیا اس کو عذاب نہ دے، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا میں یہ خوشخبری لوگوں کو سنادوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں کو یہ خوشخبری نہ سناؤ ورنہ وہ اسی پر بھروسہ کرکے بیٹھ جائیں گے (اور عمل کرنا چھوڑ دیں گے)۔ (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

احوال معاذ بن جبل:

معاذ بن جبل الانصاری الخزرجی، آپ کی کنیت ابوعبداللہ ہے، عقبۂ ثانیہ میں شریک تھے، جلیل القدر اور قدیم الاسلام صحابی ہیں، اللہ نے ان کو تفقہ سے نوازا تھا، اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو "اعلمھم بالحلال والحرام" کے خطاب سے نوازا، بہت ہوشیار اور با استعداد تھے، اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بہت محبت تھی اور تعلق تھا، تمام غزوات میں شریک رہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی حیات میں یمن کا قاضی بنا کر بھیجا، حضرت عمرؓ نے ان کو ملک شام کا گورنر بنایا، وہیں ۱۸ھ میں طاعون "عمواس" میں آپ کی وفات ہوئی، کل عمر ۳۸ سال ہوئی، اور ایک قول کے مطابق

(۱) أخرجه البخاری فی خمسة مواضع "الجهاد" ۱/۴۰۰ برقم ۲۷۷۱، و"اللباس" ۲/۸۸۲ برقم ۵۷۳۳، و"الاستیذان" ۲/۹۲۷ برقم ۶۰۲۶، و"الرقاق" ۲/۹۶۲ برقم ۶۲۱۵، و"التوحید" ۲/۱۰۹۶ برقم ۱۰۹۶–۱۰۹۷، ومسلم فی "الإیمان" ۱/۴۴.

۳۴ سال ہوئی، مگر بڑے بڑے صحابہ حضرت عمر، ابن عمر، ابن عباس وانس وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں۔ (۱)

ایمان کی اہمیت کا بیان:

اس حدیث میں اورآگے چند احادیث میں ایمان کی اہمیت اور فائدہ بیان کیا گیا ہے، ان احادیث کے ظاہر سے محض ایمان کا نجات کے لئے کافی ہونا اوراعمال کا ضروری نہ ہونا مفہوم ہوتا ہے؛ حالانکہ اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک اعمال بھی ضروری ہیں، یہاں اولا ان احادیث کا ترجمہ وتشریح بیان کی جائے گی، اس کے بعد ان مجموعی روایات کے متعدد جوابات تحریر کئے جائیں گے جس سے ان روایات کا صحیح مطلب واضح ہوجائے گا اور دیگر نصوص جن سے اعمال کا ضروری ہونا ثابت ہوتا ہے ان نصوص کے ساتھ ان احادیث کی مطابقت بھی معلوم ہوجائے گی۔

کنت ردف النبی صلی اللہ علیہ وسلم : حضرت معاذ بن جبل ایک واقعہ بیان کررہے ہیں، اگلی حدیث میں بھی یہی واقعہ مذکور ہے، لیکن اس حدیث میں خود صاحبِ واقعہ حضرت معاذؓ بیان کررہے ہیں اوراگلی حدیث میں حضرت معاذ کے حوالہ سے حضرت انسؓ نے بیان کیا ہے، فرماتے ہیں کہ میں گدھے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ردیف بنا ہوا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گدھے پرسوار ہونا اورآپ کے گدھے کا نام:

"ردیف" کے معنی ہیں: "الذی یرکب خلف الراکب" (سوار کی اجازت سے سوار کے پیچھے بیٹھنے والا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری گدھے کی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ گدھے کی سواری جائز ہے اورآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال تواضع بھی معلوم ہوئی کہ دوجہاں کے سردار گدھے پر بھی سواری فرماتے، یہ بھی ثابت ہوا کہ جانور پردوآدمیوں کا سوار ہونا سواری پرظلم نہیں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس گدھے کا نام "عفیر" تھا، لہٰذا گدھے اوردوسرے جانوروں کے نام بھی رکھے جاسکتے ہیں، امام بخاری نے اس کے اثبات کے لئے کتاب الجہاد میں "باب اسم الفرس والحمار" کے نام سے عنوان قائم کیا ہے۔ (۲)

---

(۱) الإصابة ٥/١٥٤—١٥٥ ط دارالفكر، سير اعلام النبلاء ١/٤٤٣—٤٦١.

(۲) بخاری شریف ١/٤٠٠.

إلامؤخرةالرحل: "رحل" بمعنی کجاوہ "مؤخرة" بضم المیم وکسر الخاء المعجمہ: کجاوہ کے پیچھے کی لکڑی، جس پر سوار ٹیک لگالیتا ہے آرام کے لئے، حضرت معاذؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ کجاوہ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، اس جملہ کا مقصد اپنے غایت قرب کو بیان کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ جو حدیث میں بیان کررہاہوں وہ مجھے اچھی طرح محفوظ ہے، میں نے یہ روایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت نزدیک سے سنی ہے، (۱) بعض نے کہا کہ حالات بیان کرنے کا مقصد استلذاذ ہے کیوں کہ محبوب کے حالات میں محبّ کو لذت محسوس ہوتی ہے۔

فقال یامعاذ!هل تدری الخ: حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پکارا: اے معاذ! یہاں ایک مرتبہ پکارنا مذکور ہے اوراگلی حدیث میں تین مرتبہ پکارنے کا تذکرہ ہے، ظاہر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ ہی پکارا ہوگا، یہاں راوی نے اختصار کیا ہے، تین مرتبہ پکارنا کمال توجہ اور کمال اصغاء کے لئے تھا، تاکہ آنے والے مضمون کی اہمیت واضح ہوجائے، پکارنے کے بعد فرمایا اے معاذ! کیا تم جانتے ہو کہ بندوں پر اللہ کا کیا حق ہے؟ اور بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے؟ حضرت معاذؓ نے معذرت فرمائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ صرف اسی کی عبادت کریں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور بندوں کا حق اللہ پر یہ ہے کہ جو بندہ اللہ کے ساتھ شرک نہ کرے اللہ اس کو عذاب نہ دے۔

یہاں لفظ "حق" دومرتبہ آیا ہے: "**حق الله علی العباد**" اور "**حق العباد علی الله**" پہلی جگہ "حــق" لزوم ووجوب کے معنی میں ہے، کیونکہ اللہ کی عبادت اور شرک سے اجتناب بندوں پر لازم ہے اور دوسری جگہ "حــــق" مناسب اور لائق کے معنی میں ہے، کیونکہ اہل سنت والجماعۃ کے عقیدہ کے مطابق اللہ پر کچھ لازم وواجب نہیں، محض مشاکلۃً اور مقابلۃً اس کو "حـــــق" کہد یا گیا ہے، یا پھر اللہ نے اپنے فضل واحسان کی وجہ سے ایسے شخص کو عذاب نہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے اللہ کے وعدہ کی بنا پر اس کا حصول ایسا یقینی ہے جیسے واجب چیز یقینی ہوتی ہے، اس لحاظ سے لفظ "حق" لایا گیا ہے۔

---

(۱) المرقاة ۱ / ۱۷۲. لفظ "مؤخرة" میں تین ضبط ہیں (۱) میم کا ضمہ اس کے بعد ہمزہ ساکنہ اور خاء مکسورہ (مؤخِرة) (۲) میم کا ضمہ بعدہ ہمزہ مفتوحہ اور خاء مکسورہ مشددہ (مؤَخِّرة) (۳) میم کا ضمہ بعدہ ہمزہ اور خاء مشددہ کا فتحہ (مُـؤخَّـرَة) راجح ضبط اول ہے۔ (المرقاة ۱ / ۱۷۲)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ محض ایمان کی وجہ سے آدمی جنت میں داخل ہو جائے گا۔

''لاتبشرهم فيتكلوا الخ'' حضرت معاذ نے پوچھا یارسول اللہ: کیا میں لوگوں کو اس بات کی بشارت نہ دیدوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ پھر لوگ اسی پر بھروسہ کرلیں گے اور اعمال کی طرف توجہ نہیں دیں گے۔

''فيتكلوا'' یہ ''اتکال'' باب افتعال سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے، اور نہی کا جواب ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، جس کی وجہ سے نون اعرابی حذف ہوگیا ہے، معنی ہیں: بھروسہ کرنا۔(۱)

۲۴ / ۲۵ وَعَنْ أَنسٍؓ: أن النبيَ صلى الله عليه وسلمَ –ومعاذٌ رَدِيْفُهُ عَلَى الرَّحْلِ– قال: "يامُعاذُ!" قال: لَبَّيْکَ يَارَسُوْلَ اللّٰه وَسَعْدَيْکَ، قال: "يَامُعَاذُ!" قال: لبيک يارسولَ الله وسعديک، قال: "يامعاذُ!" قال: لبيک يارسولَ الله وسعديک ثلاثاً قال: "مامِنْ أَحَدٍ يَشْهَدُ أَنْ لاإلهَ إلاّ اللّٰه وأَنَّ محمداً رسولُ اللّٰهِ، صِدْقاً مِنْ قَلْبِهِ إلاَّ حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ" قال: يارسول الله! أَفَلاأُخبِرُبه النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُوْا؟ قال: "إذاً يَتَّكِلُوْا" فَأَخْبَرَ بها مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِهِ تَأَثُّماً. (متفق عليه)(۲)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت جبکہ سواری پر آپ کے پیچھے معاذ بیٹھے ہوئے تھے، فرمایا: اے معاذ! انہوں نے عرض کیا: حاضر ہوں یارسول اللہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: اے معاذ! انہوں نے عرض کیا: حاضر ہوں یارسول اللہ، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے پھر تیسری مرتبہ مخاطب فرمایا: اے معاذ! انہوں نے پھر عرض کیا: یارسول اللہ حاضر ہوں، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ کا جو بندہ سچے دل سے اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں تو اس پر اللہ تعالی دوزخ کی آگ حرام کردیتا ہے، یہ سن کر حضرت معاذؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا میں اس کی خبر لوگوں کو دیدوں کہ وہ خوش ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، لوگ پھر اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے (اور عمل کرنا چھوڑ

(۱) المرقاة ۱ / ۱۷۳.

(۲) أخرجه البخاري في "العلم" ۱ / ۲٤ برقم ۱۲۸ و ۱۲۹ ومسلم "فيه" ۱ / ٤٦.

دیں گے)، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذؓ نے (کتمان علم) کے گناہ کے خوف سے اپنی موت کے وقت اس حدیث کو بیان کر دیا تھا۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

اس حدیث میں بھی وہی واقعہ ہے، البتہ یہاں راوی حضرت انسؓ ہیں اوراس میں تین مرتبہ پکارنے کا ذکر ہے۔

لبیک وسعدیک کی تحقیق:

لبیک یارسول اللہ وسعدیک : لبیک اصل میں ''لبین'' تثنیہ تھا، کاف ضمیر کی طرف اضافت کی وجہ سے نون ساقط ہوگیا، یہ اُلَبِّی فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے، جووجوباً محذوف ہے، اصل عبارت ہے : **البی لک لبین** ، تکرار کے معنی پیدا کرنے کے لئے تثنیہ لایا گیا ہے، اس لئے معنی ہوں گے: **أجبتُک اجابةً بعد أجابةٍ** یعنی میں بار بار تعمیل حکم میں حاضر ہوں، اسی طرح **سعدیک** کی ترکیب ہے اوراس کی اصل عبارت ہے: **ساعدتک مساعدةً بعد مساعدةٍ** یعنی میں مسلسل تعاون کے لئے حاضر ہوں۔ (۱)

شہادتین کا اقرار کرنے والے پر جہنم حرام:

مامن احد یشهد ان لااله الا الله الخ : تین مرتبہ پکارنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی سچے دل سے اللہ کے ایک ہونے کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کی گواہی دے گا اللہ اس کو جہنم پرحرام کر دیں گے، حضرت معاذ نے پوچھا کہ کیا میں لوگوں کو اس کی بشارت نہ سنادوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا: راوی کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق حضرت معاذ نے یہ حدیث لوگوں کو نہیں بتائی، البتہ جب ان کا انتقال ہونے لگا تو کتمان علم کے گناہ کے خوف سے یہ حدیث سنائی، کتمان علم پر وعید آئی ہے کہ ایسے شخص کو قیامت میں آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔ (۱)

(۱) موسوعة علوم اللغة العربية ۷ / ۵۰۰.

(۲) عن أبی هریرةؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: من سئل عن علم علمه ثم کتمه ألجم یوم القیامة بلجام من نار رواه احمد وأبوداود والترمذی، مشکوة ۱ / ۳٤.

علماء نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ ممانعت ابتداء اسلام میں تھی، جب صحابہ اعمال میں پختہ نہیں ہوئے تھے اس وقت یہ اندیشہ تھا کہ لوگ اس پر بھروسہ کرلیں گے اور اعمال نہیں کریں گے، لیکن جب صحابہ اعمال میں پختہ ہوگئے اور اعمال کی اہمیت سے وہ واقف ہوگئے تو پھر ممانعت نہیں رہی، چنانچہ بعد میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت سنائی ہے جیسا کہ ابوہریرہؓ کی روایت میں آئندہ آرہا ہے۔

۲۵/۲۶ وَعَنْ أَبِیْ ذَرٍّ رضی الله عنه قال: أَتیتُ النبيَ صلى الله عليه وسلم- وَعَلَيْهِ ثَوْبٌ أَبْيَضُ، وهو نائمٌ، ثم أَتَيْتُهُ وقد اسْتَيْقَظَ- فقال: "مَامِنْ عَبْدٍ قال: لاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ،ثم ماتَ عَلىٰ ذٰلِک؛ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ"قلت: وإِنْ زَنٰی وَإِنْ سَرَقَ؟ قال: وَإِنْ زَنٰی وَإِنْ سَرَقَ" قلتُ: وَإِنْ زَنٰی وَإِنْ سَرَقَ؟ قال: "وَإِنْ زَنٰی وَإِنْ سَرَقَ" قلت: وَإِنْ زَنٰی وَإِنْ سَرَقَ؟! قَالَ: "وَإِنْ زَنٰی وَإِنْ سَرَقَ عَلٰی رَغْمِ أنْفِ أَبِیْ ذَرٍّ"وكان أبو ذر إِذَا حَدَّثَ بهذاقال: وإِنْ رَغِمَ أَنْفُ أَبِیْ ذَرٍّ. (متفق علیہ)(۱)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفید کپڑا اوڑھے ہوئے سو رہے تھے (اس وقت تو میں واپس چلا آیا) پھر دوبارہ آپ علیہ الصلوۃ والسلام کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوا جبکہ آپ بیدار ہو چکے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے صدق دل سے لاالہ الا اللہ کہا اور اسی عقیدہ پر انتقال ہوگیا تو وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا، میں نے عرض کیا: اگرچہ اس نے چوری اور زنا کا ارتکاب کیا ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں خواہ وہ چوری اور زنا کا مرتکب کیوں نہ ہو، میں نے پھر سوال کیا اگرچہ اس نے چوری اور زنا کا ارتکاب ہی کیوں نہ کیا ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں خواہ وہ چوری اور زنا کے جرم کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو (میں نے سہ بارہ پھر) عرض کیا اگرچہ اس نے چوری اور زنا کا ارتکاب کیا ہو؟

(۱) أخرجه البخاری فی ثمانية مواضع: "الجنائز"۱/۱۶۵برقم ۱۲۲۳، و"الاستقراض" ۱/۳۲۱ برقم ۲۳۲۶و"بدء الخلق" ۱/۴۵۷ برقم ۳۱۱۸، و"اللباس"۲/۸۶۶ برقم ۵۵۹۸، و"الإستيذان"۲/۹۲۷برقم ۶۰۲۷، و و"الرقاق"۲/۹۵۳برقم ۶۱۹۴، و۶۱۹۵، و"التوحيد"۲/۱۱۱۵برقم ۷۱۸۷ ومسلم "الإيمان"۱/۶۶.

(تیسری مرتبہ بھی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا: ہاں خواہ وہ چوری اور زنا کا مرتکب کیوں نہ ہوا ہو، ابوذر کی ناک خاک آلود ہونے کے باوجود، راوی کہتے ہیں کہ جب بھی حضرت ابوذرؓ یہ حدیث بیان کرتے (بطور فخر) اس آخری جملہ ''وإن رغم أنف أبي ذر'' کو ضرور نقل فرماتے۔(بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

احوال ابوذر غفاریؓ:

ابوذر کنیت ہے، مشہور قول کے مطابق ان کا نام جندب بن جنادہ الغفاری ہے، قبیلہ ''غِفار'' کے تھے، مکی زندگی میں ایمان لائے، بعض نے کہا کہ پانچویں نمبر پر ایمان لائے، اسلام کی وجہ سے بڑی مشقتیں اٹھائی ہیں، کفار مکہ نے ان کو بہت مارا تھا جس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان کے قبیلہ میں بھیج دیا اور فرمایا: کہ جب ہمارے غلبہ کی خبر سنو اس وقت آجانا، چنانچہ ہجرت کا حکم آنے کے بعد غزوۂ خندق کے سال یعنی ۵ھ میں مدینہ تشریف لائے، ان پر زہد اور فکر آخرت کا بہت غلبہ تھا، ضرورت سے زائد مال جمع کرنے کو ناجائز سمجھتے تھے، اور ایسا کرنے والوں پر سختی کرتے تھے، لوگوں سے اس بارے میں جھگڑتے تھے، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں مدینہ طیبہ سے باہر مقام ربذہ میں رہنے لگے تھے، وہاں کوئی آبادی بھی نہیں تھی، مقام ''ربذہ'' میں ہی ۳۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا، انتقال کے وقت کوئی نہیں تھا جو تجہیز وتدفین کے فرائض انجام دے، اہلیہ پریشان ہوئی تو ابوذرؓ نے فرمایا کہ: کچھ دیر کے بعد یہاں سے ایک قافلہ گزرے گا ان کو خبر کردینا وہ کفن دفن کا نظم کریں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہاں سے حضرت ابن مسعودؓ اور ان کے رفقاء جو کوفہ سے آرہے تھے گذرے، اہلیہ نے اطلاع دی ان لوگوں نے آپ کی تکفین وتدفین کی، ان کے بڑے فضائل ہیں اور کثیر الروایات صحابی ہیں۔(۱)

کلمۂ ایمان کی برکت اور فائدہ:

اس حدیث میں کلمۂ ایمان کے فائدہ کا بیان ہے، حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفید کپڑا اوڑھے ہوئے سو رہے

(۱) الإصابة ٦/٨٤–٨٧، سير اعلام النبلاء ٢/٤٦–٧٨.

تھے، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بیدار نہیں کیا، واپس آ گئے، معلوم ہوا کہ بڑے آدمی کو بلاضرورت بیدار نہیں کرنا چاہئے اور وہاں بیٹھنا بھی نہیں چاہئے، لوگ اس کو برا سمجھتے ہیں کہ سونے کی حالت میں کوئی ان کے پاس بیٹھا رہے، حضرت ابوذرؓ کچھ دیر کے بعد دوبارہ حاضر ہوئے، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہو گئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص لا الہ الا اللہ کہے وہ جنت میں داخل ہوگا، حضرت ابوذر یا تو یہی سوال کرنے کے لئے آئے تھے، یا ویسے ہی ملنے آئے تھے، مگر سونے کی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس مضمون کا القا ہوا ہو، تو بیداری کے فوراً بعد ابوذرؓ کو وہ مضمون سنایا۔

لاالـه الا الله سے پوراکلمہ مراد ہے، اختصاراً دوسرا جزو چھوڑ دیا، اور **ثـم مات على ذالك** کی قید لگا کر مرتد کو نکال دیا کہ وہ اس بشارت کے تحت داخل نہیں ہوگا۔

قـلـت: وان زنى وان سرق : حضرت ابوذرؓ کو تعجب ہوا اس لئے پوچھا: **وإن زنـى وإن سرق ؟** تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، چاہے اس نے چوری وزنا کیا ہو، اس جملہ میں واو مبالغہ کے لئے اور "اِن" وصلیہ ہے، شرطیہ نہیں، اسی طرح دوبارہ اور سہ بارہ کہا، تیسری مرتبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: **على رغم انف ابى ذر**، یعنی ابوذر کی ناک خاک آلود ہونے کے باوجود۔

"**رغـم**" بمعنی خاک آلود ہونا، یہ اصلاً بددعا ہے، ذلت کے لئے بولا جاتا ہے، لیکن اہل عرب اس کو بہت سی مرتبہ تعجب پر نکیر کرنے کے لئے بولتے ہیں، یہاں یہی مقصد ہے کہ اس بات پر تمہیں تعجب نہیں کرنا چاہئے، راوی کہتے ہیں کہ حضرت ابوذرؓ جب بھی اس حدیث کو بیان فرماتے تو بطور استلذاذ کے کہتے:

وان رغم انف أبی ذر. (۱)

اس حدیث سے بھی یہی معلوم ہوا کہ صرف کلمہ پڑھنے سے آدمی کو جنت کا داخلہ مل جائے گا۔

صرف سرقہ اور زنا کا ذکر کیوں؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں صرف دو گناہوں کو ذکر کیا کیوں کہ زنا میں حق اللہ کا ضیاع ہے اور سرقہ میں حق العباد کا ضیاع ہے مراد حقوق اللہ اور حقوق العباد ہیں کہ اگر ان حقوق کو بھی توڑا ہو تب بھی جنت میں داخل ہوگا۔

---

(۱) فتح الإله ۱ / ۳۲۲.

۲۶/ ۲۷ وعن عبادة بن الصامت رضی اللہ عنہ قَالَ: قال رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: "مَنْ شَهِدَ أَنْ لاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وحدَهُ لاشَرِيْكَ لَهُ وَأَنَّ محمداً عبدُهُ ورسولُه، وَأَنَّ عِيْسٰى عبدُاللّٰهِ ورسولُه وابْنُ أَمَتِهِ وكلمتُه ألقاها إلىٰ مَرْيَمَ، وروحٌ مِنْهُ، والجنةُ والنَّارُ حَقٌّ؛ أدخلَهُ اللّٰهُ الجنةَ عَلٰى ما كانَ مِنَ الْعَمَلِ"، (متفق عليه)[1]

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جوشخص اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور کوئی اس کا شریک نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور یہ کہ عیسیٰ اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور اللہ کی بندی مریم علیہا السلام کے بیٹے اور اللہ کا کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم کی طرف ڈالا تھا اور اللہ کی (بھیجی ہوئی) روح ہیں اور یہ کہ جنت و دوزخ حق ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں ضرور داخل کرے گا خواہ وہ کسی بھی عمل پر ہو۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

اس حدیث میں بھی کلمہ اور ایمان کا فائدہ بیان کیا گیا ہے۔

اسلامی عقائد کا تذکرہ اور باطل عقائد کی تردید:

مضمون حدیث یہ ہے کہ جوشخص اللہ کے ایک ہونے کی گواہی دے اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں (چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب مشرکین کے علاوہ یہود ونصاریٰ بھی تھے، اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں افراط وتفریط میں مبتلا تھے، اس لئے بالخصوص عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق صحیح عقیدہ رکھنے کی تلقین فرمائی، چنانچہ فرمایا کہ) اور جو اس کی بھی گواہی دے کہ عیسیٰ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، **عبداللہ** کہہ کر نصاریٰ کی تردید فرمائی کیونکہ وہ ان کو ابن اللہ مانتے تھے، اور "**رسوله**" سے یہود کی تردید کی کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو رسول نہ مانتے بلکہ اللہ کا دشمن کہتے تھے۔

وابن أمته: اس میں بھی نصاری کی تردید ہے کیونکہ نصاری حضرت مریم کو العیاذ باللہ اللہ کی بندی کے بجائے اللہ کی بیوی کہتے تھے، "امۃ" کی اضافت اللہ کی طرف بطور تشریف وتکریم کے ہے ورنہ سب عورتیں

(۱) أخرجه البخاري في "الأنبياء" ۱/ ۴۸۸ برقم ۳۳۲۰ ومسلم "الإيمان" ۱/ ۴۳.

امۃ اللہ ہیں۔[۱]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "کلمۃ اللہ" کہنے کی وجوہات:

وکلمته الخ: یہ لفظ قرآن کریم میں بھی ہے، عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا کلمہ کہنے کی کئی وجہیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے خلاف عادت بچپن میں کلام کیا تھا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے "**قال انی عبدالله الخ**" اس لئے ان کو اللہ کا کلمہ کہا۔

(۲) بعض نے کہا کہ آپ اللہ کے کلمہ "کن" سے بغیر باپ کے واسطہ کے پیدا ہوئے ہیں۔

(۳) آپ کا کلام بہت موثر تھا تاثیر کلام کی وجہ سے ان کو کلمۃ اللہ کہا جاتا ہے۔

(۴) کلام عرب میں کلمہ "حجت" کو بھی کہتے ہیں، کہا جاتا ہے: **هو كلمة الاسلام أي حجة الاسلام** ان کا بغیر باپ کے پیدا ہونا یہ بعث بعد الموت کی حجت ودلیل ہے، پس اس معنی میں ان کو "کلمہ" کہا گیا ہے۔[۲]

وروح منه: یہ لفظ بھی قرآن میں ہے، اس کے معنی ہیں **ذی روح منه**[۳] یعنی اللہ کی طرف سے روح والے ہیں "**منه**" میں "من" "تسخیر کے لئے ہے تبعیض کا نہیں ہے، یعنی ایسی روح والے ہیں جو اللہ کی طرف سے مسخر وتابع ہے، جبکہ نصاریٰ "من" کو تبعیضیہ مانتے ہیں اور اس بناء پر حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں، جو بناء الفاسد علی الفاسد کے قبیل سے ہے۔

ایک عیسائی کا استدلال اور ایک مسلمان عالم کا جواب:

ملا علی قاری نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ: ایک مجلس میں ایک عیسائی نے ایک قاری کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو اس نے کہا کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا وہی عقیدہ ہے جو عیسائیوں کا ہے کہ عیسی اللہ کا جز ویعنی بیٹے ہیں، مجلس میں علی بن حسین بن واقد بھی تھے، انہوں نے اس کو جواب دیتے ہوئے فوراً آیت پڑھی "**وسخر لكم مافي السموات ومافي الارض جميعاً منه**" اور فرمایا کہ اگر اس

(۱) شرح الطيبی ۱/ ۱٦٧.

(۲) شرح الطيبی ۱/ ۱٦٨.

(۳) فتح الإله ۱/ ۳۲٥.

آیت میں ''من'' کو تبعیض کا قرار دیا جائے تو تمام مخلوق کا اللہ کا بیٹا ہونا ثابت ہوگا جس کے قائل تم بھی نہیں ہو، اس سے وہ عیسائی مبہوت ہوگیا اور مسلمان ہوگیا۔ (۱)

عیسیٰ علیہ السلام کو ''روح'' کہنے کی وجوہات:

عیسیٰ علیہ السلام کو روح کہا گیا جس کی دو وجہیں ہیں:

(۱) اللہ کے حکم سے جبرئیل علیہ السلام نے ان کی والدہ کے گریبان میں ان کی روح پھونکی تھی، توان کی روح پھونکنے کی چونکہ منفرد شکل اختیار کی گئی اس لئے ان کو ''روح'' کہا گیا۔

(۲) وہ لوگوں کے لئے حیات جسمانی اور حیات روحانی کا سبب تھے، ایمان کی دعوت دیتے تھے یہ حیات روحانی ہے اور بطور معجزہ مردوں کو زندہ کرتے تھے، یہ حیات جسمانی ہے، پس بطور مبالغہ ان ہی کو ''روح'' کہد یا گیا۔ (۲)

والجنة والنار حق: یہ بھی ایک مؤمن بہ ہے کہ جنت وجہنم کے حق ہونے کو تسلیم کیا جائے۔

حدیث کا حاصل یہ ہوا جس کے عقائد صحیح ہوں اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا، چاہے اس کا عمل کیسا ہی ہو، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایمان نجات کے لئے کافی ہے، نیز یہود ونصاری میں سے جو بھی ایمان لائے گا اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی اپنا عقیدہ صحیح کرنا ہوگا اسی وقت اس کا ایمان قبول ہوگا۔

۲۷/ ۲۸ وعن عمرو بن العاصؓ قال: أَتَيت النبيَّ صلى الله عليه وسلم، فقلت: أُبْسُطْ يمينَكَ فَلِأُبايِعَكَ، فَبَسَطَ يَمِيْنَهُ، فَقَبَضْتُ يَدِيْ، فَقَالَ: مَالَكَ يَاعَمْرو؟ قلت: أردتُ أَنْ أَشْتَرِطَ، فَقَالَ: "تَشْتَرِطُ مَاذَا؟" قُلْتُ: أن يُغْفَرَلِيْ، قال: "أَمَا عَلِمْتَ يَاعَمْرُو أَنَّ الإسلامَ يَهْدِمُ ماكانَ قبلَه، وأَنَّ الهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَاكانَ قبلَها، وَأَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ ماكان قبلَه؟!" (رواه مسلم) (۳) وَالْحَدِيْثَان الْمَرْوِيَّان عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ:

(۱) المرقاة ۱/ ۱۷۷.

(۲) شرح الطيبى ۱/ ۱۶۸.

(۳) أخرجه مسلم فى "الإيمان" ۱/ ۷۶.

قَالَ اللّٰـهُ تعالى: أَنا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ والآخَرُ: "الكبرياءُ رِدَائي" سنذكرهما في باب الرياء والكبر إن شاء الله تعالىٰ.

ترجمہ: حضرت عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اورعرض کیا یارسول اللہ! اپنا ہاتھ پھیلایئے تا کہ میں آپ سے بیعت کروں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جب) اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، آپ نے (تعجب سے) فرمایا عمرو! تمہیں کیا ہوا؟ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں کچھ شرط کرنا چاہتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا شرط ہے؟ میں نے عرض کیا: (میں چاہتا ہوں کہ) میرے (ان تمام) گناہوں کو معاف کردیا جائے (جو میں نے اسلام سے پہلے کئے تھے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمرو! کیا تم نہیں جانتے کہ اسلام ان تمام گناہوں کو مٹادیتا ہے، جو اسلام سے پہلے کیے گئے ہوں، ہجرت ان تمام گناہوں کو ختم کردیتی ہے جو اس سے پہلے کیے گئے ہوں، اور حج ان تمام گناہوں کو مٹادیتا ہے جو اس سے پہلے کئے گئے ہوں۔ (مسلم) اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ دونوں حدیثیں یعنی "قال اللہ تعالی انا أغنى الشركاء عن الشرك الخ اور" الكبرياء ردائي الخ" ریااور کبر کے باب میں نقل کی جائیں گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

تشریحِ حدیث

احوال عمروؓ بن عاصؓ بن وائل:

عمرو آپ کا نام ہے، ابوعبداللہ کنیت ہے، آپ کے والد عاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت دشمن تھے، عمرو بھی پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے دشمن تھے، لیکن پھر ۸ھ کے اوائل میں فتح مکہ سے قبل اسلام لے آئے اور بڑے صحابی بنے، بہت ہوشیار و عقلمند تھے، عقلاء عرب میں اُن کا شمار ہوتا تھا، ایسے چند حضرات تھے عمرو بن عاص، مغیرہ بن شعبہ، حضرت معاویہ، حضرت خالد بن ولید وغیرہ، یہ حضرات بڑے بڑے بہادر بڑے شجاع اور بہت عقلمند اور بہت صلاحیت والے تھے، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان حضرات کو جہاد میں امیر لشکر بنایا کرتے تھے، حضرت عمروؓ، حضرت عمرؓ کے زمانے میں فوجوں کے جرنل تھے، انہوں نے

ہی مصر فتح کیا ہے، حضرت عمرؓ ان کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اللہ نے ان کو دنیا میں امیر بننے ہی کے لئے پیدا کیا ہے، کسی نے ان سے پوچھا کہ تم نے اسلام قبول کرنے میں کیوں تاخیر کی؟ جبکہ تمہارا شمار عرب کے عقلاء میں ہوتا تھا؟ انہوں نے کہا کہ عرب میں ہم سے بھی بڑے لوگ تھے، جن کی عقلوں کا موازنہ پہاڑوں سے کیا جاتا تھا، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو تسلیم نہیں کیا، ہم نے بھی ان کی اقتداء کی، جب وہ ختم ہوگئے اور ہم بڑے ہوگئے تو ہم نے پھر خود غور کیا اور آپ کی حقانیت صاف محسوس ہوئی، تو ہمارے قلب میں اسلام کی محبت بیٹھ گئی اور ہم نے اسلام قبول کرلیا، قریش نے جن لوگوں کو شاہِ حبشہ سے مہاجر صحابہ کو واپس لانے کے لئے بھیجا تھا، یہ بھی ان میں شامل تھے۔(۱)

عمرو بن العاصؓ کے قبول اسلام کا واقعہ:

اس حدیث میں عمرو بن العاص اپنے ایمان لانے کا واقعہ بتاتے ہیں کہ ہم مکہ مکرمہ سے آئے، حضرت خالد بن ولید بھی ساتھ تھے، میں نے بیعت اسلام کرنا چاہی اور درخواست کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا ہاتھ پھیلادیں، چنانچہ آپ نے ہاتھ پھیلایا، لیکن میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھیں کیا ہوا؟ عرض کیا: میں کچھ شرط لگانا چاہتا ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا شرط لگانا چاہتے ہو؟ حضرت عمرو بن عاص نے عرض کیا: میری شرط یہ ہے کہ میرے پچھلے گناہ معاف کردیئے جائیں، مطلب یہ کہ ان کو اپنے پچھلے اعمال پر ندامت تھی اور ذہن میں یہ تھا کہ اگر اسلام لانے کے باوجود گناہ معاف نہ ہوں تو اسلام لانے کا فائدہ کیا؟

اسلام اور اعمال صالحہ سے گناہوں کی معافی:

اما علمت یاعمرو! ان الاسلام الخ :حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھیں یہ معلوم نہیں کہ اسلام پچھلے سب گناہوں کو ختم کردیتا ہے؟ نیز فرمایا کہ اسلام کی بات تو بڑی ہے، اسلام لانے کے بعد شریعت میں بہت سے اعمال ایسے ہیں جو گناہوں کو ختم کردیتے ہیں، چنانچہ ہجرت سے بھی گناہ معاف

(۱) طبقات ابن سعد ۷/۳٤۲، تاریخ دمشق ٤٦/۱۱۲، سیر أعلام النبلاء/ ٥٥، الإصابه ٤/٤٤، رقم الترجمه ٥٨٨٢ مطبوعه : دارالفکر بیروت لبنان.

ہوجاتے ہیں اور حج سے بھی گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

علماء نے فرمایاہے کہ اس میں تفصیل ہے: اسلام لانے والا اگر کافر حربی ہے تو اس کے تمام گناہ ختم ہوجاتے ہیں سوائے مسلمانوں کے مالی حقوق کے، اور اگر کافر ذمی مسلمان ہو تو اسلام اس کے صرف ان گناہوں کو مٹاتا ہے جو حقوق اللہ کے قبیل سے ہیں، حقوق العباد کو ادا کرنا ضروری ہوگا، وہ معاف نہیں ہوں گے۔ (۱)

وانّالهجرة تهدم الخ: ہجرت اور حج سے بھی گناہ معاف ہوتے ہیں، مگر علماء نے دیگر نصوص کی روشنی میں فرمایا کہ ہجرت اور حج وغیرہ اعمال سے صغائر معاف ہوتے ہیں، کبائر کی معافی کے لئے توبہ ضروری ہے۔ (۲)

ایک اہم اشکال اور اس کے متعدد جوابات:

اوپر حضرت معاذ کی احادیث سے یہاں تک یہ پانچ حدیثیں ہوئیں، جن سے معلوم ہوتاہے کہ نجات کے لئے ایمان کافی ہے، اعمال کی ضرورت نہیں، حالانکہ یہ مذہب تو مرجئہ کا ہے، اہل سنت والجماعت کے یہاں اعمال بھی ضروری ہیں، کیونکہ صحیح احادیث سے عُصاۃِ مومنین کا بھی جہنم میں داخل ہونا ثابت ہے، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ عاصی مؤمنین جہنم میں داخل کئے جائیں گے، جس سے ان کے بدن کوئلے کی طرح ہوجائیں گے اور پھر انہیں نہر حیات میں ڈالا جائے گا جس سے وہ چمک اٹھیں گے، اس کے بعد جنت میں داخل ہوں گے، (۳) لہٰذا یہ روایات بظاہر اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلک کے خلاف ہیں۔

(۱) المرقاۃ ۱/۱۷۹.

(۲) فتح الإله ۱/۳۲۹، والمرقاة ۱/۱۷۹، علامه ابن حجر مكی المتوفی ۹۷٤ھ نے اس حدیث شریف کی شرح کرنے کے بعد لکھا ہے "وفيه فوائدمنها: إنه يسن بسط اليمين عند المبايعة، وإنه ينبغي للعالم إذاظهرله من المتعلم شيئاً ينافي التعلم أن يسأله عن سببه، وإن اشتراط المتعلم على المعلم أمراً ينتفع به منه لاينافي التأدب معه، فإنه ليس القصد بذلک إلا مزيد الإمداد والانتفاع، وإنه إذا ظهرله من ذكي يخالف ذكاء ه أن يشعره بأنه كان ينبغي لک التفطن، وأن لايشکک في ذلک، وإن زيد في الجواب للحاجة والمناسبة، وأن يستعمل الأمور البديعة من الاستعارات وغيرها، فتح الإله في شرح المشكاة ۱/۳۳۰ مبطوعه دارالكتب العلميه بيروت ولبنان"

(۳) رواه مسلم في كتاب الايمان، باب اثبات الشفاعة واخراج الموحدين من النار.

علماء نے ان روایات کے کئی جوابات دیئے ہیں:

(۱)سعید ابن المسیب نے فرمایا"إن هذا كان قبل نزول الفرائض والأمر والنهي" کہ یہ حکم فرائض اور اوامر ونواہی کے نزول سے پہلے تھا۔

(۲)حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اس جیسی احادیث کا مطلب ہے: "مَنْ قَالَ الْكَلِمَةَ وَادّیٰ حَقَّهَا وَفَرِيْضَتَهَا "یعنی جو کلمہ کا قائل ہو، اور اسکا حق بھی اداء کرے اور فرائض بجالائے ، لہٰذا اوامر کا امتثال اور نواہی سے اجتناب بھی شہادتین میں داخل ہے کہ یہ کلمہ کا حق ہے۔

(۳) امام بخاریؒ نے فرمایا کہ: یہ روایات اس شخص کے لئے ہیں جو اخیر حیات میں ایمان لایا ہو اور اس کے بعد اس کو اعمال کا موقع نہ ملا ہو، چنانچہ حدیث شریف میں اس طرح کا واقعہ آتا ہے کہ ایک کافر آیا مسلمان ہوا اور اونٹنی سے گرکر مرگیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے جنت کی بشارت سنائی۔ (۱)

(۴) ملاعلی قاریؒ نے فرمایا: الأقرب ان يراد تحريم الخلود یعنی اس پر جہنم حرام ہوتی ہے بر سبیل خلود ودوام، نہ کہ بر سبیل دخول، یہ بہتر جواب ہے۔(۲)

(۵) شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے فرمایا کہ: جہنم کے حرام ہونے سے مراد جہنم کا خاص طبقہ ہے جو صرف کافروں کے لئے تیار ہوا ہے، لیکن ایک طبقہ عصاۃ مومنین کیلئے ہے، اس میں مسلمان اپنی بدعملی کی وجہ سے جاسکتا ہے۔(۳)

(٦) بعض نے کہا کہ: ان احادیث کا مقصود کلمہ کی تاثیر کو بیان کرنا ہے، اور کسی بھی چیز کی تاثیر ظاہر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ شرائط موجود ہوں اور موانع کا ارتفاع ہو، جیسے گلِ بنفشہ کی تاثیر ہے کہ نزلہ کو ختم کرتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ مقدار مجوزہ میں کھائے اور ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز کرے، اسی طرح شہادتین؛ حرمت جہنم اور دخول جنت کا سبب ہے مگر شرط ہے کہ امتثال اوامر اور اجتناب نواہی بھی ہو۔

(۷) بعض نے کہا کہ: حضرت انسؓ کی روایت میں "صِدْقاً مِنْ قَلْبِهٖ " کی قید ہے یعنی اخلاص ہونا چاہئے اور اخلاص کہا جاتا ہے استقامت علی الطاعات والاعمال کو، لہٰذا اس سے اعمال کی ضرورت خود ثابت ہوگئی۔

(۱)شرح الطيبي ۱/۱۰۹ مكتبه زكريا ديوبندوفتح الإله ۱/۳۲۰.

(۲) المرقاة ۱/۱۷۹.

(۳)لمعات التنقيح ۱/۲۵۸.

(۸) بعض نے کہا کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات اغلبی ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جو شخص سچے دل سے کلمہ پڑھتا ہے وہ عموماً اعمال میں لگ ہی جاتا ہے۔ (۱)

(۹) بعض نے کہا کہ: جہنم کے حرام ہونے سے مراد تحریم نار علی اللسان ہے، تحریم نار علی الاعضاء کلہا مراد نہیں ہے، باقی اعضاء اور جسم کو آگ جلاسکتی ہے۔ (۲)

مذکورہ روایات کے یہ جوابات دیئے گئے ہیں، کیونکہ دیگر احادیث سے اعمال کا ضروری ہونا ثابت ہوتا ہے، ان احادیث سے خوارج ومعتزلہ کی بھی تردید ہوتی ہے، جو مرتکب کبیرہ کے خلود فی النار یا عدم دخول جنت کے قائل ہیں، کیونکہ ان احادیث میں ایسے افراد کے لئے بھی واضح طور پر دخول جنت کی بشارت دی گئی ہے۔

مصنف کی طرف سے ایک وضاحت:

والحديثان المرويان عن الخ :مصنفؒ فرماتے ہیں کہ مصابیح السنۃ میں یہاں دو حدیثیں اور مذکور تھیں، دونوں کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں اور دونوں حدیث قدسی ہیں لیکن ہم ان کو باب الریاء والکبر (جلد ثانی) میں ذکر کریں گے کیونکہ انکی مناسبت ریاء وکبر سے زیادہ ہے ایمان سے صرف باعتبار ضد کے مناسبت ہے۔

الفصل الثانی

۲۸/ ۲۷ عَنْ مُعَاذٍؓ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَخْبِرْنِيْ بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِيْ الْجَنَّةَ، وَيُبَاعِدُنِيْ عَنِ النَّارِ قَالَ: لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْ أَمْرٍ عَظِيْمٍ، وَإِنَّهُ لَيَسِيْرٌ عَلٰى مَنْ يَّسَّرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ، تَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَاتُشْرِكُ بِهٖ شَيْئاً، وَتُقِيْمُ الصَّلاةَ، وَتُؤْتِي الزَّكَاةَ، وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ، وَتَحُجُّ الْبَيْتَ، ثُمَّ قَالَ "أَلَا أَدُلُّكَ عَلٰى أَبْوَابِ الْخَيْرِ؟ اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ، وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ، وَصَلاةُ الرَّجُلِ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ" ثُمَّ تَلا: " تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ" حَتّٰى بَلَغَ "يَعْمَلُوْنَ" ثُمَّ قَالَ: "أَلَا أَدُلُّكَ بِرَأْسِ الْأَمْرِ وَعَمُوْدِهٖ وَذِرْوَةِ سَنَامِهٖ؟" قُلْتُ: بَلٰى، يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: رَأْسُ الْأَمْرِ: الْإِسْلَامُ،

(۱) شرح نووی ۱/ ۷۶ مکتبہ اشرفی۔

(۲) فتح الإله فی شرح المشکاۃ ۱/ ۳۲۶ دار الکتب العلمیہ بیروت۔

وَعَمُوْدُهُ: اَلصَّلَاةُ وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ: اَلْجِهَادُ، ثُمَّ قَالَ: "أَلاأُخْبِرُكَ بِمِلَاكِ ذٰلِكَ كُلِّهِ؟" قُلْتُ: بَلٰى، يَانَبِيَّ اللّٰهِ! فَأَخَذَ بِلِسَانِهِ، فَقَالَ: "كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا" فَقُلْتُ: يَانَبِيَّ اللّٰهِ! وَإِنَّا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَانَتَكَلَّمُ بِهِ؟ قَالَ: "ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ يَامُعَاذُ! وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوهِهِمْ، أَوْعَلٰى مَنَاخِرِهِمْ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ؟" (رواه أحمد والترمذی، وابن ماجة)[1]

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ: میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے کوئی عمل ایسا بتادیجئے، جومجھ کو جنت میں داخل کرادے اوردوزخ سے دورکردے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ تم نے ایک بڑی چیز کے بارے میں سوال کیا ہے، لیکن جس پراللہ تعالیٰ آسان فرمادے اسکے لئے یہ بہت آسان بھی ہے، اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی چیز کوشریک نہ ٹھیراؤ، اورنماز پابندی کے ساتھ اداء کرتے رہو، اورزکوۃ دیتے رہو، رمضان کے روزے رکھو، اورخانہ کعبہ کا حج کرو، پھرفرمایا: اے معاذ! کیاتم کوخیرکے دروازے (اعمال) نہ بتلاؤں؟ (سنو)روزہ ڈھال ہے اورصدقہ گناہوں کو ایسے ختم کردیتاہے جیسے پانی آگ کو بجھادیتاہے، (اوراسی طرح) رات کے حصہ میں آدمی کا نماز (تہجد) پڑھنا (گناہ کوختم کردیتاہے) پھرحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "**تتجافی جنوبهم يعملون**" تک (پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: ان کے پہلوخوابگاہوں سے الگ رہتے ہیں، وہ اپنے رب کوخوف وامید سے پکارتے ہیں اورہماری دی ہوئی روزی میں سےخرچ کرتے ہیں پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے کیااس کے لئے چھپایاگیاہے ان کے اعمال کے بدلہ میں)، پھرآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اے معاذ!) کیاتم اِس امر (دین) کا سراوراس کا ستون اوراس کے کوہان کی بلندی نہ بتاؤں؟ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں یارسول اللہ! (ضروربتایئے) آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: "اِس امر (دین) کا سراسلام ہے اور

(١) أخرجه الترمذی فی "الإيمان" ٢/٨٩ برقم ٢٦١٦، وابن ماجة فی "الفتن" ٢/٢٨٦ برقم ٣٩٧٣ وأحمد ٥/٢٣١ برقم ٢٢٠٦٩، و٥/٢٣٤ برقم ٢٢١٠٠ و٥/٢٣٥ برقم ٢٢١٠٤، و٥/٢٣٦ برقم ٢٢١١٦ و٥/٢٣٧ برقم ٢٢١٢٥ و٥/٢٤٢ برقم ٢٢١٥٧، و٥/٢٤٥ برقم ٢٢١٧٥.

اس کا ستون نماز ہے اوراس کے کوہان کی بلندی جہاد ہے، پھرآپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: کیا تمہیں ان تمام چیزوں کی جڑ نہ بتاؤں؟ میں نے عرض کیا: اللہ کے نبی! کیوں نہیں (ضرور بتایئے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک پکڑی (اوراس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) فرمایا: اس کو روک کر رکھو (لایعنی اورفضول باتوں سے) میں نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! ہم اپنی زبان سے کچھ الفاظ بول لیتے ہیں کیااس پربھی مواخذہ ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معاذ! تمہاری ماں تمہیں گم کردے (اچھی طرح جان لو) لوگوں کوان کے منہ کے بل یاان کے نتھنوں کے بل جہنم میں گرانے والی چیز ان کی زبانوں کی کاٹی ہوئی کھیتی (بری باتیں) ہی ہونگی۔ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح حدیث

ایک عظیم سوال:

یہ حدیث بھی حضرت معاذؓ کی ہے اوراس میں بھی اعمال ایمان کا بیان ہے حضرت معاذؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ مجھے ایسے عمل کے بارے میں بتلادیں جو مجھے جنت میں داخل کردے اور جہنم سے دوری ہوجائے، حضرات صحابہؓ کے سوالات کا اکثر محور یہی ہوا کرتا تھا کہ ہماری آخرت سنور جائے ان کو یہی ایک دھن تھی اوریہی ایک فکر تھی کہ جنت نصیب ہوجائے اورجہنم سے حفاظت ہوجائے۔

اخبرني بعمل يدخلني الجنة: دخول جنت سے مراد جنت کا دخول اولی ہے۔

لقد سألت عن امر عظيم: یعنی تم نے ایک بڑا اوراہم سوال کیا ہے، اس کے کئی مطلب ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ: اس سے ''مشکل امر'' مراد ہے کہ تم نے ایک مشکل چیز کا سوال کیا کیونکہ جنت کے دخول اولی کے لئے اصولاً تمام اوامر کا امتثال اورتمام نواہی سے اجتناب ضروری ہے اورظاہر ہے کہ یہ مشکل چیز ہے، لیکن حق تعالیٰ شانہ جس کے لئے آسان فرمادے اورجس کو توفیق بخشے اس کے لئے آسان ہے۔ (۱)

(۲) بعض نے کہا کہ اس سے مراد ہے: أَمْرٌ عَظِيمٌ جزائُهُ یعنی ایسا عمل جس کی جزاء عظیم ہواوروہ دخول جنت ہے۔

(۱) شرح الطيبي ۱/ ۱۷۳-۱۷٤.

(۳) بعض نے کہا کہ اس سے مراد ہے: **امر عظیم جوابه** یعنی جس کا جواب اور نشاندہی مشکل ہو، کیونکہ اس کا جواب بغیر علم غیب کے نہیں دیا جاسکتا، اور علم غیب پر مطلع ہونا بغیر وحی کے نہیں ہوسکتا ہے۔ (۱)

اعمالِ ایمان:

تعبد الله الخ: یہ مضارع بمعنی امر ہے، اور عبادت سے یا تو ایمان وتوحید مراد ہے اسی لئے آگے اس کی ضد یعنی شرک کی نفی کی گئی ہے یا اس سے اعمال مراد ہیں اس صورت میں شرک سے شرک خفی مراد ہوگا۔ (۲)

مرجیہ، جہمیہ اور کرّامیہ کی تردید:

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ارکان خمسہ: نماز روزہ، زکوۃ اور حج کی ادائیگی کا حکم دیا، جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ عقیدہ کی درستگی کے ساتھ اعمال کی انجام دہی بھی لازمی ہے، اس سے مرجیہ، جہمیہ اور کرامیہ وغیرہ کا رد ہوجاتا ہے جو اعمال کو ضروری نہیں سمجھتے۔

ابواب خیر:

ثم قال: ألا ادلک علی أبواب الخير: حضرت معاذ کے سوال کا جواب پورا ہوگیا، لیکن چونکہ حضرت معاذؓ کے اندر علم کی طلب اور اس کا شوق بہت تھا اور وہ فطری طور پر بااستعداد تھے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اضافہ فی الجواب کے طور پر ان کو کمال ایمان اور رفع درجات کے لئے کچھ نفلی اعمال بتائے۔

''ابواب'' بمعنی (طرق) یعنی کیا میں تمہاری خیر کے راستوں کی طرف رہنمائی نہ کروں کہ تم اس سے خیر و بھلائی تک پہونچ جاؤ، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تین اعمال بتائے (۱) نفلی روزے رکھے جائیں (۲) نفلی صدقہ کیا جائے (۳) نماز تہجد پڑھی جائے۔

ابواب خیر کہنے کی وجہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم، صدقہ اور نماز کو ابواب الخیر فرمایا، اس میں بطور استعارہ بالکنایہ

(۱) فتح الإله ۱/ ۳۳۲.

(۲) المرقاة ۱/ ۱۸۱.

ان اعمال ثلثہ کو مکان کے بند دروازوں کے ساتھ تشبیہ دی، دروازہ بند ہوتو مکان میں داخل ہونا مشکل ہے اور دروازہ کھلنے پر داخلہ آسان ہوجاتا ہے، اسی طرح ان تین اعمال کو انجام دینا مشکل ہوتا ہے کہ روزہ میں نفس کی خواہشات کو دبانا پڑتا ہے، صدقہ میں اپنی محبوب چیز (مال) کو نکالنا ہوتا ہے اور تہجد کے وقت میں بیدار ہونا اور نماز پڑھنا اشق علی النفس ہے، پس جو شخص ان تین اعمال کا عادی ہوجائے گویا اس نے بند دروازوں کو کھولدیا، پھر باقی احکام پر عمل کرنا اس کے لئے آسان ہوجائے گا، جس طرح دروازہ کھلنے کے بعد مکان میں داخل ہونا آسان ہوجاتا ہے۔(۱)

روزہ اور صدقہ کے فوائد:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان نفل اعمال کے فوائد بھی بیان کئے، روزہ کے بارے میں فرمایا: **الصوم جنة** کہ روزہ ڈھال ہے، ڈھال حفاظت کا ذریعہ ہوتی ہے، اسی طرح دنیا میں روزہ وساوسِ شیطانی سے حفاظت کا ذریعہ ہے، انسان جب زیادہ کھاتا ہے تو شیطان کو اس کے رگ وریشہ میں داخل ہوکر کاہلی لانے اور خواہشات میں مبتلا کرنے کا موقعہ زیادہ ملتا ہے، روزہ رکھنا شیطان کے انسانی رگوں میں داخلہ سے رکاوٹ کا سبب بنتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہے: **ان الشیطان یَجْرِی من الانسان مَجْرَی الدم، الافَضَیِّقُوْا مَجَارِیَه بِالْجُوْعِ** (۲) یعنی شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑتا ہے، لہٰذا ہوشیار رہو اور بھوک سے خون کے مقامات کو تنگ کرو، اور آخرت میں روزہ عذاب جہنم سے حفاظت کا ذریعہ ہے۔

والصدقة تطفی الخطیئة: صدقہ کا فائدہ بیان کیا کہ صدقہ گناہوں کو ایسے ختم کردیتا ہے جیسے پانی آگ کو ختم کردیتا ہے، لہٰذا انسان کو چاہئے کہ حسب وسعت موقعہ بموقعہ صدقہ کرتا رہے۔

وصلوة الرجل فی جوف اللیل: اس جملہ میں تہجد کا بیان ہے اس کی تائید میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی "**تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفاً وَّطَمَعاً وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ**" (ترجمہ حدیث کے ترجمہ کے ذیل میں آچکا)

دین کے اہم ترین اعمال اور اجزاء:

ثم قال الأأدلک برأس الا مر وعموده وذروة سنامه: اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) المرقاۃ ۱ / ۱۸۲.
(۲) احیاء علوم الدین ۱ / ۳۰٤.

نے دین اسلام کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے اہم اورخصوصی اجزاء کو بیان کیا اوردین میں ان کے مرتبہ اورحیثیت کوبھی واضح کیا، چنانچہ آپ نے تین چیزیں ذکرفرمائیں:

(۱) **رأس الامر الاسلام**: ''راس'' بمعنی سر اور''امر'' سے مرادامردین، یعنی دین کا سر اسلام یعنی توحید ورسالت کی شہادت دینا ہے، پس جس طرح سر کے بغیر آمی کا وجودنہیں ہوسکتا اسی طرح بغیر اقرارِ شہادت کے دین قائم نہیں ہوسکتا۔

(۲) **وعمودہ الصلوۃ**: دین کا ستون نماز ہے کہ دین کی عمارت اسی پرقائم ہے، پس جس طرح بے ستون کی عمارت منہدم ہونے کااندیشہ رہتاہے اسی طرح نمازوں کو ضائع کرنے سے ضیاع دین کا اندیشہ رہتاہے۔

(۳) **وذروۃ سنامه الجهاد**: ''ذروۃ'': بتثلیث الذال ہے یعنی ذال پرتینوں حرکات صحیح ہیں، معنی ہیں: بلندی، اس جملہ میں دین کوتشبیہ دی گئی ہے اونٹ کے کوہان کے ساتھ، اونٹ کا کوہان خود بلند ہوتا ہے پھربطورمبالغہ اس کے لئے بلندی کوثابت کیا گیاہے۔

کچھ اعمالِ اسلام کی خاصیتیں:

یعنی دین کی سربلندی اورغلبہ دنیامیں جہاد کے ذریعہ سے ہوگا، اس سے جہاد کی خاصیت اورشان کا بھی علم ہوگیا، اعمال شریعت نماز، روزہ وغیرہ ہرایک کی اپنی اپنی جداگانہ خاصیتیں اورامتیازات ہیں مثلاً نماز کی خاصیت ہے کہ وہ برائیوں سے روکتی ہے، اللہ پاک کا ارشاد ہے: **اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ**(۱)، یقیناً نماز بے حیائی اوربرے کاموں سے روکتی ہے، روزہ کی خاصیت تقوی ہے، چنانچہ روزہ کی فرضیت کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیاہے: **لعلکم تتقون**(۱)، تاکہ تم متقی بن سکو) زکوۃ سے اخلاق رذیلہ بالخصوص رذیلۂ بخل ختم ہوتاہے، **خذ من أموالهم صدقة تطهرهم الخ**(۲)(آپ ان کے مال میں سے صدقہ لیجئے جو انھیں پاک کرے اوران کا تزکیہ کرے) حج سے اللہ کی محبت اورعشق پیداہوتاہے، جہادبھی شریعت کا ایک عمل ہے اس سے اعلاء کلمۃ اللہ اوردین کا غلبہ حاصل ہوتاہے، یہ مقصد

(۱)العنکبوت:٤٥.

(۲)البقرۃ: ١٨٣

(۳)التوبۃ:١٠٣.

معتد بہ طور پر دیگر عبادتوں سے حاصل نہیں ہوگا، اس لئے اس کو اسلام کے لئے ''ذروة السنام'' کہا گیا۔

تمام اعمال صالحہ کو تقویت پہنچانے والا عمل:

قال الأأخبرك بملاك ذلك كله : اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں ایسی چیز بتاؤں جس سے مذکورہ تمام اعمال میں مدد ملے اور تقویت حاصل ہو؛ مِلاک کے معنی ہیں: **مابه إحكام الشي وتقويته** یعنی کسی شئ کا ایسا سبب اور ذریعہ جس سے اس شئ کی پختگی اور تقویت ہو، حضرت معاذؓ نے فرمایا: کیوں نہیں ضرور بتائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک کو پکڑا اور فرمایا اس کی حفاظت کرو شرک اور کفر کی بات سے، غیبت سے، جھوٹ وغیرہ سے، اس پر حضرت معاذؓ نے سوال کیا: اے اللہ کے نبی! ہم زبان سے جو الفاظ بولتے ہیں کیا اس پر بھی مواخذ ہوگا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے معاذ! تیری ماں تجھے گم کرے، لوگ جہنم میں منہ کے بل اسی زبان کی وجہ سے ڈالے جائیں گے۔

ثكلتك امك : یہ جملہ اصلاً بددعائیہ ہے، تیری ماں تجھے گم کرے یعنی تو ہلاک ہوجائے، لیکن عرب کے محاورہ میں اس کا وقوع مقصود نہیں ہوتا، بلکہ محض تادیب کے لئے اور غفلت پر تنبیہ کے لئے یہ جملہ بولا جاتا ہے۔

وجوههم أو مناخرهم: اس میں راوی کو شک ہے وجوہ فرمایا، یا مناخر کہا۔

حصائد السنتهم : بمعنی کاٹی ہوئی کھیتی، یہاں زبان کو تشبیہ دی ہے درانتی کے ساتھ کہ وہ کھیتی کو کاٹ دیتی ہے، چاہے وہ کچی ہو یا پکی، اور زبان سے بولی ہوئی باتوں کو تشبیہ دی ہے کٹی ہوئی کھیتی کے ساتھ، یعنی زبان سے نکلی ہوئی باتوں کی وجہ سے جہنم میں داخل ہوں گے، لہذا اس پر قابو رکھا جائے۔ (۱)

تنبیہ : اس حدیث میں تمام اعمال کی انجام دہی کو زبان کی حفاظت سے جوڑا گیا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ حفاظتِ لسان سے قلب میں صفائی ونورانیت آتی ہے، اور جب قلب میں نورانیت ہوتی ہے تو نیکیوں کی طرف آدمی کا ذہن چلتا ہے اور قلب میں اعمال صالحہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں عمل کی انجام دہی سہل ہوجاتی ہے، زبان کی حفاظت نہ ہو تو قلب میں غفلت وتاریکی پیدا ہوتی ہے، پھر بجائے نیکیوں کے برائیوں کی طرف ذہن چلتا ہے، برے خیالات آتے ہیں اور برائیوں کا داعیہ ابھرتا ہے، اس وقت

(۱) المرقاة ۱/۱۸٤.

اعمال صالحہ کوانجام دینا بہت مشکل ہوتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان کی حفاظت کوتمام اعمال کی جڑ بتایا ہے۔

۲۹ / ۲۸ وَعَنْ أَبِیْ أُمَامَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ، وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ، وَأَعْطىٰ لِلّٰهِ، وَمَنَعَ لِلّٰهِ، فَقَدْ اِسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ" رواه ابوداود ورواه الترمذی عن معاذ بن انس مع تقديم وتاخير، وفيه فقد استكمل ايمانَهُ.(۱)

ترجمہ :حضرت ابوامامہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: جوشخص اللہ ہی کے لئے محبت کرے اوراللہ ہی کے لئے نفرت کرے اوراللہ ہی کے لئے دے اوراللہ ہی کے لئے روکے تو اس نے اپنے ایمان کومکمل کرلیا۔ (ابوداود)اورترمذی نے اس حدیث کو معاذ بن انسؓ سے کسی قدر تقدیم وتاخیر کے ساتھ نقل کیا ہے جس کے آخری الفاظ یہ ہیں: تو یقیناً اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔

تشریحِ حدیث

احوال ابوامامہ:

نام: صُدَی بن عجلان الباہلی، کثیرالروایۃ صحابی ہیں، فتح مصر کے بعد مصر چلے گئے تھے، پھروہاں سے شام منتقل ہوگئے اور ملک شام میں ہی ۸۶ھ میں انتقال ہوا،بعض نے کہا کہ شام میں آخری صحابی یہی ہیں، جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔(۲)

اخلاص کاحکم بالخصوص محبت،بغض، اعطاء اورمنع میں اخلاص کی تاکید اورفضیلت:

من احب لله وابغض لله الخ :اس حدیث میں اخلاص کاحکم دیا گیا ہے کہ بندہ ہرعمل میں اللہ کی رضا وخوشنودی کی نیت کرے، چاراعمال خاص طور پر بتائے گئے کہ ان میں اخلاص پیدا ہوجائے تو آدمی کا

(۱)أخرجه ابوداود فی "كتاب السنة" ۲ / ٦٤٣ برقم: ٤٦٢١،والترمذي فی "أبواب صفة القيامة" ۲ / ۷۸ برقم: ۲۵۲۱.

(۲)السير ۳ / ۳۵۹–۳٦۲،والإصابه ۳ / ۱٤–۱۵.

ایمان کامل اور مکمل ہوجائے گا وہ چار اعمال یہ ہیں: **الحب لله، البغض لله، الاعطاء لله اور المنع لله،** کسی سے محبت کرے، کسی سے نفرت کرے، کسی کو کوئی چیز دے، یا منع کرے، سب اللہ کی رضا کے لئے ہونا چاہئے۔

صحابہ کی زندگی میں اخلاص کی روشن مثالیں:

حضرات صحابہؓ میں یہ بات بدرجۂ اتم موجود تھی اور وہ اس بارے میں اپنی قرابت اور رشتہ داری کا بھی خیال نہ کرتے تھے، ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کوئی حدیث بیان کی، تو ان کے صاحبزادے نے کوئی ایسی بات کہدی جس سے حدیث کا معارضہ محسوس ہورہا تھا، تو عبداللہ بن عمر نے اپنے اس صاحبزادہ سے تازندگی بات نہیں کی،(۱) جوحب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی مثال ہے۔

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے بھانجے حضرت مسطحؓ کا کچھ وظیفہ مقرر کرکھا تھا، جب منافقین نے حضرت عائشہؓ پرتہمت لگائی تو حضرت مسطحؓ نے بھی ان کی کچھ تائید کردی، جس سے ناراض ہوکر حضرت ابوبکرؓ نے ان کا وظیفہ بند کردیا، مگر اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ نازل فرماکر اس کے اجراء کا حکم دیا، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سب کچھ بھلاکر فوراً وظیفہ جاری فرمادیا،(۲) یہ اعطاء للہ اور منع للہ کا خوب تر مظاہرہ ہے۔

اعمال اربعہ کی وجہ تخصیص:

یہاں چار اعمال مذکور ہیں، اگلی حدیث میں ان چار میں سے اختصاراً دو عمل ذکر کئے گئے: **الحب فی الله والبغض فی الله**، سوال یہ ہے کہ بندہ سے ہر عمل میں اخلاص مطلوب ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: **ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی لله رب العالمین**(۳)؟ یعنی میری نماز میری عبادت اور میرا جینا مرنا سب کچھ اللہ کے لئے ہے، پھر ان چار کی تخصیص کیوں ہے؟

جواب: ان چار اعمال میں عموماً حظ نفس شامل ہوتا ہے آدمی ان اعمال کو نفس کے تقاضہ سے کرتا ہے لہٰذا اگر ان چار اعمال میں اخلاص پیدا ہوگیا تو باقی چیزوں میں اخلاص کا حصول آسان ہوجائے گا اس نکتہ کی

(۱) رواہ مسلم فی کتاب الصلوۃ، باب خروج النساء الی المساجد.

(۲) تفسیر قرطبی ۱۲/۲۰۷.

(۳) الانعام: ۱۶۲.

وجہ سے ان چار اعمال کو ذکر فرمایا گیا۔ (۱)

ورواه الترمذی عن معاذ بن أنس الخ: اس مضمون کی روایت ترمذی میں معاذ ابن انس الجہنیؓ سے مروی ہے، البتہ اس میں کچھ الفاظ کی تقدیم وتاخیر ہے اور کچھ اضافہ بھی ہے، چنانچہ اس کے الفاظ اس طرح ہیں: من اعطی لله ومنع لله واحب لله وابغض لله وانکح لله فقداستکمل ایمانه، ''انکح لله'' کا مطلب ہے کہ کسی کے نکاح میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے جانی یا مالی تعاون کرے۔

۳۰/ ۲۹ وَعَنْ أَبِیْ ذَرٍّؓ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: ''أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ اَلْحُبُّ فِي اللّٰهِ، وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ'' (رواہ ابوداود) (۲)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ اعمال میں سب سے افضل عمل یہ ہے کہ اللہ ہی کے لئے کسی سے محبت رکھی جائے اور اللہ ہی کے لئے کسی سے نفرت رکھی جائے۔ (ابوداود)

تشریحِ حدیث

حب فی اللہ اور بغض فی اللہ افضل الاعمال:

''**حب فی الله اور بغض فی الله**'' جس کی وضاحت اوپر حدیث میں آئی ہے کہ اللہ کے لئے محبت رکھی جائے اور اللہ ہی کے لئے بغض وعداوت ہو، اس حدیث میں اس کو افضل الاعمال قرار دیا گیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اخلاص حاصل ہوجانا دیگر تمام اعمال میں اخلاص پیدا ہوجانے کا سبب ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، اس وجہ سے ان کو افضل الاعمال کہا گیا ہے۔

افضل الاعمال کونسا عمل ہے؟

افضل عمل کیا ہے؟ اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں بعض روایات میں **الحب فی الله والبغض فی الله** کو افضل عمل بتایا ہے اور بعض روایات میں **الصلاة لوقتها** کو افضل الاعمال قرار دیا ہے اور بعض میں

(۱) المرقاۃ ۱/ ۱۸۵.

(۲) أخرجه أبوداود في ''السنة'' ۲/ ۶۳۲ برقم ۴۵۹۹.

''شهادة ان لاإلـه الا الـله '' کوافضل عمل فرمایا گیا ہے اوربعض روایات میں دیگر کچھ چیزیں آئی ہیں، ظاہر ہے کہ افضل عمل تو کوئی ایک ہی ہوگا؟ پھرکئی اعمال پر افضل عمل کا اطلاق کیوں کرکیا گیا ہے؟

اس سوال کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

(۱)حضورصلی اللہ علیہ وسلم نے عموماً کسی سائل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے متعدد افعال پر افضل الاعمال کا اطلاق کیا ہے، یہ اختلاف سائل کے حالات کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہے، حضور علیہ الصلوۃ والسلام روحانی طبیب تھے، سائل افضل عمل کا سوال کرتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی حالت کے موافق جواب دیتے، مثلاً کسی کے اندر اخلاص کی کمی ہے اس نے سوال کیا ای الـعـمـل افـضـل اس کو جواب دیا الحب فی الله و البغض فی ا لله، کسی کی طبیعت میں بخل ہے اس نے افضل عمل کا سوال کیا تو اس کو فرمایا افـضـل الاعـمـال اطـعـام الـطـعـام، سائل کے اندر اگر نماز کی پابندی نہیں ہے تو اس کے حق میں فرمایا الصلوۃ لوقتها، جیسا کہ ڈاکٹر وطبیب مریض کی حالت کے موافق مختلف نسخے تجویز کرتے ہیں۔

(۲)بعض نے کہا کہ افـضـل الاعـمـال کا لفظ جہاں بھی آتا ہے وہاں من مقدر ہوتا ہے اي: من أفضل الأعمال یعنی افضل اعمال ایک نوع کلی ہے اس کے افراد کثیر ہیں۔

(۳)بعض نے کہا کہ افضل اسم تفضیل کا صیغہ ہے لیکن یہاں تفضیل کے معنی میں نہیں، بلکہ اسم فاعل کے معنی میں ہے اورمقصود محض اس عمل کی فضیلت واہمیت بیان کرنا ہوتا ہے، نہ کہ دوسروں کے مقابلہ اس کی افضلیت کو ثابت کرنا، اہل عرب بھی تفضیل کا صیغہ ہمیشہ تقابل کے لئے استعمال نہیں کرتے، لہٰذا یہاں معنی ہوں گے کہ یہ اعمال فی نفسہ بڑی فضیلت والے ہیں دوسرے عمل سے تقابل مقصود نہیں ہے۔

۳۱ / ۳۰ وَعَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ قَـال: قـال رسـول الـلـه صلى الله عليه وسلم: ''اَلْـمُسْـلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ،وَالْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰى دِمَائِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ''(رواه الترمذي،والنسائي)[1] وَزَادَ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الإِيْمَانِ[2] بِرِوَايَةِ

(۱)أخرجه الترمذي في ''الإيمان'' ۲/ ۹۰ برقم ۲٦۲۷ والنسائي في ''الإيمان وشرائعه'' ۲/ ۲٦٦ برقم ٤٥٥۹.

(۲)أخرجه البيهقي في ''شعب الإيمان'' باب في أن يحب الرجل لأخيه المسلم مايحب لنفسه ويكره له مايكره لنفسه ۷/ ٤۹۹ قد عزاه صاحب المشكاة إلى البيهقي وقد أخرجه ابن ماجه أيضاً في ''الفتن'' ۲/ ۲۸۲، برقم ۳۹۳٤.

فَـضَـالَةَ "وَالْـمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ، وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَايَا وَالذُّنُوْبَ"

تـرجـمـه :حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کامل مسلمان وہ شخص ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں اور کامل مؤمن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جان اور مال کو مامون سمجھیں ۔(ترمذی، نسائی)،اورشعب الایمان میں امام بیہقیؒ نے فضالہ سے یہ روایت نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں: اور حقیقی مجاہد وہ ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کیا اور اصل مہاجر وہ ہے جس نے تمام چھوٹے بڑے گناہوں کو ترک کر دیا۔

تشریح حدیث

اس حدیث میں اسی طرح اگلی حدیث میں کمالِ ایمان کا بیان ہے۔

کامل مسلمان:

المسلم من سلم المسلمون الخ اس جملہ سے متعلق کلام گزر گیا۔

کامل مؤمن:

والمومن من أمنه الناس : کامل مومن وہ ہے جس کی طرف سے لوگ اپنے جان ومال کے بارے میں مطمئن رہیں، مطلب یہ ہے کہ آدمی کو بے ضرر بن کر رہنا چاہئے، لوگ اس کے متعلق مطمئن اور بے فکر رہیں کہ یہ شخص ہمیں کسی جانی یا مالی نقصان میں مبتلا نہیں کرے گا، ایسا شخص مؤمن کامل ہے، ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مؤمن کامل وہ ہے جس کو لوگ اپنے مال وجان پر امین بنائیں، لیکن یہ معنی پہلے معنی سے مختلف نہیں، بلکہ اس کا جزء زائد ہے اور مطلب یہ ہے کہ آدمی کی جانب سے لوگ اتنے مطمئن اور بے خوف ہوں کہ وہ خود اپنے جان ومال اس کی امانت میں دینے سے نہ ہچکچائیں۔

وزاد البیھقی : امام بیہقیؒ نے بھی شعب الایمان میں حضرت فضالہ کی روایت سے اس حدیث کو نقل کیا، اس میں دو جملے زائد ہیں، جن کی تشریح آگے آرہی ہے۔

احوال فَضالہ بن عبید:

ان کا پورا نام فُضالہ بن عبید الانصاری الاوسی ہے، جلیل القدر صحابی ہیں، ان کی پہلی شرکت غزوۂ احد میں ہوئی، ملک شام کو فتح کرنے کے لئے جو لشکر گیا اس میں آپ بھی شریک تھے، پھر وہیں سکونت اختیار کر لی، حضرت معاویہؓ نے ان کو دمشق کا قاضی مقرر کیا تھا، نیز ایک مرتبہ ان کو اپنا نائب بھی بنایا تھا، اُن کے دورِ خلافت میں شام میں ہی ۵۳ھ میں وفات ہوئی، حضرت معاویہؓ بھی ان کا جنازہ اٹھانے والوں میں شامل تھے۔(۱)

حقیقی مجاہد:

والمجاهد من جاهد الخ : حقیقی مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرے یعنی اپنے نفس کو شریعت کے تابع بنائے، نفس نہ چاہے تب بھی احکام شرعیہ بجالائے، نفس میں جو خلاف شرع تقاضے آئیں ان کو دبائے اور کچلے، ایسا شخص اصل مجاہد ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار اور نفس دونوں انسان کو دین پر چلنے سے روکتے ہیں، دین پر عمل کے لئے دونوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، لیکن کفار سے مقابلہ کی کبھی کبھار نوبت آتی ہے جبکہ نفس سے ہر وقت مقابلہ ہے، تو جو اس ہمیشہ کے دشمن کو رام کر لے وہی اصل مجاہد ہے۔

''رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر'' روایت کا صحیح مفہوم اور ایک غلط نظریہ کی تردید:

ایک غزوہ سے واپسی پر مدینہ کے قریب آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، **رجعنا من الجهاد الأصغر إلى الجهاد الأكبر** (۲) یعنی ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ہم ابتک دشمن کی زمین میں کفار کے مقابلہ برسرِ پیکار تھے وہاں نفس کو اسباب لذت میسر نہ تھے، اس لئے وہاں نفس کو لذتوں سے روکنے کا مجاہدہ نہ ہوسکا، پس وہ جہاد اصغر ہوا، اب وطن واپسی ہو رہی ہے جہاں اسباب عیش ولذت میسر ہوتے ہیں ایسے موقعہ میں نفس کو غیر مشروع لذتوں سے روک کر شریعت کی قید

(۱) الإصابة ٤/٣٤٣-٣٤٤.

(۲) الزهد للبيهقي، رقم: ٣٧٣، ولفظه: قدمتم خير مقدم من الجهاد الأصغر إلى الجهاد الأكبر، رواه عن جابر وقال هذا الإسناد ضعيف.

میں مقید کرنا اور مکمل شریعت پر عمل پیرا ہونا نفس کا بڑا مجاہدہ ہے جو جہاد اکبر کے درجہ میں ہے، اس روایت کا یہی صحیح مطلب ہے۔

بعض لوگ اس حدیث کی وجہ سے جہاد کی حیثیت گھٹاتے ہیں کہ ہم نفس سے جہاد کررہے ہیں وہ افضل ہے جہاد مع الکفار کے مقابلہ میں جو درست نہیں، کیونکہ جو روایت اوپر گذری اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کو شریعت کا مکمل تابع بنادے یعنی شریعت کا جو حکم سامنے آئے اس کو بجالائے، مثلاً وقت پر نماز ادا کرے، روزے رکھے، زکوۃ ادا کرے، حج ادا کرے اور اگر کفار سے جہاد کا حکم ہوجائے اس حکم کو بھی بجالائے، یہ نہ کہے کہ ہم تو جہاد اکبر میں مشغول ہیں پس چھوٹے جہاد کی حاجت نہیں، اس لئے کہ اگر ایسا کہے گا تو پھر یہ مجاہدۂ نفس کہاں ہوا؟ مجاہدۂ نفس میں تو مکمل شریعت کا اتباع داخل ہے جس کا ایک حصہ اور شعبہ جہاد مع الکفار بھی ہے، پس مجاہدہ نفس اس وقت مکمل ہوگا جبکہ جہاد مع الکفار بھی کیا جائے۔(۱)

اصل مہاجر:

والمهاجر من هجر الخطايا والذنوب: اس کی تشریح بھی حدیث "**المسلم من سلم المسلمون الخ**" کے تحت گزر چکی ہے۔

> ۳۱ / ۳۰ وَعَنْ أَنَسٍ ؓ قال: قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَّا قَالَ: لا إِيْمَانَ لِمَنْ لا أَمَانَةَ لَهُ، وَلا دِيْنَ لِمَنْ لا عَهْدَ لَهُ. "رواه البيهقي في "شعب الايمان"(۲)
>
> **ترجمه** : حضرت انس ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا خطبہ کم دیا ہوگا جس میں یہ نہ فرمایا ہو کہ جس شخص میں امانت نہیں اس کا ایمان بھی کچھ نہیں اور جس میں ایفاءِ عہد نہیں اس کا دین بھی کچھ نہیں۔ (شعب الایمان)

تشریح حدیث

قلما خطبنا الخ: اس حدیث میں بھی کمال ایمان کا بیان ہے، حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت

(۱) المرقاة ۱ / ۱۸۷.

(۲) أخرجه البيهقي في شعب الإيمان ٤ / ٧٨، برقم: ٤٣٥٤.

صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے اس مضمون سے بہت کم خالی ہوتے تھے جس سے اس مضمونِ ہدایت کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

قـلـمـا میں ما مصدریہ بھی ہوسکتا ہے اور ما کافہ بھی، ''ما مصدریہ'' بعد کے فعل کو مصدر کے معنی میں کردیتا ہے اور ''ما کافہ'' ماقبل کو مابعد میں عمل کرنے سے روک دیتا ہے۔ تفصیل نحو کی کتابوں میں ہے۔(۱)

امانت کی اہمیت:

لاإيمـان لمن لاأمانة له : امانت سے کیا مراد ہے؟ اور نفی کیسی ہے؟ کمال کی یا اصل کی؟ اس میں دو احتمال ہیں:

(۱) کہ امانت کے معروف معنی مراد ہوں کہ کسی نے تمہارے پاس اپنا کچھ مال امانت کے طور پر رکھا، یا وہ باہر سفر پر جارہا ہے اپنے اہل وعیال کو تمہارے اوپر بھروسہ کرکے ان کی نگرانی تمہارے حوالہ کرگیا، اب تمہارا فرض یہ ہے کہ خیانت نہ کرو، امانت داری اختیار کرو، اگر امانت میں خیانت کی تو ایمان کامل نہیں اس صورت میں نفی کمال کی ہوگی۔

(۲) امانت سے تکالیف شرعیہ مراد ہوں جس کا تذکرہ اس آیت میں ہے ''**إِنَّـا عَـرَضْنَـا الامَـانَةَ عَلَـى السَّـمٰوٰتِ وَالارْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الإِنْسَانَ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُـوْمـاًجَهُوْلا**''(۲) (یقیناً ہم نے امانت پیش کی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر تو ان سب نے انکار کیا اس کے اٹھانے سے اور وہ ڈرے اس سے، اور اس کو انسان نے اٹھالیا یقیناً وہ بڑا ظالم اور بڑا جاہل ہے) اس آیت میں راجح قول کے مطابق امانت سے احکام شرعیہ مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اللہ کے احکام (مجموعہ ایمان وعمل) بندوں کے حق میں امانت ہیں، اگر ان احکام سے روگردانی کی اور ان کو قبول نہ کیا تو ایسا شخص ایمان والا نہیں ہے، اس صورت میں نفی اصل ایمان کی ہوگی۔

عہد کی سنگینی:

ولادين لمن لاعهدله : اس میں بھی دونوں احتمال ہیں: (۱) عہد سے باہمی عہد مراد ہو تو اس وقت

(۱) المرقاة ۱/۱۸۷ط اشرفيه ديوبند.

(۲) الأحزاب: ۷۲.

نفی، نفی کمال ہوگی کہ جو کئے ہوئے عہد کی پاسداری نہیں کرتا اس کا دین کامل نہیں۔

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس سے عہد اَلست مراد ہو جو اللہ نے عالم ارواح میں لیا تھا، اس وقت نفی اصل دین کی ہوگی یعنی جو اللہ کی وحدانیت کا قائل نہیں وہ دین والا نہیں بلکہ بے دین ہے۔

الفصل الثالث

۳۳/۳۲ عَنْ عَبَادَةَ بـن الصَّـامِتِؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّـمَ يَـقُـوْلُ: مَنْ شَهِـدَ أَنْ لاإِلٰـهَ إِلَّا الـلّٰـه وَأَنَّ مُـحَـمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ، حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ النَّارَ. رواه مسلم. (۱)

ترجمہ :- حضرت عبادہ بن الصامتؓ سے مروی ہے کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: جس شخص نے گواہی دی اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اللہ اس پر جہنم کی آگ حرام فرمادیں گے۔ (مسلم)

تشریح حدیث

اس حدیث میں اور آئندہ کی دو حدیثوں میں ایمان وکلمۂ ایمان کی برکت اور ان کے فائدہ کا بیان ہے، ان روایات سے محض ایمان کا نجات کے لئے کافی ہونا معلوم ہوتا ہے، اس مضمون کی احادیث ماقبل میں گزر چکی ہیں اور اس سے متعلق سوالات کے جوابات بھی دیئے جا چکے ہیں۔

۳٤/۳۳ وَعَنْ عُثْمَانَؓ قَال: قَال رسولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ لاإِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ" رواه مسلم. (۲)

ترجمہ :- حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کی وفات اس یقین پر ہوئی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ جنت میں داخل ہوجائے گا (مسلم)

(۱) رواہ مسلم فی الایمان، باب من لقی اللہ بالإیمان وھو غیر شاک فیہ دخل الجنة وحرم علی النار (۲۹)

(۲) أخرجه مسلم في الإيمان، باب الدليل على أن من مات على التوحيد دخل الجنة قطعاً، ۱/۴۳.

تشریحِ حدیث

احوال عثمان بن عفان:

امیر المؤمنین، خلیفۂ ثالث، حضرت عثمانؓ بن عفان، عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، ذوہجرتین ہیں، ذو النورین ہیں، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دوصاحبزادیاں رقیہ اورام کلثوم یکے بعد دیگرے آپ کے نکاح میں آئیں، آپ کے فضائل جلد ثانی میں مستقل باب میں آئیں گے، بارہ سال تک آپ خلیفہ رہے، ۳۵ھ میں مصر کے باغیوں نے آپ کو شہید کیا۔ (۱)

کیا اقرار باللسان ضروری نہیں؟

اس روایت میں ''لاالٰہ الااللہ'' سے مراد پورا کلمہ ہے اور ''یعلم'' سے مراد علم یقین ہے اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وحدانیت ورسالت پر یقین رکھنا کافی ہے، اقرار باللسان ضروری نہیں؟

جواب یہ ہے کہ یہ روایت اقرار باللسان کے بارے میں ساکت ہے اور دیگر روایات اس سلسلہ میں ناطق ہیں اور ناطق ساکت پر مقدم ہوتا ہے، اس لئے اقرار باللسان بھی ضروری ہے۔

۳۵/۳۴: وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ''ثِنْتَانِ مُوْجِبَتَانِ'' قَالَ رجلٌ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاالْمُوْجِبَتَانِ؟ قَالَ: ''مَنْ مَاتَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ، وَمَنْ مَاتَ لايُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئاً دَخَلَ الْجَنَّةَ'' (رواہ مسلم) (۲)

ترجمہ:- حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: دوچیزیں واجب کرنے والی ہیں (جنت اوردوزخ کو) ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! (جنت اوردوزخ کو) واجب کرنے والی وہ چیزیں کون سی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (پہلی چیز تو یہ ہے کہ) جوشخص اس حال میں مرا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کوشریک ٹھیرا

(۱) الإصابة ۳/۳۲۵-۳۲۷.

(۲) أخرجه مسلم في كتاب الإيمان، باب الدليل على أن من مات لايشرك بالله شيئا دخل الجنة ۱/۶۶ وليس فيه ثنتان موجبتان.

رکھا تھا تو وہ دوزخ میں داخل ہوگا (اور دوسری چیز یہ ہے کہ) جس کی وفات اس حال میں ہوئی کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا تھا تو وہ جنت میں جائے گا۔

تشریحِ حدیث

احوال جابر بن عبداللہ:

جابر بن عبداللہ بن عمرو انصاری صحابی ہیں ابوعبداللہ کنیت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ اٹھارہ غزوات میں شریک ہوئے، البتہ غزوۂ بدر اور احد میں شریک نہیں ہوسکے، جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی والدہ نہیں تھیں اور بہنیں متعدد تھیں، تو والد محترم نے ان کو بہنوں کی دیکھ بھال کے لئے گھر رہنے کا حکم دیا تھا اور خود جنگ میں تشریف لے گئے تھے، پھر جب وہ احد میں شہید ہوگئے، اس کے بعد سے یہ تمام غزوات میں شریک ہونے لگے، ان سے بکثرت روایات مروی ہیں، احادیث کے سماع اور حصول کا بہت شوق تھا، صرف ایک حدیث کے سماع کے لئے ملک شام کا سفر کیا جس میں ایک ماہ لگا، اور اخیر عمر میں بھی صرف سماع حدیث کے لئے مدینہ سے مکہ تشریف لے گئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بہت تعلق تھا اور آپ ان کی امداد بھی فرماتے تھے، اخیر عمر میں نابینا ہوگئے تھے، ۷۴ھ میں مدینہ میں انتقال ہوا اور بعض نے کہا کہ یہ مدینہ میں آخری صحابی ہیں۔(۱)

شرک وایمان اوران کے لازمی اثرات:

ثنتان موجبتان: اس حدیث میں بہ حیثیت وعدہ اور وعید شرک کو دخول نار واجب کرنے والا اور توحید کو دخول جنت واجب کرنے والا قرار دیا گیا ہے، ورنہ اللہ کے ذمہ کچھ واجب نہیں ہے، یہی اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب ہے، جبکہ معتزلہ نیک اعمال پر ثواب اور گناہوں پر سزا دینے کو اللہ کے ذمہ واجب قرار دیتے ہیں کما مر۔

۳۶/۳۵ وَعَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: کُنَّا قُعُوْداً حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَنَا أَبُوْبَکْرٍ وَعُمَرُ رضی الله عنهما فِیْ نَفَرٍ، فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْ بَیْنِ أَظْهُرِنَا،

(۱) اسد الغابة ۱/ ۴۹۲، (۶۴۷) والإصابة ۱/ ۲۳۰، سیر اعلام النبلاء ۳/ ۱۸۹–۱۹۴، حضرت جابرؓ کی مرویات کی تعداد ۱۵۴۰ ہے ۵۸ متفق علیه، ۲۶ ماانفرد به البخاري اور ۱۲۶ ماانفرد به مسلم هیں، کمافی السیر ۳/ ۱۹۴.

فَأَبْطَأَ عَلَيْنَا، وَخَشِيْنَا أَنْ يُقْتَطَعَ دُوْنَنَا، وَفَزِعْنَا فَقُمْنَا، فَكُنْتُ أَوَّلَ مَنْ فَزِعَ، فَخَرَجْتُ أَبْتَغِيْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى أَتَيْتُ حَائِطاً لِلْأَنْصارِ لِبَنِي النَّجَّارِ، فَدُرْتُ بِهٖ، هَلْ أَجِدُ لَهُ بَاباً؟ فَلَمْ أَجِدْ، فَإِذَا رَبِيْعٌ يَدْخُلُ فِيْ جَوْفِ حَائِطٍ مِنْ بِئْرٍ خَارِجَةٍ، وَالرَّبِيْعُ: الْجَدْوَلُ، قَالَ: فَاحْتَفَزْتُ، فَدَخَلْتُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: "أَبُوْهُرَيْرَةَ؟" فَقُلْتُ: نَعَمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ "مَاشَأْنُكَ؟" قُلْتُ: كُنْتَ بَيْنَ أَظْهُرِنَا فَقُمْتَ فَأَبْطَأْتَ عَلَيْنَا، فَخَشِيْنَا أَنْ تُقْتَطَعَ دُوْنَنَا فَفَزِعْنَا، فَكُنْتُ أَوَّلَ مَنْ فَزِعَ، فَأَتَيْتُ هٰذَا الْحَائِطَ، فَاحْتَفَزْتُ كَمَا يَحْتَفِزُ الثَّعْلَبُ، وَهٰؤُلَاءِ النَّاسُ وَرَائِيْ، فَقَالَ: يَا "أباهريرة" وَأَعْطَانِيْ نَعْلَيْهِ، فَقَالَ: اِذْهَبْ بِنَعْلَيَّ هَاتَيْنِ، فَمَنْ لَقِيَكَ مِنْ وَرَاءِ هٰذَا الْحَائِطِ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهُ فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ" فَكَانَ أَوَّلَ مَنْ لَقِيْتُ عُمَرَ فَقَالَ: مَاهَاتَانِ النَّعْلَانِ يَاأَبَاهُرَيْرَةَ؟ قُلْتُ: هَاتَانِ نَعْلَا رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَنِيْ بِهِمَا، مَنْ لَقِيْتُ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِناً بِهَا قَلْبُهُ، بَشَّرْتُهُ بِالْجَنَّةِ، فَضَرَبَ عُمَرُ بَيْنَ ثَدْيَيَّ، فَخَرَرْتُ لِإِسْتِيْ، فَقَالَ، اِرْجِعْ: يَاأَبَاهُرَيْرَةَ! فَرَجَعْتُ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَجْهَشْتُ بِالْبُكَاءِ، وَرَكِبَنِيْ عُمَرُ، وَإِذَا هُوَ عَلٰى أَثَرِيْ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَالَكَ يَاأَبَاهُرَيْرَةَ؟" فَقُلْتُ: لَقِيْتُ عُمَرَ فَأَخْبَرْتُهُ بِالَّذِيْ بَعَثْتَنِيْ بِهٖ، فَضَرَبَ بَيْنَ ثَدْيَيَّ ضَرْبَةً خَرَرْتُ لِإِسْتِي فَقَالَ: اِرْجِعْ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "يَاعُمَرُ! مَاحَمَلَكَ عَلٰى مَا فَعَلْتَ؟" قَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! بِأَبِيْ أَنْتَ وَأُمِّي، أَبَعَثْتَ أَبَاهُرَيْرَةَ بِنَعْلَيْكَ، مَنْ لَقِيَ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِناً بِهَا قَلْبُهُ بَشَّرَهُ بِالْجَنَّةِ؟ قَالَ: "نَعَمْ" قَالَ: فَلَا تَفْعَلْ، فَإِنِّيْ أَخْشَىْ أَنْ يَتَّكِلَ النَّاسُ عَلَيْهَا، فَخَلِّهِمْ يَعْمَلُوْنَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "فَخَلِّهِمْ" (رواه مسلم)(١)

ترجمه:- حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ (ایک دن) ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور ہمارے ساتھ ابوبکر و عمرؓ بھی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اچانک ہمارے

(١) أخرجه مسلم في الإيمان، باب الدليل على أن من مات على التوحيد دخل الجنة قطعاً ١ / ٤٤.

درمیان سے اٹھے (اور باہر تشریف لے گئے)جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گئے ہوئے بہت دیر ہوگئی تو ہمیں ڈر ہوا کہ ہماری غیر موجودگی میں آپ کو تکلیف نہ پہنچادی جائے، ہم گھبرائے اوراٹھ کھڑے ہوئے اور میں پہلا وہ شخص تھا جو گھبرایا، پس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں باہر نکلا اور تلاش کرتا ہوا قبیلہ بنی النجار کے ایک انصاری کے باغ کے قریب پہنچ گیا (اس خیال سے کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس باغ کے اندر ہوں) میں نے (اندر جانے کے لئے)دروازہ تلاش کیا، مگر دروازہ نہیں مل سکا، اچانک ایک نالی نظر آئی جو باہر کے کنویں سے باغ کے اندر جارہی تھی، میں سمٹ کر اس نالی میں داخل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارکہ میں پہنچ گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوہریرہ تم ہو؟ میں نے عرض کیا جی ہاں: یارسول اللہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا بات ہے؟ میں نے عرض
کیا: یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تشریف فرما تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے (اور باہر) تشریف لے گئے جب بہت دیر ہوگئی (اور واپس تشریف نہیں لائے) تو ہم گھبرا گئے کہ کہیں ہماری غیر موجودگی میں آپ کو تکلیف نہ پہنچادی جائے، اور سب سے پہلے گھبراہٹ میرے اوپر طاری ہوئی، چنانچہ میں آپ کو تلاش کرتا ہوا اس باغ تک آ گیا، (یہاں دروازہ نظر نہیں آیا) تو لومڑی کی طرح سکڑ کر (نالی کے راستہ سے) اندر داخل ہوگیا اور لوگ بھی میرے پیچھے آرہے ہیں، (یہ سن کر) آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنی دونوں جوتیاں نکال کر مجھے دیں، اور فرمایا: اے ابوہریرہ! جاؤ ان جوتیوں کو ساتھ لیجاؤ (تاکہ لوگ جان لیں کہ تم میرے پاس سے آئے ہو) اور باغ کے باہر جو شخص صدق دل اور پختہ اعتقاد کے ساتھ یہ گواہی دینے والا تمہیں ملے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس کو جنت کی بشارت دیدو، حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ: (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پیغام کو لیکر میں باہر نکلا تو) سب سے پہلے حضرت عمرؓ سے میری ملاقات ہوئی انہوں نے پوچھا ابوہریرہؓ یہ جوتیاں کیسی ہیں؟ میں نے کہا: یہ جوتیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ جوتیاں (نشانی کے طور پر) دے کر اس لئے بھیجا ہے کہ جو شخص صدق دل اور پختہ اعتقاد کے ساتھ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس کو جنت کی بشارت دیدوں، یہ سن کر عمرؓ نے میرے سینے پر اتنے زور سے ہاتھ مارا

کہ میں سرین کے بل نیچے گر پڑا، اور پھر انہوں نے کہا: ابوہریرہؓ! جاؤ، واپس چلے جاؤ، چنانچہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس لوٹ آیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، ادھر عمرؓ کا خوف مجھ پر سوار ہی تھا کہ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آ پہنچے، سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حالت دیکھ کر پوچھا، ابوہریرہ کیا ہوگیا؟ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ میں آپ کا پیغام لیکر باہر نکلا تو سب سے پہلے میری ملاقات حضرت عمرؓ سے ہوئی، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ان تک پہنچایا، انہوں نے اسکو سنکر میرے سینے پر اس طرح ہاتھ مارا کہ میں سرین کے بل زمین پر گر پڑا اور انہوں نے کہا کہ: واپس چلے جاؤ، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت عمرؓ سے پوچھا) عمر! تم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے کہا یارسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان؛ کیا واقعی آپ نے ابوہریرہؓ کو اپنی جوتیاں دیکر اس لئے بھیجا تھا کہ جو شخص صدق دل اور پختہ اعتقاد کے ساتھ لاالہ الا اللہ کی گواہی دیتا ہو، اسے جنت کی بشارت دے دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ایسا نہ کیجئے، مجھے ڈر ہے کہ لوگ کہیں اسی بشارت پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں (اور عمل کرنا چھوڑ دیں) اس لئے آپ ان کو ایسے ہی چھوڑ دیجئے، عمل میں لگے رہنے دیجئے، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا (کہ ٹھیک ہے)'' پھر ان کو چھوڑ دو (عمل میں لگا رہنے دو)۔ (مسلم)

تشریحِ حدیث

واقعۂ حدیث:

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس لگی ہوئی تھی، صحابہ کرامؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ بھی تشریف فرما تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجلس سے کھڑے ہوئے اور کہیں تشریف لے گئے، جب کافی دیر ہوگئی تو صحابہ کو فکر لاحق ہوئی، کیونکہ مدینہ میں بھی دشمن بہت تھے، صحابہ گھبرائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں وہاں سے نکلے، ابوہریرہؓ بنونجار کے ایک باغ کے پاس پہنچے، اس کا دروازہ نہیں ملا تو پانی کی نالی میں سے اندر داخل ہوگئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا ہوا؟ ابوہریرہؓ نے پورا واقعہ بیان کیا اور بتایا کہ باقی لوگ بھی میرے پیچھے آرہے ہیں، حضور صلی اللہ

علیہ وسلم نے اپنے نعل مبارک ان کو دیئے اور فرمایا کہ جو شخص صدقِ دل سے اللہ کی وحدانیت کی گواہی دے اس کو جنت کی بشارت سنادو، چنانچہ میں باہر نکلا سب سے پہلے عمرؓ سے میری ملاقات ہوئی، میں نے ان سے قصہ بتایا اس پر عمرؓ نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا جس سے میں سرین کے بل گر گیا اور مجھے واپس ہونے کا حکم دیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وجہ پوچھی تو میں نے واقعہ بیان کیا، اتنے میں عمرؓ بھی پہنچ گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تو عمرؓ نے اقرار کیا اور عرض کیا کہ: لوگوں کو اس کی بشارت نہ سنائیں ورنہ وہ اسی پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ٹھیک ہے ان کو چھوڑ دو یعنی لوگوں کو اس کی اطلاع نہ دو۔

کلمۂ ایمان کی تصدیق واقرار پر دخول جنت کی بشارت:

اس حدیث میں بھی مذکورہ واقعہ کے ضمن میں کلمۂ ایمان کے فائدہ کو بیان کا گیا ہے کہ جو قلبی یقین وتصدیق کے ساتھ اس کا اقرار کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔

کنا قعودا: قعود یا قاعد کی جمع ہے، یا مصدر ہے، مصدر قرار دیں تو مصدر کا حمل ذات پر لازم آئے گا، جو درست نہیں، اس لئے مصدر ہونے کی صورت میں قعود سے پہلے ذی مقدر ہوگا أی **کنا ذی قعود** اس صورت میں ذات کا حمل ذات پر ہوگا نہ کہ مصدر پر۔ (۱)

صحابہ میں ابوبکرؓ وعمرؓ کا مقام ومرتبہ:

ومعنا ابوبکر وعمر الخ: حضرت ابوہریرہؓ نے اہل مجلس میں سے صرف حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کا تذکرہ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب کی عادت تھی کہ پوری جماعت کا نام لینے کے بجائے صرف اشراف وسربراہوں کا نام لیتے تھے اس سے پوری جماعت کی حیثیت سمجھ میں آجاتی تھی۔

بین اظھرنا: یہ جمع ہے "ظہر" کی، اور یہ لفظ تحسین کلام کے لئے بڑھایا گیا ہے، اصل عبارت ہے: **فقام من بیننا**، ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ اس لفظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، ہمارا سہارا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات مبارکہ تھی کہ ظہر سہارے کا ذریعہ ہے اور آپ ہی ہمارے سردار تھے۔ (۲)

(۱) المرقاۃ ۱/ ۱۹۱.

(۲) مرقاۃ المفاتیح / ۱۹۱.

خشينــا وفـزعنـا: علامہ طیبی نے کہا کہ یہ دونوں مترادف ہیں، ایک مترادف کا دوسرے مترادف پرعطف ہے، دونوں کے معنی ڈرنے کے ہیں[1] ملاعلی قاری کا رجحان یہ ہے کہ دونوں کے مفہوم میں اعتباری فرق ہے، وہ یہ کہ خشیت کا تعلق قلب کے ساتھ اور فزع کا تعلق ظاہری اعضاء وجوارح کے ساتھ ہے، اعضاء وجوارح پر گھبراہٹ کے جو آثار ظاہر ہوں اس کو ''فزع'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[2]

ان تــقتــطــع: اقتطاع کے معنی ہیں ایک شے کو دوسری شے سے جدا کردینا، یہاں پر مراد ہے ''ان يصاب بمكروه'' کہ مبادا کوئی تکلیف پہنچ جائے۔[3]

دوننا: یعنی ہماری غیر موجودگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف پہنچے یہ ہمیں پسند نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پہلے ہماری جانیں جانی چاہئیں۔

حتــى أتيــت حـائطاً الخ: ''حائط'' سے مراد باغ ہے اہل عرب حفاظت کے مقصد سے باغ کی چہاردیواری بنایا کرتے تھے گویا باغ کے لئے دیوار لازم تھی، اس لئے لازم بول کر ملزوم مراد لیا ہے۔

حضرت ابو ہریرۃؓ کو کیسے معلوم ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ہیں؟ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم علمی مجلس سے اٹھ کر گئے تھے تو انہوں نے اندازہ لگایا کہ ذہنی سکون حاصل کرنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم باغ میں گئے ہوں گے، اور صحیح بات تو یہ ہے کہ عاشق کو معشوق کی بوآجاتی ہے اور اللہ مدد کرتا ہے۔

فلم اجد به باباً: سوال ہوتا ہے کہ دروازہ کیوں نہیں ملا؟ جواب یہ ہے کہ شدت فزع کی وجہ سے دروازہ نظر نہیں آیا، یا پھر دروازہ دیوار کے ساتھ اس طور سے لگا ہوا ہو کہ وہ محسوس نہ ہوسکا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابو ہریرۃؓ نے پوری دیوار کا چکر نہ لگایا ہو، اول وہلہ میں ہی نالی نظر آگئی ہو، اور اسی سے داخل ہوگئے ہوں۔

والـربيع الجدول: یہ حدیث کا جملہ نہیں بلکہ بعض رواۃ کی طرف سے ربیع کی تفسیر ہے، جدول بمعنی گول، نالی، چھوٹی نہر۔

---

(۱)طیبی طاب الله ثراه ۱ / ۱۸۵ .
(۲)المرقاة ۱ / ۱۹۱ .
(۳)شرح الطيبي ۱ / ۱۸۵ .

من بئر خارجة : حافظ ابوموسی اصفہانی نے ان الفاظ کو تین طریقے سے ضبط کیا ہے:

(۱) ''بئر'' اور''خارجۃ'' دونوں کو تنوین کے ساتھ پڑھا جائے، اس صورت میں دونوں موصوف صفت ہونگے، اور معنی ہوں گے کہ: ایسے کنویں سے جو باغ کے باہر تھا۔

(۲)''بئر'' پرتنوین ہواور''خارجہ'' میں صیغہ اسم فاعل کومضاف کیا جائے ہاضمیر کی طرف، اورجیم پرفتحہ پڑھا جائے ظرف یا حال ہونے کی بنا پر أي: بئـر خارجَه،ضمیر کا مرجع حائط (باغ) ہوگا، أي: البير في موضع خارج عن الحائط یعنی نالی داخل ہورہی تھی ایسے کنوین سے جو باغ سے باہر تھا۔

(۳)''بئر'' کی اضافت''خارجۃ'' (تاء مدورہ کے ساتھ) کی طرف ہو،''خارجۃ'' ایک شخص کا نام ہے، اس وقت خارجۃ غیرمنصرف ہوگا اوراس پرفتحہ آئے گا،ترجمہ یہ ہوگا: وہ نالی خارجہ نامی شخص کے کنویں سے داخل ہورہی تھی۔

حافظ ابن صلاح نے پہلا ضبط نقل کیا ہے، اور امام نووی نے اسی کومشہور کہا ہے۔ (۱)

فقال:أبوهريرة: اس میں ہمزۂ استفہام محذوف ہے، اصل عبارت اس طرح ہے: أأنت أبوهريرة؟

یہ استفہام کیسا ہے؟ بعض نے کہا کہ یہ استفہام حقیقی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پراس وقت استغراق کی کیفیت تھی اس لئے اول وہلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابوہریرۃؓ کو پہچان نہیں سکے اس لئے سوال کیا،بعض نے کہا کہ استفہام برائے تعجب ہے کہ باغ کا دروازہ بند ہے، پھراندر کیسے آ گئے؟ اس پرابوہریرۃؓ نے واقعہ بیان کیا۔ (۲)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نعلین مبارکین عطاء فرمانا:

اذهب بنعليّ الخ:دونوں جوتوں کا دینا زیادتی اعتماد کے لئے تھا ورنہ ابوہریرۃؓ خود ثقہ تھے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سلامتی اورخیریت کے اظہار کے لئے ان کو جوتے دیئے ہوں، کیونکہ صحابہ آپ کے اس طرح چلے جانے اورواپس نہ آنے سے آپ کی جانب سے گھبراہٹ میں مبتلا تھے۔

سوال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جوتے دیئے کوئی اور چیز کیوں نہیں دی؟

(۱)بعض نے کہا کہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جوتوں کے علاوہ کچھ اورنہیں تھا۔

---

(۱)شرح النووي ۱/ ٤٥،والمرقاة ۱/ ۱۹۱.

(۲)طيبي طاب الله ثراه ۱/ ۱۸٦.

(۲) بعض نے کہا کہ جوتے قدم میں پہنے جاتے ہیں اشارہ اس طرف تھا کہ کلمہ اس وقت مفید ہوگا جب کہ آدمی اس پر ثابت قدم رہے۔

(۳) بعض نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوتے نکالے اس سے اشارہ تھا کہ میری شریعت میں قید و بند اور مشکل احکامات نہیں ہیں۔

(۴) بعض نے کہا کہ امت کو یہ پیغام دینا تھا کہ جس طرح میں نے جوتے نکالے اسی طرح تمہیں بھی قلب سے دنیا کی محبت نکالدینی چاہئے۔ (۱)

فمن لقیک من وراء هذا......الخ: مذکورہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوہریرہؓ کو جو بشارت دے کر بھیجا تھا وہ کس کے لئے تھی؟ صرف انہیں صحابہ کے لئے جو آپ کو تلاش کرنے آئے تھے یا تمام امت کے لئے؟ اس میں شراح کے دونوں قول ہیں، تمام امت کے لئے ہونا راجح ہے، کیونکہ دیگر احادیث سے اس طرح کی بشارت تمام کے لئے ثابت ہے۔

حضرت عمر وابوہریرہؓ کے مابین مباحثہ:

فضرب عمر الخ: حضرت عمرؓ نے ابوہریرہؓ کو مارا، یہاں مضمون میں اختصار ہے، ملا علی قاری نے فرمایا کہ سیاق وسباق کا تقاضہ یہ ہے کہ یہاں دو جملے مقدر ہوں، وہ یہ کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کو واپس جانے کے لئے فرمایا، حضرت ابوہریرہؓ نے ان کی بات نہیں مانی، اس پر حضرت عمرؓ نے تنبیہ کے طور پر ان کے سینہ پر ہاتھ مارا، یہ مارنا بطور تادیب وتنبیہ کے تھا، جیسے استاذ شاگرد کو تنبیہ کرتا ہے، کیوں کہ ابوہریرہؓ متعلم کے درجہ میں تھے اور حضرت عمرؓ معلم کے درجہ میں۔

اور یہ توجیہ بھی ہوسکتی ہے کہ حضرت عمرؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیر بھی تھے، ان کو عام صحابہ تک اس پیغام کا پہنچنا خلاف مصلحت معلوم ہوا، اس لئے انہوں نے ابوہریرہؓ کو اس سے روکنا چاہا، مگر ابوہریرہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے پیش نظر ہر حال میں اس کو عام صحابہ تک پہنچانا چاہتے تھے، حضرت عمر کو جب یہ محسوس ہوا کہ وہ اس پیغام کو ضرور پہنچا کر رہیں گے، تو انہوں نے اپنے منصب کا استعمال کرتے ہوئے ان کو پیچھے کو دھکا دیا اور زبردستی ان کو واپس لوٹانے کی کوشش کی، ابوہریرہؓ کو عمر فاروقؓ سے اس طرز عمل کی توقع نہ تھی،

(۱) مرقاة المفاتيح ۱ / ۱۹۲ مطبوعه اشرفيه ديوبند.

چنانچہ حضرت عمرؓ کی جانب سے اس خلاف توقع طرز عمل کے ظاہر ہونے کے بعد وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس ہوئے اور پوری صورت حال بیان کی، واللہ اعلم

فخررت لإستي: ''اِستٌ''، بمعنی سرین، یعنی میں سرین کے بل پیچھے کو گر گیا۔

فأجهشت: اجہاش کے معنی ہیں روتے ہوئے فریاد کرنا، مرادی ترجمہ ہے: پھوٹ پھوٹ کر رونا۔

اِثرىٰ: بمعنی نشان قدم، اس میں بفتحتین اور بفتح الاول وسکون الثانی دونوں ضبط ہیں۔

أبعثت أباهريرة ......الخ: حضرت عمرؓ کے استفسار کا منشاء رفع اشتباہ تھا کہ ممکن ہے حضرت ابو ہریرہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء کو سمجھ نہ سکے ہوں، بے اعتمادی منشاء نہ تھا۔

ایک سوال وجواب:

سوال: جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دینے کے لئے بھیجا تھا تو حضرت عمرؓ نے کیوں روکا؟

جواب: وہ بشارت تو صحیح تھی، لیکن اس کا اظہار اس وقت مصلحت تھا یا نہیں؟ یہ غور طلب تھا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر استغراقی کیفیت تھی اور صفات جمالیہ کا غلبہ تھا اس لئے مصلحت پر نظر نہیں گئی اور بشارت سنانے کا حکم دیدیا، حضرت عمرؓ مظہر جلال تھے ان پر اس طرح کی کیفیت بھی نہیں تھی اور وہ آپکے مشیر بھی تھے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، اس لئے ان کو اس بشارت سے لوگوں کے ترکِ عمل کا اندیشہ ہوا، چنانچہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس مصلحت کا اظہار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سے اتفاق کیا اور اس بشارت کے سنانے سے منع کردیا، اس کا حاصل یہ ہوا کہ امت کے روحانی معالجہ میں حضرت عمرؓ کی رائے بجائے مفرد دوا کے معجون مرکب کی تھی کہ ایمان بھی ہو اور اعمال بھی ورنہ لوگ صرف ایمان پر اکتفاء کر بیٹھیں گے۔

اس حدیث سے محض ایمان کا نجات کے لئے کافی ہونا ثابت ہوتا ہے اس میں حسب سابق نو جوابات جاری ہونگے۔ (۱)

دوسرے کی زمین میں بلا اجازت داخل ہونا:

اس روایت سے معلوم ہوا کہ دوسرے کی زمین میں بلاصریح اذن داخل ہونا جائز ہے جب کہ دلالۃً

(۱) شرح الطيبي ۱/۱۸۷، والمرقاة ۱/۱۹۳، والمرعاة ۱/۱۱۰.

اجازت ہو، دلالۃً اجازت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مالک کے متعلق یقین یا ظن غالب ہو کہ معلوم ہونے پر اس کو ناگواری نہ ہوگی، جیسا کہ ابو ہریرہؓ اس انصاری کے باغ میں داخل ہوگئے، حالانکہ صریح اجازت نہیں تھی۔

۳۶/۳۷ وَعَنْ مُعَاذِ بنِ جَبَلٍؓ قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "مَفَاتِيحُ الْجَنَّةِ شَهَادَةُ أَنْ لاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" (رواہ أحمد)(۱)

ترجمہ:-حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جنت کی کنجیاں اس بات کی گواہی دینا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔(احمد)

تشریح حدیث

جنت کی چابی:

اس حدیث میں جنت کو تشبیہ دی گئی ہے شئ مقفل کے ساتھ، ایسی چیز جس پر تالا لگا ہو تو اس کے لئے چابی چاہئے: اور جنت کی چابی وحدانیت ورسالت کی شہادت ہے، جو اس کی شہادت دے گا اس کے لئے جنت کا تالا کھل جائے گا یعنی وہ جنت میں داخل ہوجائے گا۔

مبتدا و خبر میں عدم مطابقت کا اشکال:

مفاتیح الجنۃ شہادۃ لاالہ الا اللہ: اس جملہ میں "**مفاتیح**" مبتدا ہے اور "**شہادۃ**" خبر ہے، یہاں مبتدا اور خبر کے درمیان افراد وجمع میں یکسانیت نہیں ہے، حالانکہ دونوں میں مطابقت ضروری ہے، اس کے لئے مبتدا یا خبر میں سے کسی ایک میں تاویل کی جائے گی، چنانچہ مبتدا میں دو تاویلیں اور خبر میں بھی دو تاویلیں کی گئی ہیں، جانب مبتدا کی دو تاویلیں یہ ہیں:

(۱) مفاتیح اگرچہ لفظاً جمع ہے مگر معنیً واحد ہے، اس لئے کہ تالے کی چابی باعتبار نوعیت تو ایک ہی ہوگی اور لفظاً اس لئے جمع لایا گیا ہے کہ ایک چابی میں دندانے متعدد ہوتے ہیں۔

(۲) اہل عرب بعض مرتبہ مفرد کو جمع سے تعبیر کرتے ہیں جیسے مَعِيْ جِيَاعٌ (میرے ساتھ کئی بھوکی اونٹنیاں ہیں) حالانکہ اونٹنی ایک ہوتی ہے۔

---

(۱) أخرجه احمد ۵/۲۴۲ برقم ۲۲۱۵۵.

اور جانب خبر کی دو تاویلیں یہ ہیں:

(۱) شہادة جنس ہے، جنس کا اطلاق قلیل وکثیر سب پر ہوتا ہے لہٰذا یہاں شہادت سے جمع مراد ہے کیونکہ ہر شخص کے لئے الگ الگ شہادت ضروری ہے، اس صورت میں مطابقت ہوگئی۔

(۲) شہادة سے یہاں تثنیہ مراد ہے اسلئے کہ یہاں دو چیزوں کی گواہی مراد ہے ایک وحدانیت کی اور ایک رسالت کی اور تثنیہ بھی جمع کے حکم میں ہوتا ہے الاثنان و مافوقھما جماعة۔[1]

۳۸/۳۷ وَعَنْ عُثْمَانَ قال: إنَّ رِجَالاً مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ تُوُفِّي حَزِنُوْا عَلَيْهِ، حَتّٰى كَادَ بَعْضُهُمْ يُوَسْوِسُ، قَالَ عُثْمَانُ وَكُنْتُ مِنْهُمْ، فَبَيْنَا أَنَاجَالِسٌ مَرَّعَلَيَّ عُمَرُ، وَسَلَّمَ، فَلَمْ أَشْعُرْبِهِ، فَاشْتَكٰى عُمَرُ إِلٰى أَبِيْ بَكْرٍ رضى الله عنهما، ثُمَّ أَقْبَلا، حَتّٰى سَلَّمَا عَلَيَّ جَمِيْعاً، فَقَالَ أَبُوْبكر: مَاحَمَلَكَ أَنْ لاتَرُدَّ عَلٰى أَخِيْكَ عُمَرَ سَلامَهُ؟ قُلْتُ: مَافَعَلْتُ، فَقَالَ عُمَرُ: بَلٰى، وَاللّٰهِ لَقَدْ فَعَلْتَ، قَالَ: قُلْتُ وَاللّٰهِ مَاشَعَرْتُ أَنَّكَ مَرَرْتَ وَلاسَلَّمْتَ، قَالَ أَبُوْبكر: صَدَقَ عُثْمَانُ، قَدْ شَغَلَكَ عَنْ ذٰلِكَ أَمْرٌ، فَقُلْتُ: أَجَلْ قَالَ مَاهُوَ؟ قُلْت: تَوَفَّى اللّٰهُ تَعَالٰى نَبِيَّهُ صلى الله عليه وسلم قَبْلَ أَنْ نَسْأَلَهُ عَنْ نَجَاةِ هٰذَا الْأَمْرِ، قَالَ أَبُوْبَكْرٍ: قدسألته عن ذلک، فَقُمْتُ إِلَيْهِ وَقُلْتُ لَهُ: بِأَبِيْ أَنْتَ وَأُمِّي، أَنْتَ أَحَقُّ بِهَا، قَالَ أَبُوْبَكْرٍ: قُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! مَانَجَاةُ هٰذَا الْأَمْرِ؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "مَنْ قَبِلَ مِنِّى الكلمةَ الَّتِيْ عَرَضْتُ عَلٰى عَمِّي فَرَدَّهَا، فَهِيَ لَهُ نَجَاةٌ" (رواہ احمد[2])

ترجمہ: -حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو صحابہ کرام پر رنج وحزن کا غلبہ تھا حتی کہ یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ بعض لوگ وسوسہ کے اندر مبتلا نہ ہوجائیں، حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں میں سے ایک میں بھی تھا چنانچہ میں (غم کی حالت میں) بیٹھا تھا کہ حضرت عمرؓ میرے پاس سے گزرے اور سلام کیا، مجھے اس کا احساس نہ ہوا (کہ وہ کب میرے پاس سے گزرے اور کب سلام کیا) حضرت عمرؓ نے اس بات

(۱) المرقاة ۱/۱۹۵.

(۲) أخرجه احمد ۱/۶ برقم ۲۰ و ۲۴، ۱۰/۷ برقم ۳۷.

کی شکایت حضرت ابوبکرؓ سے کی، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں حضرات (میرے پاس) تشریف لائے اور دونوں حضرات نے مجھے سلام کیا، حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے پوچھا، تم نے اپنے بھائی عمرؓ کے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا تھا؟ میں نے عرض کیا "میں نے تو ایسا نہیں کیا" (یعنی مجھے اس کا علم نہیں ہے کہ عمرؓ نے آ کر سلام کیا ہو اور میں نے جواب نہ دیا ہو) حضرت عمرؓ نے فرمایا: کیوں نہیں؟ خدا کی قسم تم نے ایسا کیا ہے (یعنی میرے سلام کا جواب نہیں دیا) حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا اللہ کی قسم مجھے بالکل اس کا احساس نہیں ہوا کہ آپ میرے پاس سے گزرے اور نہ ہی آپ نے سلام کیا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: عثمان سچ کہتے ہیں (لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) آپ کو کسی خاص معاملہ نے اس احساس سے روک دیا ہے (کہ نہ تو تمہیں عمرؓ کے آنے کی خبر ہوئی اور نہ تم ان کے سلام کا جواب دے سکے) میں نے عرض کیا: جی ہاں! ایسا ہی ہے، انہوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ: حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے وفات دیدی، لیکن ہم آپ سے یہ دریافت نہ کر سکے کہ اس معاملہ سے نجات کا ذریعہ کیا ہے؟ ابوبکرؓ نے فرمایا کہ (تم غم نہ کرو) میں اس سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر چکا ہوں، پس میں خوشی میں کھڑا ہو گیا اور میں نے ان سے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں واقعی آپ ہی (فضیلتوں اور کمالات میں سبقت لیجانے والے ہونے کی وجہ سے) یہ سوال کرنے کے زیادہ مستحق تھے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: میں نے عرض کیا تھا کہ: یارسول اللہ! اس معاملہ میں نجات کی صورت کیا ہوگی؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جس شخص نے (خلوص دل کے ساتھ) مجھ سے وہ کلمہ توحید قبول کر لیا جسے میں نے اپنے چچا کے سامنے پیش کیا تھا اور انہوں نے اس کو رد کر دیا تھا تو وہ کلمہ اس شخص کی نجات کے لئے کافی ہوگا۔ (احمد)

تشریحِ حدیث

واقعۂ حدیث:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جب وفات ہوگئی تو بڑے بڑے صحابہؓ ہوش کھو بیٹھے، حتی کہ بہت سے

صحابہ کو وسوسہ آنے لگا کہ اب اسلام ختم ہوجائے گا، حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ میں بھی انہی لوگوں میں تھا، ایک جگہ میں اسی فکر میں بیٹھا ہوا تھا کہ عمرؓ میرے پاس سے گزرے اور سلام کیا، لیکن مجھے ان کے آنے کا اور سلام کا پتہ نہیں چلا، انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے اس کی شکایت کی، پھر حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ دونوں میرے پاس آئے اور سلام کیا، حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کہ تم نے عمرؓ کے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا؟ میں نے کہا کہ میں نے تو ایسا نہیں کیا، حضرت عمرؓ نے قسم کھا کر فرمایا کہ تم نے ایسا ہی کیا ہے، میں نے کہا کہ اللہ کی قسم آپ کے آنے کا اور آپ کے سلام کا مجھے پتہ نہیں چلا، اس پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ ہاں عثمان سچ کہتے ہیں، کسی معاملہ میں غور و فکر کی وجہ سے ان کو پتہ نہیں چلا ہوگا، میں نے کہا: جی ایسا ہی ہے، حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کہ تم کیا سوچ رہے تھے؟ تو میں نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے وفات دے دی، لیکن ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نہ معلوم کر سکے کہ اس امر سے نجات کیسے ہوگی؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں اس امر کے بارے میں پوچھ چکا ہوں، تو میں ان کی طرف محبت میں لپکا اور میں نے کہا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ ہی اس سوال کے زیادہ حقدار تھے، آپ کو تمام فضیلتیں اور سبقتیں حاصل ہیں، پھر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا ''مانجاة هذا الأمر؟'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اس کلمہ کو قبول کرلے جو میں نے اپنے چچا پر پیش کیا تھا جس کو انہوں نے رد کردیا تھا تو وہ کلمہ اس کی نجات کے لئے کافی ہے۔

کلمۂ اسلام جہنم سے نجات کا وسیلہ:

اس حدیث میں کلمۂ اسلام کا فائدہ مذکور ہے کہ اس کلمہ میں ہر مشکل سے نجات ہے، حتی کہ جہنم سے بھی، جیسا کہ اوپر واقعہ سے معلوم ہوا۔

کاد بعضهم یوسوس: یہ وسوسہ انقطاعِ دین اور شریعتِ غراء کے نور کے بجھ جانے کا تھا جو بہت محنت و مشقت سے حاصل ہوا تھا۔

فاشتکی عمر إلی أبی بکر: سوال ہوتا ہے کہ سلام کا جواب نہ دینا کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ اس کی کسی سے شکایت کی جائے، پھر حضرت عمرؓ نے کیوں شکایت کی؟

جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کو محسوس ہوا کہ شاید عثمانؓ کے دل میں میری طرف سے کچھ خلش ہے،

جس کی بناء پر ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی ہے، اگر ابھی سے ہمارے اندر نفرت پیدا ہوجائے تو ہم اسلام کی کیا خدمت کریں گے، یہ بہت اہم بات تھی اور اعلیٰ سوچ تھی اس لئے شکایت کی اور خود حضرت عثمانؓ سے اس لئے نہیں کہا کہ وہ اور ناراض ہوجائیں گے بلکہ حضرت ابوبکرؓ سے کہا، کیونکہ وہ دونوں کے بڑے تھے۔

باہمی نفرت وکدورت مٹانے کا ایک ادب وطریقہ:

اس سے معاشرت کا ادب معلوم ہوا کہ اگر دوساتھیوں کے درمیان کوئی بات ہوجائے تو درمیان میں کسی عقلمند کو ڈال لینا چاہئے، اور کدورت ومیل کو ختم کرلینا چاہئے، ورنہ پھر وہ بغض وعداوت میں تبدیل ہوجائے گا اور دینی ودنیوی فساد پیدا ہوگا۔

عن نجاة هذا الأمر: اس کی مراد میں شراح کے مختلف اقوال ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ نجاۃ سے مراد: **نجاة عن نار جهنم** اور ''**هذا الامر**'' سے امر دین مراد ہے، یعنی اس دین میں جہنم سے نجات کا مدار کس چیز پر ہے؟ تو فرمایا کہ نجات کا مدار اس دین میں وہ کلمہ ہے جس کو میں نے اپنے چچا پر پیش کیا تھا۔

(۲) بعض نے کہا کہ ''**هذا الامر**'' سے مراد **ماعليه الناس من حب الدنيا و الشهوات** ہے یعنی وہ حب دنیا اور شہوات جو لوگوں میں پائی جاتی ہیں، اس سے نجات کا کیا راستہ ہے، اس کا جواب بھی یہی ہے کہ اس سے نجات کلمہ کے ذریعہ ملے گی۔

(۳) بعض نے کہا کہ ''**هذا الامر**'' سے مراد ہے وسوسہ کی وہ حالت جس پر صحابہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی وفات کے وقت تھے یعنی ہم لوگوں کو اگر کسی وقت انقطاع دین کا وسوسہ آنے لگے تو اس سے نجات کیسے حاصل ہوگی؟ اس کا جواب بھی وہی ہوگا۔(۱)

الحاصل سوال میں کئی احتمال ہیں لیکن جواب تمام سوالوں کا ایک ہی ہے۔

فلم أشعر به: ''**به**'' کی ضمیر کا مرجع بعض نے کہا مرورِ عمر اور بعض نے کہا کہ اس کا مرجع ہے سلامِ عمر، راجح یہ ہے کہ اس کا مرجع دونوں چیز ہیں جو المذکور کی تاویل میں ہیں۔(۲)

(۱) شرح المشكاة للطيبي ۱/۱۸۹.

(۲) مرعاة المفاتيح ۱/۳۰۵.

۳۹ / ۳۸ وَعَنِ الـمِقْدَادُ ؓ أنه سمع رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: "لايَبْـقـٰى عَـلٰى ظَهْرِ الْأَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلاوَبَرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الإِسْلاَمِ بِعِزِّعَزِيْزٍ وَذُلِّ ذَلِيْلٍ، إِمَّا يُعِزُّهُمُ اللّٰهُ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ أَهْلِهَا، أَوْيُذِلُّهُمْ فَيَدِيْنُوْنَ لَهَا" قُلْتُ: فَيَكُوْنُ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ. (رواه أحمد)(۱)

ترجمه :-حضرت مقداد ؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ روئے زمین پر کوئی گھر خواہ مٹی کا ہو یا اونٹ کے بالوں کا ایسا باقی نہیں رہے گا کہ جس میں اللہ تعالیٰ اسلام کے کلمہ کو معزز کی عزت کے ساتھ اور ذلیل کی رسوائی کے ساتھ داخل نہ کرے (پس جو لوگ خوشی سے اسلام قبول کریں گے) ان کو اللہ تعالیٰ معزز بنا کر اس کلمہ کا اہل قرار دے گا، یا حق تعالیٰ شانہ ان کو (جو بخوشی قبول نہ کریں) ذلیل کرے گا پھر وہ اس کلمہ کے تابع اور منقاد ہو جائیں گے (بایں طور کہ وہ جزیہ اداء کریں گے) میں نے (خوش ہوکر) عرض کیا پھر تو چاروں طرف اللہ ہی کا دین ہوگا۔ (احمد)

تشریحِ حدیث

احوال مقداد ؓ:

مقداد بن عمرو بن ثعلبہ الکندی، ان کو مقداد بن اسود بھی کہا جاتا ہے، کندی: قبیلہ کی طرف نسبت ہے، لیکن آپ کندہ قبیلہ سے نہیں تھے بلکہ ان کے والد عمرو بن ثعلبہ کندہ قبیلہ کے حلیف تھے، اور ان کی وہاں شادی ہوئی تھی، مقداد وہیں پیدا ہوئے تھے، ان کو مقداد بن اسود اس لئے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بنو کندہ کے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا اور بھاگ کر مکہ آ گئے تھے، اور اسود بن عبد یغوث کے حلیف ہو گئے تھے، پھر اس نے ان کو متبنیٰ بھی بنالیا تھا، اس وقت سے مقداد بن اسود کے نام سے پکارے جانے لگے، لیکن جب "ادعوهم لآبـــائهـم" آیت کریمہ نازل ہوئی تو پھر اپنے والد کی طرف منسوب کئے جانے لگے، قدیم الاسلام صحابی ہیں، تمام غزوات میں شریک ہوئے، غزوہ بدر میں صرف انہی کے پاس گھوڑا تھا، اس لئے "اول من قَاتَلَ

(۱) مسند أحمد ۳۹ / ۲۳٦ (۲۳۸۱٤)

فـي سبيـل الله على فَرَس ‘‘ کہلاتے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چچازاد بہن زبیر بن عبدالمطلب کی صاحبزادی ضباعہ سے نکاح ہوا تھا۔

ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ نے مجھے چار لوگوں سے محبت کا حکم دیا اور فرمایا کہ یہ بھی ان کو بتادو کہ اللہ بھی ان سے محبت رکھتا ہے، مقداد، علی، ابوذر، اور سلمان فارسی، ان کے انتقال کا بھی عجیب واقعہ ہے، وہ یہ کہ لحیم وشحیم تھے، پیٹ موٹا تھا، غلام نے کہا کہ میں پیٹ چیر کر زائد چربی نکال دونگا، چنانچہ اس نے یہ عمل کیا اور اوپر سے ٹانکے لگادیئے، اسی وقت انتقال ہوگیا اور غلام ڈر کر فرار ہوگیا، ۳۳ھ میں خلافت عثمانی میں آپ کا انتقال ہوا ہے، حضرت عثمان بن عفانؓ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع میں مدفون ہوئے، آپ کی عمر مبارک (۷۰) سال ہوئی ہے۔ (۱)

کلمۂ اسلام ہر کچے پکے گھر میں پہنچے گا:

اس حدیث میں اسلام اور کلمۂ اسلام کے غلبہ کا بیان ہے، کہ ایک وقت آئے گا کہ یہ کلمہ ہر گھر میں پہنچے گا۔

صحابہ کرام مکہ میں پریشان تھے اور عبادات بھی چھپ کرادا کرتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ عنقریب ایسا وقت آنے والا ہے کہ اسلام کا غلبہ ہوجائے گا اور کلمہ کی دعوت ہر گھر میں پہنچے گی، پھر اس کے بعد دو طرح کے لوگ ہوں گے: ایک وہ جو اس کلمہ کو بخوشی اور باعزت طریقے سے قبول کریں گے، اللہ ان کو مرتے دم تک ایمان پر قائم رکھ کر اور زیادہ عزت دے گا اور بعض ایسے ہوں گے جو کلمہ کی دعوت کو قبول نہیں کریں گے، ایسے لوگوں سے جہاد کیا جائے گا یہ لوگ قتل وقید کے خوف سے اسلام قبول کرلیں گے اور اس کلمہ کے تابع ومنقاد ہوجائیں گے، پھر اللہ آہستہ آہستہ ان میں اخلاص پیدا فرمادے گا اور بہت سے لوگ مسلمان نہیں ہوں گے لیکن جزیہ دینے پر آمادہ ہوجائیں گے اور اسلامی سلطنت کی ماتحتی قبول کرلیں گے۔

الغرض ایک وقت میں اس طرح اسلام کا غلبہ قائم ہوجائے گا کہ یا تو لوگ خواہی نخواہی اسلام قبول

---

(۱) الإصـابة ٥ / ١٩٤ — ١٩٥، وسير اعـلام النبلاء ١ / ٣٨٥ — ٣٨٩، مرقاۃ میں حضرت مقداد کی عمر ۹۰ سال اور وفات ۳۷ھ میں لکھی ہے، بظاہر یہ تسامح ہے والله اعلم بالصواب.

کرلیں گے یا اس کی ماتحتی میں آجائیں گے،اور قرآن کریم کی یہ بات ''لیُظهِرَه علی الدینِ کلّه'' سچی ثابت ہوجائے گی۔

کیا یہ پیش گوئی پوری ہوچکی؟

لایبقی علی ظهر الارض :ظہرالارض سے کیا مراد ہے؟ اور یہ پیشین گوئی پوری ہوچکی ہے یا ابھی پوری نہیں ہوئی؟ اس میں حضرات شراح کے متعدد اقوال ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ اس سے مراد جزیرۃ العرب ہے یعنی جزیرۃ العرب میں کوئی گھر ایسا باقی نہیں رہے گا،جس میں کلمہ کی دعوت نہ پہنچے اس قول کے لحاظ سے یہ پیش گوئی پوری ہوچکی ہے،آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک اکثر جزیرۃ العرب موحد ہوگیا تھا،پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تمام جزیرۃ العرب موحد ہوگیا کہ آپ نے یہود کو بھی عرب سے جلاوطن کردیا تھا۔ (۱)

(۲) بعض نے کہا کہ اس سے تمام روئے زمین مراد ہے کہ دنیا کے ہر گھر میں کلمۂ اسلام داخل ہوگا یہ پیشین گوئی اس صورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ومہدی کے زمانہ میں پوری ہوگی، ابھی پوری نہیں ہوئی۔ (۲)

(۳) بعض نے کہا کہ اگر اس سے تمام دنیا مراد ہے تو بھی یہ پیشین گوئی پوری ہوچکی ہے، کیونکہ اسلامی تاریخ میں ایک زمانہ گزر چکا ہے کہ اسلامی حکومت سب سے بڑی حکومت تھی، اور اکثر غیر مسلم اسلامی حکومت کو جزیہ ادا کرتے تھے، یہ خلفاء بنوعباسیہ کا دور تھا،مشہور عباسی خلیفہ ہارون رشید جب کسی بادل کو دیکھتے تو کہتے: تو کہیں بھی برس، تیرا فائدہ بہرحال مسلمانوں کو پہنچے گا۔ (۳)

(۴) بعض نے کہا کہ اس سے کلمہ کا قبول کرنا یا اس کی ماتحتی میں آنا مراد نہیں، بلکہ اسلام کا تعارف مراد ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ ساری دنیا اسلام سے متعارف ہوجائے گی، اس لحاظ سے بھی یہ پیش گوئی پوری ہوچکی ہے، بالخصوص جب سے الیکٹرانک میڈیا کا وجود ہوا ہے تو اس کے توسط سے تمام دنیا اسلام سے واقف ہوچکی ہے۔

(۱)مرعاۃ المفاتیح ۱/۳۰۷(۴۲)
(۲)تفسیر قرطبی ۱۴/۲۱۴(التوبۃ:۳۳)والدر المنثور ۴/۱۷۶.
(۳)مرعاۃ المفاتیح ۱/۳۰۷(۴۲)

بیت مدرولاوبر : ''مدر'' جمع ہے مَدَرَۃٌ کی بمعنی اینٹ، چونکہ شہرودیہات میں لوگ اینٹوں کے مکانات بناکر رہتے ہیں اس لئے اس سے شہرودیہات کے مکانات مراد ہیں۔

''**وبر**'' بمعنی اونٹ کے بال ،عرب میں بہت سے لوگ جنگل میں رہتے تھے اوراونٹ کے بالوں کی ترپال بناکراس کا خیمہ بناتے تھے اور بعض لوگ براہ راست اونٹ کے بالوں کا خیمہ بناتے تھے، تواس سے مراد خیمے اورتنبو ہیں اورمطلب یہ ہے کہ ہرگھر میں خواہ وہ پکا ہو یا کچا، دائمی رہائشگاہ ہو یاعارضی، سب جگہ اسلام پہنچے گا۔

بعزعزیز وذل ذلیل: یہ متلبسۃ محذوف سے متعلق ہوکر حال ہے،اور''**کلمۃ الاسلام**'' ذوالحال ہے۔

اما یعزھم اللہ ......الخ: یہ جملہ''**بعزعزیزوذل ذلیل**'' کی تفسیر ہے۔

قلت فیکون الدین کلہ للہ: ظاہر یہ ہے کہ اس کا فاعل راوی حدیث حضرت مقداد ہیں، انہوں نے یہ بات یاتو حضورصلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی کہی یاپھراپنے تلامذہ کے سامنے حدیث کے بیان کرتے وقت کہی۔ (۱)

۴۰/ ۳۹ **وَعَنْ وَهْبِ بْنِ مُنَبِّهٍ قِيْلَ لَهُ: أَلَيْسَ لَاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ؟ قَالَ: بَلٰى! وَلٰكِنْ لَيْسَ مِفْتَاحٌ إِلَّا وَلَهُ أَسْنَانٌ،فَإِنْ جِئْتَ بِمِفْتَاحٍ لَهُ أَسْنَانٌ فتح لَكَ وَإِلَّا لَمْ يُفْتَحْ لَكَ.** (رواہ البخاری فی ترجمۃ باب)(۲)

ترجمہ: حضرت وہب بن منبہؒ سے مروی ہے: کسی نے ان سے سوال کیا کہ:''**لاالٰہ الا اللہ**'' کیاجنت کی کنجی نہیں ہے؟ وہب علیہ الرحمہ نے کہا: کیوں نہیں،لیکن کوئی کنجی ایسی نہیں ہوتی جس کے دندانے نہ ہوں،پس اگرتم ایسی کنجی لے کرآ ؤگے جس میں دندانے موجود ہوں تو تمہارے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے ورنہ نہیں کھولے جائیں گے۔(بخاری)

(۱)مرقاۃ المفاتیح ۱/ ۱۹۷—۱۹۸.

(۲)ذکرہ البخاری فی الصحیح تعلیقاً فی "الجنائز"۱/ ۱۶۵، وفی تاریخہ الکبیر وصلاً ۱/ ۹۵برقم ۲۶۱.

تشریحِ حدیث

احوال وہب بن منبہ:

وہب بن منبہ (بصیغۃ الفاعل) ابوعبداللہ الصنعانی کبار تابعین میں سے ہیں، اسرائیلیات کے ماہر اور دنیا کی تاریخ اور انبیاء علیہم السلام اور بادشاہوں کے حالات کے عالم تھے، فرماتے تھے کہ میں نے بہتر (۷۲) آسمانی کتب کا مطالعہ کیا ہے ۱۱۴ھ میں وفات ہوئی ہے۔(۱)

روایت کا حال:

یہ روایت سنداً مقطوع ہے، فصل ثالث میں صاحب مشکوۃ کبھی مقطوع روایت کو بھی لاتے ہیں، جیسا کہ کتاب کے دیباچہ میں ذکر کیا گیا تھا۔

اعمال ایمان کی اہمیت:

اس حدیث میں اعمال ایمان کی اہمیت کا بیان ہے، ایک مرتبہ وہب بن منبہ اعمال کی ترغیب بیان کر رہے تھے تو کسی نے سوال کیا کہ: کیا لاالہ الا اللہ مفتاح الجنۃ نہیں ہے؟ انہوں نے بہت معقول جواب دیا کہ لاالہ الا اللہ جنت کی چابی ہے، اس سے انکار نہیں، مگر ہر چابی کے لئے دندانے ہونے ضروری ہیں اگر چابی تو ہو لیکن دندانے نہ ہوں تو چابی کام نہیں کرے گی، اسی طرح لاالہ الا اللہ کی چابی کے ساتھ اعمال کے دندانے نہ ہوئے تو جنت کا تالا کھلنے میں دقت پیش آسکتی ہے، پس اعمال صالحہ چابی کے لئے دندانے کے درجہ میں ہوئے۔

علماء نے فرمایا کہ یہ قاعدہ کلی نہیں بلکہ اکثری ہے، کیونکہ بعض چابیوں میں ایک بھی دندانہ نہیں ہوتا، اسی طرح بعض کی مغفرت صرف ایمان کی بنیاد پر ہوجائے گی، خواہ اعمال میں کتنی ہی کوتاہی ہو: **إن اللّٰہ لایغفر ان یشرک بہ ویغفر مادون ذلک لمن یشاء.**

٤١ / ٤٠ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "إِذَا أَحْسَنَ أَحَدُكُمْ إِسْلَامَهٗ فَكُلُّ حَسَنَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهٗ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلٰى سَبْعِ مِأَةِ ضِعْفٍ،

(۱) وفیات الأعیان (٦ / ٣٥)، الاعلام للزرکلی ٨ / ١٢٥.

وَكُلُّ سَيِّئَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ بِمِثْلِهَا حتىٰ لَقِيَ اللّٰهَ"(متفق عليه)(۱)

ترجمہ :-حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے ایمان کو اچھا بنالیتا ہے پھروہ جوبھی نیکی کرے گا وہ اس کے لئے دس گنازیادہ لکھی جاتی ہے سات سو گنا تک، اوروہ جو برائی کرتا ہے تو وہ اس کے برابر لکھی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

حسن اسلام کی وجہ سے نیکی کے ثواب میں اضافہ:

اس حدیث میں بھی کلمہ اسلام کی برکت اور اس کے فائدہ کا بیان ہے، جب کوئی شخص مسلمان ہوجائے اوراس کے اسلام میں اخلاص بھی آجائے تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اب ایک نیک کام پر دس گنا سے لیکر سات سو گنا تک اجر وثواب ملتاہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ سات سو آخری حد ہے، یا اس سے بھی زائد ثواب مل سکتاہے؟

چنانچہ علامہ ماوردی نے اس حدیث کی بناء پر فرمایاہے کہ سات سوانتہاء ہے، اس سے زیادہ ثواب نہیں، مگر امام نووی نے علامہ ماوردی کی بات کوغلط قراردیاہے، اس لئے کہ بخاری ومسلم کی حدیث میں یہ الفاظ ہیں''إلى سبع مائة ضعف إلى أضعاف كثيرة ''یعنی آدمی کے اخلاص اور نیکی کے مقام وزمانہ کے اعتبار سے سات سو سے زیادہ بھی ثواب ملتاہے،(۲) جیساکہ نماز کے متعلق روایات میں تفصیل ہے کہ گھر میں نماز پڑھنے کا ثواب ایک نماز کاہے، اورمحلّہ کی مسجد میں ۲۵ یا ۲۷ نمازوں کاثواب ہے، اورشہرکی جامع مسجد میں پانچ سونمازوں کا، مسجد بیت المقدس میں ایک ہزار نمازوں کا، مسجد نبوی میں پچاس ہزارنمازوں کا اورمسجد حرام میں ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملتاہے، معلوم ہوا کہ حسنات کے مضاعف ہونے کے لئے سات سو کی تحدید نہیں ہے، بلکہ اس سے زیادہ اجر سے نوازا جاسکتاہے، یہ نیکی کا حکم ہے، سیئہ کا حکم یہ ہے کہ ایک سیئہ پرصرف ایک گناہ لکھاجائے گا۔

---

(۱)أخرجه البخاري في "الإيمان" ۱/ ۱۱ برقم ٤٢ ومسلم في "الإيمان" ۱/ ۷.

(۲)شرح النووي على مسلم ۱/ ۷۹.

اذاأحسن احدكم اسلامه: احسانِ اسلام سے مراد اخلاص ہے اور مطلب یہ ہے کہ صدق واخلاص کے ساتھ اسلام میں داخل ہوجائے، اخلاص کی برکت سے حسنات مضاعف ہوتی چلی جاتی ہیں جس کی کوئی حدوانتہا نہیں ہے۔

حتی لقي الله: بعض علماء نے کہا ہے کہ اس کا تعلق کل سیئة سے ہے کہ اس گناہ پراس کو سزا ملے گی یا نہیں؟ اس کا علم ابھی نہیں ہوگا یہاں تک کہ بندہ اللہ سے جا ملے، یعنی آخرت میں معلوم ہوگا، ممکن ہے اس پر سزا ملے اور ممکن ہے کہ اس کو بخشد یا جائے۔

بعض نے کہا کہ اس کا تعلق دونوں جملوں سے ہے اور معنی یہ ہیں کہ یہ معاملہ یعنی حسنہ کا ثواب سات سو گنا اور سیئہ پر صرف ایک گناہ بندہ کے ساتھ چند دنوں تک کے لئے نہیں، بلکہ پوری زندگی کے لئے ہے یہاں تک کہ وہ اللہ سے جاملے۔

۴۲ / ۴۱ وَعَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ أَنَّ رَجُلاً سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلى الله عليه وسلم: مَاالإِيْمَانُ؟ قَالَ: "إِذَا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ، وَسَاءَتْکَ سَيِّئَتُکَ؛ فَأَنْتَ مُؤْمِنٌ" قَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! فما الإِثْمُ؟ قَالَ: إِذَا حَاکَ فِيْ نَفْسِکَ شَيْءٌ فَدَعْهُ "(رواہ احمد)(۱)

ترجمه:-حضرت ابوامامہؓ سے مروی ہے کہ: ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: ایمان کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تیری نیکی تجھ کوخوش کرے اور تیری برائی تجھے غمگین کرے تو سمجھ لو کہ تم پکے مومن ہو، پھراس شخص نے پوچھا کہ: یارسول اللہ! گناہ (کی علامت) کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب کوئی کام تمہارے دل میں تردد پیدا کردے تو اس کو چھوڑ دو (یعنی سمجھ لو کہ وہ گناہ ہے) (احمد)

تشریحِ حدیث

ایمان اور گناہ کی علامت وکسوٹی:

اس حدیث پاک میں علامت ایمان اورعلامتِ اثم کا بیان ہے، اور مضمون حدیث یہ ہے ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: **ماالإيمان اى ماعلامة الايمان**؟ کیونکہ یہاں "ما" سے

(۱)مسندأحمد ۵ / ۲۵۱(۲۲۲۱۳)

حقیقت کو معلوم کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس کی علامات جاننا مقصد ہے، اور ایمان سے مراد: کمال ایمان ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: نیک کام سے خوشی اور برے کام سے رنج وغم ہو تو یہ کمال ایمان کی علامت ہے، اس لئے کہ نیکی و برائی میں امتیاز کرنا مومن کا کام ہے، کافر کو اس کی تمیز نہیں ہوتی، ایسے ہی مومنِ فاسق بھی یہ امتیاز نہیں کر پاتا، کہ اس کو گناہوں کی عادت ہوجاتی ہے اس لئے گناہ کا احساس کم ہوتا چلا جاتا ہے، حدیث شریف میں ہے کہ مومن سے گناہ سرزد ہوجائے تو وہ مضطرب اور پریشان ہوجاتا ہے، اس کو ایسا لگتا ہے جیسے پہاڑ اس کے اوپر گررہا ہے حتی کہ وہ توبہ کرلے، توبہ کے بغیر اس کو قرار حاصل نہیں ہوتا، اور فاسق گناہ کو ایسا سمجھتا ہے جیسے کہ ایک مکھی ناک پر بیٹھی تھی اس کو اڑادی، کوئی خاص احساس اس کو نہیں ہوتا۔ (۱)

فمـا الإثم ؟ پھر اس شخص نے دوسرا سوال کیا کہ گناہ کی علامت کیا ہے؟ یعنی جو چیز ایسی ہو کہ اس کے بارے میں صریح نص موجود نہ ہو کہ یہ گناہ کی چیز ہے یا نہیں؟ تو ایسی چیز کے گناہ ہونے کی علامت کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ جب تیرے نفس میں کوئی چیز کھٹکے اور اس کے بارے میں تمہارے قلب میں تردد ہو تو یہ اس کے گناہ ہونے کی علامت ہے، لہذا اس کو چھوڑ دو۔

ایک حدیث میں مزید تفصیل وارد ہوئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**دع مـا يـريبك الـى مـا لا يريبك**"، یعنی مشتبہ چیز چھوڑ کر غیر مشتبہ کو اختیار کرو، ایک شخص نے کہا کہ: یارسول اللہ! ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ مشتبہ کیا ہے اور غیر مشتبہ کیا ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: جب تو کسی کام کا ارادہ کرے تو اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ، کیونکہ قلب حرام کو انجام دیتے وقت مضطرب اور پریشان ہوتا ہے اور حلال کو انجام دیتے وقت پرسکون رہتا ہے۔ (۲)

البتہ علماء میں اس میں اختلاف ہے کہ کیا مشتبہ اور کسی کام کے گناہ ہونے کی یہ علامت تمام مؤمنین کے حق میں ہے؟ یا قلوب ونفوس کا تزکیہ کراچکے اہلِ دل کے حق میں ہے؟ اکثر کی رائے یہ ہے کہ سب کے حق میں ہے اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ صرف ان اشخاص کے حق میں ہے کہ جن کے قلوب کا تزکیہ ہوچکا ہے، اس لئے کہ ان کے قلوب ہی خیر کی جانب مائل اور شر سے متنفر ہوتے ہیں جبکہ عام لوگ خیر کو شر اور شر کو خیر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ (۳)

---

(۱) مشكوة ص ۲۰۶ ،باب الاستغفار والتوبة.

(۲) رواه ابويعلى الموصلي فى مسنده (۷٤۹۲)

(۳) شرح المصابيح لابن ملک ۳/ ۳۹۰.

۴۲/۴۱: وعن عمرو بن عبسةؓ ،قال: أَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم فَقُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! مَنْ مَعَكَ عَلَى هٰذَا الْأَمْرِ؟ قَالَ: "حُرٌّ وَعَبْدٌ" قُلْتُ: مَاالْإِسْلَامُ؟ قَالَ: طِيْبُ الْكَلَامِ، وَإِطْعَامُ الطَّعَامِ قُلْتُ: مَاالْإِيْمَانُ؟ قَالَ: "الصَّبْرُ وَالسَّمَاحَةُ" قَالَ: قُلْتُ أَيُّ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ قَالَ: قُلْتُ: أَيُّ الْإِيْمَانِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: "خُلُقٌ حَسَنٌ" قَالَ: قُلْتُ: أَيُّ الصَّلٰوةِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: طُوْلُ الْقُنُوْتِ قَالَ: قُلْتُ: أَيُّ الْهِجْرَةِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: أَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ،قَالَ: فَقُلْتُ أَيُّ الْجِهَادِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: مَنْ عُقِرَ جَوَادُهٗ،وَأُهْرِيْقَ دَمُهٗ قَالَ: قُلْتُ: أَيُّ السَّاعَاتِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: جَوْفُ اللَّيْلِ الْآخِرُ. (رواہ أحمد)(۱)

ترجمه:-حضرت عمرو بن عبسہؓ سے مروی ہے: فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا (جب آپ نے دعوت کا کام شروع فرمایا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور کون تھا اس دین پر؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ میرے ساتھ ایک آزاد (یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ) اور ایک غلام (حضرت بلالؓ) تھے، پھر میں نے عرض کیا کہ: اسلام کی علامت کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: عمدہ کلام اور کھانا کھلانا، (پھر) میں نے عرض کیا کہ: ایمان کی علامت کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: صبر اور سخاوت اختیار کرنا، (پھر) میں نے عرض کیا کہ: کونسا مسلمان افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ: وہ مسلمان بہتر ہے جس کی زبان اور ہاتھ (کی ایذاء) سے مسلمان محفوظ رہیں (پھر) میں نے عرض کیا کہ: ایمان کا کونسا کام افضل ہے؟

(۱)أخرجه احمد ۴/۱۱۱ برقم ۱۷۰۵۹ و۴/۱۱۲ برقم ۱۷۰۶۰و۴/۱۱۴ برقم ۱۷۰۶۸ و۱۷۰۶۹ و۴/۳۸۵ برقم ۱۹۴۵۱، ۱۹۴۵۲، ۱۹۴۵۳، ۱۹۴۵۴.

قلت: قد عزاه صاحب المشكاة إلى مسند احمد، وقد أخرجه أيضاً مسلم في "الصلوة، باب الأوقات التي نهي عن الصلوة فيها" ۱/۲۷۶، والترمذي في "الدعوات، باب في انتظار الفرج وغير ذلك ۲/۹۸، والنسائي في "الصلوة باب النهي عن الصلاة بعد العصر ۱/۹۶ وأيضاً في "الصلاة، باب إباحة الصلاة إلى أن يصلي الصبح ۱/۹۷، وابن ماجه في "السهو في الصلاة، باب ماجاء في الساعات التي تكره فيها الصلاة ۱/۸۸ وأيضاً في " كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب ماجاء في أي ساعات الليل أفضل ۱/۹۷ وأيضاً "الجهاد، باب القتال في سبيل الله ۱/۲۰۰"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: ''اچھے اخلاق'' (پھر) میں نے عرض کیا کہ: نماز میں کونسی چیز افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: ''طویل قیام کرنا'' پھر میں نے سوال کیا: کونسی ہجرت افضل ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: ''افضل ہجرت یہ ہے کہ: جو چیزیں تیرے رب کو پسند نہیں ان کو چھوڑ دو، پھر میں نے عرض کیا: کونسا جہاد افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: ''جس میں آدمی کا گھوڑا بھی زخمی کردیا جائے اور خود اس کا بھی خون بہادیا جائے'' (پھر) میں نے عرض کیا: سب سے افضل وقت کونسا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا ''شب کا نصف آخر'' (احمد)

تشریحِ حدیث

تعارف عمرو بن عبسہ:

عمرونام ہے، ابونجیح کنیت ہے، قبیلہ بنوسُلَیم کے تھے، اس لئے سُلمی کہلاتے ہیں، قدیم الاسلام صحابی ہیں، چوتھے نمبر پرایمان لائے، خود کہا کرتے تھے کہ: انـی لَـرُبُعُ الاسلام یعنی میں اسلام کا چوتھائی حصہ ہوں، چوتھے نمبر پرایمان لایاہوں، اورفرماتے تھے کہ اسلام کی آمد سے پہلے ہی میں لوگوں کو ضلالت اور گمراہی پر سمجھتا تھا، اسی لئے میں نے بت پرستی ترک کردی تھی، ان کومعلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ میں کسی نے نبوت کا دعوی کیاہے تو مکہ مکرمہ آئے اورمسلمان ہوگئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کے اعمال بتاکرانکے قبیلہ میں بھیج دیا اورفرمایاکہ جب ہمارے غلبہ کی خبرسنواس وقت میرے پاس آجانا، چنانچہ ۷ھ میں فتح خیبر کے بعد وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ منورہ پہنچے۔(۱)

اسلام اوراعمال اسلام کے بارے میں ایک صحابی کے سوالات:

اس حدیث پاک میں اعمال اسلام کا بیان ہے، راوی حدیث حضرت عمرو بن عبسہ کوعلمی باتیں معلوم کرنے کا بہت شوق تھا،حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے کئی سوالات کئے جوایمان، اسلام واعمال اسلام سے متعلق تھے، کوئی ضروری نہیں کہ انہوں نے یہ تمام سوالات ایک ساتھ کئے ہوں، بلکہ ممکن ہے

(۱)الإصابة ٤/٤٩(٥٩٠٢)

مختلف اوقات میں اور متعدد مرتبہ میں کئے ہوں، یہ نو سوال ہیں اور ہر سوال مستقل حدیث کے درجہ میں ہے، لہٰذا حکماً یہ نو حدیثیں ہوئیں۔

أتیت رسول الله صلی الله علیه وسلم : مطلب یہ ہے کہ میں اپنے قبیلہ سے ہجرت کر کے مدینہ آیا۔

حضور ﷺ کا ساتھ دینے والے:

من معک علی هذا الامر؟ شراح نے فرمایا ہے کہ اس سوال کا تعلق ماضی و مستقبل دونوں سے ہوسکتا ہے، ماضی سے تعلق ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ ابتدا میں دین اسلام کے بارے میں آپ کی موافقت کون کررہا تھا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ایک آزاد اور ایک غلام یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت بلالؓ اور بعض نے کہا کہ غلام سے حضرت زید بن حارثہؓ مراد ہیں، اسلام لانے میں علی الاطلاق سبقت تو حضرت خدیجہؓ کو حاصل ہے لیکن وہ عورت تھیں ان کا معاملہ لوگوں میں زیادہ مشہور نہ تھا اس لئے اس موقعہ پر ان کا تذکرہ نہیں کیا۔

حضرت عمرو بن عبسہ کے اس سوال کا تعلق مستقبل سے ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ آئندہ آپ کے دین میں کون داخل ہوں گے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر قسم کے لوگ دین میں داخل ہونگے، آزاد بھی اور غلام بھی۔

اسلام کے شعبے:

قلت: ما الإسلام؟: یہ دوسرا سوال ہے، مقصود شُعَبِ اسلام کے بارے میں سوال کرنا ہے ای **ماشُعَبُ الاسلام**، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چیزیں بتائیں، نرمی سے گفتگو کرنا اور لوگوں کو کھانا کھلانا۔

ایمان کے ثمرات:

ما الإیمان؟ تیسرا سوال کیا کہ ایمان کیا ہے؟ یہاں بھی حقیقت مقصد نہیں، بلکہ ایمان کا نتیجہ وثمرہ معلوم کرنا مقصود ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صبر اور سخاوت۔

صبر وسخاوت کا مفہوم:

صبر کے معنی ہیں **حبس النفس علی ما تکرہ** یعنی جو امور نفس کو ناگوار ہوں نفس کو ان پر جمانا

اور ثابت رکھنا، اور اس کی تین قسمیں ہیں (۱) صبر علی الطاعات: یعنی جی نہ چاہنے کے باوجود طاعات انجام دینا، (۲) صبر عن المعاصی: یعنی جی چاہنے کے باوجود معصیتوں سے رکنا، (۳) صبر علی البلایا: یعنی جانی یا مالی نقصان ہو جانے پر اس کا شکوہ نہ کرنا۔

اور سخاوت یہ ہے کہ خود دنیا سے اعراض کرے اور اپنے پاس جو کچھ ہو وہ دوسروں پر خرچ کرے۔

افضل ترین مسلمان:

ای الاسلام افضل: چوتھا سوال کیا کہ کونسا اسلام یعنی کون سا مسلمان افضل ہے؟ جواب کا حاصل یہ ہے کہ وہ مسلمان افضل ہے جو بے ضرر ہو، ماقبل میں اس کی تفصیل آچکی ہے۔

افضل ترین خصلت:

قلت ای الایمان أفضل: پانچواں سوال کیا کہ ایمان کی کونسی خصلت افضل ہے؟ کیونکہ معنی یہ ہیں **ایُ خصال الایمان افضل** تو فرمایا کہ خلق حسن، عموماً اس کا مطلب طیب کلام سمجھا جاتا ہے، لیکن علماء نے فرمایا کہ خلق حسن کے معنی طیب کلام میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ اس میں پوری شریعت پر عمل داخل ہے یعنی تمام اوامر کا امتثال اور تمام نواہی سے اجتناب ہو۔

اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ کی شہادت دی ہے: **انک لعلی خلق عظیم**، حضرت عائشہؓ کے ایک شاگرد نے ان سے سوال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا **کان خلقه القرآن ای کان یمتثل الأوامر ویجتنب النواهی** اس کے عموم میں طیب کلام اور اور طلاقت وجہ بھی داخل ہے۔

افضل ترین نماز:

ای الصلوة أفضل؟ عمرو بن عبسہؓ نے ایک سوال یہ کیا کہ کون سی نماز افضل ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس میں طول قنوت ہو، قنوت کے متعدد معنی ہیں: قیام، قرات، خشوع وغیرہ، یہاں قیام مراد ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جس نماز میں قیام طویل ہو وہ افضل ہے۔

طول قیام افضل ہے یا کثرت سجود:

یہ مسئلہ علماء کے درمیان اختلافی ہے کہ نماز میں طول قیام افضل ہے یا کثرت سجود؟ عندالجمہور طول

قیام افضل ہے اور بعض علماء کے نزدیک کثرت سجود افضل ہے، اس کا ثمرہ اس وقت ظاہر ہوگا جب کوئی شخص نفل نماز کے لئے کچھ وقت متعین کرے مثلاً بیس منٹ متعین کئے اگر اس میں طول قیام کو اختیار کرے تو بیس منٹ میں چار رکعت ادا ہوں گی اور کثرت سجود سے مثلاً سولہ رکعات ادا ہوں گی، ایسی صورت میں جمہور کے یہاں طولِ قیام والی چار رکعات کو اولویت حاصل ہوگی، دلیل یہی حدیث ہے، دیگر حضرات کی دلیل آگے آئے گی۔

افضل ترین ہجرت:

قلت ای الھجرۃ افضل؟ ایک سوال یہ کیا کہ کون سی ہجرت افضل ہے؟ یہ اس لئے پوچھا کہ ہجرت کی کئی قسمیں ہیں ظاہری باطنی وغیرہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہجرت باطنی افضل ہے، کیونکہ ہجرت ظاہری کا مقصود بھی یہی ہے کہ آدمی اپنے وطن کو چھوڑ کر اسلامی ماحول میں آجائے اور وہاں رہ کر احکام الٰہیہ کو بجالاوے۔

افضل ترین جہاد:

فقلت ای الجھاد افضل؟ ایک سوال کیا کہ کون سا جہاد افضل ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جس میں گھوڑا زخمی ہوجائے اور خود کا خون بھی بہہ جائے یعنی جان ومال دونوں کی قربانی دے۔

''**جواد**'' بمعنی عمدہ گھوڑا، اھریق کی اصل تھی، اُریق: جو باب افعال سے ہے، ہاء کا اضافہ مبالغہ کی وجہ سے کیا گیا ہے۔

افضل ترین وقت:

قلت ای الساعات افضل: ایک سوال کیا کہ کون سا وقت طاعت کے لئے افضل ہے؟ طاعت سے نفل نماز مراد ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نوافل کے لئے رات کا نصف اخیر افضل ہے، اس لئے کہ اس وقت نیند سے بیدار ہونا اشق علی النفس ہوتا ہے، نیز اس وقت ملائکہ کا نزول ہوتا ہے، رحمت الٰہی بکثرت نازل ہوتی ہے اور مخلوق سے تخلیہ ہوتا ہے۔

''جوف'' کے معنی بیچ اور درمیان کے ہیں شئی درمیان میں پہنچ کر نصف ہوجاتی ہے اس لئے جوف کا مرادی ترجمہ نصف سے ہوتا ہے، ''الآخر'' جوف کی صفت ہے یعنی رات کا نصف اخیر۔

٤٣/٤٢: وَعَنْ معاذ بن جبلؓ، قال :سمعتُ رَسُوْلَ اللهِ صلى الله عليه وسلم يقول: مَنْ لَقِيَ اللّٰهَ لايُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا، وَيُصَلِّي الْخَمْسَ، وَيَصُوْمُ رَمَضَانَ؛ غُفِرَ لَهٗ"قُلْتُ: أَفَلا أُبَشِّرُهُمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: "دَعْهُمْ يَعْمَلُوْا" (رواہ احمد)(۱)

ترجمه :-حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ: جوآدمی اللہ تعالیٰ شانہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کوشریک نہیں کیا اور پانچوں وقت کی نماز پابندی سے پڑھتارہا اوررمضان المبارک کے روزے رکھتارہا تو اس کی مغفرت اوربخشش کردی جائے گی، میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول کیامیں لوگوں کو یہ بشارت سنادوں؟ آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشادفرمایا:"لوگوں کو(ان کے حال پر) چھوڑ دوتا کہ وہ عمل کرتے رہیں"(احمد)

تشریح حدیث

حضرت معاذ بن جبل کی اس مضمون کی حدیث پہلے گزرچکی ہے جس میں کلمۂ ایمان کے فائدہ کا بیان تھا، اسی کا خلاصہ یہاں بیان کیا گیاہے، البتہ یہاں دوباتیں یادرکھنے کی ہیں: ایک یہ کہ اس حدیث میں جن اعمال کا تذکرہ ہے وہ بطورمثال ہے، اورمطلب یہ ہے کہ جوشخص تمام فرائض وواجبات بجالانے کے بعداللہ سے ملاقات کرے گا اس کے سب گناہ معاف کردیئے جائیں گے، دوسرے یہ کہ مغفرت سے صغائر کی معافی مراد ہے، البتہ اداء فرائض وواجبات کے ساتھ توبہ بھی شامل ہوجائے تووہ کبائر بھی معاف ہوجائیں گے جوازقبیلِ حقوق اللہ ہیں اورحقوق العباد کی معافی اداءحقوق کے بغیرنہیں ہوگی، یاپھراللہ اپنی جانب سے ان حقوق کی ادائیگی فرمادے۔

٤٤/٤٣: وَعَنْهُ أَنَّهُ سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ أَفْضَلِ الإِيْمَانِ؟ قَالَ: "أَنْ تُحِبَّ لِلّٰهِ، وَتُبْغِضَ لِلّٰهِ، وَتُعْمِلَ لِسَانَكَ فِيْ ذِكْرِاللّٰهِ "قَالَ: وَمَاذَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: "وَأَنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَاتُحِبُّ لِنَفْسِكَ، وَتَكْرَهَ لَهُمْ مَاتَكْرَهُ لِنَفْسِكَ" (رواہ احمد(۲))

(۱)مسند أحمد بن حنبل ٥/٢٤٦برقم :٢٢١٨٣و٢٢١٨٥.

(۲)أخرجه أحمد ٥/٢٤٦برقم:٢٢١٨٣و٢٢١٨٥.

ترجمہ:-حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ایمان کے بارے میں دریافت کیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا:تم (کسی سے) محبت کروتو اللہ کے لئے اور (کسی سے) بغض رکھو وہ بھی اللہ کے لئے اوراپنی زبان کو اللہ کے ذکر میں مشغول رکھو،حضرت معاذؓ نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! اس کے علاوہ اورکیا کروں میں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا جواپنے لئے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لئے پسند کرواورجواپنے لئے ناپسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لئے ناپسندکرو۔ (احمد)

تشریح حدیث

افضل ترین اعمالِ ایمان:

اس روایت کے راوی بھی حضرت معاذ بن جبل ہیں، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ایمان کے بارے میں سوال کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی باتیں فرمائیں کہ: اللہ کے لئے ہی محبت کرے اوراسی کے لئے نفرت کرے اوراپنی زبان کو اللہ کے ذکر میں مشغول رکھے۔

''**تعمل**'' مضارع باب افعال سے ہے، استعمال کے معنی میں ہے،مطلب یہ ہے کہ زبان اللہ کے ذکر کی عادی ہوجائے ،اس کا کمال درجہ تو یہ ہے کہ قلب بھی ذکر میں مشغول رہے،حضورقلب کے ساتھ ذکر ہو،حضورقلب نہ ہوتب بھی زبان کا ذکر میں مشغول رہنا اللہ کی عبادت اور بڑی عنایت ہے کہ ایک عضوء کو اللہ نے عبادت میں لگارکھاہے اس پرشکراداکیا جائے تو اس میں ترقی ہوگی پھرحضورقلب بھی میسر ہوگا۔

اللہ کا نام غفلت کے ساتھ بھی اثر رکھتا ہے:

حضرت گنگوہیؒ ایک مرتبہ تخلیہ سے باہرتشریف لائے پوچھا کوئی ہے؟ مولانا یحیٰ صاحبؒ (حضرت شیخ زکریاؒ کے والدمحترم) موجود تھے تو ان کو خطاب کرکے فرمایا کہ اللہ کا نام کتنی ہی غفلت کے ساتھ لیاجائے اثر کئے بغیرنہیں رہتا۔

دوسروں کے لئے پسند وناپسند کا معیار:

قال: وماذايارسول الله؟ پھرحضرت معاذؓ نے پوچھا کہ ان اعمال کے بعد کیاعمل ہے؟ حضور صلی

اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: تو لوگوں کے لئے اسی چیز کو پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرے اور جو اپنے لئے ناپسند کرے وہ دوسروں کے لئے بھی ناپسند کرے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس شخص کے دل میں کسی کی طرف سے حسد نہیں ہے بلکہ اس کے قلب میں اللہ کی مخلوق کے لئے شفقت اور ترحم کا جذبہ ہے اور یہ چیز اللہ کو بہت پسند ہے۔

باب الكبائر وعلامات النفاق

باب الکبائر، کتاب الایمان کا دوسرا باب ہے،اس باب میں کبائر اور علامات نفاق کا بیان ہے، کبائر ونفاق کا تعلق ایمان سے باعتبارضد کے ہے، جب کبائر ونفاق معلوم ہوں گے تو ایمان نکھر کر سامنے آئے گا، کیونکہ قاعدہ ہے: **تعرف الاشياء بأضدادها**، ترجمہ میں دو لفظ ہیں کبائر اور علامات نفاق، دونوں سے متعلق چند باتیں پیش ہیں، کبائر سے متعلق تین ابحاث ہیں: (۱) تقسیم الذنوب الی الصغائر والکبائر، (۲) حد الصغیرۃ والکبائر، (۳) تعداد الکبائر۔

(۱) تقسيم الذنوب الى الكبائر:

کبائر: کبیرۃ کی جمع ہے بمعنی بڑی چیز، پھر یہ لفظ علم ہو گیا بڑے گناہوں کا، اصطلاح شرع میں جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے بڑے گناہ مراد ہوتے ہیں، لہٰذا ترجمہ میں ''ذنوب'' کا لفظ مقدر ہے، عبارت یہ ہوگی: **باب ذنوب الكبائر**.

علماء کا اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ گناہوں کی تقسیم صغائر وکبائر کی طرف ہے یا نہیں؟ قاضی عیاضؒ نے محققین کا مذہب یہ نقل کیا ہے کہ تمام گناہ بڑے ہیں، ابواسحاق اسفرائنی بھی اسی کے قائل ہیں، اس لئے کہ ہر گناہ میں حق جل وعلا کی نافرمانی ہے جو بڑی عظمت اور بڑی قدرت وسلطنت والا ہے، ایسی ذات کی نافرمانی بڑی خطرناک چیز ہے، اس لئے ہر معصیت کبیرہ ہے، لیکن جمہور علماء، محدثین اور فقہاء تقسیم کے قائل ہیں، جمہور فرماتے ہیں کہ اللہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے اگرچہ ہر نافرمانی بڑی ہے، مگر یہاں مقصود گناہوں کا باہم تقابل ہے، یعنی جب ایک گناہ کا دوسرے گناہ سے تقابل کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک گناہ بڑا ہے اور ایک چھوٹا ہے، مثلاً لمس اور زنا کا تقابل کیا جائے تو ظاہر ہے کہ زنا بڑا گناہ ہے لمس سے؛ اسی طرح چوری کرنا اور اس کے لئے چلنا، چوری کرنا بڑا گناہ ہے اور اس کے لئے چلنا اس سے چھوٹا گناہ ہے۔

یہ تقسیم خود قرآن وحدیث سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''لایُغَادِرُ صَغِیْرَۃً وَلاکَبِیْرَۃً اِلَّا أَحْصَاهَا، (۱) وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبَائِرَ الاثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّااللَّمَمِ، (۲) إِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَائِرَمَاتُنْهَوْنَ عَنْهُ نُکَفِّرْعَنْکُمْ سَیِّئَاتِکُم (۳) امام غزالیؒ نے ''البسیط'' میں فرمایا ہے: ''انکارُ الفرقِ بین الصغیرۃِ والکبیرۃِ لایلیقُ بالفقہِ وقد فُهِما من مَدارکِ الشرعِ'' (۴) یعنی صغیرہ وکبیرہ کے فرق کا انکار عقل ودانش کے خلاف ہے اور یہ دونوں نصوص شرع سے ثابت ہیں۔

(۲) حدالصغیرۃ والکبیرۃ:

قرآن وحدیث میں صغیرہ اورکبیرہ کی تعریف بیان نہیں کی گئی، البتہ اللہ تعالیٰ نے بعض گناہوں کو زیادہ سختی کے ساتھ بیان کیا اوربعض پراتنی سختی نہیں آئی،اسی طرح بعض پرلعنت وغضب کا لفظ آیاہے اوربعض پرنہیں،بعض گناہوں کی دنیا میں حد متعین کردی گئی ہے اوربعض کی نہیں، علماء نے ان تمام چیزوں پرغور فرماکراپنے اپنے اعتبار سے کبیرہ وصغیرہ کی تعریف کی ہے، جوذیل میں درج ہے:

(۱) ابن عباسؓ وحسن بصریؒ سے مروی ہے کہ ہروہ گناہ جس پرلعنت غضب یاعذاب کا تذکرہ ہووہ کبیرہ ہےاوراس کے علاوہ تمام صغیرہ ہیں۔ (۵)

(۲) بعض نے کہا کہ جوگناہ طاعات سے معاف ہوجائیں وہ صغیرہ ہیں اورجوطاعات سے معاف نہ ہوں وہ کبیرہ ہیں۔ (۶)

(۳) علامہ ابن قیم نے فرمایا کہ جن معاصی کا مفسدہ لذاتہ ہووہ کبیرہ ہیں جیسے زنااورجن کا مفسدہ لذاتہ نہ ہووہ صغیرہ ہیں جیسے قُبلہ وبوسہ اورالمشی للسرقہ. (۷) حضرت نانوتوی اورحضرت شیخ الہند رحمہما اللہ نے بھی اسی کواختیارکیاہے۔

(۱) الكهف: ٤٩.
(۲) النجم: ٣٢.
(۳) النساء: ٣١.
(٤) شرح النووي على مسلم ١/٦٤(١٤٤)، و"فتح الباري" ١٠/٤٧٦(٥٩٧٦)
(٥) فتح الملهم ٢/٤٧.
(٦) فتح الباری ١٠/٤٧٦(٥٩٧٦)
(٧) مدارج السالكين لابن القيم ١/٣٢٤.

(۴)امام سدی نے فرمایا کہ گناہ کا مقدمہ صغیرہ ہے اور خود گناہ کبیرہ ہے۔ (۱)

(۵) امام ابوالحسن الواحدی فرماتے ہیں: حدالکبیرۃ غیرمعروف، کیونکہ حق تعالیٰ شانہ نے بعض گناہوں کی صفت کبیرہ اور بعض کی صغیرہ بیان کی اور بعض کو مطلق رکھا، صغیرہ اور کبیرہ کی تعریف کے لئے کوئی اصول مقرر نہیں فرمایا۔ (۲)

(۶)علامہ آلوسی نے روح المعانی میں ایک جامع تعریف نقل کی ہے کہ: کبیرہ ہر وہ گناہ ہے جس پر قرآن وحدیث میں وعید، حد یالعنت آئی ہو، یااس کا مفسدہ اس گناہ کے برابر یا اس سے بھی زیادہ ہو جس پر وعید، حد یالعنت وارد ہوئی ہو۔ (۳)

(۷)بعض نے کہا **لاکبیرۃ مع الاستغفار ولاصغیرۃ مع الإصرار.** (۴)

(۳) تعداد الکبائر:

کبائر کی تعداد بھی قرآن وحدیث میں بیان نہیں کی گئی، بعض احادیث میں تین کا، بعض میں پانچ، بعض میں سات کا تذکرہ ہے، لیکن انہی میں انحصار مقصود نہیں، اصلاً شریعت میں ان کی تعداد متعین نہیں ہے اوراسی میں مصلحت بھی ہے ورنہ صغائرکا ارتکاب لوگ بے دھڑک کرتے، البتہ احادیث کی روشنی میں بعض نے تعداد متعین کی ہے، بعض نے تین، بعض نے چار، بعض نے سات، بعض نے سترہ اور بعض نے ستر کہاہے۔ (۵)

نفاق کے معنی:

ترجمہ کا دوسرا جز علامات النفاق ہے، **علامات** جمع ہے **علامۃ** کی ای **مایُعلَم بہ الشئُ**،
نفاق: باب مفاعلت کا مصدر ہے، اس کے کئی معنی ہیں:

---

(۱)مدارج السالکین لابن القیم ۱/۳۲۳.

(۲)روح المعاني۳/۱۸.

(۳)روح المعاني ۳/۱۸.

(٤)شرح النووی علی مسلم ۱/٦۳، التيسير بشرح الجامع الصغير ۲/۵۰۲.وروی هذا أيضاً عن الشيخ أبی محمد بن عبدالسلام،(التعليق الصبيح ۱/۵۰)

(۵)لينظر: مدارج السالكين ۱۰/۳۲۰ومابعدها.

(۱) یہ نفق سے ماخوذ ہے بمعنی ختم ہونا، نفاق کی وجہ سے بھی منافق کے اعمال حبط اور ختم ہوجاتے ہیں۔[۱]

(۲) بعض نے کہا کہ یہ ماخوذ ہے ''نفقت السوق'' سے بمعنی گرم بازاری یعنی بازار میں خوب بیع وشراہونا، منافقین بھی گرم بازاری کرتے ہیں کہ کبھی مسلمانوں کے پاس جاتے ہیں اوران سے کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور کبھی کافروں کے پاس جاکران سے کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔[۲]

(۳) بعض نے کہا کہ یہ نافقاء الفار سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں جنگلی چوہے کا سوراخ، جنگلی چوہا زمین میں لمبا سوراخ کرتا ہے اندراندر زمین کو دورتک کھود دیتا ہے، حتی کہ دوسری جانب بھی سوارخ بنالیتا ہے اور پھر اس دوسرے سوراخ سے باہر نکل جاتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ کہاں سے داخل ہوا تھا، پھروہ سخت متحیر ہوتا ہے، اسی لئے چوہا نسیان میں ضرب المثل ہے، پس نفاق کے معنی ہوئے متحیر ہونا، منافقین بھی اپنے معاملہ میں متحیر اور حیران رہتے تھے کما قال اللہ تعالی: وَهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ.[۳] (وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہتے ہیں) کُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَیْهِمْ قَامُوْا.[۴] یعنی جب بجلی ان کے لئے روشنی پیدا کرتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں اور جب اندھیرا کرتی ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں۔[۵]

عرف میں نفاق کے معنی ہیں: اظهار خلاف الباطن اوراصطلاح شرع میں نفاق کا حاصل ''إبطان الکفر وإظهار الإسلام'' ہے۔[۶]

منافق کی قسمیں

پھر منافق کی دوقسمیں ہیں (۱) منافق اعتقادی (۲) منافق عملی، منافق اعتقادی وہ ہے جو کفر کو چھپائے اور اسلام کا اظہار کرے، یہ کافر سے سے بھی بدتر ہے: ''ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار'' اور منافق عملی یہ ہے کہ ایک شخص سچا مسلمان ہے لیکن اس کے اعمال میں خرابی ہے، اعمال منافقوں کے

(۱) تاج العروس ۲۶/ ۲۴۷-۲۴۸ (نفق)

(۲) المصدر السابق.

(۳) البقرة ۱۵.

(٤) البقرة: ۲۰.

(٥) تاج العروس (نفق) والمزهر في علوم اللغة للسیوطي ۱/ ۲٤۰، ۲۳٥.

(٦) التعریفات للجرجاني ۱/ ۲۹۸ (۱٤۹۰)

سے ہیں، تو وہ منافق عملی ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ بعض بری عادتیں اور بری خصلتیں ایسی ہیں جن کو منافقوں سے خاص مناسبت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں وہ خصلتیں منافقوں کے اندر ہی پائی جاتی تھیں، مسلمانوں میں نہیں، مثلاً جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا وغیرہ، ایسی خصلتوں کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ چیزیں منافق کی علامت ہیں یعنی ایسی خصلتیں ہیں جو عموماً انھیں میں ہوتی ہیں، کسی صاحب ایمان میں ان کی پرچھائی بھی نہیں ہونی چاہئے، اگر بدقسمتی سے کسی مسلمان میں ان میں سے کوئی عادت پائی جائے تو اسے منافقانہ عادت کہا جائے گا، اگر کسی میں بدبختی سے منافقوں والی ساری عادتیں پائی جائیں تو وہ پورا منافق کہلائے گا، مگر ہوگا وہ مسلمان۔

نفاق کی کچھ بحث آگے روایات کے ذیل میں آئے گی، یہاں شروع کی چند احادیث کبائر سے متعلق ہیں۔

الفصل الاول

۴۵ / ۱: عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍ ؓ، قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَيُّ الذَّنْبِ أَكْبَرُ عِنْدَاللّٰهِ؟ قَالَ: "أَنْ تَدْعُوَلِلّٰهِ نِدّاً وَهُوَ خلقك" قَالَ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ "أَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ خَشْيَةَ أَنْ يَطْعَمَ مَعَكَ" قَالَ ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: "أَنْ تَزْنِيَ حَلِيْلَةَ جَارِكَ" فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَصْدِيْقَهَا؟ "وَالَّذِيْنَ لايَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهاً آخَرَ وَلايَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّابِالْحَقِّ وَلايَزْنُوْنَ الآية. (متفق علیہ[1])

(۱) أخرجه البخارى فى سبعة مواضع: فى "التفسير" باب قول الله تعالى "فلا تجعلوا لله انداداً وانتم تعلمون" ۲/۶۴۳ برقم ۴۲۹۲، وأيضاً، فيه، باب قوله تعالى والذين لايدعون مع الله الٰهاً آخر الآية ۲/۷۰، برقم ۴۵۷۵، وأيضاً فى الأدب، باب قتل الولد خشية أن يأكل معه، ۲/۸۸۷ برقم ۵۷۶۷.

وأيضاً فى "كتاب المحاربين، باب إثم الزناة وقول الله تعالى: ولايزنون، ولاتقربواالزنى إنه كان فاحشه وساء سبيلا ۲/۱۰۰۶ برقم ۶۵۵۳ وفى "الديات" باب قول الله عزوجل "ومن يقتل مومنا متعمدا فجزاءه جهنم ۲/۱۰۱۴ برقم ۶۵۹۷ و"التوحيد، باب قول الله تعالى" فلاتجعلوالله انداداً ۲/۱۱۲۱ برقم ۷۲۱۹ وايضاً فيه، باب قول الله تعالى "ياأيهاالرسول بلغ ماانزل إليك من ربك ۲/۱۱۲۴ برقم ۷۲۳۱، ومسلم "كتاب الإيمان، باب كون الشرك أقبح الذنوب وبيان أعظمها بعده ۱/۶۳.

ترجمہ :- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے سوال کیا یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ شانہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قراردو حالانکہ تم کو پیدااللہ نے کیا ہے، پھراس شخص نے دریافت کیا اس کے بعد سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: تم اپنی اولادکواس ڈر سے مارڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی، پھراس شخص نے معلوم کیا کہ اس کے بعد سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ کہ تم اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرو'' اللہ تعالیٰ نے اسی مسئلہ کی تصدیق کے لئے یہ آیت شریفہ نازل فرمائی **والـذیـن...... الـخ** جس کا ترجمہ یہ ہے وہی اللہ کے مقرب اورخاص بندے ہیں جواللہ کے سوا کسی دوسرے کومعبودنہیں مانتے ہیں اورجس جاندار کوقتل کرنا اللہ نے حرام قراردیا ہے اس کو ناحق قتل نہیں کرتے اور نہ وہ زنا کرتے ہیں اور جوکوئی ایسا کرے گا وہ گناہ کے وبال میں پڑجائے گا۔ (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

تعارف عبداللہ بن مسعودؓ

نام عبداللہ کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے، قبیلہ ہذیل کے ہیں، چھٹے نمبر پر اسلام لائے، ذوہجرتین ہیں، بدراوراسکے بعد تمام غزوات میں شریک رہے، جسمانی اعتبار سے کچھ کمزور تھے، غزوۂ بدرمیں ابوجہل کوقتل کرنے میں ان کی بھی شرکت تھی، چنانچہ ابوجہل کی گردن کوجسم سے انہوں نے ہی الگ کیا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کوتفقہ کی دعادی تھی، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی خادم تھے، سفروحضرمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تکیہ، مسواک اور جوتے لے کر چلتے تھے، اسی لئے ان کا لقب ''**صـاحبُ الوسادة والنعلين والســـــواک**'' ہے، ان کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آمدورفت بکثرت رہتی تھی، ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ ہم عبداللہ بن مسعودؓ کو بہت دن تک اہل بیت میں سمجھتے رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں امت کو یہ مژدہ سنایا **رضيتُ لامتي مارَضِيَ لها ابنُ أم عبدٍ وسَخَطْتُ لها ماسَخَطَ لها ابنُ ام عبدٍ.**[1] یعنی میں اپنی امت کے لئے اس کو پسند کرتا ہوں جس کو ام عبد کا بیٹا (عبداللہ بن مسعود)

(۱) رواه الحاكم في المستدرک ۲/۳۱۷.

میری امت کے لئے پسند کرتا ہے، اور میں اپنی امت کے لئے وہ ناپسند کرتا ہوں جس کو امت کے لئے ام عبد کا بیٹا ناپسند کرتا ہے۔

نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں بغیر مشورہ کے کسی کو امیر بناتا تو ابن مسعودؓ کو بناتا، خلفائے اربعہ کے بعد آپ افقہ الصحابہ ہیں، حضرت عمرؓ نے ان کو کوفہ کا والی مقرر کیا اور کوفہ والوں کو لکھا کہ ابن مسعود ایسے شخص ہیں کہ ان کے علم کا میں خود محتاج ہوں، لیکن میں تم لوگوں کو اپنے اوپر ترجیح دے کر ان کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں، امام ابوحنیفہؒ نے زیادہ تر ان ہی کے شاگردوں سے علم حاصل کیا، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں آپ کوفہ سے مدینہ آ گئے تھے اور مدینہ میں ہی ۳۲ھ میں انتقال ہوا، اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔(۱)

کبیرہ گناہ:

اس حدیث پاک میں کبائر کو بیان کیا گیا ہے۔

قال رجل یارسول الله! بعض روایات میں اس کی جگہ "قلت" وارد ہوا ہے(۲) یعنی سائل خود ابن مسعودؓ ہیں۔

أيُّ الذنب اکبر عندالله؟ "ذنب" کے اصل معنی ہیں: پیچھے لگنا، جانور کی دم کو بھی "ذنب" کہا جاتا ہے کیونکہ دم بھی پیچھے ہوتی ہے، گناہ کا نتیجہ آدمی کے پیچھے لگ جاتا ہے اس لئے اس کو "ذنب" کہا جاتا ہے۔

گناہ کی اقسام اور احکام:

ملاعلی قاریؒ نے فرمایا کہ گناہ چار قسم کے ہیں:

(۱) وہ گناہ جو طاعات سے معاف ہوجاتے ہیں جیسے صغائر، چنانچہ ارشاد باری ہے: **ان الحسنات یذهبن السیئات**(۳) یعنی نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔

---

(۱) الاصابة ٤ / ١٩٩.

(۲) کمافی روایة البخاري: ۲ / ٦٤٣ (٤٢٩٢)

(۳) هود: ١١٤.

(۲)وہ گناہ جو طاعت سے معاف نہیں ہوتے ان کے معاف ہونے کے لئے توبہ ضروری ہے جیسے کفروشرک۔

(۳) وہ گناہ کہ طاعات سے ان کا معاف ہونا یقینی نہیں البتہ توبہ سے یقیناً معاف ہوجاتے ہیں جیسے حقوق اللہ۔

(۴)وہ گناہ جو نہ طاعات سے معاف ہوتے ہیں اور نہ توبہ سے، وہ حقوق العباد کی قبیل کے گناہ ہیں ان میں حق کو ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔(۱)

شرک؛اکبرالکبائر:

یہاں حدیث میں مطلق کبیرہ کے متعلق سوال نہیں، بلکہ اکبرالکبائر کے بارے میں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تو اللہ کے لئے کسی کو ذات یاصفات میں مثل قرار دے یہ ''اکبرالکبائر'' ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بغاوت ہے اور بغاوت دنیامیں بھی سب سے بڑاجرم سمجھا جاتاہے۔

نِدّاً: بمعنی مثل، ایساشخص جو دوسرے کے برابر ہوذات وصفات میں۔

سوال: ایساممائل جواللہ تعالیٰ شانہ کی ذات وصفات میں برابرہو،کوئی نہیں ہے، پھراس کے لئے ''ند'' قراردینے کا کیامطلب ہے؟

جواب: ''نــد'' کا لفظ بولا گیاہے مشرکین کے عقیدہ اورنظریہ کے اعتبار سے کہ وہ اللہ کے لئے مثل ہونے کا اعتقادرکھتے تھے،ورنہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ شانہ کا کوئی مثل نہیں ہے،''لیس کمثله شیء(۲)''،یعنی کوئی چیز اس کے مثل نہیں ہے۔

وهو خلقک: یہ جملہ حال ہے اورترجمہ ہے: حالانکہ اس نے تجھ کو پیدا کیاہے،اس میں شرک کی انتہائی مذمت ہے کہ پیدا تو اللہ نے کیا،نعمتیں وہی دیتاہے اورعبادت میں اس کے ساتھ دوسرے کوشریک کرتے ہو، یہ نمک حرامی ہوئی اوراللہ کے ساتھ بغاوت ہوئی۔(۳)

---

(۱)المرقاة: ۱/ ۲۰۴.

(۲)شوری: ۱۱.

(۳)فتح الإله: ۱/ ۳۶۹

قتل اولاد:

قال ثم أي ؟: پھرسوال کیا کہ اس کے بعد کون سا گناہ بڑا ہے؟ ثم ترتیبِ رُتبی کے لئے ہے اور أيٌ کی تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے، تقدیرِعبارت یہ ہے: ثــم أيُّ شــيءٍ مــن الــذنــوبِ أكبــرُ بعدالشرکِ، یعنی شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اپنی اولاد کو اس خوف سے قتل کرنا کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے، یعنی فقر وفاقہ کے خوف سے قتل کرنا، اس میں قتل نفس کے ساتھ قطع رحمی بھی ہے اور عقیدہ کی خرابی بھی ہے کہ اللہ کے رزاق ہونے پر بھروسہ نہیں ہے، گویا اپنے آپ کو رزاق سمجھا، الغرض شرک کے بعد یہ اکبرالکبائر ہے کیونکہ اس میں کئی مفسدے ہیں: (۱)قتلِ نفس (۲)قطع رحم (۳)اعتقاد کی خرابی۔

زمانہ جاہلیت میں یہ گناہ بڑا عام تھا، لوگ فقر وفاقہ کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل کردیا کرتے تھے جس سے قرآن نے منع کیا: "لاتَقْتُلُوْا أَوْلادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلاق"(۱)

فیملی پلاننگ کا حکم:

آجکل جو فیملی پلاننگ کی باتیں کہی جاتی ہیں اس کے پیچھے بھی یہی نظریہ موجود ہے کہ بچے زیادہ ہونگے تو کھائیں گے کہاں سے؟ اس لئے ازروئے شرع اس سوچ کے ساتھ فیملی پلاننگ قطعاً ناجائز ہے۔

پڑوسن سے زنا:

قال ثم أی ؟: سوال کیا پھر کون سا گناہ بڑا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان تزنی حلیلة جارک یعنی اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا۔

"حلیلة" یہ حــل یحل حِلًّا وحلالاً سے مشتق ہے اور حلال کے معنی میں ہے، بیوی کو "حـلیله" اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ شوہر کے لئے حلال ہوتی ہے، یاحــل یــحل حلول بمعنی نزول سے ماخوذ ہے کیونکہ زوجین کا باہم ایک دوسرے کے پاس نزول ہوتا ہے، اس معنی کے لحاظ سے بھی بیوی کو حلیلہ کہنا صحیح ہے۔(۲)

زنا کرنا خود کبیرہ گناہ ہے مگر پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا اکبرالکبائر ہے، کیونکہ اس میں دومفسدے ہیں

(۱) بنی اسرائیل ۳۱.

(۲)فتح الإله: ۱/ ۳۷۰.

(۱)زنا (۲)حق جار میں خیانت، پڑوسی تمھیں اپنے جان و مال کا امین سمجھ کر تمہارے اوپر بھروسہ رکھے ہوئے ہے، اور تم نے یہ حرکت کر کے اس کی امیدوں کا خون کردیا۔

فانزل اللہ تصدیقها: ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق نازل فرمائی: ''وَالَّذِیْنَ لَایَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهاً اٰخَرَ وَلَایَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَایَزْنُوْنَ''(۱) یعنی مومنین اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کی عبادت نہیں کرتے اور جس کی جان کو اللہ تعالیٰ نے محترم قراردیا، اس کو ناحق قتل نہیں کرتے اور نہ زنا کرتے ہیں، یہاں تصدیق سے مراد تائید ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ مضمون کی تائید ان آیات سے بھی ہوتی ہے، البتہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ یہ آیت کریمہ مذکورہ روایت کے بعد نازل ہوئی ہو، کیونکہ صحابہ کی عادت تھی کہ اگر کوئی حدیث کسی آیت کے موافق ہوتی تو وہ حضرات حدیث کو بیان کرتے ہوئے کہتے تھے کہ یہ آیت اس حدیث کی تصدیق میں نازل ہوئی، مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس آیت سے حدیث کی تائید ہورہی ہے۔(۲)

۲/٤٦: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بنِ عَمْرٍوؓ قال: قَالَ رَسُوْلُ الله صلی الله علیه وسلم: ''اَلْکَبَائِرُ اَلإِشْرَاکُ بِاللّٰهِ، وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ، وَقَتْلُ النَّفْسِ، وَالْیَمِیْنُ الْغَمُوْسُ''(رواہ البخاری)(۳)

وَفِیْ رِوَایَة أَنَسٍؓ: ''وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ'' بَدْلَ ''الیَمِیْنُ الْغموسُ''(متفق علیہ)(۴)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بڑے گناہ ''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، ناحق کسی کو قتل کرنا اور جھوٹی قسم کھانا (ہیں)''(بخاری)

---

(۱)الشعراء: ٦٨.

(۲)المفاتیح: ۱/ ۱۳۵، تحفة الأبرار ۱/ ۸۲، المرقاة ۱/ ۲۰۵.

(۳)أخرجه البخاری فی ثلاثة مواضع، کتاب الإیمان والنذور، باب الیمین الغموس ۲/ ۹۸۷، برقم ٦٤١٩، و''الدیات، باب قول الله تعالی ومن أحیاها ۲/ ۱۰۱۵ برقم ٦٦٠٥، وکتاب استتابة المعاندین والمرتدین، باب إثم من أشرک بالله وعقوبته فی الدنیا والآخرة ۲/ ۱۰۲۲، برقم ٦٦٥٣''

(٤)أخرجه البخاری فی ثلاثة مواضع: ''کتاب الشهادات باب ماقیل فی شهادة الزور لقوله تعالی والذین لایشهدون الزور الخ ۱/ ۳٦۲ برقم ۲٥۷۹''و''کتاب الأدب، باب عقوق الوالدین من الکبائر ۲/ ۸۸٤ برقم ٥۷٤۳ و''کتاب الدیات، باب قوله تعالی: ومن أحیاها''۲/ ۱۰۱٥، برقم ٦٦۰٦ ومسلم فی کتاب الإیمان، باب بیان الکبائر وأکبرها ۱/ ٦٤

اورحضرت انسؓ کی روایت میں **اليمين الغموس** کی جگہ ''**شهادة الزور**'' کا ذکر ہے۔
(بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

پانچ بڑے گناہ:

اس حدیث پاک میں پانچ کبائر کا بیان ہے یہ روایت دو صحابہ سے مروی ہے، دونوں کی روایت میں بعض الفاظ کا فرق ہے، دونوں کے مجموعہ سے پانچ کبیرہ گناہ معلوم ہوئے۔

(۱) شرک کرنا:

الإشراک بالله: یہاں شرک میں کفر بھی داخل ہے کہ کفر بھی کبائر میں سے ہے، کفر اور شرک میں مفہوم کے لحاظ سے فرق ہے، شرک کے معنی ہیں ذات وصفات میں کسی کو اللہ کا شریک ٹھیرانا اور کفر کا مطلب ہے: خدا کے وجود کا انکار کرنا، قرآن وحدیث میں شرک پر جو وعید اور سزائیں آئی ہیں وہ کفر پر بھی ہیں اور قرآن کریم میں شرک کا لفظ اس لئے زیادہ استعمال ہوا ہے کہ قرآن کریم کے اولین مخاطب اہل عرب تھے جو مشرک تھے۔

(۲) والدین کی نافرمانی:

وعقوق الوالدين :عقوق: عقٌّ سے ماخوذ ہے، بمعنی قطع، اس سے والدین کی نافرمانی مراد ہوتی ہے، قرآن وحدیث میں شرک کے بعد عموماً عقوق والدین کا ذکر کیا جاتا ہے کیونکہ دونوں میں مناسبت ہے، شرک میں سبب حقیقی (یعنی اللہ تعالیٰ) کا انکار ہوتا ہے اور عقوق والدین میں سبب ظاہری کا انکار ہوتا ہے، انسان کے وجود میں آنے کے لئے سبب ظاہری والدین ہیں۔

والدین کی نافرمانی کا معیار اوران کی اطاعت کا حکم:

والدین کی نافرمانی کا معیار کیا ہے؟ حضرات مفسرین نے فرمایا کہ ایسی بات جو والدین اولاد کی

(۱) اسراء :۲۳.

طرف سے معاشرہ میں برداشت نہ کرسکیں اوراس سے انکو غیر معمولی اذیت پہنچے وہ عقوق الوالدین اوران کی نافرمانی میں داخل ہے، اسی لئے قرآن کریم لاتَـقُـلْ لَهُمَا أُفٍّ (۱) میں ''اف'' سے مرادکلمۂ ایذاء ہے، پس اگرکسی معاشرہ میں کلمۂ ''اف'' تکلیف کی بات شمار نہ ہوتی ہوتو یہ کلمہ کہنا ممانعت میں داخل نہیں ہوگا، اسی طرح اگروالدین کوئی ایسا حکم دیں یا کسی ایسی بات سے روکیں جس کی مخالفت عرف ومعاشرہ میں نافرمانی نہ سمجھی جاتی ہوتو ایسے امرونہی کی مخالفت عقوق ونافرمانی شمار نہیں ہوگی۔(۱)

بہرحال عقوق والدین حرام ہے اوران کی خدمت ضروری ہے جسمانی بھی اور مالی بھی، مالی خدمت اس وقت ضروری ہے جب وہ اس کے محتاج ہوں اوراولاد اس پرقادر بھی ہو، اوروالدین کی اطاعت بھی واجب ہے، لیکن ناجائز کاموں میں ان کی اطاعت نہیں ہوگی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''وَاِنْ جَـاهَـدَاكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا''(۲) یعنی اگر والدین تجھ کواس پرمجبورکریں کہ تو ان کیساتھ اس چیز کو شریک ٹھہرائے جسکا تجھے علم نہیں تو تو انکی اطاعت مت کر، نیز حدیث میں ہے ''لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ''(۳) یعنی خالق کی معصیت والے کام میں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جائے گی، چنانچہ والدین اگرترک فرض یاترک واجب کاحکم دیں تو ان کی اطاعت نہ کی جائے، البتہ سنن کوکبھی کبھار ان کی وجہ سے ترک کیاجاسکتا ہے اورترک مستحب ہمیشہ کیاجاسکتا ہے۔(۴)

(۳)ناحق قتل کرنا:

قتل النفس: یعنی ناحق کسی کوقتل کردینا اوراس سے مرادکسی بھی طرح ہلاک کرنا ہے، چنانچہ زہر دے کرماردینا، جان بوجھ کرغلط دوادینا، جھوٹے مقدمہ میں پھانس کر پھانسی دلوادینا، کسی کو پیسے دے کرقتل کروانا، جادوکرکے یاکراکے کسی کو مارنا، یہ سب صورتیں ناحق قتل میں داخل ہیں، یہ ناحق قتل بھی کبیرہ گناہ ہے اورسخت ترین گناہ ہے، قرآن کریم نے اس کی سزاخلود فی النار یعنی دائمی جہنم بیان کی ہے، جس سے اس

(۱)تفسير القرطبي: ٥/ ٥٧٩،ط:دارالحديث القاهرة.

(۲)لقمان:١٥.

(۳)أخرجه الترمذي: أبواب الجهاد، باب ماجاء لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق ١/ ٣٠٠، لفظه: عن ابن عمرؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: السمع والطاعة على المرء المسلم فيما احب وكره مالم يؤمربمعصية فإن أمر بمعصية فلاسمع ولاطاعة.

(٤)مرقاة المفاتيح ١/ ٦٠٦مطبوعه اشرفيه ديوبند.

گناہ کی سنگینی اور شناعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، البتہ دیگر نصوص کی بناء پر علماء نے لکھا ہے کہ ایسا شخص بھی سزا بھگت کر جہنم سے نکال لیا جائے گا۔

خودکشی کا حکم:

اور قتل نفس سے صرف دوسرے انسان کا قتل ہی مراد نہیں، بلکہ اپنے آپ کو قتل کرنا بھی اس میں داخل ہے، جتنا جرم اور گناہ دوسرے انسان کو قتل کرنے کا ہے اتنا ہی بڑا جرم اور گناہ خودکشی کا بھی ہے، یہ سمجھنا بڑی غلط فہمی ہے کہ ہم اپنی جان کے مالک ہیں اور اس کے تلف کرنے کے مجاز ہیں، ہماری جان اللہ کی ملک ہے ہماری نہیں، اس لئے ہم نہ اس کے تلف کے مجاز ہیں اور نہ بے جا استعمال کے۔

(۴) جھوٹی قسم کھانا:

الیمین الغموس: علماء نے لکھا ہے کہ یمین تین قسم کی ہوتی ہے: یمین لغو، یمین غموس اور یمین منعقدہ۔

یمین کی اقسام اور ان کے احکام:

(۱) یمین لغو کہتے ہیں: بھول کر گذشتہ فعل پر جھوٹی قسم کھالینا، جیسے کہے کہ اللہ کی قسم زید آ گیا، حالانکہ نہیں آیا، مگر اپنے گمان میں یہی سمجھتا ہے کہ زید آ گیا ہے، اس یمین پر گناہ ومواخذہ نہیں ہے: لَايُوَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ اَيْمَانِكُمْ. (۱) یعنی اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری لغو قسموں کے بارے میں مواخذہ نہیں کرے گا۔

(۲) یمین غموس کے معنی ہیں: عمداً گذشتہ فعل پر جھوٹی قسم کھانا، غموس بمعنی ڈوبنا، یہ قسم آدمی کو گناہ میں ڈبا دیتی ہے، چنانچہ یہ کبائر میں شمار ہے، البتہ اس میں کفارہ واجب نہیں، اور جمہور کے یہاں کفارہ بھی ہے۔

(۳) یمین منعقدہ کہتے ہیں: آدمی آئندہ کے لئے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھاوے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر یمین کو پورا کیا اور بارّ ہوگیا تو یمین پوری ہوجاتی ہے کفارہ واجب نہیں ہوتا اور اگر قسم کے خلاف کیا تو حانث ہوجائے گا اور کفارہ واجب ہوگا، کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلائے یا دس فقیروں کو کپڑے بنادے یا ایک غلام آزاد کرے، اگر ان تین چیزوں میں سے کسی پر قدرت نہیں ہے تو مسلسل تین دن کے روزے رکھے، پھر قسم کو پورا کرنے کا حکم اس وقت ہے جب کہ قسم جائز ہو اور اگر معصیت

(۱) البقرة: ۲۲۵.

کی قسم ہے تو ایسی قسم کھانا جائز نہیں اور نہ اس کو پورا کرنا جائز ہے، بلکہ اس میں حانث ہونا واجب ہے، لہٰذا قسم توڑ کر اس کا کفارہ ادا کرے۔ (۱)

(۵) جھوٹی گواہی دینا:

وفی روایة انس : یہ چار کبیرہ گناہ ہوئے، بخاری شریف میں یہی حدیث حضرت انسؓ کے واسطہ سے آئی ہے، اس میں چوتھے نمبر پر یمین غموس کے بجائے شهادة الزور کا لفظ ہے، یعنی جھوٹی گواہی دینا، اس طرح یہ کل پانچ کبائر ہوجائیں گے، زور بمعنی مائل ہونا، جھوٹی گواہی میں آدمی حق سے باطل کی طرف مائل ہوتا ہے، اس لئے جھوٹی گواہی کو ''زور'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، (۲) یہ کبیرہ گناہ ہے، حضرت عمرؓ ایسے لوگوں کو چالیس کوڑے لگاتے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دیا کرتے تھے، اسی لئے امام ابو یوسف ومحمدؒ کے نزدیک جھوٹے گواہوں کو مارا بھی جائے گا اور قید بھی کیا جائے گا، اور امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کی صرف تشہیر ہوگی مار پٹائی نہیں کی جائے گی۔ (۳)

دو روایتیں اور ان میں فرق:

یہ روایت حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت انسؓ دونوں سے مروی ہے، دونوں کی حدیثوں میں چار گناہوں کا بیان ہے، البتہ دو باتوں کا فرق ہے، ایک یہ کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت اَفراد بخاری میں سے ہے اور حضرت انسؓ کی روایت متفق علیہ ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں چوتھا گناہ یمین غموس ہے اور حضرت انسؓ کی حدیث میں چوتھا گناہ شہادت زور ہے۔

سوال: جب دونوں حدیثیں ایک ہی ہیں تو پھر دونوں روایتوں میں چوتھے گناہ کے بارے میں فرق کیسے ہوا، اس کے کئی جواب ہیں:

(۱) دونوں راویوں کی روایت کا یہ اختلاف، اختلاف مجلس پر محمول ہے، ایک مجلس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار کبائر ذکر فرمائے اس کو ابن عمرؓ نے سنا، دوسری کسی مجلس میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار کبائر بیان فرمائے، لیکن چوتھے نمبر پر شہادت زور کو بیان فرمایا اس کو حضرت انسؓ نے سنا، اس لئے

(۱) البحر الرائق ٤/٤٨٣-٤٨٨.
(۲) فتح الإله ١/٣٧٢.
(۳) البحر الرائق ٧/٢٦-١٢٥.

روایات مختلف ہوئیں۔(۱)

(۲)اگر مجلس ایک ہی رہی ہوتو پھر توجیہ یہ ہوگی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ گناہ بیان فرمائے تھے ان میں سے ایک گناہ کو ابن عمر بھول گئے اور ایک کو حضرت انس بھول گئے۔(۲)

۴۷ / ۳: وَعَنْ أَبِيْ هرُيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "اِجْتَنِبُوْا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ"قالوا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَاهُنَّ؟ قَالَ: "اَلشِّرْكُ بِاللّٰهِ، وَالسِّحْرُ، وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّابِالْحَقِّ، وَأَكْلُ الرِّبَا، وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيْمِ، وَالتَّوَلِّيْ يَوْمَ الزَّحْفِ، وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلاتِ"(متفق عليه)(۳)

ترجمه:- حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو، حضرات صحابہ کرامؓ نے معلوم کیا، یارسول اللہ! وہ سات ہلاک کرنے والی چیزیں کون سی ہیں؟ فرمایا(۱)اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینا (۲)جادو کرنا (۳)اللہ کے حرام کردہ نفس کو قتل کرنا مگر حق کی وجہ سے (۴)سود کھانا (۵)یتیم کا مال کھانا (۶) لڑائی (جہاد) کے دن پشت پھیر کر بھاگنا (۷) ایمان والی بھولی بھالی پاکدامن عورتوں کو زنا کی تہمت لگانا۔(بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

سات بڑے گناہ:

اس حدیث پاک میں سات کبائر کا بیان ہے، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: **اجتنبوا السبع الموبقات**، یعنی سات گناہوں سے بچو جو ہلاک کرنے والے ہیں، صحابہؓ نے عرض کیا **وماهن** یعنی وہ کیا ہیں؟

(۱)المفاتيح: ۱ / ۱۳۷.

(۲)المرقاة: ۱ / ۲۰۶.

(۳)أخرجه البخاري في ثلاثة مواضع "كتاب الوصايا، باب قول الله تعالىٰ: إن الذين يأكلون أموال اليتامى ظلما" ۱ / ۳۸۷ برقم ۲۶۸۵ وأيضاً "كتاب الطب، باب الشرك والسحر من الموبقات" ۲ / ۸۵۸ برقم: ۵۵۳۹، ومسلم في "كتاب الإيمان، باب الكبائر وأكبرها" ۱ / ۶۴ برقم ۸۹، كتاب المحاربين، باب رمي المحصنات، والذين يرمون المحصنات ثم لم يأتوا بأربعة شهداء ۲ / ۱۰۱۳، برقم ۶۵۹۴

تو آپ نے فرمایا:

(۱) شرک:

الشرک باللہ: اس کی تفصیل پہلے آچکی ہے۔

(۲) سحر:

السحر: اس کے لغوی معنی ہیں امر خفی، س ح ر کے مادہ میں خفاء کے معنی پائے جاتے ہیں، صبح کی روشنی کو ''سحر'' کہا جاتا ہے صبح صادق سے پہلے وقت کو بھی ''سحر'' کہتے ہیں اس لئے کہ اس وقت روشنی مخفی ہوتی ہے۔

اور اصطلاح میں سحر کے معنی ہیں: افعال خفیہ کے ذریعہ امور عجیبہ اور واقعاتِ عجیبہ پر قدرت حاصل کرنا۔

سحر حقیقت یا تخیل محض؟

امام راغب اصبہانی اور ابوبکر جصاص وغیرہ حضرات کا کہنا ہے کہ سحر: نظر بندی اور تخییل ہوتی ہے جس کی کوئی حقیقتِ واقعیہ نہیں ہوتی، مثلاً قوتِ خیالیہ مسمریزم [1] وغیرہ کے ذریعہ کسی کے دماغ پر ایسا اثر ڈالا جاتا ہے کہ وہ اس کی وجہ سے ایک چیز کو آنکھوں سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، مگر اس کی کوئی حقیقت واقعیہ نہیں ہوتی، اور کبھی یہ کام شیاطین کے ذریعہ کیا جاتا ہے کہ ان کی مدد سے مسحور کی آنکھوں اور دماغ پر ایسا اثر ڈالا جاتا ہے جس سے وہ ایک غیر واقعی چیز کو حقیقت سمجھنے لگتا ہے، معتزلہ کا بھی یہی قول ہے کہ سحر کا اثر صرف تخییل اور نظر بندی تک ہوسکتا ہے اس سے شئ کی حقیقت نہیں بدلتی، سحر اور جادو سے کسی انسان یا جاندار کو پتھر یا کوئی جانور بنا دیا جائے، ایسا نہیں ہوسکتا۔

اور جمہور فرماتے ہیں کہ سحر کی حقیقت ہے اور واقعتہً اس کی وجہ سے خلاف عادت امور وجود میں آجاتے ہیں اور سحر کے ذریعہ قلب ماہیت بھی ہوجاتا ہے، اس میں نہ کوئی عقلی امتناع ہے اور نہ شرعی، مثلاً جسم پتھر بن جائے یا کوئی شئ ایک نوع سے دوسری نوع کی طرف منقلب ہوجائے کچھ مستبعد نہیں، الفاظ سحر میں ایسی تاثیر کا ہونا قرآن وسنت سے ثابت ہے،، کعب احبار فرماتے تھے کہ میں صبح وشام کچھ کلمات پڑھ لیا کرتا ہوں ورنہ یہ یہود مجھے گدھا بنا دیتے، جس سے معلوم ہوا کہ سحر کے ذریعہ حقیقت بھی تبدیل ہوسکتی ہے۔

(۱) (مِس، مِ، رَے، زْم) انگ، ڈاکٹر مسمر کا ایجاد کیا ہوا ایک علم، جس میں تصور یا خیال کا اثر دوسرے کے دل پر ڈال کر پوشیدہ اور آئندہ کے حالات پوچھے جاتے ہیں۔ (فیروز اللغات)

سحر وجادو سے حفاظت کرنے والے کلمات:

جوکلمات وہ پڑھتے تھے وہ یہ ہیں: اَعـوذُ باللهِ العظيمِ الذى لَيْسَ بشئٌ اعظمَ منه وبكَلِماتِ اللـه التـامّات التى لايجاوز هن برٌّ ولافاجرٌ وبأسْماءِ الله الحسنىٰ كلِّها، ماعَلِمتُ منها ومالَمْ اَعْلَمْ من شرِّ ماخَلَقَ وَبَرَءَ وَذَرَءَ ۔(۱)

سحر کا حکم:

سحر میں عموماً استمداد بالشیاطین ہوتا ہے، ان کو خوش کرنے کے لئے کبھی ایسے منتر اختیار کئے جاتے ہیں جن میں کفر وشرک کے کلمات ہوتے ہیں اور شیاطین کی مدح کی جاتی ہے، کبھی ایسے اعمال اختیار کئے جاتے ہیں جو شیطان کو پسند ہیں، مثلاً کسی کو ناحق قتل کر کے اس کا خون استعمال کرنا، جنابت ونجاست کی حالت میں رہنا وغیرہ، پس سحر کا حکم یہ ہے کہ اگر اس میں کفر وشرک کے اقوال یا اعمال اختیار کئے ہوں تو سحر کفر ہے، اور جس سحر میں اعمال کفر نہ ہوں مگر معاصی کا ارتکاب ہو، یا کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے کیا جائے، یا کسی ناجائز مقصد کے حصول کے لئے کیا جائے وہ گناہ کبیرہ ہے، اسی لئے سحر کا تعلیم وتعلم حرام ہے، البتہ اگر مسلمانوں سے دفعِ ضرر کے لئے بقدر ضرورت سیکھا جائے تو بعض فقہاء نے اجازت دی ہے (۲) مشائخ شوافع میں امام غزالی نے بھی اجازت دی ہے، امام مالکؒ اور علماء کی ایک جماعت نے سحر کو مطلقاً کفر کہا ہے۔

(۳) قتل:

وقتل النفس التى حرم الله إلا بالحق: اس کی تفصیل بھی اوپر آ چکی ہے، البتہ یہاں ''الا بالحق'' کا استثناء ہے، اس استثناء میں پانچ صورتیں داخل ہیں: (۱) قصاصاً قتل کرنا (۲) ردت کی وجہ سے قتل کرنا (۳) محصن اور محصنہ کو زنا کی وجہ سے قتل کرنا (۴) باغیوں کو قتل کرنا (۵) جہاد میں قتل کرنا۔

(۴) سودخوری:

وأكل الربوا: اکل بمعنی اخذ ہے اس لئے کہ لینے سے مقصود کھانا ہوتا ہے، اور ''ربا'' کے معنی زیادتی

(۱) معارف القرآن (۱/ ۲۱۸)

(۲) شامی زکریا (۱/ ۱۳۴)

کے ہیں اور شرعاً **فَضْلُ مالٍ لايقابِلُه عوضٌ في معاوضةِ مالٍ بمالٍ**[۱] کو "ربا" کہتے ہیں، یعنی مالی لین دین کے معاملہ میں ایسا اضافہ جس کے مقابلہ میں دوسری طرف سے عوض نہ ہو، مثلاً ایک ہزار قرض دے کر گیارہ سو لینا، یا ایک کلو چیز کے بدلہ اسی طرح کی چیز سوا کلو لینا، یہ ربا تمام امتوں میں حرام رہا ہے، اور قرآن وسنت میں اس پر بڑی سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں۔

(۵) یتیم کا مال کھانا:

اکل مال الیتیم: یتیم، یتم سے ہے بمعنی قطع کرنا، کاٹنا، یتیم کے اسباب معیشت منقطع ہوجاتے ہیں اس لئے اس کو یتیم کہتے ہیں، علماء نے فرمایا ہے کہ یتیم کی اضافت تین چیزوں کی طرف ہوتی ہے اور تینوں صورتوں میں معنی الگ الگ ہوتے ہیں: (۱) یتیم الانسان (۲) یتیم الحیوان (۳) یتیم الجمادات۔

یتیم الانسان: وہ نابالغ بچہ ہے جس کا باپ مرگیا ہو، اس میں دو قید ہیں: نابالغ ہو اور باپ مرا ہو، اگر بالغ ہے تو یتیم نہیں کہلائے گا نیز اگر والد کا نہیں بلکہ والدہ کا انتقال ہوا ہے پھر بھی بچہ کو یتیم نہیں کہا جائے گا۔

یتیم الحیوان: جانور کا وہ بچہ جس کی ماں مرجائے اس لئے کہ جانوروں میں نسب مادہ کی طرف سے چلتا ہے، انسان ہو یا جانور اصل تو یہ ہے کہ ماں کی طرف منسوب ہو کیونکہ بچہ کے تولد میں نر کے بالمقابل مادہ کا عمل دخل زیادہ ہے، کما ہو ظاہر، لیکن انسانوں میں مرد کی تعظیم کی وجہ سے مرد کی طرف نسبت کی جاتی ہے، جانوروں میں اصل کا لحاظ کرتے ہوئے نسبت میں مادہ کا اعتبار ہوتا ہے۔

اگر یتیم کی نسبت جمادات کی طرف ہو جیسے "دُرِّ یتیم" تو وہاں یتیم کے معنی یکتا اور بے نظیر کے ہوتے ہیں۔

یتیم کے مال کو کھانا حرام ہے، کھانے سے مراد اس میں ہر قسم کا تصرف واستعمال ہے اور کھانے کی تخصیص محض اس لئے ہے کہ مال کا اولین مصرف کھانا ہوتا ہے، باقی ضروریات بعد میں ہیں، لیکن اگر یتیم کا ولی (خدمت کرنے والا) اپنی خدمت کے بقدر اس کے مال سے لے تو یہ جائز ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے: **وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيْراً فَالْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ.**[۲] کہ جو ولی مالدار ہو وہ احتیاط کرے اور جو نادار ہو وہ عرف کے مطابق کھا سکتا ہے۔

---

(۱) هندیه ۳/ ۱۱۷.

(۲) من سورة النساء: ٥.

(۲)میدان جنگ سے بھاگنا:

والتولی یوم الزحف: الزحف بمعنیٰ بچہ کا سرین کے بل گھسٹ کر چلنا، پھراس کا اطلاق بڑے لشکر پر ہونے لگا کیوں کہ ازدحام کی وجہ سے وہ بھی آہستہ آہستہ چلتا ہے، چنانچہ یہاں یہی معنی مراد ہیں۔

میدان جنگ سے فرار اختیار کرنا اور وہاں سے ہٹ جانا جائز نہیں البتہ تین صورتوں میں اس کی اجازت ہے جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے:

(۱)او متحر فاً لقتالٍ: یعنی لڑائی کا پینترا بدلنے کے لئے تاکہ پھر پلٹ کر ان پر حملہ کیا جائے اس کی اجازت ہے۔

(۲)أو متحیزاً إلی فئةٍ: یعنی ساتھیوں کی مدد حاصل کرنے اور مجتمع ہوکر حملہ کرنے کے لئے پشت پھیرنا یہ بھی جائز ہے۔

(۳) اگر کفار مسلمانوں کے مقابلہ میں دوگنا سے زیادہ ہوں تب بھی مقابلہ سے ہٹ جانا جائز ہے جیسا کہ اس آیت سے مفہوم ہوتا ہے ''اَلْآنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ (۱)''

(۱)پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانا:

وقذف المحصنات: پاک دامن کو تہمت لگانا حرام ہے، خواہ مرد ہو یا عورت، عموماً عورت کو تہمت لگائی جاتی ہے اس لئے المحصنات کہا، المومنات کی قید سے کافرات کو نکال دیا کیوں کہ کافرہ کو تہمت لگانا کبیرہ گناہ نہیں، الغافلات سے ان کی براءت کی طرف اشارہ ہے کہ جس قبیح عمل کی نسبت ان کی طرف کررہے ہو وہ ایسی بھولی ہیں ان کو اس کا علم بھی نہیں۔

کسی محصن مرد یا محصنہ عورت کو تہمت لگانے پر دنیا میں بھی سزا دیجائے گی، جس کو ''حدقذف'' کہا جاتا ہے، پس اگر کوئی کسی پر زنا کی تہمت لگائے اور چار گواہوں سے اس کو ثابت نہ کرسکے اس کو بطور حد اسی (۸۰) کوڑے لگائے جائیں گے۔

(۱)الانفال: ٦٦.

۴۸ / ۴: وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "لَايَزْنِي الزَّانِي حِيْنَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَايَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَايَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَايَنْتَهِبُ نُهْبَةً يَرْفَعُ النَّاسُ إِلَيْهِ فِيْهَا أَبْصَارَهُمْ حِيْنَ يَنْتَهِبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَايَغُلُّ اَحَدُكُمْ حِيْنَ يَغُلُّ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَإِيَّاكُمْ إِيَّاكُمْ" (متفق علیہ)(۱)

وَفِيْ رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ: "وَلَايَقْتُلُ حِيْنَ يَقْتُلُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ" قَالَ عِكْرِمَةُ: قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ: كَيْفَ يُنْزَعُ الإِيْمَانُ مِنْهُ؟ قَالَ هٰكَذَا، وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ ثُمَّ أَخْرَجَهَا، فَإِنْ تَابَ عَادَ إِلَيْهِ هٰكَذَا، وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ وَقَالَ أَبُوْعَبْدِاللّٰهِ لَايَكُوْنُ هٰذَا مُؤْمِناً تَامًّا، وَلَايَكُوْنُ لَهٗ نُوْرُالإِيْمَانِ. (هذا لفظ البخاری)(۲)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا"زنا کرنے والا جب زنا کرتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا، اور چوری کرنے والا جب چوری کرتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا، شراب پینے والا جب شراب پیتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا، اور جب لوٹنے والا کھلم کھلا لوٹتا ہے حال یہ کہ کہ لوگ اس کی طرف(بے بسی کے ساتھ) نظر اٹھائے ہوتے ہیں، تو اس کا ایمان باقی نہیں رہتا، اور جب تم میں سے کوئی خیانت کرتا ہے تو اس کا ایمان باقی نہیں رہتا، پس تم اپنے آپ کو ان گناہوں سے بچاؤ! (بخاری ومسلم)

اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ:قتل کرنے والا جب(ناحق) قتل کرتا ہے تو اس کا ایمان باقی نہیں رہتا۔حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت ابن عباسؓ سے معلوم کیا کہ اس سے ایمان کیسے کھینچ لیا جاتا ہے؟ انہوں نے فرمایا اسطرح: اور اپنے

(۱)أخرجه البخاري في ثلثة مواضع: كتاب المظالم، باب النهى بغير إذن صاحبه ۱ / ۳۳۶ برقم ۲۴۱۱ و وأيضا "كتاب الأشربة، باب قوله تعالى "انما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان ۲ / ۸۳۶ برقم ۵۶۱ ۳، وأيضا كتاب الحدود، باب الزنا وشرب الخمر ۲ / ۱۰۰۱ ومسلم كتاب الإيمان، باب بيان نقصان الإيمان بالمعاصي ونفيه عن الملبس بالمعصية على إرادة نفي كماله ۱ / ۵۵ برقم ۵۷.

(۲)أخرجه البخاري في موضعين "كتاب الحدود، باب السارق حين يسرق" ۲ / ۱۰۰۲ برقم ۶۵۲۴ وأيضاً "كتاب المحاربين، باب إثم الزناة وقوله تعالى ولايزنون، ولاتقربوالزنا ۲ / ۱۰۰۶ برقم ۶۵۵۲"

دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں داخل کیں اور پھران انگلیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کردیا، (اس کے بعد فرمایا) اگروہ توبہ کرلیتا ہے تو ایمان اس طرح واپس آجاتا ہے: (یہ کہکر) پھرانہوں نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کرلیا؛ ابوعبداللہ (حضرت امام بخاریؒ) نے فرمایا کہ وہ شخص مؤمن کامل نہیں رہتا اوراس سے ایمان کا نور نکل جاتا ہے۔ (بخاری)

تشریح حدیث

چھ ایمان سوز گناہ:

اس حدیث پاک میں چھ کبائر کے ارتکاب پر ایمان کے سلب ہونے کی خبر دی ہے، فرمایا گیا ہے کہ (۱) زنا کرنے والا حالت زنا میں مومن باقی نہیں رہتا، (۲) اسی طرح چوری کے وقت ایمان باقی نہیں رہتا، (۳) اسی طرح شراب پینے کی حالت میں، (۴) اسی طرح مال کو لوٹتے وقت آدمی مومن نہیں رہتا ہے، (۵) اسی طرح خیانت کے وقت مومن نہیں رہتا، آگے ابن عباسؓ کی روایت میں ایک گناہ کا اوراضافہ ہے اوروہ ہے (۶) قتل کہ اس وقت بھی آدمی مومن نہیں رہتا ہے، اس سے ان گناہوں کی شدت معلوم ہوتی ہے۔

ایک اہم سوال وجواب:

سوال: یہ روایات اوراسی مضمون کی دیگر روایات ماقبل کی ان روایات کے معارض ہیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ ہرایمان والا جنت میں داخل ہوگا اگرچہ اس نے زنایا چوری کی ہو۔

نیز ان روایات سے معتزلہ کی بھی تائید ہوتی ہے کہ ارتکاب کبیرہ سے ایمان ختم ہوجاتا ہے اور یہ کہ ایسا شخص مخلد فی النار ہوگا؟

ان کی روایات کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں:

(۱) یہاں کمال ایمان اورنور ایمان کی نفی ہے جیسا کہ صاحب مشکوٰۃ نے امام بخاریؒ سے اس حدیث کی یہی تاویل نقل فرمائی ہے، یعنی زنا کی حالت میں آدمی کامل مومن باقی نہیں رہتا ہے، اوراس سے نورایمان ختم ہوجاتا ہے۔[1]

---

(۱) لم أجده في نسخ صحيح البخاري ولكن وجدته في حديثٍ موقوف لابن عباس (مصنف ابن أبي شيبة ۱۱ / ۱٤ (۳۰۹٦٦، و٤ / ٤۰٤ (۱٦۹۳۵) ت: محمد عوامة ونقل ابن حجر عنه حديثا مرفوعاً عن الطبرى بمعناه (لينظر: فتح البارى ۱۲ / ٦۸ (٦۷۷۲ وفتح الملهم ۲ / ۱۲)

(۲) ایمان کا عارضی طور پر نکل جانا مراد ہے، یہ جواب صاحب مشکوۃ نے حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کیا ہے، یعنی گناہ کے عین ارتکاب کے وقت ایمان نکل جاتا ہے اور گناہ سے علیحدہ ہوجانے پر ایمان لوٹ آتا ہے، چنانچہ بعض روایات میں ہے کہ ایسی حالت میں ایمان سائبان کی طرح اس کے سر پر کھڑا ہوجاتا ہے گویا کہ اس حالت میں بھی وہ اس کی حفاظت کرتا ہے، کیونکہ اس وقت اس شخص پر عذاب الٰہی کا خطرہ تھا، عکرمہؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے سوال کیا کہ ایمان کیسے نکل جاتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ اس طرح؛ یہ کہہ کر ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے میں داخل کیں اور پھر ان کو نکال دیا، دراصل گناہ کے بعد مومن کو کچھ نہ کچھ ندامت ہوتی ہے اس سے ایمان قلب میں پھر لوٹ آتا ہے۔

(۳) یہ روایات تغلیظ وتشدید پر محمول ہیں (۱) اور تغلیظ وتشدید کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ان گناہوں کی وجہ سے ایمان فی الحال تو نہیں نکلتا ہے لیکن خروج ایمان تک توبت پہنچ سکتی ہے، کیونکہ جب آدمی گناہ کا عادی ہوتا ہے تو قلب میں اس کی محبت پیدا ہوجاتی ہے اور اس کو قلب سے اچھا سمجھنے لگتا ہے حالانکہ شریعت نے اس کو برا کہا ہے، جو چیز شرعاً سیئہ ہو اس کو اچھا سمجھنا کفر ہے، حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے: "**فان لم یستطع فبقلبه وذالک أضعف الإیمان** (۲)"، کہ اگر منکر ومعصیت کو طاقت یا زبان سے ختم کرنے کی قوت نہ ہو تو کم از کم قلب سے اس کو برا سمجھو، یہ ایمان کا ادنی ترین درجہ ہے، پس اگر قلب سے بھی برا نہ سمجھا گیا تو اس کے بعد ایمان کا یہ ادنی درجہ بھی ختم ہوجائے گا۔

قرآن کریم سے بھی یہ مضمون ثابت ہے: "**بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْئَتُهٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ** (۳)" (ہاں وہ شخص جو گناہ کرے اور اس کا گناہ اس کا احاطہ کرلے تو وہ جہنم میں داخل ہوگا اور اس میں ہمیشہ رہے گا) قاضی بیضاوی نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ **احاطت به خطیئته** سے مراد تمام اعضاء وجوارح کا احاطہ ہے جس میں قلب بھی داخل ہے یعنی گناہ کرتے کرتے یہاں تک پہنچ جائے کہ دل سے اچھا سمجھنے لگے، ظاہر ہے کہ اس میں نص کا انکار ہے جو کفر ہے، اس کی

---

(۱) لمعات التنقیح ۱/۲۹۹ ولینظر التقریر الرفیع ۱/۹۶.

(۲) صحیح مسلم ۱/۵۱(۷۸) وابن ماجه ص: ۲۹۰(۴۰۱۳)

(۳) البقرہ: ۸۱.

وجہ سے ایسا شخص مخلد فی النار ہوتا ہے۔(۱)

(۴) حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ: اس کا نام مومن نہیں رہے گا، جب اس نے ایمان قبول کیا تو اس کا نام مومن رکھا گیا تھا، یہ ایک متبرک نام ہے، ان گناہوں کے ارتکاب سے اب اس کو سارق، زانی، فاسق وغیرہ کہا جائے گا، مومن نہیں کہا جائے گا۔

(۵) بعض نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ: وہ مومن مطیع نہیں رہے گا۔

(۶) بعض نے کہا ہے کہ: یہاں مومن کے لغوی معنی (امن والا) کی نفی ہے، یعنی وہ فسادی بن جائے گا امن والا نہیں رہے گا۔(۲)

(۷) بعض نے کہا ہے کہ: **لایزنی** لفظاً خبر ہے مگر نہی کے معنی میں ہے، اور مطلب یہ ہے کہ ایمان کے ہوتے ہوئے آدمی کو زنا چوری وغیرہ نہیں کرنی چاہئے پس حدیث کا مقصود ممانعت ہے۔(۳)

(۸) بعض نے کہا ہے کہ: یہ روایات مستحل پر محمول ہیں یعنی جو شخص ان گناہوں کو حلال سمجھے وہ مومن نہیں رہے گا، کیونکہ قرآن وحدیث سے ان گناہوں کی حرمت ثابت ہے ان کو حلال سمجھنے والا قرآن وحدیث کا منکر ہے۔(۴)

(۹) بعض نے کہا ہے کہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص نے ایمان کے مقتضا پر عمل نہیں کیا، جیسے جو عالم اپنے علم کے تقاضہ پر عمل نہیں کرتا اس کو جاہل کہا جاتا ہے، اسی طرح اس شخص نے ایمان کے مقتضا پر عمل نہیں کیا، لہٰذا وہ مومن ہی نہیں ہے۔(۵)

نهبة يرفع الناس اليه فيها ابصارهم حين ينتهبها: یعنی جس کا مال لوٹا جارہا ہے وہ حسرت سے اس کی طرف دیکھتا ہے یا لوگ اس لوٹنے والے کی جرأت پر اس کو دیکھتے ہیں، یہ قید احترازی نہیں کہ لوگ نہ

---

(۱) تفسير بيضاوي ۱/ ۳۰۲ ط: دارالفكر.

(۲) فتح البارى فيه "معنى نفي الإيمان نفي الأمان من عذاب الله لأن الإيمان مشتق من الأمن"

(۳) فتح الملهم ۲/ ۱۲.

(٤) فتح البارى ۱۲/ ۷۰، وفتح الملهم ۲/ ۱۲ قال: الحافظ وعنه العثماني: وقد ورد في تأويله: بالمستحل حديث مرفوع عن علي عند الطبراني في الصغير لكن في اسناده راوٍ كذبوه.

(٥) فتح البارى ۱۲/ ۷۰۔

دیکھیں تو حرام نہیں بلکہ قید واقعی ہے کہ لوٹ کے وقت لوگوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔(۱)

لایغل: بمعنیٰ مالِ غنیمت میں خیانت کرنا یہ اس کے اصل معنی ہیں، مگر اس سے مطلق خیانت بھی مراد ہوتی ہے، یہاں یہی معنی مراد ہیں۔(۲)

شبک: بمعنیٰ ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے میں داخل کرنا۔

مصنفؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے بعد عبداللہ بن عباس کی روایت نقل فرمائی کیونکہ اس میں ایک گناہ کا اضافہ ہے، دوسرے خود اس روایت میں ان مجموعی روایات کے دو مطالب مذکور ہیں۔

٤٩ /٥: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلٰثٌ". زَادَ مُسْلِمٌ: "وَإِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ" ثُمَّ اتَّفَقَا: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ. (متفق عليه)(۳)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "منافق کی تین علامتیں ہیں، (اس کے بعد) امام مسلمؒ نے (اپنی روایت میں اتنا) اضافہ فرمایا "اگرچہ وہ نماز پڑھے اور روزے رکھے اور مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرے" اس کے بعد بخاری و مسلم متفق ہیں (وہ تین علامتیں یہ ہیں) جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح حدیث

نفاق کی علامات:

اب تک کی روایات میں کبائر کا بیان تھا، ترجمہ کا دوسرا جزء "علامات النفاق" ہے اب یہاں سے چند

(۱) لمعات التنقيح ۱/ ۳۰۰، والمرعاة ۱/ ۳۲۷ والتقرير الرفيع ۱/ ۹٦.

(۲) فتح الملهم ۲/ ۱٥، اللمعات ۱/ ۳۰۰. عبارته: "والمشهور أن المراد في هذا الحديث هو الخيانة من المغنم وهو من الكبائر"

(۳) أخرجه البخاري في أربعة مواضع: "كتاب الإيمان، باب علامة المنافق ۱/ ۱۰ برقم ۳۳، وأيضاً "كتاب الشهادات، باب من أمر بانجاز الوعد وفعله الحسن" ۱/ ۳٦۸ برقم ۲٦۰٥، وأيضاً "كتاب الوصايا، باب قول الله تعالى" "من بعد وصية يوصى بها او دين" ۱/ ۳۸٤ برقم ۲٦٦۸ وأيضاً "كتاب الأدب، باب قوله تعالى "اتقوا الله وكونوا مع الصادقين ۲/ ۹۰۰ برقم ٥۸٥۷"، ومسلم "كتاب الإيمان، باب بيان خصال المنافق ۱/ ٥٦ برقم ٥۸، ٥۹.

روایات میں اس دوسرے جز کا بیان ہے، اس حدیث میں منافق کی تین علامتیں بتائی گئیں:(۱) جب بات چیت کرے تو جھوٹ بولے، (۲) وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے، (۳) اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے، امام مسلم نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں: ''وان صلی وصام وزعم انه مسلم'' کہ اگرچہ وہ نماز روزہ والا ہو اور اپنے کو مسلمان سمجھتا ہو، اگلی حدیث میں چار علامتوں کا بیان ہے، تین تو یہی ہیں اور چوتھی علامت اس میں یہ مذکور ہے کہ جب لڑائی کرے تو گالی گلوچ کرے۔

کل علامات نفاق کتنی ہیں؟ ان روایات میں ''**إذا وعد أخلف** اور **اذا عاهد غدر**'' یہ دو جملے آئے ہیں، پس وعدہ خلافی اور عہد شکنی دونوں کو علیحدہ علیحدہ شمار کریں جیسا کہ امام نووی [۱] نے فرمایا ہے، تو علامات نفاق پانچ ہونگی اور اگر دونوں کو ایک شمار کریں اس وقت چار علامتیں ہوں گی، بعض روایات میں ''اذا وعد غدر'' کے الفاظ ہیں، اس سے دونوں کے ایک علامت ہونے کی تائید ہوتی ہے۔

(۱) جھوٹ بولنا:

اذا حدث کذب: پہلی علامت نفاق جھوٹ بولنا ہے، یہ ہر دین ومذہب اور ہر قوم وملت میں حرام رہا ہے، ایک روایت میں وارد ہے کہ مؤمن سے ہر گناہ کا صدور ہوسکتا ہے سوائے جھوٹ کے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حتی الوسع جھوٹ سے بچا جائے، جھوٹ بولنے میں جھوٹی سفارش، جھوٹی شہادت، جھوٹی تعریف، جھوٹی تصدیق، جھوٹی نسبت، جھوٹا سرٹیفکٹ اور جھوٹا مذاق سب شامل ہے۔

(۲) وعدہ خلافی:

اذا وعد أخلف: علماء نے فرمایا کہ وعدہ خلافی اس وقت علامت نفاق ہے جبکہ وعدہ کرنے کے وقت ہی اس کو پورا نہ کرنے کی نیت ہو، اور اگر بوقت وعدہ ایفاء کا ارادہ تھا لیکن بعد میں کسی وجہ سے پورا نہ کرسکا تو یہ علامت نفاق نہیں ہے البتہ ایسی صورت میں بھی جس سے وعدہ ہے اس کو بتادینا چاہئے کہ میں کسی وجہ سے وعدہ پورا نہیں کرسکتا۔

(۳) امانت میں خیانت:

اذا اؤتمن خان: خیانت میں پیسوں کی خیانت بھی شامل ہے اور اپنی ذمہ داریوں میں کوتاہی بھی،

(۱) شرح مسلم ۱/ ۵٦.

اسی طرح کسی کا راز افشاء کرنا، بلااجازت یاحدِّ اجازت سے ماوراء کسی کی چیز استعمال کرنا بھی خیانت میں شمار ہے۔

اگر کسی مسلمان میں یہ علامات ہوں؟

سوال: یہ علامتیں تو بہت سے مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہیں تو کیا ان پر بھی نفاق کا حکم ہوگا؟

اس کے متعدد جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) منافق دو قسم کا ہوتا ہے: (۱) منافق اعتقادی (۲) منافق عملی، منافق اعتقادی کافر اور مخلد فی النار ہے اور منافق عملی مؤمن ہے اور مخلد فی النار نہیں ہے، ان روایات میں منافق سے مراد منافق عملی ہے اور نفاق عملی ایمان کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے، پس جو مؤمنین ان گناہوں کا ارتکاب کریں گے وہ عملاً منافق شمار ہوں گے۔

(۲) ان روایات میں نفاق سے مراد نفاق عرفی ہے یعنی اظہار خلاف الباطن، اس سے اس شخص کا کافر و منافق ہونا لازم نہیں آتا۔

(۳) یہ روایات تغلیظ وتشدید پر محمول ہیں یعنی ان گناہوں کی وجہ سے آدمی نفاق تک پہونچ سکتا ہے کہ شدہ شدہ ان گناہوں کو دل سے اچھا سمجھنے لگے کمامر تفصیلہ۔

(۴) بعض نے کہا انها طلائع النفاق کہ یہ گناہ نفاق کا مقدمہ اور پیش خیمہ ہیں، یہ جواب تیسرے جواب کے قریب قریب ہے۔

(۵) ان خصلتوں واعمال سے ان عادات کے مجموعے پر مداومت مراد ہے، اور مداوم منافق ہی ہوسکتا ہے، جیسا کہ لفظ ''اذا'' اس کی طرف مشیر ہے یعنی علی سبیل الدوام جس میں یہ باتیں ہوں وہ منافق ہوگا، ان گناہوں میں سے کسی گناہ کا کبھی کبھار مرتکب ہوجائے تو وہ منافق نہیں ہوگا، یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے، کیونکہ روایت میں ''اذا حدث کذب'' کے الفاظ ہیں اور ''اذا'' یقین ودوام کے لئے آتا ہے، پس مطلب یہ ہوگا کہ منافق وہ ہے جو مداومت کے ساتھ جھوٹ بولے کبھی سچ نہ بولے، اور مومن ہمیشہ جھوٹ نہیں بولتا بلکہ اکثر وبیشتر سچ ہی بولتا ہے یہی حال دوسری خصلتوں کا ہے۔

(۷) یہ روایات مستحل پر محمول ہیں کہ جو شخص ان اعمال کو حلال وجائز سمجھ کر کرے اور زبان سے اس

کا اظہار نہ کرے وہ منافق ہے۔

۵۰/ ٦: وَعَنْ عَبدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَ سُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقاً خَالِصاً وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا: إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَاحَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَاعَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَاخَاصَمَ فَجَرَ. (متفق علیہ)(۱)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جس شخص میں چار باتیں ہوں گی وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک بات ہوگی تو اس میں نفاق کی ایک خصلت آ گئی جب تک کہ اس کو چھوڑ نہ دے (اور وہ چار باتیں یہ ہیں) (۱) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے (۲) جب بات کرے تو جھوٹ بولے، (۳) جب عہد کرے تو اس کے خلاف کرے، (۴) جب جھگڑے تو گالی گلوچ کرے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

کان منافقا خالصا: یہ روایت ان علامات وامور کو حلال وجائز سمجھنے والے پر محمول ہے کیونکہ ایسا شخص ہی منافق خالص ہے۔

(۴) عہد شکنی:

اذاعاهد غدر: "وعدہ" اور "عہد" میں بعض علماء نے یہ فرق بتایا ہے کہ "وعدہ" وہ ہے جو ایک طرف سے ہو اور "عہد" وہ ہے جو جانبین سے ہو اور معاہدہ کی پاسداری بھی لازم ہے، خواہ شخصی معاہدہ ہو یا قومی اور ملکی۔

واذاخاصم فجر: منافق کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ جھگڑے کے وقت بدگوئی اور بدزبانی پر اتر آتا ہے اور گالیاں بکنے لگتا ہے، اور سچا مومن لعن طعن، بدگوئی اور فحش گوئی سے اپنے آپ کو دور رکھتا ہے،

(۱) أخرجه البخاري في ثلثة مواضع: "كتاب الإيمان، باب علامة المنافق ۱/ ۱۰ برقم ۳٤، وأيضاً كتاب المظالم باب إذاخاصم فجر ۱/ ۳۳۲ برقم ۲۳۹۵ وأيضاً "كتاب الجزية والموادعة، باب إثم من عاهدثم غدر الخ ۱/ ٤٥۱ برقم ۳۰۷۵" ومسلم "كتاب الإيمان، باب بيان خصال المنافق ۱/ ٥٦"

جیسا کہ ایک روایت میں ہے: لیس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذی۔[1]

۵۱/۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَثَلُ الْمُنَافِقِ كَالشَّاةِ الْعَائِرَةِ بَيْنَ الْغَنَمَيْنِ تَعِيْرُ إِلٰى هٰذِهٖ مَرَّةً وَإِلٰى هٰذِهٖ مَرَّةً. (رواہ مسلم)[2]

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: منافق کی مثال اس بکری کی سی ہے جو دو ریوڑوں کے درمیان جانے والی ہے (نر کی تلاش میں) کبھی اس طرف جاتی ہے اور کبھی اس طرف جاتی ہے۔ (مسلم)

تشریح حدیث

منافقین کی مثال:

اس حدیث پاک میں منافقین کی تردد کی حالت کو بکری کی حالت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، منافقین اپنے معاملہ میں متردد و حیران رہتے تھے اگر مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی ہوتی اور مال غنیمت ملتا تو غیر اختیاری طور پر ان کا قدم اسلام کی طرف بڑھتا تھا اور اگر کبھی مسلمانوں کو شکست ہوتی تو وہ بڑھتا ہوا قدم رک جاتا اور کفار کے پاس جا کر ان سے کہتے: ''اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ''[3]، یعنی ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو صرف مذاق کر رہے تھے، ایک دوسری آیت میں ان کے بارے میں ہے: ''كُلَّمَا اَضَاءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَاِذَا اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا''[4]، یعنی جب کبھی بجلی ان کے لئے روشنی کر دیتی ہے تو اس میں چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر تاریکی چھا جاتی ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں، اس آیت میں روشنی سے مراد فتوحات اور ظلمت سے مراد ان کے ذاتی مفادات ہیں، مطلب یہ ہے کہ جب اسلام کی فتوحات دیکھتے تو اسلام کی طرف راغب ہوتے اور جب اسلامی احکام پر عمل میں ذاتی مفادات متاثر ہوتے دیکھتے تو پھر توقف

(۱) ترمذی ابواب البر والصلة ماجاء فی اللعنة: ۱۹۷٤.

(۲) أخرجه مسلم في كتاب الإيمان، باب خصال المنافق ۱/۵٦.

(۳) من سورة البقرة: ۱٤.

(٤) من سورة البقرة: ۲۰.

کر لیتے، یہ ان کی تردد کی حالت ہے اس لئے ان کی مثال اس بکری کی سی ہے جو اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لئے کبھی اس ریوڑ میں جائے اور کبھی دوسرے ریوڑ میں، بعض بکریوں میں جنسی خواہش زیادہ ہوتی ہے تو وہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے نر کی تلاش میں کبھی ادھر اور کبھی ادھر جاتی ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ منافقین کو بکری سے تشبیہ دی ہے اس میں منافقین کی بزدلی کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بکری بزدلی میں ضرب المثل ہے۔

الفصل الثانی

۵۲/۸: عَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍؓ قَالَ: قَالَ يَهُوْدِيٌّ لِصَاحِبِهٖ: اِذْهَبْ بِنَا إِلٰى هٰذَا النَّبِيِّ فَقَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ، لَاتَقُلْ نَبِيٌّ، إِنَّهٗ لَوْسَمِعَكَ لَكَانَ لَهٗ أَرْبَعُ أَعْيُنٍ، فَأَتَيَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَسَأَلَاهُ عَنْ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَاتُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا، وَلَاتَسْرِقُوْا، وَلَاتَزْنُوْا، وَلَاتَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ، وَلَاتَمْشُوْا بِبَرِيْءٍ إِلٰى ذِيْ سُلْطَانٍ لِيَقْتُلَهٗ، وَلَاتَسْحَرُوْا، وَلَاتَأْكُلُوْا الرِّبَا، وَلَاتَقْذِفُوْا مُحْصَنَةً وَلَاتَوَلَّوْا لِلْفِرَارِ يَوْمَ الزَّحْفِ، وَعَلَيْكُمْ خَاصَّةً الْيَهُوْدَ، أَنْ لَاتَعْتَدُوْا فِي السَّبْتِ، قَالَ: فَقَبَّلَا يَدَيْهِ وَرِجْلَيْهِ، وَقَالَا، نَشْهَدُ أَنَّكَ نَبِيٌّ، قَالَ: "فَمَا يَمْنَعُكُمْ أَنْ تَتَّبِعُوْنِيْ؟ "قَالَا، إِنَّ دَاوٗدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ دَعَا رَبَّهٗ، أَنْ لَايَزَالَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ نَبِيٌّ، وَإِنَّا نَخَافُ إِنْ تَبِعْنَاكَ أَنْ يَّقْتُلَنَا الْيَهُوْدُ. (رواه الترمذي، وأبوداود، والنسائي)(۱)

ترجمہ: حضرت صفوان بن عسالؓ سے مروی ہے کہ (ایک دن) ایک یہودی نے اپنے ایک (یہودی) ساتھی سے کہا کہ: ہمیں ان نبی کے پاس لے کر چلو اس کے ساتھی نے کہا: انہیں نبی نہ کہو، کیونکہ اگر انہوں نے سن لیا (کہ یہودی بھی مجھے نبی کہتے ہیں) تو ان کی چار آنکھیں

(۱) أخرجه الترمذي في موضعين "كتاب الاستيذان، باب ماجاء في قبلة اليد والرجل ۲/۱۰۲ وأيضاً "كتاب تفسير القرآن، باب من سورة بني اسرائيل ۲/۱٤٦ والنسائي "كتاب المحاربة، باب السحرة" ۲/۱۷۱.

الملحوظة: عزاه صاحب المشكاة إلى أبي داود أيضاً، وفيه نظر، لأن المزي لم يعزه إليه في تحفة الأشراف ٤/۱۹۱ وقال الحافظ في "الدراية ۲۳۲" رواه الأربعة إلا أباداؤد، وكذا لم أجد أحداً من المحققين عزاه إليه؛ اللهم أن يقال إنه أراد به الطيالسي لا السجستاني لأن أبادارد الطيالسي قد أخرجه برقم ۱۲٦۰ والله اعلم بالصواب.

ہو جائیں گی، بہرحال وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آپ علیہ الصلوۃ والسلام سے (نو) واضح احکام کے بارے میں سوال کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہ قرادو (۲) چوری نہ کرو (۳) زنا نہ کرو (۴) جس جان کا مارنا اللہ نے حرام قرار دیا اس کو ناحق قتل نہ کرو (۵) کسی بے گناہ کو قتل کرانے کے لئے حاکم کے پاس مت لیجاؤ (۶) جادو نہ کرو (۷) سود نہ کھاؤ (۸) پاکدامن عورت پر تہمت نہ لگاؤ (۹) جہاد کے دن پشت پھیر کر نہ بھاگو، اور اے یہود! تمہارے لئے خاص طور سے واجب ہے کہ شنبہ کے دن میں حکم الٰہی سے تجاوز نہ کرو، راوی کہتے ہیں کہ: یہ سن کر دونوں یہودیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پیر چوم لئے اور بولے کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم واقعی نبی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو پھر میرا اتباع کرنے سے تم کو کیا چیز مانع ہے؟ انہوں نے کہا حقیقت یہ ہے کہ: داود علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ دعاء کی تھی "کہ ان کی اولاد میں ہمیشہ نبی ہوا کرے لہٰذا ہمیں ڈر ہے کہ اگر ہم آپ کی پیروی کریں تو یہودی ہم کو مار ڈالیں گے" (ترمذی، ابوداود، نسائی)

تشریح حدیث

احوال صفوان بن عسال:

یہ قبیلہ "مراد" کے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب فارس فتح ہوگیا تو کوفہ میں رہنے لگے تھے، ان کی روایات اہل کوفہ کے پاس زیادہ ہیں اور قلیل الروایۃ صحابی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بارہ غزوات میں شرکت فرمائی۔(۱)

واقعۂ حدیث:

ایک مرتبہ مدینہ میں ایک یہودی کے پاس اس کا کوئی مہمان آیا، اس نے میزبان سے کہا کہ ہمیں اس نبی کے پاس لے چلو جو نبوت کا دعوی کرتے ہیں، اس پر میزبان نے کہا کہ نبی مت کہو، اگر انہوں نے تمہاری یہ بات سن لی تو ان کی چار آنکھیں ہوجائیں گی، یہ گستاخی کا کلمہ تھا، بہرحال دونوں آئے اور "آیات بینات" کے بارے میں سوال کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند احکامات بتلائے جو حدیث

(۱) الإصابة: ۳/ ۳۵۳.

میں مذکور ہیں، ان کے قلب میں غیر اختیاری طو پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عظمت پیدا ہوگئی، چنانچہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اور پیروں کا بوسہ لیا اور کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ: آپ واقعی نبی ہیں، اس سے ان کا مقصود شہادت دینا اور ایمان قبول کرنا نہیں تھا، بلکہ اپنے علم کو بیان کرنا مقصد تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: پھر تم میرا اتباع کیوں نہیں کرتے؟ تو ان دونوں نے کہا کہ: حضرت داود علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ: ان کی ذریت میں ہمیشہ کوئی نبی رہے اور ظاہر ہے کہ ان کی دعا قبول ہوئی ہوگی، لہٰذا کوئی نبی ہم میں سے بھی آئے گا ہم اس پر ایمان لائیں گے، اور آپ بنی اسماعیل میں سے ہیں، اگر ہم آپ پر ایمان لے آئیں تو یہود ہمیں قتل کردیں گے۔

چار آنکھوں کا مطلب:

لکان له أربع اعین: چار آنکھیں ہوجانے سے کیا مراد ہے؟ اس میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) بعض علماء نے کہا کہ یہ کنایہ ہے غایت سرور سے کہ اگر انہوں نے سن لیا تو وہ بہت خوش ہوں گے اس لئے وہاں انہیں نبی نہ کہنا، فرحت وسرور سے بینائی میں اضافہ ہوتا ہے جیسا کہ غم کی وجہ سے بینائی متاثر ہوجاتی ہے، چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی غم فراق میں چلی گئی تھی۔ (۱)

(۲) بعض نے کہا کہ یہ کنایہ ہے قوت سے یعنی اگر انہوں نے سن لیا تو ان کو قوت حاصل ہوگی کہ اب تو مخالفین ویہود بھی ہم کو نبی ماننے لگے ہیں۔

(۳) بعض نے کہا کہ یہ کنایہ ہے شدت انتظار سے، یعنی تم انھیں نبی کہوگے تو پھر وہ تمہارے ایمان لانے کا انتظار کریں گے کہ آج انہوں نے اپنی زبان سے نبی کہا ہے تو کل ایمان بھی لاسکتے ہیں، ''اعین'' اور ''انتظار'' میں مناسبت یہ ہے کہ آدمی جدھر انتظار کرتا ہے ادھر نظریں بھی لگ جاتی ہیں۔

فسألاه عن آيات بينات: یہاں دو نسخے ہیں، ایک نسخہ کے الفاظ تو یہی ہیں اور دوسرے نسخہ میں **تسع آيات بينات** آیا ہے، یہی دوسرا نسخہ راجح ہے اور شروح مشکوۃ میں بھی یہی لیا گیا ہے۔

اب یہاں بحث یہ ہے کہ **تسع آيات بينات** سے کیا مراد ہے؟

(۱) بعض علماء نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نو معجزات عطا کئے گئے تھے وہ مراد ہیں، ان

(۱) اللمعات ۱/۳۰٤ والمرعاة ۱/۳۳٥–۳۳٦.

نومعجزات میں سے سات کا تذکرہ اس رکوع میں ہے: وَلَقَدْ أَخَذْنَاآلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتالآیة[۱] قحط،نقصِ ثمرات ،طوفان، ٹڈیاں، جوں،مینڈک اورخون کا عذاب، یہ اس لحاظ سے معجزات ہیں کہ جب عذاب آتا ہے تو بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایمان لانے کا وعدہ کرتے اور دعا کی درخواست کرتے، ان کے وعدۂ ایمان پر موسیٰ علیہ السلام دعاء کرتے جس سے عذاب رفع ہوجاتا لیکن وہ ایمان نہ لاتے، آٹھواں معجزہ عصااورنواں معجزہ ید بیضاء ہے۔

لیکن اگر یہ نومعجزات مراد لئے جائیں تواس وقت سوال وجواب میں مطابقت نہیں ہوگی کیونکہ ان لوگوں نے نومعجزات کے بارے میں سوال کیا اورحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معجزات کے بجائے ان کو احکام بتلائے اس کا جواب یہ ہے کہ:

یہاں راوی نے اختصارکیاہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً نومعجزات بیان فرمائے تھے اورپھر اضافہ فی الجواب کے طور پر کچھ احکام بیان کئے، راوی نے ان معجزات کو یہاں ذکرنہیں کیا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہ معجزات قرآن پاک میں مذکورہونے کی وجہ سے عوام وخواص میں مشہور ہیں اس لئے راوی نے ان کے تذکرہ کی ضرورت نہیں سمجھی، اضافہ فی الجواب کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام بتائے راوی نے صرف ان کو بیان کیا۔[۲]

(۲) دوسراقول یہ ہے کہ ''تسع آیات بینات'' سے مراد نومعجزات نہیں، بلکہ وہ احکام مراد ہیں جوسب شریعتوں اورتمام ملتوں میں مشترک رہے ہیں اوران ہی احکام کا بیان یہاں روایت میں ہے،اس صورت میں بھی سوال اورجواب میں مطابقت نہیں ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس احکام بیان فرمائے حالانکہ سوال نواحکام کے متعلق تھا، جواب یہ ہے کہ حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سوال کے جواب میں نواحکام بتائے پھراضافہ فی الجواب کے طورپرمزیدایک حکم بیان فرمایا جوخاص طور سے یہود کے حال کے مناسب تھا وہ یہ کہ یوم السبت کا احترام اوراس میں عبادت کا اہتمام کریں۔[۳]

ولاتمشوابِبريءٍإلى ذي سلطان: ان احکامات ونواہی میں سے بیشتر کا بیان گذشتہ احادیث میں

(۱) من سورة الأعراف: ۱۳۰–۱۳۳.

(۲) لمعات التنقيح ۱/ ۳۰۴–۳۰۵.

(۳) اللمعات ۱/ ۳۰۴–۳۰۵.

آچکا ہے، ایک گناہ جو"قتل نفس" ہی کی ایک خاص صورت ہے جیسا کہ اوپر"الا بالحق" کے ذیل میں ذکر کیا گیا تھا، اس کو یہاں حدیث میں مستقلاً ذکر کیا گیا، کیونکہ یہود اس میں ملوث تھے اور اس حدیث کے مخاطب یہود ہی تھے کیونکہ وہی سائل ہیں، یہود میں یہ خرابی تھی کہ وہ بے قصور آدمی کی بادشاہ سے شکایت کرتے اور اس کو قتل کرا دیتے تھے، آپ نے اس سے منع فرمایا کہ یہ بھی قتل نفس ہی ہے اور شکایت کرنے والا ہی اصل قاتل سمجھا جائے گا۔

"**ذی سلطان**" اس سے ہر صاحب اقتدار مراد ہے، کیونکہ معنی ہیں: غلبہ والا، خاص "بادشاہ" مراد نہیں۔ (۱)

ولاتقذفوا محصنة : **محصنة** بفتح الصاد وکسر ہا دونوں ضبط ہیں، **محصنة** بکسر الصاد کے معنی ہیں عزت کی حفاظت کرنے والی عورت اور **محصنة** بفتح الصاد کے معنی ہیں وہ عورت جس کی عصمت کی حفاظت کی گئی ہو۔ (۲)

جبین بوسی، ید بوسی، اور قدم بوسی کا حکم:

قال فقبلایدیه ورجلیه تعظیماً: ملاقات ہونے پر یا رخصت ہوتے وقت ہاتھ اور چہرے کو بوسہ دینا جائز ہے بشرطیکہ وہ قابل تعظیم ہو مثلاً عالم دین، استاذ، والدین، منصف بادشاہ، اور جو قابل تعظیم نہ ہو اس کے چہرے وہاتھوں کو بوسہ دینا جائز نہیں، الا یہ کہ دفع شر مقصود ہو، اور پیروں کو چومنا درست نہیں خواہ وہ قابل تعظیم ہو، کیونکہ اس میں جھکنا پڑے گا اور سجدہ کی سی حالت ہوجائے گی، جو ممنوع ہے، لیکن یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نہیں روکا اس سے تو قدم بوسی کا جواز معلوم ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لوگ چونکہ ابھی احکام شریعت کے مکلّف نہیں تھے اور ان کے اس عمل میں اسلام کا غلبہ تھا، اس لئے آپ نے ان کو ایسا کرنے سے منع نہیں فرمایا۔ (۳)

وقالانشهدانک نبی: "**نشهد**" سے "**نعلم**" مراد ہے، کیونکہ وہ ایمان نہیں لائے اور ایمان لانا ان کا مقصود بھی نہ تھا بلکہ ان کے قلب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے برحق ہونے کا غیر اختیاری طور پر جو احساس پیدا ہوا اس کا اظہار مقصود تھا۔

---

(۱) مرعاة المفاتيح ۱ / ۳۳۷.
(۲) المرعاة ۱ / ۳۳۷.
(۳) تحفة الأحوذي (۷ / ٤۳۸)

قالاإن داود عليه السلام :دعاربه الخ : ان دونوں نے حضرت داوٗدعلیہ السلام کی دعاء کا حوالہ دیا اور ایمان قبول نہیں کیا، اس دعاء کی حقیقت کیا ہے؟ اس بارے میں چنداقوال ہیں:

(۱) بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ افترائے محض ہے داود علیہ السلام نے ایسی کوئی دعانہیں کی ہے۔(۱)

(۲) اوربعض نے کہا کہ ممکن ہے کہ داود علیہ السلام نے اس نوع کی دعا کی ہو لیکن ان کی مراد یہ ہوگی کہ نبی آخرالزماں تک میری اولاد میں نبوت کو باقی رکھا جائے، اس لئے کہ نبی آخرالزماں کی اطلاع سب نبیوں کو تھی اور یہ بھی معلوم تھا کہ وہ بنی اسماعیل سے ہوں گے۔(۲)

(۳) ملاعلی قاریؒ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں اورقرب قیامت میں دنیامیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ بن کرآئیں گے اورشریعت محمدیہ کے مطابق عمل اورفیصلے کریں گے؛ لیکن ان کا وصف نبوت باقی رہے گااس لحاظ سے من وجہ داود علیہ السلام کی دعاقبول ہوئی کہ قرب قیامت تک ان کی آل میں نبی موجود رہیں گے جیسے ایک علاقہ کا گورنرکسی دوسرے علاقہ میں چلا جائے تو وہ احکام میں دوسرے کے تابع ہوگا لیکن اس کا وصفِ گورنری باقی رہے گا۔(۳)

حدیث کی ترجمۃ الباب سے مناسبت:

اس حدیث کی ابتداء میں ''**لاتشركوا بالله**'' وغیرہ میں کبائر کا بیان ہے اس لحاظ سے حدیث کی ترجمہ کے اول جزء سے مناسبت ہے اوربعض نے کہا کہ اس حدیث میں نفاق کا بیان ہے اور یہ حدیث ترجمہ کے دوسرے جزء ''علامات النفاق'' سے متعلق ہے کیونکہ ان دونوں یہودیوں کا ایمان نہ لانا تو اپنی نفسانیت کی وجہ سے تھا اورانہوں نے بہانہ بنایاداوٗدعلیہ السلام کی دعاکو، پس ان کی اس روش میں اظہار خلاف الباطن ہے جوعرفی لحاظ سے نفاق ہے۔(۴)

۵۳/ ۹: وَعَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "ثَلٰثٌ مِنْ أَصْلِ الإِيْمَانِ: اَلْكَفُّ عَمَّنْ قَالَ: لاإِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، لاتُكَفِّرْهُ بِذَنْبٍ، وَلاتُخْرِجْهُ مِنَ الإِسْلامِ

(۱)شرح المشكاة للطيبي ۲/ ۵۱۲.

(۲)ذخيرة العقبى في شرح المجتبى ۳۲/ ۳۹(۴۰۸۰)

(۳)مرقاة المفاتيح ۱/ ۲۱۷.

(۴)شرح الطيبى ۱/ ۲۱۰.

بِعَمَلٍ، وَالْجِهَادُ مَاضٍ مُذْ بَعَثَنِيَ اللّٰهُ إِلٰى أَنْ يُقَاتِلَ آخِرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ الدَّجَّالَ، لَا يُبْطِلُهُ جَوْرُ جَائِرٍ، وَلَا عَدْلُ عَادِلٍ وَالْإِيْمَانُ بِالْأَقْدَارِ'' (رواہ ابوداود)(۱)

ترجمہ :حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: تین باتیں ایمان کی جڑ ہیں (۱) جو شخص لا الہ الا اللہ کا اقرار کرے اس سے ہاتھ (جنگ) روک لینا، اب کسی گناہ کی وجہ سے اس کو کافر مت کہو اور نہ کسی عمل کی وجہ سے اس کو اسلام سے خارج قرار دو، (۲) اور جہاد جاری رہے گا جس وقت سے کہ اللہ نے مجھے مبعوث فرمایا یہاں تک کہ اس امت کے آخر میں ایک شخص دجال سے قتال کرے، کسی عادل کا عدل یا کسی ظالم کا ظلم جہاد کو ختم نہیں کرسکتا۔ (۳) اور تقدیر پر ایمان لانا۔ (ابوداود)

تشریح حدیث

اس حدیث پاک میں تین احکام مذکور ہیں ان کے خلاف کرنے میں کبائر کا ارتکاب ہوگا اسلئے باب الکبائر سے مناسبت ہے۔

اصول ایمان:

ثلث من اصل الایمان :حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں ایمان کی بنیاد ہیں، ان کے خلاف کرنے میں ایمان کی بنیاد ختم ہوجائے گی، وہ یہ ہیں:

(۱) تکفیر سے احتیاط:

الکف عمن قال لاالہ الا اللہ: اپنے آپ کو اس شخص سے روکنا جو لا الہ الا اللہ کہے، یعنی ایسے شخص کے جان و مال سے تعرض نہ کیا جائے، یہ نہ کہو کہ یہ تو ظاہراً کلمہ پڑھ رہا ہے نہ کہ دل سے، اس لئے اس کا مال اور دم مباح ہے، کیونکہ تم ظاہر کے مکلّف ہو، دل کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے، اس لئے اس کو کافر سمجھ کر جانی یا مالی نقصان پہنچانا تمہارے لئے حرام ہے، نیز فرمایا کہ: ایسے شخص کو گناہ کی وجہ سے کافر نہ کہو اور نہ کسی عمل کی وجہ سے اس کو اسلام سے نکالو۔

(۱) أخرجه أبو داود في ''كتاب الجهاد ،باب في الغزو مع الأئمة الجور ۱ / ۳٤۳.

اس سے معلوم ہوا کہ ارتکاب کبیرہ کی وجہ سے آدمی کافرنہیں ہوتا، لہذا اس سے خوارج ومعتزلہ دونوں کی تردید ہوجاتی ہے، کیونکہ خوارج کبیرہ گناہ کی وجہ سے مسلمان کو کو کافر کہتے ہیں اور معتزلہ بھی کبائر کی وجہ سے مسلمان کو اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں اگرچہ خوارج کی طرح کافرنہیں کہتے۔

''**ذنب**'' اور ''**عمل**'' سے مراد وہ ذنب اور عمل ہے جو فسق وفجور کے قبیل سے ہو، لیکن اگر ایسا گناہ یا عمل ہے جو موجب کفر ہے تو بہرحال اس کو اسلام سے خارج اور کافر قرار دیا جائے گا۔

''**لاتکفروه**'' اور ''**لاتخرجه**'' ان میں دو ضبط ہیں: ایک صیغۂ خطاب کے ساتھ اور دوسرا صیغۂ جمع متکلم کے ساتھ، اول کے مطابق یہ نہی کا صیغہ ہے اور ثانی ضبط کے مطابق یہ خبر ہوگی صاحب شریعت کی طرف سے۔(۱)

(۲) جہاد:

والجهاد ماض مذبعثني الله: اس جملہ میں دوسری اصل جہاد کا بیان ہے اور **الأصل الثاني** یا **الخصلة الثانية** مبتدا محذوف ہے اور **الجهاد** اس کی خبر ہے، ''**ماض**'' ''**هو**'' مبتدا محذوف کی خبر ہے اي: **هو ماض** اور مطلب یہ ہے کہ جہاد دین کی اصل وبنیاد اور دائمی فریضہ ہے، وہ کبھی منسوخ نہیں ہوگا اور ہمیشہ وہر حال میں کیا جائے گا اور چونکہ اسلام کے خلاف سازشیں کرنے والے پیدا ہوتے رہیں گے اس لئے اس کی ضرورت بھی ہمشہ باقی رہے گی یہاں تک کہ اس امت کا آخر ہوجائے گا۔(۲)

اس سے مرزا غلام احمد قادیانی کی تردید ہوجاتی ہے جو یہ کہتا تھا کہ جہاد منسوخ ہوگیا، آپ علیہ السلام نے اس حدیث میں زبانی طور پر اس کے غیر منسوخ ہونے کی خبر دی اور عملی طور پر بھی آپ اخیر عمر تک جہاد میں لگے رہے، اور آپ کے بعد کوئی حکم شرعی منسوخ نہیں ہوسکتا، لہذا مرزا قادیانی کی بات بے معنی اور مہمل ہے۔

ایک اشکال وجواب:

''**مذبعثني**'' اس پر اشکال ہے کہ اول بعثت میں تو جہاد کی اجازت نہیں تھی بلکہ عفو ودرگذر کا حکم تھا، جیسا کہ اس آیت میں ہے ''فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ(۳)''، پھر یہ کیوں فرمایا کہ جہاد اول

(۱) التقرير الرفيع ۱/۱۰۰ والمرعاة ۱/۴۳۹.
(۲) شرح الطيبي ۱/۲۱۰.
(۳) من سورة البقرة: ۱۰۹.

بعثت سے مشروع ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ: یہاں بعثت کے اصطلاحی معنی مراد نہیں بلکہ لغوی معنی یعنی بعثت الی المدینہ یا بعثت الی الجہاد مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس وقت سے جہاد کی اجازت اور اس کا حکم نازل ہوا ہے اس وقت سے لے کر قرب قیامت تک جہاد جاری رہے گا، اور اصل یہاں جہاد کی ابتداء کو بتانا مقصود نہیں بلکہ اس کی انتہاء کو بتانا اصل مقصود ہے۔ (۱)

اخیر زمانہ میں جہاد:

الی أن یقاتل آخر هذه الأمة: یہاں امت سے امت اجابت مراد ہے امت دعوت نہیں، اور "**آخر هذه الأمة**" سے کوئی شخص خاص مراد نہیں بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدی اور ان کے زمانہ کے لوگ مراد ہیں، اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے فرد خاص یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل حضرت مہدی دجال کے لشکر سے قتال کریں گے دجال قتل نہ ہو سکے گا، حتی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور وہ دجال کو قتل کریں گے۔

یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس امت کے لوگوں میں سے شمار کیا گیا، کیوں کہ وہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ بن کر آئیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مطابق ہی فیصلے کریں گے اس لحاظ سے ان کا شمار امتِ محمدیہ میں کیا گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام جہاد کو منسوخ فرمائیں گے پھر جہاد ختم ہوجائے گا، اس لئے کہ اس کے بعد یا تو جہاد کی طاقت نہیں رہے گی یا ضرورت نہیں رہے گی، کیوں کہ قتل دجال کے بعد خروج یاجوج ماجوج ہوگا اور وہ پوری دنیا میں پھیل جائیں گے مسلمانوں میں ان سے لڑنے کی طاقت نہیں رہے گی، اس وقت عیسیٰ علیہ السلام تمام مسلمانوں کو ایک پہاڑ پر لے کر چلے جائیں گے، پھر یاجوج ماجوج ختم ہوجائیں گے، اس کے بعد روئے زمین پر تمام لوگ مسلمان ہونگے، پھر عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوجائے گی اور کچھ عرصہ کے بعد اللہ کی طرف سے ایک پاکیزہ ہوا چلے گی جس کے نتیجہ میں تمام مسلمان وفات پاجائیں گے اور پھر دنیا میں صرف کفار باقی رہ جائیں گے اور ان ہی پر قیامت قائم ہوگی، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قتل دجال کے بعد جہاد کی ضرورت نہیں رہے گی یا طاقت نہیں رہے گی۔

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح ۱/۲۱۷.

لايبطله جور جائر: جہاد کے ختم ہونے کی دو صورتیں ہوسکتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی نفی فرمادی، وہ یہ کہ جہاد امیر کے ماتحت ہوتا ہے، امیر یا عادل ہوگا یا ظالم، اگر امیر ظالم ہوتو مسلمانوں کو عذر ہوسکتا تھا کہ ظالم امیر کے ساتھ ملکر کیسے جہاد کیا جاسکتا ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نفی فرمادی: ''**لايبطله جور جائر**'' کہ ظالم کا ظلم اس کو ختم نہیں کرسکتا، کیونکہ جہاد کا مقصد اسلام کا غلبہ ہے اور یہ مقصد ظالم امیر کی امارت میں جہاد کرنے سے بھی حاصل ہوجائے گا، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''**الجهاد واجب عليكم مع كل امير براً كان أو فاجراً**''[1] یعنی ہر امیر کے ساتھ ملکر جہاد کرنا تمہارے اوپر فرض ہے، امیر نیک ہو یا بد، چنانچہ حضرات صحابہ نے ظالم امیر کی امارت میں بھی جہاد کیا ہے، یزید بن معاویہ فاسق تھا لیکن اس وقت اہل روم کے ساتھ بڑے بڑے جہاد ہوئے، اسی کے زمانہ میں قسطنطنیہ فتح ہوا اور اسی سفر میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کی شہادت ہوئی۔

ولا عدل عادل: دوسرا عذر یہ ہوسکتا تھا کہ مسلمانوں کا امیر عادل ہو اور مسلمان سکون وچین کی زندگی بسر کررہے ہوں، اس وقت یہ خیال ہوسکتا تھا کہ ایسے سکون کے وقت میں جہاد کی کیا ضرورت ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق فرمایا: ''**ولا عدل عادل**'' کہ بادشاہ چاہے عادل ہو لیکن کفار کو مرعوب کرنے اور ان کا سر کچلنے کے لئے اس امن کے زمانہ میں بھی جہاد کیا جائے گا۔

''**لايبطله**'' اس میں دو احتمال ہیں: یا تو یہ نفی ہے یا نہی، اگر نفی ہے تو یہ خبر اور پیش گوئی ہے، یعنی ظالم کا ظلم اور عادل کا عدل جہاد کو ختم نہیں کرے گا، شراح نے اس حدیث کے ضمن میں عمل جہاد کے تسلسل کو بیان فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اب تک جہاد مسلسل جاری رہا ہے، چنانچہ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، اور اگر یہ نہی ہوتو اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ ظالم کا ظلم اور عادل کا عدل تم کو جہاد سے نہ روکے ورنہ تم گنہگار ہوگے۔

(۳) تقدیر پر ایمان:

والايمان بالأقدار: ایمان کی تیسری بنیاد تقدیر پر ایمان لانا ہے، کہ جو کچھ ہو چکا یا ہو رہا ہے یا آئندہ ہوگا وہ سب اللہ کو ازل سے معلوم ہے، ہر چیز کا وقوع اللہ کی مشیت اور اس کی قدرت سے ہوتا ہے،

(۱) رواه ابوداود، كتاب الجهاد، باب في الغز ومع ائمة الجور (۲۵۳۳)

آئندہ مستقل باب کے تحت اس کی تفصیلات آرہی ہیں۔

٥٤ / ١٠: وعن أبی هريرةؓ قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: ''إِذَازَنَى الْعَبْدُ خَرَجَ مِنْهُ الإِيْمَانُ، فَكَانَ فَوْقَ رَأْسِهِ كَالظُّلَّةِ، فَإِذَاخَرَجَ مِنْ ذٰلِكَ الْعَمَلِ رَجَعَ إِلَيْهِ الإِيْمَانُ'' (رواہ الترمذی، وأبوداود)(١)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب بندہ زنا کرتا ہے تو ایمان اس سے نکل جاتا ہے اوراس کے سر پر سائبان کی طرح معلق رہتا ہے پھر جب وہ اس گناہ سے فارغ ہوجاتا ہے تو ایمان اس کی طرف لوٹ آتا ہے۔(ترمذی، ابوداود)

تشریح حدیث

خوارج ومعتزلہ کی تردید:

اس حدیث کا خلاصہ پہلے گذر چکا ہے کہ گناہ کے وقت ایمان آدمی سے نکل جاتا ہے لیکن اس وقت بھی مثل سائبان کے اس کے سر پر رہتا ہے، بندہ جب گناہ سے ہٹ جاتا ہے تو ایمان واپس لوٹ آتا ہے۔

پس زانی یا مرتکب کبیرہ کو کافر یا خارج از اسلام قرار دینا درست نہیں، جیسا کہ خوارج یا معتزلہ کا مذہب ہے۔

الفصل الثالث

٥٥ / ١١: عن معاذٍؓ قَالَ: أَوْصَانِيْ رسولُ اللّٰهِ صلی الله عليه وسلم بعَشْرِ كلماتٍ، قال: ''لاتُشْرِكْ بِاللّٰهِ شَيْئاً وَإِنْ قُتِلْتَ وَحُرِّقْتَ، وَلاتَعُقَّنَّ وَالِدَيْكَ وَإِنْ اَمَرَاكَ أَنْ تَخْرُجَ مِنْ أَهْلِكَ وَمَالِكَ، وَلاتَتْرُكَنَّ صَلاةً مَكْتُوْبَةً مُتَعَمِّداً؛ فَإِنَّ مَنْ تَرَكَ صَلاةً مَكْتُوْبَةً مُتَعَمِّداً فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ، وَلاتَشْرَبَنَّ خَمْراً فَإِنَّهُ رَأْسُ كُلِّ فَاحِشَةٍ، وَإِيَّاكَ وَالْمَعْصِيَةَ؛ فَإِنَّ بِالْمَعْصِيَةِ حَلَّ سَخْطُ اللّٰهِ، وَإِيَّاكَ وَالْفِرَارَ مِنَ الزَّحْفِ وَإِنْ هَلَكَ النَّاسُ، وَإِذَا أَصَابَ النَّاسَ مَوْتٌ وَأَنْتَ فِيْهِمْ فَاثْبُتْ، وَأَنْفِقْ عَلٰى

(١) أخرجه أبوداود فی ''كتاب السنة، باب الدليل على زيادة الإيمان ونقصانه ٢ / ٦٤٤، وذكره الترمذی تعليقاً فی ''كتاب الايمان، باب لايزنی الزانی وهو مؤمن'' ٢ / ٩٠.

عِيَالِکَ مِنْ طَوْلِکَ، وَلَاتَرْفَعْ عَنْهُمْ عَصَاکَ أَدَبًاوَأَخِفْهُمْ فِي اللّٰهِ" (رواہ احمد)(۱)

ترجمہ: حضرت معاذؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دس باتوں کی وصیت فرمائی چنانچہ فرمایا(۱) کہ اللہ کے ساتھ کسی کوشریک نہ کرو، اگرچہ تمھیں جان سے مارڈالا جائے اور جلادیا جائے (۲) اپنے والدین کی نافرمانی نہ کرو، اگرچہ وہ تمہیں اپنے اہل اور مال چھوڑنے کا حکم دیں (۳) جان بوجھ کر کوئی فرض نماز نہ چھوڑو کیونکہ جوشخص جان بوجھ کر فرض نماز چھوڑتا ہے اللہ کا ذمہ اس سے بری ہوجاتا ہے (۴) شراب نہ پیو کیونکہ شراب تمام برائیوں کی جڑ ہے (۵) اللہ کی نافرمانی کرنے سے بچو کیونکہ نافرمانی کرنے سے اللہ کا غصہ اتر آتا ہے (۶) جہاد میں بھاگنے سے پرہیز کرو، اگرچہ (تمہارے ساتھ کے) تمام لوگ ہلاک ہوجائیں (۷) جب لوگوں میں موت (وباء کی صورت میں) پھیل جائے اورتم ان میں موجود ہو تو ثابت قدم رہو (یعنی ان کے درمیان سے بھاگومت) (۸) اپنے اہل وعیال پر وسعت کے مطابق خرچ کرتے رہو (۹) تادیباً اپنا ڈنڈا ان سے نہ ہٹاؤ (۱۰) اوراللہ تعالیٰ کے معاملہ میں ان کوڈراتے رہو۔ (احمد)

تشریح حدیث

دس باتوں کی نصیحت:

اس حدیث پاک میں کبائر کا بیان ہے اور یہ ترجمہ کے پہلے جز یعنی "الکبائر" سے متعلق ہے، حضرت معاذ بن جبلؓ فقیہ اور سمجھدار تھے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اہتمام کے ساتھ نصیحتیں فرماتے تھے، یہاں آپ علیہ السلام نے ان کو دس نصیحتیں فرمائیں، معاذ نام کے بہت سے صحابی ہیں لیکن مطلق بولنے کیوقت اس سے معاذ بن جبل مراد ہوتے ہیں، کیونکہ وہ معروف ومشہور تھے۔

أوصـــــانـــي: یہاں وصیت سے مراد تاکیدی حکم ہے، اس لئے کہ وصیت کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ (۲)

(۱) أخرجه احمد ۵/ ۲۳۸ برقم ۲۲۱۲۸.

(۲) مرقاة المفاتيح ۱/ ۲۱۹ مطبوعه اشرفيه ديوبند.

(۱)لا تشرک باللہ شیئاو إن قتلت و حرقت :یعنی شرک مت کرنا خواہ تمہیں ماردیاجائے یا جلادیاجائے۔

حالت اکراہ میں کفریہ کلمہ کہنے کا مسئلہ:

اس پر یہ سوال ہے کہ اکراہ کی وجہ سے کلمۂ کفرزبان سے اداکرنا جائز ہوتاہے جیساکہ قرآن کریم میں ہے:''اِلَّامَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّ بِالإِیْمَانِ'' (۱) یعنی جس پر جبرکیاجائے اوراس کا دل ایمان پرمنشرح ہو وہ کافرنہیں ہوگا،خواہ زبان سے کفریہ کلمہ کہدے،لیکن یہاں فرمایا گیا کہ خواہ جان چلی جائے مگرشرک کی بات نہ کہو،اس کے دوجواب دیئے گئے ہیں:

(۱)یہ حکم خاص ہے حضرت معاذؓ کے ساتھ کہ وہ جلیل القدرصحابی تھے اُن کا مرتبہ بڑاتھااور بڑے لوگوں کے لئے حکم بھی سخت ہوتاہے،مقولہ مشہورہے حسنات الأبرار سیئات المقربین یعنی جو امورنیک لوگوں کے حق میں حسنات سمجھے جاتے ہیں مقرب اورخاص لوگوں کی جانب سے ان کا ارتکاب برا شمارہوتاہے،اسی طرح آیت کریمہ''یٰنِسَاءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ''میں صاف کہدیاگیا کہ نبی علیہ السلام کی بیویاں اپنے آپ کو عام عورتوں کی طرح نہ سمجھیں،یعنی ان کی جانب سے معمولی فروگزاشت بھی بڑاجرم ہوگا۔(۲)

(۲)یہاں حدیث میں عزیمت کابیان ہے اورقرآن کی مذکورہ آیت میں رخصت کابیان ہے،یہی دوسراجواب راجح ہے۔(۳)

بیوی کوطلاق دینے کے بارے میں والدین کی اطاعت کاحکم:

(۳)ولا تعقن والدیکوان امراک ان تخرج من اھلک ومالک:اس سے مراد بیوی کو طلاق دینے کا اورمال کوخرچ کرنے کاحکم ہے کہ اگروہ اس کاحکم دیں اس میں بھی ان کی نافرمانی نہ کی جائے،تووالدین اگربیوی کوطلاق دینے کاحکم دیں توان کی اطاعت واجب ہے یانہیں؟ مسئلہ یہ ہے کہ بیوی کے حال کودیکھاجائے گااگربیوی کاقصورنہ ہوتو بلاوجہ والدین کےحکم کی اطاعت واجب نہیں اوراگربیوی

(۱)من سورة النحل:۱۰۶.
(۲)سورة الأحزاب:۳۲.
(۳)لمعات ۱/۳۱۱.

کاقصور ہواوروہ اس کا ازالہ نہ کرتی ہوتو اب ان کی اطاعت کرنا واجب ہوگا، یہی تفصیل مال میں بھی جاری ہوگی، مثلاً اگر مال ضرورت سے زائد ہوتو ان کے حکم کی تعمیل واجب ہوگی اوراگر خود کوضرورت ہےتو پھرتعمیل واجب نہیں۔

اورحدیث اسی دوسری شکل پرمحمول ہے، اورحافظ ابن حجر نے فرمایا کہ:''وان امـراک الخ '' میں والدین کی اطاعت میں مبالغہ مقصود ہے کہ ان کے حکم کو بجالاؤ خواہ نفس پرکتنا ہی شاق گذرے لہذا مبالغہ مقصود ہے نہ کہ حقیقت۔ (۱)

(۳)ولاتترکن صلاۃ المکتوبۃ: فرض نماز کو جان بوجھ کرمت چھوڑو کہ اس سے آدمی اللہ کے امان سے نکل جائے گا،امان سے نکل جانے کا کیامطلب ہے؟ اس میں اختلاف ہے:امام احمد فرماتے ہیں کہ یہ مرتد ہوگیا لہٰذا اس کوقتل کیا جائے، امام شافعی اور مالک فرماتے ہیں کہ اس کو حداً قتل کیا جائے، امام صاحب فرماتے ہیں کہ یہ اللہ کی امان میں نہیں رہا لہٰذااس کوقیدخانہ میں ڈال دیا جائے،تفصیل پہلے آچکی ہے۔

(۴) ولاتشربن خمرافإنہ راس کل فاحشۃ: شراب مت پینااس لئے کہ وہ ہر برائی کی جڑ ہے، کیونکہ آدمی کوگناہوں سے روکنے والی چیزعقل ہے اورشراب سے عقل زائل ہوجاتی ہے، پھرآدمی بڑے سے بڑے گناہ میں مبتلا ہوسکتا ہے، اسی لئے شراب کو''ام الخبائث'' کہاجاتا ہے اورنماز برائیوں سے روکتی ہے اس لئے نماز کو''ام العبادات'' کہاجاتا ہے۔

(۵) وإیاک والمعصیۃ :معصیت سے دوررہنا،کیونکہ انسان اس کی وجہ سے اللہ کی ناراضگی وغصہ کا مستحق بن جاتا ہے،یہ تعمیم بعد التخصیص ہے کہ ماقبل میں بھی معاصی کا ہی تذکرہ ہے۔

(٦)وایاک والفرار من الزحف: پہلے آچکا ہے کہ اگرکفارمسلمانوں سے دوگنا سے زیادہ ہوں یااپنی جماعت سے مدد حاصل کرنایاپلٹ کرحملہ کرنا مقصود ہوتو مقابلہ سے ہٹ جانا جائز ہے، پس یہاں حدیث میں عزیمت کا بیان ہے،اورعزیمت یہی ہے کہ ہرحال میں مقابلہ کرے، فتح ملے گی تو غازی کہلائے گا ورنہ شہید ہوگا۔

(۱)المرعاۃ۱/ ۳٤۸.

(۷) وإذاأصاب الناس موت الخ: اگرکسی بستی میں وبا پھیل جائے تو اس بستی سے نہ نکلے، اس لئے کہ ایسا کرنے سے عقیدہ خراب ہوگا کہ وبا کی بستی میں رہنا موت کا سبب ہوتا اور وہاں سے نکلنا زندگی کا سبب ہوا، حالانکہ موت وحیات تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے، اور دوسری حدیث میں ہے کہ اگر تم وبا کی بستی سے باہر ہو تو وبا کے زمانہ میں داخل نہ ہو۔(۱) کیونکہ اس میں بھی عقیدہ کی خرابی ہے کہ اگر اس بستی میں جاکر قضا وقدر کے تحت اس کی موت واقع ہوگئی تو لوگوں کا عقیدہ یہ ہوگا کہ اس بستی میں جانے سے موت واقع ہوئی ہے حالانکہ موت وحیات ہر دو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے قبضہ میں ہیں۔

(۸) وانفق علی عیالک من طولک: "طول" کی دو تفسیریں کی گئی ہیں (۱) أی من فضل مالک یعنی اپنے زائد مال سے خرچ کرو، زائد سے مراد وہ مال جو اپنے اوپر خرچ کرنے کے بعد بچے۔

(۲) ای بقدر وسعک یعنی اپنی گنجائش کے مطابق خرچ کرو، اِسی لئے بیوی کا نفقہ شوہر کے حال کے مطابق ادنی اوسط وغیرہ واجب ہوتا ہے۔

(۹) ولاترفع عنهم عصاک: پہلے جملہ سے شبہ ہوسکتا تھا کہ اہل وعیال پر وسعت کے ساتھ خرچ کرنے سے وہ عیش وعشرت میں نہ پڑ جائیں اس لئے فرمایا کہ اتنا عیش نہ دو کہ وہ بے ادب ہوجائیں بلکہ اسلامی آداب ان کو سکھاؤ، اور اگر تادیب کے لئے مارنے کی ضرورت پیش آئے تو اس سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔

(۱۰) واخفهم فی الله: اور ان کو اللہ کے بارے میں ڈراتے رہو، تاکہ ان کے قلوب میں اللہ کا خوف پیدا ہوجائے اور شریعت کے اتباع کا جذبہ ان کے اندر آجائے۔

٥٦ / ١٢: وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ: إِنَّمَا النِّفَاقُ كَانَ عَلَى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَمَّا الْيَوْمَ فَإِنَّمَا هُوَ الْكُفْرُ أَوِ الْإِيْمَانُ. (رواه البخاری)(۲)

ترجمه: حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ نفاق کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا، اب دو ہی صورتیں ہونگی یا کفر ہوگا یا ایمان۔ (بخاری)

(۱) بخاری ۱ / ٤٩٤، رقم: ٣٤٧٣ ولفظه: الطاعون رجس أرسل علی طائفة من بنی اسرائیل وعلی من کان قبلکم، فإذا سمعتم بأرض فلاتقدموا علیه وإذا وقع بارض وأنتم بها فلاتخرجوا فرارا عنه.

(۲) أخرجه البخاری فی کتاب الفتن، باب إذا قال عند قوم شیئاً ثم خرج فقال بخلافه ٢ / ١٠٥٤ برقم (٦٨٣١)

تشریح حدیث

احوال حذیفہؓ:

حذیفہ بن یمان العبسی جلیل القدر صحابی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب اور راز دار تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منافقین کے نام اور احوال بتادیئے تھے، اس لئے ان کو ''صاحب سرّ رسول الله صلی الله علیه و سلم'' کہا جاتا ہے، حضرت عمرؓ کی عادت تھی کہ اگر کسی کے جنازہ میں حذیفہؓ کو دیکھتے تو خود بھی شریک ہوتے ورنہ شریک نہ ہوتے، آپ فاتح ایران میں سے ہیں، مدائن جو ایران کا دارالسلطنت تھا اس میں ایوان کسریٰ کے پاس آپ کی قبر ہے، ۳۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ (۱)

کیا نفاق اور منافقین آج بھی پائے جاتے ہیں؟

انما النفاق كان على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم: ایک مرتبہ حضرت حذیفہؓ کے سامنے نفاق کا تذکرہ آیا تو انھوں نے فرمایا کہ نفاق کا حکم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا اور اب یا تو کفر ہے یا ایمان۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نفاق کا حکم یہ تھا کہ منافقین پر مسلمانوں کے احکام جاری ہوتے تھے مسلمانوں کی طرح ان کے جان و مال محفوظ رہتے تھے حالانکہ عنداللہ وہ کافروں سے بدتر تھے: ''اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّار (۲)'' اور یہ حکم چند مصلحتوں کی وجہ سے تھا:

(۱) تکثیر سواد مسلمین، یعنی کفار ان کو بھی مسلمان سمجھتے تھے، اور اس سے مسلمانوں کی جماعت میں ظاہراً اضافہ ہوتا تھا، اس وقت میں اس کی ضرورت بھی تھی کہ کفار مسلمانوں کی تعداد زیادہ دیکھ کر حملہ آور ہونے کی ہمت نہ کرتے تھے۔

(۲) انکو مانوس کرنا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ اخلاق کریمانہ سے پیش آتے اسی وجہ سے ان میں سے بہت سے لوگ صدق دل سے ایمان بھی لے آئے۔

(۳) دفع سوء ظن، کہ اگر ان کو قتل کیا جاتا تو کفار بدگمان ہوتے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو بھی

(۱) المرقاة ۱/۲۲۱.

(۲) من سورة النساء: ۱۴۵.

نہیں بخشتا ہے۔

لیکن اب چونکہ اسلام کا غلبہ ہوگیا اور یہ مصلحتیں باقی نہیں رہیں، لہٰذا اب اگر کسی کے بارے میں علامات سے معلوم ہوجائے کہ وہ کفریہ عقائد دل میں چھپاتا ہے تو اس شخص کو قتل کردیا جائے گا اور اس کو منافق نہیں بلکہ زندیق وملحد کہا جائے گا، لہٰذا حضرت حذیفہ کے قول کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی شخص اب دل میں کفر نہیں چھپا سکتا ہے، اور نفاق سرے سے ختم ہوگیا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ نفاق کا وہ نرم حکم جو دورِ نبوی میں تھا اب باقی نہیں رہا، اب ایسے اشخاص پر کفر کا حکم جاری ہوگا، لہذا اس حدیث میں انما النفاق کی تقدیر ہے: انما حکم النفاق الخ

زندقہ والحاد کا مفہوم اور اس کا حکم:

یہ زندقہ والحاد کفر کی بدترین صورت ہے، ارتداد سے بھی بدتر، اسی لئے اس کا حکم مرتد سے بھی سخت ہے، مرتد اگر گرفتاری کے بعد توبہ کرلے تو اس کو چھوڑ دیا جائے گا، لیکن جو زندیق وملحد اپنے زندقہ والحاد کا داعی ہو اور گرفتاری کے بعد توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی، بلکہ توبہ کے باوجود اس کو قتل کیا جائے گا، البتہ اگر گرفتاری سے قبل توبہ کرلے یا اپنے زندقہ والحاد کا داعی نہ ہو تو پھر اس کو توبہ کرلینے کی صورت میں چھوڑ دیا جائے گا، اور زندقہ والحاد کی علامت یہ ہے کہ اظہار اسلام کے ساتھ ضروریات دین میں کوئی ایسی تاویل کرتا ہو جو اس کو اس کے معروف معنی سے ہٹادے۔(۱)

باب فی الوسوسة

ربط ومناسبت:

ماقبل میں کبائر ونفاق کا بیان تھا، کبائر ونفاق کا سبب وسوسہ ہی ہے، اس لئے اب وسوسہ کو بیان کررہے ہیں، نیز نفاق فعل قلبی ہے اور وسوسہ بھی فعل قلبی ہے، فعل قلبی ہونے کے اعتبار سے بھی دونوں میں مناسبت ہے، وسوسہ سے متعلق چند مباحث ہیں:

(۱) وسوسہ کے لغوی معنی:

وسوسہ بروزن بعثرۃ، باب فَعْلَلَةٌ کا مصدر ہے بمعنی ہلکی آواز کا آنا، دل میں کسی خیال یا بات کا آنا،

(۱) شامی ۳/ ۳۸۳-۳۸۴ وجواھر الفقه ۱/ ۶۳-۶۸.

لفظ ''وسوسہ'' مصدری معنی میں بھی بولا جاتا ہے اور اسمی معنی میں بھی اس کا اطلاق کیا جاتا ہے، اسمی معنی ہیں: صوتِ خفی (یعنی ہلکی آواز)(۱)

(۲) وسوسہ کے اصطلاحی معنی:

برے خیالات کو اصطلاح میں ''وسوسہ'' کہا جاتا ہے، یہ وسوسہ کبھی شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور کبھی نفس کی طرف سے، علماء نے دونوں کے مابین فرق یہ بیان کیا ہے کہ بار بار کسی برائی کا خیال آنا نفس کی طرف سے ہوتا ہے اور مختلف گناہوں کا خیال شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ (۲)

(۳) الہام کا مفہوم اور اس کی حجیت:

وسوسہ کا مقابل ''الہام'' ہے، نیکی کے خیال کو ''الہام'' کہا جاتا ہے، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا الہام حجت شرعیہ ہے اور امتی کا الہام حجت شرعیہ نہیں ہے، البتہ علماء فرماتے ہیں کہ الہام اگر موافقِ شرع ہو تو اس سے تائید کا فائدہ ہوگا۔ (۳)

(۴) خیالات کی مختلف صورتیں اور ان کے احکام:

انسان کے دل پر جو خیالات گزرتے ہیں، خواہ اچھے ہوں یا برے، ان کی پانچ قسمیں ہیں (۱) ہاجس (۲) خاطر (۳) حدیث النفس (۴) ہم (۵) عزم۔

هاجس: کوئی خیال دل میں آوے اور فوراً ختم ہوجائے۔

خاطر: کوئی خیال دل میں آوے اور ذرا ٹھہرے، مگر اس سے قبل کہ اس کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں سوچا جائے وہ ختم ہوجائے۔

حديث النفس: کوئی خیال دل میں آئے اور اتنی دیر ٹھہرے کہ اس کے کرنے نہ کرنے کے بارے میں تردد ہونے لگے اس کے بعد ختم ہوجائے۔

هم: خیال دل میں آوے اور اس کے انجام دینے کا رجحان پیدا ہوجائے پھر ختم ہوجائے۔

(۱) اللمعات ۱/ ۳۱٤.
(۲) اللمعات ۱/ ۳۱٤.
(۳) المرقاة ۱/ ۲۲۲.

عزم: یعنی کوئی خیال دل میں آوے پھر اس کے انجام دینے کا پختہ ارادہ کرلیا جائے۔

ان میں سے پہلی تین قسمیں غیراختیاری ہونے کی وجہ سے معاف ہیں، چوتھی قسم ''ہم'' ہے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ہم کا تعلق سیئہ سے ہوتو وہ معاف ہے اوراگر حسنہ سے تعلق ہوتو اس پرایک نیکی لکھی جاتی ہے خواہ اس پر عمل نہ کرسکے،اس امت پرحق تعالیٰ شانہ کا یہ احسان ہے کہ ہمّ سیئہ کو معاف قرار دیا گیا اور ہمّ حسنہ پر اجرعطا کیا جاتا ہے، پانچویں قسم عزم ہے عزم کا تعلق سیئہ سے ہوتو اس پر گناہ لکھا جاتا ہے اگرچہ عمل نہ کیا ہو مگر صرف عزم کا گناہ لکھا جاتا ہے نہ کہ عمل کا، اورحسنہ سے تعلق ہوتو بغیر عمل کے بھی نیکی لکھی جاتی ہے۔

بعض علماء نے عزم سیئہ کو ہمّ سیئہ کی طرح معاف کہا ہے لیکن جمہوراس پر مواخذہ کے قائل ہیں، چنانچہ قرآن کریم میں تصریح ہے:''**وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ** ''(۱) نیز ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے''**إذا الْتَقَى الْمُسْلِمانِ بِسَيْفَيْهِما فالقاتلُ والمقتولُ في النّارِ**'' یعنی جب دومسلمان تلوار سے لڑیں تو قاتل ومقتول ہردوجہنم میں جائیں گے، صحابہ نے کہا کہ قاتل کا جہنم میں جانا معقول ہے مگر مقتول جہنم میں کیوں جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا''**إنّه كان حريصاً علىٰ قتلِ صاحِبِه**'' کہ وہ بھی اپنے مقابل کے قتل کا حریص تھا اوراس کا عزم کئے ہوئے تھا''(۲) اس روایت میں صراحت ہے کہ مقتول معصیت کے عزم کی وجہ سے جہنم رسید ہوا۔(۳)

علاجِ وسوسہ:

اگروسوسے اور برے خیالات آویں تو آئندہ روایات میں اس کے کئی علاج بتائے گئے ہیں: (۱) تعوذ پڑھے (۲) آمنت باللہ ورسولہ کہے (۳) بائیں جانب تھوک دے تاکہ شیطان ذلیل ہو اور بھاگ جائے (۴) مجلس سے اٹھ جائے یعنی اپنی ہیئت کو بدل دے (۵) عدم التفات الی الوسوسہ یعنی وسوسہ کی جانب توجہ نہ کرے (٦) عدم مواخذہ وامید اجر یعنی اس امر کا استحضار کرے کہ وسوسہ پر مواخذہ نہیں ہے اوراجروثواب کی امید رکھے۔(۱)

(۱) من سورة البقرة: ۲۲۵.

(۲) أخرجه البخاري: الإيمان /وإن طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فأصلحوا بينهما (۱/ ۹ (۳۱)، و(٦۸۷۵) و(۷۰۸۳) ومسلم: الفتن/إذا التقى المسلمان ......(۲/ ۳۸۹ (۲۸۸۸)

(۳) مرقاة المفاتيح ۱/ ۲۲۲.

(٤) مرقاة المفاتيح ۱/ ۲۲۳.

الفصل الأول

۱/۵۷: عن أبی هریرةؓ قال: قال رسولُ الله صلی الله علیه وسلم "إِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ أُمَّتِيْ مَاوَسْوَسَتْ بِهٖ صُدُورُهَامَالَمْ تَعْمَلْ بِهٖ أَوْتَتَكَلَّمْ" (متفق علیہ)(۱)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لوگوں کے ان وسوسوں کو معاف کردیا ہے جوان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں جب تک کہ وہ ان وسوسوں پر عمل نہ کریں اوران کو زبان پر نہ لائیں۔ (بخاری ومسلم)

شرح حدیث

وساوس معاف ہیں:

اس حدیث میں امت سے وسوسہ کے معاف ہونے کا بیان ہے کہ جب تک اس پر عمل نہ کرے یااس کا تکلم نہ کرے وہ معاف ہے، اوراگر وسوسہ کے مطابق عمل کرلیا جبکہ وہ ازقبیل عمل ہو یازبان سے تلفظ کیا اگروہ ازقبیل قول ہوتو پھرمعاف نہیں، بلکہ قابل گرفت ہے۔

کیاوساوس کی معافی اس امت کی خصوصیت ہے؟

ان اللـه تجاوز عن امتی: اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وسوسہ کا معاف ہونا اس امت کی خصوصیت ہے، امم سابقہ سے وسوسہ معاف نہ تھا،لیکن علی الاطلاق ایسانہیں ہے، بلکہ وسوسہ کی غیراختیاری صورتیں سب امتوں میں معاف تھیں،قرآن کریم میں عام ضابطہ بیان کیا گیا ہے: "لَايُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً اِلَّاوُسْعَهَا" (۲) یعنی اللہ تعالیٰ کسی کوبھی اس کی وسعت سے زیادہ کا پابندنہیں کرتا،لہٰذا"ہاجس""خاطر" اور"حدیث النفس" وسوسہ کی یہ اقسام ثلثہ امم سابقہ سے بھی معاف تھیں اور"عزم" کسی سے بھی معاف نہیں ہوا، امتِ محمدیہ کی خصوصیت"ہم" کا معاف ہوناہے،"ہم" میں اختیار پایا جاتا ہے اور جانب فعل کوترجیح

(۱) أخرجه البخاري فی کتاب العتق، باب الخطاء والنسیان فی العتاقة(۲۵۲۸) وفی کتاب الطلاق، باب الطلاق فی الاغلاق والکره (۵۲۶۹) وفي کتاب الأیمان والنذور باب إذا حنث ناسیا فی الأیمان (۶۶۶۴) ومسلم فی کتاب الإیمان، باب تجاوز الله عن حدیث النفس والخواطر بالقلب لم تستقر(۲۰۱، ۲۰۲)

(۲) من سورة البقرة: ۲۸۶.

ہوجاتی ہے اس طور پر کہ اگر اول وہلہ میں جبکہ ہاجس کا مرحلہ تھا اس کو دفع کر دیتا اور اپنے ذہن کو دوسری طرف متوجہ کر دیتا تو ہم کے مرحلہ تک نوبت نہ پہنچتی، پس درجۂ ہم میں ایک نوع کا اختیار پایا جاتا ہے اس کے باوجود معاف قرار دیا گیا ہے، یہ اس امت کی خصوصیت ہے۔

ماوسوست به صدرها: ''صدر'' سے مراد قلب ہے، محل بول کر حال مراد لیا گیا ہے، پھر راجح یہ ہے کہ صدر مرفوع ہے اور وسوست کا فاعل ہے (۱) بعض نے اس کو منصوب پڑھا ہے مفعول بہ ہونے کی وجہ سے، اس وقت و سوست کا فاعل لفظ ''امت'' ہوگا اور وسوست حدثت کے معنی میں ہوگا، لیکن اول ضبط راجح ہے اس لئے کہ وسوسہ عموماً لازم استعمال ہوتا ہے۔

تنبیه: یہاں مشکوۃ شریف کے ہندی نسخوں میں ''صدرها'' مفرد کے صیغہ کے ساتھ تحریر ہے، جو کہ تصحیف ہے، صحیح ''صدورها'' جمع کے صیغہ کے ساتھ ہے، بخاری وغیرہ میں جمع کے صیغہ کے ساتھ ہی وارد ہے۔(۲)

۵۸ / ۲: وَعَنْهُ قَالَ: جَاءَ نَاسٌ مِنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم اِلَى النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم، فَسَأَلُوْهُ: إِنَّا نَجِدُ فِيْ أَنْفُسِنَامَايَتَعَاظَمُ أَحَدُنَا أَنْ يَتَكَلَّمَ بِهٖ! قَالَ: أَوَقَدْ وَجَدْتُمُوْهُ؟ قَالُوْا: نَعَمْ، قَالَ: "ذَاكَ صَرِيْحُ الْإِيْمَانِ" (رواه مسلم)(۳)

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے چند حضرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے دریافت کیا کہ ہم اپنے دلوں میں بعض ایسی باتیں (وسوسے) پاتے ہیں کہ جن کو زبان پر لانا بھی ہم برا سمجھتے ہیں، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کیا واقعی تم ایسا پاتے ہو؟ صحابہ نے عرض کیا: جی ہاں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تو کھلا ایمان ہے۔ (مسلم)

تشریح حدیث

اس حدیث میں بھی وسوسہ کا اور اس کے معاف ہونے کا بیان ہے نیز اس بات کا بیان ہے کہ بہت

(۱) المرقاة ۱ / ۲۲۲۔
(۲) بخاری شریف ۱ / ۳٤۳.
(۳) أخرجه مسلم، كتاب الايمان، باب بيان الوسوسة في الايمان ۱ / ۷۹.

سے صحابہ کرامؓ کو بھی وسوسے آتے تھے۔

صحابۂ کرام کی وساوس کی شکایت اور آپ علیہ السلام کا جواب:

جاء ناس من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم : حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں: کہ کچھ صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ ہم اپنے نفس میں ایسی باتیں پاتے ہیں کہ ہم ان کو زبان پرلانا بھی بڑا گناہ سمجھتے ہیں، مثلاً اللہ کی ذات کے بارے میں وسوسہ کا پیدا ہونا، یہ وسوسہ کہ قیامت آئے گی یا نہیں؟ جنت ودوزخ برحق ہے یا نہیں؟ وغیرہ، ایک حدیث میں ہے کہ ہمارے دل میں ایسے وسوسے آتے ہیں کہ ہم کو کوئلہ بن جانا پسند ہے لیکن ان چیزوں کو زبان پرلانا گوارا نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو صریح ایمان ہے۔

ذاک صريح الايمان: اس کا مشار الیہ کیا ہے؟

(۱) بعض نے کہا کہ مشار الیہ وساوس ہیں یعنی یہ وساوس صریح ایمان کی علامت ہیں۔ (۱)

(۲) بعض نے کہا کہ اس کا مشار الیہ "وجدان" ہے جو "**وجدتموه**" فعل کا مصدر ہے، فعل کی دلالت مصدر پر ہوتی ہے۔ (۲)

(۳) بعض نے کہا کہ مشار الیہ "تعاظم" ہے جو "**یتعاظم**" فعل کا مصدر ہے یعنی اس وسوسہ کو برا سمجھنا صریح ایمان ہے۔ (۳)

مگر سب صورتوں میں مطلب ایک ہی ہے کہ وساوس کا آنا ایمان کی علامت ہے، اس لئے کہ چور خالی گھر میں داخل نہیں ہوتا ہے، چنانچہ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ جس نماز میں وسوسہ نہ آئے وہ یہود ونصاریٰ کی نماز ہے، (۴) یعنی اطمینان سے نماز پڑھنے کا موقعہ شیطان انہی کو دے سکتا ہے مؤمنوں کو تو وہ قدم قدم پر بہکاتا ہے، دوسرے یہ کہ کافر شخص اس قسم کے وساوس کو اچھا سمجھتا ہے اور انہی کا معتقد

(۱) المرقاة ۱/ ۲۲۵.

(۲) اللمعات ۱/ ۳۱۶.

(۳) اللمعات ۱/ ۳۱۶.

(٤) المرقاة شرح المشكاة ۲۱/ ۱۳٦، ط: مكتبه امدايه، ملتان.

ہوتا ہے، لہذا جوان کو برا سمجھ رہا ہے تو یہ اس کے مومن ہونے کی دلیل ہے۔ (۱)

٥٩ / ٣ :وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم : "يَأْتِي الشَّيْطَانُ أَحَدَكُمْ، فَيَقُوْلُ: مَنْ خَلَقَ كَذَا؟ مَنْ خَلَقَ كَذَا؟ حَتّٰى يَقُوْلَ: مَنْ خَلَقَ رَبَّكَ؟ فَإِذَا بَلَغَهُ، فَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ وَلْيَنْتَهِ" (متفق علیہ)(۲)

ترجمہ :حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے بعض آدمیوں کے پاس شیطان آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا؟ اور اس چیز کو کس نے پیدا کیا؟ یہاں تک کہ وہ یوں کہتا ہے کہ تیرے پروردگار کو کس نے پیدا کیا؟ جب آدمی اس حد تک پہنچ جائے تو اس کو چاہئے کہ اللہ سے پناہ مانگے اور (اس سلسلہ میں تفکر سے) رک جائے۔ (بخاری ومسلم)

٦٠ / ٤ : وَعَنْهُ قَالَ: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم : لَايَزَالُ النَّاسُ يَتَسَاءَلُوْنَ حَتّٰى يُقَالَ : هٰذَا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ، فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ؟ فَمَنْ وَجَدَمِنْ ذٰلِكَ شَيْئاً؟ فَلْيَقُلْ: آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ. (متفق عليه)

ترجمہ :اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ لوگ باہم سوال کرتے رہیں گے یہاں تک کہ کہا جائے گا (یعنی دل میں وسوسہ آئیگا) کہ اس تمام کائنات کو اللہ نے پیدا کیا تو اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ پس جس شخص کے دل و دماغ میں اس قسم کا کوئی خیال و وسوسہ پیدا ہو تو وہ یہ کہے کہ میں اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا۔ (بخاری ومسلم)

شرح حدیث

خدا تعالیٰ کی پیدائش کا وسوسہ اور اس کے متعدد علاج:

ان دونوں حدیثوں میں وسوسوں کی تفصیل مذکور ہے کہ انسان کے قلب میں کس قسم کے وسوسے پیدا

(۱) اللمعات ١ / ٣١٦.

(۲) أخرجه البخاری ، كتاب بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده ١ / ٤٦٣ برقم ١٣٧٠، ومسلم: كتاب الإيمان ، باب بيان الوسوسة في الايمان الخ ١ / ٧٩.

ہوتے ہیں، پھر ان کا علاج بتایا گیا ہے، وہ تفصیل یہ ہے کہ شیطان بعض لوگوں کے پاس آتا ہے اور ذہن میں سوال ڈالتا ہے کہ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا؟ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا؟ پھر خود ہی اس کا جواب سکھاتا ہے کہ اللہ نے پیدا کیا، اس طرح مختلف چیزوں کے متعلق سوال ڈالتا ہے اور ہر سوال کا جواب سجھاتا ہے کہ اللہ نے پیدا کیا، جب آدمی کا یہ ذہن بن جاتا ہے کہ ہر چیز تخلیق کے مرحلہ سے گذری ہے اور قانونِ فطرت ہے کہ ہر چیز کو پیدا کیا گیا ہے تو اچانک ذہن میں یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ العیاذ باللہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان وسوسوں کے کئی علاج بیان فرمائے۔

(۱) تعوذ پڑھے:

فلیستعذ باللہ: آدمی جب اس حد تک پہنچ جائے تو تعوذ پڑھے، کیونکہ شیطانی تصرف کے وقت حق تعالیٰ شانہ نے قرآن میں یہی طریقہ تعلیم فرمایا ہے "**وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ**"[(۱)] کہ اگر شیطان تمہارے دل میں برائی کا خیال ڈالے تو اللہ سے پناہ مانگ لیا کرو، وجہ اس کی یہ ہے کہ شیطان کا مکر اگرچہ بڑا ہے، مگر اللہ کے سامنے اس کا مکر ضعیف و ہیچ ہے: **اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطَانِ کَانَ ضَعِیْفًا**.[(۲)]

ہمارے حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ شیطان اور اس کے وسوسوں کی مثال اس کتے کیسی ہے جو گھر کے دروازہ پر کھڑا ہو، گھر کے مالک کا ایک دوست اس سے ملنے کے لئے آتا ہے تو وہ کتا اس پر بھونکتا ہے، اس وقت تین صورتیں ہوسکتی ہیں (۱) اس کتے سے مقابلہ کیا جائے، اس میں کامیابی کا امکان کم ہے اور خطرہ زیادہ ہے، (۲) خائف ہوکر وہاں سے واپس آجائے، اس وقت مقصد میں ناکام رہے گا ملاقات سے محرومی رہے گی (۳) اس دوست اور مکان کے مالک کو آواز دے، وہ آئے گا اور کتے کو ڈانٹ کر ہٹادے گا، اس شکل میں کتے سے بھی حفاظت رہے گی اور مقصد بھی حاصل ہوجائے گا، دوست سے ملاقات ہوجائے گی، یہی صورت یہاں ہے کہ بندہ جب کثرت عبادت اور ذکر و مراقبہ کے ذریعہ حق تعالیٰ شانہ کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس وقت عموماً وساوس شیطانی اس کو گھیر لیتے ہیں تاکہ وہ مایوس ہوکر عبادت ذکر وغیرہ کو چھوڑ بیٹھے، اس وقت بندہ تعوذ پڑھے اور شیطان کے مقابلہ میں اللہ سے مدد چاہے، اللہ تعالیٰ شانہ شیطان کو ذلیل اور ناکام بنادے گا، شیطان راستہ سے ہٹ جائے گا اور بندہ کو وصالِ خداوندی

(۱) من سورۃ الاعراف: ۲۰۰.

(۲) من سورۃ النساء: ۷۶.

حاصل ہوجائے گا۔

تفکر چھوڑ دے:

ولینتہ: دوسرا علاج بیان کیا کہ ان تفکرات سے رک جائے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی خیال کا آنا تو غیراختیاری چیز ہے لیکن اس سے دوسری طرف ذہن منتقل کرلینا اختیاری چیز ہے، اس لئے ذہن کو وہاں سے ہٹالے اور دلائل سے اس کا جواب نہ دے، کیونکہ شیطان دلائل کو توڑ دے گا اور آدمی شک وشبہ میں مبتلا ہوجائے گا۔

ایک عالم کو جنگل میں شیطان ملا، شیطان نے پوچھا کہ بتاؤ تمہارا ایمان قوی ہے یا عامی شخص کا، عالم نے کہا میرا، اس لئے کہ میرا ایمان استدلالی ہے اور عامی آدمی کا ایمان تقلیدی ہے، شیطان عالم صاحب کو ایک عامی شخص کے پاس لے گیا جو کلہاڑے سے لکڑی کاٹ رہا تھا، شیطان نے اس عامی شخص سے سوال کیا کہ اللہ ایک ہے یا دو؟ اس نے کہا کہ ایک ہے، شیطان نے کہا اگر میں دلیل سے دو ثابت کردوں تو؟ اس عامی شخص نے کہا کہ میں کلہاڑے سے تیرے دو ٹکڑے کردونگا، شیطان نے مولانا صاحب سے کہ کہ تمہاری دلیل کا جواب تو دے سکتا ہوں، مگر اس کا جواب نہیں دے سکتا، معلوم ہوا کہ عامی کا ایمان قوی ہے۔(۱)

لایزال الناس یتساء لون: یعنی آپس میں ایک دوسرے سے سوال کریں گے یا لوگ خود ہی اپنے دل سے سوال کریں گے۔

(۳) آمنت بالله ورسله کہے:

آمنت بالله ورسله: دفع وسوسہ کا یہ تیسرا علاج ہے، بعض نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ اس طرح کے وساوس کا آنا کفر ہے، لہٰذا تجدید ایمان کے لئے **آمنت بالله ورسله** کہے، ملا علی قاریؒ نے اس قول کی تردید فرمائی اور فرمایا کہ یہ کفر نہیں، البتہ اس سے قلب میں ایک طرح کی تاریکی پیدا ہوتی ہے، قلب میں جلاء اور روشنی پیدا کرنے کے لئے **آمنت بالله ورسله** کہنا چاہئے۔(۲)

بعض علماء نے فرمایا کہ **آمنت بالله ورسله** کہنا شیطان کی تردید کے لئے ہے کہ وہ ہمیں دلائل کی

(۱) ملفوظات فقیہ الامت ۱/۶۵۔

(۲) المرقاۃ ۱/۲۲۷۔

بحث میں ڈال کر گمراہی میں مبتلا کرنا چاہتا ہے، آمنت باللہ کا حاصل یہ ہے کہ ہم اللہ ورسول کے حکم کو بغیر دلیل کے مانتے ہیں اور دلائل کی بحث میں نہیں پڑتے۔(۱)

۶۱/۵: وَعَنِ ابنِ مسعودٍؓ قال: قال رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: "مَامِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ بِهِ قَرِينُهُ مِنَ الْجِنِّ وَقَرِينُهُ مِنَ الْمَلائِكَةِ" قَالُوْا: وَإِيَّاكَ يَارَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: "وَإِيَّايَ" وَلٰكِنَّ اللّٰهَ أَعَانَنِي عَلَيْهِ فَأَسْلَمَ، فَلايَأْمُرُنِيْ إِلَّابِخَيْرٍ. (رواہ مسلم)(۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نہیں ہے تم میں سے کوئی شخص مگراس پرایک ساتھی جنات (شیاطین) میں سے مقرر کیا گیا ہے اور ایک ساتھی ملائکہ میں سے مقرر کیا گیا ہے اس پر صحابہؓ نے عرض کیا: کہ یارسول اللہ کہ وہ "قرین من الجن" آپ کے اوپر بھی مقرر ہے فرمایا کہ ہاں میرے اوپر بھی مقرر ہے، لیکن اللہ نے میری اس کے خلاف مدد فرمائی پس وہ مجھے حکم نہیں دیتا مگر خیر کا۔

تشریح حدیث

ہرانسان کے ساتھ شیطان اور فرشتہ کا پیدا ہونا:

اس روایت میں وسوسہ اور الہام کا بیان ہے اور بتایا گیا ہے کہ وسوسہ ڈالنے والا کون ہے اور الہام کرنے والا کون ہے؟ روایت کا حاصل یہ ہے کہ ہرانسان کا ایک ساتھی جن یعنی شیطان ہے اور ایک ساتھی فرشتہ، جب انسان کے یہاں بچہ پیدا ہوتا ہے، تو شیطان کا بھی بچہ پیدا ہوتا ہے شیطان کے بچہ کو اس انسان پر مقرر کر دیا جاتا ہے اس کو "قرین الانسان من الجن" کہا جاتا ہے اور اس کا لقب "وسواس" ہے، اسی کے ساتھ انسان پر ایک فرشتہ بھی مقرر کر دیا جاتا ہے اس کو "قرین الانسان من الملائکہ" کہا جاتا ہے اور اس کا لقب "ملہم" ہے، دل میں جو برائی کا خیال آتا ہے وہ "وسواس" کی طرف سے ہوتا ہے اور جو نیکی کا خیال آتا ہے وہ ملہم کی طرف سے ہوتا ہے، اور یہ صورت حال ہر شخص کے ساتھ ہے، صحابہ نے سوال کیا کہ کیا یہ شیطان آپ

(۱) اللمعات ۱/۳۱۹.

(۲) أخرجه مسلم فی "كتاب صفات المنافقين وأحكامهم، باب تحريش الشيطان الخ ۲/۳۷۶"

کے اوپر بھی مقرر ہے؟ فرمایا کہ ہاں میرے اوپر بھی مقرر ہے، لیکن اللہ نے اس کے خلاف میری مدد فرمائی اور وہ میرا تابعدار ہوگیا پس وہ مجھ کو حکم نہیں دیتا مگر خیر اور بھلائی کا۔

فأسلم: اس صیغہ کو دو طریقوں پر ضبط کیا گیا ہے: (۱) باب افعال سے ماضی معروف واحد غائب کا صیغہ ہو، اس صورت میں دو ترجمہ ہوسکتے ہیں: ایک یہ کہ وہ شیطان میرا تابعدار ہوگیا ہے، جیسا کہ بعض روایات میں وارد "فاستسلم" کے لفظ سے بھی معلوم ہوتا ہے (۱) دوسرا ترجمہ: وہ شیطان مسلمان ہوگیا۔(۲)

سوال: شیطان تو مسلمان نہیں ہوسکتا؟ اس کے حق میں گمراہی مقدر ہوچکی ہے تو پھر **فأسلم** کا کیا مطلب ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ یہ حکم تو ابوالشیاطین ابلیس کیلئے ہے، اس کی ذریت میں سے کوئی مسلمان ہوجائے تو یہ ممکن ہے اس میں کوئی استبعاد نہیں ہے۔(۳)

(۲) باب سمع سے مضارع واحد متکلم کا صیغہ ہو، اس صورت میں ترجمہ ہوگا کہ میں اس سے محفوظ رہتا ہوں، سفیان ابن عیینہ نے دوسرے ضبط کو اور قاضی عیاض نے اول کو اختیار کیا ہے۔(۴)

٦٢/٦: وعن أنسٍ قال: قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: إنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ. (متفق علیہ)(۵)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: شیطان انسان کے اندر اس طرح دوڑتا پھرتا ہے جیسے رگوں میں خون گردش کرتا رہتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

(١) اكمال المعلم ٨/ ٣٥٠.

(٢) اللمعات ١/ ٣٢٠.

(٣) اللمعات ٦/ ٣٢٠-٣٢١.

(٤) إكمال المعلم بفوائد مسلم ٨/ ٣٥٠ ط دار الوفاء مصر

(٥) أخرجه مسلم في كتاب السلام، باب ان يستحب لمن رأى خالياً بأمرأة وكانت زوجته أو محرما له أن يقول هذه فلانة ليدفع ظن السوء به ٢/ ٢١٦.

ملحوظه: قدعزاصاحب المشكاة خطيب التبريزي هذا الحديث إلى الشيخين، ولكن ليس هذا الحديث بموجود في صحيح البخاري من طريق انسؓ بل هو موجود من طريق صفية بنت حُيي زوجة الرسول صلى الله عليه وسلم، ١/ ٤٦٤ برقم: ٣١٧٥.

تشریح حدیث

شیطان کا جسم میں خون کی طرح دوڑنا:

اس حدیث پاک میں شیطان کے وسوسہ کا اورانسان کے اوپراس کے کمال قدرت وتصرف کا بیان ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ نے شیطان کو انسان کے اوپر تصرف کی کامل قدرت اوراختیار دیا ہے، اس کے وساوس دائمی ہیں، موت تک ہیں، اس سے غافل نہ ہونا چاہئے۔

حدیث کا شان ورود:

حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ اعتکاف میں تھے، ازواج مطہرات میں سے حضرت صفیہؓ ملاقات کے لئے مسجد میں آپ کے پاس حاضر ہوئیں، جب وہ واپس جانے لگیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو رخصت کرنے کے لئے مسجد کے دروازہ تک تشریف لائے، وہاں قریب میں دوصحابی تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کوخطاب کر کے فرمایا کہ یہ میری بیوی صفیہ ہیں، انہوں نے عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کون بدگمانی کرسکتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت یہ بات ارشادفرمائی کہ ٹھیک ہے لیکن شیطان انسان کے اندرخون کی طرح دوڑتا ہے اورکوئی بھی وسوسہ وخیال پیدا کرسکتا ہے۔ (۱)

شیطان کے دوڑنے کا مطلب:

مجری الدم: ''مجری'' کونسا صیغہ ہے؟اس میں کئی احتمال ہیں اوراسی پراس کا مطلب موقوف ہے:

(۱) مصدرمیمی ہے، اس وقت یہاں ادات تشبیہ ''کاف'' محذوف ہوگا اور منصوب بنزع الخافض ہوگا، جریِ شیطان مشبہ اور جریِ دم مشبہ بہ ہوگا اوروجہ شبہ میں کئی احتمال ہیں: ایک یہ کہ وجہ شبہ کمالِ قدرت ہو کہ جیسے خون انسان کے اندر ہرجگہ موجود ہے اورتمام اعضاء میں گردش کرتا ہے، اسی طرح شیطان کوبھی انسان پرمکمل قدرت دی گئی ہے، دوسرے یہ کہ وجہ شبہ عدمِ شعوراورعدم احساس ہویعنی جیسے انسان کواپنے اندرخون کے دوڑنے کا احساس نہیں ہوتا ایسے ہی شیطان کے چلنے کااوراس کے تصرف کا احساس نہیں ہوتا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تشبیہ نہ ہوبلکہ حقیقت پرمبنی ہو۔ (۲)

---

(۱)أخرجه أبوداؤد في كتاب الصوم، باب المعتكف يدخل البيت لحاجته ۱/۳۳٤، وفي كتاب الأدب ،باب في حسن الظن ۲/ ٦٨٢.

(۲)مرقاة المفاتيح ۱/ ۲۲۹.

(۲) مجری ظرف مکان ہے، بمعنی جاری ہونے کی جگہ اور جاری ہونے کی جگہ خون کی رگیں ہیں تو مطلب ہوگا کہ شیطان انسانی رگوں میں واقعۃً وحقیقۃً چلتا ہے۔

(۳) مجری ظرف زمان ہے، بمعنیٰ جاری ہونے کا زمانہ ومدت، یعنی شیطان انسان میں دوڑتا ہے خون کے جاری رہنے کے زمانہ تک، اورخون کے جاری رہنے کا زمانہ پوری زندگی ہے، مطلب یہ ہوا کہ انسان کے اندر شیطانی وساوس کا سلسلہ زندگی بھر جاری رہتا ہے۔

۶۳/۷: وَعَنْ أَبِيْ هريرةؓ قال :قَالَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم "مَامِنْ بَنِيْ آدَمَ مَوْلُوْدٌ إِلَّا يَمَسُّهُ الشَّيْطَانُ حِيْنَ يُوْلَدُ فَيَسْتَهِلُّ صَارِخًا مِنْ مَسِّ الشَّيْطَانِ غَيْرَمَرْيَمَ وَابْنِهَا" (متفق علیہ)(۱)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: بنی آدم کے یہاں جوبھی بچہ پیدا ہوتا ہے شیطان اس کو چھوتا ہے جس کی وجہ سے بچہ چیخ اٹھتا ہے لیکن حضرت مریم اوران کے بیٹے (عیسی علیہ السلام) کوشیطان نے نہیں چھویا۔ (بخاری ومسلم)

وعنه:قالَ قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: "صِيَاحُ الْمَوْلُوْدِ حِيْنَ يَقَعُ نَزْغَةٌ مِنَ الشَّيْطَانِ" (متفق علیہ)(۲)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ بچے کا چیخنااوررونا جس وقت کہ وہ پیدا ہوتا ہے شیطان کے چونکا لگانے کی وجہ سے ہے۔ (بخاری،مسلم)

تشریح حدیث

پیدائش کے وقت شیطان کا بچہ کو چونکا مارنا:

ان دونوں حدیثوں میں شیطان کے ایک خاص وقت کے تصرف کا بیان ہے اوروہ ہے پیدائش کا

(۱)أخرجه البخاري في ثلاثة مواضع:"كتاب بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده ۱/۴۶۴برقم ۳۱۸۰ و"كتاب الانبياء ،باب قوله تعالى واذكر في الكتاب مريم ......الخ" ۱/۴۸۸برقم ۳۳۱۶وكتاب التفسير ، باب منه آيات ،ومسلم كتاب الفضائل، باب فضائل عيسى عليه السلام۲/۲۶۵ .

(۲)أخرجه البخاري، كتاب بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده۱/۴۶۴ .

وقت، بنی آدم کی ولادت کے وقت شیطان بچہ کو چونکا مارتا ہے، اسی وجہ سے بچہ روتا ہے، البتہ حضرت مریم اور حضرت عیسی علیہ السلام اس سے مستثنی رہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت مریم کی والدہ حضرت حنہ علیہا السلام نے حضرت مریم کی پیدائش کے وقت ان کے لئے شیطان مردود سے محفوظ رہنے کی دعا کی تھی، اللہ تعالیٰ شانہ نے اس دعاء کوقبول فرمایا سورۃ آل عمران میں اس کا تذکرہ ہے:

''اِذْقَالَتِ امْرَأَةُ عِمْرَانَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَافِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّراً فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ، فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰی وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَاوَضَعَتْ ، وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْ اُعِیْذُهَا بِکَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ''(۱) یعنی وہ وقت یاد کرو جب عمران کی بیوی نے کہا تھا کہ: یارب! میں نے نذر مانی ہے کہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے میں اسے ہرکام سے آزادکر کے تیرے لئے وقف رکھوں گی، میری اس نذرکوقبول فرما، بے شک تو سننے والا ہے ہر چیز کا علم رکھتا ہے، پھر جب ان سے لڑکی پیدا ہوئی تو وہ حسرت سے کہنے لگیں: یارب یہ تو مجھ سے لڑکی پیدا ہوگئی ہے، حالانکہ اللہ کوخوب علم تھا کہ ان کے یہاں کیا پیدا ہوا ہے، اورلڑکا لڑکی جیسانہیں ہوتا، میں نے اس کا نام مریم رکھدیا ہے اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے حفاظت کے لئے آپ کی پناہ میں دیتی ہوں۔

اس لئے مریم اوران کی ذریت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شیطان نے چونکا نہیں مارا، ان کے علاوہ جوبھی بچہ پیدا ہوتا ہے شیطان اس کو چونکا مارتا ہے۔

اس پر سوال ہوتا ہے کہ حضرت مریم مسِ شیطانی سے کیسے محفوظ ہوئیں حالانکہ ان کی والدہ نے حسب تصریح قرآن ان کی ولادت کے بعد دعا کی تھی، جیسا کہ آیت مذکور سے معلوم ہوا؟

اس کے دوجواب ہیں: (۱) عیسی علیہ السلام محفوظ رہے ہیں حنہ کی دعا سے اورمریم اللہ کے فضل سے محفوظ رہیں۔

(۲) **فلماو ضعتها** سے قرب وضع مراد ہے یعنی وقت ولادت سے کچھ پہلے انھوں نے دعا کی تھی، اس لئے اس دعا کی برکت سے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہا السلام دونوں محفوظ رہے، ملاعلی قاری نے

(۱) من سورة آل عمران: ۳۵–۳۶.

اس جواب کو ترجیح دی ہے۔(۱)

إلاّیمسہ الشیطان: ایک حدیث میں ''طعن'' اورایک روایت میں ''مس'' کا لفظ ہے ''مس وطعن'' سے کیا مراد ہے؟ اس میں دوقول ہیں: (۱)اس سے مراد غیرمحسوس طریقہ سے وسوسہ ڈالنا ہے (۲) بعض نے طعن بالید مراد لیا ہے یعنی حقیقۃ ہاتھ سے چونکہ مارتا ہے وہوالراجح۔

شیطان کا چونکا اور حضرات انبیاء علیہم السلام

یہاں شراح کے درمیان یہ بحث آئی ہے کہ بوقت ولادت مس شیطانی سے محفوظ ہونا حضرت مریم اورعیسی علیہما السلام کی خصوصیت ہے یاحضور صلی اللہ علیہ وسلم اوردیگرانبیاء علیہم السلام بھی اس چونکے سے محفوظ رہے؟

(۱) اکثر علماء فرماتے ہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام شیطان کے اس تصرف سے محفوظ ہوتے ہیں بالخصوص آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم اِس مسّ سے محفوظ رہے، شیخ عبدالحق دہلویؒ نے فرمایاہے کہ متکلم اپنے کلام سے عموماً مستثنی رہتاہے لہذا آنخضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس سے محفوظ رہے۔

اشکال ہوتاہے کہ پھرحضرت مریم وعیسی علیہم السلام کی روایت میں تخصیص کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ حضرت حنہ نے جو دعا کی تھی وہ قبول ہوئی، ماعدا کی نفی کرنا مقصود نہیں ہے۔

(۲)اوربعض علماء کی رائے ہے کہ یہ استثناء صرف مریم اورابن مریم کے لئے ہے، جیسا کہ حدیث کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتاہے پس شیطان حضرات انبیاء علیہم السلام کو ایذا تو پہنچاسکتاہے البتہ وسوسہ نہیں ڈال سکتا۔

پھرسوال ہوتاہے کہ اگریہی بات ہے تو اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہوناثابت ہوگا؟

جواب: یہ فضیلت جزئی ہے اورآنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کلی فضیلت حاصل ہے، افضلیت کا فیصلہ مجموعۂ صفات سے ہوتاہے، ایسا ہوسکتاہے کہ مفضول میں بعض صفات افضل کے مقابلہ میں زیادہ پائی جائیں، جیسے ملائکہ میں عدم جوع وعدم عطش جیسی ملکوتی صفات پائی جاتی ہیں اورانبیاء میں یہ صفات نہیں ہیں،

(۱) المرقاۃ ۱/ ۲۳۱.

مگر مجموعۂ صفات کی رو سے انبیاء علیہم السلام ملائکہ سے افضل ہیں۔

٦٥/٩: وعن جابرؓ قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم اِنَّ إِبْلِيْسَ يَضَعُ عَرْشَهُ عَلَى الْمَاءِ ثُمَّ يَبْعَثُ سَرَايَاهُ يَفْتِنُوْنَ النَّاسَ فَأَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَنْزِلَةً أَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً يَجِيْءُ أَحَدُهُمْ فَيَقُوْلُ: فَعَلْتُ كَذَا وَكَذَا، فيقول: مَاصَنَعْتَ شَيْئاً، قَالَ: ثُمَّ يَجِيْءُ أَحَدُهُمْ فَيَقُوْلُ مَاتَرَكْتُهُ حَتّٰى فَرَّقْتُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ امْرَأَتِهٖ قَالَ: فَيُدْنِيْهِ مِنْهُ، وَيَقُوْلُ، نِعْمَ أَنْتَ قَالَ الْأَعْمَشُ: أُرَاهُ قَالَ "فَيَلْتَزِمُهُ" (رواه مسلم) (۱)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابلیس اپنا تخت پانی (سمندر) پر رکھتا ہے پھر وہاں سے اپنی فوجوں کو روانہ کرتا ہے تا کہ وہ لوگوں کو فتنہ اور گمراہی میں مبتلا کریں، ابلیس کی فوجوں میں اس کا سب سے مقرب وہ ہوتا ہے جو سب سے بڑا فتنہ انداز ہو، ان میں سے ایک واپس آ کر کہتا ہے کہ میں نے فلاں شخص کو فلاں گناہ میں مبتلا کیا، ابلیس اس کے جواب میں کہتا ہے: تو نے کچھ نہیں کیا، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ: پھر ان میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے کہ: میں نے (ایک بندہ کو گمراہ کرنا شروع کیا اور) اس وقت تک اس کو نہیں چھوڑا جب تک کہ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی نہ ڈلوادی، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: ابلیس یہ سن کر اس کو اپنے قریب کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ: تو نے بڑا کام کیا (حدیث کے ایک راوی) اعمشؒ کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ انہوں (میرے استاذ ابوسفیان طلحہ بن نافع) نے حضرت جابرؓ سے فیلتزمہ (پس ابلیس اس کو گلے لگا لیتا ہے) کے الفاظ نقل کئے تھے۔ (مسلم)

تشریح حدیث

شیطان کا اپنے کارندوں سے کارگزاری لینا اور طلاق وتفریق سے خوش ہونا:

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ انسانوں کو گناہوں پر آمادہ کرنا اور ان کو گمراہی میں مبتلا کرنا شیطان

(۱) أخرجه مسلم، كتاب صفات المنافقين وأحكامهم، باب تحريش الشيطان الخ ۲/ ۳۷٦.

اوراس کی ذریت کا باقاعدہ مشغلہ اور مشن ہے، چنانچہ صبح کے وقت ابلیس اپنا عرش پانی پر بچھاتا ہے اوراپنے کارندوں کو انسانوں کو بہکانے کے لئے بھیجتا ہے، شام کے وقت پھر تخت پانی پر بچھاتا ہے اوران کی کارگذاری سنتا ہے، چھوٹے شیاطین اپنے اپنے کئے ہوئے کام بتاتے ہیں، ان میں سے ایک کہتا ہے کہ میں نے فلاں کونماز سے روک دیا شیطان کہتا ہے: ماصنعتَ شیئا کہ تونے کوئی بڑا کام نہیں کیا، سب سے اسی طرح کہتا رہتا ہے، اخیر میں ایک شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے فلاں میاں بیوی میں جھگڑا کرادیا حتی کہ ان میں تفریق کرادی اور شوہر نے بیوی کو طلاق دے دی، شیطان اس چیلے کو قریب کرتا ہے اوراس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ واقعی تونے بڑا کام کیا ہے، راوی کہتے کہ میرا ظن غالب یہ ہے کہ حضرت جابرؓ نے یہ بھی کہا تھا کہ شیطان اس سے معانقہ کرتا ہے، معلوم ہوا کہ انسانوں کو بہکانے کا شیاطین کا باقاعدہ مشغلہ ہے۔

طلاق سے بے انتہاء خوش ہونے کی وجہ:

سوال ہوتا ہے کہ شیطان طلاق پر اتنا خوش کیوں ہوتا ہے؟ حالانکہ طلاق فی نفسہ مباح ہے؟

جواب: طلاق اگرچہ فی نفسہ مباح ہے اور ظاہر میں یہ معمولی برائی ہے لیکن عنداللہ مباحات میں سب سے زیادہ مبغوض ہے، کیونکہ طلاق اپنے اندر بڑے مفاسد لئے ہوئے ہے، تفریق کے بعد بیوی اپنے میکہ پہنچ جاتی ہے، اپنے گھر والوں کے سامنے شوہر کی برائیاں بیان کرتی ہے، جوغیبت ہے، نیز بہت سی ایسی ناروا چیزیں بھی شوہر کے متعلق کہتی ہے جوواقعۃً اس میں نہیں ہوتیں، یہ بہتان ہے، اس طرح عورت اوراس کے گھروالے غیبت اور بہتان دونوں قسم کے گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں، یہی حال شوہر اوراس کے خاندان والوں کا ہوتا ہے، پھر دونوں خاندان کے تعلقات منقطع ہوجاتے ہیں ،سلام کلام بند ہوجاتا ہے، جس پرروایات میں سخت وعیدیں آئی ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ جن دومسلمان بھائیوں کے درمیان تین دن سے زیادہ سلام کلام بند ہو یہ موجبِ اثم ہے[1] پیروجمعرات کواللہ کی بارگاہ میں بندوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں سب کی مغفرت کردی جاتی ہے سوائے ان کے جن کا باہم سلام کلام بند ہو، ان کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے ''دَعَوْهُمَا حتی یصطلحا'' ان کو چھوڑے رکھو جب تک یہ آپس میں صلح نہ کرلیں[2] اگراسی حال میں

(۱) رواہ ابوداؤد، بحوالہ مشکوۃ ص ۴۲۸ .

(۲) رواہ مسلم ،بحوالہ مشکوۃ ص ۴۲۹ .

دونوں میں سے کسی کا انتقال ہوجائے تو وہ جہنم میں جائے گا [1] وغیرہ۔

پھر مرد وعورت دونوں کے ساتھ جذبات لگے ہوئے ہیں، مرد کہیں اپنا منہ کالا کرتا ہے اور عورت کہیں اور، اس کے نتیجہ میں بہت سی مرتبہ ''ولدالزنا'' کا وجود ہوتا ہے، جس سے معاشرہ میں بہت سی خرابیاں پھیلتی ہیں، نیز اولاد کے حقوق ضائع ہوتے ہیں، وہ اچھی تربیت سے محروم ہوجاتے ہیں اور غلط راستہ پر چل پڑتے ہیں، غرضیکہ شیطان نے تفریق کراکر گویا ایک خاردار درخت لگادیا جس کی ہر شاخ پر کانٹے ہی کانٹے ہیں، اس لئے ابلیس طلاق وتفریق پر سب سے زیادہ خوش ہوتا ہے۔

اشکال: بعض روایات میں ہے کہ شیطان زنا پر زیادہ خوش ہوتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں روایتوں کا محمل الگ الگ ہے، ابلیس کے سامنے جس دن طلاق وتفریق کا تذکرہ ہوتا ہے تو اس پر زیادہ خوش ہوتا ہے اور جس روز زنا کا بھی تذکرہ ہو اس دن زنا پر زیادہ خوش ہوتا ہے۔

عن جابر :جابر نام کے دوصحابی ہیں: جابر بن عبداللہ اور جابر بن سمرہ ''جابر'' مطلق بولا جائے تو جابر بن عبداللہ مراد ہوتے ہیں،اس روایت کے راوی وہی ہیں۔

ان ابلیس یضع عرشه علی الماء : علماء نے فرمایا ہے کہ یہ حقیقت پر محمول ہے، حضرت شاہ ولی اللہ نے فرمایا ہے کہ بعض اہل اللہ نے اس کا مشاہدہ بھی کیا ہے، مشکوۃ جلد ثانی میں ابن صیاد کا قصہ آئے گا، [2] اس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سوال کے جواب میں کہ تجھے کیا نظر آتا ہے؟ کہا تھا کہ میں پانی پر تخت دیکھتا ہوں آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ تجھے شیطان کا تخت سمندر پر نظر آتا ہے۔

ثم یبعث سرایاہ: ''سرایا'' جمع سریة، وہ لشکر جو زیادہ سے زیادہ چار سو افراد پر مشتمل ہو۔ (۳)

حتی فرقت بینه وبین امرأته: یہاں تفریق سے مراد حقیقۃً تفریق وعلیحدگی بھی ہوسکتی ہے کہ ان کے مابین طلاق واقع کرادی اور بغیر طلاق وعلیحدگی کے محض دوری اور بعد بھی مراد ہوسکتا ہے کہ دونوں میں ناراضگی پیدا کرادی، یہ ناراضگی بھی بہت سے فتنوں اور فسادات کی موجب ہوتی ہے۔ (۴)

---

(۱) رواہ احمد وابوداؤد بحوالہ مشکوۃ ص۴۲۸.

(۲) مشکاۃ المصابیح، کتاب الفتن باب قصة ابن صیاد ۲ / ۴۷۸۔

(۳) فتح الإله شرح المشکاۃ ۱ / ۴۱۰.

(۴) المرقاۃ ۱ / ۲۳۲.

نِعْمَ أنت : اس میں دو احتمال ہیں:(۱)فعل مدح ہو اصل عبارت ہوگی: **نعم الولد أنت** (تو میرا کتنا اچھا بچہ ہے) اس صورت میں "انت" مخصوص بالمدح ہوگا (۲) یہ نعم حرف ایجاب ہے اور انت مبتداء ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، پوری عبارت اس طرح ہے: **أي أنت صنعت شيئا عظيما** کہ ہاں تو نے ایک بڑا کام کیا ہے۔ (۱)

قال الأعمش أراه: "اراه" کی ضمیر مفعول کا مرجع ابوسفیان طلحہ بن نافع المکی ہیں، یہی حضرت جابر سے نقل کرنے والے ہیں اور اعمش کے استاذ ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اعمش فرماتے ہیں کہ ابوسفیان نے حضرت جابر سے "فيلتزمه" بھی نقل کیا تھا، اس کے مرجع کے بارے میں اور بھی احتمالات ہیں جن کو عربی شرحوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ (۲)

یہ راوی کی دیانت داری کی بات ہے کہ جن الفاظ کا یقین نہیں تھا ان کو اراہ (صیغۂ ظن سے) بیان فرمایا۔

> ۶۶/ ۱۰: **وعنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم** "إِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ أَيِسَ مِنْ أَنْ يَعْبُدَهُ الْمُصَلُّوْنَ فِيْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ، وَلٰكِنْ فِي التَّحْرِيْشِ بَيْنَهُمْ" (رواہ مسلم)(۳)
>
> **ترجمه** :حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شیطان اس بات سے مایوس ہوگیا ہے کہ جزیرۂ عرب میں نمازی (مسلمان) اس کی پرستش کریں لیکن ان کے درمیان لڑائی کرانے میں کوشش کرتا رہے گا۔ (مسلم)

تشریح حدیث

شیطان کی جزیرۂ عرب میں بت پرستی سے مایوسی اور باہم لڑانے کی کوشش:

اس حدیث میں بھی وساوس شیطانی کا بیان ہے، کہ شیطان لوگوں کو آپس میں لڑانے اور ان میں جھگڑا کرانے کے لئے ایک کو دوسرے کے خلاف اکساتا اور وسوسے ڈالتا ہے، اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب وعجم میں بت پرستی غالب تھی، اللہ تعالیٰ نے آنحضرت

(۱) المرقاة ۱/ ۲۳۳.

(۲) المرقاة ۱/ ۲۳۲.

(۳) أخرجه مسلم "كتاب صفات المنافقين واحكامهم، باب تحريش الشيطان" ۲/ ۳۷۶.

صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام ہدایت دے کر مبعوث فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو کفر وشرک سے نکالا، چنانچہ آپ کی محنت کی برکت سے لوگوں نے بت پرستی کو چھوڑ دیا اور تقریباً پورا جزیرۃ العرب موحد بن گیا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پیش گوئی فرمائی کہ شیطان اس بات سے تو مایوس ہوگیا ہے، کہ مسلمان جزیرۃ العرب میں بت پرستی میں مبتلا ہوں، جزیرۃ العرب میں لوگ توحید واسلام پر قائم رہیں گے، البتہ شیطان ان کو باہم لڑاتا رہے گا۔

"ان یعبدہ" شیطان کی عبادت سے مراد بت پرستی ہے، شیطان اس کا حکم دینے والا اور وسوسہ ڈالنے والا ہے، اس لئے شیطان کی طرف نسبت کی گئی ہے۔

"**المصلون**" اس سے **المسلمون** مراد ہے، یہاں صلاۃ بول کر ایمان مرادلیا گیا ہے کیونکہ نماز ایمان کا اعلیٰ رکن ہے۔

"**التحریش**"، بمعنی بعض کو بعض کے خلاف بھڑکانا، لڑائی کرانا، یعنی شیطان مسلمانوں میں باہم رقابتیں ڈال کر ان کو لڑاتا رہے گا، مسلمانوں میں باہم اختلافات اور تنازعات جو پیش آتے رہتے ہیں وہ اسی شیطانی تحریش کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

ایک سوال وجواب:

سوال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب میں ارتداد پھیل گیا تھا اور بہت سے لوگ کفر میں مبتلا ہوگئے تھے تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی کس طرح درست ثابت ہوئی کہ آئندہ جزیرۂ عرب میں بت پرستی نہیں ہوگی؟

جواب یہ ہے کہ کچھ لوگ مرتد تو ہوئے تھے، لیکن اس کی بناء زکوۃ کا انکار کرنا تھا بت پرستی میں وہ بھی مبتلا نہیں ہوئے تھے [1] مگر یہ جواب زیادہ معقول نہیں ہے اس لئے کہ شیطان کا مقصد کفر میں مبتلا کرنا ہے شکل اس کی جو بھی ہو، بت پرستی ضروری نہیں، لہٰذا صحیح جواب یہ ہے کہ حدیث کا مقصد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل جس طرح کفر کا غلبہ اور شیوع تھا اب آئندہ اس طرح کفر وشرک کا شیوع وغلبہ نہیں ہوگا، پس اگر کچھ لوگ مرتد ہوجائیں تو یہ حدیث کے منافی نہیں ہوگا۔

(۱) المرقاۃ ۱/ ۲۳۳.

جزیرۃ کا مفہوم اورجزیرۃ العرب کا مصداق:

جزیرۃ العرب: یہ ''جزر'' سے ہے بمعنی ہٹنا، مفعول کے معنی میں ہے، ''جزیرہ'' کے معنی ہیں زمین کا وہ خشک حصہ جس کے چاروں طرف پانی ہو، عرب کے تین طرف پانی ہے نہ کہ چارطرف، اس لئے عرب کو جزیرہ نما (نما بمعنی مثل ومشابہ) کہا جاتا ہے، عرب کے شمال میں ملک شام واقع ہے جو پانی سے خالی ہے البتہ تین جانب سے پانی کا احاطہ ہے، وہ اس طرح کہ عرب کی مشرقی جانب میں خلیج فارس اور بحرعمان واقع ہے، مغربی جانب میں بحیرۂ قلزم اور نہرسویز ہے، جنوب میں بحر ہند واقع ہے، شمال میں ملک شام ہے ادھر سمندر نہیں ہے۔ (۱)

جزیرۃ العرب کا مصداق کیا ہے؟ اس میں متعدد اقوال ہیں:

(۱) امام مالک نے فرمایا کہ اس سے مراد مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اوریمن ہے۔ (۲)

(۲) بعض نے کہا کہ اس کی لمبائی عدن سے عراق تک اور چوڑائی جدہ سے اطراف شام تک ہے۔ (۳)

(۳) بعض نے کہا کہ اس کا مصداق نجد، تہامہ، حجاز اوریمن اورعروض ہے۔ (۴)

(۴) بعض نے کہا ہے کہ دس لاکھ سے تیرہ لاکھ مربع میل تک جزیرۃ العرب کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

جزیرۃ العرب کی وجہ تخصیص:

مذکورہ حکم میں جزیرۃ العرب کی تخصیص اس لئے ہے کہ وہ مہبط وحی اور مرکز دین وشریعت ہے، پس سارے عالم میں کفروشرک کا غلبہ ہوسکتا ہے مگر جزیرۂ عرب دین وشرع کا مرکز ہونے کی وجہ کفروشرک کے غلبہ سے محفوظ ومامون رہے گا۔ (۵)

---

(۱) شرح المشكاة للطيبي ١/ ٢٢٥.

(٢) وشرح المشكاة للطيبي ١/ ٢٢٥.

(٣) شرح البخاري لابن بطال ٥/ ٣٤٦.

(٤) عمدة القاري ٣/ ٥١٥.

(٥) شرح الطيبي ١/ ٢٢٥.

الفصل الثاني

٦٧ / ١١: عن ابن عباسؓ أن النبيَ صلى الله عليه وسلم جَاءَهُ رَجُلٌ، فقال: إنِّيْ أُحَدِّثُ نَفْسِيْ بِالشَّيِّ لأنْ أَكُوْنَ حُمَمَةً أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَتَكَلَّمَ بِهٖ قَالَ: ''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِيْ رَدَّ أَمْرَهُ إِلَى الْوَسْوَسَةِ'' (رواہ ابوداود) (١)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا (یارسول اللہ!) میں اپنے اندر ایسا برا خیال پاتا ہوں کہ مجھے جل کر کوئلہ بن جانا زیادہ پسند ہے مگر ان چیزوں کو زبان پر لانا گوارا نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے اس خیال کو وسوسہ کی حد تک رکھا ہے۔ (ابوداود)

تشریح حدیث

انی احدث نفسی بالشئ: ایک شخص نے آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے ایسے وسوسے آتے ہیں کہ مجھے کوئلہ بن جانا پسند ہے لیکن میں ان چیزوں کو زبان پر لانا گوارا نہیں کرتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ صورت وسوسہ کی ہے اور وسوسہ شرعاً معاف ہے، اللہ کا فضل اور احسان ہے کہ اس نے اس معاملہ کو صرف وسوسہ کی حد تک رکھا۔

رد أمره: اس ضمیر کے مرجع میں دو احتمال ہیں: (۱) اس کا مرجع آنے والا شخص ہو، معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ کا فضل اور احسان ہے کہ اس شخص کے اس معاملہ کو وسوسہ کی حد تک محدود رکھا، عمل و تکلم نہ کرایا ورنہ وہ شخص کفر میں مبتلا ہو جاتا۔ (۲)

(۲) ضمیر کا مرجع شیطان ہو اور امر ''مکر'' کے معنی میں ہو، چنانچہ بعض روایات میں **کیده** کا لفظ آیا ہے، (۳) اس صورت میں معنی ہونگے کہ تمام تعریفیں اللہ کیلئے ہیں کہ جس نے شیطان کے مکر کو وسوسہ کی طرف پھیر دیا، حاصل وہی ہوا کہ مبتلاء کفر ہونے سے حفاظت فرمائی۔

---

(١) أخرجه أبو داود، كتاب الأدب، باب في رد الوسوسة ٢ / ٦٩٧.

(٢) شرح الطيبي ١ / ٢٢٦.

(٣) (المصدر السابق)

شیطان کی بہکانے کی کوششیں اور حضرت معاویہ کا واقعہ:

علماء نے فرمایا کہ شیطان انسان کا دشمن ہے، وہ اولاً کفر کا وسوسہ ڈالتا ہے، بندہ اس میں اطاعت نہ کرے تو کبائر کا وسوسہ ڈالتا ہے، پھر صغائر کا وسوسہ ڈالتا ہے، پھر عمل مفضول کا وسوسہ ڈالتا ہے، افضل عمل سے روکنے کی بہرحال کوشش کرتا ہے، مثلاً دل میں یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ نفل نماز کھڑے ہوکر پڑھنا کوئی ضروری نہیں، بیٹھ کر پڑھ لینا کافی ہے چنانچہ آدمی بیٹھ کر پڑھ لیتا ہے اور کھڑے ہوکر پڑھنا جو افضل ہے اس کو چھوڑ دیتا ہے۔

حضرت معاویہؓ کی ایک مرتبہ تہجد فوت ہوگئی، چونکہ اس سے قبل کبھی تہجد فوت نہیں ہوئی تھی اس لئے بہت رنج وافسوس ہوا، حتی کہ سارا دن روتے روتے گذار دیا، جب اگلی رات سوئے تو تہجد کے وقت ایک شخص نے آپ کو بیدار کیا کہ اٹھ کر تہجد پڑھ، حضرت معاویہؓ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے بیدار کرنے والے سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں شیطان ہوں، حضرت معاویہؓ نے پوچھا کہ تمہارا کام تو لوگوں کو نماز کے وقت سلانا ہے نہ کہ جگانا؟ شیطان نے کہا: آپ کو اس بحث میں پڑنے کی حاجت نہیں، آپ تہجد پڑھیے، حضرت معاویہؓ نے اصرار کیا؟ ان کے اصرار پر شیطان نے کہا کہ گذشتہ رات میں نے آپ پر غفلت طاری کرکے آپ سے تہجد فوت کرادی، لیکن آپ اس کے افسوس میں دن بھر روتے رہے، جس سے آپ کے اس قدر درجات بلند ہوئے کہ تہجد پڑھنے پر بھی اتنے بلند نہ ہوتے، پس چال الٹی پڑ گئی، لہذا آج میں آپ کو بیدار کرنے کے لئے آیا ہوں تاکہ آپ کے درجات زیادہ بلند نہ ہوں،[1] اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ شیطان آخری درجہ میں افضل عمل سے ہٹا کر مفضول میں لگا دیتا ہے۔

٦٨ / ١٢: وَعَنِ ابنِ مَسْعُودٍؓ قال: قال رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم إِنَّ لِلشَّيْطَانِ لَمَّةً بِابْنِ آدَمَ، وَلِلْمَلَكِ لَمَّةً، فَأَمَّا لَمَّةُ الشَّيْطَانِ فَإِيْعَادٌ بِالشَّرِّ، وَتَكْذِيْبٌ بِالْحَقِّ، وَأَمَّا لَمَّةُ الْمَلَكِ فَإِيْعَادٌ بِالْخَيْرِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْحَقِّ، فَمَنْ وَجَدَ ذٰلِكَ؛ فَلْيَعْلَمْ أَنَّهُ مِنَ اللّٰهِ؛ فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ وَمَنْ وَجَدَ الْأُخْرَىٰ؛ فَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ثُمَّ قَرَأَ: "اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ" (رواه الترمذي)[2] وقال: هذا حديث غريب.

(١) اصلاحی خطبات ٦ / ٤٢.

(٢) أخرجه الترمذي، كتاب تفسير القرآن، باب من سورة البقرة ٢ / ١٢٨.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بیشک ہرانسان پرایک تصرف تو شیطان کا ہوا کرتا ہے اورایک تصرف فرشتہ کا، شیطان کا تصرف یہ ہے کہ وہ برائی پر ابھارتا ہے اورحق کو جھٹلاتا ہے اورفرشتہ کا تصرف یہ ہے کہ وہ نیکی پر ابھارتا ہے اورحق کی تصدیق کرتا ہے، لہٰذا جوشخص یہ کیفیت (نیکی پر ابھارنے کی) پائے اس کو جان لینا چاہئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اورجوشخص دوسری کیفیت (یعنی شر پر ابھارنا اور شیطان کی وسوسہ اندازی) اپنے اندر پائے تو اس کو چاہئے کہ شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کرے، پھرحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت شریفہ پڑھی (جس کا ترجمہ یہ ہے) شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اورگناہ کا حکم کرتا ہے۔ (ترمذی، اورامام ترمذی نے فرمایا یہ حدیث غریب ہے)

تشریح حدیث

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ انسان کے اندر دو چیزیں تصرف کرنے والی ہیں، ایک فرشتہ اورایک شیطان ۔جس کی کچھ تفصیل اس سے قبل حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں بھی آچکی ہے۔

لمہ کے معنی اوراس کی اقسام وجہات:

''لمہ'' بمعنی الالقاء فی القلب، مراداس سے تصرف ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ لمہ چارقسم کا ہوتا ہے:

(۱) لمۂ حقانی، کہ اللہ براہ راست بندہ کے قلب میں کوئی بات القاءفرمادے (۲) لمۂ نفسانی، برے تصرف کا باعث نفس ہو (۳) لمۂ ملکی، القاء خیرفی القلب فرشتہ کے واسطہ سے ہو (۴) لمۂ شیطانی، براتصرف شیطان کی طرف سے ہو، ان چاروں لموں کا اثرقلب پرہوتا ہے اول کا اثرقلب کے اوپر والے حصہ پرہوتا ہے اورثانی کا اثرقلب کے نیچے والے حصہ پر،اورثالث کا اثر داہنی جانب، اوررابع کا اثر بائیں جانب میں ہوتا ہے، اسی لئے وسوسہ آنے پربائیں جانب تھوکنے کا حکم ہے۔(۱)

فاما لمة الشيطان: یعنی شیطان کا تصرف یہ ہے کہ وہ انسان کوشراور برائی پراکساتا ہے،حق کی بات کی تکذیب یااس کی عدم تعمیل پرابھارتا ہے اورفرشتہ کا تصرف یہ ہوتا ہے کہ وہ خیراور بھلائی کے امور پر

(۱) اللمعات ۱/۳۳۲ — ۳۳٤ وقد ذكرهنا أقساماً أخر.

ابھارتا ہے اورحق کی تصدیق وتعمیل کے جذبات پروان چڑھاتا ہے۔

وعدہ، وعید اور ایعاد:

فـإيعاد باشر :اس مادہ کے تین لفظ ہیں وعدہ، وعید اور ایعاد، وعدہ کا اطلاق امورِ خیر میں ہوتا ہے اور وعید کا امورِ شر میں، اور ایعاد لفظ مشترک ہے، خیر وشر دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، چنانچہ یہاں خیر وشر دونوں کے لئے بولا گیا ہے،شر سے مراد کفر وشرک اور کبائر وغیرہ ہیں۔ (۱)

فـمـن وجـد ذلک الخ : جب انسان کے قلب میں خیر کے جذبات پیدا ہوں تو ان کو منجانب اللہ سمجھ کر اللہ کا شکر بجالانا چاہئے اوران کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کرنی چاہئے اور جب دل میں برے خیالات پیدا ہوں تو ایسے وقت تعوذ پڑھنا چاہئے ،حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر یہ آیت تلاوت فرمائی: **اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الفَقْرَوَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشاءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلاً.** (۲) کہ شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور تمھیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے اوراللہ تم سے مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے ،اس آیت کریمہ سے حدیث کے مضمون کی تائید ہورہی ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور استشہاد اس کو پڑھا۔

حدیث کی نوعیت اوراس کا درجہ:

وقال: هذا حديث غريب: مصنف فرماتے ہیں کہ امام ترمذی نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا ہے کہ :یہ حدیث غریب ہے، ’’غریب‘‘ وہ حدیث کہلاتی ہے کہ جو صرف ایک سند وطریق سے مروی ہو، اس کی کوئی دوسری سند موجود نہ ہو، یا اس کے متن میں ایسا لفظ ہو جس کو دوسرے رواۃ نے نہ بیان کیا ہو، لیکن غریب کا مطلب ضعیف نہیں ہوتا، حدیث غریب ہونے کے باوجود صحیح ہوسکتی ہے، چنانچہ امام ترمذی نے اس کو غریب ہونے کے باوجود صحیح قراردیا ہے، اورفرمایا ہے: ہذا حدیث حسن صحیح غریب، اور یہ غریب اس لئے ہے کہ اس میں ایک راوی ابوالاحوص ہیں، تنہا وہی اس کو مرفوع حدیث کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ (۳)

---

(۱) اللمعات ۱/ ۳۳۰.

(۲) من سورة البقرة:۲۶۸.

(۳) امام ترمذیؒ نے حدیث شریف نقل کرنے کے بعد فرمایا: ’’هـذاحـديـث حسـن صـحـيـح غـريـب وهو حديث أبي الأحوص لانعرفه مرفوعا إلا من حديث أبي الأحوص‘‘(ترمذی ۲/ ۱۲۸)

٦٩ / ١٣: وعن أبي هُريرةَؓ أَنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم قال: لايَزَالُ النَّـاسُ يَتَسَـاءَ لُـوْنَ حَتّٰى يُقَالَ هٰذَا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ؟ فَإِذَا قَالُوْا ذٰلِكَ فَقُوْلُوْا: اَللّٰهُ أَحَدٌ، اَللّٰهُ الصَّمَدُ، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ، وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ كُفُواً اَحَدٌ، ثُمَّ لِيَتْفُلْ عَنْ يَسَـارِهٖ ثَـلاثًا. وَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ. (رواه ابوداود)[1] وسنذكر حديث عمرو بن الأحوص في باب خطبة يوم النحر إن شاء الله تعالى.

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: لوگ باہم سوال کرتے رہیں گے، حتی کہ کہاجائے گا (یعنی شیطانی وسوسوں کی صورت میں ان کے اندراس طرح کے خیالات پیداہوتے رہیں گے) کہ جب ہر چیز کو اللہ نے پیدا کیا تو اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ جب یہ سوال پیداہوتو کہو اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا ہے اور کوئی اس کا ہمسراور جوڑنہیں، پھر اپنی بائیں طرف تین مرتبہ تھتکاردو اورشیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگو (ابوداود) (صاحب مشکوۃ فرماتے ہیں) کہ عمرو بن احوص کی روایت (جس کو صاحب مصابیح نے یہاں نقل کیا تھا) ہم اس کو خطبۂ یوم النحر کے باب میں نقل کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔ (کیونکہ وہ روایت اسی باب سے متعلق ہے)

تشریح حدیث

دفع وساوس کا ایک اورعلاج:

ان احادیث کا حاصل پہلے گذر چکاہے کہ شیطان اللہ کی ذات وصفات کے بارے میں وسوسہ ڈالتارہتاہے یہاں اس کا علاج بتایا گیاہے کہ ان وسوسوں کے وقت سورۂ اخلاص **قل هو الله أحد** پڑھو، اورتعوذ پڑھ کر بائیں جانب تھوک دو۔

لایزال الناس یتساء لون: اس سوال کی دوصورتیں ہیں ایک یہ کہ بعض اشخاص بعض سے سوال کریں گے تحقیق کے لئے، یالوگ اپنے دلوں سے سوال کریں گے یعنی ان کے دل ودماغ میں اس قسم کا سوال باربارآئے گا، دونوں صورتیں اس کا مصداق ہیں، اس صورت حال کاعلاج بتایا گیا کہ اس وقت سورۂ اخلاص

(١) أخرجه ابوداود في كتاب السنة، باب في الجهمية ٢ / ٦٤٨.

پڑھو، سورۂ اخلاص میں اللہ کی تحمید تنزیہ اور تقدیس مذکور ہے کہ وہ اس بات سے منزہ اور پاک ہے کہ اس کو جنا جائے، اور تعوذ پڑھو کہ اس میں شیطان کے مقابلہ کے لئے حق تعالیٰ شانہ سے استمداد ہے۔

وسنذکر حدیث عمرو بن الاحوص : اس موقعہ پر مصابیح السنہ میں ایک اور حدیث تھی، لیکن وہ کتاب الایمان کے زیادہ مناسب نہیں تھی بلکہ خطبہ یوم النحر کے زیادہ مناسب تھی، اس لئے علامہ خطیب تبریزیؒ نے اس کو وہاں ذکر کیا ہے، شروع کتاب میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ صاحب مشکوۃ نے مصابیح السنۃ میں اس قسم کے تغیرات کئے ہیں۔

الفصل الثالث

۷۰/۱۴: عن أنسؓ قَالَ: قال رسولُ اللّٰہِ صلی الله علیه وسلم: لَنْ يَبْرَحَ النَّاسُ يَتَسَاءَلُوْنَ، حَتّٰى يَقُوْلُوْا: هٰذَا اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ شَيْئٍ ،فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ ؟ (رواہ البخاری) ولمسلم قال: قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ : اِنَّ أُمَّتَكَ لَايَزَالُوْنَ يَقُوْلُوْنَ: مَاكَذَا ؟ مَاكَذَا؟ حَتّٰى يَقُوْلُوْنَ: هٰذَا اللّٰهُ خَلَقَ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ؟(۱)

ترجمہ : حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: لوگ باہم پوچھ تاچھ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ یہ کہنے لگیں گے کہ اللہ نے ہر چیز کو پیدا کیا تو اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ (بخاری) اور مسلم کی روایت میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ آپ کی امت کے لوگ پہلے یوں کہیں گے: یہ کیا ہے؟ یہ کیسے ہوا؟ (یعنی مخلوقات کے بارے میں تحقیق وتجسس کریں گے) اور پھر آخر میں یوں کہیں گے کہ تمام چیزوں کو اللہ نے پیدا کیا تو پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا؟

تشریح حدیث

اس حدیث کا بھی مضمون گذر چکا ہے، مسلم شریف میں یہ حدیث حدیث قدسی کے طور پر مروی ہے، ''ما کذا'' سے مراد یہ ہے کہ لوگ خلقت کے بارے میں سوال کرتے رہیں گے، اور سوال کا یہ سلسلہ دراز ہوگا

(۱) رواہ البخاری فی کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة، باب مایکرہ من کثرۃ السؤال ۸۳/۲(۷۲۹۶) ومسلم فی کتاب الإیمان، باب بیان الوسوسة فی الإیمان ۷۹/۱(۲۱۷)

حتی کہ حق جل وعلا تک نوبت پہنچے گی۔

۷۱ / ۱۵: وعن عثمانَ بن أبي العاصؓ قال: قُلْتُ: یارسول الله! إنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ حَالَ بَيْنِي وَبَيْنَ صَلوتِي وَبَيْنَ قِرَاءَتِي يُلَبِّسُهَا عَلَيَّ، فَقَالَ: رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: ذَاكَ شَيْطَانٌ يُقَالُ لَهُ خِنْزَبٌ، فَإِذَا أَحْسَسْتَهُ فَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْهُ، وَاتْفُلْ عَلٰى يَسَارِكَ ثَلاثًا، فَفَعَلْتُ ذٰلِكَ فَأَذْهَبَهُ اللّٰهُ عَنِّي. (رواہ مسلم)(۱)

ترجمہ: حضرت عثمان بن ابی العاصؓ سے مروی ہے: انھوں نے فرمایا: میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے اور میری نماز وقراءت کے درمیان شیطان حائل ہوجاتا ہے اور نماز کو میرے اوپر مشتبہ کرتا رہتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ ایک شیطان ہے جس کو "خنزب" کہا جاتا ہے پس جب تم اس کو محسوس کروتو تم اس شیطان مردود سے خدا کی پناہ مانگو اور بائیں طرف تین مرتبہ تھتکاردو، حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا تو اللہ تعالیٰ شانہ نے اس کو مجھ سے دور کردیا۔ (مسلم)

تشریح حدیث

احوال عثمانؓ:

عثمان بن ابی العاص قبیلہ ثقیف کے ہیں، ابوعبداللہ کنیت ہے، یہ قبیلہ سب سے اخیر میں مسلمان ہوا، یہ لوگ ۱۰ھ میں مسلمان ہوئے، اس وقت عثمان بن ابی العاص کی عمر ۱۹ سال کی تھی، لیکن سمجھدار بہت تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو طائف کا عامل مقرر کردیا تھا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دور میں وہاں کے عامل رہے، پھر حضرت عمرؓ نے ان کو عمان اور بحرین کا گورنر بنادیا، اس کے بعد بصرہ میں مقیم ہوگئے اور وہیں حضرت معاویہؓ کے دور میں ۵۰ھ یا ۵۱ھ میں انتقال فرماگئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ارتداد پھیلا، اس وقت ثقیف قبیلہ نے بھی ارتداد کا ارادہ کیا تو حضرت عثمان ابن العاص نے ہی ان کو یہ کہکر سمجھایا: **یامعشرَ ثقیفٍ کنتم آخرَ الناس إسلاماً فلا تکونوا أوَّلَهم ردةً** کہ تم لوگ سب سے اخیر میں اسلام لائے، اب سب سے پہلے مرتد مت بنو۔

(۱) أخرجه مسلم، کتاب السلام، باب التعوذ من شیطان الوسوسة في الصلوة ۲ / ۲۲۴.

ان کے یہ نصیحت فرمانے پر یہ قبیلہ ارتداد سے رک گیا۔(۱)

خِنزَب نامی شیطان کا نماز میں حائل ہونا اوراس سے حفاظت کی تدبیر:

ان الشیطان قدحال بینی: حضرت عثمان بن العاص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ شیطان میری نماز کے درمیان حائل ہوتا ہے یعنی نماز شروع کرنے نہیں دیتا، یا اثناء نماز میں حائل ہوتا ہے اور قرأت میں خلل ڈالتا ہے نیز خشوع سے نماز نہیں پڑھنے دیتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات کو تسلیم کیا اور فرمایا کہ اس شیطان کا نام ''خنزب'' ہے۔

خنزب: بروزن درہم بمعنی **الجری علی المعاصی** برائی پر جری اور دلیر۔

فاذا احسسته فتعوذ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب ایسا ہو تو اس وقت تعوذ پڑھو اور تین مرتبہ بائیں جانب تھوک دو، راوی کہتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا تو اللہ نے اس کیفیت کو ختم فرمادیا۔

نماز میں تھوکنے کا حکم:

حنابلہ کے یہاں یہی حکم ہے کہ نماز میں شیطانی وسوسہ آوے تو نماز میں ہی بائیں جانب تین مرتبہ تھوک دے، ان کے مذہب کے مطابق اس سے نماز میں کوئی خلل نہیں ہوگا قالہ ابن القیم۔(۲)

اورحضرات احناف اس کو بعد فراغ الصلاۃ پر محمول کرتے ہیں، کیونکہ اگر نماز میں ایسا کرے گا تو عمل کثیر ہوجائے گا جو کہ مفسد صلوۃ ہے، اگر نماز میں تھوکنا چاہے تو تین مرتبہ متوالیاً نہ تھوکے بلکہ متفرقاً تھوکے، نیز اگر مسجد کا فرش پختہ ہو تو تھوک کو اپنے کپڑے میں لے، فرش پر نہ تھوکے۔

۷۲/ ۱۶: وعن القاسمِ بنِ محمدٍؒ: أَنَّ رَجُلاً سَأَلَهُ فَقَالَ: إِنِّيْ أَهِمُ فِيْ صَلاتِيْ فَيَكْثُرُ ذٰلِكَ عَلَيَّ، فَقَالَ لَهُ: اِمْضِ فِيْ صَلاتِكَ، فَإِنَّهُ لَنْ يَذْهَبَ ذٰلِكَ عَنْكَ حَتّٰى تَنْصَرِفَ وَأَنْتَ تَقُوْلُ مَاأَتْمَمْتُ صَلاتِيْ. (رواہ مالک)(۳)

ترجمہ: حضرت قاسم بن محمدؒ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ: مجھے اپنی نماز میں وہم ہوتا رہتا ہے اور یہ مجھے بکثرت پیش آتا ہے، قاسم بن محمد نے فرمایا: تم اپنی نماز پوری کرو،

(۱) الإصابة ۳/ ۴۲۲-۴۳۲ (۵۴۴۲)
(۲) اعلام الموقعين ۴/ ۲۱۸.
(۳) أخرجه مالك فى المؤطا، كتاب الصلوة، باب العمل فى السهو ۱/ ۳۵.

اس لئے کہ وہ شیطان تم سے جب ہی دور ہوگا کہ تم اپنی نماز پڑھ کر ہٹ جاؤ اور کہو کہ ہاں میں نے اپنی نماز پوری نہیں کی۔ (مالک)

تشریح حدیث

احوال قاسم بن محمدؒ:

قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیقؓ کبار تابعین میں سے ہیں، بڑے علم وفضل کے مالک تھے، مدینہ طیبہ کے فقہائے سبعہ میں سے ہیں، یحیٰ بن سعید نے فرمایا کہ: ہم نے مدینہ میں ان سے افضل کسی کو نہیں پایا، ۱۰۱ھ میں وفات ہوئی۔(۱)

چونکہ یہ تابعی ہیں ہیں اسلئے ان کی یہ حدیث "مقطوع" کہلائے گی، جو حدیث وروایت تابعی کی جانب منسوب ہو اس کو "حدیث مقطوع" کہتے ہیں۔

نماز میں وساوس آنے کا ایک علاج:

اس حدیث میں بھی نماز میں وسوسہ آنے کا ایک علاج مذکور ہے، قاسم بن محمدؒ سے کسی نے شکایت کی کہ نماز میں مجھے وہم بہت ہوتا ہے۔

قاسم بن محمد نے اس کا یہ علاج بتایا کہ: اس وہم کی طرف توجہ نہ کرو، بلکہ نماز میں دھیان جمائے رکھو اور نماز کے بعد شیطان کو کہو کہ ہاں میں نے ناقص نماز پڑھی ہے تیرے کہنے سے میں نماز کو مکمل نہیں کروں گا ، اللہ تعالیٰ شانہ میری ناقص نماز کو ہی قبول فرمائے گا، اس طرح شیطان کی مخالفت کرنے سے شیطان مایوس ہو کر پیچھا چھوڑ دے گا، اس کے وسوسے ختم ہو جائیں گے۔

آج بغیر کہنی دھوئے نماز پڑھیں گے!

نماز میں وساوس اور شیطانی دخل اندازی کا خاتمہ اسی صورت سے ممکن ہے کہ وساوس شیطانی کی جانب توجہ نہ کی جائے اور محض وسوسہ کی بنیاد پر نماز کا اعادہ نہ کیا جائے، ورنہ آدمی وہم کا مریض بن جائے گا اور شیطان اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا، بعض بزرگوں کے بارے میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ ان کو دوران

(۱) المرقاۃ ۱/۲۳۹۔

وضو کہنی کے خشک رہ جانے کا وسوسہ ہوا، انہوں نے دوبارہ اس کو دھولیا، پھر وسوسہ ہوا تو یہ کہہ کر کھڑے ہوگئے کہ: آج بغیر کہنی دھوئے نماز پڑھیں گے، حضرت کی یہ بات دفعِ وساوس کے لئے تھی جو اسی حدیث سے ماخوذ تھی۔

مگر علماء نے فرمایا کہ: یہ اس وقت ہے جب کہ ظن غالب نماز کی تکمیل کا ہو، اگر ظن غالب یہ ہے کہ نماز پوری نہیں ہوئی ہے تو پھر تکمیل لازم ہوگی، یہی حکم دوسرے اعمال کا ہے۔

فیکثر ذالک: اس کو تین طرح سے ضبط کیا گیا ہے: (۱) **یکثر** صیغہ معروف کے ساتھ ہو بروزن **یکرم** (۲) صیغہ مجہول کے ساتھ (۳) **یکبر** بالباء الموحدہ، پہلی صورت میں معنی یہ ہیں کہ یہ وہم مجھے کثرت سے ہوتا ہے، صیغۂ مجہول ہو تو معنی ہونگے کہ یہ وہم میرے اوپر کثرت سے ڈالا جاتا ہے، اور باء موحدہ کے ساتھ پڑھا جائے تو معنی ہونگے: یہ وہم مجھے شاق ودشوار گزرتا ہے، قرآن کریم کی آیت "**كَبُـرَتْ كَـلِـمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ**"(۱) میں کبرت اسی معنی میں مستعمل ہے۔(۲)

باب الإيمان بالقدر

ماقبل میں مطلق ایمان کا بیان تھا، ایمان بالقدر یہ مطلق ایمان کا جزو ہے، گویا کل کے بعد جزو کو بیان کیا جارہا ہے، یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ماقبل میں عام کا بیان تھا یہاں خاص کو بیان کیا جارہا ہے پس یہ **تخصیص بعدالتعمیم** ہے۔

مسئلہ تقدیر کی اہمیت ونوعیت:

سوال: اس جزو کو مستقل باب میں کیوں بیان کیا جارہا ہے؟ ایمان بالقدر مطلق ایمان کا ایک حصہ ہے لہذا کتاب الایمان کا جو عنوان پیچھے سے چلا آرہا ہے اسی کے تحت اس کی روایات کو لایا جاسکتا تھا، مستقل باب کی ضرورت نہیں تھی؟

جواب یہ ہے کہ: ایمان بالقدر مہتم بالشان مسئلہ ہے، اس کی اہمیت کی وجہ سے اس کو مستقل باب میں بیان کیا جارہا ہے، اس مسئلہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے امت میں مختلف فرقے پیدا ہوئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ

(۱) من سورۃ الکھف: ۵۔

(۲) **اللمعات** ۱: ۳۳۷۔

علیہ وسلم تقدیر کے بارے میں گفتگو سے منع فرمایا کرتے تھے؛ اسی لئے تقدیر کے بارے میں عقلاً گفتگو کرنا درست نہیں ہے، ہاں نصوص میں تقدیر کے متعلق جو کچھ وارد ہوا ہے اس کا مذاکرہ صحیح ہے اس کی ممانعت نہیں ہے۔

ملاعلی قاریؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ سے کسی نے سوال کیا: **اخبرنی عن القدر** ؟ تو فرمایا: **طریق مُظلِمٌ لاتَسْلُکْهُ** کہ وہ ایک تاریک راستہ ہے اس پر مت چلو، اس شخص نے دوبارہ یہی سوال کیا تو فرمایا **بحرٌ عمیقٌ لاتَلِجْهُ** کہ وہ ایک گہرا دریا ہے اس میں مت داخل ہو، سائل نے تیسری مرتبہ یہی سوال کیا تو فرمایا: **سرٌّ اللّٰہِ قَدْخَفِیَ عَلَیْکَ لاتُفَتِّشْهُ** کہ وہ اللہ تعالی شانہ کا ایک راز ہے اس کی تفتیش مت کر،(۱) ملاعلی قاریؒ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ تقدیر اللہ کا راز ہے اس کا علم نہ ملک مقرب کو دیا گیا ہے اور نہ نبی مرسل کو، مسئلۂ تقدیر عقل کی حد سے باہر ہے اس لئے آدمی اس کی کنہ وحقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔(۲)

ہمارے حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ نے انسان کو جو قوتیں (بصر، سمع، مال وغیرہ) عطا فرمائی ہیں ان کی ایک حد مقرر ہے، اس حد تک وہ قوت کام کرتی ہے اس سے آگے نہیں، مثلاً اللہ کی عطا کردہ ایک قوت بینائی ہے، اس سے بیس گز کے فاصلہ کی چیز کو پڑھا جاسکتا ہے اس سے دور کی چیز کو نہیں پڑھا جاسکتا، یہی حال قوت سماعت کا ہے، ایک شخص قوی وتندرست ہے وہ ایک کوئنٹل کا پتھر اٹھاسکتا ہے اس سے زیادہ کا نہیں، ایک شخص مالدار ہے وہ ایک ہیرا خرید سکتا ہے دو ہیرے نہیں خرید سکتا، غرضیکہ انسان کی ہر قوت ایک حد تک کام کرتی ہے اس سے آگے نہیں، اسی طرح قویٰ انسانی میں ایک قوت عقلیہ ہے اس کی بھی منجانب اللہ ایک حد ہے، اس حد کے اندر کی چیزوں کو عقل سمجھتی ہے، حد سے باہر کی چیزوں کو نہیں سمجھ سکتی، مسئلۂ تقدیر عقل کی حد سے باہر کی چیز ہے اس لئے اس مسئلہ کو عقل سے نہیں سمجھا جاسکتا، بلا سمجھے ہی اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔

اس باب سے متعلق چند مباحث ہیں: قضاء وقدر کے لغوی واصطلاحی معنی، قضاء وقدر میں فرق، ایمان بالقدر کا مفہوم، ایمان بالقدر پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات، مسئلہ تقدیر اور اختلاف امت، ایمان بالقدر کے فوائد، اقسام تقدیر، کتابت تقدیر کے مراحل واوقات۔

---

(۱)مرقاة المفاتیح ۱/ ۲٤۰.

(۲)المصدر السابق.

قضاوقدر کےلغوی واصطلاحی معنی:

''قدر''بفتح الدال کے لغوی معنی ہیں: تجویز کرنا، اندازہ کرنا اور''قضا'' کے لغوی معنی ہیں: فیصلہ کرنا، اورتجویز اوراندازہ کے مطابق کام انجام دینا، پس وضعاً قدر مقدم ہے اور قضاء مؤخر، اورقضاوقدر کے اصطلاحی معنی ہیں: عالم میں جوامورواشیاء موجود ہیں یاجوآئندہ وقوع پذیر ہونگی وہ سب اپنے وقوع کے اوقات وکیفیات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کےعلم میں ہیں اوراس کی تجویز وفیصلہ کے مطابق واقع ہوتی ہیں ۔(۱)

قضاوقدر میں فرق:

بعض نے کہا کہ دونوں مترادف ہیں اوربعض نے فرق کیاہے کہ قضانام ہےحکم کلی اجمالی کا جوازلی ہے اورقدرنام ہےاس حکم کلی کے اپنی تفصیلات اورجزئیات کے ساتھ وقوع کا، اوربعض نے اس کے برعکس کہاہے کہ: قدرنام ہے اجمالاکسی کام کے اندازہ کرنے کا اورقضاء نام ہے اندازہ کےمطابق اس کو وقوع پذیر کرنے کا، یہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ قرآن کریم میں یہ الفاظ اسی معنی ومفہوم میں استعمال ہوئے ہیں:

ارشاد باری ہے:''قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرا ''(۲)یعنی اللہ تعالیٰ نے ہرشے کا ایک اندازہ مقررکررکھاہے،''اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَر ''(۳)یعنی ہم نے ہرچیز کواندازہ کرکے پیدا کیاہے، نیز ارشاد ہے: فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ،(۴)یعنی ہم نے سات آسمان پیدافرمائے۔

ایمان بالقدرکامفہوم:

ایمان بالقدر یہ ہے کہ اس بات کا پختہ یقین رکھاجائے کہ جوکچھ ہوچکا یاہورہاہے یاآئندہ ہوگاوہ سب اللہ کےعلم محیط میں پہلے سے تھا، اوراب بھی ہے، پھراللہ تعالیٰ نے اپنےعلم ازلی کے مطابق ہرچیزکو لوح محفوظ میں لکھاپھراللہ کی قدرت کاملہ کےتحت اللہ کے ارادہ ومشیت سے تمام امورانجام پاتے ہیں(۵) جیسے انجینئر ایک مکان بنانا چاہےتو اس کا ایک خاکہ ذہن میں تیارکرتا ہے، پھراسی ذہنی خاکہ کے مطابق کاغذپر

(۱)فتح الإله ۱/۴۲۳،والمرقاة ۱/۲۴۰.
(۲) من الطلاق:۳.
(۳) من القمر:۴۹.
(۴) من السجدة:۱۲.
(۵)المرقاة۱/۲۴۰.

نقشہ بنا تا ہے، پھراس نقشہ کے مطابق معماروں کو حکم دیتا ہے، تو اللہ کے علم ازلی میں بھی اس کائنات کا نقشہ موجود تھا، پھراس کو لوح محفوظ میں لکھا، پھراسی لکھے ہوئے کے مطابق تمام امور اپنے اپنے وقتوں میں انجام پاتے ہیں۔

مسئلہ تقدیر کی ایک واضح مثال:

مسئلہ تقدیر کی مثال ایسی ہے جیسے ٹرین کا ایک نظام الاوقات (ٹائم ٹیبل) ہوتا ہے جو اسٹیشن ماسٹر کو معلوم ہے اس نے بلیک بورڈ پر اپنے علم کے مطابق ٹرین پہنچنے کے اوقات لکھے کہ یہ ٹرین فلاں وقت فلاں اسٹیشن پر پہنچے گی، ایک گھنٹہ میں اتنی مسافت طے کرے گی اور یہاں کے اسٹیشن پر فلاں وقت پہنچے گی، غرضیکہ ٹرین کا مکمل نظام الاوقات مرتب ہو کر سامنے آ گیا، آپ دیکھتے ہیں کہ وہ گاڑی ٹھیک اسی نظام کے مطابق چلتی ہے اور وقت پر اسٹیشن پہنچتی ہے جس طرح کہ لکھا گیا تھا، لیکن یہ نظام الاوقات کا مقرر ہو جانا اس گاڑی کو نہیں چلاتا بلکہ ٹرین کا ڈرائیور اپنے اختیار سے چلاتا ہے بلیک بورڈ پر وقت لکھے جانے سے ڈرائیور کا اختیار سلب نہیں ہوا، اسی طرح لوح محفوظ میں انسان کی تقدیر لکھے جانے سے انسان مجبور نہیں ہوا، تقدیر لکھے جانے کے باوجود انسان کی زندگی کی یہ گاڑی اپنے کسب واختیار سے سفر کر رہی ہے، بس فرق یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کا علم کامل اور محیط ہے اس لئے جو لکھ دیا اس سے تخلف نہیں ہوتا، برخلاف محکمہ ریلوے کے کہ ان کا علم ناقص ہے ان کو نہیں معلوم کہ آگے کوئی رکاوٹ پیش آئے گی یا نہیں؟ اس لئے اس میں بہت سی دفعہ تخلف ہو جاتا ہے، لہذا ہر انسان کی زندگی کا پورا نظام الاوقات بھی من جانب اللہ اسی طرح مرتب ہے اور ہر انسان اسی کے حساب سے اعمال وافعال انجام دیتا ہے، مگر سب کچھ اپنے اختیار سے ہی کرتا ہے پس نہ انسان بالکل آزاد ہے کہ اپنی تقدیر بھی خود بناتا ہو کما قال بہ القدریۃ اور نہ وہ بالکل مجبور ہے کہ خود کوئی اختیار نہ رکھتا ہو کما قال بہ الجبریہ۔

ایمان بالقدر پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات:

اس مسئلہ پر کچھ اشکالات کئے گئے ہیں:

(۱) اشکال: مسئلہ تقدیر انسان کو مجبور محض بناتا ہے کیونکہ جب یہ عقیدہ ہوگا کہ سب کچھ اللہ کے کرنے سے ہوتا ہے اور ہر چیز مقدر ہے تو بندہ مجبور ہوا، پھر جزا اور سزا بھی نہیں ہونی چاہئے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تمام چیزوں کا خلق ضرور اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، مگر اللہ نے انسان کو قوت

ارادہ اورکسب کا اختیار دیا ہے، اگرانسان برائی کرے گا تو اپنے اختیار سے کرے گا اس پرسزا کا مستحق ہوگا، اسی طرح نیکی کرے گا تو اپنے اختیار سے کرے گا اس پراس کو اجر ملے گا، اسی کسب اور اختیار کی وجہ سے انسان مکلّف ہے، انسان کا بااختیار ہونا اور مجبور نہ ہونا بدیہی چیز ہے جس کو جانور بھی سمجھتا ہے، چنانچہ کوئی شخص کسی جانور کو لاٹھی سے مارے تو وہ جانور مارنے والے سے انتقام لیتا ہے نہ کہ لاٹھی سے، کیونکہ جانور بھی اس بات کو سمجھتا ہے کہ لاٹھی مجبور اور انسان مختار ومتصرف ہے۔

(۲)اشکال: مسئلہ تقدیر انسان میں کم ہمتی پیدا کرتا ہے اس لئے کہ انسان جب یہ سوچے گا کہ جومقدر میں ہوتا ہے وہی ملتا ہے تو اسباب اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے نتیجہ میں ہمت کم اورحوصلہ پست ہوجائے گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے تقدیر پرایمان لانے کے ساتھ ساتھ اسباب کو اختیار کرنے کا حکم بھی دیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اسباب اور مسببات بھی مقدر ہیں، جب آدمی سبب کو اختیار کرے گا تو وہ کم ہمت نہیں ہوگا اگر ایک سبب سے کامیابی نہ ملی تو دوسرے سبب کو اختیار کرے گا، کیونکہ وہ یہ سوچے گا کہ ممکن ہے اللہ نے میرے لئے دوسرے سبب میں کامیابی رکھی ہو، اسی طرح تیسرے اور چوتھے سبب کو اختیار کرے گا بالآخر اس کو کسی نہ کسی سبب سے کامیابی مل جائے گی، ہاں جس شخص کا ایمان تقدیر پرنہیں ہے وہ سبب کو ہی اصل سمجھتا ہے، اگر سبب اختیار کرنے کے باوجود اس کو کامیابی نہ ملی تو وہ کم ہمت ہوجائے گا آگے کوشش چھوڑ دے گا، پس کم ہمتی تو عدم ایمان بالقدر سے ہے نہ کہ ایمان بالقدر سے۔

مسئلہ تقدیر اور اختلافِ امت:

مسئلہ تقدیر اورافعال عباد کے خلق میں اختلاف ہے، خلافت راشدہ کے زمانہ تک امت اس مسئلہ میں متفق تھی، صحابہ کے اخیر دور میں ایک شخص پیدا ہوا معبد جہنی، اس نے سب سے پہلے تقدیر کا انکار کیا اور کہا کہ معاملات اچانک وقوع پذیر ہوتے ہیں، پہلے سے وہ اللہ کے علم میں نہیں ہوتے، اس نے اس کے لئے ''الامــــر أنف '' (کہ معاملہ یکا یک اوراچانک ہوتا ہے) کی تعبیر اختیار کی، پھر ایسے لوگوں کا باقاعدہ ایک فرقہ بن گیا، جو فرقۂ قدریہ کے نام سے موسوم ہوا، اب تقدیر کے بارے میں امت میں چارفرقے ہیں: قدریہ، معتزلہ، جبریہ اوراہل السنّت والجماعت، اول الذکر تینوں فرقے افراط وتفریط کا شکار ہیں اور اہل السنۃ والجماعت کے مذہب میں اعتدال ہے۔

(۱) قدریہ:

یہ فرقہ تقدیرِ الٰہی کا منکر ہے، ان لوگوں کا کہنا ہے کہ کوئی چیز ازل سے طے نہیں، نہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے افعال پہلے مقرر کئے اور نہ ہی اس کو پہلے سے بندوں کے افعال کا علم ہے، بلکہ جب افعال وحوادث واقع ہوتے ہیں اسی وقت اللہ تعالیٰ کو ان کا علم ہوتا ہے، جیسا کہ بندوں کو بھی اسی وقت پتہ چلتا ہے جس کو یہ ''الامر انف'' سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی ہر معاملہ نو پید ہوتا ہے پہلے سے معلوم ومقدر نہیں ہوتا۔

نیز ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف اعیان (شجر، حجر، ارض، سماء وغیرہ) کا خالق ہے، افعال کا نہیں، بندے اپنے افعال اختیاریہ کے خود خالق ہیں، اگر اللہ خالق افعال ہو تو بندہ مجبور ہو جائے گا پھر اس کو احکام کا مکلّف بنانے میں تکلیف مالایطاق لازم آئے گا، اور ایسی صورت میں انزال کتب وارسال رسل سب بے کار ہو جائے گا، ان کے نظریہ کے مطابق چونکہ انسان کی تقدیر پہلے سے طے نہیں بلکہ ہر انسان اپنی تقدیر گویا خود بناتا ہے اس لئے ان کو ''قدریہ'' کہتے ہیں۔

اس فرقہ کے نظریات باطل اور قرآن وسنت کی تصریحات کے خلاف ہیں، قرآن میں صاف طور پر یہ فرمایا گیا ہے: ''اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ''(۱) دوسری جگہ ارشاد ہے: ''قُلْ لَااَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعاً وَّلَاضَرًّا اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰهُ''(۲) کہ آپ فرما دیجئے کہ میں اپنی جان کے لئے نفع اور ضرر کا مالک نہیں ہوں مگر وہ ہی جو اللہ چاہے، ''اِنَّكَ لَاتَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ''(۳) یعنی بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے اس کو جسے آپ چاہیں لیکن اللہ تعالیٰ ہدایت دیتے ہیں جسے وہ چاہتے ہیں، یہ سب آیات اس بات کی دلیل ہیں کہ انسان کو مکمل اختیار اور قدرت حاصل نہیں۔

(۲) جبریہ:

ان لوگوں نے افراط وغلو سے کام لیا ہے کہ سب کچھ اللہ کے کرنے سے ہوتا ہے بندہ کو کوئی قدرت اور اختیار حاصل نہیں ہے، بندہ مجبور محض ہے، مگر یہ مذہب عقلاً وشرعاً باطل ہے کیونکہ بے شمار کام بندہ اپنے اختیار سے انجام دیتا ہے۔

(۱) من القمر: ٤٩.
(۲) من الأعراف: ١٨٨.
(۳) من القصص: ٥٦.

(۳) معتزلہ:

معتزلہ نے کہا کہ افعالِ عباد دو قسم کے ہیں: افعال خیر اور افعال شر، افعال خیر کا خالق اللہ ہے اور افعال شر کا خالق خود بندہ ہے، ان کا کہنا ہے کہ افعال شر کا خالق اللہ کو قرار دیا جائے تو اللہ کی طرف شر اور قبیح کی نسبت کرنا لازم آئے گا اور یہ اللہ کی شان تعظیمی کے خلاف ہے۔

(۴) اہل السنّت والجماعت:

اہل سنت والجماعت راہ اعتدال پر ہیں کہ تمام اشیاء اللہ کے علم میں ازل سے ہیں، پھر ہر چیز اپنے وقت پر اللہ کی قدرت کے تحت اس کی مشیت وارادے سے وجود میں آتی ہے، ہاں بندہ کو اختیار اور قوتِ کسب دی گئی ہے اسی وجہ سے بندہ مکلّف ہے اور چونکہ بندہ اپنے کسب واختیار سے افعال انجام دیتا ہے اس لئے اس کے کسب کی نوعیت کے لحاظ سے اس کو ثواب وعذاب ہوتا ہے، پس اللہ تعالیٰ شانہ خالقِ افعال ہیں اور بندہ کاسب افعال، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے خلق کی نسبت اپنی جانب کی ہے: "وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَاتَعْمَلُوْنَ "(۱) یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں بھی پیدا فرمایا اور ان اعمال کو بھی پیدا کیا جو تم انجام دیتے ہو، اور کسب کی نسبت انسان کی طرف فرمائی ہے: "لَهَامَاكَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّاكَسَبْتُمْ "(۲)

اور خلق اور کسب میں فرق بھی ہے وہ یہ کہ خلق میں ایجاد فعل بغیر واسطۂ آلہ کے ہوتا ہے اور کسب آلہ کے ذریعہ ہوتا ہے، جیسے نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا، یہ نمرود کی طرف سے فعلِ حرق کا کسب تھا ابراہیم علیہ السلام کے لئے، لیکن جلنے کے فعل کا متحقق ہونا اللہ کے اختیار میں ہے نہ کہ بندہ کے، چنانچہ اللہ نے آگ کو حکم دیا "يَانَارُ كُوْنِيْ بَرْداً وَّسَلاماً "(۳) کہ اے آگ ٹھنڈی ہوجا اور ابراہیم کے لئے سلامتی والی بن جا، تو آگ نے انہیں نہیں جلایا۔

فوائد ایمان بالقدر:

تقدیر پر ایمان لانے کے بہت سے فائدے ہیں:

(۱) من الصافات: ۹٦.

(۲) من البقرة: ۱۳٤ و ۱٤۱.

(۳) من سورة الأنبياء: ٦۹.

(۱)معرفتِ مرتبہ، بندوں کے مراتب اللہ کے یہاں لکھے ہوئے ہیں، فرشتے ان مراتب کو دیکھ کر بندوں کے لئے حسب مرتبہ دعا کرتے ہیں۔

(۲)تقدیر پرایمان لانے سے آدمی میں تکالیف برداشت کرنے کا مادہ پیدا ہوتا ہے، اگر کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ یہ مصیبت میرے مقدر میں تھی یہ تو آنی ہی تھی، بخلاف کافر کے کہ وہ مصیبت پر پوری زندگی پچھتا تا رہتا ہے، مثلاً کسی کا بیٹا سفر میں گیا اور حادثہ میں اس کا انتقال ہوگیا تو یہ سوچ سوچ کر اپنے غم کو تازہ کرتا رہتا ہے کہ اگر میرا بیٹا سفر میں نہ جاتا تو نہ مرتا، بخلاف مومن کے کہ وہ اس وقت صبر کرتا ہے۔

(۳)اس سے شکر کی توفیق ملتی ہے جب کوئی نعمت ملتی ہے تو مومن سوچتا ہے کہ یہ نعمت میرے مقدر میں اللہ کے یہاں لکھی ہوئی تھی، اللہ نے اپنے فضل سے یہ نعمت مجھے عطا فرمائی، اس لئے بندہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔

(۴)اس سے آدمی میں شجاعت پیدا ہوتی ہے کہ موت وحیات سب مقدر ہے تو پھر ڈرنا نہیں چاہئے اور بزدلی نہیں دکھانی چاہئے، بخلاف کافر کے کہ وہ بزدل ہوتا ہے، معرکہ میں ٹھہرنا اس کو مشکل ہوتا ہے کہ کہیں موت نہ آجائے۔

تقدیر کی قسمیں:

تقدیر کی دو قسمیں ہیں: تقدیر معلق اور تقدیر مبرم، مبرم: وہ تقدیر جو قطعی ہو، جس میں تغیر وتبدل کا احتمال نہ ہو، اور تقدیر معلق یہ ہے کہ کسی چیز کو کسی فعل پر معلق کر کے لکھا گیا ہو کہ بندہ فلاں طاعت کریگا تو یہ مصیبت نہیں آئے گی، مشہور حدیث **''لایرد القدر الاالدعاء''** میں قدر سے یہی تقدیر معلق مراد ہے۔

اللہ کے علم ازلی میں ہر چیز مبرم ہے البتہ لوح محفوظ میں بعض چیزوں کو معلق کر کے لکھا جاتا ہے۔

کتابت تقدیر کے مراحل واوقات:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ تقدیر کے ادوار وزمانے مختلف ہیں جو یہ ہیں:

(۱)ازل میں جب اللہ کے سوی کچھ نہ تھا حق تعالیٰ شانہ نے اس وقت کائناتِ عالم کا خاکہ تیار کیا۔

(۲) آسمان وزمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال قبل لوح محفوظ میں تقدیر لکھی گئی، یہ علم ازلی کی نقل واندراج ہے۔

(۳) تخلیق آدم کے وقت ان کی پشت سے ان کی تمام نسل کو نکالا گیا اور کچھ کو جنتی اور کچھ کو جہنمی قرار دیا گیا۔

(۴) استقرار حمل کے وقت بھی لکھا جاتا ہے کہ یہ انسان آئندہ کیا کیا کام کرے گا، اس کی عمر کتنی ہوگی اور اس کا رزق کتنا ہوگا؟

(۵) دنیا میں کوئی حادثہ یا واقعہ پیش آنے سے پہلے بھی تقدیر کو لکھا جاتا ہے۔(۱)

الفصل الاول

۱/۷۳: عن عبداللّٰہ بن عمروؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی الله علیه وسلم ''كَتَبَ اللّٰهُ مَقَادِيْرَ الخَلائِقِ قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ'' قَالَ: وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى المَاءِ. (رواہ مسلم)(۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ شانہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار برس پہلے مخلوقات کی تقدیروں کو لکھا ہے اور فرمایا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ شانہ کا عرش پانی پر تھا۔ (مسلم)

تشریح حدیث

تقدیر لکھے جانے کا وقت:

اس حدیث میں تقدیر کے لکھے جانے کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی پیدائش سے پچاس ہزار سال قبل تمام مخلوقات کی تقدیر لکھ دی تھی، پس یہ تقدیر کے مذکورہ بالا مراحل میں سے دوسرے درجہ کا بیان ہے، اور اس سے ان لوگوں کی تردید بھی ہو جاتی ہے جو تقدیر کے منکر ہیں۔

تقدیر لکھنے کی کیفیت:

كتب الله: اللہ کے لکھنے کی کیا کیفیت ہوئی اس میں علماء کے متعدد اقوال ہیں:

(۱) رحمة الله الواسعة ۱/۶٦٨.

(۲) أخرجه مسلم كتاب القدر، باب حجاج ادم وموسى عليه السلام ۲/۳۳۵.

(۱) بعض نے کہا کہ اس سے مراد فرشتوں کو لکھنے کا حکم دینا ہے پس آمر ہونے کے اعتبار سے اللہ کی طرف نسبت کی گئی ہے، جیسے ''بني الأمير المدينة'' میں امیر کی طرف بناء کی نسبت اسی معنی لحاظ سے ہے۔(۱)

(۲) بعض نے کہا کہ اللہ نے قلم اور لوح محفوظ میں ایسا تعلق پیدا فرمادیا کہ خود بخود کتابت ہوگئی۔ (۲)

(۳) بعض نے کہا کہ اللہ نے قلم کو حکم دیا کہ لکھ، قلم نے کہا کہ: کیا لکھوں؟ اللہ نے فرمایا کہ قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے سب کچھ لکھ، چنانچہ قلم نے سب کچھ لکھ دیا۔ (۳)

(۴) بعض نے کہا ہے کہ اس سے لکھنا مراد نہیں بلکہ تعیین اور طے کرنا مراد ہے۔(۴)

مقادير الخلائق: ''مقادیر'' مقدار کی جمع ہے اور مقدار تقدیر کے معنی میں ہے۔(۵)

بخمسين ألف سنة: اس پر یہ اشکال ہے کہ جب اس وقت آسمان وزمین اور چاند وسورج نہیں تھے، جن سے وقت کا اندازہ ہوتا ہے، پھر پچاس ہزار سال کا اندازہ کیونکر لگایا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لفظ تحدید کے لئے نہیں، بلکہ محض تکثیر کے لئے ہے، اور مطلب یہ ہے کہ آسمان وزمین کی پیدائش سے بہت قبل ایسا ہوا، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وقت کی تعیین کے لئے سورج وچاند اور دن ورات کی حاجت انسانوں کو ہے، اللہ تعالیٰ کو ان کی حاجت نہیں۔

وكان عرشه على الماء: یہ جملہ قرآن پاک میں بھی آیا ہے اصلاً یہ متشابہات میں سے ہے اس کے معنی میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ یہ جملہ مجاز ہے اللہ کی قدرت کاملہ اور سلطنت تامہ سے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ نے آسمان وزمین کی پیدائش سے قبل تقدیر لکھی اس طرح کہ اس کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔(۶)

(۲) بعض نے کہا کہ پانی سے مراد سمندر کا پانی ہے اور عرش حقیقۃً سمندر کے پانی پر تھا۔(۷)

---

(۱) لمعات التنقيح ۱/ ۳٤۱.

(۲) مرقاة المفاتيح ۱/ ۲٤۰ وشرح المشكاة للطيبي ۲/ ۵۲۹.

(۳) مرعاة المفاتيح ۱/ ۳۸۳.

(٤) لمعات التنقيح ۱/ ۳٤۱.

(۵) فتح الاله ۱/ ٤۲۳.

(٦) لمعات التنقيح ۱/ ۳٤۳.

(۷) لمعات التنقيح ۱/ ۳٤۳.

(۳) بعض نے کہا کہ اللہ نے ایک خاص قسم کا پانی پیدا فرمایا تھا اس پر عرش تھا۔ (۱)
(۴) بعض نے کہا کہ عرش فرشتے کے کاندھے پر تھا اور فرشتہ پانی پر کھڑا تھا۔ (۲)
(۵) بعض نے کہا کہ عرش اوپر ہی تھا لیکن پانی وعرش کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں تھی اس لئے کہدیا کہ عرش پانی پر تھا۔ (۳)
الحاصل مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ اس وقت ان کے سواء کچھ اور موجود نہ تھا۔

٢/٧٤ : وَعَنِ ابنِ عُمرَؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم "كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعَجْزُ وَالْكَيْسُ" (رواه مسلم) (۴)

ترجمه : حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہر چیز تقدیر سے ہوتی ہے یہاں تک کہ ناکارہ ہونا اور ہوشیار ہونا بھی۔ (مسلم)

تشریح حدیث

عجز وکیس بھی مقدر ہیں:

اس حدیث میں صراحۃً تقدیر کا بیان ہے کہ ہر شے تقدیر کے تحت ہے یہاں تک کہ عجز اور کیس بھی، یعنی جملہ احوال وکیفیات اللہ کے یہاں مقدر اور طے شدہ ہیں۔

حتی العجز و الکیس : "عجز" اور "کیس" رفع اور جر دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہے (۵) یہ دونوں افعالِ عباد کا منشاء ہیں عجز کی بنیاد پر بندوں سے بے کار اعمال صادر ہوتے ہیں اور کیس بمعنی ہوشیاری اس سے اچھے اعمال صادر ہوتے ہیں، یہ بتانا مقصود ہے کہ جب بندوں کے افعال کا منشا بھی مقدر ہے تو خود افعال تو بدرجۂ اولی مقدر ہوں گے۔

بعض علماء نے فرمایا کہ: عجز وکیس میں ضدین کی نسبت نہیں، بلکہ عجز کی ضد قوت وقدرت ہے اور

(۱) فتح الباری ۱۳/ ٤٨٨.
(۲) فتح الباری ۱۳/ ٤٨٨.
(۳) شرح المشكاة للطيبي ١١/ ٣٦٠٠ (٥٦٩٨)
(٤) أخرجه مسلم كتاب القدر، باب كل شئ بقدر ٢/ ٢٣٦.
(٥) فتح الإله ١/ ٤٢٦، المرقاة ١/ ٢٤١، المرعاة ١/ ٣٨٤.

کیس کی ضد بلادۃ وحمق ہے، یہاں یہ دونوں بھی مطلوب ہیں اوران کی ضد یعنی قدرت وحمق بھی مطلوب ہیں، یعنی بندہ کے ہرقسم کے اوصاف واعمال قضا وقدر کے ماتحت ہیں۔

قدریہ اورمعتزلہ کی تردید:

پس اس حدیث سے قدریہ اورمعتزلہ ہردو کی تردید ہوجاتی ہے، قدریہ کی اس معنی کر کہ وہ تقدیر کے منکر ہیں جبکہ اس حدیث میں تمام چیزیں تقدیر کے تحت بتائی گئی ہیں اورمعتزلہ کی اس معنی کر کہ وہ شراور برائی کا خالق انسان کوقرار دیتے ہیں جبکہ اس حدیث میں ''عجز'' جوازقبیل شرہے اس کوبھی تقدیرالٰہی کے تحت بتایا گیا ہے۔(۱)

۳/۷۵: وَعن أبی هريرةؓ قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم : اِحْتَجَّ آدَمُ وَمُوْسیٰ عِنْدَ رَبِّهِمَا، فَحَجَّ آدَمُ مُوْسَیٰ؛ قَالَ مُوْسیٰ: أَنْتَ آدَمُ الَّذِیْ خَلَقَکَ اللّٰهُ بِيَدِهٖ وَنَفَخَ فِيْکَ مِنْ رُوْحِهٖ، وَأَسْجَدَ لَکَ مَلائِکَتَهٗ، وَأَسْکَنَکَ فِیْ جَنَّتِهٖ، ثُمَّ أَهْبَطْتَّ النَّاسَ بِخَطِيْئَتِکَ إِلَی الْأَرْضِ؟ قَالَ آدَمُ: أَنْتَ مُوْسیٰ الَّذِیْ اِصْطَفَاکَ اللّٰهُ بِرِسَالَتِهٖ وَبِکَلَامِهٖ، وَأَعْطَاکَ الْأَلْوَاحَ فِيْهَا تِبْيَانُ کُلِّ شَيْئٍ، وَقَرَّبَکَ نَجِيًّا، فَبِکَمْ وَجَدْتَ اللّٰهَ کَتَبَ التَّوْرَاةَ قَبْلَ أَنْ أُخْلَقَ؟ قَالَ مُوْسیٰ: بِأَرْبَعِيْنَ عاماً قَالَ آدَمُ: فَهَلْ وَجَدْتَ فِيْهَا ''وَعَصیٰ آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی؟ قَالَ: نَعَمْ قَالَ: اَفَتَلُوْمُنِیْ عَلیٰ أَنْ عَمِلْتُ عَمَلاً کَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيَّ أَنْ اَعْمَلَهٗ، قَبْلَ اَنْ يَخْلُقَنِیْ بِأَرْبَعِيْنَ سَنَةً؟ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''فَحَجَّ آدَمُ مُوْسیٰ'' (رواہ مسلم)(۲)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت آدم اورحضرت موسیٰ علیہما السلام نے اپنے پروردگار کے سامنے مناظرہ کیا، اورحضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پرغالب آ گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: آپ وہی آدم ہیں جن کوخدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا، آپ میں اپنی روح پھونکی تھی، فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا اوراپنی جنت میں آپ کورکھا تھا، پھرآپ نے اپنی غلطی کی وجہ سے لوگوں کوزمین پر

(۱) التعليق الصبيح ۱/۷٦.

(۲) أخرجه مسلم كتاب القدر، باب حجاج آدم وموسى عليهما السلام ۲/۳۳۵.

اتروادیا، آدم علیہ السلام نے کہا تم وہی موسیٰ ہو جن کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے رسالت اور ہم کلامی کے لئے منتخب فرمایا تھا اور آپ کو وہ تختیاں دی تھیں جن میں ہر چیز کا بیان تھا اور آپ کو سرگوشی کے لئے مقرب بنایا تھا، آپ کو معلوم ہے کہ اللہ سبحانہ عزوجل نے میری پیدائش سے کتنے عرصہ پہلے تورات کو لکھ دیا تھا؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا" چالیس سال پہلے" آدم علیہ السلام نے فرمایا کیاتم نے تورات میں (یہ لکھا ہوا) نہیں پایا "وَعَصٰى آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہاں، حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا: کیاتم مجھ کو میرے اس عمل پر ملامت کرتے ہو جس کو اللہ نے میری پیدائش سے چالیس سال پہلے میرے لئے (تقدیر میں) لکھدیا تھا، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اس دلیل سے آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے۔ (مسلم)

تشریح حدیث

اس حدیث میں تقدیر کا بیان ہے، حضرت آدم علیہ السلام وموسیٰ علیہ السلام کا مکالمہ ہوا، آدم علیہ السلام احتجاج بالتقدیر کی وجہ سے غالب آگئے، پس تقدیر برحق ہے۔

حضرت آدم وموسیٰ علیہما السلام کے مابین مناظرہ:

احتج آدم و موسى عندربهما :حضرت آدم وموسیٰ علی نبینا وعلیہما الصلوۃ والسلام کے درمیان محاجہ یعنی مناظرہ ومکالمہ ہوا جس کی ابتدا موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ہوئی، موسیٰ علیہ السلام نے آدم علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ وہی آدم ہیں جن کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے پیدافرمایا اوراپنی روح پھونکی اوراللہ نے آپ کو مسجود ملائکہ بنایا اور آپ کو جنت میں ٹھیرایا، آپ نے سب لوگوں کو اپنی خطا کی وجہ سے جنت سے

ملحوظة: قد عزا التبريزى هذا الحديث إلى مسلم فقط وقد أخرجه البخاري أيضاً في خمسة مواضع(١) كتاب الانبياء، باب وفاة موسى عليه السلام وذكره بعد ١/ ٤٦٣، برقم ٣٢٩٦،(٢) وكتاب التفسير، باب قوله تعالى: فلايخرجنكما من الجنة فتشقى ٢/ ٦٩٣، برقم ٤٥٥٢، (٣)وفيه أيضاً، باب قوله تعالى واصطنعتك لنفسى ٢/ ٦٩٢، برقم ٤٥٥٠، (٤) كتاب القدر، باب تحاج آدم وموسى عندالله تعالىٰ ٢/ ٩٧٩ برقم ٦٣٦١، (٥) كتاب التوحيد ،باب قوله الله تعالى وكلم الله موسى تكليما ٢/ ١١١٩ برقم ٧٢١٤، وأبوداود أيضاً، كتاب السنة، باب في القدر ٢/ ٦٤٦، والترمذى كتاب القدر، باب (بلاترجمه) ٢/ ٣٤ وابن ماجه فى المقدمه، باب فى القدر ١/ ٩.

نکالا اور زمین پر اتار دیا، آپ نے ہمیں خسارہ ونقصان میں واقع کیا، آپ سے اکل شجرہ کا قصور نہ ہوتا تو ہم خسارہ ونقصان میں مبتلا نہ ہوتے، آدم علیہ السلام نے موسیٰ کی نعمتوں کوشمار کرایا کہ آپ وہی موسیٰ ہیں جن کو اللہ نے اپنی نبوت ورسالت کے لئے منتخب فرمایا اور اپنی ہم کلامی سے نوازا، اللہ نے آپ کو توریت کی تختیاں دیں جس میں ہر چیز کی وضاحت تھی، آپ یہ بتائیے کہ میری تخلیق سے کتنے روز قبل توریت کو لکھا گیا، موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ: چالیس سال پہلے، آدم علیہ السلام نے پوچھا کہ: توریت میں یہ مضمون تھا "**وعصى آدم ربه فغوى**"؟ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: ہاں توریت میں یہ مضمون تھا، آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ: تم مجھے ایسے عمل پر ملامت کر رہے ہو جو میری پیدائش سے پہلے ہی میرے حق میں لکھا جا چکا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس دلیل سے آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مزید کچھ نہ کہا۔

مقام ووقت مناظرہ:

یہ مناظرہ کہاں اور کب ہوا؟ اس میں شراح کے مختلف اقوال ہیں:

(۱) موسیٰ علیہ السلام نے اپنی حیات میں اللہ سے دعا کی تھی کہ میں آدم علیہ السلام سے ملنا چاہتا ہوں اللہ نے آدم علیہ السلام کو زندہ کیا، اس وقت یہ محاجہ ہوا۔ (۱)

(۲) بعض نے کہا کہ یہ مناظرہ عالم ارواح میں ہوا۔ (۲)

(۳) بعض نے کہا یہ مناظرہ دونوں کا عالم برزخ میں ہوا، برزخ موت کے بعد سے نفخ صور تک کا وقت کہلاتا ہے۔ (۳)

(۴) بعض نے کہا کہ یہ مناظرہ خواب میں ہوا، اور حضرات انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی اور حجت ہوتا ہے۔ (۴)

---

(۱) لمعات التنقيح ۱/ ۳٤٥.

(۲) نفس المصدر.

(۳) مرعاة المفاتيح ۱/ ۳۸٥.

(٤) نفس المصدر.

(۵) بعض نے کہا کہ یہ مناظرہ قیامت میں ہوگا۔ (۱)

(۶) بعض نے کہا کہ یہ مناظرہ ومکالمہ روحانی ہے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی روح جب آسمان پر گئی اور حضرت آدم علیہ السلام کی روح سے ملاقات ہوئی اس وقت یہ مکالمہ ہوا، علامہ ابن عبدالبر اور علامہ قابسی کی یہی رائے ہے۔ (۲)

خلق الله بیده: ''بیدہ'' متشابہات میں سے ہے جس پر بلا کیف ایمان لانا چاہئے یا پھر اس سے اللہ کی قدرت مراد ہے۔

ونفخ فیک من روحه: ''روح'' کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف شرافت کے لئے ہے، جیسے بیت اللہ۔

واسجدلک ملائکته: یہ سجدہ سجدۂ تعظیمی تھا، جو پچھلی امتوں میں جائز رہا ہے، سجدۂ عبادت نہ تھا۔

مسئلہ عصمت انبیاء:

وعصی آدم ربه فغوی: اس روایت میں آدم علیہ السلام کی طرف عصیان کی نسبت کی گئی ہے حالانکہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ: عصمت انبیاء کی کچھ تفصیل یہاں آجائے، امام رازی نے تفسیر کبیر میں اس مسئلہ پر مفصل اور منقح بحث فرمائی ہے وہ لکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا تعلق چار چیزوں سے ہوتا ہے:

(۱) عقائد، اس میں حضرات انبیاء سے خطاء نہیں ہوسکتی۔

(۲) تبلیغ احکام، اس میں بھی ان حضرات سے سرمو خطا نہیں ہوتی وہ حضرات تبلیغ کا حق ادا فرماتے ہیں۔

(۳) فتاوی واجتہاد، اس میں لغزش ہوسکتی ہے، لیکن گناہ اس پر بھی نہیں ہوتا، بلکہ امتی سے بھی اجتہادی خطا معاف ہوتی ہے اور اس پر مواخذہ نہیں ہوتا، البتہ انبیاء اور امتی کے اجتہاد میں فرق یہ ہے کہ نبی سے اگر خطاء اجتہادی ہوجائے تو من جانب اللہ ان کو متنبہ کردیا جاتا ہے، امتی سے اگر خطا ہوتو اس کو متنبہ نہیں کیا جاتا جیسے اسارائے بدر کا واقعہ کہ اس میں لغزش ہوئی، جس پر متنبہ کیا گیا: ''مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَّكُوْنَ لَهُ أَسْرٰى...... الخ''(۳)

---

(۱) فتح الباری ۱۱/ ۵۶۱.

(۲) مرعاة المفاتیح ۱/ ۳۸۵.

(۳) من سورة الأنفال: ۶۷.

(۴) آداب واخلاق حضرات انبیاء علیہم السلام سے اس میں عمداً لغزش نہیں ہوتی سہواً ہوسکتی ہے مگر اس کو معصیت نہیں کہا جاتا بلکہ اس کو لغزش وزلت قدم کہا جاتا ہے۔ (۱)

آدم علیہ السلام سے جو خطاء ہوئی وہ اجتہادی تھی حق تعالیٰ شانہ نے ایک درخت کی طرف اشارہ کرکے فرمایا ''لَاتَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ'' (۲) اس نہی میں اشارہ حسی درخت کے ایک فرد کی طرف تھا، اس سے حضرت آدم علیہ السلام نے یہ سمجھا کہ اس مخصوص درخت سے اکل کی ممانعت کی گئی ہے، اس کی جنس کے دوسرے درختوں سے ممانعت نہیں کی گئی، اس لئے انہوں نے اس جنس کے دوسرے فرد سے کھالیا حالانکہ مقصود باری تعالیٰ تمام جنس کی ممانعت کرنا تھا، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اشارہ ایک فرد کی طرف ہوتا ہے اور مراد مکمل جنس ہوتی ہے، چنانچہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ میں سونا لیا اور ایک ہاتھ میں ریشم اور فرمایا ''إن هذين حرام على ذكور أمتي (۳)'' اس میں اشارہ فرد کی طرف تھا لیکن مراد پوری جنس تھی، اسی طرح آدم علیہ السلام نے یہاں یہ سمجھا کہ ممانعت صرف فرد کے متعلق ہے حالانکہ مکمل جنس کی ممانعت تھی اس لئے یہ اجتہادی خطا ہوئی۔

بعض نے کہا کہ ''لاتقربا'' میں نہی تحریمی نہیں تھی، بلکہ تنزیہی تھی، لیکن اس کے باوجود ''عصی'' کا لفظ استعمال کیا گیا، یہ **حسنات الابرار سیئات المقربین** کے قبیل سے ہے۔

گناہ کرکے تقدیر کا سہارا لینا:

فحج ادم موسیٰ: اس مکالمہ میں حضرت آدم علیہ السلام نے احتجاج بالتقدیر کیا جس کی وجہ سے آپ حضرت موسیٰ پر غالب آ گئے، اس پر سوال ہوتا ہے کہ معصیت کے لئے احتجاج بالتقدیر جائز نہیں ہے ورنہ عاصی اور گنہ گار لوگ تقدیر کا سہارا لے کر کہیں گے کہ ہمیں نہ ٹوکو اور ملامت مت کرو، کیونکہ یہ گناہ ہماری تقدیر کا حصہ بن چکا تھا، ظاہر ہے کہ یہ اعتذار درست نہیں ہے، پھر حضرت آدم نے احتجاج بالتقدیر کیوں کیا؟ اس سوال کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ اعتراض اس وقت کیا تھا جب کہ آدم اپنی خطا ولغزش سے توبہ

(۱) التفسير الكبير للامام الرازي ۳/ ۴۵۵.
(۲) من سورة البقرة: ۳۵.
(۳) سنن أبي داود (۴۰۵۷)، والنسائي (۵۱۴۴) وابن ماجه (۳۵۹۵)

کرچکے تھے اورتوبہ کے بعد خطا پر ملامت صحیح نہیں ہے، لہٰذا ان کا احتجاج بالتقدیر درست تھا، اسی لئے وہ غالب شمار ہوئے۔ (۱)

(۲) ان کا یہ مکالمہ ارتفاع تکلیف کے بعد ہوا یعنی وصال کے بعد عالم بالا میں، وہاں تقدیر کو عذر میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ (۲)

(۳) احتجاج بالتقدیر کی دوصورتیں ہیں: (الف) اجتراء علی المعاصی کے لئے (گناہوں پر جری ہونے کے لئے) (ب) اپنے قلب کو تسلی دینے کے لئے کہ مومن سے جب خطا صادر ہوتی ہے تو قلب کو بہت زیادہ اضطراب اور غم لاحق ہوتا ہے، اس اضطراب کو رفع کرنے کے لئے اور غم کو ہلکا کرنے کے لئے احتجاج بالتقدیر درست ہے، آدم علیہ السلام کا احتجاج اسی قبیل سے تھا اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ (۳)

۷۶/ ۴: وعن ابن مسعودٍ قَالَ: حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللهِ صلی الله علیه وسلم وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ: إِنَّ خَلْقَ اَحَدِكُمْ يُجْمَعُ فِيْ بَطْنِ أُمِّهٖ أَرْبَعِيْنَ يَوْماً نُطْفَةً، ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِثْلَ ذلك، ثُمَّ يَبْعَثُ اللّٰهُ إِلَيْهِ مَلَكاً بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ: فَيَكْتُبُ عَمَلَهٗ، وَأَجَلَهٗ وَرِزْقَهٗ، وَشَقِيٌّ أَوْسَعِيْدٌ، ثُمَّ يُنْفَخُ فِيْهِ الرُّوْحُ، فَوَالَّذِيْ لاإِلٰهَ غَيْرُهٗ إِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى مَايَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ، فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ، فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا، وَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتّٰى مَايَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا، إِلَّاذِرَاعٌ، فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ، فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا. (متفق علیہ)(۴)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ: صادق ومصدوق حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص کی تخلیق اس طرح ہوتی ہے کہ (پہلے) اس کا مادۂ خلق (نطفہ) ماں کے پیٹ (رحم) میں چالیس دن تک جمع رہتا ہے پھر اتنے ہی

(۱) شرح النووی علی مسلم ۲/ ۳۳۵.

(۲) شرح النووي علی مسلم ۲/ ۳۳۵.

(۳) مرقاۃ المفاتیح ۱/ ۲۴۳.

(۴) أخرجه البخاري في أربعة مواضع، كتاب بدء الخلق، باب ذكر الملائكة ۱/ ۴۵۶ برقم ۱۳۰۴، و"كتاب الأنبياء باب خلق آدم وذريته وقول الله تعالىٰ وإذقال ربك للملائكة إني جاعل في الأرض خليفة ۱/ ۴۶۹، برقم ۳۲۲۲، وكتاب القدر، باب في القدر ۲/ ۹۷۵ برقم ۶۳۴۲، وكتاب التوحيد، باب قوله تعالىٰ "ولقد سبقت كلمتنا لعبادنا المرسلين ۲/ ۱۱۱۰ برقم ۷۱۵۴" ومسلم "كتاب القدر" باب كيفية خلق الأدمي في بطن أمه الخ ۲/ ۳۳۲.

دنوں یعنی چالیس دن میں جماہوا خون ہوجاتا ہے پھراتنے ہی دنوں یعنی چالیس دن میں وہ گوشت کا ٹکڑا بن جاتا ہے، پھر (چوتھے اربعین میں) اللہ سبحانہ وتعالی ایک فرشتہ بھیجتے ہیں وہ فرشتہ چار باتیں اس کے بارے میں لکھتا ہے: اس کا عمل، اس کی موت کا وقت، اس کے رزق (کی مقدار) اوراس کا بد بخت اور نیک بخت ہونا، پھراسی اربعین میں نفخ روح ہوتا ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبودنہیں ہے تم میں سے بعض آدمی جنتیوں کے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھاہوا غالب آتا ہے اور پھروہ دوزخیوں والے کام کرنے لگتا ہے اور (ان اعمال بد کے سبب) دوزخ میں داخل ہوجاتا ہے اورتم میں کا بعض آدمی دوزخیوں والے اعمال کرتارہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اوردوزخ کے درمیان ہاتھ ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھاہوا غالب آتا ہے اور وہ جنتیوں والے اعمال کرنے لگتا ہے (اور ان اعمال حسنہ کے سبب) جنت میں داخل ہوجاتا ہے۔
(بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

اس حدیث پاک میں غلبۂ تقدیر کا بیان ہے کہ سعید وشقی ہونا مقدر ہے اورتقدیر کا لکھاہوا غالب آتا ہے، پس اس حدیث سے بھی قدریہ اور معتزلہ ہردوکی تردید ہوجاتی ہے اور یہ مراحل تقدیر میں سے جوابتداء بحث میں ذکر کئے گئے تھے چوتھے مرحلہ کا بیان ہے۔

انسان کی تخلیق کے مراحل:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں تخلیق انسان کے مراحل بیان فرمائے کہ اس کی ماں کے رحم میں باپ کے نطفے کو چالیس دن تک نطفہ کی صورت میں جمع رکھاجاتا ہے اس کے بعد اربعین ثانی میں علقہ یعنی خون بستہ ہوجاتا ہے۔

سوال یہ ہوتا ہے کہ اربعین اول میں نطفہ نطفہ ہی رہا کیا اس میں تغیرنہیں آیا؟ جواب یہ ہے کہ نطفہ پہلے چالیس دن تک نطفہ ہی رہا تا کہ اس کے اندر خمیر پیدا ہو یعنی آئندہ پیش آنے والے انقلابات وتغیرات کوقبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔

پھر تیسرے چلہ میں گوشت کا ٹکڑا بن جاتا ہے، ملاعلی قاری فرماتے ہیں کہ اسی تیسرے چلہ میں اعضاء اور شکل وصورت بنتے ہیں، پھر چوتھے اربعین میں اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتے ہیں جو چار باتیں لکھتا ہے اس کا عمل، اس کی عمر، اس کا رزق اور شقی ہونا یا سعید ہونا، اور اسی میں پھر نفخ روح ہوتا ہے، علماء نے لکھا ہے کہ چوتھے چلہ میں دس دن گذرنے پر جب بچہ چار ماہ دس دن کا ہو جاتا ہے اس وقت نفخ روح ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دوصفات: صادق ومصدوق:

هو الصادق المصدوق: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صفتیں عبداللہؓ بن مسعود نے ذکر کی ہیں مصدوق ہونا اور صادق ہونا، "مصدوق" ایسا شخص جس کو سچی باتیں بتائی جاتی ہوں اور پہنچائی جاتی ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آسمان سے سچی باتیں آتی تھیں، "صادق" سچ بولنے والا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے احکام بتائے ان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں، بعض نے کہا کہ مصدوق مُصدَّق کے معنی ہے یعنی جس کی تصدیق کی جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام باتوں کی تصدیق کی گئی ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے یہ دوصفات بطور فخر کے یا بطور استلذ اذ کے ذکر فرمائی ہیں۔(۱)

يجمع في بطن أمه: راوی حدیث حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس روایت کی تفسیر میں منقول ہے انہوں نے فرمایا کہ نطفہ جب رحم میں پہنچتا ہے تو اللہ کو اگر تخلیق بشر منظور ہوتی ہے تو مادہ منویہ عورت کے رگ وریشہ میں سرایت کر جاتا ہے، ایک چلہ اسی حال میں گذرتا ہے پھر وہ مادہ عروق اور رگوں سے رحم میں اتر جاتا ہے اور رحم کی حرارت سے اس میں تغیر ہونے لگتا ہے حتی کہ دوسرے چلہ میں دم بستہ بن جاتا ہے۔(۲)

متعدد مراحل میں تخلیق کی وجہ:

أربعين يوما......الخ: بچہ کی پیدائش تدریجاً ہوتی ہے حالانکہ حق تعالیٰ شانہ دفعۃً پیدا فرمانے پر بھی قادر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تا کہ انسان اپنی حالت پر غور کرے کہ کن مراحل سے گذر کر وہ خوبصورت ذی شعور انسان بنا، اپنی پچھلی حالت ذہن میں ہوگی تو بڑائی اور تکبر میں مبتلا نہ ہوگا، یہ تدریج تخلیق کی ایک بڑی وجہ ماں کے حال پر ترحم بھی ہے کہ بچہ جب آہستہ آہستہ بڑھے گا تو ماں کی قوت برداشت بھی آہستہ آہستہ بڑھے گی پھر ماں کو بچہ کا سنبھالنا آسان ہو جائے گا۔

---

(۱) فتح الإله ۱/ ۴۳۱.

(۲) شرح المشكاة للطيبي ۱/ ۲۳۷.

تقدیر سے متعلقہ چار باتوں کی کتابت اور اس کی نوعیت:

ثـم يبعـث الله إليه ملكاً: پھر اس کی تقدیر سے متعلقہ ان چار باتوں کو لکھنے کے لئے جن کا تذکرہ اوپر آ چکا ہے اللہ ایک فرشتہ بھیجتا ہے، اور بعض علماء نے فرمایا کہ یہ چار باتیں مؤکل بالرحم (محافظِ حمل) فرشتہ ہی لکھتا ہے اور بھیجنے سے مراد امر یعنی اس کو حکم دینا ہے۔

یہ چار باتیں کہاں لکھی جاتی ہیں؟ اس میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) امام مجاہد نے فرمایا فرشتہ ایک کاغذ میں لکھتا ہے اور ایک تعویذ سا بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیتا ہے جو لوگوں کو نظر نہیں آتا، جیسا کہ ارشاد ہے: ''وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِيْ عُنُقِهِ ''(۱) اور ہر شخص کے عمل کا انجام ہم نے اس کے گلے سے چمٹا دیا ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ دونوں آنکھوں کے درمیان پیشانی پر چاروں باتیں لکھی جاتی ہیں۔

(۳) ہتھیلی میں ان باتوں کو لکھا جاتا ہے۔

سوال و جواب:

ثـم يـنـفـخ فيـه الـروح: اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تقدیر لکھی جاتی ہے پھر نفخ روح ہوتا ہے جبکہ بیہقی کی ایک روایت سے اس کا عکس ثابت ہوتا ہے؟(۲)

جواب: یہ حدیث راجح ہے، کیونکہ یہ روایت شیخین کی ہے۔

سوال: جب ہر چیز لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے تو اب چار باتوں کو لکھے جانے کے کیا معنی؟

جواب: کتابت تقدیر کے مختلف مراحل ہیں: (۱) کتابت سابقہ (۲) کتابت متوسطہ (۳) کتابت لاحقہ، اول سے مراد لوح محفوظ کی کتابت اور ثانی سے مراد ہر شخص کے مقدرات کو ممتاز کرنے کے لئے نفخ روح سے قبل کی کتابت ہے اور کتابت لاحقہ سے مراد سال بھر کے مقدرات کو لیلۃ القدر میں بھی لکھا جانا ہے اس روایت میں کتابت متوسطہ کا ذکر ہے،(۳) ابتداء بحث میں بھی یہ بات آ چکی ہے۔

---

(۱) من سورة إسراء:١٣.

(٢) المرقاة شرح المشكاة ١/٢٤٨.

(٣) المرقاة ١/٢٤٧.

سوال: اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۰دن کے بعد تقدیر لکھی جاتی ہے اور بعض روایات میں ۴۲ دن کے بعد تقدیر کا لکھا جانا وارد ہے، ملا علی قاری نے بحوالہ صحیح مسلم اس روایت کو ذکر کیا ہے،(۱) اس کے دو جواب ہیں:

(۱) ابن مسعودؓ کی روایت راجح ہے اس لئے کہ یہ متفق علیہ ہے۔

(۲) اختلاف جنین پر محمول ہے، کہ بعض بچوں کی تقدیر ۴۲ دن کے بعد لکھی جاتی ہے اور بعض کی ۱۲۰دن کے بعد۔

تقدیر غالب آ کر رہتی ہے:

حتی مایکون بینه و بینها الا ذراع: مطلب یہ ہے کہ بندہ کا عمومی حال تو یہ ہے کہ سعید ہے تو اس کی زندگی نیکی والی گذرتی ہے نیکی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے اور شقی ہے تو شقاوت والے اعمال پر رہتا ہے انہیں پر مرتا ہے، البتہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی بھر ایمان واعمال صالحہ پر رہا حتی کہ ظاہری اعمال کے لحاظ سے جنت کے نہایت قریب ہوجاتا ہے لیکن تقدیر میں اس کا شقی ہونا لکھا ہے، پس اس کی تقدیر اس پر غالب آتی ہے اور اخیر میں کفر ومعاصی میں مبتلا ہوجاتا ہے اور کفر ومعاصی پر ہی مرتا ہے اور جہنم میں داخل ہوتا ہے، کبھی اسکا عکس ہوتا ہے کہ زندگی بھر اہل جہنم کے اعمال (کفر ومعاصی) پر رہا مگر اس کا جنتی ہونا مقدر ہوتا ہے، بالآخر اس کی تقدیر اس پر غالب آتی ہے، جب اس کی زندگی ہاتھ بھر رہ جاتی ہے تو جنتیوں کے اعمال (ایمان واعمال صالحہ) میں لگ جاتا ہے اسی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے جنت میں داخل ہوجاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کے حالات خواہ کتنے ہی اچھے ہوں عجب میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے،(۲) اسی لئے حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ: میں اپنے آپ کو ہر مسلمان سے بدتر سمجھتا ہوں حالاً اور کافر سے بدتر سمجھتا ہوں مآلاً، کیونکہ اعتبار خاتمہ کا ہے اور خاتمہ کا حال معلوم نہیں، ہمارے حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے سنایا تھا کہ گنگوہ میں ایک بنیا تھا، مسجد کے پڑوس میں اس کا مکان تھا، وہ مسجد کے چراغ کے لئے ہر جمعرات کو

(۱) المرقاة ۱/۲۴۷.

(۲) المرقاة ۱/۲۴۹.

تیل دیا کرتا تھا، ایک مرتبہ جمعہ کے روز مسجد میں آیا اور لوگوں سے کہا کہ مسلمان ہونا چاہتا ہوں مجھے کلمہ پڑھاؤ، اس کو کلمہ پڑھایا گیا، اس کے بعد اس نے پنجوقتہ نمازیں پابندی کے ساتھ پڑھنی شروع کیں، آئندہ ہفتہ جب جمعہ کا دن آیا اس نے جمعہ کی نماز پڑھی اور اس کا انتقال ہوگیا، اس واقعہ سے اس حدیث کا مطلب خوب واضح ہوجاتا ہے۔

قوله: ليعمل بعمل أهل النار: معلوم ہوا کہ جہنم کا داخلہ صرف تقدیر کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ سبب کے درجہ میں اس کا مدار اعمال پر بھی ہوتا ہے لہذا انسان کے جیسے اعمال ہوں گے ویسا اس کے حق میں فیصلہ ہوگا۔

۷۷/۵: وعَنْ سَهْلِ بنِ سَعْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم:
"إِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ عَمَلَ أَهْلِ النَّارِ وَإِنَّهُ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، وَيَعْمَلُ عَمَلَ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَإِنَّهُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ، وَإِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ" (متفق علیہ)(۱)

ترجمہ: حضرت سہل بن سعدؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندہ جہنمیوں والے کام کرتا رہتا ہے حالانکہ وہ جنتیوں میں سے ہوتا ہے اور جنتیوں والے کام کرتا رہتا ہے حالانکہ وہ جہنمیوں میں سے ہوتا ہے سوائے اس کے نہیں کہ اعمال کا اعتبار آخری حالت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

احوال سہل بن سعد:

نام سہل بن سعد الساعدی الانصاری، کنیت ابوالعباس ہے، ان کا نام پہلے حزن تھا بمعنی مشکل چیز، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام سہل سے بدل دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی عمر میں برکت کی دعا فرمائی تھی، چنانچہ ان کی عمر نوے سال سے زیادہ ہوئی، ۹۱ھ میں مدینہ منورہ میں ان کا انتقال ہوا، ایک قول کے مطابق مدینہ میں یہ آخری صحابی ہیں(۲)

(۱) أخرجه البخاري في أربعة مواضع، كتاب الجهاد، باب لايقول فلان شهيد ۱/۴۰۶، برقم ۲۸۱۱، وأيضا" كتاب المغازي وباب غزوة خيبر ۲/۶۰۴ برقم ۴۰۴۹، و ۲/۶۰۵، برقم ۴۰۵۴، وأيضا" كتاب الرقاق، باب الأعمال بالخواتيم ومايخاف منها ۲/۹۷۷، برقم ۶۳۵۴ وكتاب الإيمان، باب بيان غلظ تحريم قتل الانسان الخ ۱/۷۲ ومسلم، كتاب القدر، باب كيفيه خلق الآدمي في بطن أمه الخ ۲/۳۳۴.

(۲) الإصابة ۳/۱۶۷.

اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے:

اس حدیث کا بھی مضمون حدیث سابق کی طرح ہے کہ اچھے اور برے اعمال میں انسان کی آخری حالت معتبر ہوتی ہے، خاتمہ کے وقت میں ایمان واعمال ہوں تو جنت کا ورنہ جہنم کا مستحق ہوتا ہے، خواتیم ''خاتمۃ'' کی جمع ہے، اس کا موصوف محذوف ہے :ای **الحالة الخاتمة** یعنی آخری حالت۔

فوائد حدیث:

اس روایت سے کئی باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) فرقۂ قدریہ اور معتزلہ کا رد ہوا کیونکہ جب جنتی وجہنمی ہونا مقدر ہے تو اعمال بھی مخلوق ومقدر ہیں، اور بندہ تقدیر کے مطابق آخری وقت میں اچھے یا برے اعمال کی طرف لوٹتا ہے۔

(۲) اعمال صالحہ پر مواظبت کی ترغیب ثابت ہوئی، تا کہ یہ اعمال صالحہ آخری حالت تک برقرار رہیں۔

(۳) آدمی کو عجب وتکبر میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اعتبار خاتمہ کا ہے اور خاتمہ کا بندہ کو علم نہیں ہے۔

(۴) اللہ کا اپنے بندوں پر کمال تصرف ثابت ہوا۔

(۵) کسی کو حتمی طور پر جنتی یا جہنمی کہنا درست نہیں ہے، کیونکہ آخری حالت کا علم نہیں ہے۔

۷۸/۶ : وعن عائشةؓ قَالَتْ : دُعِيَ رَسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم إلىٰ جَنَازَةِ صَبِيٍّ مِنَ الأَنْصَارِ، فَقُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! طُوْبىٰ لِهٰذَا عُصْفُوْرٌ مِنْ عَصَافِيْرِ الْجَنَّةِ، لَمْ يَعْمَلِ السُّوْءَ، وَلَمْ يُدْرِكْهُ فَقَالَ: أَوَغَيْرُ ذٰلِكَ يَاعَائِشَةُ! إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ لِلْجَنَّةِ أَهْلاً، خَلَقَهُمْ لَهَا وَهُمْ فِيْ أَصْلابِ آبَائِهِمْ، وَخَلَقَ لِلنَّارِ أَهْلاً، خَلَقَهُمْ لَهَا وَهُمْ فِيْ أَصْلابِ آبَائِهِمْ . (رواه مسلم)(۱)

ترجمه :حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ایک انصاری بچہ کے جنازہ کے لئے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا گیا میں نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بچہ کے لئے خوشحالی ہے یہ تو جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے، جس نے کوئی برا کام نہیں کیا اور نہ برائی کے

(۱) أخرجه مسلم في كتاب القدر، باب معنى كل مولود يولد على الفطرة وحكم موتى أطفال الكفار وأطفال المسلمين ۲/ ۳۳۷.

زمانہ (بلوغ) کو پایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عائشہ! کیااس کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا؟ (یعنی اس کے جنتی ہونے کا جزم ویقین نہ کرو) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے لئے کچھ لوگوں کو پیدافرمایا جب کہ وہ اپنے باپوں کی پشت میں تھے اور جہنم کے لئے بھی کچھ لوگوں کو پیدا فرمایا جب کہ وہ اپنے باپوں کی پشت میں تھے۔ (مسلم)

تشریح حدیث

احوال حضرت عائشہؓ:

آپ ام المؤمنین ہیں اورازواج مطہرات میں بلند مرتبہ رکھتی ہیں، ان کے والد حضرت ابوبکرؓ اوران کی والدہ ام رومان بنت عامر بن عویمر ہیں، ہجرت سے سات سال قبل ولادت ہوئی، سات سال کی عمر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا، نوسال کی عمر میں رخصتی ہوئی، اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت صرف ۱۸سال کی عمر تھی، مگراس قلیل عرصہ میں بہت سے علوم حاصل کئے حتی کہ علماء فرماتے ہیں کہ ثلث دین تنہاانہیں کے واسطے سے امت کو پہنچا ہے، ان کا شمار فصحاء عرب میں ہوتا ہے، آپ اشعارِ عرب اورمحاورۂ عرب سے بھی واقف تھیں، اور ۵۷ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال ہوا، ان کی مرویات کی تعداد (۲۲۱۰) ہے۔ (۱)

بچوں کی نجات کے بارے میں حضرت عائشہؓ کے ایک خیال کی اصلاح:

دعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی جنازۃ الخ :ایک انصاری بچہ کا انتقال ہواحضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم کونماز جنازہ پڑھانے کے لئے بلایا گیا، حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ یہ بچہ تو جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے، بچہ کو چڑیا کے ساتھ تشبیہ دی یاتو گناہوں سے معصوم ہونے اورغیر مکلّف ہونے میں یاپھرجس طرح چڑیاہرجگہ گھومتی پھرتی ہے اسی طرح یہ بچہ جنت میں جانے کے بعد جنت میں جہاں چاہے گا گھومے گا، حضرت عائشہؓ نے پھراپنی بات کومدلل کیا کہ اس نے نہ برائی کی اورنہ برائی کا زمانہ پایا کہ بالغ ہونے سے پہلے ہی وفات پا گیا، پس یہ جنتی ہے۔

أو غیر ذلک:اس میں ہمزہ استفہامیہ ہے اورواؤ عاطفہ ہے اوردرمیان میں ایک فعل محذوف ہے

(۱)سیر أعلام النبلاء ۲ /۱۳۸۔۲۰۰، والإصابة ۷ /۱۸۷—۱۹۰.

تقدیر عبارت اس طرح ہے: اتعتقدین ماقلت؟ والحق غیر ذلک ۔یعنی جوتم نے کہا کیا تمہیں اس پر جزم ہے حالانکہ حق کچھ اور ہے، وہ یہ کہ یقینی طور پر کسی شخص کو جنتی نہ کہا جائے کیونکہ اللہ نے لوگوں کے جنتی وجہنمی ہونے کا فیصلہ اس وقت کر دیا تھا جب کہ وہ اپنے آباء کی صلب میں تھے۔ (۱)

ایک اشکال اوراس کے جوابات:

اس روایت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اطفال مسلمین کا جنتی ہونا یقینی نہیں ہے، حالانکہ ان کا جنتی ہونا علماء کے درمیان متفق علیہ ہے، امام نوویؒ نے نیز ابن حجر مکی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے؟

اس کے کئی جواب ہیں: (۱) یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم نہیں دیا گیا تھا کہ اطفال مسلمین جنتی ہیں یہ علم بعد میں حاصل ہوا۔

(۲) اطفالِ مسلمین کا جنتی ہونا اجمالی طور پر متفق علیہ ہے لیکن تعیین کے ساتھ اور یقینی طور پر کسی خاص شخص کے بارے میں بچہ ہو یا بڑا جنتی ہونے کا حکم لگانے سے آپ علیہ السلام نے منع فرمایا کہ یہ بات احتیاط کے خلاف ہے، نیز سامعین کو اس قائل شخص کے متعلق اس کے اس طرح حکم لگانے سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ گویا وہ اپنے آپ کو عالم الغیب سمجھ رہا ہے۔ (۲)

(۳) بچہ کا جنت میں جانا والدین کے مؤمن ہونے پر موقوف ہے اور والدین کا حال معلوم نہیں کہ ان کا انجام کیا ہو، پس حتمی حکم لگانا درست نہیں۔

اس حدیث سے بھی تقدیر کا ثبوت ہوا، کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کا جنتی یا جہنمی ہونا دنیا میں آنے سے قبل مقدر کر رکھا ہے۔ (۳)

۷۹/۷: وَعَنْ عليٍّ قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم "مَامِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ كُتِبَ مَقْعَدُهُ مِنَ النَّارِ وَمَقْعَدُهُ مِنَ الْجَنَّةِ" قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَفَلَانَتَّكِلُ عَلٰى كِتَابِنَا وَنَدَعُ الْعَمَلَ؟ قَالَ: "اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَاخُلِقَ لَهُ؛ أَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ السَّعَادَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ السَّعَادَةِ، وَأَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الشَّقَاوَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ الشَّقَاوَةِ،

(۱) المرقاة ۱/۲۵۱.
(۲) المرقاة ۱/۲۵۱.
(۳) المرقاة ۱/۲۵۱.

ثُمَّ قَرَأَ "فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى "الآية، (متفق علیہ)(۱)

ترجمہ : حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص کا ٹھکانا اللہ تعالی نے جنت اور دوزخ میں لکھ دیا ہے، (یعنی یہ متعین ہوچکا کہ کون لوگ جنتی ہیں اور کون لوگ جہنمی ہیں) صحابہ کرامؓ نے عرض کیا "یارسول اللہ! کیا ہم اپنے نوشتۂ تقدیر پر بھروسہ کرلیں اور عمل کرنا چھوڑ دیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم عمل میں لگے رہو، اس لئے کہ جو شخص جس چیز کے لئے پیدا کیا گیا ہے اسے اس کے لئے آسان کردیا جاتا ہے، جو شخص نیک بختوں میں سے ہوتا ہے اس کے لئے نیک بختی کے اعمال آسان کردیئے جاتے ہیں اور جو شخص بدبختوں میں سے ہوتا ہے اس کے لئے بدبختی کا عمل آسان کردیا جاتا ہے اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی (ترجمہ) پھر جس نے اللہ کے راستہ میں مال دیا اور تقوی اختیار کیا اور اچھی بات کی تصدیق کی تو ہم اس کے لئے آسان کردیں گے ایسی خصلت جو راحت ویسر (دخول جنت) کا ذریعہ بنجائے"

تشریح حدیث

تعارف حضرت علیؓ:

حضرت علیؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں، ابوالحسن کنیت ہے، بچوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں، ایمان لانے کے وقت ان کی عمر علی اختلاف الاقوال ۸ یا ۱۰ یا ۱۵ سال کی تھی، تمام غزوات میں شریک رہے سوائے غزوۂ تبوک کے، کہ اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل وعیال کی حفاظت کے لئے ان کو مدینہ طیبہ میں چھوڑ دیا تھا، منافقین نے ان سے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو

(۱) أخرجه البخاری فی تسع مواضع، كتاب الجنائز، باب موعظة المحدث عندالبقر، ۱/۱۸۲، برقم ۱۳٤٦، وكتاب التفسير، باب قوله فأما من أعطى واتقى ۲/۷۳۷، برقم ٤۷٥٥ وباب قوله وصدق بالحسنى ۲/۷۳۸، برقم ٤۷٥٦، وكتاب الأدب، باب الرجل ينكت الشئ بيده إلى الأرض ۲/۹۱۸ برقم ٥۹۷٦ وكتاب القدر، باب قوله وكان أمر الله قدراً مقدوراً ۲/۹۷۷ برقم ٦۳٥۲، وكتاب التوحيد، باب قوله ولقد يسرنا القرآن للذكر فهل من مدكر ۲/۱۱۲۷ برقم ۷۲٥۱، ومسلم كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي فى بطن أمه وكتابة رزقه الخ ۲/۳۳۳ برقم ۲٦٤۷.

کمزور سمجھ کر عورتوں میں چھوڑ دیا ہے؟اس پر ان کو جوش آیا اور چل دیئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملے اورعرض کیا کہ آپ نے مجھے کمزور سمجھ کر چھوڑا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اما ترضیٰ ان تکونَ منّی بمنزلۃِ ھارونَ مِنْ موسیٰ'' کہ تمہارا میرے بعد میں یہاں رہنا ایسا ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر جانے کے وقت اپنے بھائی حضرت ہارون کو چھوڑا تھا۔

اکثر غزوات میں جھنڈا ان ہی کے ہاتھ میں رہتا تھا، نہایت شجاع اور بہادر تھے، آپ کے مناقب اور فضائل اس قدر کثرت سے وارد ہیں کہ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ حضرات صحابہ میں جس قدر مناقب وفضائل حضرت علیؓ کے بارے میں ہیں اتنے کسی اور صحابی کے بارے میں وارد نہیں ہیں، غزوۂ خیبر کے موقعہ پر ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں صبح کو جھنڈا اس شخص کے ہاتھوں میں دونگا جو اللہ ورسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ ورسول اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کے ہاتھ پر یہ قلعہ فتح ہوگا، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اس دن کے سوا کبھی مجھے امارت کی طلب نہیں ہوئی، لیکن صبح کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو جھنڈا اعطا فرمایا، آپ کی خلافت چار سال نو مہینے چند ایام رہی، ۱۷ر رمضان ۴۰ھ میں ایک خارجی شخص عبدالرحمٰن بن ملجم نے نماز کی حالت میں ان کو زخمی کیا اور تین دن بعد کوفہ میں ان کی وفات ہوگئی، حضرت حسنؓ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔(۱)

تقدیر کے بعد عمل کی کیا ضرورت؟ اس خیال کی اصلاح:

مامنکم من احد إلاو قد کتبمقعده من النار و مقعده من الجنة: شراح نے فرمایا کہ یہاں ''واؤ'' اَوْ کے معنی میں ہے ورنہ معنی درست نہیں ہوں گے، چنانچہ بعض روایات میں ''اَوْ'' کا لفظ ہی آیا ہے، اور بعض نے کہا کہ واؤ کو اصل معنی (جمع کے معنی) میں لینا بھی صحیح ہے، کیونکہ حق تعالیٰ شانہ نے ہر شخص کا ٹھکانہ جنت میں بھی بنایا ہے اور جہنم میں بھی، پھر وہ جیسا عمل کرتا ہے اسی کے مطابق دونوں میں سے کسی ایک جگہ میں اس کو رکھا جاتا ہے۔

افلانتکل و ندع العمل: صحابہ نے عرض کیا کہ جب جنتی وجہنمی ہونا مقدر ہے تو ہم تقدیر پر بھروسہ کر کے عمل کو چھوڑ دیں، کیونکہ ہمارا عمل اللہ کے فیصلہ کو بدل نہیں سکتا، پھر عمل کا کیا فائدہ؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم

(۱)الإصابة ٤/ ٤٦٤.

نے فرمایا کہ اعمال میں لگے رہو، کیونکہ آدمی جس چیز کے لئے پیدا کیا گیا اسی کے اعمال اس کے لئے آسان کردیئے جاتے ہیں، پس سابقہ قضاء وقدر ترک عمل کا باعث نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ اگرچہ جنتی وجہنمی ہونا مقدر ہے مگر اس کا ظاہری سبب اعمال ہیں اور دنیا دارالاسباب ہے لہٰذا اسباب بھی ضروری ہیں، پس اپنے اختیار سے سعادت کی علامات اور سعادت کے اعمال میں مشغول رہو تاکہ سعادت والے اعمال پر خاتمہ ہو۔

۸۰/۸: وَعَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ صلی الله علیه وسلم "إِنَّ اللّٰهَ کَتَبَ عَلَی ابْنِ آدَمَ حَظَّهُ، مِنَ الزِّنَا، أَدْرَکَ ذٰلِکَ لَامَحَالَةَ، فَزِنَا الْعَیْنِ النَّظْرُ، وَزِنَا اللِّسَانِ الْمَنْطِقُ، وَالنَّفْسُ تَمَنّٰی وَتَشْتَهِیْ، وَالْفَرْجُ یُصَدِّقُ ذٰلِکَ وَیُکَذِّبُهُ" (متفق علیہ)(۱)

وفی روایةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ: "کُتِبَ عَلَی ابْنِ آدَمَ نَصِیْبُهُ مِنَ الزِّنَا، مُدْرِکٌ ذٰلِکَ لَامَحَالَةَ، الْعَیْنَانِ زِنَاهُمَا النَّظْرُ، وَالْأُذُنَانِ زِنَاهُمَا الاسْتِمَاعُ، واللِّسانُ زِنَاهُ الْکَلَامُ، وَالْیَدُ زِنَاهَا الْبَطْشُ، وَالرِّجْلُ زِنَاهَا الْخُطَا، وَالْقَلْبُ یَهْوٰی وَیَتَمَنّٰی وَیُصَدِّقُ ذٰلِکَ الْفَرْجُ وَیُکَذِّبُهُ"

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے مقدر میں زنا کا کچھ حصہ لکھدیا ہے (پھر جس کے مقدر میں جتنا لکھا جاچکا ہے) وہ ضرور اس کا ارتکاب کرے گا، آنکھوں کا زنا نامحرم کی طرف دیکھنا ہے اور زبان کا زنا شہوت کی باتیں کرنا ہے اور نفس آرزو وخواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس آرزو اور خواہش کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب (بخاری ومسلم)

اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ آدمی کی تقدیر میں زنا کا جتنا حصہ لکھ دیا گیا ہے اس کو وہ ضرور عمل میں لائے گا آنکھوں کا زنا (نامحرم عورتوں کی طرف) دیکھنا ہے، کانوں کا زنا (شہوت انگیز) باتیں سننا ہے اور زبان کا زنا (شہوت کی) باتیں کرنا ہے اور ہاتھ کا زنا نامحرم عورت

(۱) أخرجه البخاری فی موضعین: کتاب الاستیذان، باب زنا الجوارح دون الفرج ۲/۹۲۲ برقم ۶۰۰۲، وکتاب القدر، باب قول الله تعالیٰ وحرام علی قریة أهلکناها انهم لایرجعون ۲/۹۷۸، ومسلم کتاب القدر، باب قدر علی ابن آدم حظه من الزنا وغیره ۲/۳۳۶ برقم ۲۶۵۷

کو برے ارادہ سے پکڑنا ہے اور پاؤں کا زنا (بدکاری کی طرف) جانا ہے اور دل خواہش وآرزو کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق وتکذیب کرتی ہے۔

تشریح حدیث

گناہ اوراسباب گناہ بھی مقدر:

اس حدیث میں بھی اعمال کے مقدر ہونے کا بیان ہے کہ بندوں کے اعمال تقدیر کے ماتحت ہیں، چنانچہ فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ نے انسان کے حق میں زنا کا جوحصہ مقدر فرمادیا ہے وہ ضرور اس کا مرتکب ہوتا ہے۔

علماء نے فرمایا ہے کہ زنا کی دوقسمیں ہیں: (۱) حقیقی (۲) حکمی، زنا حقیقی تو ہے عضو مخصوص کو عضو مخصوص میں داخل کرنا اور زنا حکمی؛ مقدماتِ زنا واسباب زنا ہیں، مثلاً آنکھ سے غیرمحرم کو دیکھنا یا زنا سے متعلق گفتگو کرنا یا مقام زنا کی طرف چلنا یا قلب سے غیرمحرم کی تمنا وخواہش کرنا، یہ تمام زنا حکمی ہیں۔

اس حدیث کے مطابق حقیقی وحکمی ہرطرح کا زنا مقدر ہے، البتہ حق تعالیٰ شانہ نے بندہ کو بااختیار پیدا کیا ہے بندہ جوکرتا ہے اپنے اختیار سے کرتا ہے پس مکلّف ہونے کے لحاظ سے انسان پرلازم ہے کہ حقیقی وحکمی ہردوطرح کے زنا سے بچے، ہردوکا ارتکاب حرام ہے، البتہ حکمی زنا صغائر میں شمار ہے اور حقیقی زنا کبائر میں داخل ہے۔

سوال: یہاں حدیث میں ابن آدم کے عموم میں حضرات انبیاء علیہم السلام داخل ہیں یانہیں؟

جواب: بعض نے کہا کہ انبیاء علیہم السلام داخل نہیں ہیں، کیونکہ انبیاء معصوم ہیں، اور بعض نے کہا کہ ابن آدم کے عموم میں سب داخل ہیں، لیکن دلائل عصمت کی وجہ سے وہ اس سے خارج ہوں گے، دونوں قولوں کا حاصل ایک ہی ہے، کہ انبیاء علیہم السلام کے لئے یہ حکم نہیں ہے، پس ''ابن آدم'' سے مراد جنس آدم ہے نہ کہ جمیع افراد۔

والفرج یصدق ذلک: ''ذالک'' کے مشار الیہ میں دواحتمال ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ اس کا مشار الیہ اخیر جملہ ہے یعنی تمنائے قلب اور خواہش قلب کہ ہرآدمی کے

قلب میں غیرمحرم کی خواہش ہوتی ہے، لیکن یہ خواہش کچی ہے یا پکی، اس کی تصدیق شرم گاہ کرتی ہے کہ اگرزنا میں مبتلا ہوگیا تو مطلب یہ ہے کہ خواہش سچی تھی اوراگرزنا سے بچارہا تو مطلب یہ کہ خواہش زنا کچی تھی۔

(۲) بعض نے کہا کہ ''ذلک'' کا مشار الیہ مذکورہ تمام جملے ہیں یعنی یہ سب مقدماتِ زنا ہیں، انسان کا نفس زناء حقیقی کی جوکبیرہ گناہ ہے تمنا کرتا ہے اب آگے آدمی زنا میں مبتلا ہوجائے تو گویا شرم گاہ نے ان گناہوں کے کبیرہ ہونے کی تصدیق کردی ورنہ یہ گناہ صغیرہ کی حدتک محدود رہیں گے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ تقدیر الٰہی انسان کا مکمل احاطہ کئے ہوئے ہے، اورصرف معروف گناہ یا عبادات ہی مقدر من اللہ نہیں ہیں بلکہ ان کے مقدمات اورعوامل بھی مقدر من اللہ ہیں۔

۸۱/۹: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ أَنَّ رَجُلَيْنِ مِنْ مُزَيْنَةَ قَالاَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَرَأَيْتَ مَايَعْمَلُ النَّاسُ الْيَوْمَ وَيَكْدَحُوْنَ فِيْهِ؟ أَشَيْءٌ قُضِيَ عَلَيْهِمْ وَمَضٰى فِيْهِمْ مِنْ قَدْرٍسَبَقَ، أَوْفِيْمَا يَسْتَقْبِلُوْنَ بِهِ مِمَّا أَتَاهُمْ بِهِ نَبِيُّهُمْ وَثَبَتَتِ الْحُجَّةُ عَلَيْهِمْ؟ فَقَالَ: ''لاَ، بَلْ شَيْءٌ قُضِيَ عَلَيْهِمْ وَمَضٰى فِيْهِمْ، وَتَصْدِيْقُ ذٰلِکَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ: وَنَفْسٍ وَمَاسَوَّاهَا، فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا'' (رواہ مسلم) (۱)

ترجمہ: حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ: ایک مرتبہ قبیلہ مزینہ کے دوشخص (آپ علیہ الصلوۃ والسلام کی خدمت میں) حاضرہوئے اورعرض کیا یارسول اللہ! ہمیں یہ بتائیے کہ آج (دنیامیں) لوگ عمل کرتے ہیں اوراعمال کی کوشش میں لگے رہتے ہیں کیایہ وہی چیز ہے جس کا فیصلہ ہوچکاہے اورنوشتۂ تقدیربن چکاہے، یایہ عمل ان افعال میں سے ہے جو(لوگوں سے) آئندہ (زمانہ میں صادر) ہونے والے ہیں اورجن کوانکے نبی لیکرآئے ہیں (اورجن کے ذریعہ) لوگوں پر حجت قائم ہوئی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں بلکہ یہ وہی شے ہے جس کا فیصلہ ہوچکاہے اورنوشتہ تقدیربن چکاہے اوراس کی تصدیق قرآن کریم کی اس آیت سے ہوتی ہے: ''وَنَفْسٍ وَّمَاسَوّٰهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا'' یعنی قسم ہے انسانی جان کی اوراس کی جس نے اس کوسنوارا، پھراس کے دل میں بدی اورنیکی کی بات ڈالدی۔

(۱) أخرجه مسلم، كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمى الخ ۲/۳۳٤.

تشریح حدیث

احوال عمران بن حصین:

عمران بن حصین نام ہے، ابونجید کنیت ہے، فقہاء اور اجلۂ صحابہ میں سے ہیں، یہ اپنے والد کے ہمراہ خیبر کے سال ۷ھ میں مسلمان ہوئے اور متعدد غزوات میں شریک ہوئے، اخیر میں بصرہ میں رہنے لگے تھے اور وہیں ۵۲ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ (۱)

تقدیر کے بارے میں دولوگوں کا سوال اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب:

ان رجلین من مزینة : قبیلۂ مزینہ کے دو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سوال کیا یارسول اللہ یہ بتائیں کہ لوگ جو اعمال اور کدو کاوش کرتے ہیں، اعمال اچھے ہوں یا برے، تو کیا یہ ایسی چیز ہے جس کے بارے میں پہلے فیصلہ ہو چکا ہے اور ازل میں وہ تقدیر میں لکھے جا چکے ہیں یا قضاء وقدر سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ ان اعمال کا صدور لوگوں سے آئندہ زمانہ میں اپنی طرف سے ایجاد کے طور پر ہوتا ہے، ماضی کی قضاء وقدر ان صدور کا باعث نہیں، کیونکہ اللہ نے حضرات انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ اعمال صالحہ کا حکم دیں اور اعمال قبیحہ سے روکیں، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعمال انسانوں کی ایجاد ہیں پہلے سے مقدر نہیں ہیں، اگر مقدر ہوتے تو نواہی سے روکنے اور اوامر کا حکم دینے کی ضرورت نہ تھی، وہ افعال حسبِ تقدیر لوگوں سے خود بخود صادر ہوتے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ یہ اعمال پہلے سے مقدر ہیں، جیسا کہ اس کی تصدیق اس آیت سے ہوتی ہے: ''**وَنَفْسٍ وَّمَاسَوّٰاهَا فَأَلْهَمَهَافُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا**'' اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نفس اور اس کے تسویہ پر فجور وتقوی کے الہام کو متفرع کیا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ نفس انسانی کے پیدائش کے وقت ہی فجور وتقوی بھی مقدر اور طے ہو چکا تھا، اور اسی کے حساب سے انسان اچھے و برے اعمال انجام دیتا ہے۔

لیکن یہاں یہ سوال ہوگا کہ جب بدی اور نیکی ابتداء آفرینش ہی میں مقدر کر دی گئی تو پھر انبیاء کی بعثت بے سود ہوئی، کیونکہ جو مقدر ہوا ہے وہی واقع ہوا ہوگا، پس انبیاء علیہم السلام کے انذار وتبشیر کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کو منجانب اللہ کسب اور اختیار عطا کیا گیا ہے اچھے یا برے کام کو اپنے

(۱) سیر أعلام النبلاء ۲ / ۵۰۸، والإصابة ٤ / ۷۹.

اختیار سے انجام دیتا ہے اس لئے اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا بالکل بجا اور مفید ہے اور بہ تقاضۂ عقل وشرع انتہائی ضروری ہے۔

تشریح الفاظ:

(یکدحون فیه) ای یسعون فی تحصیله بجهد، محنت اور مشقت سے کام کو انجام دینا **(أشيء قضی علیهم)** ''شیٔ'' مبتدا محذوف کی خبر ہے، وہ مبتدا ''ہو'' ضمیر ہے، **(من قدر سبق)** ''من'' تعلیلیہ ہے یعنی وہ اعمال بندوں سے سابق تقدیر کی وجہ سے صادر ہوتے ہیں **(أو فیما یستقبلون به)** ''الاستقبال بالعمل'' آئندہ زمانہ میں کسی کام کو انجام دینا، تقدیر عبارت یہ ہے: **اوهوشيء کائن فیما یستقبلون به.**

۸۲/۱۰: وَعَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنِّیْ رَجُلٌ شَابٌّ، وَأَنَا أَخَافُ عَلٰی نَفْسِیَ الْعَنَتَ، وَلاأَجِدُ مَاأَتَزَوَّجُ بِهِ النِّسَاءَ ، کَأَنَّهٗ یَسْتَأْذِنُهٗ فِي الاخْتِصَاءِ، قَالَ: فَسَکَتَ عَنِّیْ، ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِکَ، فَسَکَتَ عَنِّیْ، ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِکَ، فَسَکَتَ عَنِّیْ، ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِکَ، فَقَالَ النَّبِیُّ صلی الله علیه وسلم ''یَاأَبَاهُرَیْرَةَ! جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا أَنْتَ لَاقٍ، فَاخْتَصِّ عَلٰی ذٰلِکَ أَوْذَرْ'' (رواہ البخاری) (۱)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ! میں ایک جوان مرد ہوں اور میں اپنے نفس سے ڈرتا ہوں کہ میں بدکاری میں مبتلا نہ ہوجاؤں اور میرے اندر اتنی استطاعت نہیں ہے کہ کسی عورت سے شادی کرلوں، گویا حضرت ابوہریرہؓ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خصی ہونے کی اجازت چاہ رہے تھے، حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ: یہ سن کر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا، میں نے دوبارہ پھر وہی عرض کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر خاموش رہے، میں نے پھر عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر سکوت اختیار فرمایا، میں نے پھر اسی طرح عرض کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوہریرہ! قلم تقدیر خشک (لکھ کر فارغ) ہوچکا ہے ان اعمال سے جو تم سے صادر ہونے والے ہیں، پس جب یہ بات ہے تو تم خصی ہوجاؤ یا خصی ہونے کو ترک کردو اس سے فرق نہیں پڑتا۔ (بخاری)

(۱) أخرجه البخاري فی کتاب النکاح، باب مایکره من التبتل والخصاء ۲/۷۵۹، برقم ٤٨٨٥، وکتاب القدر، باب جف القلم علی علم الله ۲/۹۷٦ قبل رقم ٦٣٤٤ تعلیقاً.

تشریح حدیث

تقدیر؛ تدبیر سے نہیں ٹل سکتی:

قلت یارسول الله!انی رجل شاب الخ: ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں جوان ہوں اور زنا میں مبتلا ہونے کا خوف ہے اور مال میرے پاس ہے نہیں کہ نکاح کرلوں، کیونکہ ابوہریرہؓ اصحاب صفہ میں سے تھے جنھوں نے کسب کو چھوڑ کر اپنے آپ کو تحصیل علم کے لئے وقف کر دیا تھا، ابوہریرہؓ کے شاگرد فرماتے ہیں کہ ان کا مقصد خصی ہونے کی اجازت مانگنا تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ سکوت اختیار فرمایا، کہتے ہیں کہ میں نے دوبارہ سوال کیا پھر سکوت اختیار فرمایا، اسی طرح کئی مرتبہ سوال کیا، آپ نے ہر مرتبہ سکوت فرمایا، چوتھی مرتبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو گناہ تم سے سرزد ہونے والا ہے وہ مقدر میں لکھا جاچکا ہے قلمِ تقدیر اس کو لکھ کر خشک ہو چکا ہے۔

جفافِ قلم کنایہ ہے فراغت عن الکتابت سے (۱) یعنی قلمِ تقدیر اس گناہ کو لکھ کر فارغ ہو چکا ہے، لہٰذا خصی ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، جو مقدر ہے وہ ہر صورت میں واقع ہوگا، معلوم ہوا کہ بندوں کے اچھے و برے سب اعمال مقدر ہیں، لہٰذا معتزلہ کے خیال کی تردید ہوئی۔

فاختص علی ذلک : یہ موضع حال میں ہے **فاختص حال کون فعلک اوترکک واقعاً علی ماجف القلم.** (۲)

اور یہ امر اباحت واجازت کے لئے نہیں بلکہ زجر وتوبیخ کے لئے ہے، اور معنی یہ ہیں کہ جب سب اعمال مقدر ہو چکے ہیں تو خصی ہونے سے فائدہ کیا ہے؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے آیت کریمہ "**اعملوا ماشئتم**" میں امر برائے توبیخ ہے۔

> **۸۳ / ۱۱ : وعن عبدِاللّٰہِ بنِ عَمْرٍوؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم "اِنَّ قُلُوْبَ بَنِیْ آدَمَ کُلَّھَا بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ کَقَلْبٍ وَاحِدٍ یُصَرِّفُهٗ کَیْفَ یَشَاءُ، ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ الله صلی الله علیه وسلم "اَللّٰھُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّف**

(۱) المرقاۃ ۱ / ۲۵۹.

(۲) المرقاۃ ۱ / ۲۵۹.

قُلُوْبَنَا عَلٰی طَاعَتِکَ" (رواہ مسلم)(۱)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمام انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کی دوانگلیوں کے درمیان (اس طرح ہیں) جیسے ایک دل ہے، اس کو وہ جس طرح چاہتاہے پھیر دیتاہے، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ آپ دلوں کے پھیرنے والے ہیں ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔(مسلم)

تشریح حدیث

قلوبِ انسانی رحمٰن کی دوانگلیوں کے درمیان ہیں:

اس حدیث میں بھی تقدیر کابیان ہے کہ انسان کا قلب بھی اللہ کے قبضے میں ہے، بندہ کے اعمال وافعال میں اصل قدرت اور اصل مشیت حق تعالیٰ شانہ کی ہے، اعضاء وجوارح کوکسی کام کے کرنے کا قلب حکم دیتاہے اورتمام انسانوں کے قلوب اللہ کی دوانگلیوں کے درمیان میں ہیں مثل ایک قلب کے، اللہ ان کو جدھر چاہے پھیر دیتاہے۔

ان قلوب بنی آدم کلها: اس عموم میں اولیاء وانبیاء کرام بھی داخل ہیں، ہرشخص کے دل پراللہ کی حکومت اوراس کاقبضہ ہے، جس سے کسی کا استثناء نہیں ہے۔

یہاں سوال ہوتاہے کہ انسان کے تمام ہی اعضاء وجوارح اللہ کے قبضے میں ہیں، پھرقلب کی تخصیص اعضاء انسانی میں کیوں فرمائی گئی؟

جواب: یہ ہے کہ قلب اہم عضوہے اسی پرایمان وکفرکا مدارہے قلب کے تقاضہ سے ہی اعضاء وجوارح سے افعال کا صدور ہوتاہے اس لئے قلب کا تذکرہ خاص طور پرکیاگیا، پس باقی اعضاء اس حکم میں بطریق اولی داخل ہیں، لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کے تمام اعضاء وجوارح حتی کہ قلب بھی اللہ کے قبضہ وقدرت میں ہے اللہ ان میں جوچاہے تصرف فرماتاہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قلب کے علاوہ باقی اعضاء ایسے ہیں جن پردوسراشخص قبضہ کرسکتاہے لیکن قلب

(۱)أخرجه مسلم، کتاب القدر، باب تصریف الله تعالی القلوب کیف یشاء ۲/۳۳۵.

ایک ایسا عضو ہے جس پر کوئی دوسرا شخص قبضہ نہیں کرسکتا اور اللہ کی ذات ایسی قدرت والی ہے کہ اس کا قبضہ دل پر بھی ہے، پس قدرتِ الٰہی کے اظہار کے لئے قلب کی تخصیص کی گئی۔

متشابہات کے بارے میں جمہور امت کا موقف:

بین اصبعین من أصابع الرحمن: یہ جملہ متشابہات میں سے ہے، اس لئے کہ اصابع ذی جسم شخص کی ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ جسم سے منزہ ہیں، متشابہات دوطرح کے ہیں: (۱) ایک وہ جو قابل تاویل نہیں، مثلاً حروف مقطعات، (۲) دوسرے وہ جن کی تاویل ہوسکتی ہے۔

پھر اس نوع ثانی کے بارے میں امت میں دو جماعتیں ہیں: مفوّضین ومؤوّلین؛ مفوضین وہ حضرات ہیں جو ایسے متشابہات پر بلا کیف ایمان رکھتے ہیں، قابل تاویل ہونے کے باوجود ان کی کوئی تاویل نہیں کرتے، اور مؤولین وہ ہیں جو ان کلمات کا اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان مفہوم بیان کرتے ہیں، علماء متقدمین مفوضین میں سے ہیں، چنانچہ امام مالک سے منقول ہے: **لـه یـدٌ لا کأیدینا وله رِجلٌ لا کأرْجلنا** کہ اللہ کے ہاتھ وپیر ہیں مگر ہمارے ہاتھوں وپیروں کے مثل نہیں۔

لیکن پھر بعد میں فرق ضالہ نے ان متشابہات کا غلط استعمال کیا اور اپنے فاسد عقائد ان سے ثابت کرنا چاہے، چنانچہ مجسّمہ نامی فرقہ اسی جیسی نصوص کی بناء پر اللہ تعالیٰ کے لئے جسم ہونے کا قائل ہوا، اس لئے حضرات متأخرین نے ایسے الفاظ وکلمات کی تاویل کی اور ان کا ایسا مفہوم بیان کیا کہ جو اللہ کے شایان شان بھی ہو اور ان فرق ضالہ کے عقائد بھی اس سے ثابت نہ ہوں، چنانچہ یہاں ''اصابع'' سے مراد اللہ کا قبضہ وقدرت لیا گیا، اسی لئے یہ ترجمہ کیا گیا کہ بندوں کے قلوب اللہ کے قبضہ وقدرت میں ہیں کیونکہ حسًّا بھی جس پر قبضہ کیا جاتا ہے اس کے لئے یہی تعبیرات اختیار کی جاتی ہے، کہاجاتا ہے **فـلان بیـن اصبعـی أقَلّبه کیف شئتُ** یعنی فلاں میری انگلیوں میں ہے جس طرح چاہوں میں اس کو پلٹ سکتا ہوں، مطلب یہ کہ مجھے اس پر مکمل قابو وقدرت حاصل ہے۔ (۱)

اصبعین: علماء مؤولین کے مطابق تثنیہ کے صیغہ سے اشارہ ہے اللہ کی دو قسم کی صفات کی طرف

(۱) المرقاة ۱ / ۲٦۰، لمعات التنقیح ۱ / ۳٦۲.

یعنی صفات جلالی اور صفات جمالی، اللہ کی صفت جلالی کا مظہر جہنم ہے اس کے اثر سے انسان فسق و فجور میں مبتلا ہوتا ہے اور صفت جمالی کا مظہر جنت ہے اس کے اثر سے بندہ ایمان وطاعت میں مشغول ہوتا ہے، بعض نے کہا کہ اس سے اشارہ ہے دولموں کی طرف ایک لمہ ملکی اور دوسرے لمہ شیطانی کہ انسان کے قلب پر لمہ ملکی وشیطانی دونوں کا تصرف ہوتا ہے، اور فرشتہ اور شیطان اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں، دونوں اللہ کے قبضہ میں ہیں۔(۱)

کقلب واحد :اس تشبیہ سے اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جس طرح قلب واحد پر تصرف کرنا ظاہراً آسان ہے اسی طرح اللہ کے لئے تمام قلوب پر تصرف کرنا آسان ہے وہ جس کے قلب کو جدھر چاہے پھیر سکتا ہے۔(۲)

ثم قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اللهم مصرف القلوب الخ : چونکہ اللہ تعالیٰ کو تمام انسانوں کے قلوب پر مکمل تصرف واختیار ہے، وہ قلوب کو جدھر چاہے پھیر دے، طاعات کی طرف یا معاصی کی طرف، اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ مضمون بیان کرنے کے بعد یہ دعاء فرمائی اور امت کو تعلیم دی کہ وہ اللہ سے اپنے قلوب کو طاعات کی جانب پھیرنا مانگا کریں، کیونکہ اگر وہ معاصی کی جانب پھیر دے تو کسی کو اس سے پوچھنے کی مجال نہیں۔(۳)

٨٤ / ١٢: وَعَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قال : قال رسولُ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم مَامِنْ مَوْلُوْدٍ إِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ أَوْیُنَصِّرَانِهٖ أَوْیُمَجِّسَانِهٖ، کَمَاتُنْتِجُ الْبَهِیْمَةُ بَهِیْمَةً جَمْعَاءَ هَلْ تُحِسُّوْنَ فِیْهَا مِنْ جَدْعَاءَ؟ ثُمَّ یَقُوْلُ: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَاتَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ "(۴)(متفق علیہ)(۵)

(١)اللمعات ١ / ٣٦٣.

(٢)اللمعات ١ / ٣٦٤.

(٣)اللمعات ١ / ٣٦٤.

(٤)الروم: ٣٠.

(٥)أخرجه البخاری، فی خمسة مواضع ، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی فمات هل یصلی علیه وهل یعرض علی الصبی الاسلام الخ ١ / ١٨١ برقم ١٣٤٢، ١٣٤٣، وکتاب الجنائز ،باب ماقیل فی اولادالمشرکین ١ / ١٨٥ برقم ١٣٦٩ وکتاب التفسیر، باب قوله لاتبدیل لخلق الله ٢ / ٧٠٤برقم ٤٥٨٩، وکتاب القدر، باب الله اعلم بماکانوا عاملین ٢ / ٩٧٦برقم ٦٣٤٧، ومسلم کتاب القدر، باب معنی کل مولود یولد علی الفطرة الآیه .

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، جس طرح ایک چوپایہ صحیح سالم بچہ جنتا ہے، کیا تم اس میں کوئی نقص محسوس کرتے ہو؟ پھر انھوں نے (ابو ہریرہؓ نے) یہ آیت تلاوت فرمائی: لاتبدیل الآیۃ (ترجمہ) اللہ کی بنائی ہوئی اس فطرت پر چلو جس پر اس نے تمام لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی، یہی بالکل سیدھا راستہ ہے۔

تشریح حدیث

بچوں کا وصفِ خلقت اور والدین کے ماحول کا اثر:

اس حدیث پاک میں بھی تقدیر کا بیان ہے، حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ہر بچہ صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے یعنی اگر بچے کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اسے بری صحبت نہ ملے تو وہ عقل وشعور آ جانے کے بعد اسلام پر قائم رہے گا اور اللہ کی وحدانیت کا قائل ہوگا؛ لیکن ہوتا یہ ہے کہ بہت سی مرتبہ بچہ کو صحیح ماحول نہیں ملتا، اس کے والدین یہودیت نصرانیت وغیرہ کسی دوسرے مذہب پر ہوتے ہیں تو وہ بچہ کو اپنے رنگ میں ڈھال لیتے ہیں اور اس کو اپنی طرح یہودی نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، گویا کہ اس کی فطرت میں نقص پیدا کر دیتے ہیں، حالانکہ بچہ زیغ وضلال سے سالم اور صحیح فطرت پر پیدا ہوا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو ایک مثال سے واضح فرمایا کہ دیکھو جانور کے جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو صحیح سالم ہوتا ہے پھر لوگ اس میں نقص پیدا کر دیتے ہیں، چنانچہ اہل عرب بچے کا تھوڑا سا کان کاٹ دیتے تھے اور عقیدہ یہ ہوتا تھا کہ اب یہ نظر بد سے محفوظ رہے گا، پس جس طرح جانور کے بچہ میں یہ تغیر اور نقص بعد میں پیدا ہوتا ہے اسی طرح بعض بچے بھی اصل فطرت پر پیدا ہونے کے بعد گھر کا ماحول خراب ہونے کی وجہ سے بگڑ جاتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خاص مویشیوں کی مثال اس لئے بیان کی کہ اہل عرب مویشی پالتے تھے اور وہ مویشیوں کے حالات سے خوب واقف تھے اس لئے مویشیوں کی مثال سے وہ مضمون کو اچھی طرح سمجھ لیں گے، اس کے بعد راوی نے اس حدیث کی تائید میں یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لاتَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ الآية.

فطرت کا مفہوم ومصداق:

یولد علی الفطرۃ: فطرت پر پیدا ہونے کی شرح میں دوقول ہیں:

(۱) قبول حق کی استعداد وصلاحیت پر پیدا ہونا جس کوفطرت سلیمہ کہتے ہیں۔

(۲) دین اسلام پر پیدا ہونا، اس قول کی دلیل کہ ہر بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ ترمذی کی روایت میں ''ملت'' کا لفظ وارد ہوا ہے اور شریعت میں ملت کا مصداق ملت اسلام ہوتا ہے، نیز راوی حدیث حضرت ابوہریرہؓ نے حدیث کی تائید میں یہ آیت کریمہ **فطرۃ اللہ التی الخ** پڑھی جس کا مطلب یہ ہے کہ اس فطرت پر قائم رہو جس پر اللہ نے تم کو پیدا کیا اور ظاہر ہے کہ بندوں کو ایمان پر قائم رہنے کا حکم ہے معلوم ہوا کہ فطرت سے فطرت ایمان مراد ہے۔

اور اول قول کے قائلین کی دلیل یہ ہے کہ اسلام ایک کسبی اور اختیاری چیز ہے جس کے اختیار کرنے پر بندوں کو ثواب ملتا ہے اور اس کے ترک پر جہنم کا استحقاق ہوتا ہے، اگر فطرت سے ملت اسلام مراد ہو تو مطلب ہوگا کہ ہر بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے گویا کہ اسلام غیر کسبی اور غیر اختیاری چیز ہے اور غیر اختیاری چیز پر ثواب کا استحقاق نہیں ہوتا اور نہ اس کے ترک پر عذاب ہوتا ہے، حالانکہ اسلام کا کسبی اور اختیاری چیز ہونا متفق علیہ امر ہے، دوسری دلیل ان حضرات کی یہ ہے کہ کافر کا نابالغ بچہ دنیوی احکام میں غیر مسلم ہوتا ہے کہ اگر اس کا انتقال ہوجائے تو مسنون طریقے سے اس کو کفن دفن نہیں کیا جاتا، نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے نہ اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جاتا ہے، اگر یہ مسلمان پیدا ہوا ہے تو پھر اس کی نماز جنازہ بھی ہونی چاہئے مسنون طریقہ پر کفن دفن بھی ہونا چاہئے؟ جو نہیں ہوتا، دلائل کی رو سے پہلا قول ہی راجح ہے۔(۱)

ایک اشکال وجواب:

یہاں اشکال یہ ہے کہ بمقتضاء حدیث ہر بچہ فطرت سلیمہ پر ہوتا ہے لیکن حضرت موسی وخضر کے واقعہ

(۱) اللمعات ۱/ ۳٦۵.

میں حضرت خضر نے جس بچے کو قتل کیا تھا اس کے متعلق حدیث میں طبع کافراً کے الفاظ آئے ہیں کہ وہ کافر پیدا ہوا تھا۔(۱)

اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں: (۱) یہ بچہ حدیث کل مولود کے حکم سے مستثنیٰ ہے کہ وہ فطرۃً کافر تھا۔

(۲) حضرت خضر والی حدیث میں ''طُبع'' بمعنیٰ ''قُدر'' ہے کہ اس بچے کا کافر ہونا مقدر تھا یعنی وہ اس صفت اور حالت کے ساتھ پیدا ہوا تھا کہ اگر وہ زندہ رہا اور بڑا ہوا تو وہ کافر ہوگا۔

لاتبدیل لخلق الله: میں ''لا'' صورۃً نفی ہے لیکن معنیً نہی ہے، اور معنی یہ ہیں کہ منجاب اللہ بچہ کی خلقۃً جوصفت وفطرت ہے اس میں تبدیلی نہ کرو، ایسا کرنے سے گناہ کے مستحق بنو گے۔(۲)

کماتنتج البهیمة: ''تنتج'' انتاج سے ہے بمعنی جننا، معروف ومجہول دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں، مگر راجح معروف کا صیغہ ہے، ''جمعاء'' بمعنی سلیم الاعضاء، یعنی جس کے تمام اعضاء موجود ہوں، ''جدعاء'' بمعنی کان کٹا ہوا، اس کا مرادی ترجمہ ہے نقص۔

ثم یقول فطرة الله الخ: ظاہراً متبادر ہوتا ہے کہ یہ استشہاد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی فرمایا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت ابو ہریرہؓ کا کلام ہے، جیسا کہ بعض طرق میں ''ثم یقول ابوهریرة'' کی تصریح وارد ہے۔

۸۵/۱۳: وعن أبي موسى الأشعريؓ قَالَ: قَامَ فِينَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بِخَمْسِ كَلِمَاتٍ فَقَالَ: إِنَّ اللّٰهَ لايَنَامُ، وَلايَنْبَغِيْ لَهُ أَنْ يَنَامَ، يَخْفِضُ الْقِسْطَ وَيَرْفَعُهُ، يُرْفَعُ إِلَيْهِ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ، وَعَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ، حِجَابُهُ النُّوْرُ، لَوْكَشَفَهُ لَأَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهِ مَاانْتَهىٰ إِلَيْهِ بَصَرُهُ مِنْ خَلْقِهِ''(رواہ مسلم)(۳)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ: ایک مرتبہ آپ علیہ الصلوۃ والسلام ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور پانچ باتیں ارشاد فرمائیں: اللہ تعالیٰ شانہ سوتا نہیں اور سونا اس

(۱) رواه أبوداوٗ في كتاب السنة، باب في القدر ۲/۶۴۷ لفظه: وكان طبع يوم طبع كافراً.

(۲) اللمعات ۱/۳۶۶.

(۳) أخرجه مسلم في الإيمان، باب قوله تعالى ولقد انزلنا نزلة أخرى الاية.

کی شان کے مناسب بھی نہیں ہے، وہ ترازو کو بلند و پست کرتا ہے، دن کے عمل سے پہلے رات کے عمل اور رات کے عمل سے پہلے دن کے عمل اس کے پاس پہنچادیئے جاتے ہیں، اور اس کا حجاب نور ہے، اگر وہ اس کو کھولدے تو اس کی ذاتِ پاک کا نور مخلوقات کی حدنگاہ تک تمام چیزوں کو جلاکر خاکستر کردے۔ (مسلم شریف)

تشریح حدیث

پانچ باتیں:

اس حدیث میں پانچ جملے ہیں، ایک جملہ تقدیر سے متعلق ہے اس لئے اس حدیث کو باب الایمان بالقدر کے تحت لایا گیا ہے، حق تعالیٰ شانہ کی عظمت اور جلالتِ شان کو بتانے کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ باتیں بیان فرمائیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کو نیند کی احتیاج نہیں:

ان اللـه لاینـام: اللہ سوتا نہیں ہے اور اس کے لئے سونا مناسب بھی نہیں ہے، ”لَاتَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلَانَوْمٌ“ یعنی نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، اس لئے کہ مشہور ہے **النـوم أخـت المـوت** کہ نوم اور موت دونوں غفلت میں برابر ہیں اور اللہ تعالیٰ موت وغفلت سے منزہ ہے، نیز حیوان سوتا ہے تاکہ اس کی تکان زائل ہوجائے اور اللہ تکان وتکاسل سے بھی منزہ ہے اسی لئے جنت میں نوم نہیں ہے کیونکہ اہل جنت کو تکان نہیں ہوگی، نیز نوم محدثات کا خاصہ ہے اور اللہ کی ذات قدیم ہے۔

(۲) رزق کی تنگی وکشادگی اللہ کے قبضہ میں:

یـخـفض القسط ویرفعه: یہ دوسرا جملہ باب کے مناسب ہے کہ اللہ قسط کو کبھی بلند کرتا ہے اور کبھی پست۔

”قسـط“ کے معنی میں کئی احتمال ہیں: (۱) حصہ اور حصہ سے مراد ہے رزق کہ وہ بھی حیوان کا حصہ ہوتا ہے، پس حدیث کے معنی ہوئے کہ حق تعالیٰ شانہ رزق کو کبھی پست اور کبھی بلند فرمادیتا ہے رزق پست کرنے سے مرادرزق میں تنگی اور بلند کرنے سے مرادرزق میں وسعت پیدا فرمانا ہے۔ (۱)

(۱) اللمعات ۱/ ۳۷۱.

(۲) عدل وانصاف اس صورت میں ترجمہ ہوگا کہ اللہ عدل وانصاف کو کبھی پست کرتا ہے اور کبھی بلند یعنی کبھی ظالم بادشاہ مقرر کرتا ہے اور کبھی عادل حکمراں عطافرماتا ہے اور ایسا عموماً بندوں کے اعمال کی وجہ سے ہوتا ہے، مشہور مقولہ ہے: اعمالکم عمالکم. جیسے تمہارے اعمال ہونگے ویسے ہی تمہارے اوپر حکمراں ہونگے۔(۱)

(۳) بعض نے کہا کہ قسط کے معنی میزان وترازو کے ہیں جو آلۂ عدل ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ میزان کو کبھی پست اور کبھی بلند کرتا ہے، پھر میزان کی مراد میں مذکورہ دونوں احتمال ہوں گے میزان رزق کا یا میزان عدل کا، اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ میزانِ عمل مراد ہو، اور میزانِ عمل کو بلند کرنے کا مطلب عمل صالح کی توفیق دینا اور پست کرنے سے مراد سلبِ توفیق ہے۔(۲)

(۳و۴) بندوں کے اعمال کی صبح وشام پیشی:

یرفع إلیه عمل اللیل ......الخ: یہ تیسرا اور چوتھا جملہ ہے کہ بندوں کے اعمال اللہ کی بارگاہ میں صبح وشام پہنچائے جاتے ہیں صبح اور شام فرشتوں کی ڈیوٹی بدلتی ہے، جنکی ڈیوٹی پوری ہوتی ہے وہ اللہ کی بارگاہ میں اپنے پاس محفوظ اعمال لےکر بارگاہِ الٰہی میں پہنچتے ہیں، ''**رفع عمل لیل قبل عمل النھار**'' کنایہ ہے سرعتِ رفع سے کہ صبح وشام کے احکام بارگاہ الٰہی میں بہت جلد پیش ہوتے ہیں، یہ ایک جملہ دو جملوں کے قائم مقام ہے۔(۳)

(۵) اللہ وبندہ کے درمیان حجابِ نور کی حیلولت:

حجابه النور: یہ حدیث کا آخری جملہ ہے کہ اللہ کا حجاب نور ہے، اسی لئے دنیا میں ان فانی آنکھوں سے اللہ کو دیکھ نہیں سکتے: ''**لَاتُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِکُ الْأَبْصَار**'' یعنی نگاہیں اس کو پا نہیں سکتیں اور وہ تمام نگاہوں کو پالیتا ہے۔

حجاب دو قسم کا ہوتا ہے: حجاب ظلمت اور حجاب نور، حجاب ظلمت یہ ہے کہ رائی ومرئی کے درمیان کوئی حسی حائل (دیوار وغیرہ) موجود ہو، اس کی وجہ سے شئی مرئی نظر نہ آوے، دوسری قسم حجاب کی حجاب نور ہے

(۱) اللمعات ۱/ ۳۷۱.
(۲) اللمعات ۱/ ۳۷۱.
(۳) اللمعات ۱/ ۳۷۲.

اس کا حاصل یہ ہے کہ وہاں کوئی حسی حائل نہیں ہے، البتہ مرئیٰ کا نور غایت درجہ کا ہے اور رائی کی قوت باصرہ کمزور ہے، اس کے حق میں وہ غایت درجہ کا نور ہی حجاب کے درجہ میں ہوجاتا ہے، جیسے چمگادڑ پرندہ کو دن میں نظر نہیں آتا کیونکہ اس کی بینائی کمزور ہے اور سورج کی روشنی بہت زیادہ ہے، اس لئے وہ سورج کی طرف دیکھ نہیں پاتا، اسی طرح اللہ اور بندوں کے درمیان حجاب ظلمت نہیں ہے بلکہ اللہ سراپا نور ہے اور ہماری بینائی کمزور ہے، اس کا سراپا نور ہونا بندوں کے لئے حجاب بن گیا ہے، **حجابه النور** کا مطلب یہی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ شانہ نے اپنے نور کی ہلکی سی تجلی دکھائی وہ اس کو برداشت نہ کرسکے اور بیہوش ہوکر گر گئے۔ (۱)

لو كشفه لاحرقت سبحات وجهه: اللہ نے اپنی ذات کو نور کے پردہ میں رکھا ہے اگر وہ نور کے پردہ کو ہٹادے تو اس کی ذات کے انوارات تمام مخلوق کو جلاکر خاک کردیں۔ (۲)

''**سبحات**'' سبحۃ کی جمع ہے بمعنی تسبیح، ملائکہ جب اللہ کے نور کو دیکھتے ہیں تو تسبیح پڑھتے ہیں، رؤیتِ نور سبب ہوتا ہے تسبیح کا، پس نور سبب اور تسبیح مسبب ہے، یہاں مسبب بول کر سبب مراد لیا گیا ہے۔ (۳)

٨٦ / ١٤: وَعَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: ''يَدُاللّٰهِ مَلأى لاتَغِيْضُها نَفَقَةٌ، سَحَّاءُ اللَّيْلِ وَالنَّهارِ، أَرَأَيْتُمْ مَاأَنْفَقَ مُذْخَلَقَ السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ؟ فَإِنَّهُ، لَمْ يَغِضْ مَافِيْ يَدِهٖ، وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ، وَبِيَدِهِ الْمِيْزَانُ يَخْفِضُ وَيَرْفَعُ'' (متفق علیہ) (۴)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: ''يَمِيْنُ اللّٰهِ مَلْأَي قَالَ ابْنُ نُمَيْرٍ: مَلآنُ، سَحَّاءُ لايَغِيْضُهَا شَيْءٌ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ''

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا:

(١) اللمعات ١ / ٣٧٢-٣٧٣۔

(٢) المرقاة ١ / ٢٦٥۔

(٣) فتح الإله ١ / ٤٥٤.

(٤) أخرجه البخاري في خمسة مواضع: كتاب التفسير، باب وكان عرشه على الماء ٢ / ٦٧٧ برقم ٤٤٩٧، والنفقات، باب فضل النفقة على الاهل وقوله ويسئلونک ماذا ينفقون ٢ / ٨٠٥ برقم ٥١٤٣، والتوحيد، باب قوله تعالى لماخلقت بيدى ٢ / ١١٠٢ برقم ٧١١٣ والتوحيد، باب وكان عرشه على الماء وهورب العرش العظيم الخ ٢ / ١١٠٣ برقم ٧١٢٠، والتوحيد، باب قول الله تعالى يريدون ان يبدلوا كلام الله ٢ / ١١١٦ برقم ٧١٩٥، ومسلم، كتاب الزكاة، باب الحث على النفقة وتبشير المنفق بالخلف ١ / ٣٢٢ برقم ٩٩٣.

اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے، رات دن خرچ کرنا بھی اس میں کمی پیدا نہیں کرتا کیا تم نہیں دیکھتے ہو؟ کہ جب سے اس نے زمین وآسمان کو پیدا فرمایا اور جبکہ اللہ کا عرش بھی پانی پر تھا کتنا خرچ کیا ہے؟ لیکن (اتنا زیادہ) خرچ کرنے کے باوجود جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہے (یعنی اس کا خزانہ) اس میں کمی نہیں ہوئی ہے اور اس کے ہاتھ میں ترازو ہے جسے وہ بلند وپست کرتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

اور مسلم کی روایت ہے "اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا داہنا ہاتھ بھرا ہوا ہے اور ابن نمیر کی روایت میں ہے کہ: اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے، رات اور دن خرچ کرنا بھی اس کے خزانہ میں کمی نہیں کرتا۔

تشریح حدیث

اس حدیث میں بھی کئی جملے ہیں، ان میں سے ایک جملہ باب کے مناسب ہے: "**بیدہ المیزان یخفض ویرفع** "اس لئے اس روایت کو تقدیر کے بیان میں لایا گیا۔

اللہ کی سخاوت اور کثرتِ عطاء:

ید اللہ ملأی: اس میں اللہ کی سخاوت اور کثرت عطا کا بیان ہے کہ اللہ کے خزانے بھرپور ہیں انمیں خرچ کرنے سے کمی نہیں آتی۔

"ملأی" صیغۂ صفت مونث ہے، اس کا مذکر ملآن ہے، ید متشابہات میں سے ہے، متاخرین کے یہاں ید سے مراد محل عطاء یعنی اللہ کے خزانے ہیں۔

لاتغیضھا نفقة: خرچ کرنے سے ان خزانوں میں کوئی کمی نہیں آتی۔

سحاء اللیل والنہار: حق تعالیٰ شانہ رات دن بہت خرچ کرتا ہے، "سحاء" "سح" سے ماخوذ ہے بمعنی کسی چیز کو اوپر سے نیچے کی طرف کثرت سے بہانا، اوپر سے؛ بھاری چیز بھی آسانی سے گرائی جاسکتی ہے اور وافر مقدار میں گرائی جاسکتی ہے، اس لئے "سحاء" کے معنی ہوئے بہت خرچ کرنے والا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ شانہ کے بے نہایہ خزانے اور اس کی کثرتِ عطاء کی طرف توجہ دلائی کہ غور کرو کہ اللہ تعالیٰ زمین وآسمان کو پیدا کرنے کے وقت سے برابر اپنی مخلوق پر خرچ کرتا آرہا ہے، لیکن اس کے باوجود اب تک اس کے خزانے میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی ہے۔

وفی روایۃ لمسلم: مسلم شریف کی روایت میں ''یمین'' کا لفظ وارد ہوا ہے، سخی شخص عطاء وبخشش عموماً داہنے ہاتھ سے کرتا ہے، اس لئے یہاں موقعۂ سخاوت میں اللہ کے لئے یمین کا لفظ لایا گیا ہے نہ کہ یسار سے تقابل کے طور پر، یسار میں یمین کے مقابلہ ضُعف ہوتا ہے اور حق تعالیٰ ہر طرح کے ضعف سے منزہ ہے اس لئے اللہ کی طرف یسار کی نسبت نہیں ہوتی، ایک حدیث میں فرمایا گیا ''کلتا یدیه یمین'' (۱)

قال ابن نمیر: ملآن: ایک راوی عبداللہ بن نمیر ہیں انہوں نے ملآن صیغہ مذکر نقل کیا ہے، امام نووی نے فرمایا کہ یہ غلط ہے کیونکہ ان کے سوا تمام رواۃ نے صیغہ تانیث کے ساتھ روایت کیا ہے، علامہ طیبی نے فرمایا کہ صیغہ مذکر کو از روئے نقل وروایت غلط کہیں تو کوئی نزاع نہیں، لیکن اس وجہ سے غلط کہنا درست نہیں کہ ''ید'' مؤنث معنوی ہے اور ملآن مذکر کا صیغہ ہے پس ملآن صیغہ مذکر کی اس سے مطابقت نہیں ہے، غلط کہنے کی یہ وجہ اس لئے درست نہیں کیونکہ ید سے مراد اللہ کا احسان وانعام ہے پس ید کا لفظ معنی کے لحاظ سے مذکر ہے۔(۲)

وبیده المیزان: اور اسی کے قبضہ میں ترازو ہے جس کو وہ پست وبلند کرتا رہتا ہے، یہ جملہ اس سے پہلے والی حدیث میں بھی آچکا ہے اس میں بھی وہی احتمالات جاری ہوں گے جو وہاں تھے، اسی جملہ کی وجہ سے یہ حدیث اس باب کے تحت ذکر کی گئی ہے۔کمامر

۸۷/۱۵: وعنه قال: سُئِلَ رسولُ اللّٰه صلی الله علیه وسلم عَنْ ذَرَارِيِّ الْمُشْرِكِيْنَ، قَالَ: ''اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ'' (متفق علیه)(۳)

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کی اولاد کے بارے میں سوال کیا گیا: (کہ وہ مرنے کے بعد دوزخ میں جائیں گے یا جنت میں؟) آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: اللہ بہتر جانتے ہیں کہ اگر وہ زندہ رہتے تو کیا عمل کرتے۔ (بخاری ومسلم)

(۱)المرقاۃ ۱/۲۶۷.

(۲)المرقاۃ ۱/۲۶۷،وفتح الإله ۱/۴۵۷.

(۳)أخرجه البخاری فی موضعین، کتاب الجنائز، باب ماقیل فی اولاد المشرکین ۱/۱۸۵برقم ۱۳۶۸ وکتاب القدر، باب الله اعلم بماکانوا عاملین ۲/۹۷۶برقم ۶۳۴۶.
ومسلم،کتاب القدر، باب معنی کل مولود یولد علی الفطرة وحکم موت أطفال الکفار ۲/۳۳۷.

تشریح حدیث

اس حدیث میں بھی تقدیر کا اور اللہ کے علم کا بیان ہے، مشرکین کی نابالغ اولاد جو نابالغی کی حالت میں مرجائے وہ جنتی ہوگی یا جہنمی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا کہ: اللہ کو خوب معلوم ہے کہ اگر وہ زیادہ حیات پاتے تو کیا عمل کرتے، پس اسی لحاظ سے اللہ ان کے ساتھ معاملہ فرمائیں گے، اس روایت سے ثابت ہوا کہ ہر فرد بشر کا جنتی یا جہنمی ہونا مقدر ہے۔

حکم اطفال مشرکین:

نابالغ اولاد اگر مسلمانوں کی ہو تو وہ ماں باپ کے تابع ہو کر جنت میں داخل ہوگی، یہ متفق علیہ ہے، اور نابالغ اولاد اگر مشرکین کی ہو تو اگر اس کے والدین میں سے کوئی ایک مسلمان ہو تو بھی وہ اولاد خیر الوالدین کے ضابطہ کے تحت جنت میں جائے گی، البتہ اگر والدین دونوں کے دونوں مشرک و کافر ہوں تو اس میں روایات بہت مختلف ہیں، اس لئے علماء کے بھی مختلف اقوال ہوگئے ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ وہ اہل جنت کے خادم ہوں گے، گویا کہ تبعاً جنتی ہوں گے۔

(۲) بعض نے کہا کہ اصل فطرت کا اعتبار کرتے ہوئے وہ جنت میں جائیں گے گویا اصالۃً جنتی ہوں گے۔

(۳) بعض نے کہا کہ وہ ماں باپ کے تابع ہو کر جہنم میں جائیں گے۔

(۴) بعض نے کہا کہ اس سلسلے میں توقف کرنا چاہئے، جمہور فقہاء و محدثین اسی کے قائل ہیں اور ائمہ اربعہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

(۵) بعض نے کہا کہ ان کا فیصلہ ان کے بارے میں اللہ کے علم کے مطابق ہوگا جیسا کہ اس حدیث میں مذکور ہوا۔

(۶) بعض نے کہا کہ وہ اعراف میں رہیں گے، اعراف جنت وجہنم کے درمیان ایک میدان ہے جو نہ جنت ہے نہ جہنم۔

(۷) بعض نے کہا کہ وہ بہائم کے حکم میں ہوں گے اور مٹی بن جائیں گے۔

(۸) بعض نے کہا کہ ان کا امتحان لیا جائے گا، ان سے کہا جائے گا کہ جہنم میں جاؤ؛ اس وقت ان میں سے جو اطاعت کریں گے ان کو جنت میں داخل کیا جائے گا اور جو تابعداری نہیں کریں گے وہ جہنم میں جائیں گے۔

(۹) بعض نے کہا کہ ان کا فیصلہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہوگا۔(۱)

الـلـه أعلم بما كانوا الخ: اس کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اولادِ مشرکین کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ کے علم پر محول کردیا، مذکورہ اقوال میں سے پانچواں قول اسی معنی پر مبنی ہے اور یہی متبادر معنی اس کے اوپر ذکر کئے گئے، لیکن علامہ خطابی نے اس معنی کو وہم کہا ہے اور فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہے کہ وہ اپنے آباء کے تابع ہوکر کافر ہیں اس لئے جہنمی ہیں، کیونکہ اللہ جانتے ہیں کہ اگر وہ زندہ رہتے اور بڑے ہوتے تو کفر ہی کے کام کرتے۔(۲)

الفصل الثانی

۸۸/۱۶: عَنْ عُبَادَةَ بنِ الصَّامِتِؓ قال قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم "إِنَّ أَوَّلَ مَاخَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمُ، فَقَالَ لَهُ، اُكْتُبْ، قَالَ: مَاأَكْتُبُ؟ قَالَ: اُكْتُبِ الْقَدْرَ فَكَتَبَ مَاكَانَ وَمَاهُوَ كَائِنٌ إِلَى الْأَبَدِ" (رواه الترمذى) (۳) وقال: هذا حديث غريب إسناداً.

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ سبحانہ عزوجل نے سب سے پہلے جس چیز کو پیدا فرمایا وہ قلم تھا پھر اس قلم سے کہا کہ لکھ، قلم نے کہا (یا اللہ!) کیا لکھوں؟ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: تقدیر لکھ، پس قلم نے ان چیزوں کو لکھا جو ابتک ہوچکی ہیں اور ان چیزوں کو لکھا جو آئندہ ہونے والی ہیں، امام ترمذی نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

(۱) فتح البارى ۳/۱ ۳۰-۳۰۲، المرقاة ۱/۲۶۸، اللمعات ۱/۳۷۶-۳۷۷.

(۲) بذل المجهود، كتاب السنة، باب ذراري المشركين ۱۳/۱۲۷.

(۳) أخرجه الترمذي، كتاب القدر، باب بدون ترجمة ۲/۳۸ والتفسير، باب من سورة نون ۲/۱۶۹.

تشریح حدیث

قلم؛ اولین تخلیق اور اس بارے میں متعارض احادیث میں تطبیق:

اس حدیث پاک میں قلمِ تقدیر کی تخلیق اور کتابتِ تقدیر کا بیان ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ حق تعالی شانہ نے سب سے پہلے قلمِ تقدیر کو پیدا فرمایا ہے، مخلوقات میں اول کیا چیز ہے؟ اس سلسلے میں روایات مختلف ہیں ایک روایت تو یہی ہے کہ اول مخلوق قلم ہے اور ایک حدیث میں ہے: "**اول ماخلق الله العقل**" کہ اللہ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا فرمایا، اور ایک روایت میں ہے "**اول ماخلق الله نوری**" کہ اللہ نے سب سے پہلے میرے نور کو پیدا کیا، ایک حدیث میں ہے "**ان اول ماخلق روحی**" اور ایک حدیث میں ہے "**ان اول ماخلق العرش**" اور بھی بعض چیزوں کے متعلق اول مخلوق کا لفظ وارد ہوا ہے، اول مخلوق ظاہر ہے کہ کوئی ایک شئ ہوگی، پھر متعدد چیزوں کے لئے یہ لفظ بولنا کیوں کر صحیح ہے؟

ملاعلی قاریؒ نے جواب دیا کہ اول کی دو قسمیں ہیں: اول حقیقی اور اول اضافی، اول حقیقی وہ شئ جس کو حقیقۃً وواقعۃً سبقت حاصل ہو کہ اس سے قبل کوئی شئ پیدا نہ کی گئی ہو، اور اول اضافی وہ چیز جس کو حقیقۃ سبقت حاصل نہ ہو البتہ دوسری شئ کی طرف نظر کرتے ہوئے اس کو سبقت حاصل ہو، تخلیق میں اولیت حقیقیہ حاصل ہے نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اور باقی چیزوں میں اول سے اول اضافی مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ ان اشیاء میں سے ہر شئ اپنی اپنی جنس کے اعتبار سے اول مخلوق ہے، پس قلم جو کہ اشجار کی جنس سے ہے وہ اپنی جنس کے اعتبار سے اول مخلوق ہے اور عقل جو اجسام لطیفہ میں سے ہے وہ اجسام لطیفہ میں اول مخلوق ہے اور عرش جو اجسام کثیفہ میں سے ہے وہ اجسام کثیفہ میں اول مخلوق ہے۔(۱)

ماکان وماھو کائن الی الأبد: اس جملہ کی دو تفسیریں ہیں: (۱) بعض نے کہا کہ "ماکان" سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کی چیزیں اور "ماھو کائن" سے مراد آپ کے زمانے اور اس کے بعد کی چیزیں ہیں۔(۲)

(۲) بعض نے کہا کہ "ماکان" سے تخلیق قلم سے پہلے کی چیزیں اور "ماھو کائن" سے تخلیق قلم کے

(۱) المرقاۃ ۱/ ۲۶۹-۲۷۰.

(۲) المرقاۃ ۱/ ۲۶۹.

بعد کی چیزیں مراد ہیں، تخلیق قلم سے پہلے ہوا وعرش وغیرہ کو پیدا کیا جا چکا تھا۔(۱)

"الأبـــد" یہ مقابل ہے ازل کا، ازل: وہ زمانہ جس کی کوئی ابتداء نہ ہو اور ابد: وہ زمانہ جس کی کوئی انتہاء نہ ہو اور دونوں کو جامع لفظ "سرمد" ہے۔

اس پر اشکال ہے کہ ابد تو غیر متناہی زمانہ کو کہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس میں امور بھی غیر متناہی ہوں گے اور غیر متناہی امور کو لکھنا اور ضبط کرنا محال ہے پھر قلم نے ان کو کیسے لکھ دیا؟ جواب یہ ہے کہ غیر متناہی امور کو ضبط کرنا بندوں کے لئے تو محال ہے لیکن اللہ کے لئے آسان ہے، اپنی قدرت کو اللہ کی قدرت پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔

۸۹/۱۷: وَعَنْ مُسلِمِ بنِ يَسَارٍ، قَالَ : سُئِلَ عُمَرُ بنُ الخَطَّابِ عَنْ هٰذِهِ الآيَةِ "وَإِذْأَخَذَرَبُّکَ مِنْ بَنِيْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ" الآية، قَالَ عُمَرُ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يُسْأَلُ عَنْهَا فَقَالَ: إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ، ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَه بِيَمِيْنِهِ، فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً، فَقَالَ: خَلَقْتُ هٰؤُلاءِ لِلْجَنَّةِ، وَبِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ يَعْمَلُوْنَ، ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ، ذُرِّيَّةً، فَقَالَ: خَلَقْتُ هٰؤُلاءِ لِلنَّارِ، وَبِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ يَعْمَلُوْنَ، فَقَالَ رَجُلٌ فَفِيْمَ الْعَمَلُ يارسولَ اللّٰه؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : إِنَّ اللّٰهَ إِذَاخَلَقَ الْعَبْدَ لِلْجَنَّةِ، اِسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِحَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى عَمَلٍ مِنْ أَعْمَالِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُدْخِلُهُ بِهِ الْجَنَّةَ، وَإِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلنَّارِ، اِسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى عَمَلٍ مِنْ أَعْمَالِ أَهْلِ النَّارِفَيُدْخِلُهُ بِهِ النَّارَ.(رواه مالک، والترمذی، وابوداود.(۲)

ترجمه: مسلم بن یسارؒ سے مروی ہے کہ: حضرت عمر فاروقؓ سے اس آیت "وَإِذْأَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِيْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ" (کی تفسیر) کے بارے میں سوال کیا گیا، تو انہوں نے فرمایا کہ: حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: اللہ سبحانہ وتعالی نے حضرت آدم علیہ السلام کو

(۱)المرقاة ۱/ ۲۶۹.

(۲)أخرجه مالک في المؤطا. كتاب القدر ص ۳۶۲، وأبوداوٗد، كتاب السنة، باب في القدر ۲/ ۶۴۷ والترمذي في كتاب التفسير، باب من سورة الأعراف ۲/ ۱۳۸.

پیدافرمایا، پھران کی پشت پر داہنا ہاتھ پھیرا اور اس میں سے ان کی اولاد نکالی اور فرمایا میں نے ان کو جنت کے لئے پیدا کیا اور یہ لوگ اہل جنت کے ہی اعمال اختیار کریں گے، پھر دوبارہ اپنا ہاتھ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت پر پھیرا اور اس میں سے ان کی اولاد نکالی اور فرمایا کہ میں نے ان کو جہنم کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ لوگ جہنمیوں والے اعمال اختیار کریں گے، یہ سن کر ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ! پھر عمل کی کیا ضرورت ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ شانہ کسی بندہ کو جنت کے لئے پیدا فرماتے ہیں تو اس سے جنتیوں کے ہی اعمال کراتے ہیں یہاں تک کہ وہ بندہ جنتیوں کے اعمال میں سے کسی عمل پر وفات پاتا ہے اس کی وجہ سے اللہ اس کو جنت میں داخل فرماتا ہے اور جب کسی بندہ کو دوزخ کے لئے پیدا فرماتے ہیں تو اس سے دوزخیوں کے سے اعمال کراتے ہیں یہاں تک کہ وہ اہل دوزخ کے اعمال میں سے کسی عمل پر مرجاتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے ان اعمال کی بناپر جہنم میں ڈال دیتا ہے۔ (مؤطا مالک، ترمذی، ابوداود)

تشریح حدیث

ذریۃ آدم کا استخراج اوران کی تقدیر طے کئے جانے کا واقعہ:

اس حدیث میں ایک آیت کی تفسیر ہے، اسی کے ضمن میں اس بات کا بیان ہے کہ جنتی جہنمی ہونا مقدر ہے، وہ آیت شریفہ یہ ہے: ”وَإِذْ أَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ“ (۱) مسلم بن یسار فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ سے اس آیت کی تفسیر معلوم کی گئی توانہوں نے فرمایا کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس کا سوال کیا گیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق فرمایا تھا کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اوراپنا داہنا ہاتھ ان کی پشت پر پھیراتو اس سے ان کی اولاد نکلی، ایک دوسری حدیث میں یہ بھی ہے کہ داہنی طرف سے نکلنے والی اولاد کی پیشانیوں پر نور تھا، حق تعالیٰ شانہ نے ان کے متعلق ارشادفرمایا کہ میں نے ان کو جنت کے لئے پیدا کیا ہے، پھر دوبارہ ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اس سے بھی ذریت نکلی، لیکن ان پر نورنہیں تھا، ان کے متعلق فرمایا کہ میں نے ان کو جہنم کے لئے پیدا کیا ہے، اس پر ایک شخص نے سوال کیا اور بعض روایات میں ہے کہ خود حضرت عمرؓ نے سوال کیا کہ ”پھر عمل کی کیا ضرورت ہے؟ آنحضرت

(۱) من سورة الاعراف رقم الآية: ۱۷۲.

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت وجہنم کی طرح اعمال بھی مقدر ہیں کہ جو شخص اہل جنت میں سے ہوتا ہے وہ اہل جنت کے اعمال میں لگا رہتا ہے اور اسی پر اس کی موت آتی ہے، اسی طرح اہل جہنم کا حال ہے، تو گویا کہ اعمال شقی وسعید ہونے کی علامات ہیں اور اعمال اختیار کی چیز ہیں پس اپنے اختیار سے اچھی علامات اور اعمال خیر میں مصروف ہونا چاہئے۔

سوال یہ ہے کہ آیت مذکورہ اور حدیث کے معنی میں مطابقت نہیں ہے، کیونکہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ذریت کو بنی آدم کی پشت سے نکالا اور حدیث میں یہ ہے کہ ذریت کو آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا؟

جواب: آیت کریمہ میں آدم علیہ السلام مع اولاد مراد ہیں اور حدیث شریف میں اکتفا کیا گیا ہے آدم علیہ السلام پر ان کے اصل ہونے کی وجہ سے، اور آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالنے کا مطلب یہ نہیں کہ تمام انسانوں کو براہ راست آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا گیا بلکہ جس ترتیب سے دنیا میں پیدائش ہوئی ہے اسی ترتیب سے واسطہ درواسطہ نکالا، یعنی آدم علیہ السلام کی صلبی اولاد کو خود آدم علیہ السلام سے نکالا اور پھر اولاد آدم سے اولاد کی اولاد کو نکالا، اسی طرح آخر تک ہوا، حاصل یہ کہ استخراج ذریت کی دونوں صورتیں ہوئیں بلاواسطہ اور بالواسطہ، ایک صورت کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے اور اور ایک کو حدیث پاک میں۔ (۱)

استخراج ذریت کا عمل کہاں ہوا؟:

اس میں متعدد اقوال ہیں: (۱) بعض نے کہا استخراج ذریت کا عمل آدم علیہ السلام کے جنت میں داخل ہونے سے پہلے مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ہوا۔

(۲) بعض نے کہا کہ وادی نُعمان جو عرفات کے قریب ہے وہاں یہ عمل ہوا، جیسا کہ ایک حدیث میں اس کی صراحت ہے، جلالین شریف میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ (۲)

(۳) بعض نے کہا کہ استخراج ذریت جنت میں ہوا۔ (۳)

---

(۱) المرقاۃ ۱/ ۲۷۱.

(۲) جلالین شریف ۱/ ۱۴۴، مسند احمد (۲۴۵۵) نصه هكذا: عن ابن عباس، عن النبی صلی الله عليه وسلم قال: اخذ الله الميثاق من ظهر آدم بنعمان، "يعنى عرفة" فأخرج من صلبه كل ذريته ذرأها، فنثرهم بين يديه كالذر، ثم كلمهم قبلا، قال: ألست بربكم الآية.

(۳) المرقاۃ ۱/ ۲۷۲.

(۴) بعض نے کہا کہ جنت سے اتر آنے کے بعد سرزمین ہندسرندیپ میں یہ عمل ہوا۔(۱)

ثـم مسـح ظهره بيمينه : مسلمان ذریت کے لئے ان کی شرافت کی وجہ سے یمین کا لفظ ذکر فرمایا اور غیرمسلم ذریت میں یہ بات نہیں اس لئے ان کے لئے مطلق ''ید'' بولا گیا۔

قدریہ، معتزلہ اور مرجیہ کی تردید:

استعـمله بعمل اهل الجنة :اس سے معلوم ہوا کہ اچھے و برے سب اعمال من جانب اللہ مقدر ہیں، لہذا اس سے قدریہ ومعتزلہ ہردوفرقوں کی تردید ہوجاتی ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اچھے و برے اعمال کے لحاظ سے ہی انسان کا انجام متعین ہوگا، پس اس سے مرجیہ کی بھی تردید ہوجاتی ہے جواعمال کو بے فائدہ قرار دیتے ہیں۔

۹۰/۱۸: وعن عَبْدِاللّٰهِ بنِ عَمروٍؓ قال: خَرَجَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم وَفِي يَدَيْهِ كِتَابَانِ، فَقَالَ: "أَتَدْرُوْنَ مَاهٰذَانِ الْكِتَابَانِ؟" قُلْنَا: لا، يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! إلاَّ أَنْ تُخْبِرَنَا فَقَالَ لِلَّذِيْ فِيْ يَدِهِ الْيُمْنٰى: هٰذَا كِتَابٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، فِيْهِ أَسْمَاءُ أَهْلِ الْجَنَّةِ، وَأَسْمَاءُ آبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ، ثُمَّ أُجْمِلَ عَلٰى آخِرِهِمْ؛ فَلايُزَادُ فِيْهِمْ وَلايُنْقَصُ مِنْهُمْ أَبَداً" ثُمَّ قَالَ لِلَّذِيْ فِيْ شِمَالِهِ: "هٰذَا كِتَابٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ فِيْهِ أَسْمَاءُ أَهْلِ النَّارِ، وَأَسْمَاءُ آبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ، ثُمَّ أُجْمِلَ عَلٰى آخِرِهِمْ، فَلايُزَادُ فِيْهِمْ وَلايُنْقَصُ مِنْهُمْ أَبَداً" فَقَالَ أَصْحَابُهُ: فَفِيمَ الْعَمَلُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ إِنْ كَانَ أَمْرٌ قَدْ فُرِغَ مِنْهُ؟ فَقَالَ: "سَدِّدُوا وَقَارِبُوْا؛ فَإِنَّ صَاحِبَ الْجَنَّةِ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ، وَإِنْ عَمِلَ أَيَّ عَمَلٍ، وَإِنَّ صَاحِبَ النَّارِ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ وَإِنْ عَمِلَ أَيَّ عَمَلٍ، ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بِيَدَيْهِ فَنَبَذَهُمَا، ثُمَّ قَالَ: فَرَغَ رَبُّكُمْ مِنَ الْعِبَادِ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ "(رواہ الترمذی)(۲)

ترجمه : حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ: ایک مرتبہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے حجرہ مبارکہ) سے نکلے اورآپ کے ہاتھوں میں دو کتابیں (رجسٹر) تھیں، آپ علیہ الصلوۃ

(۱) المرقاة ۱/ ۲۷۲.

(۲) أخرجه الترمذي، كتاب القدر، باب ماجاء ان الله كتب كتابا لأهل الجنة وأهل النار ۲/ ۳٦.

والسلام نے فرمایا کیاتم جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیسی ہیں؟ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ! ہم نہیں جانتے آپ بتائیں تو معلوم ہوگا تو آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے اس کتاب کے بارے میں جوآپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں ہاتھ میں تھی فرمایا: یہ پروردگارعالم کی طرف سے وہ کتاب ہے جس میں جنتیوں کے نام ، ان کے باپوں کے نا م اور ان کے قبیلوں کے نام درج ہیں، اورآخرمیں جوڑکردیا گیا ہے (مجموعی تعداد ذکر کردی گئی) نہ ان میں کسی نام کا کبھی اضافہ ہوگا اورنہ ان میں سے کوئی کبھی کم کیا جائے گا، پھرآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب (رجسٹر) کے بارے میں جوآپ کے بائیں ہاتھ میں تھی فرمایا: اوریہ پروردگارعالم کی کتاب وہ (رجسٹر) ہے جس میں جہنمیوں کے نام، ان کے باپوں کے نام اوران کے قبیلے درج ہیں، اورآخرمیں جوڑکردیا گیا، نہ تو ان میں کبھی کسی نام کا اضافہ ہوگا اورنہ ہی کم ہوگا، (یہ سن کر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! اگراس معاملہ سے فراغت ہوچکی ہے تو پھرعمل کی کیاضرورت ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: درست عمل کو اختیارکرکے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قرب حاصل کرو کیونکہ جنتی کا خاتمہ جنت والوں کے سے عمل پرہوگا اگرچہ وہ (زندگی بھر) کیسے ہی عمل کرتارہاہو اورجہنمی کا خاتمہ جہنم والوں کےعمل پرہوگا اگرچہ وہ(زندگی بھر) کیسے ہی عمل کرتارہاہو(اس کے بعد) آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے دونوں ہاتھوں کوحرکت دی اوران دونوں (رجسٹروں) کوڈال دیا، پھرفرمایا کہ تمہارا رب بندوں (کے متعلقہ فیصلوں) سے فارغ ہوچکاہے، ایک جماعت جنت کے واسطے ہےاورایک جماعت جہنم کے واسطے ہے۔ (ترمذی)

تشریح حدیث

تقدیر کے دونوشتے:

خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم وفي يديه كتابان :حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے پاس تشریف لائے آپ کے دونوں ہاتھوں میں دوکتابیں تھیں،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا کہ جانتے ہوکہ یہ دونوں کتابیں کیسی ہیں؟ صحابہ نے لاعلمی ظاہرفرمائی،آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے داہنے ہاتھ والی کتاب کے بارے میں فرمایا کہ: یہ اللہ کی طرف سے ایک کتاب ہے اوراس میں اہل جنت

کے نام ہیں، اوران کے والد کااوران کے قبیلہ کا نام ہے اورآ خرمیں ٹوٹل کردیا گیاہے، جونام اس میں درج ہوگئے ہیں اس میں نہ کسی ایک شخص کا اضافہ ہوسکتا ہے اورنہ اس میں کمی ہوسکتی ہے، یعنی بالکل حتمی فہرست ہے، اسی طرح بائیں ہاتھ میں جوکتاب تھی اس کے بارے میں فرمایا کہ: یہ اہل جہنم کی فہرست ہے مع ولدیت وقبیلہ اوراخیر میں ان کا بھی ٹوٹل کردیا گیاہے اوریہ فہرست بھی حتمی ہے، اس پرصحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ جب جنتیوں اور جہنمیوں کی باقاعدہ فہرست بن چکی ہے تو ظاہر ہے کہ ہرگز اس کے خلاف نہ ہوگا، پھرعمل کی کیاضرورت ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عمل کرتے رہو اور اللہ کاقرب حاصل کرنے کی سعی میں لگے رہو جوجنتی ہوتاہے(شروع میں نہ سہی تو) اخیروقت میں وہ جنت کے اعمال میں لگ جاتاہے اور اس کے نتیجہ میں جنت میں داخل ہوتاہے اورجہنمی کا خاتمہ جہنم کےعمل پرہوتاہے، خواہ زندگی میں کیسے ہی اعمال کئے ہوں، راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعدحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھ نیچے کرلئے اورفرمایا کہ تمہارا رب اب بندوں کی طرف سے فارغ ہوگیاہے، ایک فریق کے لئے جنت کا فیصلہ فرماچکاہے اورایک فریق کیلئے جہنم کا۔

ماھذان الکتابان: ملاعلی قاریؒ وغیرہ شراح نے فرمایا کہ یہ دونوں کتابیں حسی تھیں اور واقعۃً وحقیقۃً حضورصلی اللہ علیہ وسلم کو اہل جنت وجہنم کی فہرست عطاء کی گئی تھی، حضرات انبیاء کرام سے بطورمعجزہ خرق عادت چیزیں صادرہوتی ہیں پس یہ بھی اسی قبیل کی ایک چیزتھی، اوربعض نے کہا کہ حقیقۃً کوئی کتاب اور فہرست آپ صلی اللہ علیہ وسلم کونہیں دی گئی تھی بلکہ یہ کلام تمثیلی ہے،حضورصلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین کو یہ باورکرایا کہ اللہ نے اہل جنت و اہل جہنم کی فہرست بنادی ہے اورتم یوں سمجھو کہ ان میں سے ایک فہرست میرے داہنے ہاتھ میں ہے اورایک بائیں ہاتھ میں ہے، یہ کلام تمثیلی ہے یا حقیقی اور واقعی فہرست تھی دونوں باتیں ہوسکتی ہیں کوئی استبعادنہیں۔ (۱)

ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم بيديه: یہاں ''قال'' ''حرک'' کے معنی میں ہے، کیونکہ ''قال'' کے معنی اپنے متعلقات کے اعتبارسے بدلتے رہتے ہیں،قال بیدہ، ہاتھ سے پکڑا، قال برجلہ، پیرسے چلا۔ (۲)

---

(۱)المرقاۃ۱/۲۷۲،واللمعات۱/۳۷۳.

(۲)اللمعات۱/۳۸۶.

فنبذھما: اس ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ اگر حسی کتابیں تھیں تو مرجع وہ کتابیں ہونگی اور ڈالنے سے مراد ہاتھوں کو اوپر کی طرف حرکت دے کر ان کو غائب کر دینا ہوگا، اور اگر کتابیں تمثیلی تھیں تو اس وقت مرجع دونوں ہاتھ ہوں گے کہ مثال بیان کرتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھ اٹھا رکھے تھے، پھر بعد التمثیل دونوں ہاتھوں کو نیچے یعنی اپنی حالت پر کرلیا۔

ســدّدوا: تسدید بمعنیٰ کسی چیز کو بالکل سیدھا اور درست کرنا یعنی درست اعمال کرتے رہو، افراط و تفریط نہ کرو۔

قــاربوا: اس سے مراد یہ ہے کہ اگر افضل عمل نہ کرسکو تو اس کے قریب عمل کو اختیار کرو، اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد ہے اللہ کا قرب حاصل کرو، اور یہ ''سددوا'' کا ثمرہ ہے کہ اعمال کو درست کرنے سے اللہ کا قرب حاصل ہوگا۔

زندگی کا محاسبہ کرتے رہئے!

اس حدیث سے ایک بڑی اہم بات معلوم ہوئی کہ آدمی کو اپنے اعمال واخلاق کی فکر ہونی چاہئے، بالخصوص اخیر عمر میں بہت خیال رکھنا چاہئے اور جیسے جیسے عمر زیادہ ہوتی رہے اعمال میں بھی اضافہ ہونا چاہئے بندہ ہر دن محاسبہ کرے کہ کل کے مقابلہ میں آج میرے اعمال اور نیکیوں میں اضافہ ہوا ہے یا نہیں؟ اگر ترقی دیکھے تو اللہ کا شکر اداء کرے، اور خدانہ کرے اگر تنزلی دیکھے تو خائف ہو اور توبہ واستغفار کرے۔

امام غزالیؒ کی ایک فکر انگیز نصیحت:

امام غزالی کے ایک شاگرد نے ان کو خط لکھا کہ حضرت کوئی نصیحت فرمائیں، امام غزالیؒ نے فرمایا: بیٹا! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں امت کے لئے بہت نصیحتیں موجود ہیں، پس الگ سے کسی نصیحت کی حاجت نہیں، چنانچہ انہوں نے اس خط میں ایک حدیث تحریر فرمائی جس کا مضمون یہ ہے کہ اگر بندہ کی ایک ساعت اور ایک گھڑی بھی اس مقصد کے علاوہ میں صرف ہوجائے جس کے لئے اس کو پیدا کیا گیا ہے تو یہ آدمی کے لئے باعث حسرت ہے اور بندہ کا غیر مفید امور میں مشغول ہونا علامت ہے اس بات کی کہ اللہ نے اس سے نظر عنایت پھیر لی ہے، اور جس شخص کی عمر چالیس سال سے متجاوز ہوجاوے اور پھر بھی اس کی نیکیاں اس کی برائیوں پر غالب نہ آئیں تو اسے اپنے آپ کو جہنم کے لئے تیار رکھنا چاہئے، انتہی۔

کیونکہ چالیس سال عمر ہوجانے کے بعد اصلاح مشکل ہوتی ہے، پھر عادات پختہ ہوجاتی ہیں لہٰذا محاسبہ کرنا چاہئے کہ آج میری حالت کل کے مقابلے میں بہتر ہوئی یا نہیں، اگر کمی محسوس کرے تو توبہ واستغفار کرے اور اس کی کمی کی تلافی کرے۔

۹۱/۱۹: وَعَنْ أَبِیْ خِزَامَةَ عَنْ أَبِیْهِ،قَالَ: قُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَرَأَیتَ رُقًی نَسْتَرْقِیْهَا، وَدَوَاءً نَتَدَاوٰی بِهٖ، وَتُقَاةً نَتَّقِیْهَا ، هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدْرِاللّٰهِ شَیْئًا؟ قَالَ: هِیَ مِنْ قَدْرِاللّٰهِ''(رواہ احمد، والترمذی، وابن ماجہ)(۱)

ترجمہ: حضرت ابوخزامہ اپنے والدمحترم (حضرت یعمرؓ) سے نقل فرماتے ہیں کہ انھوں نے (والدمحترم نے) عرض کیا: یارسول اللہ! بتایئے کہ وہ جھاڑ پھونک جو ہم کراتے ہیں، وہ دوا، جس کے ذریعہ ہم علاج کرتے ہیں اور وہ حفاظتی چیز (ڈھال وزرہ وغیرہ) جس کے ذریعہ ہم اپنا بچاؤ کرتے ہیں کیا یہ چیزیں تقدیر الٰہی کو ٹال دیتی ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ چیزیں تقدیر الٰہی میں شامل ہیں۔ (احمد وترمذی وابن ماجہ)

تشریح حدیث

احوال: ابوخزامہؓ:

ابوخزامہ (بکسر الخاء المعجمۃ) کنیت ہے بعض نے کہا کہ ان کا نام زید ہے، ان کے والد کا نام یَعْمر ہے، قبیلہ بنوسعد کے تھے، اس لئے السعدی کہلائے ہیں، بعض نے ان کو صحابی کہا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ تابعی ہیں، ہاں ان کے والد یَعْمَر صحابی ہیں۔(۲)

علاج اور اس سے شفاء بھی مقدر من اللہ:

ابوخزامہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ کوئی وظیفہ یا ورد، جس کے ذریعہ ہم جھاڑ پھونک کرتے ہیں یا دوا جس سے علاج کرتے ہیں یا بچاؤ کی چیزیں

(۱)أخرجه أحمد فی مسنده۳/۴۲۱ برقم ۱۵۵۱۰،۱۵۵۱۱، ۱۵۵۱۲،۱۵۵۱۳، والترمذي،فی کتاب الطب، باب ماجاء فی الرقی والأدویة ۲/۲۷، والقدر، باب ماجاء لاترد الرقی والدواء من قدرالله شیئاً ۲/۳۶ برقم ۳۱۴۸ وابن ماجه فی المقدمه، کتاب السنة، باب فی القدر ۱/۹.

(۲)التقریب(۸۰۷۷)الإصابة ۶/۷۲،۵/۵۰۰.

(ڈھال وغیرہ) جن سے بچاؤ اختیار کرتے ہیں کیا یہ چیزیں تقدیر کو ٹال سکتی ہیں؟ مقصد یہ تھا کہ اگر نہیں ٹال سکتیں تو ان کا اختیار کرنا بے کار اور لغو ہے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ چیزیں بھی تقدیر میں لکھی ہوئی ہیں، یعنی مثلاً جس طرح بیمار ہونا مقدر میں لکھا ہے اسی طرح یہ بھی لکھا ہے کہ یہ شخص علاج کرائے گا یا نہیں؟ اس علاج سے فائدہ ہوگا یا نہیں ہوگا؟ اسی طرح جھاڑ پھونک کے ذریعے بیماری دور ہوگی یا نہیں، علی ہذا القیاس، پس جس کے مقدر میں ان کے اختیار کرنے سے شفاء لکھی ہوتی ہے اس کو شفاء ہوجاتی ہے اور جس کے مقدر میں شفاء نہیں لکھی ہوتی ہے اس کو شفاء نہیں ہوتی ہے، لہذا ان کا اختیار کرنا بے سود نہیں ہے، پس جس طرح تقدیر کے بھروسہ اعمال کا ترک مناسب نہیں اسی طرح اسباب کا ترک بھی مناسب نہیں۔

رقی نسترقیها: ''رقی'' ''رقیۃ'' کی جمع ہے، جیسے ''ظلم'' ''ظلمۃ'' کی جمع ہے بمعنی منتر۔

جھاڑ پھونک کا حکمِ شرعی:

اس جملہ سے جھاڑ پھونک کا جواز معلوم ہوتا ہے چنانچہ جھاڑ پھونک چند شرطوں کے ساتھ جائز ہے:

(۱) جھاڑ پھونک کے الفاظ صحیح ہوں، (۲) ان الفاظ کے معانی معلوم ہوں اس لئے کہ اگر ان الفاظ کے معنی معلوم نہ ہوں تو یہ احتمال ہے کہ ان کے معنی کفر وشرک کے بنتے ہوں، (۳) تعویذ کو موثر بالذات نہ سمجھے بلکہ صرف سبب کے درجہ میں جانے، (۴) تعویذ کا مقصد جائز ومباح ہو، [1] تفصیل آگے آئے گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

تقاۃ نتقیها: ''تقاۃ'' اصل میں ''وقاۃ'' تھا، تعلیل کے بعد ''تقاۃ'' ہوگیا، بمعنی آلۂ حفاظت جیسے ڈھال، زرہ وغیرہ۔

۹۲ / ۲۰: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ فِي الْقَدْرِ، فَغَضِبَ حَتّٰى احْمَرَّ وَجْهُهُ، حَتّٰى كَأَنَّمَا فُقِئَ فِيْ وَجْنَتَيْهِ حَبُّ الرُّمَّانِ، فَقَالَ: أَبِهٰذَا أُمِرْتُمْ؟ أَمْ بِهٰذَا أُرْسِلْتُ إِلَيْكُمْ؟! إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حِيْنَ تَنَازَعُوْا فِيْ هٰذَا الْأَمْرِ، عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ، عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ أَنْ لَا تَنَازَعُوْا

(۱) شامی زکریا ۹ / ۵۲۳.

فِیْهِ. (رواه الترمذی)[1] وروی ابن ماجه [2] نحوه عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ: (ایک مرتبہ) حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے حال یہ کہ ہم تقدیر کے بارے میں بحث ومباحثہ کر رہے تھے (یہ دیکھ کر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ مبارک سرخ ہوگیا جیسے انار کا دانہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخساروں میں نچوڑ دیا گیا ہو، اور فرمایا کیا تمھیں اسی بات پر مامور کیا گیا ہے؟ اور کیا میں تمھارے درمیان اسی لئے مبعوث کیا گیا ہوں؟ سوائے اس کے نہیں کہ تم سے پہلے (بعض امتوں کے لوگ) اسی وقت ہلاک ہوئے جبکہ وہ اس معاملہ میں بحث ومباحثہ کرنے لگے تھے، میں تم کو عہد دیتا ہوں کہ آئندہ پھر کبھی اس مسئلہ میں بحث ومباحثہ مت کرنا، (ترمذی) اور ابن ماجہ نے اسی طرح کی روایت اس سند سے نقل فرمائی ہے: عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده.

تشریح حدیث

مسئلہ تقدیر میں عقل لڑانے کی ممانعت:

خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ: ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز ہم لوگ تقدیر کے بارے میں بحث کر رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے آئے، ہماری یہ حالت دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت غصہ آیا حتی کہ چہرہ مبارک سرخ ہوگیا ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا انار کا دانہ رخساروں پر نچوڑ دیا گیا، اور فرمایا کہ کیا اسی کا تم کو حکم دیا گیا ہے؟ کیا اسی لئے میں بھیجا گیا ہوں؟ اور فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ تقدیر کے بارے میں بحث کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئے، لہٰذا میں عہد دیتا ہوں کہ تم اس میں بحث نہ کرو۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ تقدیر کا مسئلہ بہت دقیق بلکہ ادق ہے، کوئی بھی انسان اس کی کنہ تک نہیں پہنچ

---

(۱) أخرجه الترمذی فی "القدر" باب ماجاء من التشدید فی الخوض فی القدر ۲/۳۴.

(۲) أخرجه ابن ماجه فی المقدمة ۱/۹.

سکتا، اسی لئے ''سلامتی بر کنار است'' پر عمل ہو اور اس بارے میں زیادہ کھود کرید کی کوشش نہو، جو کچھ تقدیر کے سلسلہ میں احادیث میں آ گیا ہے اس کو تسلیم کیا جائے، اگر اس مسئلہ کو محض عقل کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو سابقہ امم کی طرح گمراہی کے سوا کچھ حاصل نہوگا۔

''عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده'' اس سند کا حل اور درجہ:

یہ ترمذی کی روایت ہے اور ابن ماجہ نے اس کو دوسری سند سے ذکر کیا ہے، وہ سند یہ ہے: **عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده الخ** کتب حدیث میں اس سند کی روایات کثرت سے آئی ہیں، البتہ حضرات شیخین نے بخاری و مسلم میں اس سند کی روایات کو نہیں لیا ہے، اس سند کا حکم کیا ہے؟ اس کو سمجھنا ہے، اس کے راویوں کا مکمل سلسلہ اس طرح ہے: **عمرو بن شعيب بن محمد بن عبدالله بن عمرو بن عاص**، اور اس کی مختصر تعبیر ہے: **عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده**، اس میں **عن ابيه** اور **عن جده** دونوں جگہ ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ اور اب اور جد کا مصداق کیا ہے؟ یہ قابل غور ہے، یہ تو متعین ہے کہ ''**ابيه**'' کی ضمیر عمرو کی طرف راجع ہے اور ''اب'' کا مصداق شعیب ہیں، اور ترجمہ یہ ہے: عمرو نقل کرتے ہیں اپنے باپ یعنی شعیب سے، لیکن **عن جده** میں اختلاف ہے کہ اس کی ضمیر بھی عمرو کی طرف راجع ہے یا شعیب کی طرف؟ اس میں دونوں قول ہیں:

(۱) **عن جده** کی ضمیر کا مرجع اگر عمرو ہو تو جد سے مراد محمد ہوں گے یعنی عمرو بن شعیب نقل کرتے ہیں اپنے والد شعیب سے اور شعیب نقل کرتے ہیں عمرو کے دادا محمد بن عبداللہ بن عمرو سے، اور محمد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل کرتے ہیں، حالانکہ محمد صحابی نہیں، بلکہ تابعی ہیں گویا کہ تابعی کے بعد یہاں کوئی راوی ساقط ہے، پس اس سند کی حدیث کو مرسل کہا جائے گا اور شیخین نے صحیحین میں مرسل روایات کو نہیں لیا ہے، لیکن یہ احتمال مرجوح ہے۔

(۲) **عن جده** کی ضمیر کا مرجع شعیب ہوں اور جد سے مراد عبداللہ بن عمرو صحابی ہوں، یعنی عمرو بن شعیب نقل کرتے ہیں اپنے والد شعیب سے اور وہ نقل کرتے ہیں اپنے دادا عبداللہ بن عمرو صحابی سے اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے، اس صورت میں صحابی رسول کا واسطہ مذکور ہونے کی وجہ سے یہ سند متصل ہوگی، کیونکہ عبداللہ بن عمرو صحابی ہیں۔

(۳) ایک تیسرا قول اس بارے میں اور موجود ہے، وہ یہ کہ بعض محدثین جیسے ابن حبان ابن عدی اور یحیٰ القطان نے اس سند کو بھی منقطع کہا ہے کیونکہ شعیب کے استاذ ان کے والد محمد ہیں نہ کہ عبداللہ، لیکن وہ ان کو ذکر نہ کرکے اپنے دادا عبداللہ کی طرف نسبت کرتے ہیں پس یہ سند منقطع ہوئی، اس لئے ابن حبان اور ابن عدی اس سند کو حجت نہیں مانتے، ان کا کہنا ہے کہ یہ سند ایک صورت میں مرسل اور ایک صورت میں منقطع ہے۔

لیکن اکثر محدثین جیسے حضرت امام احمد بن حنبل، علی بن مدینی، امام بخاری اور امام نووی اس سند کو حجت مانتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جدہ کی ضمیر شعیب کی طرف راجع ہے اور شعیب کا اپنے دادا عبداللہ بن عمرو سے سماع ثابت ہے، امام ترمذی نے جامع ترمذی باب ماجاء فی زکوۃ مال الیتیم میں ثبوت سماع کی تصریح کی ہے، وہ فرماتے ہیں: **وشعیب قد سمع من جدہ عبداللہ بن عمرو** ، نیز حافظ ذہبی اور بہت سے محدثین نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ شعیب کے استاذ ان کے والد محمد نہیں، بلکہ ان کے دادا عبداللہ بن عمرو صحابی ہیں، کیونکہ شعیب کے بچپن میں ان کے والد محمد کا انتقال ہوگیا تھا اور شعیب کی تربیت ان کے دادا عبداللہ بن عمرو صحابی نے کی ہے، انھوں نے ہی ان کو علم سکھایا ہے، پس درمیان میں کوئی راوی ساقط نہیں ہے اور یہ سند متصل ہے، یہی بات راجح ہے، اس لئے کہ حدیث کی بہت سی کتابوں میں کمافی ابی داؤد والنسائی سند ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے: **عن عبداللہ بن عمرو عن أبیہ عن جدہ عبداللہ بن عمرو** ، الغرض عندالجمہور یہ سند متصل اور معتبر ہے۔

لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ سند متصل ہے تو پھر شیخین اپنی صحیحین میں اس سند کی روایات کیوں نہیں لیتے؟

اس کے دو جواب ہیں، (۱) اگرچہ راجح یہی ہے کہ جد سے مراد عبداللہ بن عمرو ہیں لیکن دوسرا بھی احتمال ہے، اس وجہ سے شیخین نے اس سند کو نہیں لیا۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرو کے پاس احادیث کا ایک صحیفہ تھا جس کا نام انھوں نے ''صحیفۂ صادقہ'' رکھا تھا، ان کے پاس سے یہ صحیفہ ان کے ورثہ میں منتقل ہوتا رہا، حتی کہ وہ صحیفہ شعیب کے پاس آیا، شعیب روایات کو بسا اوقات استاذ سے نقل کرنے کے بجائے اس صحیفہ سے نقل کرتے تھے، صحیفہ سے نقل کرنے کو محدثین کے یہاں روایت بطریقہ ''وِجادہ'' کہا جاتا ہے، جو انقطاع کے حکم میں ہے، اس لئے حضرات شیخین

نے صحیحین میں اس سند سے روایات کی تخریج نہیں فرمائی، لیکن چونکہ ائمہ فن نے ثبوت سماع کی صراحت کی ہے تو انقطاع نہیں رہا، اسی لئے جمہور اس سند کو حجت اور معتبر مانتے ہیں، گو شیخین نے صحیحین میں اس سند کو قبول نہ کیا ہو۔(۱)

۹۳/ ۲۱: وَعَنْ أَبِي مُوسٰیؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: ”إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ مِنْ قُبْضَةٍ قَبَضَهَامِنْ جَمِيْعِ الْأَرْضِ، فَجَاءَ بَنُوْآدَمَ عَلٰى قَدْرِالْأَرْضِ، مِنْهُمُ الْأَحْمَرُوَالْأَبْيَضُ وَالْأَسْوَدُ وَبَيْنَ ذٰلِكَ، وَالسَّهْلُ وَالْحَزْنُ، وَالْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ“(رواه احمد و الترمذی و أبو داود)(۲)

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ: اللہ تعالیٰ شانہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ایک مٹھی مٹی سے پیدا فرمایا جس کو تمام زمین سے جمع کیا تھا، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد زمین کے مطابق پیدا ہوئی کہ ان میں سے کچھ سرخ ہیں، کچھ سفید ہیں اور کچھ سیاہ ہیں اور کچھ ان کے درمیان یعنی سانولے ہیں، اسی طرح ان میں سے کچھ نرم طبیعت ہیں اور کچھ سخت طبیعت والے ہیں اور اسی طرح کچھ اخلاق حسنہ والے ہیں اور کچھ اخلاق رذیلہ والے ہیں۔ (احمد، ترمذی، ابوداود)

تشریح حدیث

الوان وطبائع کا اختلاف بھی مقدر من اللہ:

اس حدیث میں بھی تقدیر کا بیان ہے کہ انسانوں میں الوان وطبائع کا اختلاف بھی تقدیر کے ماتحت ہے، حدیث کا مضمون یہ ہیکہ: اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ایک مٹھی مٹی سے پیدا کیا جو تمام روئے زمین سے لی گئی تھی، اور چونکہ مٹی مختلف طرح کی ہوتی ہے اس لئے انسان بھی مختلف طبیعتوں اور رنگوں کے پیدا ہوئے۔

---

(۱)المرقاة ۱/ ۲۷۸.

(۲)أخرجه أبوداؤد في السنة، باب في القدر ۲/ ۶۴۳، والترمذي في التفسير، باب من سورة البقرة ۲/ ۱۲۴ واحمد ۴/ ۴۰۰ برقم ۱۹۵۹۷ و ۱۹۵۹۸ و ۴/ ۴۰۶، برقم ۱۹۶۵۹.

مــن جـمـيـع الأرض: اس سے زمین کے وہ مقامات مراد ہیں جن پرلوگ بستے ہیں، زمین کی مٹی مختلف صفات کی ہوتی ہے، سفید، سیاہ، سرخ اور ان کے بین بین، باطنی اوصاف کے لحاظ سے بھی مٹی کئی طرح کی ہوتی ہے، کسی جگہ کی مٹی نرم کہیں کی سخت کہیں کی پاک اور کہیں کی ناپاک، آدم علیہ السلام کے خمیر میں ہرقسم کی مٹی شامل تھی، اس لئے یہ خاکی صفات آدم علیہ السلام میں اور پھران کی اولاد میں منتقل ہوئیں، جس شخص میں جس قسم کی مٹی کا غلبہ ہوا اسی کی صفت اس شخص میں نمایاں ہوئی، اسی لئے بعض اشخاص کا رنگ سفید ہوتا ہے اور بعض کا سیاہ، اور بعض میں دوطرح کے رنگ کی آمیزش ہوتی ہے، اسی طرح بعض کی طبیعت میں نرمی ہوتی ہے اور بعض میں سختی نیز بعض اچھی طبیعت کے ہوتے ہیں اور بعض بری طبیعت کے، گویا الوان وطبائع کا یہ اختلاف تقدیر کے ماتحت ہے۔(۱)

السهــل: نرم زمین، اس سے مراد ہے نرم طبیعت کے لوگ، **الـحــزن**: سخت زمین اس سے سخت طبیعت کے لوگ مراد ہیں، **الـخبيث**، رائحہ کریہیہ والی چیز، اس سے مراد ہے شریر کافر، **الـطيب**، رائحہ طیبہ والی چیز، اس سے مراد خیر وصلاح والا مومن ہے، الوان میں تین رنگ اصل ہیں: احمر، ابیض اور اسود، باقی رنگ مثلاً سانولا پن وغیرہ ان الوان ثلث کی آمیزش سے بنتے ہیں، جس کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بین ذالک سے اشارہ فرمایا ہے۔

۹٤ / ۲۲: وَعَنْ عَبدِاللّٰهِ بنِ عَمْرٍو رضي الله عنه قَالَ: "سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عليه وسلم يَقُوْلُ: إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ خَلْقَهُ فِيْ ظُلْمَةٍ، فَأَلْقىٰ عَلَيْهِمْ مِنْ نُوْرِهِ، فَمَنْ أَصَابَهُ، مِنْ ذٰلِکَ النُّوْرِ اهْتَدَى، وَمَنْ أَخْطَأَهُ ضَلَّ، فَلِذٰلِکَ أَقُوْلُ: جَفَّ الْقَلَمُ عَلىٰ عِلْمِ اللّٰهِ" (رواه أحمد والترمذی)(۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: اللہ تعالیٰ شانہ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا فرمادیا اور پھر اس پر اپنا کچھ نور ڈالا چنانچہ جس کو اس نور میں سے کچھ مل گیا وہ راہ یاب ہوگیا اور جو اس نور سے علیحدہ رہا وہ

(۱) المرقاة ۱ / ۲۷۹، واللمعات ۱ / ۳۸۹.

(۲) أخرجه الترمذی فی الإيمان، باب ماجاء فی افتراق هذه الأمة ۲ / ۹۳، وأحمد ۲ / ۱۷٦ برقم ٦٦٤٤ و ۲ / ۱۹۷ برقم ٦٨٥٤.

گم ہوگیا، اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ قلم اللہ کے علم پر خشک ہو گیا (یعنی جس کو جو کچھ پیش آنا ہے وہ اس کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے، اب اس میں تغیر وتبدل ممکن نہیں ہے) (احمد، ترمذی)

تشریح حدیث

تخلیق انسانی کی کیفیت اوراس کے اثرات:

یہاں بھی تقدیر کا بیان ہے کہ انسان کا ہدایت یافتہ ہونا اور گمراہ ہونا من جانب اللہ مقدر اور طے شدہ ہے، اسی کے لحاظ سے انسانی دنیا میں ہدایت یا گمراہی پر رہتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: کہ اللہ نے اپنی مخلوق جن وانس کو تاریکی میں پیدا فرمایا، پھران پر اپنا نور ڈالا وہ نور جس کو حاصل ہوا وہ دنیا میں ہدایت یافتہ ہوا اور جس کو وہ نور حاصل نہ ہوسکا وہ دنیا میں آ کر گمراہ ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ قلمِ تقدیر لوگوں کی تقدیر لکھ کر خشک ہو چکا ہے۔

نور وظلمت کی مراد:

نور اور ظلمت سے کیا مراد ہے اس میں تین قول ہیں:

(۱) علامہ طیبی نے کہا کہ ظلمت سے مراد انسان کی نفسانی خواہشات اور قوت بہیمیہ ہے جس کا مادہ ہر شخص کے اندر رکھا گیا ہے اور نور سے مراد ہے: قوت عقلیہ اور قوت ملکیہ، پس مطلب یہ ہوا کہ انسان نفسانی خواہشات اور بہیمانہ صفات کے ساتھ پیدا ہوا، لیکن اس کے ساتھ اس کو عقل وشعور بھی عطاء کیا گیا، پس جو عقل وشعور کو صحیح استعمال میں لاتا ہے وہ راہ یاب ہو جاتا ہے اور جو اس کو صحیح استعمال نہیں کرتا وہ نفسانی خواہشات سے مغلوب ہو کر گمراہ ہو جاتا ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ ظلمت سے مراد جہالت اور نور سے مراد اللہ کی معرفت ہے، جس شخص کو معرفت کا کچھ حصہ حاصل ہوا وہ دنیا میں راہ یاب ہوا، اور جو اس نور معرفت سے محروم رہا وہ گمراہ ہو گیا۔(۱)

(۳) ظلمت سے مراد اخلاق ذمیمہ: حرص، حسد اور کبر وغیرہ ہیں اور نور سے مراد: ہدایت اور اخلاقِ رذیلہ کو دور کرنے کی توفیق ہے، پس مطلب یہ ہوا کہ جس انسان کو اخلاق رذیلہ دور کرنے کی توفیق مل جاتی ہے

(۱) شرح الطیبی ۱/۲۷۶۔

وہ راہ یاب ہوجاتا ہے، اور جس کو یہ توفیق نہیں ملتی وہ گمراہ ہوجاتا ہے۔(۱)

اشکال: اس حدیث کے مطابق انسان کو ظلمت میں پیدا کیا گیا حالانکہ دوسری حدیث میں ہے: ''**مامن مولود إلا یولد علی الفطرۃ**'' دونوں حدیثوں کے مضمون میں تعارض ہے، کیونکہ فطرت سے مراد نور اسلام ہے، اور ظلمت اور نور میں تعارض ظاہر ہے؟

جواب: ظلمت سے نفس امارہ کی تاریکی اور فطرت سے قبول حق کی استعداد مراد ہے اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، اللہ نے انسان کے اندر نفس امارہ کے ساتھ قبول حق کی استعداد پیدا فرمائی ہے، انسان روحانیت ونفسانیت دونوں سے مرکب ہے، پس جو شخص فطری صلاحیت کو کام میں لاکر نفس امارہ کو مغلوب کرتا ہے وہ کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔(۲)

۹۵/۲۳: وَعَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يُكْثِرُ أَنْ يَقُوْلَ: ''يَامُقَلِّبَ الْقُلُوبِ! ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ'' فَقُلْتُ: يَانَبِيَّ اللّٰهِ! آمَنَّابِكَ وَبِمَا جِئْتَ بِهٖ، فَهَلْ تَخَافُ عَلَيْنَا؟ قَالَ: نَعَمْ؛ إِنَّ الْقُلُوْبَ بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ اللّٰهِ، يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَاءُ'' (رواہ الترمذی وابن ماجہ)(۳)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت یہ دعاء فرمایا کرتے تھے کہ اے دلوں کے پھیرنے والے (پروردگار) میرے دل کو اپنے دین پر قائم رکھ چنانچہ میں نے (ایک دن) عرض کیا کہ: اے اللہ کے نبی! ہم آپ پر اور آپ کی لائی ہوئی شریعت پر ایمان لاچکے ہیں تو کیا (اس کے بعد بھی) آپ کو ہمارے بارے میں (گمراہی کا) خوف وخدشہ ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں دراصل (بندوں کے) قلوب اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان میں ہیں، وہ جس طرح چاہتے ہیں ان کو الٹتے پلٹتے ہیں۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

(۱) المرقاة ۱/۲۸۰۔

(۲) المرقاة ۱/۲۸۰.

(۱) أخرجه الترمذی فی الإيمان القدر، باب ماجاء أن القلوب بين اصبعی الرحمن ۲/۳۶ وابن ماجه، كتاب الدعاء، باب دعاء الرسول صلى الله عليه وسلم ۲/۲۷۲.

تشریح حدیث

ہدایت وضلالت کا مقدر من اللہ ہونا اور ہدایت پر ثابت قدمی کی ایک دعا:

اس حدیث میں بھی تقدیر کا بیان ہے کہ لوگوں کے قلوب اللہ کے قبضہ وقدرت میں ہیں، وہ جب چاہے انکو ہدایت یا ضلالت کی جانب پھیر سکتا ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کثرت سے مانگا کرتے تھے، ''یامقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک''
حضرت انسؓ جانتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعا فرمانا امت کی تعلیم کے لئے تھا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو معصوم ہیں اور آئندہ کے خطرات سے محفوظ ہیں، اس لئے حضرت انسؓ نے امت کے حوالہ سے دریافت کیا کہ ہم آپ پر اور آپ کی شریعت پر ایمان لا چکے ہیں، کیا آپ پر ایمان لانے کے بعد بھی آپ کو ہماری گمراہی کا خوف ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! کیونکہ بندوں کے قلوب اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان میں ہیں وہ ان کو جس طرح چاہے پھیر دیتا ہے اس لئے ہمہ وقت یہ دعا کرتے رہنا چاہئے۔

بین اصبعین: علامہ ابن العربی نے فرمایا کہ بندوں کے قلوب پر اللہ کا کامل قبضہ وقدرت ہے اس کو حسی مثال سے سمجھانے کے مقصد سے ''بین اصبعین'' کی تعبیر اختیار کی گئی کہ جس طرح انسان کی انگلیوں کے درمیان جو چیز ہوتی ہے اس میں تصرف کرنا انسان کے لئے آسان ہوتا ہے، اسی طرح اللہ رب العالمین کے لئے بندوں کے قلوب میں کامل تصرف کرنا آسان ہے۔(۱)

روایت کے الفاظ کے فرق کی وضاحت

من اصابع الله: اسی نوع کی روایت ماقبل میں بھی آئی البتہ اس میں **من اصابع الرحمن** کا لفظ تھا اور یہاں **من اصابع الله** کے الفاظ ہیں، الفاظ کا فرق اسلئے ہے کہ ماقبل کی روایت میں یہ مضمون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود بیان کیا، کوئی سوال اس کا باعث نہیں ہوا، اور حسب تصریح حدیث ''**إن رحمتی سبقت غضبی**'' اللہ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے، اس لئے اس مضمون کی ادائیگی میں ''**من اصابع الرحمن**'' کے الفاظ تکلم فرمائے، زیر نظر روایت میں نوعیت جدا ہے کہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصل ایک دعا ''**یامقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک**'' صحابہؓ کے سامنے پڑھی، اس دعا کو سن کر حضرات صحابہؓ پر خوف طاری ہوا، اور ان کو اپنے اوپر خطرہ محسوس ہوا، اس کا استفسار انہوں نے

(۱) تحفة الأحوذي (٢١٤٠)

آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے سلسلہ میں صحابہؓ کے اس خوف اور فکر کو صحیح قرار دیا اور اس خوف کی تائید کرتے ہوئے مذکورہ مضمون ارشاد فرمایا، تائید خوف کی وجہ سے یہ مقام مقام ہیبت وجلال ہے اس لئے یہاں اسم جلالہ ''من اصابع الله'' کا لفظ استعمال کیا گیا۔(۱)

٩٦ / ٢٤: وَعَنْ أَبِيْ مُوْسَى قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَثَلُ الْقَلْبِ كَرِيْشَةٍ بِأَرْضِ فَلَاةٍ يُقَلِّبُهَا الرِّيَاحُ ظَهْراً لِبَطْنٍ. (رواه احمد)(۲)

ترجمہ: حضرت ابوموسی اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: دل کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پَر کُھلے میدان میں پڑا ہو جس کو ہوائیں اوپر نیچے الٹ پلٹ کر رہی ہوں۔ (احمد)

تشریح حدیث

قلوب کے اللہ کے قبضہ میں ہونے کی ایک تمثیل:

اس حدیث میں بھی یہی بیان کیا گیا کہ لوگوں کے قلوب اللہ کے قبضے میں ہوتے ہیں جن کو وہ جب چاہے ہدایت یا ضلالت کی جانب پھیر سکتا ہے، قلب کی اس ناپائیدار کیفیت کو آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حسی مثال سے سمجھایا کہ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی پَر ہو جو چٹیل میدان میں پڑا ہو، اور ہوا چل رہی ہو تو ہوا اس پر کو کبھی ادھر لے جاتی ہے اور کبھی ادھر، یہ پَر اس ہوا کے سامنے بے بس و بے سہارا اس کے اشارہ پر الٹتا پلٹتا رہتا ہے، اسی طرح قلوب اللہ کے سامنے بے بس و بے سہارا ہوتے ہیں، اللہ جس طرح چاہتا ہے اس میں تصرف کرتا ہے، خیر سے شر کی طرف اور شر سے خیر کی طرف جب اور جیسے چاہے پھیر دیتا ہے۔

فلاة: ''ارض'' کی صفت ہے، بمعنی چٹیل میدان، فَلَوات اس کی جمع ہے، ظهراً: اوپر والا حصہ، بطن: نیچے والا حصہ اور ''لبطن'' میں ل بمعنی الی ہے جیسے مُنَادِياً يُّنَادِيْ لِلْإِيْمَانِ میں لام الی کے معنی میں ہے۔(۳)

(١) المرقاة ج ا ص ٢٨١.

(٢) أخرجه احمد ٤ / ٤٠٨ يرقم ١٦٩٧٧.

(٣) المرقاة ١ / ٢٨٣.

۹۷ / ۲۵ وَعَنْ عَلِیٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَايُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِأَرْبَعٍ يَشْهَدُ أَنْ لَاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ بَعَثَنِيْ بِالْحَقِّ، وَيُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ، والبعث بعد الموتِ وَيُؤْمِنُ بِالْقَدْرِ"(رواه الترمذی، وابن ماجه)(۱)

ترجمہ: حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہوتا جب تک کہ وہ چار چیزوں پر ایمان نہ لائے: (۱) اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور یہ گواہی دے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور مجھ کو حق (دین اسلام) لیکر بھیجا ہے، (۲) موت پر ایمان لائے (۳) مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان لائے، (۴) تقدیر پر ایمان لائے، (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح حدیث

چار باتوں پر ایمان کا حکم:

اس حدیث پاک میں چار باتوں پر ایمان لانے کا مطالبہ فرمایا اور بتایا کہ ان امور پر ایمان کے بغیر بندہ مؤمن شمار نہیں ہوگا: (۱) اللہ کی الوہیت اور وحدانیت پر ایمان لانا، یعنی اللہ کے معبود ہونے کو تسلیم کرے اور اس کو ایک مانے، (۲) اس بات پر ایمان لائے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اور اللہ نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے (۳) موت پر ایمان لائے، اور موت کے بعد پھر زندہ ہونے پر ایمان لائے۔

موت پر ایمان لانے کا مطلب:

سوال یہ ہے کہ موت پر ہر آدمی کا یقین ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں، پھر موت پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مقصد یہ ہے کہ موت وحیات کو اللہ کے قبضے میں جانے کہ وہ جب تک چاہتا ہے بندہ کو زندہ رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے مار دیتا ہے، فلاسفہ کی طرح فساد مزاج کو موت کی علت نہ سمجھے، فساد مزاج موت کا سبب تو ہو سکتا ہے لیکن علت نہیں، اس لئے کہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا

(۱) أخرجه الترمذی فی کتاب القدر، باب ماجاء فی الإیمان بالقدر خیره وشره ۲/ ۳۶ وابن ماجه فی القدر، باب فی القدر ۱/ ۹.

اچانک انتقال ہوتا ہے کسی طرح کا فسادِ مزاج نہیں ہوتا، اور بہت سے لوگ سخت بیمار ہوجاتے ہیں ان میں فساد مزاج ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ عرصہ تک زندہ رہتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ موت کا وقوع یا عدمِ وقوع دراصل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، پس اس پر ایمان رکھا جائے۔

(۴) اور تقدیر پر ایمان لائے، یہی جملہ باب کے مناسب ہے، اس کی وجہ سے یہ حدیث یہاں ذکر کی گئی۔

۹۸ / ۲۶ وعن ابن عباسؓ قال: قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: "صِنْفَانِ مِنْ أُمَّتِيْ لَيْسَ لَهُمَا فِي الْإِسْلامِ نَصِيْبٌ: الْمُرجِئَةُ وَالْقَدْرِيَّةُ" (رواه الترمذى وقال هذا حديث غريب) (۱)

ترجمہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: میری امت میں دو فرقے ایسے ہیں جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے: (۱) مرجئہ (۲) قدریہ، امام ترمذی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح حدیث

فرقۂ مرجئہ وقدریہ کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں:

اس حدیث میں اور آگے چند احادیث میں تقدیر کی تکذیب کرنے والوں کے لئے وعید بیان کی گئی ہے، فرمایا کہ میری امت میں دو قسم کے لوگ ایسے ہیں جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے: مرجئہ اور قدریہ، علامہ طیبی نے کہا کہ مرجئہ سے مراد "فرقۂ جبریہ" ہے، جس کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے اور سب اعمال تقدیر کے موافق وقوع پذیر ہوتے ہیں، اس لئے دخول جنت کے لئے صرف ایمان کافی ہے، اعمال کی ضرورت نہیں، اعمال تو بندہ سے اللہ ہی کراتا ہے۔ (۲)

کیا یہ فرقے کافر ہیں؟

ليس لهما فى الاسلام نصيب: جب اسلام میں ان کا کوئی حصہ نہیں تو کیا یہ کافر ہیں؟ علامہ تورپشتیؒ

(۱) أخرجه الترمذي في ابواب القدر، باب ماجاء في القدرية ۲ / ۳۶.

(۲) شرح المشكاة للطيبى ۱ / ۲۸۱.

نے فرمایا کہ اس جیسی احادیث کی بنا پر بعض علماء نے ان کو دائرہ اسلام سے خارج اور کافر کہا ہے لیکن جمہور علماء اور محققین ان پر کفر کا حکم نہیں لگاتے، بلکہ بدعتی ہونے کا حکم لگاتے ہیں، جیسا کہ ''مـن امتی'' کے لفظ سے بھی ان کا اہل اسلام سے ہونا معلوم ہوتا ہے، ملاعلی قاریؒ نے ابن حجر مکی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سلف صالحین ان کو کافر نہیں کہتے تھے، بلکہ ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا برتاؤ کرتے تھے، ان کے اندر شادی بیاہ کرتے تھے، ان کی نماز جنازہ پڑھتے تھے، ان کی تدفین مسلمانوں کے قبرستان میں کرتے تھے، اس لئے کہ انھوں نے تقدیر کا انکار تاویل کے ساتھ کیا ہے، ان کا مقصد کفر اختیار کرنا نہیں ہے، انھوں نے حق کو تلاش کرنے کے لئے اجتہاد کیا جس میں ان سے خطا ہوئی، اس کی وجہ سے وہ فاسق اور گنہ گار قرار پائے اور اجتہادی خطا اس وقت معاف ہوتی ہے جب اجتہاد مسائل فرعیہ میں ہو، ان لوگوں نے مسائل اعتقادیہ میں اجتہاد کیا جو اجتہاد کا محل نہیں ہیں، ان میں اجتہاد قابلِ مواخذہ ہے۔ (۱)

سوال ہوگا کہ جب ان پر کفر کا حکم نہیں ہے تو حدیث کا کیا جواب ہوگا؟ حدیث میں تو صراحۃ کہا گیا ہے کہ اسلام میں ان کا کوئی حصہ نہیں؟ اس کے دو جواب ہیں:

(۱) نصیب سے مراد نصیب کامل ہے کہ اسلام میں ان کا کامل حصہ نہیں ہے، چنانچہ ایک حدیث میں جو امام ابونعیم نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے اس میں ان کے بارے میں یہ الفاظ مروی ہیں: **صـنـفـان مـن امتـي لاتـنـالُهم شَفَاعتي يوم القيامة: المرجئةُ و القدريةُ** (الحلیۃ) اس سے واضح ہے کہ **ليس لهما نصيب في الاسلام**، کا مقصود انکو کلی طور پر اسلام سے خارج قرار دینا نہیں ہے، بلکہ کمال اسلام کی نفی مقصود ہے، کیونکہ اس حدیث میں آپ علیہ السلام نے ان کے بارے میں صرف یہ فرمایا ہے کہ ان کو بروز قیامت میری شفاعت کا استحقاق نہیں ہوگا اور محض اتنی بات سے کفر لازم نہیں آتا۔

(۲) یہ حکم بطور زجر و توبیخ ہے یعنی ان کا نظریہ ایسا خطرناک ہے کہ وہ ان کو دائرہ اسلام سے خارج کر کے کفر تک پہنچا سکتا ہے۔

مرجئہ اور قدریہ کی وجہ تسمیہ:

المرجئة: ارجاء سے ہے بمعنیٰ موخر کرنا، پیچھے ہٹانا، یہ فرقہ بندہ کو درجۂ اختیار سے پیچھے ہٹاتا ہے،

(۱) المرقاۃ ۱/۲۸۳.

یا پھر یہ فرقہ اعمال کو ان کے شرعی درجہ سے پیچھے ہٹاتا ہے اور اہمیت نہیں دیتا، اس لئے ان لوگوں کا ''مرجئہ'' نام رکھا گیا اور یہاں اس سے مراد ''فرقۂ جبریہ'' ہے جیسا کہ ذکر کیا گیا۔

القدریة :اس سے مراد وہ فرقہ ہے جو تقدیر کا منکر اور ''**الأمر أنف**'' کا قائل ہے یعنی جو کچھ ہوتا ہے وہ انسان از خود کرتا ہے، پہلے سے کچھ مقدر نہیں ہے۔

سوال: یہ ہے کہ فرقہ قدریہ تو تقدیر کا انکار کرتا ہے تو پھر اس کا نام قدریہ کیوں رکھا گیا جبکہ اس لفظ کے ظاہر سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تقدیر کو تسلیم کرتا ہے؟

جواب: ان کا یہ نام تسمیة الشی باسم ضده کے قبیل سے ہے، یا وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ بندہ کے لئے زیادہ قدرت واختیار ثابت مانتے ہیں، اس لئے قدرت کی طرف نسبت کر کے ان کو ''قدریہ'' کہا گیا۔

حدیث کا درجہ:

وقال هذا حديث غريب: ''غریب'' یہاں ضعیف کے معنی میں ہے، چنانچہ حضرت ابن عباس کی یہ حدیث ازروئے سند ضعیف ہے، جیسا کہ امام ترمذی کی اپنی سنن میں بیان کردہ تفصیل سے ظاہر ہے، البتہ یہ حدیث حضرت ابن عباس کے علاوہ دیگر صحابہ سے بھی مروی ہے اس لئے بحیثیت مجموعی یہ حدیث ''حسن'' کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے، اس لئے امام ترمذیؒ نے اس پر ''حسن غریب'' ہونے کا حکم لگایا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک طریق کی رو سے غریب یعنی ضعیف ہے اور مجموعۂ طرق کے لحاظ سے حسن ہے، لیکن مصنف خطیب تبریزی نے چونکہ یہاں ابن عباسؓ کے حوالہ سے یہ حدیث نقل کی ہے اور ابن عباسؓ کے طریق سے یہ ضعیف ہے اس لئے مصنفؒ نے اس پر صرف ''غریب'' ہونے کا حکم لگایا۔

۹۹/ ۲۷ وعن ابن عمرؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: "يَكُوْنُ فِيْ أُمَّتِيْ خَسْفٌ وَمَسْخٌ، وَذٰلِكَ فِي الْمُكَذِّبِيْنَ بِالْقَدْرِ" (رواه ابوداود، وروى الترمذی نحوه)(۱)

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: میری امت میں زمین میں دھنس جانا اور صورتوں کا مسخ ہوجانا بھی ہوگا

(۱) أخرجه أبوداود، کتاب السنة، باب لزوم السنة ۲/ ۶۳۲ والترمذی فی القدر، باب بدون ترجمة ۲/ ۳۸۔

اور یہ عذاب ان لوگوں پر ہوگا جو تقدیر کے منکر ہیں۔ (ابوداود) اور امام ترمذی علیہ الرحمہ نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

تشریح حدیث

منکرین تقدیر کے لئے عذاب کی وعید:

اس حدیث میں منکرین قدر کے لئے وعید کا بیان ہے اور ''امت'' سے امت اجابت مراد ہے، مطلب یہ کہ میری امت میں خسف ومسخ کا عذاب ہوگا، جو خاص طور پر تقدیر کی تکذیب کرنے والوں پر نازل ہوگا، ''خسف'' کے معنی زمین میں دھنسا دینا اور ''مسخ'' کے معنی بدتر صورت میں بدل جانا مثلاً انسان کا بندر بن جانا۔

ایک تعارض اور اس کا حل:

سوال یہ ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ: میری امت میں خسف ومسخ کا عذاب نہیں ہوگا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے حق میں اس کی دعا فرمائی تھی اور وہ قبول ہوئی؟

اس کے کئی جواب ہیں:

(۱) یہ جملہ ''یکون فی امتی الخ'' قضیۂ فرضیہ ہے جیسے **لو کان فیھما آلھۃ ......الخ** یعنی اگر میری امت میں خسف ومسخ کا عذاب ہوتا تو وہ مکذبین تقدیر میں ہوتا۔(۱)

(۲) خسف ومسخ کی نفی کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب زمانے سے ہے اور اثبات کا تعلق قرب قیامت سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے آپ کے قریبی زمانہ میں امت اس عذاب سے محفوظ رہے گی، البتہ جب قیامت قریب آجائے گی اور زمانہ نبوت دور ہو جائے گا اس وقت تقدیر کی تکذیب کرنے والوں میں یہ عذاب آسکتا ہے، گویا نفی واثبات دونوں کا زمانہ جدا جدا ہے اس لئے تعارض نہیں ہے، تعارض کے لئے اتحاد زمان ضروری ہے۔(۲)

---

(۱) المرقاۃ ۱/۲۸۵، واللمعات ۱/۳۹۶.

(۲) المرقاۃ ۱/۲۸۵.

(۳) بعض نے کہا کہ نفی عمومی عذاب کی ہے کہ یہ عذاب امت میں عمومی طریقے پر نہیں آئے گا جیسے امم سابقہ میں ہوا، اس امت میں مخصوص افراد اور مخصوص اقوام میں یہ عذاب آ سکتا ہے۔(۱)

(۴) بعض نے کہا جن روایات میں اس عذاب کا اثبات ہے اس سے خسف ومسخ باطنی مراد ہے کہ خسف سے ذلت اور مسخ سے قلب کی تاریکی مراد ہے، اور معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ ایسے لوگوں کو ذلیل فرمائے گا، ان کے قلوب تاریک ہو جائیں گے اور قلوب سے رحمت ومعرفت نکل جائے گی، قساوت، جہالت اور تکبر دل میں سما جائے گا۔(۲)

وروی الترمذي نحوه: اس کا مطلب یہ ہے کہ امام ترمذی نے بھی کچھ الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ اسی مضمون کی روایت نقل کی ہے، اس کا مضمون یہ ہے کہ: ایک شخص نے عبداللہ بن عمرؓ کے پاس کسی کے ذریعہ اپنا سلام بھیجا، مگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو یہ اطلاع پہنچی تھی کہ وہ سلام بھیجنے والا تقدیر کا منکر ہے چنانچہ آپ نے اس کے سلام کا جواب دینے سے انکار فرمایا اور یہ حدیث سنائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے: **یکون في هذه الأمة أو في أمتي خسف أو مسخ أو قذف في أهل القدر**، اس میں خسف اور مسخ کے ساتھ "قذف" (پتھروں سے ہلاک کرنا) کی بھی وعید ہے، یہ حدیث آگے فصل ثالث میں آ رہی ہے۔

۱۰۰ / ۲۸ وعنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: "اَلْقَدَرِيَّةُ مَجُوْسُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ، إِنْ مَرِضُوْا فَلَا تَعُوْدُوْهُمْ وَإِنْ مَاتُوْا فَلَا تَشْهَدُوْهُمْ" (رواه أحمد، وأبوداود)(۳)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: فرقۂ قدریہ اس امت کے مجوس ہیں، اگر یہ بیمار ہوں تو ان کی عیادت مت کرنا اور اگر مر جائیں تو جنازہ میں شریک مت ہونا۔ (رواہ احمد)

(۱) المرقاة ۱ / ۲۸۵.

(۲) المرقاة ۱ / ۲۸۵.

(۳) أخرجه ابوداود، كتاب السنة، باب فی القدر ۲ / ٦٤٤ واحمد ۲ / ۸٦ برقم ٥٥٨٦.

تشریح حدیث

منکرین تقدیر کے ساتھ میل جول کی ممانعت:

اس حدیث پاک میں بھی مکذبین قدر کے ساتھ میل جول رکھنے سے منع فرمایا گیا تا کہ ان کے فاسد خیالات اور گمراہ کن عقائد کا اثر نیک طبیعت اور خوش عقیدہ لوگوں پر نہ پڑے، چنانچہ فرمایا کہ: فرقۂ قدریہ اس امت کے مجوس ہیں، پس اگر وہ بیمار ہوجائیں تو ان کی عیادت نہ کرو اور اگر مرجائیں تو ان کے جنازے میں شرکت نہ کرو، شراح نے فرمایا کہ یہاں قدریہ سے مراد معتزلہ ہیں، معتزلہ کو تشبیہ دی گئی ہے مجوس کے ساتھ تعدد خالق کا عقیدہ رکھنے میں، مجوس تعدد الٰہ کے قائل تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ الٰہ دو ہیں ایک خالق خیر اور ایک خالق شر، خالق خیر کا نام ہے: یزداں اور خالق شر کا نام: اہرمن ہے، معتزلہ بھی تعددِ خالق کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ افعال خیر کا خالق اللہ اور افعال شر کا خالق خود بندہ ہے، اس لئے معتزلہ مجوس کے مشابہ ہوئے۔(۱)

إن مرضوا فلاتعادوهم......الخ: جوحضرات قدریہ (معتزلہ) کو کافر کہتے ہیں ان کے یہاں یہ نہی حقیقت پر محمول ہے اور جو ان کو کافر نہیں مانتے ان کے یہاں یہ نہی زجر وتوبیخ کے طور پر ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو چیزوں کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ: یہ حقوق فرض کفایہ کے قبیل سے ہیں اور ان حالات میں آدمی کو ان چیزوں کی احتیاج بھی ہوتی ہے، پس جب احتیاج کے باوجود فرض کفایہ کی قبیل کے حقوق کی ادائیگی سے روک دیا گیا تو دیگر حقوق کی ادائیگی سے بدرجۂ اولی روکا جائے گا۔

۱۰۱/ ۲۹ وَعَنْ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم لاتُجَالِسُوْا أَهْلَ الْقَدْرِ، وَلاتُفَاتِحُوْهُمْ. (رواه ابوداود)(۲)

ترجمه: حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: قدریہ کے پاس اٹھنا بیٹھنا مت کرو، اور نہ ان کو اپنا حاکم بناؤ (دوسرا ترجمہ یہ ہوسکتا ہے) کہ ان سے سلام وکلام میں ابتداء نہ کرو۔

(۱)المرقاة۱/ ۲۸۵.

(۲)أخرجه أبوداود، كتاب السنة، باب في ذراري المشركين ۲/ ٦٤٩.

تشریح حدیث

اس حدیث میں بھی مکذبین بالقدر کے لئے زجروتوبیخ ہے کہ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا نہ رکھا جائے اور میل جول نہ کیا جائے۔

و لاتفاتحوهم: اس کے معنی میں کئی احتمال ہیں: (۱) یہ فتاحة (بضم الفاء وکسرہا) سے ماخوذ ہو بمعنی حکومت یعنی ان کو حاکم نہ بناؤ۔(۱)

(۲) یہ ماخوذ ہو فتح سے بمعنیٰ ابتداء کرنا آغاز کرنا، پھر آغاز کا تعلق کس چیز سے ہے؟ اس میں کئی احتمال ہیں: ایک یہ کہ ابتداء بالسلام نہ کرو کہ یہ بدعتی ہیں، اور اگر وہ سلام کریں تو جواب دینا واجب نہیں، دوسرے معنی یہ ہیں کہ ابتداء بالکلام نہ کرو، بدعتی کو ابتداء بالسلام وبالکلام کرنا مکروہ ہے، لیکن اگر اس کی اصلاح مقصود ہو، یا یہ سلام اور کلام اس کی توبہ کا ذریعہ بنے تو مستحب ہوگا۔(۲)

(۳) علامہ مظہرؒ نے فرمایا کہ معنی یہ ہیں کہ ان سے مناظرہ میں ابتداء نہ کرو کہ وہ عقلیات کے ماہر ہوتے ہیں اور چرب زبان ہوتے ہیں وہ تمہیں شک میں مبتلا کردیں گے لہذا حتی الامکان ان کے ساتھ مناظرہ سے احتراز کرو۔(۳)

۱۰۲ / ۳۰ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: سِتَّةٌ لَعَنْتُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهِ وَكُلُّ نَبِيٍّ يُجَابُ: اَلزَّائِدُ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ، وَالْمُكَذِّبُ بِقَدْرِ اللّٰهِ، وَالْمُتَسَلِّطُ بِالْجَبَرُوْتِ لِيُعِزَّ مَنْ أَذَلَّهُ اللّٰهُ وَيُذِلَّ مَنْ أَعَزَّهُ اللّٰهُ، وَالْمُسْتَحِلُّ لِحَرَمِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَحِلُّ مِنْ عِتْرَتِيْ مَاحَرَّمَ اللّٰهُ، وَالتَّارِكُ لِسُنَّتِيْ" (رواه البيهقي في "المدخل" ورزين في كتابه) (٤)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: چھ شخص ایسے ہیں جن پر میں لعنت بھیجتا ہوں اور اللہ نے بھی ان کو ملعون قرار دیا ہے اور ہر نبی کی

(۱) المرقاة ۱ / ۲۸٦.
(۲) المرقاة ۱ / ۲۸٦.
(۳) المفاتيح شرح المصابيح ۱ / ۲۱۳.
(٤) هذا الحديث موجود في شعب الإيمان للبيهقي، برقم ٤٠١٠ وأيضاً أخرجه الترمذي، كتاب القدر، باب بدون ترجمة برقم ٢١٥٤ كما في بعض النسخ ولا يوجد في النسخة الهندية ولا في تحفة الأشراف.

دعا قبول ہوتی ہے:

(۱) کتاب اللہ میں زیادتی کرنے والا، (۲) تقدیر الٰہی کو جھٹلانے والا، (۳) وہ شخص جو زبردست اقتدار پر قابض ہو جائے پھر ایسے شخص کو عزت دے جس کو اللہ نے ذلیل کیا ہو اور اس شخص کو ذلیل کرے جسکو اللہ تعالیٰ نے عزت وعظمت سے نوازا ہے، (۴) وہ شخص جو حرام امور کو حلال سمجھے، (۵) وہ شخص جو میری اولاد سے وہ چیز حلال جانے جو اللہ نے حرام کی ہے (۶) وہ شخص جو میری سنت کو چھوڑ دے۔ (بیہقی، رزین)

تشریح حدیث

چھ لوگوں پر اللہ کی لعنت:

اس حدیث میں مکذب قدر پر لعنت کا بیان ہے، حدیث کا مضمون یہ ہے کہ چھ اشخاص ایسے ہیں کہ میں ان پر لعنت کرتا ہوں اور اللہ بھی لعنت کرتا ہے، اور ہر نبی کی دعا قبول ہوتی ہے، پس ان کے حق میں کی گئی لعنت ضرور ان پر پڑ کر رہے گی، وہ چھ اشخاص یہ ہیں:

(۱) **الزائد فی کتاب اللہ:** علماء نے فرمایا کہ زیادتی فی کتاب اللہ کی کئی قسمیں ہیں:

(۱) الفاظ میں زیادتی کرے، یہ کفر ہے (۲) معنی میں زیادتی کرے، پھر اس کی دو صورتیں ہیں: (۱) اس زیادتی کی وجہ سے شریعت کے کسی حکم کا انکار لازم آئے، یہ بھی کفر ہے، (۲) شرعی حکم کا انکار تو لازم نہ آئے لیکن وہ زیادتی کتاب وسنت کے خلاف ہو تو یہ بدعت ہے۔

قراءت شاذہ کا حکم:

ابن حجر مکی نے فرمایا کہ الفاظ میں زیادتی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قرآن کریم کو قراءت شاذہ کے ساتھ بحیثیت قرآن کریم پڑھا جائے، کیونکہ شاذ قراءت کی حیثیت حدیث اور خبر واحد کی ہوتی ہے نہ کہ قرآن کی، کیونکہ قرآن میں تواتر ضروری ہے اور قراءت شاذہ میں تواتر نہیں ہوتا ہے، البتہ شاذ قرأت کو تفسیر کے طور پر یا کسی حکم کی وضاحت کے طور پر ذکر کرنا درست ہے۔(۱)

(۱) فتح الإله ۱/ ۴۷۹.

(۲) المكذب بقدر الله: یہ جملہ باب کے مناسب ہے، یعنی تقدیر کا انکار کرنے والا۔

(۳) المتسلط بالجبروت: یعنی لوگ اس کو حاکم بنانا نہیں چاہتے لیکن وہ طاقت کے بل بوتے پر اقتدار پر قابض ہوجائے اور زبردستی حاکم بن جائے، "لیعز" میں لام عاقبت کے معنی میں ہے کہ ایسے لوگ عموماً باعزت کو ذلیل اور ذلیل کو باعزت بناتے ہیں۔(۱)

(۴) المستحل لحرم الله: "حَرَم" بفتحتین مسجد حرام اور اس کے آس پاس کی جگہ کو کہتے ہیں یعنی حرم میں جو باتیں حرام ہیں ان کو حلال سمجھنے والا کہ حرم میں وہ کام کرے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے مثلاً وہاں شکار کرنا، وہاں کا درخت کاٹنا، وہاں بغیر احرام کے داخل ہونا وغیرہ، دوسرا ضبط الحرم بضمتین ہے یعنی اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھنے والا، ترجمہ اسی ضبط کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔

(۵) المستحل من عترتي الخ: "عترة" بمعنیٰ اولاد، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ اولاد مراد ہے جو حضرت فاطمہ کے واسطے سے چلی آرہی ہے جن کو "سادات" کہا جاتا ہے اس جملہ کے دو مطلب ہیں:

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کا ادب احترام توقیر وتعظیم لازم ہے، پس جو شخص سادات میں سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچائے ان کی بے حرمتی کرے اس پر اللہ ورسول کی لعنت ہے، اس وقت "مِنْ عترتی" میں من ابتدائیہ ہوگا۔

(۲) سادات کے حق میں گناہ کی شدت بیان کرنا مقصود ہے کہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھنا گناہ ہے لیکن اگر سادات میں سے کوئی ایسا کرے تو اس کو گناہ زیادہ ہوگا، اس وقت "مِنْ" بیانیہ ہوگا۔

(۶) التارک لسنتي: ترک سنت کی دو صورتیں ہیں، (۱) کاہلی کی وجہ سے ہو تو یہ کبھی کبھار معفو عنہ ہے اور اس کی عادت بنالینا گناہ ہے (۲) بطور استخفاف ہو کہ سنت کو حقیر سمجھ کر ترک کرے یہ کفر ہے۔(۲)

۱۰۳ / ۳۱ وَعَنْ مَطَرِبْنِ عُكَامِسٍ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: "إِذَاقَضَى اللّٰهُ لِعَبْدٍأَنْ يَمُوْتَ بِأَرْضٍ جَعَلَ لَهُ إِلَيْهَا حَاجَةً" (رواه احمد، والترمذی)(۳)

---

(۱) المرقاة ۱ / ۲۸۸.

(۲) اللمعات ۱ / ٤۰۱.

(۳) أخرجه الترمذي، كتاب القدر، باب ماجاء أن النفس حيث ما كتب لها ۲ / ۳٦، واحمد ٥ / ۲۲۷ برقم ۲۲۰۳٤، ۲۲۰۳٥.

ترجمہ: حضرت مطر بن عکامسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کی موت کو کسی زمین میں مقدر کر دیتا ہے تو اس زمین میں اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی ضرورت پیدا کر دیتے ہیں (تا کہ وہ وہاں جائے اور مر جائے) (احمد، ترمذی)

تشریح حدیث

احوال مطر بن عکامس:

مطر بن عکامس نام ہے اور "اسلمی" نسبت ہے، کوفیین میں شمار ہوتے ہیں، بعض نے ان کی صحابیت کا انکار کیا ہے، لیکن راجح یہ ہے کہ صحابی ہیں، البتہ قلیل الروایۃ ہیں اور ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے، چنانچہ امام ترمذی نے کہا کہ: "**ولانعرف لمطر بن عكامس عن النبي صلى الله عليه وسلم غيرهذا الحديث**"(۱)

جائے موت بھی مقدر:

اس حدیث میں تقدیر کا بیان ہے کہ جائے موت بھی مقدر ہے چنانچہ اللہ جب کسی بندے کی کسی زمین میں موت مقدر فرمادیتے ہیں تو وہاں اس کی کوئی ضرورت اور حاجت پیدا فرمادیتے ہیں وہ اپنی اس ضرورت کی تکمیل کے لئے وہاں جاتا ہے اور مر جاتا ہے، حدیث کے اس مضمون میں آیت کریمہ "وَمَاتَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ" کی طرف اشارہ ہے، بعض روایات میں ہے کہ آدمی جہاں کی مٹی سے پیدا ہوتا ہے وہیں اس کی موت ہوتی ہے۔

١٠٤/٣٢ وعن عائشةؓ قَالَتْ: قُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! ذَرَارِيُّ الْمُوْمِنِيْنَ؟ قَالَ: "مِنْ آبَائِهِمْ" فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ بِلاعَمَلٍ؟ قَالَ: اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَاكَانُوْا عَامِلِيْنَ" قُلْتُ: فَذَرَارِيُّ الْمُشْرِكِيْنَ؟ قَالَ: "مِنْ آبَائِهِمْ" قُلْتُ: بِلاعَمَلٍ؟ قَالَ: اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَاكَانُوْا عَامِلِيْنَ"(رواه ابوداود)(۲)

(١)الإصابة ١٠١/٦.

(٢)أخرجه ابوداود، كتاب السنة، باب في ذرارى المشركين ٦٤٨/٢.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ! (جنت وجہنم کے سلسلہ میں) مسلمان بچوں کا کیا حکم ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ اپنے باپوں کے تابع ہیں، (یعنی وہ اپنے آباء کے تابع ہونے کی وجہ سے جنت میں ہیں) میں نے عرض کیا یارسول اللہ بغیر کسی عمل کے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ وہ بچے کیا عمل کرنے والے تھے، میں نے پھر معلوم کیا کہ مشرکین کی اولاد کا کیا حکم ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ بھی اپنے باپوں کے تابع ہیں، میں نے پوچھا بغیر کسی عمل کے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ شانہ ہی زیادہ جانتے ہیں وہ بچے کیا کرنے والے تھے۔ (ابوداود)

تشریح حدیث

اطفال مؤمنین اور اطفال مشرکین کا حکم:

حضرت عائشہؓ نے اطفال مومنین ومشرکین کے بارے میں سوال کیا کہ ان کا کیا حکم ہوگا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جنت اور دوزخ کے سلسلہ میں اپنے آباء کے تابع ہوں گے، اس پر حضرت عائشہؓ کو تعجب ہوا کہ یارسول اللہ بلاعمل کے ہی یہ جنت اوردوزخ میں جائیں گے؟ تو فرمایا کہ اللہ زیادہ جانتے ہیں کہ وہ بڑے ہوکر کیا اعمال کرتے یعنی اللہ بخوبی جانتے ہیں کہ اطفال مومنین بڑے ہوتے تو ایمان واعمال کو اختیار کرتے، لہٰذا وہ جنت میں داخل کئے جائیں گے، اسی طرح اطفال مشرکین کے متعلق بھی اللہ کو معلوم ہے کہ وہ بڑے ہوتے تو کفر وشرک میں مبتلا ہوتے، پس وہ جہنم کے مستحق ہیں، عام شراح نے اس جملہ کے یہی معنی تحریر فرمائے ہیں۔(۱)

اس حدیث سے اطفال مومنین کا جنتی ہونا معلوم ہوا اور ان کا یہ حکم گذشتہ حدیث "عصفور من عصافیر الجنۃ" کے خلاف نہیں ہے جیسا کہ اس حدیث کی تشریح کے ذیل میں ذکر کیا جاچکا ہے، فلیراجع۔

نیز اس حدیث سے اطفال مشرکین کا جہنمی ہونا معلوم ہوتا ہے، چنانچہ ان کے متعلق ایک قول یہی ہے، ان کے بارے میں دیگر متعدد اقوال اور راجح قول کی تعیین سب ماقبل میں گذر چکا ہے۔

علامہ تورپشتیؒ نے اس حدیث کا یہ مطلب بیان فرمایا کہ من آبائھم میں اطفال مشرکین کا حکم دنیوی

(۱) المرقاۃ ۱/ ۲۹۰۔

مذکور ہے کہ دنیوی احکام میں اسلام اور کفر کے لحاظ سے وہ اپنے والدین کے تابع ہونگے اور **اللہ اعلم بما کانوا عاملین** میں حکم اخروی کا بیان ہے کہ وہ اللہ کے علم کے مطابق جنت یا جہنم میں جائیں گے، لیکن پہلا مطلب ظاہر ہے، اسی کو قاضی بیضاویؒ نے اختیار کیا ہے۔(۱)

۱۰۵/۳۳ وعن ابن مسعودؓ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ''اَلْوَائِدَةُ وَالْمَوْؤُدَةُ فِي النَّارِ'' (رواہ ابوداود والترمذي)(۲)

ترجمہ :حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: زندہ بچی کو دفن کرنے والی عورت اوروہ بچی جس کو دفن کیا گیا ہے دونوں جہنم میں ہوں گے۔ (ابوداود)

تشریح حدیث

زندہ درگورکرنے کی سزا:

الوائدة :وئدٌ سے اسم فاعل مؤنث ہے، یہ باب ضرب سے آتا ہے،اس کے معنی ہیں: زندہ بچے کو قبر میں دفن کرنا، زمانۂ جاہلیت میں عرب میں زندہ بچہ کوبالخصوص لڑکیوں کو زندہ درگورکرنے کا رواج تھا، اور اس کی صورت یہ ہوتی کہ جب عورت کو دردِزہ ہوتا تو ایک دایہ آتی اور گڑھا کھودتی،عورت اس پر بیٹھتی دایہ بچہ کی منتظررہتی، اگرلڑکا پیدا ہوتا تو دایہ اس کو اٹھالیتی اوراگرلڑکی ہوتی تو اس کوگڑھے میں چھوڑ دیتی، پس یہ دایہ''**وائدہ**'' ہوگئی اور''**موؤودة**'' وہ بچی کہلائے گی جس کوزندہ درگور کیا گیاہے، حدیث کے حکم کے مطابق یہ دونوں جہنمی ہیں۔(۳)

سوال ہوتاہے کہ ''وائدہ'' کا جہنمی ہونا تو صحیح ہے کہ اس نے قتل نفس کیا ہے،لیکن ''موؤدۃ'' جہنمی کیوں ہے؟ وہ تو بےقصور ہے؟

جواب یہ ہے کہ وہ مشرکین کی نابالغ اولاد ہے، لہٰذا اپنے والدین کے تابع ہوکر وہ بھی جہنمی ہوگی جیسا کہ اولادمشرکین کے بارے میں ایک قول یہی ہے، جواوپر حدیث میں بھی آیاہے،اسی بناپراس حدیث

(۱) تحفة الابرار ۱/۱۰۳–۱۰٤.

(۲) أخرجه أبوداود، کتاب السنة، باب فی ذراری المشرکین ۲/٦٤٩.

(۳)المرقاة ۱/۲۹۱.

کو باب الایمان بالقدر میں لایا گیا ہے کہ جنتی وجہنمی ہونا مقدر ہے۔

بعض حضرات نے کہا کہ یہ بچی جہنمی نہیں ہے جیسا کہ مشکوۃ جلد ثانی میں روایت ہے لہٰذا اس حدیث میں تاویل ہوگی وہ یہ کہ ''الموؤدة'' ''الموؤدة لها '' کے معنی میں ہیں بحذف الصلۃ، یعنی وہ عورت جس کی وجہ سے بچے کو زندہ دفن کیا گیا یعنی بچے کی ماں وہ جہنم میں جائے گی، اس لئے کہ وہ اس فعل حرام پر راضی تھی اور وہ بھی قتل ناحق میں شریک تھی، یہی معنی راجح ہیں، یعنی دایا اور بچے کی ماں دونوں جہنمی ہیں۔(۱)

الفصل الثالث

۱۰۶ / ۳۴ عَنْ أبِي الدرداءؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ''إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ فَرَغَ إِلٰى كُلِّ عَبْدٍ مِنْ خَلْقِهِ مِنْ خَمْسٍ: مِنْ أَجَلِهِ، وَعَمَلِهِ، وَمَضْجَعِهِ، وَأَثَرِهِ، وَرِزْقِهِ'' (رواه احمد)(۲)

ترجمہ: حضرت ابوالدرداءؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ شانہ اپنی مخلوق میں سے ہر ایک بندہ کے متعلق پانچ باتیں (لکھکر) فارغ ہو چکے ہیں (۱) اس کی موت (کہ کب آئے گی) (۲) اس کے نیک و بد اعمال، (۳) اس کے لیٹنے کی جگہ، (۴) اس کی واپسی کی جگہ، (۵) اسکا رزق۔ (احمد)

تشریح حدیث

احوال ابوالدرداء:

آپ کا نام عویمر ابن عامر الأنصاری الخزرجی ہے اور بقول بعض عامر نام ہے اور عویمر لقب ہے، ابوالدرداء کنیت ہے، بدر کے دن اسلام قبول کیا اور پھر احد وغیرہ میں شریک ہوئے، حضور علیہ السلام نے ان کو ''حکیم امتی '' کے اعزاز سے نوازا، درداء آپکی بیٹی کا نام تھا، ان کی طرف منسوب ہوکر ابوالدرداء کنیت پڑی، ۳۲ھ میں دمشق میں حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں ان کی وفات ہوئی، وہ دمشق کے قاضی بھی تھے۔(۳)

(۱) المرقاة ۱ / ۲۹۱.

(۲) أخرجه احمد ۵/ ۱۹۷ برقم ۲۱۷۷ و ۲۱۷۷۱.

(۳) الإصابة ۴ / ۶۳۲.

مقدر من اللہ پانچ امور:

اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ہر بندہ کے لئے تقدیر میں پانچ چیزیں لکھی جا چکی ہیں: (۱) اس کی موت کب آئے گی، (۲) اس کا عمل بھی لکھا جا چکا ہے، (۳،۴) ''مضجع'' اور ''اثر'' بھی طے ہے (۵) رزق بھی طے کیا جا چکا ہے کہ کس قدر ملے گا۔

''مضجع'' اور ''اثر'' کی دو تفسیریں ہیں: (۱) بعض نے کہا کہ ''مضجع'' سے مراد سکون وقرار اور ''اثر'' سے چلنا پھرنا اور حرکت کرنا ہے کہ اس بندہ کو دنیا میں کتنا سکون میسر آئے گا اور کتنی محنت کرے گا۔

(۲) بعض نے کہا کہ ''مضجع'' سے مراد یہ ہے کہ اس کی قبر کہاں ہوگی اور کہاں موت آئیگی، اور ''اثر'' سے اس کا اخروی ٹھکانہ مراد ہے یعنی اس کی جائے موت اور جائے دفن اور جنت وجہنم میں سے جو بھی اس کا ٹھکانہ ہے وہ پہلے سے مقدر ہو چکا ہے، ترجمہ اسی تفسیر کے مطابق کیا گیا ہے۔(۱)

۱۰۷/۳۵ عن عائشةؓ قالت: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: ''مَنْ تَكَلَّمَ فِيْ شَيْءٍ مِنَ الْقَدْرِ سُئِلَ عَنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ لَمْ يَتَكَلَّمْ فِيْهِ لَمْ يُسْأَلْ عَنْهُ''(رواه ابن ماجه)(۲)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: جو شخص تقدیر کے مسئلہ میں بحث ومباحثہ کرے گا قیامت میں اس سے باز پرس ہوگی اور جو شخص (تقدیر پر ایمان لا کر اس سلسلہ میں) بحث ومباحثہ نہیں کرے گا وہ اس مواخذہ سے بچ جائے گا۔(ابن ماجہ)

تشریح حدیث

تقدیر میں رائے زنی کرنے والے سے باز پرس:

اس حدیث میں بھی تقدیر کا بیان ہے کہ عقلی دلائل کے ذریعہ تقدیر کے بارے میں بحث نہیں کرنی چاہئے کیونکہ تقدیر کے بارے میں مناقشہ ومباحثہ بہت سی مرتبہ گمراہی کا ذریعہ بنجاتا ہے، البتہ نصوص میں اس

(۱) المرقاة ۱/۲۹۲.

(۲) أخرجه ابن ماجة في المقدمة، ۱/۹.

بارے میں جو کچھ وارد ہوا ہے اس کی تشریح وتوضیح کی جاسکتی ہے، جو شخص تقدیر کے بارے میں تکرار ومباحثہ کرے گا اس سے قیامت کے دن باز پرس ہوگی کیونکہ بذریعہ عقل بحث عن التقدیر منہی عنہ ہے، اسلئے اس سے باز پرس ہوگی کہ اس سلسلہ میں بحث کیوں کی؟ اور جو شخص اپنی زبان بند رکھے گا اور بغیر بحث ومباحثہ کے تقدیر پر ایمان لائے گا وہ اس باز پرس سے محفوظ رہے گا۔

١٠٨/٣٦ وَعَنِ ابْنِ الديلمي رحمه الله تعالى قَالَ: أَتَيْتُ أُبَيَّ بنَ كَعْبٍ، فَقُلْتُ لَهُ: قَدْوَقَعَ فِيْ نَفْسِي شَيٌّ مِنَ الْقَدْرِ، فَحَدِّثْنِي لَعَلَ اللّٰهَ أَنْ يُذْهِبَهُ مِنْ قَلْبِيْ، فَقَالَ: لَوْ أَنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ عَذَّبَ أَهْلَ سمٰواتِهٖ وَأَهْلَ أَرْضِهٖ؛ عَذَّبَهُمْ وَهُوَغَيْرُظَالِمٍ لَهُمْ، وَلَوْرَحِمَهُمْ كَانَتْ رَحْمَتُهُ خَيْراً لَهُمْ مِنْ أَعْمَالِهِمْ وَلَوْاَنْفَقْتَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَباًفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَاقَبِلَهُ اللّٰهُ مِنْكَ حَتّٰى تُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ، وَتَعْلَمَ أَنَّ مَاأَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ، وَأَنَّ مَاأَخْطَاكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَكَ وَلَوْمُتَّ عَلىٰ غَيْرِهٰذَا لَدَخَلْتَ النَّارَ؛ قَالَ: ثُمَّ أَتَيْتُ عَبْدَاللّٰهِ بنَ مَسْعُوْدٍ، فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ، قَالَ: ثُمَّ أَتَيْتُ حُذَيْفَةَ بنَ الْيَمَانِ، فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ أَتَيْتُ زَيْدَ بنَ ثَابِتٍ فَحَدَّثَنِيْ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَ ذٰلِكَ. (رواه احمد، وأبو داود وابن ماجه)(۱)

ترجمه ومفهوم: ابن دیلمیؒ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ: میں حضرت ابی بن کعبؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اورعرض کیا کہ: میرے دل میں تقدیر کے بارے میں کچھ شبہ پیدا ہوگیا ہے مثلاً (یہ کہ جب تمام چیزیں نوشتہ تقدیر کے مطابق ہیں تو پھر ثواب وعذاب کیسا) آپ مجھے کوئی ایسی بات بتائیں جسکی برکت سے اللہ تعالیٰ میرے دل سے اس شبہ کو دورکردے (یہ سن کر) حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا کہ (صاف صاف سن لو) اگر اللہ تعالیٰ شانہ تمام آسمان والوں اور تمام زمین والوں کو عذاب دینے لگے تو وہ اس عذاب دینے میں ظالم نہیں ہوگا (کیونکہ ظلم تو کہتے ہیں دوسرے کی ملک میں تصرف کرنے کو اور یہاں یہ بات نہیں ہے، تمام مخلوق اللہ کی بنائی ہوئی ہے اس کی اپنی چیز ہے وہ اس میں جو چاہے تصرف کرے) اوراگر بجائے

(۱) أخرجه احمد في مسنده، رقم الحديث: (٢١٥٨٩، ٢١٦١١، ٢١٦٥٣) وابوداود في سننه في باب القدر. (٤٦٩٩) ابن ماجة في المقدمة، باب في القدر ١/٩.

عذاب کے سب کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ فرمائے تو یہ اللہ کا معاملہ اور اس کی رحمت ان کے اعمال خیر سے بدرجہا بہتر ہوگا، اور اگر تو احد پہاڑ کے برابر سونا اللہ کے لئے خرچ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو قبول نہیں فرمائیں گے جب تک تو تقدیر پر ایمان نہیں لائے گا (اور ایمان بالقدر میں یہ بھی داخل ہے کہ تم یہ جان لو) کہ جو چیز تجھ کو پہنچی ہے (مصیبت یا راحت، غمی یا خوشی) ممکن نہیں تھا کہ وہ نہ پہنچتی اور جو چیز تجھ کو نہیں پہنچی تو نہیں ممکن تھا کہ وہ شی تجھ کو پہنچتی (مطلب یہ کہ جو کچھ ہوا وہ ضرور ہونا تھا)''ولو مت علی غیر هذا''اگر تو اس عقیدہ کے خلاف دوسرے عقیدہ پر مرے گا تو جہنم میں جائے گا۔

ابن دیلمیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابی بن کعبؓ کی یہ بات سن کر میں (مزید اپنے اطمینان کے لئے) عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں (وہی سوال لے کر) حاضر ہوا تو انہوں نے بھی بعینہ یہی جواب دیا، اسی طرح میں پھر حذیفہ بن یمانؓ کے پاس گیا تو انہوں نے بھی یہی جواب ارشاد فرمایا اور پھر اخیر میں زید بن ثابتؓ کے پاس گیا انہوں نے اسی طرح کی بات مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کر کے بیان فرمائی۔ (احمد، ابوداود، ابن ماجہ)

تشریح حدیث

احوال ابن دیلمی:

ان کے نام میں کئی قول ہیں، صاحب مشکوۃ نے اپنے رسالہ اسماء الرجال میں ضحاک بن فیروز بتایا ہے،'' دیلم'' مشہور پہاڑ ہے، ان کے قبیلے کے لوگ اس پہاڑ کے قریب آباد تھے، اس لئے ''دیلمی'' کہلاتے ہیں، ان کے والد فیروز دیلمی صحابی ہیں اور نجاشی کے بھانجے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے کامیابی کی دعا دی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخیر حیات میں اسود عنسی نے نبوت کا دعوی کیا اس کو فیروز دیلمیؓ نے ہی قتل کیا تھا، اس کی خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض الوفات میں پہنچی تو آپ نے فرمایا تھا: قَتَلَه الرجلُ الصالحُ فیروزُ فَازَ فیروزُ۔(۱)

ابن الدیلمی تابعی کا مسئلہ تقدیر کے بارے میں مختلف صحابہ سے استفسار:

ابن الدیلمی تابعیؒ کو مسئلہ تقدیر کے بارے میں کچھ شبہات تھے، ان کے حل کے لئے وہ مختلف صحابہ

(۱) المرقاة ۱/ ۲۹٤.

کرام کے پاس تشریف لے گئے، حسن اتفاق یہ ہوا کہ تمام صحابہ نے یکساں جواب مرحمت فرمایا جو یہاں حدیث میں مذکور ہے، ترجمہ سے اس کا مفہوم ظاہر اور واضح ہے۔

عذبهم وهو غير ظالم لهم الخ: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ پر بندوں کا کوئی حق واجب نہیں، گو بندے حکم الٰہی پر کاربند ہوں، اہل سنۃ کا یہی مسلک ہے، جبکہ معتزلہ اللہ پر اس کے وجوب کے قائل ہیں، جس کی اس سے تردید ہوتی ہے۔

۱۰۹ / ۳۷ وعن نافع أَنَّ رَجُلاً أَتَى ابنَ عُمَرَؓ فقال: إِنَّ فُلاناً يُقْرِئُ عَلَيْكَ السَّلامَ، فَقَالَ: إِنَّهُ بَلَغَنِيْ أَنَّهُ، قَدْ أَحْدَثَ، فَإِنْ كَانَ قَدْ أَحْدَثَ فَلا تُقْرِءْهُ مِنِّى السَّلامَ، فَإِنِّىْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: "يَكُوْنُ فِيْ أُمَّتِيْ أَوْفِيْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ خَسْفٌ وَمَسْخٌ أَوْقَذْفٌ فِيْ أَهْلِ الْقَدْرِ" (رواه الترمذى، وأبو داود، وابن ماجه، وقال الترمذى: هذا حديث حسن صحيح غريب)(۱)

ترجمہ: حضرت نافعؒ سے مروی ہے کہ: ایک شخص حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ: فلاں شخص نے آپ کو سلام کہا ہے حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ: اس شخص نے دین میں کوئی نئی بات نکالی ہے، اگر واقعی اس نے دین میں کوئی نئی بات پیدا کی ہے تو میری طرف سے جواب میں اسے سلام نہ پہنچانا، اس لئے کہ میں نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: میری امت میں یا یہ فرمایا کہ اس امت میں اہل قدر (تقدیر کے منکرین) میں زمین میں دھنس جانا اور صورت کا مسخ ہوجانا یا پتھر برس جانا یہ عذاب ہوں گے، (ترمذی، ابوداود، ابن ماجہ) اور امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح وغریب ہے۔

تشریح حدیث

احوال نافع:

نافع: عبداللہ بن عمرؓ کے غلام تھے، کبار تابعین میں سے ہیں، امام مالک کے استاذ ہیں، امام مالک

(۱) أخرجه الترمذى فى سننه فى ابواب القدر (۲۱۵۲) وأبوداود، في كتاب السنة، باب فى القدر ۲ / ٦٤٦ وابن ماجه فى المقدمة، باب فى القدر ۱ / ۸.

فرماتے ہیں کہ جب میں نافع عن ابن عمر کی سند سے کوئی روایت سنتا ہوں تو اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ یہ حدیث کسی اور سے سنوں یا نہ سنوں، یعنی ان سے سماع کے بعد کسی اور سے سماع کی احتیاج نہیں رہتی، اسی لئے ائمہ حدیث نے ''مالک عن نافع عن ابن عمر'' اس سند کو ''اصح الاسانید'' قرار دیا ہے۔

ایک منکر تقدیر اور حضرت ابن عمرؓ کا اس کے ساتھ طرز عمل:

اس حدیث پاک میں مکذبین بالقدر کے لئے وعید ہے اور ایک واقعہ بھی مذکور ہے، جس کا اجمالی بیان پہلے بھی آ چکا ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ فلاں نے آپ کو سلام کہا ہے، آنے والا حسین بن عبدالرحمٰن تھا جو کوفہ سے آیا تھا اور فلاں سے مراد معبد جہنی ہے جو فرقۂ قدریہ کا بانی ہے، معبد جہنی نے حسین سے کہا تھا کہ تم مدینہ جا رہے ہو وہاں اگر کسی صحابی سے ملاقات ہو تو ان کو میرا اسلام کہنا، حسین مدینہ طیبہ آئے یہاں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ملاقات ہوئی تو حسین نے ان کو معبد جہنی کا سلام پیش کیا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو معبد کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ تقدیر کا انکار کرتا ہے، تو انھوں نے فرمایا کہ مجھے خبر پہنچی ہے کہ اس نے ایک بدعت ایجاد کی ہے، اگر واقعہ ایسا ہی ہے تو میری طرف سے اس کو سلام نہ کہنا، پھر انہوں نے ایک حدیث مرفوع سنائی جس میں منکرین قدر کے لئے عذاب کی وعید بیان کی گئی ہے، نیز حضرت عبداللہ بن عمر نے اس کے سلام کو قبول نہیں کیا، اس سے معلوم ہوا کہ بدعتی کے سلام کا جواب دینا واجب نہیں، الا یہ کہ اس کی اصلاح مقصود ہو۔

حدیث کا درجہ اور ''حسن صحیح غریب'' کا اجتماع:

وقال الترمذی: هذا حديث حسن صحيح غريب: یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ ایک سند کو بیک وقت حسن، صحیح اور غریب قرار دینا کیونکر درست ہے؟ اور یہ متضاد صفات ایک ہی سند میں کیسے مجتمع ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث دراصل متعدد اسانید سے مروی ہے جن میں سے کوئی حسن، کوئی صحیح اور کوئی غریب ہے، پس یہ علیحدہ علیحدہ اسانید کے لحاظ سے حکم لگایا گیا ہے، نہ کہ ایک سند کے لحاظ سے۔

۱۱۰/۳۸ وَعَنْ عَلِيٍّؓ قَالَ: سَأَلَتْ خَدِيْجَةُ النَّبِيَّ صلی الله عليه وسلم عَنْ وَلَدَيْنِ مَاتَالَهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی الله عليه وسلم: "هُمَافِي النَّارِ"قَالَ: فَلَمَّا رَأىٰ الْكَرَاهَةَ فِيْ وَجْهِهَا قَالَ: "لَوْ رَأَيْتِ مَكَانَهُمَا

لَأَبْغَضْتِهِمَا"،قَالَتْ : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! فَوَلَدِيْ مِنْکَ؟ قَالَ: "فِي الْجَنَّةِ" ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ وَأَوْلَادَهُمْ فِي الْجَنَّةِ، وَإِنَّ الْمُشْرِكِيْنَ وَأَوْلَادَهُمْ فِي النَّارِ"،ثُمَّ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : "وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ . (رواہ احمد)(۱)

ترجمہ : حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ: حضرت خدیجہؓ نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اپنے ان دوبچوں کے بارے میں جوزمانۂ جاہلیت میں (اسلام سے پہلے) مرگئے تھے؟آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا:وہ دونوں بچے جہنم میں ہیں،حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ:جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کے چہرہ کا رنگ (اپنے بچوں کے بارے میں یہ سن کر) بدلا ہوا (رنجیدہ) دیکھاتو فرمایا کہ: اگرتم ان بچوں کے ٹھکانے اوران کے حال کو دیکھوکہ وہ کس طرح خدا کی رحمت سے دور ہیں تو تم کو ان بچوں سے نفرت ہوجائے، پھرحضرت خدیجہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! میری وہ اولاد جوآپ سے پیداہوئی ہے (قاسم اورعبداللہ)ان کا کیا حال ہے؟آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ جنت میں ہیں،اس کے بعدآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی:"وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيْمَانٍ اَلْحَقْنَابِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ" (۲)یعنی جولوگ ایمان لائے اوران کی اولاد نے ایمان کے ساتھ ان کا اتباع کیا تو ہم ان کی اولادکو جنت میں انہیں کے ساتھ رکھیں گے۔(احمد)

تشریح حدیث

احوال ام المؤمنین خدیجۃ الکبریٰؓ:

خدیجہ بنت خویلد بن اسد القرشیہ،انہوں نے پہلے ابو ہالہ بن زرارہ سے نکاح کیا، ان کے فوت ہونے کے بعدعتیق بن عائذ سے نکاح ہوا ،پھران کے بعدآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا، پہلے دوشوہروں سے دوبچے بھی پیداہوئے،لیکن نابالغی کی حالت میں ان کاانتقال ہوگیا،انہی کے بارے میں اس حدیث میں استفسارکیا گیاہے،حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمرچالیس

(۱)أخرجه أحمد ۱/ ۱۳٤ برقم: ۱۱۳۱.

(۲)من الطور: ۲۱.

سال تھی جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۲۰ یا ۲۵ سال تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً حضرت خدیجہؓ سے نکاح کیا اور جب تک وہ حیات رہیں اس وقت تک کسی اور سے نکاح نہیں فرمایا، حضرت ابراہیم کے علاوہ آپ کی تمام اولاد انہی کے بطن سے پیدا ہوئی، حضرت ابراہیم: ماریہ قبطیہ سے تولد ہوئے، حضرت خدیجہؓ علی الاطلاق سب سے پہلے ایمان لانے والی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غم گسار، معاون اور مددگار تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بہت محبت تھی، ان کی وفات کے بعد ہمیشہ ان کو یاد فرمایا کرتے تھے، ۶۵ سال کی عمر میں ہجرت سے ۴ یا ۵ سال قبل وفات ہوئی اور مقام حجون میں تدفین ہوئی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھوں سے ان کو دفنایا، اس وقت تک نماز جنازہ مشروع نہیں ہوئی تھی۔(۱)

حضرت خدیجہؓ کا اپنے بچوں کے ٹھکانے کے بارے میں استفسار:

اس حدیث میں بھی اولاد مؤمنین اور اولاد مشرکین کے جنتی یا جہنمی ہونے کا بیان ہے، جس کی تفصیل پہلے آچکی ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے اپنے دو بچوں کے بارے میں سوال کیا، جو سابق شوہروں سے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ دونوں جہنم میں ہیں، اس سے حضرت خدیجہؓ کو غم ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم ان کی جگہ دیکھ لو تو تم بھی ان سے نفرت کرنے لگو، کیونکہ انکے ٹھکانے اور ان کے احوال سے اگر تمھیں آگاہی ہوجائے تو تمھیں ان کا عنداللہ مبغوض ہونا معلوم ہوجائے گا اور جو اللہ کا مبغوض ہوتا ہے مؤمن کامل اس سے نفرت کرتا ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب سمجھ گئے کہ ان کے باپ اللہ کے دشمن ہیں تو باپ ہونے کے باوجود ان سے برأت کا اظہار کیا، حضرت خدیجہؓ نے سوال کیا کہ میری جو اولاد آپ سے ہے وہ کہاں ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جنت میں ہیں، پھر ضابطہ بتایا کہ مومنین اور ان کی اولاد جنت میں داخل کی جاتی ہے اور مشرکین اور ان کی اولاد جہنم میں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دلیل میں یہ آیت کریمہ بھی پڑھی: **والذین آمنوا واتبعتهم الآية.**

یہاں سوال ہوتا ہے کہ آیت میں ذریت سے بالغ اولاد مراد ہے کہ مومن اولاد کا درجہ جنت میں کم ہوا تو ان کو والدین کے درجہ میں پہنچا دیا جائے گا، پھر اس آیت سے حدیث کی تائید کیسے ہوگی؟ کیونکہ حدیث

(۱) الإصابة ۸/۱۰۳، والمرقاة ۱/۲۹۷.

نابالغ اولاد سے متعلق ہے؟

جواب یہ ہے کہ: ذریت میں یہاں بالغ ونابالغ دونوں قسم کی اولاد داخل ہے اس لئے آیت کریمہ سے استشہاد درست ہے۔

۱۱۱/ ۳۹ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ مَسَحَ ظَهْرَهُ، فَسَقَطَ عَنْ ظَهْرِهٖ كُلُّ نَسَمَةٍ هُوَ خَالِقُهَا مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَجَعَلَ بَيْنَ عَيْنَيْ كُلِّ إِنْسَانٍ مِنْهُمْ وَبِيْصاً مِنْ نُوْرٍ، ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلٰى آدَمَ، فَقَالَ: أَيْ رَبِّ! مَنْ هٰؤُلَاءِ؟ قَالَ ذُرِّيَّتُكَ، فَرَأىٰ رَجُلاً مِنْهُمْ فَأَعْجَبَهُ وَبِيْصُ مَابَيْنَ عَيْنَيْهِ، قَالَ: أَيْ رَبِّ! مَنْ هٰذَا؟ قَالَ: دَاوُدُ، فَقَالَ: أَيْ رَبِّ! كَمْ جَعَلْتَ عُمْرَهُ؟ قَالَ: سِتِّيْنَ سَنَةً، قَالَ رَبِّ زِدْهُ مِنْ عُمْرِيْ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَلَمَّا انْقَضٰى عُمْرُ آدَمَ إِلَّا أَرْبَعِيْنَ جَاءَهُ مَلَكُ الْمَوْتِ، فَقَالَ آدَمُ: أَوَلَمْ يَبْقَ مِنْ عُمْرِيْ أَرْبَعُوْنَ سَنَةً؟ قَالَ أَوَلَمْ تُعْطِهَا ابْنَكَ دَاوُدَ؟ قال: فَجَحَدَ آدَمُ، فَجَحَدَتْ ذُرِّيَّتُهُ، وَنَسِيَ آدَمُ فَأَكَلَ مِنَ الشَّجَرَةِ فَنَسِيَتْ ذُرِّيَّتُهُ، وَخَطَأَ آدم وَخَطَأَتْ ذُرِّيَّتُهُ. (رواه الترمذی)(۱)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا پس ان کی پشت سے وہ تمام روحیں نکل پڑیں جن کو حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں اللہ تعالیٰ شانہ قیامت تک پیدا کرنے والے تھے، اللہ نے ان میں سے ہر انسان کی دو آنکھوں کے درمیان نور کی چمک رکھی، پھر ان سب کو حضرت آدم علیہ السلام کے روبرو پیش کیا (ان سب کو دیکھ کر) حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا: پروردگار یہ کون ہیں؟ اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا یہ تمہاری اولاد ہیں، حضرت آدم علیہ السلام نے ان میں سے ایک شخص کو دیکھا جس کی آنکھوں کے درمیان کی چمک ان کو بہت اچھی لگی، پوچھا پروردگار یہ کون ہے؟ فرمایا داود (علیہ السلام) ہیں، آدم علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب؟ آپ نے ان کی عمر کتنی مقرر کی ہے؟ فرمایا ساٹھ سال، حضرت آدم علیہ السلام نے

(۱) أخرجه الترمذی فی التفسیر، من سورة الأعراف ۲/ ۱۳۸ برقم ۳۰۷۶.

عرض کیا: میرے پروردگار میری عمر میں سے چالیس سال ان کو دے کر ان کی عمر میں اضافہ کر دیجئے، راوی فرماتے ہیں کہ: حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب حضرت آدم علیہ السلام کی عمر پورا ہونے میں چالیس سال باقی رہ گئے تو موت کا فرشتہ ان کے پاس آیا، حضرت آدم علیہ السلام نے فرشتہ سے کہا کہ: کیا ابھی میری عمر میں چالیس سال باقی نہیں ہیں؟ **ملک الموت** نے کہا، آپ نے اپنی عمر میں سے چالیس سال اپنے بیٹے داود کو نہیں دیئے تھے؟ حضرت آدم علیہ السلام نے انکار کیا اسی وجہ سے ان کی اولاد بھی انکار کرتی ہے اور آدم علیہ السلام بھول گئے (کہ انہوں نے شجرۂ ممنوعہ کو کھالیا) اس کی وجہ سے ان کی اولاد بھی بھولتی ہے اور حضرت آدم علیہ السلام نے خطاء کی تھی اس لئے ان کی اولاد بھی خطاء کرتی ہے۔ (ترمذی)

تشریحِ حدیث

حضرت آدم علیہ السلام کی عمر تبدیل کئے جانے کا واقعہ:

اس حدیث میں حضرت آدم علیہ السلام کی عمر تبدیل کئے جانے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، واقعہ یہ ہوا کہ آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی ذریت کو نکالا گیا اور ان کو بصورت انسان ظاہر کیا گیا البتہ جسم وجثہ میں وہ چیونٹی کے برابر تھے، ہر شخص کی پیشانی پر نور کی چمک رکھی، یہ فطرت سلیمہ کا نور تھا، آدم علیہ السلام نے سب پر نظر ڈالی تو ایک شخص کی پیشانی کا نور زیادہ اچھا لگا پوچھا کہ اے اللہ یہ کون ہے؟ ارشاد ہوا کہ: داود، آدم علیہ السلام نے پوچھا ان کی عمر کتنی ہے؟ ارشاد ہوا کہ: ساٹھ سال، آدم علیہ السلام نے عرض کیا کہ: میری عمر میں سے چالیس سال ان کو دیدیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، پھر جب آدم علیہ السلام کی عمر سے چالیس سال باقی رہ گئے تو ملک الموت تشریف لائے، آدم علیہ السلام نے پوچھا کہ کیا میری ابھی چالیس سال عمر باقی نہیں؟ تو ملک الموت نے عرض کیا کہ آپ نے اپنی عمر کے چالیس سال اپنے بیٹے داوٗد کو نہیں دیدیئے تھے؟ آدم علیہ السلام نے انکار کیا جس کے اثر سے ان کی ذریت میں بھی انکار کا مادہ آ گیا کہ بیٹا باپ کے نقش قدم پر ہوتا ہے: **الولَدُ سِرٌّ لأبيه.**

اشکال: افضل الخلائق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو سب سے زیادہ نور آپ کی پیشانی پر ہونا چاہئے تھا، داود علیہ السلام کی پیشانی پر زیادہ نور کیوں تھا؟

اس کے دوجواب ہیں: (۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی کا نور ہی سب سے زیادہ تھا، لیکن آدم علیہ السلام کی نظر اول وہلہ میں داود علیہ السلام پر پڑی، اس لئے ان کے بارے میں مذکورہ واقعہ پیش آیا۔

(۲) زیادہ نور حضرت داود علیہ السلام کی پیشانی پر ہی تھا لیکن داود علیہ السلام کی یہ فضیلت جزئی تھی اورآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجموعی وکلی فضیلت حاصل ہے، اوراس جزئی فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ: آدم میں نبوت وخلافت دونوں جمع تھیں آدم علیہ السلام کے بعد سب سے پہلے پیغمبر جو دونوں کے جامع تھے وہ داؤدعلیہ السلام ہیں، اسی لئے انکو اپنی عمر میں سے کچھ سال بھی انھوں نے عنایت فرمائے۔

تقدیر معلق میں تبدیلی ممکن:

پھرعمر میں اضافہ کا ہونا تقدیر کادوسرا مرتبہ ہے جس کو تقدیر معلق کہاجاتا ہے، اس میں تغیر ہوسکتا ہے، اول مرتبہ جوعلم ازلی اورتقدیر مبرم کا ہے اس میں تغیرنہیں ہوتا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کو ازل سے معلوم تھا کہ ان کی عمر اصلاً سوسال ہوگی، اور وہ سوسال ہی ہوئی۔

سوال: مشکوۃ جلد ثانی میں یہی واقعہ مذکور ہے[۱] لیکن اس میں مضمون یہ ہے کہ داودعلیہ السلام کی عمر چالیس سال تھی آدم علیہ السلام نے اپنی عمر میں سے ان کو ساٹھ سال عنایت فرمائے، جبکہ یہاں حدیث میں اس کا برعکس ہے؟

جواب(۱): یہ روایت راجح ہے کہ ان کی اصل عمر ساٹھ سال کی تھی۔

(۲) بعض علماء نے ان میں یہ تطبیق دی ہے کہ داود علیہ السلام کی عمر چالیس سال تھی آدم علیہ السلام نے اپنی عمر میں سے اولاً بیس سال کااضافہ کرایا تو ان کی عمر ساٹھ سال ہوگئی، آدم علیہ السلام نے ان کے حق میں اس عمرکو بھی کم سمجھا اس لئے پھر چالیس سال کا اضافہ اورکرایا، تو مجموعی اضافہ ساٹھ سال ہوااوردومرحلوں میں ہوا۔

فسقط عن ظهر كل نسمة الخ: ''نسمة'' ن اورس کے فتحہ کے ساتھ، جمع: نَسَمٌ بمعنی جاندارمخلوق، ''وبيصا'' بمعنی چمک۔

> ۱۱۲ / ۴۰ وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ، عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ حِيْنَ خَلَقَهُ، فَضَرَبَ كَتِفَهُ الْيُمْنٰى، فَأَخْرَجَ ذُرِّيَّةً بَيْضَاءَ كَأَنَّهُم الذَّرُّ، وَضَرَبَ

(۱) مشکوۃ، باب السلام ص: ۴۰۰.

كَتِفَهُ الْيُسْرَى فَأَخْرَجَ ذُرِّيَّةً سَوْدَاءَ كَأَنَّهُمُ الْحُمَمُ، فَقَالَ لِلَّذِي فِي يَمِينِهِ: إِلَى الْجَنَّةِ وَلاأُبَالِيْ، وَقَالَ لِلَّذِيْ فِيْ كَتِفِهِ الْيُسْرَى: إِلَى النَّارِوَلاأُبَالِيْ"(رواه احمد)(۱)

ترجمہ: حضرت ابوالدرداءؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جس وقت اللہ تعالیٰ شانہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان کے داہنے مونڈھے پر ہاتھ مارا تو اس سے سفید اولاد نکلی چیونٹیوں کے مانند، پھر بائیں مونڈھے پر ہاتھ مارا تو اس سے سیاہ اولاد نکلی کوئلہ کے مانند، پھر اللہ تعالیٰ شانہ نے دائیں طرف والی اولاد کے بارے میں فرمایا کہ یہ جنتی ہیں اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں اوران (آدم علیہ السلام) کے بائیں مونڈھے والی اولاد کے بارے میں فرمایا کہ یہ جہنمی ہیں اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں ہے۔ (احمد)

تشریح حدیث

مخلوق کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا کامل اختیار:

اس حدیث پاک میں بھی تقدیر کا بیان ہے کہ جنتی و جہنمی ہونا سب مقدر ہے، اور یہ کہ اللہ اپنی مخلوق کے بارے میں ہر طرح کے فیصلہ اور تصرف کا مختار ہے۔

کأنهم الذّر: ذال کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی چیونٹیاں، "**الحمم**" حاء کے ضمہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ، حممة کی جمع، بمعنی کوئلہ۔ (۲)

ولا أبالي: مقصد یہ ہے کہ ان کو جنت میں بھیجنا میرے لئے کوئی بڑی چیز نہیں ہے، میرے لئے سب آسان ہے، اسی طرح جہنم میں جانے والوں کو بھی کوئی پرواہ نہیں یعنی کسی کے سوال کا کوئی خوف نہیں، قرآن کریم میں ہے: "**لَايُسْئَلُ عَمَّايَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ**"(۳) کہ وہ جو کچھ کرتا ہے وہ اس کا جوابدہ نہیں اور لوگوں کو انہیں جواب دینا پڑے گا، اس حدیث میں در اصل حق تعالیٰ شانہ نے اپنی بے نیازی کو بتایا ہے کہ اس کو نہ جنت میں جانے والوں کی پرواہ ہے اور نہ جہنم میں جانے والوں کی، اور یہ سب پہلے مقدر ہو چکا ہے، اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ پر بندوں کا کوئی حق واجب نہیں، جیسا کہ پہلے آچکا ہے۔

(۱) أخرجه أحمد٦ / ٤٤١ برقم ٢٧٥٢٨ .

(۲) اللمعات ١ / ٤١٠ .

(۳) من سورة الأنبياء: ٢٣ .

سوال یہ ہے کہ ’’كـأنـه الحُمَم ‘‘ سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیں جانب والوں کا رنگ کالا تھا حالانکہ ماقبل کی حدیث میں آیا کہ ہر شخص کی پیشانی پر نور تھا یعنی فطرت سلیمہ کا؟

جواب: یہ ہے کہ رنگ کا کالا ہونا اور پیشانی پر نور کا ہونا دونوں میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ فطرت سلیمہ تو اللہ تعالیٰ نے سب کو دی ہے خواہ وہ داہنی جانب سے نکلنے والے ہوں یا بائیں جانب سے۔

۱۱۳ / ۴۱ وَعَنْ أَبِيْ نَضْرَةَ ؓ أَنَّ رَجُلاً مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صلَّى اللّٰه عليه وسلم: يُقَالُ لَهُ: أَبُوْعَبْدِاللّٰهِ دَخَلَ عَلَيْهِ أَصْحَابُهُ، يَعُوْدُوْنَهُ، وَهُوَيَبْكِيْ، فَقَالُوْا لَهُ: مَايُبْكِيْكَ؟ اَلَمْ يَقُلْ لَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم :’’خُذْمِنْ شَارِبِكَ ثُمَّ أَقِرَّهُ حَتّٰى تَلْقَانِيْ؟‘‘ قَالَ بَلٰى، وَلٰكِنْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلَّى اللّٰه عليه وسلَّم يقول: إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَبَضَ بِيَمِيْنِهِ قَبْضَةً وَأُخْرىٰ بِالْيَدِالْأُخْرىٰ وَقَالَ: هٰذِهِ لِهٰذِهِ، وَهٰذِهِ لِهٰذِهِ، وَلاأُبَالِيْ وَلاأَدْرِيْ فِيْ أَيِّ الْقَبْضَتَيْنِ أَنَا. (رواه أحمد)(۱)

ترجمہ: حضرت ابونضرہ ؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک شخص جن کا نام ابوعبداللہ تھا ان کے پاس ان کے چند ساتھی ان کی عیادت کے لئے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ: ابوعبداللہ رو رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ: آپ کو کیا چیز رلا رہی ہے؟ کیا آپ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد نہیں فرمایا تھا کہ: تم اپنے لب (مونچھوں کے) بال پست کرو اور اسی پر قائم رہو یہاں تک کہ تم مجھ سے آملو، ابوعبداللہ ؓ نے کہا کہ ہاں! لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: اللہ بزرگ وبرتر نے اپنے داہنے ہاتھ کی مٹھی میں لوگوں کی ایک جماعت لی اور دوسرے ہاتھ میں ایک جماعت لی اور فرمایا کہ یہ داہنے ہاتھ کی جماعت جنت کے لئے ہے اور دوسرے ہاتھ والی جماعت جہنم کے لئے ہے اور مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے، یہ کہکر ابوعبداللہ نے فرمایا میں نہیں جانتا کہ: میں کس مٹھی میں تھا (یعنی داہنی مٹھی میں یا بائیں مٹھی میں اس لئے رو رہا ہوں) (احمد)

(۱) أخرجه احمد ۵ / ۶۸ برقم ۲۰۶۸۷.

تشریح حدیث

تعارف ابونضرۃ:

ابونضرہ بن منذر بن مالک العبدی تابعی ہیں، بصرہ کے رہنے والے ہیں، حسن بصری کے کچھ دنوں کے بعد وفات ہوئی ہے، عبداللہ بن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابوسعیدؓ الخدری سے روایات سنی ہیں، ابراہیم تیمی، قتادہ اور سعید بن یزید انکے تلامذہ میں ہیں۔(۱)

ایک صحابی کا اپنے انجام سے ڈرنا:

ایک صحابی جن کی کنیت ابوعبداللہ تھی، بیمار ہوگئے تو ان کے احباب جو صحابہ تھے ان کی عیادت کے لئے گئے تو وہ رونے لگے، ان کے احباب نے کہا کہ تم کیوں رو رہے ہو؟ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ اپنی مونچھوں کو پست کرو اور اسی پر قائم رہو اور مجھ سے حوض کوثر پر آکر ملنا، مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حسن خاتمہ کی اور جنت کی بشارت دی تھی اس لئے صحابہ نے ان کو تسلی دی، انھوں نے کہا کہ ہاں یہ بات تو ہے لیکن میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی سنا ہے کہ اللہ نے کچھ لوگوں کو داہنی مٹھی میں لیا اور کچھ لوگوں کو دوسری مٹھی میں لیا اور فرمایا کہ یہ مٹھی والے جنت کے لئے ہیں اور دوسری مٹھی والوں کے متعلق فرمایا کہ یہ جہنم کے لئے ہیں اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے، ابوعبداللہ نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ میں اس وقت کس مٹھی میں تھا، میں اسی غم میں رو رہا ہوں۔

مونچھیں کاٹنے کا حکم اور طریقہ:

خذ من شاربک ثم أقر :یعنی اپنی مونچھیں کاٹا کرو اور پابندی کے ساتھ یہ عمل انجام دیتے رہو، مونچھیں کاٹنا اور ان کو ہونٹوں سے متجاوز نہ ہونے دینا مسنون اور اعمال فطرۃ میں سے ہے، البتہ کاٹنے کی کیفیت کیا ہو؟ حلق کیا جائے یا قصر یعنی باریک کاٹا جائے؟ راجح یہ ہے کہ حلق کے بجائے ان کو خوب پست اور چھوٹا کرلیا جائے۔اس کی تفصیل مع دلائل کتاب الطہارۃ میں آرہی ہے۔(۲)

تلقانی:اس سے حوض کوثر پر یا آخرت کے کسی اور مقام پر ملنا مراد ہے، اس سے سنت پر عمل کی اہمیت

(۱)میزان الاعتدال ۸/۱۸۱،المرقاۃ ۱/۳۰۱.

(۲)شامی ۲/۲۰٤.

وفضیلت ظاہر ہے، عامل بالسنۃ کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخرت میں خصوصی اکرام فرمائیں گے۔

سوال: جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حوض کوثر پر ملنے کی بشارت سنادی تھی توان کا جنتی ہونا ثابت ہوگیا اور یہ بات معلوم ہوگئی کہ وہ اہل جنت والی مٹھی میں تھے، پھرانہوں نے ’’ولاادری فی أی القبضتین أنا‘‘ کیوں کہا۔؟

اس کے دوجواب ہیں: (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حسن خاتمہ کی بشارت دی تھی لیکن ایک قید لگائی تھی کہ مونچھوں کو پست رکھنا اوراسی پرثابت قدم رہنا توان کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ معلوم نہیں میں اپنی زندگی میں صحیح معنی میں اس پرثابت قدم رہ سکایانہیں؟

(۲) اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جنت کی بشارت دی تھی لیکن ان پرخوف کا غلبہ ہوا کہ اللہ کواس کے خلاف پر بھی قدرت ہے توغلبۂ خوف کی وجہ سے ’’لاأدری فی ای القبضتین أنا‘‘ کہا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ پرغلبۂ خوفِ خداوندی:

اوراس طرح کے واقعات ان جلیل القدر صحابہ کے بھی منقول ہیں جن کو مطلقاً جنت کی بشارت مل چکی تھی، ان پر جب خوف کا غلبہ ہوتا تو وہ حضرات پرندہ ہونے کی اوربعض گھاس کا تنکا ہونے کی تمنا کرتے، نیزحضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ جب بادل آتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پریشان ہوجاتے چہرہ کا رنگ متغیر ہوجاتا، تاآنکہ بادل برسنے لگے یاختم ہوجائے، حضرت عائشہؓ نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ قوم عاد بھی بادل کو دیکھ کرخوش ہوئے تھے اورکہا تھا:’’ھذا عارض ممطرنا‘‘ کہ یہ بادل ہمیں سیراب کرے گا، حالانکہ وہی بادل ان کے لئے عذاب کا سامان بنا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ خوف ہوتا کہ کہیں یہ بادل عذاب خداوندی کو لئے ہوئے نہ ہو، حالانکہ قرآن کریم کا وعدہ آگیا ہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے حق تعالیٰ شانہ عذاب نازل نہیں فرمائے گا’’وماکان اللہ لیعذبھم الخ‘‘، مگر جب اللہ کے خوف کا غلبہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ شانہ کی شان بے نیازی سے ڈرتے کہ بہرحال وہ مالک ارض وسماء ہے اور شانِ بے نیازی رکھتا ہے، پس وہ جوچاہے کرسکتا ہے، کسی کواس کے سامنے جنبش لب کی اجازت نہیں۔

۱۱۴ / ۴۲ وَعَنِ ابنِ عَبَّاسؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: أَخَذَ اللّٰهُ الْمِيْثَاقَ مِنْ ظَهْرِ آدَمَ بِنَعْمَانَ يَعْنِيْ عَرَفَةَ فَأَخْرَجَ مِنْ صُلْبِهٖ كُلَّ ذُرِّيَّةٍ ذَرَأَهَا، فَنَثَرَهُمْ

بَيْنَ يَدَيْهِ كَالذَّرِّ، ثُمَّ كَلَّمَهُمْ قُبُلاً قَالَ "أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا أَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غَافِلِيْنَ أَوْتَقُوْلُوْا إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاءُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِنْ بَعْدِهِمْ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَافَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ" (رواه أحمد)(۱)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ شانہ نے عرفات کے قریب مقام نعمان میں حضرت آدم علیہ السلام کی اس اولاد سے جوان کی پشت سے نکلی تھی عہد لیا، چنانچہ آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی تمام اولاد کو نکالا جن کو (ازل سے ابد تک) پیدا کرنا تھا اور ان سب کو چیونٹیوں کی طرح حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے پھیلا دیا، پھر اللہ تعالی شانہ نے ان سے روبرو گفتگو فرمائی اور فرمایا کہ: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد نے کہا: کیوں نہیں! یقیناً آپ ہمارے رب ہیں ہم شہادت دیتے ہیں (آپ کے رب ہونے کی) پھر اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا (یہ شہادت میں نے تم سے اس لئے لی ہے کہ) تم قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم اس سے غافل وناواقف تھے یا تم کہنے لگو کہ ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے شرک کیا تھا اور ہم ان کے بعد ان کی اولاد سے ہیں، آپ ہمیں اس چیز کی وجہ سے کیوں ہلاکت میں ڈالتے ہیں جو باطل لوگوں نے (جرم) کیا۔ (احمد)

تشریح حدیث

عہد الست کا بیان:

اس حدیث میں عہد الست کا بیان ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے عرفات کے قریب وادی نعمان میں آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی ذریت کی ارواح کو نکالا اور ان کو عقل عطا فرمائی، پھر ان سے اپنی ربوبیت کے بارے میں سوال کیا انہوں نے اس خداداد عقل سے معاملہ کی حقیقت کو سمجھ کر اقرار کیا کہ واقعی آپ ہمارے رب ہیں ہم آپ کی ربوبیت اور وحدانیت کا اقرار کرتے ہیں اور ہم اس پر گواہ بھی بنتے ہیں۔

اس عہد کی وجہ اللہ نے یہ بیان فرمائی کہ اختیار شرک پر قیامت میں مواخذہ ہو تو یہ نہ کہہ سکو کہ ہم تو اس توحید سے غافل تھے یا یوں نہ کہنے لگو کہ ہم شرک میں اپنے آباء واجداد کے تابع تھے کہ اصل قصور تو ان

(۱) أخرجه أحمد ۱ / ۲۷۲ برقم ۲۴۵۵.

کا تھا اور اولاد اور نسل تو عقائد وخیالات میں اپنے آباؤ اجداد کے تابع ہوتی ہے اسلئے ہم بے خطا ہیں، لہٰذا ہمیں سزا نہ ہونی چاہئے، جب ان سے یہ عہد واقرار لے لیا گیا تو ان کے لئے اب عذر کا جواز نہیں رہے گا۔

بنعمان: ''نعمان'' ظمأن کے وزن پر ہے یہاں راوی نے اس کی تفسیر عرفہ سے فرمائی ہے، مگر یہ عرفات کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ عرفات کے برابر میں ایک وادی کا نام ہے۔(۱)

عہد جب یاد نہیں تو اس کے لینے کا کیا فائدہ؟

سوال ہوتا ہے کہ اس عہد کا فائدہ کیا ہوا جبکہ دنیا میں یہ عہد کسی کو یاد نہیں رہا؟ جواب یہ ہے کہ اگر چہ یہ عہد یاد نہیں رہا لیکن حضرات انبیاء کرام اوران کے قائم مقام علماء اس کی یاد دہانی کراتے رہے ہیں اور کوئی معتبر آدمی کسی بات کی یاددہانی کرادے تو وہ چیز خود اپنے سننے کے درجے میں ہوجاتی ہے۔

پھر سوال ہوتا ہے کہ انبیاء نے جب یاددہانی کرائی ہے تو مدار ان کی یاد دہانی پر ہوا پھر عہد لینے کی کیا ضرورت تھی؟ جواب یہ ہے کہ عہد لینے کا فائدہ یہ ہوا کہ بھولی ہوئی چیز کو یاد کرنا آسان ہوتا ہے ازسرنو یاد کرنے کے مقابلہ میں، اسی لئے وحدانیت اور ربوبیت کا مسئلہ آدمی جلدی قبول کر لیتا ہے، رسالت کو دیر میں قبول کرتا ہے، تجربہ بھی اس کا شاہد ہے، علاوہ ازیں حضرات مفسرین نے یہ صراحت فرمائی ہے کہ بہت سے لوگوں کو عہد الست یاد تھا جیسے حضرت علی، حسن بصری وغیرہ۔(۲)

''بلیٰ'' کی جگہ اگر ''نعم'' کہدیا جاتا:

اس موقعہ پر حضرت عبداللہ ابن عباس سے ایک علمی نکتہ منقول ہے وہ فرماتے تھے کہ عہد الست میں اگر لوگ بجائے ''بلیٰ'' کے ''نعم'' کہتے تو سب کافر ہوتے، کیوں کہ ''نعم'' ماقبل کی تاکید کرتا ہے ماقبل میں نفی ہوتو نفی کی تاکید کرتا ہے اور اثبات ہوتو اثبات کی تاکید کرتا ہے، برخلاف ''بلیٰ'' کے کہ وہ نفی کی نفی کے لئے آتا ہے اور نفی کی نفی اثبات ہے، اس لئے ''ألست بربکم'' کے جواب میں اگر لوگ ''نعم'' کہتے تو مطلب یہ ہوتا کہ ہاں تو ہمارا رب نہیں ہے اور یہ کفر ہے۔(۳)

---

(۱)الفتح الربانی لترتیب مسند الامام احمد الشیبانی ۱ / ۳۳.

(۲)معارف القرآن ٤ / ١١٥.

(۳)روح المعانی ٥ / ٩٤.

۱۱۵ / ۴۳ وَعَنْ أُبَيِّ بن كعبٍ ؓ فِيْ قَوْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ: "وَإِذْ اَخَذَرَبُّکَ مِنْ بَنِيْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ" قَالَ جَمَعَهُمْ فَجَعَلَهُمْ أَزْوَاجاً، ثُمَّ صَوَّرَهُمْ فَاسْتَنْطَقَهُمْ، فَتَكَلَّمُوْا، ثُمَّ أَخَذَ عَلَيْهِمُ الْعَهْدَ وَالْمِيْثَاقَ، "وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" قَالُوْا: بَلٰى: قَال فَإِنِّيْ أُشْهِدُعَلَيْكُمُ السَّمٰوَاتِ السَبْعَ وَالْأَرْضِيْنَ السَبْعَ، وَأُشْهِدُعَلَيْكُمْ أَبَاكُمْ آدَمَ أَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ: لَمْ نَعْلَمْ بِهٰذَا، اِعْلَمُوْا أَنَّهُ لاإِلٰهَ غَيْرِي، وَلارَبَّ غَيْرِيْ، وَلاتُشْرِكُوْا بِيْ شَيْئاً، إِنِّيْ سَأُرْسِلُ إِلَيْكُمْ رُسُلِيْ يُذَكِّرُوْنَكُمْ عَهْدِيْ وَمِيْثَاقِيْ، وَأُنْزِلُ عَلَيْكُمْ كُتُبِيْ، قَالُوْا: شَهِدْنَا بِأَنَّکَ رَبُّنَا وَإِلٰهُنَا لارَبَّ لَنَا غَيْرُکَ، وَلا إِلٰهَ لَنَا غَيْرُکَ، فَأَقَرُّوْا بِذٰلِکَ، وَرُفِعَ عَلَيْهِمْ آدَمُ عَلَيْهِ السَّلامُ يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، فَرَأَى الْغَنِيَّ وَالْفَقِيْرَوَحَسَنَ الصُّوْرَةِ وَدُوْنَ ذٰلِکَ فَقَالَ: رَبِّ لَوْلا سَوَّيْتَ بَيْنَ عِبَادِکَ! قَالَ: إِنِّيْ أَحْبَبْتُ أَنْ أُشْكَرَ، وَرَأَى الْأَنْبِيَاءَ فِيْهِمْ مِثْلَ السُّرُجِ عَلَيْهِمِ النُّوْرُ، خُصُّوْا بِمِيْثَاقٍ آخَرَ فِي الرِّسَالَةِ وَالنُّبُوَّةِ، وَهُوَ قَوْلُهُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰى: وَإِذْأَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّيْنَ مِيْثَاقَهُمْ إِلٰى قَوْلِهٖ "عِيْسٰى بْنِ مَرْيَمْ" كَانَ فِيْ تِلْکَ الأَرْوَاحِ، فَأَرْسَلَهُ إِلٰى مَرْيَمَ عَلَيْهَا السَّلامُ فَحُدِّثَ عَنْ أُبَيِّ: أَنَّهُ دَخَلَ مِنْ فِيْهَا. (رواه أحمد)(۱)

ترجمه: حضرت ابی بن کعب ؓ سے "واذاخذربک الآیة" (یادکرواس وقت کو جب تمہارے پروردگار نے اولاد آدم کی پشتوں سے انکی اولاد نکالی) اس آیت شریفہ کی تفسیر میں مروی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالی نے اولاد آدم کو جمع فرمایا، پھران کو جوڑے بنایا، پھران کی شکل وصورت عطاء فرمائی، اوران کو گویائی عطافرئی، پس انھوں نے گفتگوکی، پھران سے عہد وپیان لیا اور پھران کوخود ان کے اوپر گواہ قرار دے کر پوچھا: کیامیں تمہارارب نہیں ہوں؟اولاد آدم نے کہا: کیوں نہیں! یقیناآپ ہمارے رب ہیں، پھراللہ تعالی شانہ نے فرمایا: میں ساتوں آسمانوں اورساتوں زمینوں کوتمہارے سامنے گواہ بناتاہوں اورتمہارے باپ آدم کوبھی گواہ قراردیتاہوں، تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم اس سے ناواقف تھے،اس وقت تم اچھی طرح جان لو، نہ تو میرے سواکوئی معبود ہے اور نہ ہی میرے سواکوئی پروردگار ہے اورمیرے ساتھ کسی کوشریک

(۱)أخرجه أحمد في مسنده: ۵ / ۱۳۵(۲۱۲۷۰)

نہ قرار دینا، میں تمہارے پاس عنقریب اپنے رسول بھیجوں گا، جو تمہیں میرے عہد و پیمان یاد دلائیں گے اور تم پر اپنی کتابیں نازل کرونگا (یہ سن کر) اولاد آدم نے کہا، ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ ہمارے رب ہیں اور آپ ہی ہمارے معبود ہیں، آپ کے سوا نہ تو کوئی ہمارا پروردگار ہے اور نہ ہی آپ کے سوا کوئی ہمارا معبود ہے چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد نے اس کا اقرار کیا، اور حضرت آدم علیہ السلام کو ان کے اوپر بلند کر دیا گیا جس سے وہ اس منظر کو دیکھ رہے تھے، آدم علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کی اولاد میں امیر بھی ہیں اور فقیر بھی اور خوبصورت بھی اور بدصورت بھی، یہ دیکھ کر انہوں نے عرض کیا: پروردگار! آپنے تمام بندوں کو یکساں اور برابر کیوں نہ بنایا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میرا شکر ادا کیا جائے، پھر حضرت آدم علیہ السلام نے حضرات انبیاء علیہ السلام کو دیکھا جو چراغوں کی طرح تھے اور ان پر نور تھا، ان سے رسالت ونبوت کے سلسلہ میں خصوصی عہد و پیمان لیا گیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ شانہ کا قول ہے **واذاخذنا من النبيين ميثاقهم ومنک ومن نوح وإبراهيم وموسى عيسى بن مريم الخ**: ان روحوں کے درمیان حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تھے، چنانچہ ان کی روح کو اللہ تعالیٰ شانہ نے حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بھیج دیا، حضرت ابی بن کعب سے نقل کیا گیا کہ یہ روح حضرت مریم علیہا السلام کے منھ کی طرف سے ان کے جسم میں داخل ہوئی۔ (احمد)

تشریح حدیث

احوال ابی بن کعب:

ابی بن کعب الانصاری الخزرجی، ابوالمنذر وابوالطفیل کنیت ہے، اقرأ الصحابہ ہیں، کاتب وحی ہیں، جلیل القدر صحابی ہیں اور حفاظ صحابہ میں سے ہیں، بدر اور اس کے بعد تمام غزوات میں شریک رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو "سید الانصار" کہا کرتے تھے اور حضرت عمرؓ ان کو اپنے زمانہ میں "سید المسلمین" کہا کرتے تھے ۱۹ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔(۱)

عہد الست کا تفصیلی واقعہ:

حضرت ابی بن کعب نے آیت کریمہ **واذاخذربک من بنی آدم** ......الخ کی تفسیر فرمائی، جس

(۱) الإصابة ۱/۳۵.

میں عہد الست کا بیان ہے البتہ اس تفسیر میں ماقبل کی روایات کے بہ نسبت کچھ چیزیں زائد ہیں ان کی وضاحت یہ ہے:

جعلهم ازواجاً: اس سے مراد بعض کو مذکر اور بعض کو مونث بنانا ہے یا مختلف اصناف: غریب، امیر، خوبصورت اور بدصورت بنانا ہے، آگے غنی اور فقیر کا بیان اس کی تفسیر ہے۔

رفع عليهم آدم عليه السلام: آدم علیہ السلام کو ایک بلند جگہ بٹھایا گیا انہوں نے بعض کو غنی بعض کو فقیر بعض کو خوبصورت اور بعض کو بدصورت دیکھا، اس سے ان کو تعجب ہوا، انہوں نے حق تعالیٰ شانہ سے سوال کیا کہ اے اللہ تو نے اپنے بندوں کے درمیان برابری کیوں نہیں فرمائی؟ کہ سب غنی ہوتے کوئی فقیر نہ ہوتا، سب خوبصورت ہوتے کوئی بدصورت نہ ہوتا، اللہ نے حکمت بیان فرمائی کہ میں نے چاہا کہ میرا شکر ادا کیا جائے، اگر درجات کا تفاوت نہ ہوتا تو بندے اللہ کا شکر ادا نہ کرتے، درجات کے تفاوت کی وجہ سے اللہ کا شکر ادا کیا جائے گا، چنانچہ غنی جب فقیر کی عسرت وتنگی کو دیکھے گا تو اپنی خوشحالی پر اللہ کا شکر ادا کریگا، فقیر جب مال کی وجہ سے آنے والے فتنوں کو دیکھے گا اور خود کو ان سے محفوظ پائیگا تو اپنے فقیر ہونے پر اللہ کا شکر ادا کرے گا، خوبصورت اپنے جمال پر شکر ادا کرے گا اور بدصورت شخص حسن وجمال کی وجہ سے آنے والے فتنوں کو دیکھے گا اور اپنے آپ کو ان سے محفوظ پائے گا تو اللہ کا شکر ادا کرے گا۔

ورای الانبياء فيهم مثل السرج: "السرج" "سراج" کی جمع ہے، بمعنی چراغ۔

آدم علیہ السلام نے اپنی ذریت میں انبیاء کرام کو چراغ کی طرح منور دیکھا، چونکہ انبیاء علیہم السلام منبعِ ہدایت ہوتے ہیں اس لئے ہدایت کا نور ان پر نظر آیا۔

انبیاء کرام سے لئے گئے ایک عہد کا تذکرہ:

خصوا بميثاق آخر الخ: وہاں عالم ارواح میں انبیاء کرام سے بھی ایک عہد لیا گیا جس کا اجمالی بیان اس آیت میں ہے: **واذاخذنا من النبيين ميثاقهم ومنك**......الخ اور اس کی تفصیل دوسری آیت میں ہے جو یہ ہے: **وإذ أخذ الله ميثاق النبيين لما آتيتكم من كتب وحكمة**......الخ انبیاء سے باہمی تصدیق وتعاون کا عہد بھی لیا گیا یعنی اگر ایک نبی کے زمانہ میں دوسرے بھی آجائیں تو وہ ایک

دوسرے کی تصدیق کریں مدد کریں، غرضیکہ ان سے باہم تعاون وتناصر کا عہد بھی لیا گیا۔

اس عہد کے بعد ان ارواح کو ان کے آباء کی پشتوں میں پہنچادیا گیا، عیسیٰ کی روح بھی ان ارواح میں تھی، ان کی روح کو بواسطہ جبرئیل حضرت مریم کے منہ میں پھونک دیا گیا کیونکہ ان کی پیدائش بلاواسطہ باپ حضرت مریم کے بطن سے ہونا تھی۔

فحدث عن أبي: حُدِّث صیغہ مجہول ہے اور مطلب یہ ہے کہ: حضرت ابی بن کعب نے یہ وضاحت بھی فرمائی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح حضرت مریم کے منھ کے راستہ سے ان میں داخل کی گئی۔

١١٦ / ٤٤ وعَن أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ : بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَرَسُوْلِ الله صلى الله عليه وسلم: نَتَذَاكَرُ مَايَكُوْنُ، إِذْقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم : إِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَكَانِهِ فَصَدِّقُوْهُ، وَإِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَيَّرَعَنْ خُلُقِهِ فَلاتُصَدِّقُوْابِه، فَإِنَّهُ يَصِيْرُإِلٰى مَاجُبِلَ عَلَيْهِ"(رواه أحمد)(١)

ترجمہ: حضرت ابوالدرداءؓ سے مروی ہے کہ: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے آئندہ ہونے والی چیزوں کا مذاکرہ کررہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہماری باتوں کو سن کر) فرمایا جب تم سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو اسے سچ مان لو، لیکن جب تم یہ سنو کہ کسی شخص کی عادت بدل گئی تو اس کی تصدیق نہ کرو (یعنی اس کا اعتبار نہ کرو) اس لئے کہ انسان اسی چیز کیطرف لوٹتا ہے جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے۔ (احمد)

تشریح حدیث

عادات واخلاق میں تبدیلی ناممکن:

اس حدیث میں بھی تقدیر کا بیان ہے کہ لوگوں کی عادات واخلاق بھی تقدیر کے ماتحت ہیں اور جو تقدیر میں درج کیا گیا وہ ایسا پختہ ہے کہ اس میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئندہ زمانے میں ہونے والی

(١) أخرجه أحمد ٦ / ٤٤٣ برقم ٢٧٥٣٩.

چیزوں کا تذکرہ کررہے تھے کہ کائنات میں جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ ان چیزوں میں سے ہے جن کا واقع ہونا علم الٰہی میں پہلے سے طے ہوچکا ہے، یا ایسی چیز ہے جو کسی سبب کے پیش آنے سے فوری طور پر وجود میں آتی ہے، ماضی کے قضا وقدر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب تم کسی پہاڑ کے بارے میں یہ سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو اس کی تصدیق کرو اور اگر کسی شخص کے متعلق یہ سنو کہ اس کی عادت بدل گئی ہے تو اس کی تصدیق نہ کرو، کیونکہ آدمی اسی خصلت کی طرف لوٹتا ہے جس پر اس کی تخلیق ہوئی ہے، غرض یہ بتانا ہے کہ ہر شئ مقدر ہے حتی کہ آدمی کے عادات واخلاق بھی مقدر ہیں، ان میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

بجبل زال عن مکانه: پہاڑ کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا ممکن ہے، چنانچہ بنی اسرئیل کے زمانہ میں ایسا ہوبھی چکا ہے، قرآن کریم میں ہے" **وَاِذْنَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ**......الخ " وہ وقت یاد کرو جب ہم نے ان پر پہاڑ ایسے اٹھالیا تھا جیسا کہ وہ کوئی سائبان ہو، پس پہاڑ کا اپنی جگہ سے ہٹنا ممکنات میں سے ہے، لیکن آدمی کی خصلت کا بدلنا ممکن نہیں۔

عادات واخلاق کی درستگی کا مفہوم ومطلب:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آدمی کے اخلاق نہیں بدلتے، حالانکہ قرآن وحدیث میں اخلاق کو سنوارنے کا حکم ہے، قرآن کریم میں ہے:" **قد افلح من تزکی** "جس نے اپنے آپ کو پاکیزہ بنالیا وہ کامیاب ہوگیا، اور حدیث میں ہے:"**حسنوا أخلاقکم**" وغیرذالک من النصوص، یعنی اپنے اخلاق اچھے بناؤ، پس جب اخلاق میں تبدیلی ممکن نہیں ہے تو پھر اخلاق کے تزکیہ اور تحسین کا حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اور حضرات صوفیاء اس کے لئے ریاضتیں اور مجاہدے کیوں کراتے ہیں؟ اس سوال کے دو جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) اصل خلقت کے اعتبار سے آدمی میں اچھے اخلاق بھی ہوتے ہیں اور برے بھی، شریعت کی جانب سے حکم اس بات کا ہے ان میں اعتدال پیدا کیا جائے اور اسی اعتدال کا نام خلق حسن ہے اور اعتدال لانا آدمی کے اختیار میں ہے، اس لئے حسن اخلاق کا مکلف بنایا گیا ہے۔ (۱)

(۲) قرآن وحدیث میں جو اخلاق کے سنوارنے کا حکم ہے تو اس سے اصل مقصود جبلی اخلاق کا ازالہ

(۱) المرقاة ۱/ ۳۰۹.

نہیں، بلکہ امالہ یعنی ان کے رخ کو پھیرنا مقصود ہوتا ہے جبکہ حدیث میں ازالہ کی نفی کی گئی ہے، مثلاً ایک شخص کے اندر غصہ ہے وہ اس کا ازالہ کرنا چاہے اس کے مادہ کو ختم کرنا چاہے تو ختم نہیں کرسکتا البتہ ریاضت مجاہدہ اور مشق سے اس کے رخ کو پھیرا جاسکتا ہے، بایں طور کہ جس غصہ کا مظاہرہ اہل وعیال اور مسلمانوں پر کیا کرتا تھا ان کے ساتھ تو نرمی اور ترحم کا برتاؤ کرے اور غصہ جہاد کے موقعہ میں کفار اور اعداء اسلام پر اتارے، حق تعالیٰ شانہ نے حضرات صحابہ کی قرآن کریم میں یہی شان بیان فرمائی ہے"**و الذین معه اشداء الخ**"، اسی طرح سخاوت اور بخل کہ جن مواقع میں خرچ کرنا عنداللہ پسندیدہ ہے وہاں سخاوت کو اختیار کرے، جہاں خرچ کرنا ممنوع اور عنداللہ ناپسند ہے وہاں بخل سے کام لے، مؤمنین کے ساتھ تواضع برتے اور کفار سے جہاد کے وقت بڑائی اور دلیری کا مظاہرہ کرے۔

۱۱۷/ ۴۵ **وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ ، قَالَتْ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! لايَزَالُ يُصِيْبُكَ فِيْ كُلِّ عَامٍ وَجَعٌ مِنَ الشَّاةِ الْمَسْمُوْمَةِ الَّتِيْ أَكَلْتَ قَالَ: "مَاأَصَابَنِيْ شَيْءٌ مِنْهَا إِلَّا وَهُوَ مَكْتُوْبٌ عَلَيَّ وَآدَمُ فِيْ طِيْنَتِهِ"** (رواه ابن ماجه)(۱)

ترجمه: حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ: انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ: آپ نے جو زہر آلود بکری کھائی تھی (جو خیبر میں ایک یہودی عورت نے کھلائی تھی) ہر سال اس کی وجہ سے آپ کو بیماری اور تکلیف لاحق ہوتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی وجہ سے جو چیز (اذیت) مجھکو پہنچتی ہے وہ میرے لئے اسی وقت لکھدی گئی تھی جب کہ آدم اپنی مٹی کے اندر تھے۔ (ابن ماجہ)

تشریحِ حدیث

احوال ام سلمہؓ:

ام المؤمنین ہیں، ازواج مطہرات میں بڑے مرتبہ والی ہیں، نام: ہند بنت ابی امیہ ہے، والد کا نام حذیفہ اور بقول بعض سہل تھا، جو"زاد الراکب" کے لقب سے مشہور تھے، کیونکہ وہ نہایت سخی تھے، اور جس قافلہ میں چلتے اس کے تمام سواروں کے خورد ونوش اپنے ذمہ لے لیا کرتے، پہلے ابوسلمہ کے نکاح میں تھیں،

(۱) أخرجه ابن ماجه في الطب، باب السحر ۲/ ۲۵۳.

ان کے انتقال کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں، مدینہ ہجرت کرکے جانے والی عورتوں میں سب سے پہلی عورت ہیں جو مدینہ میں داخل ہوئیں، ۵۹ھ میں وفات ہوئی، اور جنت البقیع میں مدفون ہیں، کل عمران کی ۸۴ سال ہوئی۔ (۱)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دینے کا واقعہ اوراس کے اثرات:

ایک یہودیہ عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے لئے ایک سازش رچی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور چند صحابہ کی دعوت کی، اس موقعہ پر اس نے بکری ذبح کی اوراس میں زہر ملا دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ تشریف لائے اور کھانا شروع کیا، تو جبرئیل علیہ السلام نے آکر بتایا کہ اس میں زہر ملایا گیا ہے، آپ اور آپ کے ساتھی اس کو نہ کھائیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور صحابہ کو بھی روک دیا، البتہ ایک دولقمہ زہرآلود آپ علیہ الصلوۃ والسلام تناول فرما چکے تھے جس سے زہر کا اثر جسم میں پہنچ گیا، اس کے اثر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر سال کوئی نہ کوئی بیماری لاحق ہوتی تھی جو آپ کے لئے سخت اذیت کا سبب بنتی، علماء نے صراحت فرمائی ہے کہ مرض الوفات میں بھی اس کا اثر تھا اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرتبۂ شہادت بھی نصیب ہوا ہے۔

یہ تکالیف میرا مقدر ہیں:

بہرحال ہر سال اس زہر کی وجہ سے آپ کو جو امراض پیش آتے اس پر ام سلمہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اظہار افسوس کیا کہ ہر سال کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس زہر کی وجہ سے جو بیماری اور تکلیف مجھے پہنچتی ہے وہ میرے مقدر میں اس وقت لکھ دی گئی تھی جب آدم علیہ السلام اپنے خمیر میں ہی تھے، یعنی تخلیق آدم علیہ السلام سے قبل، لہٰذا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، معلوم ہوا کہ احوال وامراض وغیرہ بھی من جانب اللہ مقدر اور طے ہیں۔

وآدم فی طینته: علامہ طیبیؒ نے کہا کہ یہ تقدیر سابق کی مثال ہے تعیین وقت مقصود نہیں ہے، کیونکہ آدم کا اپنے خمیر میں ہونا بھی تقدیر کی ایک چیز ہے نہ کہ خارج تقدیر شی۔ (۲)

(۱) تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو: الاصابة ۸/۱۵۰.

(۲) شرح المشکاة للطیبي ۱/۳۰۲.

(٤) باب إثبات عذاب القبر

عذاب قبر کے اثبات کا بیان

الفصل الأول

قبر میں عذاب یاثواب کا مسئلہ ایمانیات کا ایک اہم مسئلہ ہے اسی لئے مصنفؒ نے اس کو مستقل عنوان کے تحت ذکر کیا ہے، اس بارے میں چند باتیں عرض ہیں:

ماقبل سے مناسبت:

(۱) ماقبل میں ایمان بالقدر کا بیان تھا اور ایمان بالقدر اللہ تعالیٰ کی کئی صفات کو مستلزم ہے خصوصاً علم وقدرت کو، پس جب اللہ شانہ کو ہر چیز کا علم ہے اور ہر چیز پر قدرت بھی ہے تو وہ برے اعمال پر سزا دینے پر بھی قادر ہے اور سزا کی ایک صورت عذاب قبر بھی ہے۔

(۲) تقدیر کا مسئلہ مشہور اختلافی مسئلہ ہے ایسے ہی عذابِ قبر کے مسئلہ میں بھی اختلاف مشہور ہے، ان دووجہوں کی بنا پر ایمان بالقدر کے بعد عذاب قبر کو بیان کیا۔

عنوان پر اشکال اور اس کے جوابات:

اس ترجمہ پر اشکال ہے کہ اس باب کے تحت دوقسم کی روایات ہیں، بعض میں عذاب قبر کا ذکر ہے اور بعض میں راحتِ قبر کا، تو ترجمہ میں بھی دونوں کا تذکرہ ہونا چاہئے محض عذاب قبر کا عنوان کیوں قائم کیا؟ اس اشکال کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) عذاب قبر سے بچنے کی اہمیت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے عذاب قبر کا عنوان قائم کیا گیا ہے کیونکہ عذاب قبر سے بچنا دفعِ مضرت کے قبیل سے ہے اور راحت قبر جلبِ منفعت کے قبیل سے ہے اور قاعدہ ہے کہ دفعِ مضرت اولی ہے جلبِ منفعت سے۔

(۲) فقہاء ومحدثین کی اصطلاح میں عذابِ قبر سے مراد احوال برزخ ہوتے ہیں اور احوال برزخ میں عذاب وراحت دونوں داخل ہیں لیکن عذاب کو راحت پر غلبہ دیا گیا ہے اس لئے کہ راحت مومن مطیع کو حاصل ہوگی اور عذاب فاسقین وکافرین کو ہوگا اور ان کی تعداد زیادہ ہے وقليل من عبادي الشكور، پس

معذَّبین کی کثرت کی وجہ سے عذاب کو اسکے مقابل پر غلبہ دیا گیا۔

(۳) بعض نے کہا کہ قبر فی نفسہ مقام وحشت ہے، جب آدمی اس کا نام سنتا ہے تو گھبرا جاتا ہے اور یہ بھی ایک قسم کا عذاب ہے اس لئے وہاں کے احوال کو عذاب سے تعبیر کیا۔

(۴) بعض نے کہا کہ منکر نکیر جب مردے کے پاس آتے ہیں تو اول وہلہ میں ہر آدمی ان سے ڈرتا ہے اور تکلیف محسوس کرتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کا عذاب ہے اس لئے عذاب قبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قبر کا مفہوم:

قبر کے دو معنی ہیں ایک حقیقی: یعنی وہ گڑھا جس میں مردہ مدفون ہوتا ہے، دوسرے مجازی: یعنی عالم برزخ، موت کے بعد سے دوبارہ زندہ ہونے تک کے زمانہ کو "برزخ" کہا جاتا ہے، عرفاً وشرعاً قبر سے اس کے حقیقی معنی مراد ہوتے ہیں الایہ کہ مجازی معنی پر کوئی قرینہ موجود ہو، انتقال کے بعد انسان کی روح عالم برزخ میں چلی جاتی ہے اور جسم دنیا میں رہتا ہے، خواہ گڈھے میں ہو یا جل کر راکھ ہوگیا ہو یا ڈوب گیا ہو یا کسی درندہ نے کھالیا ہو، اس دنیاوی جسم کے ساتھ برزخ میں موجود روح کا تعلق قائم کر کے اللہ تعالیٰ ہر دو کو تکلیف وراحت کا احساس کراتا ہے۔[۱]

مسئلۂ عذاب قبر:

اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ کافر کے لئے عذاب قبر اور مومن کے لئے راحت قبر برحق ہے، قدمائے معتزلہ بھی اس کو تسلیم کرتے تھے لیکن متاخرین معتزلہ، اسی طرح مرجئہ، روافض اور خوارج نے اس کا انکار کیا ہے اور اس زمانہ میں منکرین حدیث جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں وہ بھی اس کے منکر ہیں، ان کا یہ موقف نصوص شرعیہ کے خلاف ہے کیونکہ قرآن وسنت کی بے شمار نصوص جیسا کہ آئندہ آرہا ہے، اس کے ثبوت پر دال ہیں، اسی لئے بہت سے علماء نے ایسے لوگوں کو جو عذاب قبر کے منکر ہیں کافر قرار دیا ہے، البتہ راجح قول کے مطابق منکرینِ عذاب قبر پر کافر ہونے کا حکم نہیں، بلکہ وہ فاسق وگمراہ ہیں، اس لئے کہ وہ تاویلاً منکر ہیں اور ضابطہ ہے: "**المؤوِّل لایکفر**"

---

(۱) لمعات التنقیح ۱/ ۴۱۷.

عذابِ قبر کا ثبوت:

عذاب قبر کا ثبوت قرآن کریم سے بھی ہے اور احادیث متواترہ سے بھی، البتہ قرآن کریم سے ثبوت عبارۃ النص کے طور پر نہیں بلکہ دلالۃ النص کے طور پر ہے، قرآن کی کئی آیات عذاب قبر کے برحق ہونے پر دال ہیں۔

(۱) مثلاً آل فرعون کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ''اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةَ اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ [۱]''، یعنی آگ ان لوگوں کے سامنے صبح وشام پیش کی جاتی ہے اور جس دن قیامت آئے گی تو حکم ہوگا کہ سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔اس آیت میں دوعذابوں کا تذکرہ ہے ایک قیامت کا عذاب اور ایک قیامت سے پہلے کا عذاب اور یہی عذاب قبر ہے۔

(۲) قوم نوح کے بارے میں اللہ نے فرمایا ''مِمَّا خَطِیْئٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا [۲]'' یعنی ان لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے ہی انہیں غرق کیا گیا، پھر آگ میں داخل کیا گیا، اس آیت کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ مرنے کے معاًبعد ان کو آگ میں داخل کیا گیا کیونکہ دخول نار کا ترتب غرق وہلاکت پر فاء کے ذریعہ کیا گیا ہے اور فاء جس کا مدلول بعدیتِ متصلہ ہے یعنی قومِ نوح ادھر پانی میں غرق ہوئی اور ادھر آگ میں داخل کی گئی، ظاہر ہے کہ یہ قیامت سے پہلے برزخی عذاب ہے جو عذابِ قبر ہے، عذاب جہنم تو میدان حشر کے بعد ہوگا۔ [۳]

کیفیت عذاب قبر:

جوحضرات عذاب قبر کو برحق مانتے ہیں ان کا عذاب قبر کی کیفیت میں اختلاف ہے۔

(۱) محمد بن جریر کرامی نے کہا کہ عذاب قبر صرف جسم کو ہوگا روح کو نہیں اس لئے کہ روح یا تو اعلیٰ علیین میں یا اسفل سافلین یعنی سجین میں ہوتی ہے، اس لئے عذاب روح سے متعلق نہیں ہوتا، مگر یہ قول صحیح نہیں ہے۔

(۲) علامہ ابن حزم ظاہری اور دیگر بعض علماء نے کہا کہ عذاب قبر روح کو ہوگا جسم کو نہیں، یہ قول بھی

(۱) من سورة المؤمن: ٤٦.

(۲) من سورة نوح: ٢٥.

(۳) المرقاة ١/ ٣١٠.

نصوص کے خلاف ہے۔

(۳) جمہور فرماتے ہیں کہ عذاب قبر جسم وروح دونوں کو ہوگا کیوں کہ مرنے کے کچھ دیر بعد روح کو جسم میں لوٹادیا جاتا ہے۔

مدت عذاب قبر:

اس کی کوئی صراحت احادیث میں نہیں ہے، بعض علماء نے کہا کہ مومن کامل کودائمی راحت اور کافر کے لئے دائمی عذاب ہوگا اورمومن فاسق کے لئے عارضی یعنی کچھ وقت کے لئے عذاب قبر ہوگا پھر وہ عذاب ہٹادیاجائے گا۔[1]

اشکالات برعذاب قبر:

عذاب قبر کے منکرین نے اس پر چند اعتراضات کئے ہیں:

(۱) ایک اعتراض یہ ہے کہ مرنے کے بعد بعض مرتبہ بدن انسانی محفوظ نہیں رہتا، کبھی مرنے والے کی لاش کوجلادیا جاتا ہے، کبھی جانور کھاجاتا ہے کبھی اس کے ذرات کوسمندر میں بہادیا جاتا ہے، پس جب جسم کے اجزاء محفوظ نہیں تو اس کوکس طرح عذاب دیاجاسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس اعتراض کی بنا ایک غلط خیال پر ہے کہ قبر محض ایک گڈھے کا نام ہے اورعذاب وثواب کا مدار بدن انسانی کے ڈھانچے پر ہے، حالانکہ ایسانہیں ہے، کیونکہ یہاں قبر سے مراد عالم برزخ ہے جیسا کہ گزرا، اور عذاب وثواب کا مدار اللہ کے علم کامل وقدرت کاملہ پر ہے، مرنے والا اگرچہ زمین میں دفن نہ ہو، اس کوجلادیا جائے یا کوئی جانور کھاجائے؛ لیکن بہرحال وہ عالم برزخ میں ہے نیز اس کے ذرات جسم خواہ کہیں ہوں خشکی میں ہوں سمندر میں ہوں یا کسی اور جگہ ہوں، حق تعالیٰ شانہ کواپنے علم کامل کی بناء پر معلوم ہے کہ اس کا کونسا ذرہ کہاں ہے اوراپنی قدرت کاملہ کی وجہ سے وہ ان ذرات سے عذاب کاتعلق قائم کرنے پر قادر ہے۔

(۲) دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر قبر کوکھودا جائے تو وہاں مردہ پڑا نظر آتا ہے لیکن عذاب وراحت کچھ نظر نہیں آتا؟

---

(۱) النبراس، مطبوعه انارکلی، لاهور ص ۳۱۵.

اس کا جواب یہ ہے کہ عالمِ برزخ کے احوال عالم دنیا سے مختلف ہیں، دنیا کے قُویٰ سے احوال برزخ نظر نہیں آتے اس کے لئے برزخی قُویٰ ضروری ہیں، خود عالم دنیا میں بہت سی چیزوں کا وجود ہے لیکن وہ ہمیں نظر نہیں آتیں، پس موجود ہونے کے لئے نظر آنا ضروری نہیں، مثلاً جنات وفرشتے موجود ہیں لیکن نظر نہیں آتے، جبرئیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی سنانے آتے تھے اور صحابہ کو پاس ہونے کے باوجود جبرئیل نظر نہ آتے، سر کا درد نظر نہیں آتا، دودھ میں مکھن ہوتا ہے مگر نظر نہیں آتا، ایک شخص کے پیٹ میں درد ہے لیکن نظر نہیں آتا، بیہوش آدمی پر کیا حالات گذرتے ہیں دوسرے کو پتہ نہیں چلتا وغیرہ۔

اقسامِ عالم اور ان کے احوال:

بعض علماء نے اس کی تفصیل بیان کی کہ عالم تین ہیں (۱) عالمِ دنیا، (۲) عالمِ برزخ (۳) عالمِ آخرت، آدمی کے پیدا ہونے سے مرنے تک کا زمانہ عالم دنیا ہے، اور مرنے کے بعد سے نفخ صور تک کا زمانہ عالم برزخ ہے اور نفخ صور سے قیامت اور اس کے بعد تک کا وقت عالم آخرت ہے، ان تینوں عالموں کے احوال مختلف ہیں، عالم دنیا میں تکلیف وراحت کا تعلق اصالۃً جسم کے ساتھ ہوتا ہے، اور تبعاً روح سے ہوتا ہے، جسم کے واسطے روح تک اس کا اثر جاتا ہے، اور عالم برزخ میں اس کا عکس ہوتا ہے کہ راحت وتکلیف کا تعلق اصالۃً روح سے اور تبعاً جسم سے ہوتا ہے اور عالم آخرت میں راحت وتکلیف کا تعلق جسم وروح دونوں سے برابر ہوتا ہے، عالم برزخ کی مثال خواب کی سی ہے کہ خواب دیکھنے والا اپنے آپ کو کبھی راحت میں اور کبھی زحمت میں دیکھتا ہے، کبھی اچھے مناظر دیکھتا ہے کہ عمدہ کھانا کھا رہا ہے اچھی جگہوں کی سیر کر رہا ہے، کبھی خوفناک منظر دیکھتا ہے کہ شیر اس کا تعاقب کر رہا ہے ازدہا پیچھے دوڑ رہا ہے، اس نوع کے مختلف حالات دیکھتا ہے لیکن جو شخص اس کے برابر میں بیٹھا ہوتا ہے اس کو ان حالات کی مطلق خبر نہیں ہوتی یہی حال قبر میں مردہ کا ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتا کہ اس پر کیا گذر رہی ہے۔ (۱)

اخفائے عذاب قبر کی وجہ اور ایک عورت کا عبرتناک واقعہ:

عذاب قبر کو مخفی رکھنے کی بڑی وجہ ایمان بالغیب ہے، اگر عذاب قبر دکھایا جاتا تو ایمان بالغیب نہ رہتا بلکہ ایمان

(۱) المرقاۃ ۱/ ۳۱۰، واللمعات ۱/ ۴۱۸.

بالمشاہدہ ہوجاتا، حالانکہ اللہ کو بندوں سے ایمان بالغیب مطلوب ہے، البتہ بعض مرتبہ مصلحت کی وجہ سے عبرت کے لئے کچھ حالات دکھادیئے جاتے ہیں، ہمارے حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے سنایا تھا کہ اب سے پچیس سال قبل پاکستان میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک عورت کا انتقال ہوا جب اس کے جنازہ کو قبر میں اتارا گیا تو ایک اژدہا آیا اور اس کا کفن پھاڑ کر اس کا منہ کھول کر اس کی زبان پکڑلی، لوگوں نے اس کے لئے دیر تک استغفار کیا اور ایصال ثواب کیا تو وہ اژدہا ہٹ گیا، لوگوں نے اس عورت کے شوہر سے وجہ معلوم کی تو اس نے بتایا کہ اور کوئی وجہ تو مجھے معلوم نہیں البتہ اتنی بات ہے کہ یہ میرے ساتھ زبان درازی کیا کرتی تھی، اس نوع کے واقعات بر بناء مصلحت گاہے گاہے ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

۱۱۸/۱ عَنِ الْبَرَاءِ بنِ عَازِبٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ "اَلْمُسْلِمُ إِذَا سُئِلَ فِيْ الْقَبْرِ، يَشْهَدُ أَنْ لاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ، فَذٰلِکَ قَوْلُهٗ": "يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الآخِرَةِ"

وَفِيْ رِوَايَةٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: "يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ نَزَلَتْ فِي عَذَابِ الْقَبْرِ، يُقَالُ لَهٗ: مَنْ رَبُّکَ؟ فَيَقُوْلُ: رَبِّيَ اللّٰهُ، وَنَبِيِّي مُحَمَّدٌ" (متفق عليه)

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جس وقت مسلمان سے قبر میں سوال کیا جاتا ہے تو وہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ شانہ کے اس ارشاد کا "يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الآخِرَةِ" کہ اللہ تعالیٰ شانہ ان لوگوں کو ثابت قدم رکھتا ہے جو ایمان لاتے ہیں مضبوط قول کے ذریعہ دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں، اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ آیت "يثبت الله الذين آمنوا بالقول الثابت" عذاب قبر کے بیان میں نازل ہوئی ہے، (چنانچہ قبر میں مردہ سے) سوال کیا جاتا ہے کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور میرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

احوال براء بن عازب:

حضرت براء بڑے صحابی ہیں، یہ اوران کے والد دونوں کو شرفِ صحبت حاصل ہے، ابوعمارة اورابوعمرو کنیت ہے، جنگ بدر میں کم سنی کے باعث شریک نہیں ہوسکے اس کے بعد احدوغیرہ میں شریک رہے، کل چودہ یاپندرہ غزوات میں شرکت کی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ۱۸رسفر کئے، مقام رئ کو ۲۴ھ میں انہوں نے ہی فتح کیاتھا، اور جنگ جمل وصفین میں حضرت علیؓ کے ہمراہ تھے، کوفہ میں ۷۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (۱)

''القول الثابت'' کی مراداوراس کی برکت وفضیلت:

اس حدیث میں ایک آیت کی تفسیر ہے''يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الآخِرَةِ'' اس آیت میں ''قول ثابت'' سے مرادکلمہ شہادت اور''آخرت'' سے مرادقبر ہے جیسا کہ مذکورہ روایت میں اس کی صراحت آگئی، معنی یہ ہیں کہ کلمہ طیبہ جب مومن کے قلب میں راسخ ہوجاتاہے تو اس کی برکت یہ ہوتی ہے کہ کیسے ہی صبرآزما حالات کیوں نہ ہوں مومن کے ایمان میں اور پائے استقامت میں ذرہ برابر تزلزل واقع نہیں ہوتا، اورآخرت میں ثابت قدم رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ کلمہ کی برکت سے قبر میں فرشتوں کے سوالات کا صحیح جواب دیتاہے۔

قبر میں کتنے سوالات ہوتے ہیں؟

اس حدیث میں میت سے کئے جانے والے سوال کا تذکرہ ہے، میت سے اصل تین سوال ہوتے ہیں، من ربک، مادینک، ماتقول في هذا الرجل، بعض روایات میں ان تینوں سوالوں کوجمع کیاگیاہے اوربعض میں دوسوالوں کا تذکرہ ہے اوربعض میں محض ایک سوال کا، جیسا کہ اس حدیث میں ایک ہی سوال مذکورہے، اسی طرح سوال وجواب کے الفاظ بھی مختلف منقول ہیں، الفاظ کا یہ اختلاف، اختلافِ راوی پرمحمول ہے کہ رواۃ نے روایت بالمعنی کی، اس لئے ان کے الفاظ میں اختلاف ہوا، یا اختلافِ اشخاص پر

(۱) الإصابة ۱/۲۱۳-۲۱۴.

محمول ہے کہ کسی مردہ سے سوال کرتے ہوئے یہ الفاظ اور کسی سے دوسرے الفاظ استعمال کئے، اس لئے یہ تعارض کی بات نہیں ہے۔

قبر کے سوال سے مستثنیٰ افراد:

پھر کچھ حضرات منکر نکیر کے سوال سے مستثنیٰ ہیں ان سے قبر میں سوال نہیں ہوتا، مختلف روایات میں ایسے متعدد حضرات بتائے گئے ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) انبیاء علیہم السلام، البتہ سید ابوشجاع نے بعض علماء کا قول لکھا ہے کہ ان سے تبلیغ کے متعلق سوال ہوتا ہے (۲) شہید (۳) اسلامی سرحد کی حفاظت کرنے والا (۴) مؤذن (۵) جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات میں وفات پانے والا (۶) بچوں کے بارے میں دونوں قول ہیں ایک یہ کہ ان سے سوال نہیں ہوتا دوسرے یہ کہ ان سے بھی سوال ہوتا ہے۔(۱)

قبر میں سوال کس زبان میں ہونگے؟

پھر قبر میں یہ سوالات کس زبان میں ہوتے ہیں؛ اس میں علماء کا اختلاف ہے: (۱) بعض نے کہا کہ سریانی زبان میں ہوتے ہیں (۲) بعض نے عربی زبان میں کہا ہے لیکن راجح ثانی قول ہے۔(۲)

۱۱۹/۲: وَعَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا وُضِعَ فِيْ قَبْرِهٖ وَتَوَلّٰى عَنْهُ أَصْحَابُهٗ إِنَّهٗ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ أَتَاهُ مَلَكَانِ فَيُقْعِدَانِه فَيَقُوْلَانِ: مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ لِمُحَمَّدٍ؟ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ فَيَقُوْلُ: أَشْهَدُ أَنَّهٗ عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ، فَيُقَالُ لَهٗ: أُنْظُرْ إِلٰى مَقْعَدِكَ مِنَ النَّارِ، قَدْ أَبْدَلَكَ اللّٰهُ بِهٖ مَقْعَداً مِنَ الْجَنَّةِ، فَيَرَاهُمَا جَمِيْعاً، وَأَمَّا الْمُنَافِقُ وَالْكَافِرُ فَيُقَالُ لَهٗ: مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ؟ فَيَقُوْلُ: لَاأَدْرِيْ! كُنْتُ أَقُوْلُ مَايَقُوْلُ النَّاسُ! فَيُقَالُ له: لَادَرَيْتَ وَلَاتَلَيْتَ، وَيُضْرَبُ بِمَطَارِقَ مِنْ حَدِيْدٍ ضَرْبَةً، فَيَصِيْحُ صَيْحَةً يَسْمَعُهَا مَنْ يَلِيْهِ غَيْرَ الثَّقَلَيْنِ"

(۱) شرح الصدور فی احوال الموتی والقبور للسیوطی ص۱٤۸.

(۲) السؤال بالعربية أو بالسريانية كذافي الفتاوى الحديثية. ص۷.

(متفق عليه و لفظه للبخاری)[1]

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب بندہ کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے اعزہ واحباب واپس آنے لگتے ہیں تو وہ (مردہ) ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے اور اس کے پاس (قبر میں) دو فرشتے آتے ہیں اور اس کو بٹھا کر پوچھتے ہیں کہ تو اس شخص (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ اس کے جواب میں مومن بندہ کہتا ہے کہ: میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، پھر اس بندہ سے کہا جاتا ہے کہ: تو جہنم میں اپنا ٹھکانہ دیکھ، اس کے بدلہ تجھے اللہ نے جنت میں ٹھکانہ دیا ہے چنانچہ وہ مردہ دونوں مقام (جنت ودوزخ) دیکھتا ہے، اور جو مردہ منافق یا کافر ہوتا ہے اس سے بھی یہی سوال کیا جاتا ہے کہ اس شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں تو کیا کہتا تھا؟ وہ اس کے جواب میں کہتا ہے میں کچھ نہیں جانتا، جو اور لوگ کہتے تھے وہی میں بھی کہتا تھا، اس سے کہا جاتا ہے کہ نہ تو نے تحقیق کر کے جانا اور نہ اہل تحقیق کی اتباع کی، یہ کہکر اس کو لوہے کے گرزوں سے مارا جاتا ہے کہ اس کے چیخنے چلانے کی آواز سوائے جنوں اور انسانوں کے قرب وجوار کی تمام چیزیں سنتی ہیں۔ (بخاری ومسلم، الفاظ بخاری کے ہیں)

تشریحِ حدیث

قبر میں سوال وجواب اور راحت وعذاب:

اس حدیث میں قبر میں مومن کو راحت پہنچنے اور کافر ومنافق کو عذاب ہونے کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قبر مومن کے لئے راحت وآرام کی جگہ ہے، مومن بندہ منکر نکیر کے سوالات کا صحیح جواب دے کر نجات پا جاتا ہے اور راحت اور نعمتوں میں رہتا ہے اور کافر ومنافق جواب نہیں دے پاتا اس لئے وہ

(۱) أخرجه البخاري في موضعين: كتاب الجنائز، باب الميت يسمع خفق النعال ١/١٧٨، برقم ١٣٢٣ وباب ماجاء في عذاب القبر ١/١٨٤، برقم ١٣٥٨.

ومسلم "كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب عرض مقعد الميت من الجنة أو النار عليه الخ ٢/٣٨٦.

دائمی عذاب میں گرفتار ہوجاتا ہے اوراس کے عذاب وتکلیف کا سلسلہ قبر سے ہی شروع ہوجاتا ہے۔

مسئلۂ سماعِ موتی:

انہ لیسمع قرع نعالھم :اس جملہ سے معلوم ہوا کہ مردہ کے اردگرد جولوگ ہوتے ہیں مردہ ان کے جوتوں کی آواز اوران کی گفت وشنید کوسنتا ہے، اس لئے یہاں ''مسئلہ سماعِ موتی'' زیرِبحث آتا ہے کہ مردہ قبر میں سنتا ہے یانہیں؟ یہ مسئلہ صحابہؓ کے زمانہ سے ہی علماء کے درمیان مختلف فیہ چلا آرہاہے اوراس میں دونوں قسم کی آراء ہیں:

(۱) حضرت عائشہؓ اور بہت سے صحابہؓ اس کے قائل ہیں کہ مردہ نہیں سنتا ہے، ان کی دلیل قرآن کی یہ آیت ہے: ''وَمَآ أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ'' (۱) اسی طرح ایک جگہ وارد ہے: إِنَّكَ لَاتُسْمِعُ الْمَوْتٰى (۲) البتہ جن چیزوں کا سننا حدیث میں مذکور ہے ان کو یہ حضرات بھی بلاتاویل تسلیم کرتے ہیں، مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی قبر شریف میں لوگوں کے صلاۃ وسلام کوسننا اورجواب دینا، یہ حدیث سے ثابت ہے، اس پرسب متفق ہیں۔

(۲) حضرت عمر، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس اوراکثر علماء سماعِ موتی کے قائل ہیں، ان کے بھی کئی دلائل ہیں، بلکہ علامہ کشمیریؒ نے فرمایا ہے کہ سماعِ موتی کے بارے میں روایات تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں، چند روایات یہ ہیں:

(۱) یہی حدیث کہ مردہ اپنے ساتھیوں کے جوتوں کی آواز سنتا ہے۔

(۲) ایک حدیث میں ہے کہ جب آدمی قبر پر جاتا ہے اورسلام کرتا ہے تو مردہ اس کا جواب دیتا ہے اوراس کو پہچانتا ہے۔ (۳)

(۳) جنگ بدر میں ستر کافر مارے گئے، اوران کی لاشوں کوا یک کنویں میں ڈال دیا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کنویں کے پاس تشریف لے گئے اوران سے خطاب کیا کہ اللہ نے ذلت وعذاب کا تم سے جووعدہ کیا تھا اس کوتم نے سچا پالیا یانہیں؟ اس پرحضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ان کوخطاب کرنے کا

(۱)من سورۃ الفاطر:۲۲۔

(۲)من سورۃ النمل:۸۰۔

(۳)رواہ ابن عبدالبرعن ابن عباس مرفوعاً کماذکرہ ابن کثیر فی تفسیرہ ۳/ ۵۷۵۔

کیافائدہ؟ یہ تو مردے ہیں سنتے نہیں ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم ان سے زیادہ نہیں سنتے ہو، بس فرق یہ ہے کہ یہ جواب نہیں دے سکتے۔ (۱)

(۳) بعض علماء نے جانبین کے دلائل پرنظر کرتے ہوئے یہ تطبیق بیان فرمائی کہ سماع موتی جزئی طور پر مشیتِ الٰہی سے ثابت ہے یعنی ایسا نہیں کہ مردہ اپنے طور پر ہر بات کو سنتا ہو، البتہ حق تعالیٰ شانہ میت کو کوئی چیز سنانا چاہے تو اس کو سن لیتا ہے، صاحب روح المعانی نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، ہمارے اکابر میں حضرت گنگوہیؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ بھی اسی کے قائل ہیں، یہی قول راجح ہے، کیونکہ یہ اوفق بالنصوص ہے، حق تعالیٰ نے اپنے ماسوی سے اسماع کی نفی فرمائی ہے جبکہ بہت سی چیزوں کا سماع ثابت ہے، اس لئے یہ کہنا بجاہے کہ سماعِ موتی مشیت الٰہی سے جزئی طور پر ہوتا ہے۔ (۲)

قبرستان میں جوتے پہننے کا مسئلہ:

''قرع نعالھم'' ان الفاظ سے فقہاء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ قبرستان میں جوتے پہن کر جانا جائز ہے۔ (۳)

منکراورنکیراور بیک وقت متعدد اموات سے سوال کی نوعیت:

أتاه ملکان: مردہ کے پاس دوفرشتے آتے ہیں ان میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہتے ہیں، جیسا کہ آئندہ روایت میں تصریح آرہی ہے۔

اشکال: قبر میں سوال کے لئے منکر نکیر مقرر ہیں، حالانکہ دنیا میں ایک وقت میں متعدد افراد مرتے ہیں، پس محض یہ دونوں ایک وقت میں سب لوگوں سے کیسے سوال کر لیتے ہیں؟

اس کا جواب بعض نے یہ دیا ہے کہ منکر نکیر فرشتوں کی جماعت کا نام ہے، اوراس جماعت میں بہت سے فرشتے ہیں جو سب اسی کام پر مقرر ہیں اور بعض نے کہا کہ منکر ونکیر فرشتوں کی جماعت کے امیر ہیں اوران کے ماتحت ہزاروں فرشتے ہیں، پس ہر شخص کے پاس علیحدہ فرشتے آتے ہیں جیسا کہ ہر شخص کے اعمال

(۱) أخرجه البخاري في المغازي، باب قتل أبي جهل ۲/ ۵٦۵ برقم ۳۸۳٤.

(۲) مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: معارف القرآن ٦/ ٧٦٤-٧٦٦ (النمل: ۸۰)

(۳) المرقاة ۱/ ۳۱۳ واللمعات ۱/ ٤۲۱.

لکھنے کے لئے الگ الگ فرشتے مقرر ہیں۔

قعود وجلوس میں فرق:

فيقعدانه : بعض روایات میں "**فيجلسانه**" آیا ہے امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ: قعود وجلوس دونوں مترادف ہیں،(۱) اور علامہ تورپشتی نے فرمایا کہ: یہ دونوں لفظ جب تقابل کے طور پر مذکور ہوں تو ان میں فرق ہوتا ہے کہ قعود مقابل ہے قیام کا اور جلوس مقابل ہے اضطجاع کا، یعنی آدمی کھڑا ہو پھر بیٹھے تو اس بیٹھنے کو "قعود" سے تعبیر کہا جاتا ہے اور لیٹا ہو پھر اٹھ کر بیٹھے تو اس بیٹھنے کو "جلوس" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی لئے بعض نے کہا کہ **فيجلسانه** اولی ہے، کیونکہ مردہ قبر میں لیٹا ہوا ہوتا ہے فرشتے آکر بٹھاتے ہیں (۲) مگر ملاعلی قاری نے فرمایا کہ زیادہ روایات میں **فيقعدانه** آیا ہے، جس کا تقاضہ قیام سے قعود کی طرف آنا ہے، بعض علماء نے ان دونوں لفظوں کی تطبیق بیان کی ہے کہ مردہ فرشتوں کو دیکھ کر گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے پھر فرشتے اس کو بٹھاتے ہیں اس صورت میں **فيجلسانه** اور **فيقعدانه** دونوں درست ہیں۔(۳)

قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سوال وجواب کی نوعیت:

ما كنت تقول في هذا الرجل الخ : یہ تیسرا سوال ہے یہاں پہلے دوسوال مذکور نہیں ہیں، **لمحمد** "**الرجل**" کی تفسیر ہے، بعض نے کہا کہ یہ تفسیر راوی یعنی حضرت انسؓ کی طرف سے ہے، اور بعض نے کہا کہ ان کے علاوہ اور کسی راوی نے یہ تفسیر کی ہے، اس کو محدثین کی اصطلاح میں ادراج کہتے ہیں اور یہ اضافہ مدرج کہلاتا ہے، سید جمال الدین نے کہا کہ: یہ تفسیر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اس کا قرینہ یہ ہے کہ اگر راوی کی طرف سے تفسیر ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ درود ہوتا، اسی طرح نبی یا رسول کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی فرمائی ہے، پھر فرشتہ کا بغیر کسی تعظیمی لفظ کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو "رجل" سے تعبیر کرنا اس لئے ہے تاکہ میت فرشتہ کے تعظیمی لفظ سے جواب کو نہ سمجھ لے۔(۴)

---

(۱) المرقاة ۱/۳۱۳.

(۲) شرح المشكاة للطيبي ۱/۳۰۵.

(۳) المرقاة ۱/۳۱۳.

(٤) شرح المشكاة للطيبي ۱/۳۰۵-۳۰٦، فتح الإله ۱/۵۰۸.

سوال: ہذا اسم اشارہ قریب کے لئے آتا ہے تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں موجود ہوتے ہیں؟

جواب: اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں، (۱) بعض نے کہا کہ مردے کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ مثالیہ پیش کی جاتی ہے، اوراس صورتِ مثالیہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ: میت اور روضۂ اقدس کے درمیان جوحجابات ہیں وہ ہٹادیئے جاتے ہیں، میت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نظر آتے ہیں پھرآپ کی طرف اشارہ حسیہ کیا جاتا ہے۔

(۳) بعض نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بطور معجزہ کے مردے کے پاس خودتشریف لاتے ہیں۔

(۴) ملاعلی قاریؒ نے فرمایا کہ: ''الرجل'' پرالف لام عہد ذہنی کا ہے اورمعہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کامل فی الرجلیت ہیں، اس لئے اس وقت مردے کے ذہن میں خود بخود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تصورآ جاتا ہے۔(۱)

لاأدری! كنت أقول مايقول الناس : بظاہرمعلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں لفظ کافر ومنافق دونوں کہتے ہیں، لیکن ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ''لاادری'' کافرکہتا ہے یاپھروہ خاموشی اختیارکرتا ہے اور کنت اقول منافق کا قول ہے کیونکہ وہ بطورتقیہ کے دنیامیں کلمہ کا اقرار کرتا تھااس لئے اس کو جواب کے الفاظ کا استحضار نہ ہوگا۔(۲)

لادريت ولاتليت: ''تليت'' ''تلايتلو تُلُوًّا'' سے ہے بمعنی کسی کے پیچھے چلنا، اتباع کرنا، اصل میں ''تلوت'' تھا ''دريت'' کی مناسبت کی وجہ سے ''تليت'' کردیا گیا، مطلب یہ ہے کہ نہ تو نے خود تحقیق کی کہ حق کیا ہے اور غیرحق کیا ہے، اور نہ اہل تحقیق کا اتباع کیا، اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اگرخود محقق نہ ہولیکن اہلِ تحقیق کا اتباع کرلے تب بھی وہ نجات پاجائے گا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جوشخص مجتہد نہیں اس پرمجتہد کی تقلید کرنا واجب ہے۔

مطارق: مِطْرَقَةٌ کی جمع ہے بمعنی ہتھوڑا، گُرز، اس کوجمع لایا گیا ہے حالانکہ وہ ایک ہی ہوگا، وجہ یہ ہے کہ وزنی اور بھاری ہونے کی وجہ سے وہ ایک کئی گرزوں کے قائم مقام ہوگا۔(۳)

---

(۱)المرقاة ۱/۳۱۳.

(۲)المرقاة ۱/۳۱٤.

(۳)فتح الإله ۱/۵۰۹.

یسمعهامن یلیه : اس پراشکال ہے کہ یہاں "یسمعها من یلیه " کہا اور آئندہ حدیث میں آرہاہے کہ اس کی چیخ کومشرق ومغرب کی تمام مخلوق سنتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بعید کی نفی کرنا مقصودنہیں ہے،قریب کی مخلوق بھی سنتی ہے اور بعید کی بھی، اس لئے دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے، اسی طرح ذوالعقول بھی سنتے ہیں اور غیرذوی العقول بھی، مگر "من" ذوی العقول کا صیغہ اس لئے لایا گیا ہے کہ یہاں ملائکہ کو غیر ملائکہ پرغلبہ دیا گیا ہے۔(۱)

غیر الثقلین : ثقلین سے انسان اور جنات مراد ہیں کیونکہ یہ اپنے گناہوں کی وجہ سے زمین پر بوجھ ہیں۔بعض نے کہا کہ انہوں نے احکام شرعیہ کے بوجھ کو اٹھایا ہے اس لئے ان کوثقلین کہاجاتا ہے۔ (۲)

۱۲۰ / ۳ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ اَحَدَكُمْ إِذَا مَاتَ عُرِضَ عَلَيْهِ مَقْعَدُهُ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ، إِنْ كَا نَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَمِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، وَإِنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ النَّارِ فَمِنْ أَهْلِ النَّارِ، فَيُقَالُ: هٰذَا مَقْعَدُكَ حَتّٰى يَبْعَثَكَ اللّٰهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" (متفق عليه)(۳)

ترجمه : حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب تم میں سے کوئی مرجاتا ہے تو قبر کے اندرصبح وشام اس کا ٹھکانہ اسکے سامنے پیش کیاجاتا ہے اگر وہ جنتی ہوتاہے تو جنت میں اس کا ٹھکانہ دکھایا جاتا ہے، اوراگر وہ جہنمی ہوتا ہے تو جہنم میں اس کا ٹھکانہ دکھایا جاتا ہے اوراس سے کہا جاتا ہے کہ یہ تیراٹھکانہ ہے (اس کا انتظار کر) یہاں تک کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ شانہ تجھے وہاں پہنچادے گا۔(بخاری ومسلم)

(۱)فتح الإله ۱/ ۵۰۹.

(۲)فتح الإله ۱/ ۵۰۹.

(۳) أخرجه البخاري في ثلثة مواضع: كتاب الجنائز،باب الميت يعرض عليه مقعده بالغداة والعشي ۱/ ۱۸٤ برقم ۱۳٦۳، وأيضاً كتاب بدأالخلق، باب ماجاء في صفة الجنة وأنها مخلوقة ۱/ ٤۵۹، وأيضاً كتاب الرقاق، باب سكرات الموت ۲/ ۹٦٤.ومسلم كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب عرض مقعد الميت من الجنة اوالنار عليه الخ ۲/ ۳۸۵.

تشریحِ حدیث

قبر میں صبح وشام ٹھکانہ کا پیش ہونا:

اس حدیث میں بھی احوال برزخ کا بیان ہے کہ مرنے والا جنتی ہو یا جہنمی قبر میں ہر روز اس کا ٹھکانہ صبح وشام اس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

غداۃ و عشِیّ سے کیا مراد ہے؛ اس میں کئی اقوال ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ جس دن انتقال ہوا اس دن کی صبح وشام مراد ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ اس سے ہر دن کی صبح وشام مراد ہے۔

(۳) بعض نے کہا کہ نہار کے طرفین بول کر جمیعِ وقت اور دوام مراد لیا گیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ قبر میں مردہ اپنے جنت یا جہنم کے ٹھکانہ کو ہر وقت دیکھتا ہے۔ (۱)

۱۲۱ / ٤ : وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّ يَهُوْدِيَّةً دَخَلَتْ عَلَيْهَا، فَذَكَرَتْ عَذَابَ الْقَبْرِ، فَقَالَتْ لَهَا : أَعَاذَكِ اللّٰهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، فَسَأَلَتْ عَائِشَةُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، فَقَالَ: "نَعَمْ، عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ" قَالَتْ عَائِشَةُ: فَمَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدُ صَلّٰى صَلَاةً إِلَّا تَعَوَّذَ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ. (متفق عليه)(۲)

ترجمہ :حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ایک یہودی عورت ان کے پاس آئی اور اس نے عذاب قبر کا ذکر کیا اور پھر اس نے حضرت عائشہ سے کہا: عائشہ! اللہ تعالیٰ تمھیں عذاب قبر سے محفوظ رکھے، حضرت عائشہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عذاب قبر کا حال معلوم کیا، آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ''ہاں قبر کا عذاب حق ہے'' حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ: اس واقعہ کے بعد میں نے کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نماز پڑھی ہو اور عذاب قبر سے پناہ نہ مانگی ہو''۔ (بخاری ومسلم)

(۱) المرقاة ۱ / ۳۱٦.

(۲) أخرجه البخاري "كتاب الجنائز، باب جاء في عذاب القبر ۱ / ۱۸۳ ومسلم ""كتاب المساجد ومواضع الصلاة" (باب استحباب التعوذ من عذاب القبر ۱ / ۲۱۷)

تشریح حدیث

عذاب قبر برحق ہے:

ایک یہودیہ عورت نے حضرت عائشہؓ کے یہاں آکر کسی چیز کا سوال کیا حضرت عائشہؓ نے اس کی حاجت پوری کردی تو اس نے دعادی ''أَعَاذَكِ اللّٰهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ'' حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں دریافت کیا کہ کیا قبر میں عذاب ہوتا ہے؟ اور یہودیہ عورت کا واقعہ بتایا، اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عذاب قبر کا علم نہیں دیا گیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو سن کر گھبرائے، کمافی روایۃ الطحاوی(۱) اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عذاب قبر کا علم دیا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: ''نَعَمْ عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ''

یہاں اختصار ہے، مسند احمد کی روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت عائشہؓ کے سوال کے جواب میں آپ علیہ السلام نے یہ فرمایا ''كَذَبَتْ يهودُ؛ وهم على اللهِ عزوجل أَكْذَبُ ولاعذابَ دونَ يومِ القيامةِ (۲)'' کہ یہود نے جھوٹ کہا اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف بہت زیادہ جھوٹی باتیں منسوب کرنے والے ہیں قیامت کے عذاب سے پہلے کوئی عذاب نہیں ہے اور مسلم شریف کی روایت میں ہے: وانماتفتَنُ يهودُ کہ قبر میں یہود کو عذاب ہوتا ہے، (۳) اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی عذاب قبر کا علم دیا گیا چنانچہ اس کے بعد آپ علیہ السلام نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: نعم عذاب القبر حق، الحاصل یہودیہ کے عذاب قبر کے تذکرہ کے بعد آپ کو عذاب قبر کا علم دیا گیا اور پھر آپ نے اس کی ہولناکی کے پیشِ نظر اس سے پناہ مانگنا شروع کی۔

ملاعلی قاریؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اہتمام سے معلوم ہوا کہ کسی کو بھی اللہ کے عذاب سے اپنے کو مامون نہیں سمجھنا چاہئے۔(۴)

---

(۱) المرقاۃ ۱/۳۱۷، وکذافي رواية مسلم ۱/۲۱۷ فارتاع رسول الله صلى الله عليه وسلم.

(۲) مسند احمد (۲۴۵۲۰)

(۳) مسلم ۱/۲۱۷.

(٤) المرقاۃ ۱/۳۱۷-۳۱۸.

کیا کافرہ عورت سے پردہ ہے؟

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان عورت کے لئے کافر عورت سے پردہ نہیں ہے، احناف کا یہی مذہب ہے، ہاں اگر کافر عورت آوارہ ہو اور اس سے اندیشہ ہو کہ وہ مسلمان عورت کے حسن وجمال اور اوصاف کو اجنبیوں کے سامنے بیان کرے گی تو ایسی عورت سے پردہ ضروری ہوگا، شوافع کے یہاں مسلمہ کے لئے کافرہ سے پردہ ہے، یہ حدیث احناف کی دلیل ہے، شوافع اس میں تاویل کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے پردہ میں ہی بات کی ہوگی، حالانکہ روایات میں پردہ کا تذکرہ نہیں ہے، ملاعلی قاری نے فرمایا کہ ازواج مطہرات کا نساء کفار سے پردہ کرنا ثابت نہیں ہے۔ (۱)

۱۲۲/۵: وَعَنْ زَيْدِ بنِ ثَابِتٍؓ قَالَ: بَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَائِطٍ لِبَنِي النَّجَّارِ عَلٰى بَغْلَةٍ لَهٗ وَنَحْنُ مَعَهٗ، إِذْ حَادَتْ بِهٖ فَكَادَتْ تُلْقِيْهِ، وَإِذَا أَقْبُرٌ سِتَّةٌ أَوْخَمْسَةٌ فَقَالَ: مَنْ يَعْرِفُ أَصْحَابَ هٰذِهِ الْأَقْبُرِ؟ قَالَ رَجُلٌ: أَنَا، قَالَ: "فَمَتٰى مَاتُوْا؟" قَالَ: فِي الشِّرْكِ فَقَالَ: "إِنَّ هٰذِهِ الْأُمَّةَ تُبْتَلٰى فِيْ قُبُوْرِهَا، فَلَوْلَا أَنْ لَاتَدَافَنُوْا لَدَعَوْتُ اللّٰهَ أَنْ يُسْمِعَكُمْ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِيْ أَسْمَعُ مِنْهُ" ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَقَالَ: تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ" قَالُوْا: نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ، قَالَ: "تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ" قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، قَالَ: تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتَنِ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَابَطَنَ" قَالُوْا: نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتَنِ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَابَطَنَ، قَالَ: "تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ" قَالُوْا: نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ. (رواہ مسلم) (۲)

ترجمہ: حضرت زید بن ثابتؓ سے مروی ہے کہ ایک دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی نجار کے باغ میں اپنے خچر پر سوار تھے اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ اچانک خچر بدک گیا اور قریب تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرادے، اچانک چھ یا پانچ قبریں نظر آئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان قبر والوں کو کوئی جانتا ہے؟ ایک شخص نے کہا میں

(۱) المرقاة ۱/۳۱۷.

(۲) أخرجه مسلم، "كتاب الجنة وصفة نعيمها، باب عرض مقعد الميت من الجنة أو النار عليه وإثبات عذاب القبر والتعوذ منه ۲/۳۸٦.

جانتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کب مرے ہیں؟ اس شخص نے عرض کیا شرک کی حالت میں مرے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ امت اپنی قبروں میں آزمائی جاتی ہے (یعنی ان لوگوں پر ان کی قبروں میں عذاب ہورہا ہے) اگر مجھ کو یہ خوف نہ ہوتا کہ تم مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں ضرور اللہ سے یہ دعاء کرتا کہ وہ تم کو بھی عذاب قبر کی آواز سنوادے جس کو میں سن رہا ہوں، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ آگ کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو، صحابہؓ نے عرض کیا ہم آگ کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو، صحابہؓ نے عرض کیا: ہم عذاب قبر سے پناہ مانگتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ظاہری وباطنی فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگو، صحابہؓ نے عرض کیا: ہم ظاہری وباطنی فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دجال کے فتنہ سے اللہ کی پناہ مانگو، صحابہؓ نے عرض کیا ہم دجال کے فتنہ سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ (مسلم)

تشریحِ حدیث

احوال زید بن ثابت:

زید بن ثابت انصاری الخزرجی مشہور کاتب وحی صحابی ہیں، غزوۂ بدر کے موقع پر ان کی عمر صرف ۱۱ رسال تھی اس لئے غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوسکے تھے، ان کی پہلی شرکت غزوۂ خندق میں ہوئی، اہلِ روم کے خطوط سریانی زبان میں ہوتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے یہود سے ان کا ترجمہ کراتے تھے، لیکن ان کی ترجمانی پر اعتماد نہیں ہوتا تھا اور ان سے مضمون میں تبدیلی کردینے کا اندیشہ رہتا تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ وہ سریانی زبان سیکھیں، چنانچہ انھوں نے بہت جلد سریانی زبان سیکھ لی، حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں آپ کے حکم سے انہوں نے ہی قرآن کو پہلی مرتبہ یکجا کیا تھا، پھر حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بھی جمع قرآن کا فریضہ انہوں نے ہی انجام دیا تھا، ۴۵ھ میں مدینہ طیبہ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔(۱)

(۱) الإصابة ۲/ ۲۳۸-۲۳۹.

عذاب قبر کی ہولناکی:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنونجار کے ایک باغ میں سے گزرے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم خچر پر سوار تھے، خچر بدکنے اور شوخی کرنے لگا، حتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گرنے کے قریب ہوگئے، وہاں پانچ چھ قبریں تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معلوم کیا کہ ان قبر والوں کو کوئی جانتا ہے؟ ایک شخص نے کہا جی ہاں (میں جانتا ہوں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ لوگ کب مرے؟ انہوں نے کہا کہ شرک کی حالت میں (یعنی اسلام کی آمد سے پہلے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ امت عذاب قبر میں مبتلا کی جاتی ہے اوراگر یہ ڈر نہ ہوتا کہ تم مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دوگے تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ تم کو بھی عذاب قبر سنادے جس کو میں سن رہا ہوں، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور جہنم، عذاب قبر اور دجال کے فتنہ سے پناہ طلب کرنے کا حکم دیا۔

کیا عذاب قبر اس امت کے ساتھ خاص ہے؟

إن هذه الأمة تبتلى فى قبورها :بعض علماء نے اس جملہ سے استدلال کیا ہے کہ عذاب قبر اس امت کے ساتھ خاص ہے، حکیم ترمذی اور علامہ بن عبدالبر اسی کے قائل ہیں، لیکن علامہ ابن قیمؒ نے اس قول کی تردید کی ہے اور فرمایا کہ احادیث میں سابق امتوں سے عذابِ قبر کی نفی نہیں کی گئی ہے اور بعض علماء نے اس سلسلہ میں توقف فرمایا ہے۔ (۱)

ان مختلف اقوال میں سے راجح قول یہی ہے کہ عذاب قبر اس امت کے ساتھ خاص نہیں ہے، چنانچہ اوپر جو حدیث آئی ہے اس میں یہودیہ نے حضرت عائشہؓ کو جو "**اَعاذکِ اللہ من عذاب القبر**" کے الفاظ میں دعاء دی وہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ عذاب قبر میں پچھلی امتیں بھی مبتلا رہی ہیں اور ان کو بھی اس سے ڈرایا گیا تھا، اور **ان هذه الامة** میں امت سے جنس انسان مراد ہے۔ (۲)

فلو لا أن لاتدافنوا الخ :یعنی قبروں میں ہونے والے عذاب کو سن کر اس قدر خوف ودہشت میں مبتلا ہوجاتے کہ اپنے مردوں کو جنگلات و بیابان میں ڈالدیتے اور ان کو دفن نہ کرتے، یہ مطلب نہیں کہ

---

(۱) التمهيد لابن عبدالبر ۲۲/۲۵۳، نوادر الاصول فى احاديث الرسول ۳/۲۲۷، الروح لابن القيم ص ۷۶، ۸۷.

(۲) المرقاة ۱/۳۱۸.

عذاب قبر دفن پر موقوف ہے۔ (۱)

تعوذوا بالله من الفتن ما ظهر منها وما بطن : یہاں فتن سے مراد یا گناہ ہیں یعنی ظاہری و باطنی گناہ، ظاہری گناہ وہ ہیں جو ظاہر اعضاء سے صادر ہوتے ہیں جیسے جھوٹ غیبت، قتل سرقہ وغیرہ اور باطنی گناہ وہ ہیں جو قلب سے متعلق ہوں جیسے شرک، کفر، ریا، حسد، تکبر وغیرہ، یا فتن سے فتنہ کے معروف معنی مراد ہیں یعنی آزمائش اس معنی کے لحاظ سے فتنہ کی دو قسمیں ہیں، ظاہری فتنہ اور باطنی فتنہ، ظاہری فتنہ وہ ہے جس کے اسباب معلوم اور ظاہر ہوں اور باطنی فتنہ وہ ہے جس کے اسباب مخفی اور نامعلوم ہوں۔ (۲)

الفصل الثاني

۱۲۳/۶: عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَؓ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا أُقْبِرَ الْمَيِّتُ أَتَاهُ مَلَكَانِ أَسْوَدَانِ أَزْرَقَانِ، يُقَالُ لِأَحَدِهِمَا: اَلْمُنْكَرُ، وَلِلْآخَرِ: اَلنَّكِيْرُ فَيَقُوْلَانِ: مَاكُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ؟ فَيَقُوْلُ: هُوَ عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ، فَيَقُوْلَانِ: قَدْ كُنَّا نَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُوْلُ هٰذَا، ثُمَّ يُفْسَحُ لَهُ فِيْ قَبْرِهِ سَبْعُوْنَ ذِرَاعاً فِيْ سَبْعِيْنَ، ثُمَّ يُنَوَّرُ لَهُ فِيْهِ، ثُمَّ يُقَالُ لَهُ: نَمْ، فَيَقُوْلُ: أَرْجِعُ إِلٰى أَهْلِيْ فَأُخْبِرُهُمْ فَيَقُوْلَانِ: نَمْ كَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ الَّذِيْ لَا يُوْقِظُهُ إِلَّا أَحَبُّ أَهْلِهِ إِلَيْهِ حَتّٰى يَبْعَثَهُ اللّٰهُ مِنْ مَضْجَعِهِ ذٰلِكَ، وَإِنْ كَانَ مُنَافِقاً قَالَ: سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ قَوْلاً فَقُلْتُ مِثْلَهُ لَا أَدْرِيْ، فَيَقُوْلَانِ: قَدْ كُنَّا نَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُوْلُ ذٰلِكَ، فَيُقَالُ لِلْأَرْضِ: اِلْتَئِمِيْ عَلَيْهِ، فَتَلْتَئِمُ عَلَيْهِ، فَتَخْتَلِفُ أَضْلَاعُهُ، فَلَا يَزَالُ فِيْهَا مُعَذَّباً حَتّٰى يَبْعَثَهُ اللّٰهُ مِنْ مَضْجَعِهِ ذٰلِكَ"(رواه الترمذي)(۳)

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب مردے کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو اس کے پاس کالے رنگ کے نیلی آنکھوں والے دو فرشتے

(۱) التعليق الصبيح ۱/۱۰۹.

(۲) المرقاة ۱/۳۱۹.

(۳) أخرجه الترمذي "كتاب الجنائز، باب ماجاء في عذاب القبر ۱/۲۰۵"

آتے ہیں جن میں سے ایک کو ''منکر'' اور دوسرے کو'' نکیر'' کہتے ہیں وہ دونوں اس مردہ سے پوچھتے ہیں کہ تو اس شخص یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا کہتا تھا؟ اگر وہ شخص مؤمن ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ وہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، (یہ سنکر) دونوں فرشتے کہتے ہیں کہ: ہم جانتے تھے کہ تو یقیناً یہی کہے گا، اس کے بعد اس کی قبر لمبائی اور چوڑائی میں ستر ستر گز کشادہ کردی جاتی ہے اور قبر میں روشنی کردی جاتی ہے اور اس مردہ سے کہا جاتا ہے کہ سوجا، مردہ کہتا ہے کہ (میں چاہتا ہوں) اپنے اہل وعیال میں واپس چلا جاؤں، تا کہ ان کو اپنے اس حال سے باخبر کردوں، فرشتے اس سے کہتے ہیں کہ تو اُس دلہن کی طرح سوجا جس کو صرف وہی شخص جگا سکتا ہے جو اس کے نزدیک سب سے محبوب ہو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ شانہ اس کو اس جگہ سے اٹھائے گا (قیامت میں) اور اگر وہ مردہ منافق ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے لوگوں کو جو کچھ کہتے ہوئے سنا تھا وہی میں کہتا تھا، لیکن میں (اس کی حقیقت کو) نہیں جانتا، منافق کا (یہ جواب سن کر) فرشتے کہتے ہیں: ''ہم جانتے تھے کہ یقیناً تو یہی کہے گا، اس کے بعد زمین کو حکم دیا جاتا ہے کہ تو اس شخص پر مل جا، چنانچہ زمین اس مردہ پر سمٹ جاتی ہے اور اس کو اس طرح دباتی ہے کہ اس کی دائیں پسلیاں بائیں طرف اور بائیں پسلیاں دائیں طرف نکل جاتی ہیں اور وہ اسی طرح ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو (قیامت میں) اسی جگہ سے اٹھائے۔ (ترمذی)

تشریح حدیث

منکر اور نکیر کی ہیئت اور ان کا میت سے سوال وجواب:

اس حدیث پاک میں قبر میں منکر نکیر کے آنے اور مومن وکافر بندوں سے سوال کرنے کا اور ان کے راحت وعذاب کا ذکر ہے، یہ فرشتے نہایت خوفناک شکل میں آتے ہیں، ان کا رنگ کالا اور آنکھیں نیلی ہوتی ہیں ان میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہا جاتا ہے، مومن بندہ ان کے سوالات کا صحیح جواب دیتا ہے تو وہ کامیاب قرار پاتا ہے اور اس کو بے فکری کی نیند سلا دیا جاتا ہے، کافر اور منافق صحیح جواب نہیں دے پاتے لہٰذا ان کی قبر کو حد درجہ تنگ کردیا جاتا ہے اور وہ قیامت تک کے لئے عذاب میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

إذا اقبر الميت : ملاعلی قاریؒ نے فرمایا کہ یہ قید غالبی ہے؛ ورنہ اگر کسی کو جلادیا جائے یا درندہ اس کو کھالے اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوگا۔ (۱)

أزرقان: ''ازرق'' وہ شخص جس کی آنکھیں نیلی ہوں، ان کی آنکھیں نیلی اس لئے ہوتی ہیں تاکہ مردہ ان سے ڈرے کیونکہ ایسے شخص سے فطری طور پر ڈرلگتا ہے بالخصوص اہل عرب اس صفت والے شخص کو نہایت ہیبت ناک سمجھتے تھے، اہل عرب کی دشمنی اس زمانے میں اہل روم سے تھی اوراہل روم کی آنکھیں نیلی ہوا کرتی تھیں، اوربعض نے کہا کہ اس سے خوفناک اورڈراؤنی شکل میں آنا مراد ہے اور بقول بعض اس سے ان کا اندھے بن کرآنا مراد ہے، کما قال اللہ تعالیٰ: وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقاً'' (طٰہٰ:۱۰۲) کہ قیامت کے دن ہم مجرموں کو اندھابنا کر اٹھائیں گے، جوشخص اندھا ہواس کی شکل سے بھی فی الجملہ خوف محسوس ہوتا ہے، اوررحم کی امید بھی نہیں ہوتی۔

نیز یہ فرشتے مومن کے پاس بھی ڈراؤنی شکل میں آتے ہیں تاکہ اس کا امتحان ہو۔ (۲)

المنکر والآخر النکیر :المنکر اسم مفعول ہے انکار سے، جس کے معنی ہیں کسی کو نہ جاننا، اورنکیر بروزن فعیل مفعول کے معنی میں ہے جو نِکر بالکسر سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں غیرمعروف ہونا ''نَکِر الرجل'' اس وقت کہا جاتا ہے جب اس شخص کو کوئی نہ پہچانے، دونوں الفاظ سے مراد ہے: اجنبی شخص۔

عمدۃ القاری میں ہے کہ ان دونوں فرشتوں کی تخلیق دیگرفرشتوں نیز جانداروں میں سے کسی کے بھی مشابہ نہیں ہے بلکہ ان کی خلقت الگ نوعیت کی ہے، دیکھنے والوں کو ان میں ذرابھی انسیت محسوس نہیں ہوتی، اللہ نے ان کو عالم برزخ میں مسلمانوں کی تعظیم اورکافروں کی ذلت کے لئے پیدا کیا ہے۔ (۳)

یہ دونوں فرشتے میت کے لئے غیر مانوس واجنبی ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کو ''منکرنکیر'' کہا جاتا ہے بعض نے کہا کہ گنہ گاروں سے سوال کرنے والے فرشتوں کے نام منکرنکیر ہیں اورفرمانبرداروں سے سوال وجواب کرنے والے فرشتوں کے نام ''مبشرو بشیر'' ہیں۔ (۴)

---

(۱)المرقاۃ ۱/۳۱۹-۳۲۰.

(۲)المرقاۃ۱/۳۲۰.

(۳)عمدۃ القاری ج۱ ص۱۹۸،المرقاۃ ۱/۳۲۰.

(٤)تحفة الاحوزی ص ۱۵۵ ج٤ بحواله فتح الباری،اللمعات ۱/٤۳۰.

أشهد أن لاإله إلا الله: منکر نکیر کے سوال کا جواب دینے کے بعد مومن کلمہ پڑھتا ہے کیونکہ یہ جواب کا تتمہ ہے، بعض نے کہا کہ مردہ کلمہ پڑھتا ہے فخر وتلذذ کے طور پر کہ میں تو ایمان والا ہوں[1] یہاں صرف ایک سوال کا تذکرہ ہے ورنہ اصل تین سوالات ہوتے ہیں، قرآن وحدیث کا اسلوب یہی ہے کہ ایک واقعہ کو کبھی تفصیل سے ذکر کیا جاتا ہے اور کبھی اختصار کے ساتھ۔

قدكنا نعلم أنك تقول هذا: سوال یہ ہے کہ فرشتوں کو پہلے سے کیسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص یہ جواب دے گا؟

جواب: فرشتوں کو پہلے سے معلوم ہونے کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں: ایک یہ کہ حق تعالیٰ شانہ ان کو مطلع فرمادیتا ہو کہ یہ شخص صحیح جواب دے گا، یا فرشتے مومن مردے کی پیشانی پر سعادت کے آثار اور نورِ ایمان کو دیکھ کر پہچان لیتے ہوں[2] وغیرذٰلک۔

العروس: اس کا اطلاق مذکر ومؤنث دونوں پر ہوتا ہے، قرینۂ مقام سے اس کی مراد متعین کی جاتی ہے، یہاں مؤنث یعنی دلہن کے معنی میں ہے۔[3]

سبعون ذراعاً: بعض نے کہا کہ اس سے کثرت مراد ہے تحدید نہیں کیونکہ دوسری حدیث میں "مدبصره" تاحد نگاہ وارد ہوا ہے۔(۴)

إلااحب اهله إليه: اس سے مراد اس کا شوہر ہے، مطلب یہ ہے کہ بس اب عیش سے رہو، سوجاؤ، گھر والوں کو مطلع کرنے کی فکر نہ کرو۔(۵)

التئمي عليه: یہ التئام سے صیغۂ امر ہے بمعنی انضمي و اجتمعي یعنی مل جا، ایک ہوجا، مراد یہ ہے کہ اس پر تنگ ہوجا اور اس کو بھینچ دے، چنانچہ اس کے بعد قبر اس کو ایسا بھینچتی ہے کہ مردہ کی دونوں جانب کی پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں۔(۶)

---

(١)المرقاة ١/ ٣٢٠.
(٢)فتح الإله ١/ ٥١٦.
(٣) طيبي طاب الله ثراهُ ١/ ٣١٣.
(٤)طيبي ١/ ٣١٣، المرقاة ١/ ٣٢١.
(٥)طيبي ١/ ٣١٣.
(٦)المرقاة ١/ ٣٢٣.

اضلاعه: یہ ''ضلع'' کی جمع ہے بمعنی پسلی۔

مؤمنِ فاسق کا حال:

سوال: مومن مطیع قبر میں سوالات کے صحیح جواب دیدیتا ہے اور کافر ومنافق نہیں دے پاتے، جیسا کہ اس حدیث میں مذکور ہے، لیکن مومنِ فاسق کا کیا حال ہوگا؟ وہ منکر نکیر کے سوالات کا جواب دے سکے گا یا نہیں؟

جواب: احادیث میں بربناء مصلحت اس کی صراحت نہیں ہے کہ مؤمن فاسق منکر نکیر کے سوالات کا جواب دے سکے گا یا نہیں؟ اور وہ مصلحت یہ ہے کہ: مومن فاسق رجاء وخوف کے درمیان میں رہے، وہ جب یہ دیکھے گا کہ مؤمن مطیع صحیح صحیح جواب دیدیتا ہے تو مطیع بننے کی سعی کرے گا اور جب یہ سوچے گا کہ کافر ومنافق جواب نہیں دے پاتے اور میں کافر نہیں ایمان والا ہوں تو اللہ کی رحمت کا امیدوار رہے گا، البتہ علماء نے فرمایا ہے کہ اس بارے میں وارد احادیث کے مجموعے سے ظاہر یہی ہے کہ مؤمن اگرچہ فاسق ہو تو وہ مؤمن عادل کی طرح صحیح صحیح جواب دیدیتا ہے اور قبر میں اس کو حسب حال راحت بھی حاصل ہوگی اور اگر مستحق عذاب ہوا تو عذاب بھی ہوسکتا ہے اور اللہ معاف بھی کرسکتا ہے، پس اس کا معاملہ بین بین ہے۔[1]

١٢٤ / ٧: وَعَنِ الْبَرَاءِ بنِ عَازِبٍؓ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَالَ: "يَأْتِيهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهِ، فَيَقُوْلَانِ لَهُ، مَنْ رَبُّكَ؟ فَيَقُوْلُ رَبِّيَ اللّٰهُ، فَيَقُوْلَانِ لَهُ: مَادِيْنُكَ؟ فَيَقُوْلُ: دِيْنِي الإِسْلَامُ، فَيَقُوْلَانِ: مَاهٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ؟ فَيَقُوْلُ: هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، فَيَقُوْلَانِ لَهُ: وَمَايُدْرِيْكَ؟ فَيَقُوْلُ: قَرَأْتُ كِتَابَ اللّٰهِ فَآمَنْتُ بِهِ وَصَدَّقْتُ؛ فَذٰلِكَ قَوْلُهُ: "يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ" الآية، قَالَ: فَيُنَادِيْ مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ: أَنْ صَدَقَ عَبْدِيْ فَأَفْرِشُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ، وَأَلْبِسُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ، وَافْتَحُوْا لَهُ بَاباً إِلَى الْجَنَّةِ، فَيُفْتَحُ قَالَ: فَيَأْتِيْهِ مِنْ رَوْحِهَا وَطِيْبِهَا، وَيُفْسَحُ لَهُ فِيْهَا مَدَّبَصَرِهِ.

وَأَمَّا الْكَافِرُ فَذَكَرَ مَوْتَهُ، قَالَ: وَيُعَادُ رُوْحُهُ فِيْ جَسَدِهِ، وَيَأْتِيْهِ مَلَكَانِ، فَيُجْلِسَانِهِ فَيَقُوْلَانِ: مَنْ رَبُّكَ؟ فَيَقُوْلُ: هَاهْ هَاهْ، لَاأَدْرِيْ! فَيَقُوْلَانِ لَهُ: مَادِيْنُكَ؟

(١) ملاحظہ ہو: الدر المنضود ٦ / ٥٣٤.

فَيَقُوْلُ: هَاهْ هَاهْ لاأَدْرِيْ! فَيَقُوْلانِ مَاهٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ؟ فَيَقُوْلُ: هَاهْ هَاهْ لاأَدْرِيْ! فَيُنَادِيْ مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ: أَنْ كَذَبَ فَأَفْرِشُوْهُ مِنَ النَّارِ، وَأَلْبِسُوْهُ مِنَ النَّارِ، وَافْتَحُوْا لَهُ بَاباً إِلَى النَّارِ، قَالَ: فَيَأْتِيْهِ مِنْ حَرِّهَاوَسَمُوْمِهَا، قَالَ وَيُضَيَّقُ عَلَيْهِ قَبْرُهُ حَتّٰى تَخْتَلِفَ فِيْهِ أَضْلاعُهُ، ثُمَّ يُقَيَّضُ لَهُ أَعْمٰى أَصَمُّ، مَعَهُ مِرْزَبَةٌ من حديدٍ، لَوْضُرِبَ بِهَا جَبَلٌ لَصَارَتُرَاباً، فَيَضْرِبُهُ بِهَا ضَرْبَةً يَسْمَعُهَا مَابَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ إِلَّا الثَّقَلَيْنِ، فَيَصِيْرُتُرَاباً، ثُمَّ يُعَادُ فِيْهِ الرُّوْحُ"(رواه احمد، وابوداود)(۱)

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: قبر میں مردے کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اس کو بٹھا کر اس سے پوچھتے ہیں کہ تیرارب کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے: "میرارب اللہ ہے" پھر فرشتے پوچھتے ہیں: "تیرادین کیا ہے؟" وہ جواب میں کہتا ہے "میرادین اسلام ہے" اس کے بعد فرشتے اس سے سوال کرتے ہیں: "جوشخص اللہ کی طرف سے تمہارے پاس بھیجا گیا تھا، وہ کون ہے؟ وہ کہتا ہے: کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، پھر فرشتے اس سے پوچھتے ہیں "یہ تجھے کس نے بتایا"؟ وہ کہتا ہے "میں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب پڑھی، اس پرایمان لایا اوراس کی تصدیق کی؛ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ شانہ کے اس قول کا "یثبت اللہ الذین آمنوا بالقول الثابت الآیۃ" یعنی اللہ تعالیٰ شانہ ان لوگوں کو ثابت قدم رکھتا ہے جوایمان لائے۔ (اخیر آیت تک)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: پھر آسمان سے ایک پکارنے والا پکار کر کہتا ہے: میرے بندہ نے سچ کہا، لہٰذا اس کے لئے جنت کا فرش بچھاؤ اوراس کو جنت کا لباس پہناؤ اوراس کے واسطے جنت کی طرف ایک دروازہ کھولدو، چنانچہ جنت کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے پاس جنت کی ہوائیں اورخوشبوئیں آتی ہیں اورحد نظر تک اس کی قبر کو کشادہ کردیا جاتا ہے۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر کی موت کا ذکر فرمایا کہ اس کی روح اس

(۱) أخرجه ابوداود، كتاب السنة، باب في المسألة في القبروعذاب القبر ٢/٦٥٣، وأحمد ٤/٢٨٧ برقم ١٨٥٥٧، ١٨٥٥٨، ١٨٥٥٩.

کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے اوراس کے پاس دوفرشتے آتے ہیں جواس کو بٹھا کر پوچھتے ہیں: تیرارب کون ہے؟ وہ کہتا ہے: ہاہ ہاہ، میں نہیں جانتا، پھروہ پوچھتے ہیں: تیرادین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: ہاہ ہاہ، میں نہیں جانتا، اس کے بعدوہ پوچھتے ہیں: یہ شخص کون ہے جو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) تم میں بھیجا گیا تھا؟ وہ کہتا ہے: ہاہ ہاہ، میں نہیں جانتا، پھرآسمان سے ایک پکارنے والا پکارکر کہتا ہے" یہ جھوٹا ہے، اس کے لئے آگ کابستر بچھاؤ، آگ کا لباس اسے پہناؤ اوراس کے واسطے آگ کی طرف ایک دروازہ کھولدو" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چنانچہ دوزخ سے گرم ہوائیں اورلوئیں اس کے پاس آتی رہتی ہیں، اورفرمایا کہ قبراس کے لئے تنگ کردی جاتی ہے یہاں تک کہ ادھرکی پسلیاں ادھراورادھرکی پسلیاں اِدھرنکل آتی ہیں پھراس پرایک اندھابہرا فرشتہ مقررکردیاجاتاہے جس کے پاس لوہے کا ایسا گُرز ہوتاہے کہ اسکواگر پہاڑ پرمارا جائے تو وہ مٹی ہوجائے، وہ فرشتہ اس گرز سے اس طرح مارتاہے کہ (اس کے چیخنے کی آواز) مشرق سے مغرب تک تمام مخلوقات سنتی ہیں مگرجن وانس نہیں سنتے اوراس مارنے سے وہ مردہ مٹی ہوجاتا ہے اس کے بعد پھراس کے اندرروح لوٹادی جاتی ہے۔(احمد وابوداود)

تشریح حدیث

احوالِ قبرکاتفصیلی تذکرہ:

اس حدیث پاک میں بھی راحت قبراورعذاب قبرکابیان ہے اورقبرکے تینوں سوالوں کاتذکرہ ہے یہ ایک طویل حدیث ہے جس کے راوی براء بن عازبؓ ہیں، لیکن یہاں اس کا ابتدائی حصہ حذف کردیاگیاہے یہ مفصل روایت کتاب الجنائز میں آرہی ہے، اس حدیث کے ابتدائی حصہ میں مومن وکافرکے مرنے کا مفصل حال بیان کیاگیاہے، کہ مومن کی روح آسانی کے ساتھ نکالی جاتی ہے، آسمانوں میں اس کی روح کا استقبال کیا جاتاہے، اورکافرکی روح نہایت سختی کے ساتھ نکالی جاتی ہے، اس کی روح کے لئے آسمانوں کے دروازے بندکردیئے جاتے ہیں، یہ ابتدائی حصہ یہاں باب کے مناسب نہ تھا کیونکہ زیرنظر باب کا مقصد احوال قبرکو بیان کرناہے، اس لئے اس کا ابتدائی حصہ حذف کرکے **یاتیہ ملکان** سے روایت شروع کی گئی جس میں احوال قبرکابیان ہے۔

ماھذا الرجل: یہاں "ما" "من" کے معنی میں ہے یا یہ حذفِ مضاف کے ساتھ ہے: "ای ماوَصْفُ ھذا الرجل أرسولٌ ھو؟" یعنی اس شخص کا کیا حال ہے؟ کیا یہ رسول ہیں؛ یاما اعتقادک فیه؟ یعنی اس شخص کے بارے میں تیرا کیا عقیدہ ہے؟(۱)

فأفرشوه من الجنة: فا عاطفہ اور افرشوا باب افعال سے صیغۂ امر ہے، بمعنی بستر بچھانا، جنت میں داخلہ تو قیامت میں ہوگا لیکن اس کی کچھ نعمتیں قبر سے ہی ملنی شروع ہوجاتی ہیں۔

فیأتیه من روحها وطیبها: روح راء کے فتحہ کے ساتھ بمعنی ہوا۔(۲)

مَدَّ بصره: "مد" میم کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی فاصلہ، "مد بصره" کے معنی ہیں: نگاہ پڑنے کی حدتک کا فاصلہ، منتہائے نظر۔

ایک تعارض اور اس کا حل:

اس مضمون کی سابق روایت میں **سبعون ذراعاً** ستر ہاتھ کشادگی کا ذکر تھا اور یہاں منتہائے نظر کشادگی کا بیان ہے جو بظاہر تعارض ہے؟

اس کے کئی جواب ہیں (۱) سبعون ذراعاً سے تحدید مراد نہیں بلکہ کثرت توسیع مراد ہے، اصل کثرتِ توسیع کو بیان کرنا مقصود ہے اس کثرت توسیع کو مختلف الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ روایات کا یہ اختلاف، اختلافِ اشخاص پر محمول ہے کہ بعض مؤمن بندوں کے لئے ستر ہاتھ اور بعض کے لئے منتہائے نظر کشادگی کی جاتی ہے۔

(۳) بعض نے کہا کہ ستر ہاتھ کی کشادگی قبر میں ہوتی ہے اور منتہائے نظر کشادگی جنت میں ہوتی ہے، اس صورت میں "**فیها**" کی ضمیر کا مرجع جنت ہوگا۔(۳)

هاه هاه: یہ کلمۂ تحیر وحسرت ہے۔

فینادي منادٍ من السماء: یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی آواز ہوتی ہے، یا اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے فرشتہ کی آواز ہوتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ **لاأدری** کہنے میں جھوٹا ہے کیونکہ دنیا میں مشرق سے مغرب تک

(۱) فتح الإله ۱/ ۵۱۸.

(۲) المرقاة ۱/ ۳۲۳.

(۳) المرقاة ۱/ ۳۲٤.

دین اسلام کی شہرت تھی، مگراس نے ازراہ عناد تسلیم اور قبول نہیں کیا۔ (۱)

فيأتيه من حرها وسمومها: ''حر'' بمعنی گرمی، ''سموم'' گرم ہوا جمع سمائم۔ (۲)

أعمى أصمّ: سوال ہوتا ہے کہ وہ فرشتہ بہرہ اور اندھا کیوں ہوتا ہے؟

اس کے دو جواب ہیں:

(۱) وہ فرشتہ اندھا بہرا ہوتا ہے تاکہ وہ مردے کی حالت کو دیکھ نہ پائے اور اس کی چیخ بھی نہ سن سکے۔ (۳)

(۲) بعض نے کہا کہ: اندھا و بہرا ہونا کنایہ ہے بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ مارنے سے۔ (۴)

مرزبته: میم کے کسرہ، زا کے فتحہ اور باء کی تشدید کے ساتھ ہے، بمعنی گرز، ہتھوڑا، گھن۔

۱۲۵ / ۸: وَعَنْ عُثْمَانَؓ أَنَّهُ كَانَ إِذَا وَقَفَ عَلٰى قَبْرٍ بَكٰى حَتّٰى يَبُلَّ لِحْيَتَهُ، فَقِيْلَ لَهُ: تَذْكُرُ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ فَلَا تَبْكِيْ، وَتَبْكِيْ مِنْ هٰذَا؟! فَقَالَ: إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ''إِنَّ الْقَبْرَ أَوَّلُ مَنْزِلٍ مِنْ مَنَازِلِ الْآخِرَةِ، فَإِنْ نَجَا مِنْهُ فَمَا بَعْدَهُ أَيْسَرُ مِنْهُ، وَإِنْ لَمْ يَنْجُ مِنْهُ فَمَا بَعْدَهُ أَشَدُّ مِنْهُ'' قَالَ: وَقَالَ: رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَارَأَيْتُ مَنْظَرًا قَطُّ إِلَّا وَالْقَبْرُ أَفْظَعُ مِنْهُ''(رواه الترمذي، وابن ماجه (۵) وقال الترمذی هذا حديث غريب)

ترجمه: حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ جب وہ کسی قبر کے پاس کھڑے ہوتے تو اس قدر روتے کہ اپنی داڑھی کو (آنسوؤں سے) تر کر دیتے، ان سے کہا گیا کہ آپ جب جنت وجہنم کا ذکر کرتے ہیں تو نہیں روتے اور قبر کی وجہ سے روتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ: حضرت نبی کریم

(۱) فتح الإله ۱/ ۵۱۹.

(۲) فتح الإله ۱/ ۵۲۰.

(۳) اللمعات ۱/ ٤٣٣.

(٤) المرقاة ۱/ ۳۲۵.

(٥) أخرجه الترمذی ''كتاب الزهد، باب بدون ترجمه، وقبله باب ماجاء فی ذكر الموت، ۲/ ۵۷ وابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر القبر والبلی ۲/ ۳۱۵''

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے جس نے اس منزل سے نجات پائی بعد کے مراحل اس کے لئے آسان ہیں اور جو شخص اس سے نجات نہ پاسکا اس کے لئے اس کے بعد کے مراحل اور سخت ہیں، حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی کوئی منظر قبر سے زیادہ سخت اور بھیانک نہیں دیکھا۔ (ترمذی، ابن ماجہ، اور ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث غریب ہے)

تشریحِ حدیث

حضرت عثمان غنیؓ کا قبر کے خوف سے رونا:

اس حدیث پاک میں بھی مردہ کی نوعیت کے لحاظ سے قبر کے مقام راحت اور مقام تکلیف ہونے کا بیان ہے، حضرت عثمانؓ کا حال یہ تھا کہ جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو اس قدر روتے کہ ان کی ڈاڑھی مبارک تر ہوجاتی، کسی نے پوچھا کہ آپ جنت وجہنم کے تذکرے سے اس قدر نہیں روتے جتنا قبر کے تذکرہ سے روتے ہیں، انھوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: قبر آخرت کی منزلوں میں سے سب سے پہلی منزل ہے، جو اس سے نجات پا گیا اس کے لئے بعد کی منزلیں بھی آسان ہوں گی، کیونکہ راحت ونجات کا ملنا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ عزوجل نے اسے معاف کردیا ہے، اور جو یہاں نجات نہ پاسکا اس کے بعد کے مراحل اس کے لئے اور سخت ہوں گے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ قبر سے زیادہ ہیبت ناک کوئی منظر نہیں دیکھا۔

سوال: حضرت عثمانؓ تو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں پھر وہ قبر کو دیکھ کر کیوں روتے تھے؟

جواب: یہ ہے کہ جنت کی بشارت کے باوجود ان پر خوف کا غلبہ ہوتا تھا کہ اللہ کو اس کے خلاف پر بھی قدرت ہے، اللہ تعالیٰ شانہ بے نیاز ہے اس کی شان بے نیازی کی وجہ سے اللہ کے مقرب بندے ہمیشہ لرزاں وترساں رہتے ہیں، بعض نے کہا کہ عذاب قبر دخول جنت کے منافی نہیں ہے یہ ممکن ہے کہ قبر میں کچھ عذاب ہو اور پھر جنت کا داخلہ نصیب ہوجائے۔(۱)

(۱) المرقاۃ ۱/ ۳۲۶.

قبر؛ آخرت کی اولین منزل:

القبر أول منزل من منازل ا لآخرة: آخرت میں بہت مراحل اور منازل ہیں مثلاً منزل میزان، منزلِ صراط، منزل جنت وجہنم وغیرہ، قبران منزلوں میں پہلی منزل ہے۔

وان لم ینج منه فمابعده اشد منه: اس قاعدہ سے وہ گنہ گار مؤمن مستثنٰی ہے جس کواللہ تعالیٰ اس کے گناہ کے عوض محض قبر میں کچھ تکلیف دے کر آخرت میں عذاب نہیں دیں گے، اس کو قبر میں کچھ تکلیف دینے کا مقصد آخرت کے لئے پاک کرنا ہوگا۔ (۱)

قبر؛ سب سے خوفناک منظر:

والقبر أفظع منه: قبر کا منظر سب سے زیادہ ہولناک اورخوفناک ہے، دراصل بندہ ایسے حالات سے پہلی مرتبہ دوچار ہوگا اور پہلی مصیبت بہت سخت معلوم ہوتی ہے، اس لئے ایسا کہا گیا، ورنہ بعد کی منزلیں اور بھی سخت اورخوفناک ہیں۔

١٢٦ / ٩: وَعَنْهُ، قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا فَرَغَ مِنْ دَفْنِ الْمَيِّتِ وَقَفَ عَلَيْهِ، فَقَالَ: "اِسْتَغْفِرُوْا لأَخِيْكُمْ، ثُمَّ سَلُوْا لَهٗ بِالتَّثْبِيْتِ، فَإِنَّهُ الآنَ يُسْأَلُ" (رواه أبوداود)(۲)

ترجمہ: حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب میت کی تدفین سے فارغ ہوجاتے تو قبر کے پاس کھڑے ہوکر فرماتے اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو اوراس کے لئے ثابت قدم رہنے کی دعاء کرو اس لئے کہ اب اس سے سوال کیا جائے گا۔ (ابوداود)

تشریح حدیث

تدفین کے بعد میت کے لئے استغفار ودعا:

اس حدیث میں منکرنکیر کے سوال کا اجمالی تذکرہ اورحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک معمول کا بیان ہے کہ

(۱) المرقاة ۱ / ۳۲۶.

(۲) أخرجه أبوداود، كتاب الجنائز، باب الاستغفار عند القبر للميت في وقت الإنصراف ۲ / ۴۵۹.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم دفن کے بعد قبر پر کھڑے ہوتے اور فرماتے کہ اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو اور اس کے لئے ثابت قدمی کی دعا کرو، مثلاً ان الفاظ میں دعا کی جائے ''اَللّٰھُمَّ ثَبِّتْہُ بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ '' چنانچہ دفنِ میت کے بعد میت کے لئے استغفار کرنا اور کچھ دیر قبر پر ٹھہرنا سنت ہے، حضرت عمرو بن عاصؓ نے وصیت فرمائی تھی کہ مجھے دفن کرنے کے بعد اتنی دیر قبر پر ٹھہرنا جتنی دیر میں اونٹ کو ذبح کرکے اس کا گوشت تقسیم کیا جائے، پھر بہتر یہ ہے کہ یہ استغفار و دعا ہاتھ اٹھائے بغیر ہو، ہاتھ اٹھانے میں صاحب قبر سے مانگنے کا شبہ ہوتا ہے، لیکن اگر ہاتھ اٹھا کر کرنا ہو تو قبر کی طرف پشت اور قبلہ کی طرف رخ کرکے اس کے لئے استغفار اور دعا کی جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازہ میں ایسا ہی کیا تھا۔ (۱)

ایصالِ ثواب کا حکم:

استغفروا لأخیکم :اس سے معلوم ہوا کہ زندہ لوگوں کی دعا سے مردہ کو فائدہ ہوتا ہے، اہل سنت والجماعت کا یہی عقیدہ ہے، معتزلہ مسئلہ اہداء اور ایصالِ ثواب کو تسلیم نہیں کرتے، ان کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے ''لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی (۲)'' یعنی انسان کو صرف اس کی اپنی کوشش کا بدلہ ملے گا، لہٰذا زندہ کا عمل مردے کے کام نہیں آئے گا، جواب یہ ہے کہ سعی کی دو قسم ہیں (۱) سعی ایمانی (۲) سعی عملی، آیت شریفہ میں سعی سے سعی ایمانی مراد ہے، سعی عملی نہیں، اور مطلب یہ ہے کہ تمہارا کوئی دوست عزیز قریب وغیرہ اگر ایمان والا نہیں ہے تو تمہارے ایمان سے اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا البتہ جو حضرات ایمان والے ہیں ان کا حکم یہ ہے کہ ایک کے عمل سے دوسرے کو فائدہ ہوسکتا ہے جیسا کہ یہاں احیاء کو اموات کے لئے استغفار کا حکم اسی لئے دیا ہے کہ اس سے اموات کو فائدہ ہوتا ہے۔

البتہ اس میں کچھ تفصیل ہے، وہ یہ کہ عبادات دو قسم کی ہوتی ہیں بدنی و مالی، عبادت مالی کا ثواب تو سب کے یہاں پہنچتا ہے، عبادت بدنی کے ثواب پہنچنے میں اختلاف ہے، احناف وحنابلہ فرماتے ہیں کہ عبادت مالی و بدنی دونوں کا ثواب پہنچتا ہے اور شوافع و مالکیہ کے یہاں عبادت بدنی کا ثواب نہیں پہنچتا ہے حتی کہ تلاوت قرآن کا ثواب بھی نہیں پہنچتا، کیونکہ تلاوت بھی عبادت بدنی ہے، لیکن ان کے یہاں اس سے

(۱)فتح الباری، کتاب الدعوات، باب الدعاء مستقبل القبلة ۱۱/۱۴۴.

(۲)من سورة النجم:۳۹.

دعاء کا استثناء ہے، دعاء اگرچہ بدنی عبادت ہے، مگر شوافع و مالکیہ کے یہاں بھی دعا سے میت کو فائدہ ہوتا ہے۔ (۱)

مسئلۂ تلقین موتیٰ:

بعض شوافع نے اس حدیث سے مسئلۂ تلقین مستنبط کیا ہے جس کا تعلق بعدالدفن سے ہے، اس کی تفصیل ایک دوسری حدیث میں ہے وہ یہ کہ حضرت ابوامامہؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعدالدفن میت کو تلقین کا حکم دیا کہ ایک شخص قبر کے سر کی طرف کھڑا ہو اور مردے کو پکارے یـــا فــلان بـن فـــلانة! یعنی والدہ کی طرف نسبت کرکے پکارے تو مردہ اس کو سنتا ہے لیکن جواب نہیں دیتا ہے، پھر دوسری مرتبہ کہے تو مردہ اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے، پھر تیسری مرتبہ کہے تو اس شخص سے مردہ کہتا ہے کہ اے اللہ کے بندے تو مجھ سے کیا کہنا چاہتا ہے؟ پھر اس کے بعد کہے کہ تیرا رب اللہ ہے، تیرا دین اسلام ہے، تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اسی طرح دوسرے عقائد سکھائے جائیں، اس طرح کرنے کی وجہ سے جب منکر نکیر آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کو تو جوابات بتائے جارہے ہیں، تو واپس چلے جاتے ہیں، علامہ سیوطیؒ نے جمع الجوامع میں ابن عساکر کے حوالہ سے اس روایت کو ذکر کیا ہے، (۲) مگر چونکہ اس حدیث کی سند مضبوط نہیں اس لئے اکثر حنفیہ اس طرح کی تلقین میت کے قائل نہیں اور ظاہر الروایۃ کے مطابق یہ تلقین میت انکے یہاں غیر مستحسن ہے۔ (۳)

> ۱۲۷ / ۱۰: وَعَنْ أَبِیْ سَعِیْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَيُسَلَّطُ عَلَى الْكَافِرِ فِيْ قَبْرِهِ تِسْعَةٌ وَتِسْعُوْنَ تِنِّيْناً، تَنْهَسُهُ وَتَلْدَغُهُ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ، لَوْأَنَّ تِنِّيْناً مِنْهَا نَفَخَ فِيْ الْأَرْضِ مَاأَنْبَتَتْ خَضِراً" (رواه الدارمی وروی الترمذي نحوه (۴) وقال: "سبعون "بدل تسعة وتسعون)

(۱) کتاب الروح لابن القیم ص ۱۲۲.

(۲) جمع الجوامع، الهمزة مع الذال، رقم الحديث: ۱۷۰۰ / ۲۶۱۵.

(۳) فتاوی هندیه ۱ / ۱۰۰، مراقی الفلاح علی الطحطاوی ص ۳۰۶، مظاهر حق جدید ۱ / ۱۹۷.

(٤) أخرجه الترمذي، كتاب صفة القيامة، باب بدون ترجمه ۲ / ۷۲ والدارمي "باب فی شدة عذاب أهل النار ۲ / ۷۸۷ برقم ۲۸۵۷"

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ سے مروی ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: کافر کے اوپر اس کی قبر میں ننانوے اژدہے مسلط کئے جاتے ہیں، جو اس کو قیامت تک کاٹتے اورڈستے رہتے ہیں، اگران میں سے ایک اژدہا زمین پر پھنکار ماردے توزمین (کبھی) سبزہ نہ اُگائے (دارمی) اورترمذی نے بھی اسی قسم کی روایت نقل کی ہے لیکن اس میں بجائے ننانوے کے ستر کاعدد ہے۔

تشریح حدیث

قبرمیں کافرپرننانوے سانپوں کا مسلط ہونا:

اس حدیث میں کافر کے لئے عذاب قبرکا بیان ہے کہ کافر پرقبرمیں ننانوے اژدہے مسلط کئے جاتے ہیں جواس کوکاٹتے اورڈستے رہتے ہیں۔

تنّینا: بروزن سکّیت بڑا سانپ جس میں زہر بہت زیادہ ہو: **حية عظيمة كثيرة السم**.(۱)

ننانوے کی وجہ تخصیص:

تسعة وتسعون: اس عدد کی اصل وجہ اللہ ہی کومعلوم ہے، البتہ بعض نے کہا کہ اللہ کی سو رحمتیں ہیں، ان میں سے دنیامیں ایک رحمت کو اتاراہے اسی ایک رحمت کا اثر ہے کہ والدین اپنی اولاد سے اولاد والدین سے بھائی بھائی وغیرہ سے باہم الفت ومحبت رکھتے ہیں اور یہ الفت ومحبت جانوروں میں درندوں میں بھی پائی جاتی ہے، ننانوے رحمتوں کواللہ تعالیٰ قیامت کے دن مومنین کی مغفرت کے لئے استعمال کرے گا، پس جوشخص کافر ہے وہ اللہ کی ننانوے رحمتوں کا بھی منکر ہے، اس لئے ہررحمت کے مقابلہ میں اس پرایک اژدہامسلط کیاجائے گا۔(۲)

بعض نے کہا کہ مشہور روایت کے مطابق اللہ کے ننانوے نام ہیں **ان لله تعالىٰ تسعة وتسعين اسماًالحديث** کافر نے اللہ کا انکارکیا گویا کہ اس نے ننانوے صفات کا انکارکیا تو ہرصفت کے انکار کی وجہ سے ایک اژدہا مسلط کیاجائے گا۔(۳)

---

(۱)المرقاة ۱/ ۳۳۰، واللمعات ۱/ ٤۳٦.

(۲)المرقاة ۱/ ۳۲۸.

(۳)المرقاة ۱/ ۳۲۸.

ایک تعارض کا حل:

سوال: یہاں ننانوے ازدھوں کا بیان ہے اور ایک حدیث میں ستر اژدہوں کا ذکر ہے؟ پس دونوں حدیثیں بظاہر معارض ہیں؟

اس کے کئی جواب ہیں: (۱) ستر والی روایت ضعیف ہے اور یہ روایت راجح ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ سبعین سے مراد کثرت ہے اور اس کی مقدار ننانوے ہے، پس دونوں کی مراد ایک ہوئی۔

(۳) بعض نے کہا کہ یہ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، چنانچہ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ ۹۹ والی روایت کافر متبوع کے لئے اور ستر والی روایت کافر تابع کے لئے ہے۔

(۴) بعض نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ستر کا اور پھر بعد میں ننانوے کا علم دیا گیا اور عدد قلیل عدد کثیر کے منافی نہیں ہوتا ہے۔

(۵) بعض نے کہا کہ دونوں عددوں سے کثرت مراد ہے۔(۱)

تنهسه وتلدغه :- یہ دونوں فعل باب فتح یفتح سے ہیں، بعض نے ان کو مترادف کہا ہے، اور بعض نے فرق بیان کیا ہے کہ زور سے کاٹا جائے لیکن زہر کم ہو یہ ''نہس'' اور کاٹنا کم ہو البتہ زہر زیادہ چڑھے یہ ''لدغ'' ہے جس کا اردو ترجمہ ڈسنا ہے۔(۲)

ماأنبتت خضراً: یعنی وہ ایسا خطرناک سانپ ہوتا ہے کہ اگر اس کی پھنکار اور حرارت زمین پر پہنچ جائے تو زمین پر کبھی ہریالی پیدا نہ ہو، اللہ حفاظت فرمائے، جن مقامات میں میزائیل گرادیا جاتا ہے وہاں اس کا مشاہدہ خوب ہوتا ہے۔

الفصل الثالث

۱۲۸ / ۱۱: عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلٰى سَعْدِ بنِ مُعَاذٍ حِيْنَ تُوُفِّيَ، فَلَمَّا صَلّٰى عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَوُضِعَ

(۱) المرقاة ۱ / ۳۲۹، واللمعات ۱ / ٤٣٨، والتعليق الصبيح ۱ / ۱۱۲.

(۲) المرقاة ۱ / ۳۲۸.

فِيْ قَبْرِهٖ وَسُوِّيَ عَلَيْهِ، سَبَّحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ،فَسَبَّحْنَا طَوِيْلاً، ثُمَّ كَبَّرَ فَكَبَّرْنَا، فَقِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ! لِمَ سَبَّحْتَ ثُمَّ كَبَّرْتَ؟ قَالَ: "لَقَدْ تَضَايَقَ عَلَى هٰذَا الْعَبْدِ الصَّالِحِ قَبْرُهٗ حَتّٰى فَرَّجَهُ اللّٰهُ عَنْهُ" (رواه أحمد)(۱)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ حضرت سعد بن معاذؓ کی وفات ہونے پر ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ان کے جنازہ میں گئے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز جنازہ سے فارغ ہوگئے اور حضرت سعدؓ کو قبر میں اتار کر قبر کی مٹی برابر کردی گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سبحان اللہ کہا، ہم بھی دیر تک تسبیح پڑھتے رہے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر کہی تو ہم نے بھی تکبیر کہی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ: یارسول اللہ! آپ نے تسبیح کیوں پڑھی اور پھر تکبیر کیوں کہی؟ فرمایا "اس بندۂ صالح پر اس کی قبر تنگ ہوگئی تھی، پھر اللہ نے (ہماری تسبیح وتکبیر کی وجہ سے) اسے کشادہ فرمادیا۔ (احمد)

تشریحِ حدیث

احوال جابرؓ:

ان کا پورا نام جابر بن عبداللہ بن عمرو بن حرام الانصاری السلمی ہے، ابوعبداللہ ابوعبدالرحمان اور ابومحمد کئی کنیتیں بیان کی گئی ہیں، بیٹے اور باپ دونوں صحابی ہیں، حضرت جابر کثیر الروایہ صحابہ میں شمار ہوتے ہیں، جنگ بدر اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک رہے، فرماتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۱ر غزوات کئے جن میں سے ۱۹ر میں میں بھی شریک ہوا، اور بعض نے جنگ بدر واحد میں ان کی شرکت سے انکار کیا ہے، البتہ اس کے بعد کے غزوات میں شریک رہے، مسجد نبوی میں ان کا مستقل حلقۂ درس تھا، جس میں لوگ شریک ہوکر فیضیاب ہوتے تھے، اخیر عمر میں نگاہ کمزور ہوگئی تھی، ۹۴ر سال کی عمر میں ۷۴ھ میں اور بقول بعض ۷۸ھ میں انتقال ہوا، بعض حضرات نے کہا ہے کہ مدینہ میں سب سے اخیر میں انہی کی وفات ہوئی یعنی صحابہ میں، مگر یہ مرجوح ہے، صحیح یہ ہے کہ مدینہ میں سب سے اخیر میں وفات پانے والے صحابی سہل بن سعد ہیں۔ (۲)

---

(۱) أخرجه أحمد ۳/ ۳۶۰ برقم ۱۴۹۱۶ و۳/ ۳۷۷ برقم ۱۵۰۷۱.

(۲) الإصابة ۱/ ۵۴۶.

سعد بن معاذ اوران پر قبر تنگ ہوجانے کا واقعہ:

سعد بن معاذؓ انصار کے قبیلۂ اوس کے سردار تھے، قبیلۂ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ تھے، سعد بن معاذ قدیم الاسلام صحابی ہیں اسلام لانے کے بعد برابر اسلام کی خدمت کرتے رہے، غزوۂ بدر اور احد میں شریک ہوئے، غزوۂ احد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت پر مامور تھے، ۵ھ میں غزوۂ خندق ہوا جس میں قبائل عرب مدینہ پر چڑھ آئے تھے اور مسلمانوں کو نرغہ میں لے لیا تھا، یہودِ بنو قریظہ نے مسلمانوں سے کیا ہوا عہد توڑ کر مشرکین کا ساتھ دیا محاصرہ اس قدر شدید تھا کہ اہل ایمان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا قلوب کھنچ کر گلے میں آ گئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی خیرخواہی کے لئے ایک بات سوچی کہ ہم مدینہ کی کچھ کھجوروں پر کفار سے صلح کرلیں جس سے مسلمانوں کو اس محاصرہ سے نجات مل جائے اس پر سعد بن معاذ نے پوچھا کہ: یارسول اللہ کیا یہ من جانب اللہ حکم ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: نہیں! ایسی کوئی بات نہیں، یہ میرا مشورہ ہے اس پر انھوں نے عرض کیا کہ: ہم ان کفار کو ایک کھجور بھی نہیں دیں گے واللہ! زمانۂ جاہلیت میں بھی ان کفار مکہ کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ جبراً ہم سے ایک کھجور بھی لیجائیں، اب تو اللہ جل شانہ نے ہمیں اسلام کی دولت سے سرفراز فرمایا، اب ہم اپنا مال ان کے حوالہ کریں، یہ ناممکن ہے، لہٰذا ہم ان کا مقابلہ تلواروں سے کریں گے، ان کی اس رائے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے چنانچہ مقابلہ ہوا اور مسلمانوں کو فتح ہوئی، اس جنگ میں حضرت سعد بن معاذ کو ایک زخم لگا تھا، کچھ مدت کے بعد وہ زخم ہرا ہوا اور اسی میں وہ شہید ہوئے، جب ان کی تدفین ہوئی تو اس وقت یہ واقعہ پیش آیا جو یہاں حدیث میں مذکور ہے۔

لقد تضايق على هذا العبد الصالح: حضرت سعد بن معاذ جلیل القدر صحابی ہیں اس کے باوجود وہ قبر کی تنگی کا شکار ہوئے، اس کے مختلف اسباب ووجوہات بیان کی گئی ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ وہ جلیل القدر صحابی تھے لیکن ان کے یہاں مویشی زیادہ تھے، اس کی وجہ سے ممکن ہے کہ پیشاب کی چھینٹیں آ جاتی ہوں اور عذاب قبر پیشاب سے نہ بچنے کی وجہ سے بھی ہوتا ہے، مگر یہ کوئی مضبوط بات نہیں ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ یہ عذاب قبر نہیں، بلکہ ضغطۂ قبر ہے اور یہ تھوڑی دیر کے لئے ہر شخص کو پیش

آتا ہے، مومن کے ساتھ قبر کا یہ معاملہ بطور محبت کے ہوتا ہے، لیکن سعد بن معاذ کے حق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضغطہ کو بھی بڑا سمجھا، اس لئے تسبیح پڑھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسبیح کی برکت سے وہ رفع ہوا۔

معتزلہ کی تردید:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قبر میں ہر شخص کو ابتلاء پیش آسکتا ہے، حضرت سعد بن معاذ جیسے جلیل القدر صحابی بھی کسی نہ کسی درجہ میں اس میں مبتلا ہوئے، البتہ حضرات انبیاء علیہم السلام اس قسم کے ابتلا سے بھی محفوظ رہتے ہیں، دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایصالِ ثواب سے میت کو فائدہ پہنچتا ہے، جیسا کہ اہل السنۃ والجماعۃ کا یہی مسلک ہے، پس معتزلہ کی اس سے تردید ہوجاتی ہے۔

۱۲۹ / ۱۲: وَعَنِ ابنِ عُمَرَؓ قَالَ: "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا الَّذِيْ تَحَرَّكَ لَهُ الْعَرْشُ، وَفُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ السَّمَاءِ، وَشَهِدَهٗ سَبْعُوْنَ أَلْفاً مِنَ الْمَلائِكَةِ لَقَدْ ضُمَّ ضَمَّةً ثُمَّ فُرِّجَ عَنْهُ" (رواه النسائى)(۱)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ (سعد بن معاذؓ) وہ شخص ہیں جن کے لئے عرش ہلنے لگا اوران کے لئے آسمان کے دروازے کھولے گئے اوران کے جنازہ میں ستر ہزار فرشتے حاضر ہوئے، تحقیق کہ ان کی قبر تنگ کی گئی پھر کشادہ کی گئی۔ (نسائی)

تشریح حدیث

آسمانوں پر حضرت سعد بن معاذ کا استقبال:

یہ حدیث ایک طرح سے گذشتہ حدیث کا تکملہ ہے، اس میں حضرت سعد بن معاذ کی فضیلت اور آسمانوں پر ان کا استقبال بیان کیا گیا ہے جب ان کی وفات ہوئی تو عرش خوشی سے جھومنے لگا، آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے اوران کے جنازہ میں ستر ہزار فرشتے حاضر ہوئے۔

(۱) أخرجه النسائي، كتاب الجنائز، باب ضمة القبر وضغطته ۱ / ۲۸۹ برقم ۲۰۵۵.

''وفتحت له ابواب السماء'' آسمان کے دروازوں کا کھلنا ملائکہ کے اترنے اور روح کے اوپر چڑھنے کے لئے تھا۔(۱)

تحرک لہ العرش: اس کا یہ ہلنا خوشی کی وجہ سے تھا اس لئے کہ مومنین کاملین کی ارواح عرش کے نیچے ہوتی ہیں، عرش خوشی کی وجہ سے جھومنے لگا کہ ایک پاک روح ہماری طرف آ رہی ہے،(۲) اور بعض نے کہا کہ ان کے انتقال پر عرش کا ہلنا رنج وغم کی وجہ سے ہوا کہ نیک بندوں کے انتقال پر آسمان وزمین بھی روتے ہیں جبکہ کفار کی موت پر آسمان وزمین نہیں روتے، چنانچہ فرعون اور آل فرعون کے بارے میں قرآن میں ہے'' فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمَ السماء و الأرض (۳) کہ نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین''

۱۳۰ / ۱۳ : وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِيْ بَكْرٍؓ قَالَتْ: قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطِيْباً، فَذَكَرَ فِتْنَةَ القَبْرِ الَّتِيْ يُفْتَنُ فِيْهِ الْمَرْءُ فَلَمَّا ذَكَرَ ذٰلِكَ، ضَجَّ الْمُسْلِمُوْنَ ضَجَّةً. (رواه البخاری هکذا(٤) وَزَادَ النَّسَائِيُّ :)(٥) حَالَتْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ أَنْ أَفْهَمَ كَلامَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمَّا سَكَنَتْ ضَجَّتُهُمْ، قُلْتُ لِرَجُلٍ قَرِيْبٍ مِنِّيْ: أَيْ بَارَكَ اللّٰهُ فِيْكَ! مَاذَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ آخِرِ قَوْلِهِ؟ قَالَ: قَالَ قَدْ أُوْحِيَ إِلَيَّ أَنَّكُمْ تُفْتَنُوْنَ فِي الْقُبُوْرِ قَرِيْباً مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ''

ترجمہ: حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے مروی ہے کہ: ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور قبر کے فتنہ کا ذکر فرمایا جس میں انسانوں کو مبتلا کیا جاتا ہے، جب آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے اس کا ذکر کیا تو مسلمان چیخ چیخ کر رونے لگے (بخاری نے اس کو اسی طرح روایت فرمایا ہے) اور (نسائی نے مزید یہ بیان فرمایا ہے) کہ وہ چیخنا حائل ہوگیا میرے اور اس بات کے درمیان کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سمجھ سکوں، جب یہ چیخنا

(۱) اللمعات ۱ / ٤٤٠.

(۲) فتح الإله ۱ / ٥٢٤.

(۳) من سورة الدخان : ۲۹.

(٤) أخرجه البخاری فی الجنائز، باب ماجاء فی عذاب القبر ۱ / ۱۸۳ برقم ۱۳۵۷.

(٥) والنسائی فی الجنائز، باب التعوذ من عذاب القبر ۱ / ۲۹۰.

چلانا بند ہوگیا تو میں نے اپنے قریب بیٹھے ایک شخص سے پوچھا ''اللہ تمہیں برکت عطا فرمائے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا؟ اس شخص نے کہا کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ مجھ پر وحی آئی ہے کہ تم قبروں کے اندر فتنہ میں بتلا کئے جاتے ہو اور یہ فتنہ فتنۂ دجال کے قریب قریب ہوگا''

تشریح حدیث

احوال اسماء بنت ابوبکر:

آپ حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی ہیں، مکہ ہی میں سترہ لوگوں کے بعد اسلام لے آئی تھیں اور حضرت عائشہؓ سے دس سال بڑی تھیں، ان کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپی زاد بھائی حضرت زبیرؓ سے ہوا، انہی سے عبداللہ بن زبیر پیدا ہوئے، جب عبداللہ بن زبیر کو حجاج نے سولی دی اس وقت حضرت اسماء کی عمر سو (۱۰۰) سال تھی، اور ایک دانت بھی نہیں ٹوٹا تھا، اور ہوش وحواس بالکل درست تھے، ان کا لقب ''ذات النطاقین'' ہے اس لقب کی وجہ یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ ہجرت کے لئے تشریف لے جانے لگے اس وقت توشۂ سفر باندھنے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی تو انہوں نے اپنا کمر بند نکالا اور اس کے دو ٹکڑے کئے، ایک سے اپنے ازار کو باندھا اور دوسرے سے توشہ کو، اس وجہ سے ان کو ''ذات النطاقین'' کہا گیا، نطاق بمعنی ازار بند، نطاقین اسی کا تثنیہ ہے، ہجرت سے ستائیس سال قبل پیدا ہوئی تھیں اور ۷۳ھ میں حضرت عبداللہ بن زبیر کے سولی دیئے جانے کے ۲۰ روز بعد انتقال ہوا۔(۱)

فتنۂ قبر؛ فتنۂ دجال سے قریب قریب فتنہ:

حضرت اسماء کہتی ہیں کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور اس میں عذاب قبر کا تذکرہ فرمایا، اس کی وجہ سے سامعین کی چیخیں نکل گئیں، نسائی کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی چیخ کی وجہ سے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری بات نہ سن سکی، پھر جب سکون ہوا تو میں نے اپنے قریبی شخص سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اخیر میں کیا فرمایا؟ اس نے بتایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں فتنۂ قبر میں بتلا کیا جاتا ہے اور یہ فتنہ دجال کے فتنہ کے قریب قریب (خطرناک) ہے۔

(۱) الاصابہ ۷/ ۱۰–۱۱۔

فذكر فتنة القبر: یعنی قبر کے عذاب اور وہاں کے ابتلاء وآزمائش کا تذکرہ کیا۔
ضج المسلمون ضجة: ''ضج یضج'' باب ضرب سے ہے بمعنی چیخنا، چیخ وپکار کرنا۔
قريب مني: قریب سے رشتہ داری کے لحاظ سے بھی قریب مراد ہوسکتا ہے اور بیٹھنے کے لحاظ سے بھی۔ (۱)

۱۳۱/۱۴۳: وَعَنْ جَابِرٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِذَا أُدْخِلَ الْمَيِّتُ الْقَبْرَ مُثِّلَتْ لَهُ الشَّمْسُ عِنْدَ غُرُوْبِهَا، فَيَجْلِسُ يَمْسَحُ عَيْنَيْهِ، وَيَقُوْلُ: دَعُوْنِيْ أُصَلِّي. (رواوه ابن ماجه) (۲)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب مردہ (مومن) کو قبر کے اندر دفن کردیا جاتا ہے تو اس کے خیال میں غروب آفتاب کا وقت لایا جاتا ہے چنانچہ وہ مردہ آنکھوں کو ملتا ہوا اٹھ بیٹھتا ہے اور کہتا ہے مجھے چھوڑ دو تاکہ میں نماز پڑھ لوں'' (ابن ماجہ)

تشریح حدیث

قبر میں مؤمن کی بےفکری:

اس حدیث پاک میں مومن کی راحت قبر اور اس کی بےفکری کا بیان ہے کہ قبر میں جب فرشتے مؤمن کے پاس آئیں گے تو اس کو یہ محسوس ہوگا کہ عصر کا وقت ہے اور سورج غروب ہونے کے قریب ہے تو وہ بیٹھے گا اور آنکھیں ملتے ہوئے کہے گا کہ چھوڑو مجھے نماز پڑھنے دو، مطلب یہ ہے کہ جو شخص سچا پکا مسلمان ہے اور دنیا میں نماز کا پابند ہوتا ہے وہ قبر میں بےفکر ہوتا ہے اور فرشتوں سے نماز پڑھنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں نیند سے بیدار ہوا ہوں اور سورج غروب ہونے والا ہے۔

مثلت له الشمس: ''مثلت'' ''صُوِّرَت'' کے معنی میں ہے یعنی سورج ڈوبتے وقت کی تصویر اس کے سامنے لائی جاتی ہے۔

سوال: میت کو غروب شمس ہی کا خیال کیوں ہوتا ہے؟

(۱) فتح الإله ۱/۵۲۵.

(۲) أخرجه ابن ماجه في الزهد، باب ذكر القبر والبلى ۲/۳۱۶.

جواب: اس میں دنیا سے کوچ کرنے کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا کی زندگی بمنزلہ دن کے ہے، گویا اب اس کی زندگی کا دن غروب ہو رہا ہے، دنیا کی زندگی ختم کر کے اب یہ مسافر آخرت ہو چکا ہے، بعض نے کہا کہ اس میں صلوۃ عصر کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے: جیسا کہ آیت کریمہ ''حافظوا علی الصلوات والصلوۃ الوسطی'' میں صلوۃ عصر کی اہمیت بتائی گئی ہے۔(۱)

۱۳۲ / ۱۵: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ الْمَيِّتَ يَصِيْرُ إِلَى الْقَبْرِ فَيَجْلِسُ الرَّجُلُ فِيْ قَبْرِهٖ غَيْرَ فَزِعٍ وَلَامَشْغُوْبٍ، ثُمَّ يُقَالُ: فِيْمَ كُنْتَ؟ فَيَقُوْلُ: كُنْتُ فِي الْإِسْلَامِ، فَيُقَالُ: مَاهٰذَا الرَّجُلُ؟ فَيَقُوْلُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ جَاءَ نَابِالْبَيِّنَاتِ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ، فَصَدَّقْنَاهُ فَيُقَالُ لَهُ: هَلْ رَأَيْتَ اللّٰهَ؟ فَيَقُوْلُ: مَايَنْبَغِيْ لِأَحَدٍ أَنْ يَرَى اللّٰهَ، فَيُفَرَّجُ لَهٗ فُرْجَةً قِبَلَ النَّارِ، فَيَنْظُرُ إِلَيْهَا يَحْطِمُ بَعْضُهَا بَعْضاً، فَيُقَالُ لَهٗ: أُنْظُرْ إِلٰى مَاوَقَاكَ اللّٰهُ، ثُمَّ يُفرَّجُ لَهٗ فُرْجَةً قِبَلَ الْجَنَّةِ، فَيَنْظُرُ إِلٰى زَهْرَتِهَا وَمَافِيْهَا، فَيُقَالُ لَهٗ: هٰذَا مَقْعَدُكَ عَلَى الْيَقِيْنِ كُنْتَ، وَعَلَيْهِ مُتَّ، وَعَلَيْهِ تُبْعَثُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى، وَيَجْلِسُ الرَّجُلُ السَّوْءُ فِيْ قَبْرِهٖ فَزِعاً مَشْغُوْباً فَيُقَالُ لَهٗ: فِيْمَ كُنْتَ؟ فَيَقُوْلُ: سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ قَوْلاً فَقُلْتُهٗ، فَيُفَرَّجُ لَهٗ فُرْجَةً قِبَلَ الْجَنَّةِ، فَيَنْظُرُ إِلٰى زَهْرَتِهَا وَمَافِيْهَا، فَيُقَالُ لَهٗ: أُنْظُرْ إِلٰى مَاصَرَفَ اللّٰهُ عَنْكَ، ثُمَّ يُفرَّجُ لَهٗ فُرْجَةً إِلَى النَّارِ، فَيَنْظُرُ إِلَيْهَا يَحْطِمُ بَعْضُهَا بَعْضاً، فَيُقَالُ لَهٗ: هٰذَا مَقْعَدُكَ عَلَى الشَّكِّ كُنْتَ، وَعَلَيْهِ مُتَّ، وَعَلَيْهِ تُبْعَثُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى. (رواه ابن ماجه)(۲)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب مردہ قبر کے کے اندر پہنچتا ہے تو (نیک) بندہ قبر کے اندر اس طرح اٹھکر بیٹھ جاتا ہے کہ نہ تو وہ خوف زدہ ہوتا ہے اور نہ وہ گھبرایا ہوا، پھر اس سے پوچھا جاتا ہے کہ: تم کس دین پر تھے؟ وہ کہتا ہے کہ: میں دین اسلام پر تھا، پھر اس سے پوچھا جاتا ہے: یہ شخص (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ: محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ شانہ کے رسول ہیں، جو اللہ تعالی کے پاس سے ہمارے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لیکر آئے ہیں اور ہم نے ان کی تصدیق

(۱) المرقاۃ ۱ / ۳۳۲.

(۲) أخرجه ابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر القبر والبلى ۲ / ۳۱۵.

کی ہے، پھراس سے سوال کیا جاتا ہے کہ کیا تو نے اللہ تعالیٰ شانہ کو دیکھا ہے؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا، اس کے بعد اس کے لئے ایک روشن دان دوزخ کی طرف کھولا جاتا ہے اور وہ ادھر دیکھتا ہے اور آگ کے شعلوں کو اس طرح بھڑکتا ہوا پاتا ہے گویا اسکی لپٹیں ایک دوسرے کو کھارہی ہیں، اوراس سے کہا جاتا ہے اس چیز کو دیکھ جس سے اللہ تعالیٰ نے تجھے بچایا ہے، پھراس کے لئے ایک کھڑکی جنت کی طرف کھول دی جاتی ہے وہ جنت کی تر وتازگی اوران چیزوں (نعمتوں) کو دیکھتا ہے جو اس میں ہیں، پھراس سے کہا جاتا ہے یہ تیرا ٹھکانہ ہے کیونکہ دنیا میں تو یقین پر تھا اور یقین پر ہی مرا،اوراسی حالت میں تجھے قیامت کے دن اٹھایا جائے گا انشاء اللہ اور بدکار بندہ اپنی قبر میں خوف زدہ اور گھبرایا ہوا اٹھ کر بیٹھتا ہے، پس اس سے پوچھا جاتا ہے: تو کس دین میں تھا؟ وہ کہتا ہے: میں نہیں جانتا پھراس سے پوچھا جاتا ہے: یہ شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟ وہ کہتا ہے: میں لوگوں کو جو کچھ کہتے ہوئے سنتا تھا وہی میں کہتا تھا، اس کے بعد اس کے لئے بہشت کی طرف ایک روشن دان کھول دیا جاتا ہے جس سے وہ جنت کی تر وتازگی اوراس کی چیزوں کو دیکھتا ہے پھراس سے کہا جاتا ہے اس چیز کی طرف دیکھ جسے اللہ تعالیٰ نے تجھ سے پھیرلیا ہے پھراس کے لئے جہنم کی طرف ایک کھڑکی کھولی جاتی ہے، اوراس سے کہا جاتا ہے کہ یہ تیرا ٹھکانہ ہے تو دنیا میں شک (کفر) پر تھا اسی پر تیری موت آئی، اوراسی پر تو اٹھایا جائے گا انشاء اللہ۔ (ابن ماجہ)

تشریح حدیث

احوال قبر کا تفصیلی بیان:

اس حدیث پاک میں مومن کی راحت قبراور کافر کے عذاب قبر کا تفصیلی بیان ہے، مؤمن بندہ جب قبر میں پہنچتا ہے تو وہ بیٹھتا ہے اور بے خوف وخطر رہتا ہے، فرشتے اس سے پوچھتے ہیں تو کس مذہب پر تھا تو وہ کہتا ہے کہ میں اسلام پر تھا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو وہ اس کا بھی صحیح جواب دیتا ہے، پھراس سے پوچھا جاتا ہے کیا تو نے اللہ کو دیکھا ہے؟ تو وہ جواب دیتا ہے کہ اللہ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا پھراس کو جہنم دکھائی جاتی ہے، اوراس کے بعد جنت تاکہ مصیبت کے بعد نعمت کی قدر ہوجائے،

اور اگر کافر ہوتا ہے تو وہ ان سوالات سے لاعلمی ظاہر کرتا ہے اس کو اولاً جنت اور پھر جہنم دکھائی جاتی ہے تا کہ نعمت کو دیکھ لینے کے بعد مصیبت بھاری معلوم ہو، اور اس کے آلام میں اضافہ ہو جائے۔

ولا مشغوب: ''شغب'' سے ہے بمعنی فتنہ بھڑکانا، ہنگامہ کرنا، مطلب یہ ہے کہ وہ فتنہ وہنگامہ آرائی (عذاب وسختی) سے محفوظ و مامون ہوگا۔[1]

یحطم بعضها بعضا: ''یحطم'' باب ضرب سے ہے بمعنی ایک دوسرے کو دھکیلنا کھانا۔

باب الاعتصام بالکتاب و السنة

(کتاب وسنت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کا بیان)

ترجمۃ الباب کا مفہوم اور اس کی ضرورت:

''**الاعتصام**'' باب افتعال کا مصدر ہے، مجرد میں اس کا مصدر ''**عصم**'' ہے جو متعدی ہے معنی ہیں: روکنا، مزید فیہ میں پہنچ کر لازم ہوگیا اور معنی ہوگئے رکنا، لازم پکڑنا، کسی چیز سے چمٹ جانا، اور ایک معنی ہیں: کسی چیز پر اعتماد کرنا، اس لحاظ سے ترجمہ (عنوان) کے معنی ہونگے: کتاب وسنت پر اعتماد کرنے کا بیان اور پہلے لحاظ سے معنی ہونگے: کتاب وسنت کو لازم پکڑنے کا بیان، یعنی ان کی تعمیل واتباع کا بیان، یہاں دونوں معنی مراد ہیں اور دونوں ہی مطلوب ہیں۔

حضرات صحابہ کے زمانہ میں اس ترجمہ کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ وہ تو قرآن وسنت کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہی تھے، ان کے بعد امت مسلمہ میں فرق ضالہ پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنے عقائد کو دلائل عقلیہ سے ثابت کیا، ان کی تردید کے لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرات متکلمین کو پیدا فرمایا، متکلمین نے ان کے دلائل عقلیہ کا جواب دیا اور امت کو یہ باور کرایا کہ عقائد کے ثبوت کے لئے دلائل عقلیہ کی ضرورت نہیں، بلکہ عقائد کے باب میں کتاب وسنت پر اعتماد ہونا چاہئے، اس کے بعد حضرات مصنفین بھی اپنی کتابوں میں یہ ترجمہ قائم کرنے لگے، گویا یہ عنوان فرقِ ضالہ کی تردید کے لئے ہے۔

ربط از ماقبل:

(۱) ماقبل میں ایمان بالقدر اور عذاب قبر کا بیان تھا اور ان دونوں میں امت کے فرقِ ضالہ کا اختلاف

(۱) فتح الإله ۱/ ۵۲۸.

ہے،اس لئے اب یہ باب قائم کر کیپتایا کہتقدیر کا مسئلہ ہو یا عذاب قبر کا مدار کتاب اور سنت پر ہونا چاہئے۔

(۲)اس باب میں عقائد باطلہ کی تردید کی جائے گی جس سے ایمانی عقائد نکھر کر سامنے آئیں گے لہٰذا ایمان کے ساتھ اس کی مناسبت باعتبار ضد کے بھی ہوگی۔

سنت کا مفہوم اور اقسام:

بـالكتاب و السنة: کتاب سے مراد قرآن کریم اور سنت کے معنی طریقہ، مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اور آپ کے اقوال اور احوال ہیں۔ (۱)

سنت کی دو قسمیں ہیں: سنت ہدی سنت زائدہ۔

(۱) سنت ہدی: وہ کام جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور عبادت کیا ہو، جیسے جماعت کی نماز اوراذان واقامت، اس کا ترک مکروہ اور موجب اساءت ہے۔

(۲) سنت زائدہ: وہ کام جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور عادت کے کیا ہو، جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اور آپ کی سیرت لباس میں اور نشست و برخاست میں وغیرہ۔ (۲)

بدعت کے لغوی اور شرعی معنی ومصداق:

سنت کی ضد بدعت ہے، یہاں اکثر روایات میں بدعت کی تردید بھی کی گئی ہے،لہٰذا بدعت کا مفہوم اور اس کی تفصیل بھی معلوم ہونی چاہئے۔

بدعت کے لغوی معنی ہیں: نئی چیز، اسی سے قرآن کریم میں ہے: ''بَـدِيْـعُ السَّـمٰـوٰتِ وَالْأَرْض'' (آسمان وزمین کو بلا نمونہ پیدا کرنے والا) سابق نمونہ کے بغیر جو چیز وجود پذیر ہوگی وہ نئی ہی ہوگی۔

اور اصطلاح شرع میں اس کی متعدد تعریفات کی گئی ہیں:

(۱) علامہ جرجانی نے اپنی کتاب ''التعریفات'' میں بدعت کی یہ تعریف کی ہے ''البــدعة هــي الأمرُ المُحدَثُ الذى لم يكنْ عليه الصحابةُ و التابعونَ ولم يكن ممَّا اقْتضاه الدليلُ الشرعيُّ (۳)''

(۱) فتح الإله ۱/ ۵۳۰.

(۲) ردالمحتار ۱/ ۷۰.

(۳) كتاب التعريفات للجرجانى ص: ۳۷.

یعنی بدعت وہ نوایجاد کام ہے جس کو نہ صحابہؓ نے کیا ہو نہ تابعین نے اور نہ کسی شرعی دلیل نے اس کا تقاضہ کیا ہو۔

(۲) اور علامہ شاطبیؒ کے الفاظ یہ ہیں: ''البدعةُ طريقةٌ في الدين مخترعةٌ تُضاهي الشريعَة، يُقصَد بالسلوك عليها المبالغةُ في التعبد لله سبحانه، ويُقصَد مايُقصَد بالطريقةِ الشرعيةِ[۱]''

یعنی بدعت؛ دین میں گھڑے ہوئے اس طریقہ کا نام ہے جو شریعت کے مشابہ ہو اور اس پر چلنے کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مبالغہ ہو اور شرعی طریقہ سے جو مقصود ہوتا ہے وہی اس سے بھی مقصود ہو۔

بدعت کی ان تعریفات سے قدر مشترک کے طور پر واضح ہے کہ کسی امر کے بدعت ہونے کے لئے بطور خاص تین امور ضروری ہیں:

(۱) وہ امر نوایجاد کردہ ہو، نوایجاد کا مطلب یہ ہے کہ قرون اولی میں اس کی اصل موجود نہ ہو، نہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی طرح اس کا ثبوت ہو، نہ صحابۂ کرام سے اور نہ تابعینِ عظام سے، پس جس امر کا قرون اولی میں کسی بھی طرح ثبوت ہو وہ بدعت نہیں ہوگا۔

(۲) وہ نو ایجاد کردہ امر امورِ دین سے متعلق ہو، پس دنیوی امور میں اگر کوئی امر ایجاد کیا جائے گا تو وہ نہ ممنوع ہے اور نہ بدعت، اسی لئے آجکل جو ضرورت واستعمال کی نئی نئی چیزیں وجود پذیر ہورہی ہیں وہ سب جائز اور مباح ہیں، ان کا استعمال بدعت وممنوع نہیں۔

(۳) اس نوایجاد کردہ امر سے فی نفسہ تعبد وثواب مقصود ہو، لہذا دین میں اگر کوئی امر ایجاد کیا جائے تا کہ اس سے دین کی اعانت وحفاظت ہو اور دین کو تقویت ملے یا خود انسان میں دین کی رغبت پیدا ہو، فی نفسہ اس امر کو تعبد وثواب سمجھ کر نہ کیا جائے تو وہ بدعت نہیں کہلائے گا، چنانچہ دینی ادارے اور ان کا نصاب ونظام، خانقاہیں اور ان میں اذکار وریاضات کا اہتمام اور تبلیغی جماعت اور اس میں ماہانہ یا سالانہ مخصوص ایام میں گھر سے نکل کر دین سیکھنے وسکھانے کی پابندی، ان میں سے کسی پر بھی بدعت کا اطلاق نہیں ہوگا، اس لئے کہ ان میں سے کوئی بھی امر فی نفسہ تعبد وثواب سمجھ کر نہیں کیا جاتا، بلکہ کسی کا مقصود دین کی اعانت وحفاظت اور اس کی تقویت ہے اور کسی کا مقصود اپنے اندر دین کی رغبت وتشویق۔

ان امور کی روشنی میں غور کیا جائے تو عید میلاد النبی، تیجہ، چہلم اور برسی، متبرک راتوں میں مخصوص

(۱) الاعتصام للشاطبي ۱/۴۳، ت أبو عبيدة مشهور بن حسن آل سلمان، ط مكتبة التوحيد بيروت.

طریقہ سے نمازوں کی ادائیگی، کھانے پر فاتحہ خوانی اوراہل بدعت کے یہاں درود وسلام کے مروجہ طریقے یہ سب بدعت ہوں گے، کیونکہ مذکورہ اموران میں متحقق ہیں، چنانچہ نہ قرون اولی میں انکا کوئی ثبوت ہے، اوران کو دین کا حصہ بھی سمجھا جاتا ہے نیز بذات خود عبادت وثواب سمجھ کرانجام دیاجاتا ہے۔

بدعت کے مفاسد:

بدعت بہت خطرناک چیز ہے اوراس میں بڑے مفاسد ہیں، علماء نے فرمایا ہے کہ بدعتی کوعموماًتوبہ کی توفیق نہیں ہوتی کیونکہ وہ اس کو دین سمجھ کر کرتا ہے، نیز فرمایا کہ بدعتی سنت سے محروم رہتا ہے اور بدعتی ایک اعتبار سے مدعی نبوت ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ ایک کام کو، کارثواب بتاتا ہے، حالانکہ یہ نبی کا کام ہے کہ وہ امورِدین کی نشان دہی کرے۔ (۱)

بدعت کے اقسام:

بدعت کی دوقسمیں ہیں: بدعت حقیقیہ اور بدعت وصفیہ۔

بدعتِ حقیقیہ وہ ہے: جس کی اصل قرآن وسنت میں موجود نہ ہو اوراس کودین سمجھ کر کیاجائے مثلارہبانیت اختیارکرنا، عیدمیلادالنبی منانا وغیرہ۔

اور بدعتِ وصفیہ وہ ہے جس کی اصل قرآن وسنت میں موجود ہو، لیکن اس کی کوئی خاص ہیئت وکیفیت، مقدار، طریقہ اور وقت ثابت نہ ہو، لوگوں نے اپنی طرف سے ان امورکو گھڑلیاہو، جیسے نماز جنازہ کے بعداجتماعی دعاءکرنا، تیجہ وچالیسواں کرنا۔

بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ کی بحث:

بہت سے اہل علم جن میں ہمارے اکابر بھی شامل ہیں فرماتے ہیں کہ بدعت کی دوقسمیں اورملتی ہیں:

---

(۱) حضرت امام مالکؒ نے فرمایا: ''من ابتدع في الإسلام بدعة يراها حسنة، زعم أن محمدا صلى الله عليه وسلم خان الرسالة'' کہ: جس نے کسی بدعت کا ارتکاب کیا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) خائن تصورکیا، یعنی اس نے یہ خیال کیا کہ خیرکی بعض ایسی باتیں بھی ہیں جن کو (نعوذ باللہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھپایا تھا وہ ہم پر منکشف ہوئی ہے، حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کودین کامل عطا کیا گیا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اليوم أكملت لكم دينكم الآية'' پس جوکام اس وقت دین نہیں تھا وہ آج بھی دین نہیں ہوسکتا۔ (الاعتصام للشاطبی ۱/۶۴-۶۵)

(۱) بدعتِ حسنہ (۲) بدعتِ سیئہ۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ نے فرمایا کہ: ان دونوں قسموں میں امتیاز کے لئے اصول یہ ہے کہ دین کے نام پر جو نیا کام کیا جارہا ہے تو دیکھا جائے گا کہ اس کام کا باعث وداعی قرون مشہود لہا بالخیر میں موجود تھا یا نہیں؟ اگر موجود تھا اس کے باوجود اس زمانے میں وہ امر اختیار نہیں کیا گیا تو اس کو بدعت سیئہ کہا جائے گا اور اگر اس کا سبب وداعی اس زمانہ میں نہیں تھا بلکہ بعد میں متحقق ہوا تو وہ بدعت حسنہ ہے، بدعت سیئہ کی مثال تیجہ، چالیسواں، دسواں وغیرہ، اس کا مقصد اور سبب ایصال ثواب ہے، یہ سبب اس زمانے میں بھی موجود تھا کہ اس زمانے کی اموات بھی ایصال ثواب کی حاجتمند تھیں، مگر اس زمانہ کے لوگوں نے اس کو اختیار نہیں کیا، اس لئے یہ بدعت سیئہ ہے، بدعت حسنہ کی مثال موجودہ مدارس وخانقاہوں کا قیام ہے اس کا داعی وسبب علوم اسلامیہ کی حفاظت ہے، اس زمانے میں خیر کا غلبہ ہونے کی وجہ سے یہ ضرورت مسجد کی تعلیم سے مکمل ہوجاتی تھی، اب شر کا غلبہ ہے لوگ عام طور پر دنیا کے علوم وفنون پر توجہ دیتے ہیں، دینی تعلیم کی طرف توجہ بہت کم ہے، علم دین کی تحصیل کے لئے موانع بھی بہت ہیں، ان حالات نے اس بات کا تقاضہ کیا کہ امت میں علم وعمل کے بقاء وتحفظ کے لئے باقاعدہ ادارے (مدارس وخانقاہ) قائم کئے جائیں تاکہ لوگ اس طرف متوجہ ہوں اور یکسوئی کے ساتھ علم وعمل میں پختگی پیدا کرنے کا ان کو موقع ملے۔ (۱)

اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت گنگوہیؒ نے بدعت کی اس تقسیم کو تسلیم نہیں کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ بدعت ہمیشہ سیئہ ہی ہوتی ہے، حسنہ نہیں ہوتی کما ورد فی الحدیث ''و کل بدعة ضلالة (۲)'' ہر بدعت گمراہی ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ جن امور کے پائے جانے کی وجہ سے کوئی چیز بدعت ہوتی ہے اگر وہ کسی امر میں موجود ہوں تو وہ بالاتفاق لازمی طور پر سیئہ ہوگی، اور جس میں وہ امور متحقق نہ ہوں اور قرون اولیٰ میں اس کو اختیار نہ کرنے کے باوجود اب ضرورۃً اس کو اختیار کیا جائے تو از روئے شرع وہ بدعت نہیں؛ مگر لغۃً اس کو

(۱) امدادالفتاوی ۵ / ۲۹۱، جواهر الفقه ۱ / ۴۵۸ – ۴۵۹.

(۲) مسلم شريف ۱ / ۳۸۴، فتاوی رشيديه ص ۱۰۰، کتاب العلم، ارشادات مجدالف ثانیؒ، انتخاب مفتی محمود اشرف عثمانی ص ۱۱۳.

بدعت کہا جاتا ہے کہ ماضی میں اس کا وجود نہیں تھا اور پھر حسن نیت ومقصد کے پیش نظر اس پر حسنہ کا اطلاق کردیا جاتا ہے، پس بدعت کے حسنہ وسیئہ ہونے کا یہ اختلاف لفظی ہے، حقیقی نہیں۔(۱)

الفصل الاول

۱۳۳ / ۱: عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَالَيْسَ مِنْهُ فَهُوَرَدٌّ'' (متفق علیہ)(۲)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی نئی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔(بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

بدعت مردود ہے:

اس حدیث میں بدعت کی تردید ہے کہ جو شخص ہمارے اس دین میں ایسی چیز ایجاد کرے جو اس میں نہیں ہے وہ رد ہے، مطلب یہ ہے کہ دین اسلام کامل اور مکمل ہو چکا ہے اب اگر کوئی شخص اسلام میں کسی ایسی چیز کو ایجاد کرے جس کا ثبوت کتاب وسنت سے نہ ہو وہ شئ مردود وباطل ہے اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا امام نوویؒ نے اس حدیث کے متعلق فرمایا کہ: یہ روایت جوامع الکلم میں سے ہے، اور یہ اسلام کے قاعدوں میں سے عظیم قاعدہ ہے اور بدعات کی تردید کے لئے صریح نص ہے۔(۳)

ھــذا: اس سے دین اسلام کی طرف اشارہ ہے،''ھــذا'' سے محسوس ومبصر چیز کی طرف اشارہ ہوتا ہے دین اسلام بھی اپنے دلائل وبراہین کے اعتبار سے شئ مبصر ومحسوس کے درجہ میں ہے۔(۴)

(۱) امدادالفتاوی ۵ / ۲۹۱.

(۲) أخرجه البخاري في "كتاب الصلح" باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود ۱ / ۳۷۱ برقم ۲۶۱۹.
ومسلم في الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة ورد محدثات الأمور ۲ / ۷۷.

(۳) نووی ۲ / ۷۷.

(۴) شرح المشكاة للطيبي ۱ / ۳۲۳، وفتح الإلٰه ۱ / ۵۳۱.

فهـــورد: اس ضمیر کے مرجع میں کئی احتمال ہیں: (۱) اس کا مرجع احداث ہو، یعنی بدعت کا ایجاد کرنا مردود ہوگا اور اس احداث کی اجازت نہیں۔

(۲) اس کا مرجع **مـالیـس منه** ہے یعنی اس بدعت اور امرِ مُحدَث کو دین میں داخل نہیں کیا جائے گا، دلائل کے ذریعہ اس کا بدعت ہونا ثابت کر کے اس کو رد کردیا جائے گا، اور یہ فریضہ علماءِ اسلام انجام دیں گے۔

(۳) ہو ضمیر کا مرجع مَـــــنْ ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ بدعتی شخص مردود ہے، یعنی اسے اللہ کا قرب حاصل نہیں ہوگا۔(۱)

۱۳٤/۲: ''وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَمَّابعد، فَإِنّ خَيْرَالْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ، وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ، وَشَرُّالْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا، وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلالَةٌ'' (رواه مسلم)(۲)

ترجمه: حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ: حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک مرتبہ خطبہ میں) ارشاد فرمایا: بہرحال حمد وصلوۃ کے بعد، بیشک سب سے بہتر کلام اللہ کی کتاب ہے، اور سب سے بہتر طریقہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اور سب سے بدترین چیز وہ ہے جس کو (دین میں اپنے طور پر) ایجاد کیا گیا ہو اور ہر بدعت گمراہی ہے۔(مسلم)

تشریح حدیث

کتاب وسنت کی فضیلت اور بدعت کی شناعت:

اس حدیث میں تین جملے ہیں: پہلے جملہ میں کتاب اللہ کی عظمت کا بیان ہے دوسرے میں سنت کی اہمیت اور تیسرے جملہ میں بدعت کی تردید مذکور ہے، اس لحاظ سے حدیث کے تینوں جملے باب کے مناسب ہیں کیونکہ ترجمۃ الباب ان تین اجزاء پر مشتمل ہے، کتاب، سنت اور رد بدعت۔

أمابعد: فصل خطاب ہے اس کا استعمال سب سے پہلے داؤد علیہ السلام نے کیا تھا، مزید تفصیل خطبۂ کتاب میں آچکی ہے۔

(۱) طیبی طاب الله ثراه ۱/۳۲۳–۳۲٤، وفتح الإله ۱/۵۳۱.

(۲) أخرجه مسلم في الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة ۱/۳۸٤.

سوال: یہ کلمہ دو کلاموں کے درمیان فصل کرنے کے لئے لایا جاتا ہے؛ حالانکہ یہاں اس سے پہلے کوئی کلام نہیں ہے بلکہ یہاں سے کلام کی ابتدا کی گئی ہے اور ابتداء کلام اس کا محل نہیں ہے؟

جواب: یہاں روایت مختصر ہے اصل یہ ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ وعظ ونصیحت فرمارہے تھے تو خطبہ میں حمد وصلاۃ کے بعد" امابعد" کہا پس یہ کلمہ اثناء کلام میں واقع ہوا، نیز چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث دوران خطبہ ارشاد فرمائی تھی اس لئے آج بھی اس کو خطبہ میں پڑھا جاتا ہے۔(۱)

فإنخير الحديث الخ :**الحديث**؛معنی میں ہے: مايتحدث بہ اور مايتكلم به کے اس لئے اس کا مرادی ترجمہ ہے: "کلام" اور مطلب یہ ہے کہ اللہ کا کلام تمام کلاموں میں افضل ترین کلام ہے، الفاظ کی فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے بھی افضل ہے اور معنی کی جامعیت کے لحاظ سے بھی، کیونکہ قرآن کریم میں ایسے اصولِ کلیہ آگئے ہیں جن سے دنیاوآخرت کی تمام ضرورت کی چیزوں میں رہنمائی کی گئی ہے۔(۲)

و خير الهدى : اس میں الف لام استغراقی ہے، کیونکہ مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین اور آپ کے طریقہ کی فوقیت کو ثابت کرنا ہے تمام ادیان اور تمام سیرتوں پر، اور یہ معنی اسی وقت حاصل ہونگے جب الف لام کو استغراق کا قرار دیں۔(۳)

و شــر الأمور : سب سے بدترین امر دین میں نئی چیزیں ایجاد کرنا ہے، اور دین میں نوایجاد کردہ چیز گمراہی ہے، اور اس کا موجد وعامل ہدایت سے محروم ہے۔

۱۳۵ / ۳:وَعَـنِ ابْـنِ عَبَّـاسٍ ؓ قَـالَ: "قَـالَ رَسُـوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَبْـغَـضُ الـنَّـاسِ إِلَـى الـلّٰـهِ ثَلاثَةٌ، مُلْحِدٌ فِي الْحَرَمِ، وَمُبْتَغٍ فِي الإِسْلامِ سُنَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ، وَمُطَّلِبُ دَمِ امْرَئٍ مُسلمٍ بِغَيْرِ حَقٍّ لِيُهْرِيْقَ دَمَهُ" (رواه البخاری)(۴)

ترجمه: حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

(۱)المرقاة ۱ / ۳۳۷.

(۲)المرقاة ۱ / ۳۳۷.

(۳)المرقاة ۱ / ۳۳۷.

(٤)أخرجه البخاري، كتاب الديات، باب من طلب دم امرء بغير حق ۲ / ۱۰۱٦ برقم ٦٦١٧.

فرمایا کہ: اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض تین لوگ ہیں (۱)حرم میں ناجائز کام کرنے والا (۲) اسلام میں جاہلیت کے طریقہ کو تلاش کرنے والا (۳) کسی مسلمان کے ناحق خون کا طلبگار تاکہ اس کو بہائے۔ (بخاری)

تشریح حدیث

مبغوض ترین تین لوگ:

اس حدیث پاک میں تین قسم کے لوگوں کو عنداللہ سب سے مبغوض بتایا گیا ہے:

(۱) **ملحدفی الحرم**: الحاد کے معنی ہیں: درستگی سے ہٹ جانا اور باطل کی طرف مائل ہونا، یعنی حرم میں ایسا کام کرنا جو وہاں حرام ہے مثلاً آفاقی شخص کا بغیر احرام کے حرم میں داخل ہونا، وہاں شکار کرنا، وہاں کی گھاس اور درخت کو کاٹنا، یہ تمام امور ناجائز ہیں اور یہ سب الحاد فی الحرم ہے۔ (۱)

(۲) **مبتغ فی الإسلام**: مسلمان ہونے کے باوجود جاہلیت کے طور طریقوں کو رواج دینے والا، زمانۂ جاہلیت میں بہت ساری رسوم جاری تھیں مثلاً نوحہ کرنا، بدفالی لینا، مصیبت میں حد سے تجاوز کرنا اور خاندان کی ناحق حمایت کرنا وغیرہ، یہ جاہلیت کے رسوم ورواج تھے، اسلام کی برکت سے یہ رسوم ختم ہوئیں، اب اگر کوئی شخص ان رسوم کو زندہ کرے اور مسلمانوں میں ان کو رائج کرے وہ شخص اللہ تعالی کو نہایت مبغوض ہے اسی طرح اس میں وہ بھی داخل ہے جو غیروں کی تہذیب اور طرز زندگی کو اپنائے اور ان کی تقلید کرے۔ (۲) حدیث کا یہی جملہ باب کے مناسب ہے۔

(۳) **مطلب دم امریٔ**: یعنی کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنا، "مطلب" اصل میں مُتْطَلِبٌ تھا، تا کا طا میں ادغام کیا گیا ہے، صرف کا قاعدہ ہے کہ باب افتعال میں ف کلمہ کی جگہ ط ہو تو تاء افتعال کو ط سے بدل کر ط کا ط میں ادغام کر دیا جاتا ہے۔ (۳)

ایک سوال وجواب:

سوال: کیا یہ تینوں شخص کافر سے بھی بدتر ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے، پھر ان کو ابغض الناس کیوں

(۱) شرح المشكاة للطيبي ۱/۳۲۷.

(۲) فتح الإله ۱/۵۳٦.

(۳) المرقاة ۱/۳۳۸–۳۳۹.

کہا گیا؟

جواب یہ ہے کہ: الناس سے گناہ گار مسلمان مراد ہیں، جمیع الناس مراد نہیں ہیں، تقدیر عبارت ہے:
إن أبغض عصاة المسلمين.(۱)

(۳)''یھریق''اصل میں یریق تھا، ماضی اس کا اراق ہے، ہمزہ کو ہاء سے بدل دیا گیا۔(۲)

١٣٦ / ٤: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "كُلُّ أُمَّتِيْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى" قِيْلَ: وَمَنْ أَبٰى؟ قَالَ: "مَنْ أَطَاعَنِيْ دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ أَبٰى" (رواہ البخاری)(۳)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری تمام امت جنت میں داخل ہوگی مگر وہ شخص جس نے انکار کیا، پوچھا گیا: وہ شخص کون ہے جس نے انکار کیا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے میری فرمانبرداری کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا (وہ جنت میں داخل نہ ہوگا) (بخاری)

تشریح حدیث

نجات کے لئے اطاعتِ نبوی ضروری:

اس حدیث میں اعتصام بالسنۃ کا بیان ہے کہ نجات کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا اعتصام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ضروری ہے، مضمون یہ ہے کہ میری تمام امت جنت میں داخل ہوگی سوائے اس کے جس نے انکار کیا، عرض کیا گیا کہ ''مــن أبــى'' سے کون مراد ہیں؟ فرمایا کہ: جو میری نافرمانی کرے، وہ من ابی میں داخل ہے۔

---

(۱) المرقاة ١ / ٣٣٨.

(۲) (يهـريـق) بفتح الهاء ويسكن......من هراق الماء اذاصبه، والأصل أراق قلبت الهمزة هاء، وفيه لغة أخرى وهي إهراق بفتح الهمزة وسكون الهاء. (المرقاة ١ / ٣٣٩)

(۳) اخرجه البخاري في الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله صلى الله عليه وسلم، ٢ / ١٠٨١، رقم الحديث: (٦٩٨٨)

کـل أمتی یدخلون......الخ : امت کی دوقسمیں ہیں: امت دعوت اورامت اجابت، یہاں امت کے مصداق میں دونوں احتمال ہیں، اگرامت دعوت مراد ہوتو ''الامـن أبـی ''میں ''اباء'' سے کفرمراد ہوگا اور دخول جنت میں عموم ہوگا خواہ دخول اولی ہو یا ثانوی، اورامت اجابت بھی مراد ہوسکتی ہے اس وقت ''إلا من أبی '' میں ''اباء'' سے فسق مراد ہوگا اوراس وقت دخول جنت سے دخول اولی مراد ہوگا۔ (۱)

۱۳۷ / ۵: وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ : جَاءَتْ مَلائِكَةٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ نَائِمٌ، فَقَالُوْا: إِنَّ لِصَاحِبِكُمْ هٰذَا مَثَلاً فَاضْرِبُوْا لَهُ مَثَلاً، قَالَ بَعْضُهُمْ: إِنَّهُ نَائِمٌ، وَقَالَ بَعْضُهُمْ: إِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبَ يَقْظَانُ فَقَالُوْا: مَثَلُهُ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنَى دَاراً وَجَعَلَ فِيْهَا مَأْدُبَةً وَبَعَثَ دَاعِيًا، فَمَنْ أَجَابَ الدَّاعِيَ دَخَلَ الدَّارَ، وَأَكَلَ مَعَهُ مِنَ الْمَأْدُبَةِ، وَمَنْ لَمْ يُجِبِ الدَّاعِيَ لَمْ يَدْخُلِ الدَّارَ وَلَمْ يَأْكُلْ مِنَ الْمَأْدُبَةِ فَقَالُوْا: أَوِّلُوْهَا لَهُ يَفْقَهْهَا، قَالَ بَعْضُهُمْ : إِنَّهُ نَائِمٌ، وَقَالَ بَعْضُهُمْ: إِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبَ يَقْظَانُ فَقَالُوْا: اَلدَّارُ الْجَنَّةُ، وَالدَّاعِيْ مُحَمَّدٌ فَمَنْ أَطَاعَ مُحَمَّداً فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ، وَمَنْ عَصَى مُحَمَّداً فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ، وَمُحَمَّدٌ فَرْقٌ بَيْنَ النَّاسِ.(رواه البخاری)(۲)

ترجمہ : حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ فرشتے آئے، اس وقت آپ علیہ الصلوۃ والسلام سوئے ہوئے تھے فرشتوں نے آپس میں کہا کہ تمہارے اس ساتھی (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک مثال ہے اس کو ان کے سامنے بیان کرو، دوسرے فرشتہ نے کہا وہ توسوئے ہوئے ہیں (لہٰذا بیان کرنے سے کیافائدہ؟) ان میں سے بعض نے کہا بیشک ان کی آنکھیں سورہی ہیں لیکن دل بیدار ہے پھرانھوں نے کہا ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے گھر بنایا اورلوگوں کی ضیافت کے لئے دسترخوان لگایااور لوگوں کو بلانے کے لئے ایک آدمی بھیجا پس جس نے بلانے والے کی بات کو مان لیا وہ گھر میں داخل ہوگا دسترخوان (کی نعمتوں) سے کھائے گا اورجس نے بلانے والے کی بات کونہیں مانا وہ نہ گھر میں داخل ہوگا، اورنہ دسترخوان (کی نعمتوں) سے کھائے گا، یہ سن کرفرشتوں نے آپس میں کہا اس مثال

(۱)طیبی ۱/ ۳۲۷–۳۲۸.

(۲)أخرجه البخاري، کتاب الاعتصام، باب الاقتداء بسنن رسول الله صلى الله عليه وسلم ۲/ ۱۰۸۱ برقم۶۹۸۸.

کی وضاحت کریں تاکہ یہ سمجھ لیں، بعض فرشتوں نے کہا کہ بیان کرنے سے کیا فائدہ؟ وہ تو سوئے ہوئے ہیں، دوسروں نے کہا بیشک آنکھیں سوئی ہوئی ہیں لیکن دل تو بیدار ہے، اور پھرانھوں نے وضاحت کی کہ'' گھر سے مراد جنت ہے اور بلانیوالے سے مراد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، پس جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کی اس نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی، اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے درمیان فرق کرنے والے ہیں'' (بخاری)

تشریح حدیث

اطاعت نبوی کے ضروری ہونے کی ایک مثال سے تفہیم:

اس حدیث پاک میں اعتصام بالسنہ کا بیان ہے اور سنت کی اطاعت کے ضروری ہونے کو ایک مثال سے سمجھایا گیا ہے۔

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سوئے ہوئے تھے اس وقت کچھ ملائکہ آپ کے پاس حاضر ہوئے، ترمذی کی روایت میں ہے کہ یہ حضرت جبرئیل ومیکائیل علیہم السلام تھے [1] اس لحاظ سے تثنیہ کا صیغہ ہونا چاہئے تھا مگر ان دونوں کی تعظیم کے لئے جمع کا لفظ لایا گیا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے ہمراہ دیگر فرشتے بھی ہوں۔

ان فرشتوں میں باہم گفتگو شروع ہوئی کہ تمہارے ان صاحب کی ایک مثال ہے اس کو بیان کرو، بعض روایات میں ہے کہ قائل جبرئیل علیہ السلام تھے، اس پر میکائیل علیہ السلام نے فرمایا کہ: یہ تو سوئے ہوئے ہیں پھر مثال کیوں کر سمجھیں گے، جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ''ان العین نائمة و القلب يقظان'' ان کی آنکھ سوئی ہوئی ہے دل بیدار ہے، اس پر میکائیلؑ نے یہ مثال بیان کی کہ: ایک سخی آدمی نے ایک اچھا مکان بنایا، اس میں دسترخوان لگایا اور اس پر قسم قسم کے کھانے چنے گئے، پھر اس سخی نے ایک شخص کو لوگوں کو بلانے کے لئے بھیجا کہ اس مکان کی طرف آویں اور یہاں کی نعمتیں حاصل کریں، اس داعی نے لوگوں کو

(۱) ترمذی شریف ۲/۱۱۳، (۲۸۶۰) لفظه: إني رأيت في المنام كأن جبريل عند رأسي، وميكائيل عند رجليَّ الحديث.

دسترخوان پرآنے کی دعوت دی، دعوت پہنچنے کے بعد لوگ دوقسم کے ہوگئے، بعض نے اس داعی کی بات کا اعتبار کیا، وہ حاضر ہوئے اور مکان میں داخل ہوکر کھانوں سے محظوظ ہوئے، اور بعض لوگوں نے اس داعی کی بات کا اعتبار نہیں کیا اور یوں کہنے لگے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی شخص بلاکسی غرض کے لوگوں کی منفعت کے لئے مکان بناوے اور اپنی بلاکسی غرض کے لوگوں پرنعمتوں کا فیضان کرے یہ بات سچی معلوم نہیں ہوتی، چنانچہ انہوں نے داعی کی تکذیب کی اور اس کے بلانے سے حاضر نہیں ہوئے، اسی لئے یہ لوگ مکان کے داخلہ سے اور وہاں کی نعمتوں سے محروم رہے۔

پھر ملائکہ نے باہم کہا کہ اس مثال کی توضیح کرو، تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو سمجھ لیں اس فرشتہ نے کہا کہ یہ سوئے ہوئے ہیں، دوسرے فرشتہ نے پھروہی کہا کہ انکا قلب بیدار ہے، اس پر پہلے فرشتہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''دار'' سے مراد جنت، اور صاحب دار، یعنی رجل کریم سے مراد اللہ تعالیٰ شانہ اور کھانوں سے مراد نعمائے جنت ہیں اور داعی سے مراد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لہذا جن لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوسچا جانا اور آپ کی اطاعت کی، وہ جنت میں داخل ہوں گے، اور وہاں کی نعمتوں سے منتفع ہوں گے، اور جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی اور آپ کی اطاعت سے منہ موڑا وہ جنت سے اور اس کی نعمتوں سے محروم رہیں گے ترمذی کی ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ ان نافرمانوں کو سزا بھی دی جائے گی،(۱) اور فرشتوں نے یہ بھی کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حق وباطل کے درمیان فرق کرنے والے ہیں۔

اس مثال سے واضح ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع وپیروی ضروری ہے اور وہی شخص کامیاب ہوگا جو آپ کی اتباع وپیروی کرے گا، ورنہ ناکام ونامراد ہوگا۔

انبیاء علیہم السلام کی ایک خصوصیت:

إن العين نائمة و القلب يقظان : نوم العین ویقظۃ القلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اور دیگر انبیاء کی بڑی فضیلت اور خصوصیت ہے، ان کی آنکھیں سوجاتی تھیں جس کی وجہ سے چیزیں نظر نہیں آتی تھیں، مگر قلب بیدار اور مستعد رہتا تھا اور سونے کی حالت میں بھی قلب کا ادراک جاری رہتا تھا، اسی لئے حضرات انبیاء کا خواب وحی ہے اور ان کی نوم ناقض وضو نہیں ہوتی۔

(۱) ترمذي شريف ۲/۱۱۳، لفظ: ومن لم يجبه عاقبه أوعذبه.

سوال:فرشتہ نے ''ان العين نائمة'' کا مضمون پہلے بتادیا تھا تو اس کے اعادہ کی کیا ضرورت رہی؟
جواب:حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس منقبت عظیمہ کو سامعین کے قلوب میں اچھی طرح متحضر کرنے کے لئے مضمون کا اعادہ کیا گیا ہے۔(۱)

۱۳۲ / ٦: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ: جَاءَ ثَلاثَةُ رَهْطٍ إِلٰى أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمَّا أُخبِرُوْا بِهَا كَأَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا. فَقَالُوْا: أَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَقَدْ غَفَرَ اللّٰهُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَاتَأَخَّرَ؟!

فَقَالَ أَحَدُهُمْ: أَمَّا أَنَا فَأُصَلِّيْ اللَّيْلَ أَبَداً، وَقَالَ الآخَرُ: أَنَا أَصُوْمُ النَّهَارَ أَبَداً وَلاأُفْطِرُ وَقَالَ الآخَرُ: أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلا أَتَزَوَّجُ أَبَداً، فَجَاءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِمْ فَقَالَ: ''أَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا؟ أَمَا وَاللّٰهِ إِنِّيْ لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ، وَأَتْقَاكُمْ لَهُ، لٰكِنِّيْ أَصُوْمُ وَأُفْطِرُ، وَأُصَلِّيْ وَأَرْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ''(متفق عليه)(۲)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ: تین شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوئے تا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا حال دریافت کریں، جب ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا حال بتایا گیا تو انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کو گویا کم سمجھا اور آپس میں کہا: ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں ہماری کیا حیثیت ہے؟ اللہ تعالی نے ان کے تو اگلے پچھلے سب گناہ معاف کردیئے ہیں، ان میں سے ایک نے کہا: اب میں ہمیشہ ساری رات نماز پڑھا کروں گا، دوسرے نے کہا: میں دن میں ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا اور کبھی افطار نہ کروں گا، تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی نکاح نہ کرونگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا تم لوگوں نے

(۱)المرقاة ۱ / ۳٤۱.

(۲)أخرجه البخاري في النكاح، باب الترغيب في النكاح لقوله تعالى فانكحوا ماطاب لكم من النساء ۲ / ۷۵۷ برقم ٤۸۷۲ ومسلم، كتاب النكاح، باب استحباب النكاح لمن تاقت نفسه إليه ووجد مؤنة ۲ / ٤٤۱ برقم ۱٤۰۱.

ایسا ایسا کہاہے ''خبردار! میں تم میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں اور تم میں سب سے زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں، لیکن (اس کے باوجود) میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، میں (رات میں) نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں (یہی میرا طریقہ ہے) لہٰذا جو شخص میرے طریقہ سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے۔(بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

اتباعِ سنت اصل ہے:

اس حدیث پاک میں بھی اعتصام بالسنۃ کا بیان ہے کہ وہی عبادت دین ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر ہو جو عبادت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر نہ ہو وہ دین نہیں ہے۔

مضمونِ حدیث یہ ہے کہ: بعض صحابہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رات کے معمولات معلوم کرنے کا شوق ہوا، یہ چیز ازواج مطہرات سے معلوم ہوسکتی تھی، چنانچہ صحابہؓ میں سے تین حضرات ان کے پاس آئے حضرت علی، عثمان بن مظعون اور عبداللہ بن رواحہ، اور بعض روایات میں بجائے عبداللہ بن رواحہ کے مقداد بن اسود کا نام ہے جو حضرت علی کے دوست تھے۔(۱)

بہرحال ازواج مطہرات نے رات کی عبادت بتائی، ان لوگوں کا گمان تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پوری رات عبادت کرتے ہوں گے لہٰذا انہوں نے اس عبادت کو کم سمجھا، لیکن بدگمان نہیں ہوئے بلکہ آپس میں کہا ''**أین نحن من النبی صلی اللہ علیہ وسلم**''

اس جملہ کے دو مطلب ہوسکتے ہیں: (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو معصوم ہیں آپ بخشے بخشائے ہیں، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ عبادت کی ضرورت نہیں، لیکن ہمیں عبادت زیادہ کرنی چاہئے۔

(۲) ہماری عبادت کی کیا حیثیت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے مقابلے میں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ شانہ کے سب سے زیادہ مقرب ہیں، ہماری زندگی بھر کی عبادت آپ کی دو رکعت

(۱) المرقاۃ ۱/ ۳۴۲.

کے برابر بھی نہیں ہوسکتی، اس لئے ہمیں زیادہ عبادت کرنی چاہئے۔(۱)

چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں پوری رات عبادت کیا کروں گا، دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزے رکھوں گا، تیسرے نے کہا کہ: میں عورتوں سے علیحدہ رہونگا کبھی نکاح نہیں کروں گا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے ازواج مطہرات نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع دی، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ معلوم ہوگیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان تینوں کے پاس تشریف لے گئے اوران سے فرمایا کہ: تم نے ایسی ایسی بات کہی ہے، خبردار! میں تم میں اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں اورسب سے زیادہ تقوے والا ہوں، اس کے باوجود میں روزہ بھی رکھتا ہوں اورافطار بھی کرتا ہوں، میں رات میں نماز بھی پڑھتا ہوں اورسوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، پس جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ ہم میں سے نہیں، یعنی ہمارے طریقہ پر نہیں۔

رھط: بمعنیٰ جماعت اس کا اطلاق تین سے دس تک کے عدد پر ہوتا ہے، اسی کے قریب لفظ نفر ہے اس کا اطلاق تین سے نو تک کے عدد پر ہوتا ہے جیسا کہ مرقاۃ میں ہے، یہاں ثلثه رھط سے تین اشخاص مراد ہیں۔(۲)

کانهم تقالوها: یہ باب تفاعل سے ماضی جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے، اصل **تقالل یتقالل تقاللاً** ہے، ادغام کی وجہ سے ''تقالوها'' ہوگیا معنی ہیں: کم سمجھنا۔(۳)

وقد غفر الله له ماتقدم من ذنبه: یہاں ''ذنب'' سے خلاف اولی کام مراد ہے، اس لئے کہ انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام معصوم ہیں، بعض نے کہا کہ یہ جملہ عربی زبان میں محاورہ ہے عصمت کو بیان کرنے کے لئے، لہذا اس جملہ کے صادق آنے کے لئے ذمہ میں گناہ ہونا ضروری نہیں ہے اس صورت میں معنی ہونگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو معصوم ہیں، ہمارا یہ حال نہیں ہے، اس لئے ہمیں زیادہ عبادت کی ضرورت ہے، یہ بہتر مطلب ہے، ابن حجر مکیؒ نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں مغفرت کے معنی ہوتے ہیں: ان کے اوران کے گناہوں کے درمیان حائل قائم کردینا تاکہ ان سے معصیت کا صدور نہ ہو، اورانبیاء علیہم السلام کے

(۱)طيبي ۱/ ۳۳۱.

(۲)المرقاة ۱/ ۳٤۲.

(۳)أي: وجدوها قليلة، طيبي ۱/ ۳۳۱.

علاوہ میں مغفرت کا مطلب ہوتا ہے ان کے اوران کے گناہوں کی سزا کے درمیان حائل قائم کردینا تاکہ گناہوں پرسزانہ ہو۔(۱)

انی لأخشاکم للہ: خشیۃ کے معنی ہیں: الخوف مع التعظیم یعنی کسی سے ڈرنا قلب میں اس کی عظمت ہونے کے ساتھ، جیسے بیٹاباپ سے اورشاگرد استاذ سے ڈرتا ہے کہ یہاں نراخوف نہیں ہوتا بلکہ والد کی اوراستاذ کی عظمت بھی قلب میں ہوتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کواللہ کی خشیت سب سے زیادہ تھی اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کوسب سے زیادہ جاننے والے تھے اس لئے اللہ کی سب سے زیادہ عظمت آپ کے قلب مبارک میں تھی اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس بات کو زیادہ جانتے تھے کہ اللہ کوعبادت کا کونسا طریقہ پسند ہے۔(۲)

فمن رغب عن سنتي فليس مني: سنت سے اعراض دوطرح ہوتا ہے: (۱) بطریقۂ انکار واہانت یہ کفر ہے اس وقت لیس منی اپنے اصل معنی میں ہوگا کہ وہ اسلام سے خارج ہے (۲) بطریقۂ تکاسل وغفلت، یہ مذموم ہے، مگر کفر نہیں اس وقت لیس منی کے معنی ہونگے کہ وہ میرے کامل طریقے پرنہیں ہے۔(۳)

۱۳۸ / ۷: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: صَنَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئاً، فَرَخَّصَ فِيْهِ، فَتَنَزَّهَ عَنْهُ قَوْمٌ، فَبَلَغَ ذٰلِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَخَطَبَ فَحَمِدَ اللّٰهَ، ثُمَّ قَالَ: مَابَالُ أَقْوَامٍ يَتَنَزَّهُوْنَ عَنِ الشَّيْئِ أَصْنَعُهُ؟! فَوَاللّٰهِ إِنِّيْ لَأَعْلَمُهُمْ بِاللّٰهِ، وَأَشَدُّهُمْ لَهُ خَشْيَةً''(متفق عليه)(۴)

ترجمه: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کام کیا اوراس کام میں لوگوں کورخصت عطا فرمائی؛ لیکن کچھ لوگوں نے اس رخصت سے اجتناب کیا، جب

(۱) فتح الإله ۱ / ۵۴۲، والمرقاة ۱ / ۳۴۲.

(۲) تحفة الأبرار للبيضاوي ۱ / ۱۲۳.

(۳) طيبي ۱ / ۳۳۲.

(٤) أخرجه البخاري في موضعين، كتاب الأدب، باب من لم يواجه الناس بالعتاب ۲ / ۹۰۱ برقم ۵۸٦۳. وفي الاعتصام بالكتاب والسنة، باب مايكره من التعمق والتنازع ۲ / ۱۰۸٤ برقم ۷۰۰۸، ومسلم في كتاب الفضائل، باب علمه صلى الله عليه وسلم بالله تعالىٰ وشدة خشيته ۲ / ۲٦۱.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا: لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ اس چیز سے اجتناب کررہے ہیں جسے میں کررہا ہوں؟ اللہ کی قسم! میں اللہ کو ان سے زیادہ جانتا ہوں اوران سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔(بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

رخصتوں میں بھی نبی علیہ الصلوۃ والسلام کا اتباع پسندیدہ:

اس حدیث کا مضمون حدیث سابق کی طرح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی مرضی کو زیادہ جاننے والے ہیں، اس لئے آپ کا طریقہ ہی لائق اتباع ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی معاملہ میں رخصت پرعمل کریں تو امت کے لئے بھی وہی بہتر ہے۔

مضمونِ حدیث یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عمل کیا اوراس میں عزیمت کے بجائے رخصت پرعمل کیا، وہ کیا عمل تھا؟ ابن بطالؒ نے کہا کہ: وہ روزہ دار کے لئے بوسہ کا معاملہ تھا، اورعلامہ ابہری نے کہا کہ: وہ چیز افطار فی صوم السفر تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے سفر پر تھے، رمضان المبارک کا مہینہ تھا اور گرمی عروج پر تھی، بہت سے صحابہؓ شدتِ عطش کی وجہ سے نڈھال ہوگئے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ افطار فرمادیا اور صحابہ نے بھی افطار کرلیا؛ لیکن بعض صحابہ نے افطار نہیں کیا اورعزیمت کو اختیار کیا، انہوں نے یہ سوچا کہ یہ فعل کمال کے منافی ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا افطار فرمانا بیان جواز کے لئے ہے،(۱) جب یہ خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا، اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور پھر فرمایا کہ: لوگوں کا عجیب حال ہے کہ میں نے جو عمل کیا بعض لوگ اس سے اجتناب کررہے ہیں، حالانکہ میں اللہ کی مرضی کو سب سے زیادہ جاننے والا ہوں اور سب سے زیادہ اس سے خشیت رکھتا ہوں، جب میں نے اس موقعہ پر رخصت کو اختیار کیا تو لوگوں کا رخصت پرعمل کرنا ہی اللہ کو محبوب ہوگا، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ: اللہ رخصت پرعمل کرنے کو بھی پسند فرماتا ہے جیسا کہ عزیمت پرعمل کو پسند

(۱)المرقاۃ ۱/ ۳۴۵.

فرماتا ہے کیونکہ رخصت پر عمل میں اپنی کمزوری وعاجزی کا اللہ کے سامنے اقرار ہے، اور یہ چیز اللہ کو بہت پسند ہے۔(۱)

۱۳۹ / ۸: وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ: قَدِمَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ وَهُمْ يُؤَبِّرُوْنَ النَّخْلَ، فَقَالَ: "مَاتَصْنَعُوْنَ؟ "قَالُوْا: كُنَّا نَصْنَعُهُ قَالَ: "لَعَلَّكُمْ لَوْلَمْ تَفْعَلُوْا كَانَ خَيْراً" فَتَرَكُوْهُ؛ فَنَقَصَتْ قَالَ: فَذَكَرُوْا ذٰلِكَ لَهُ، فَقَالَ: "إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ، إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ أَمْرِ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهِ، وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْئٍ مِنْ رَأْيِيْ فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ. (رواہ مسلم)(۲)

ترجمہ: حضرت رافع بن خدیجؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے اس وقت مدینہ منورہ کے لوگ کھجور کے درختوں میں تابیر کیا کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا "یہ تم کیا کرتے ہو"؟ اہل مدینہ نے عرض کیا "ہم ایسا ہی کرتے آئے ہیں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم ایسا نہ کرو تو شاید بہتر ہو چنانچہ لوگوں نے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنکر) اسے چھوڑ دیا مگر اس سال پھل کم آیا۔

راوی کہتے ہیں کہ صحابہؓ نے اس کا تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا: تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں بھی ایک انسان ہوں، لہٰذا میں جب تمھیں ایسی بات کا حکم دوں جو تمہارے دین سے متعلق ہو تو اسے اختیار کرو اور جب کوئی بات تمھیں اپنی رائے سے بتاؤں تو (سمجھ لو) میں بھی ایک انسان ہوں۔(مسلم)

(۱) رواه البزار في مسنده برقم (۵۹۹۸) عن عبدالله بن عمر، ولفظه: إن الله تبارك وتعالىٰ يحب أن تؤتى رخصه كمايحب أن تؤتى عزائمه أو كمايكره أن تؤتى معصيته، وكذا أخرجه وغيره من البيهقي وابن حبان وابن أبى شيبه وأحمد بن حنبل والطحاوي وغيره.

(۲) أخرجه مسلم، كتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ماقاله شرعا دون ماذكره صلى الله عليه وسلم من معايش الدنيا على سبيل الراي ۲ / ۲٦٤. (۱) مرقاة ۱ / ۳٤۵.

تشریحِ حدیث

احوال رافع بن خدیج:

رافع بن خدیج انصاری اوسی ہیں، دادا کا نام بھی رافع ہے، ابوعبداللہ اور ابوخدیج کنیت ہے، والدہ کا نام حلیمہ بنت مسعود ہے، غزوہ بدر میں کم سنی کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے، باقی سب غزوات میں شریک رہے، مدینہ میں اپنی قوم وخاندان کے سردار تھے، غزوۂ احد میں ایک معمولی سا زخم لگا، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں قیامت کے دن تمہارے لئے گواہ بنوں گا، چنانچہ اس وقت تو وہ زخم اچھا ہوگیا، مگر پھر عبداللہ بن مروان کے زمانہ میں وہ زخم ہرا ہوا اور اسی میں ۷۳ھ میں ۸۶ سال کی عمر میں ان کی شہادت ہوئی۔(۱)

تابیرِ نخل اور دنیوی امور میں آپ کے اتباع کا حکم:

اس حدیث میں اعتصام بالسنہ کی تفصیل بتائی گئی کہ وہ کب ضروری ہے اور کب ضروری نہیں؟ وہ یہ کہ: اگر امور دینیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی حکم دیں تو اس کا اعتصام ضروری ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان فرمودہ وہ حکم منجانب اللہ وحی ہوتا ہے اور اگر دنیا کے کسی معاملہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رائے سے کوئی بات فرمائیں تو اس کا اعتصام لازم نہیں ہے جیسا کہ اس حدیث میں مذکور واقعہ سے ظاہر ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اہل مدینہ کا گزر بسر کھجوروں پر تھا جیسے ہمارے یہاں گیہوں پر ہے، ان کو مہینوں روٹی نہیں ملتی تھی، کھجور کھانے پر اکتفا کیا کرتے تھے، مدینہ طیبہ میں کھجور کے باغات بہت تھے، اہل مدینہ ان کی کاشت کے بہت ماہر تھے، کھجور کی پیداوار کے بڑھانے کا ایک طریقہ ان کے یہاں تابیرِ نخل تھا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ کھجوروں کے درختوں میں مذکر ومؤنث دونوں ہوتے ہیں مذکر ومؤنث کا اختلاط کرایا جائے تو کھجور زیادہ پیدا ہوتی ہیں، اختلاط کی صورت یہ ہے کہ: مذکر کھجور کے شگوفے کو مؤنث کھجور کے شگوفے میں داخل کیا جاتا ہے، یہ ایک قسم کا جماع ہوگیا، اسی کو ''تابیرِ نخل'' کہا جاتا ہے، اس سے کھجوروں کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے۔

---

(۱) الإصابة ۲/۱۴۱–۱۴۲.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے تو اہل مدینہ کو دیکھا کہ :وہ تابیر کرتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ یہ جاہلیت کی رسم ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اگر ایسا نہ کرو تو ممکن ہے اس میں خیر ہو، چنانچہ صحابہؓ نے اس سال تابیر نہیں کی، لیکن اس سال پھل کم آئے، صحابہؓ نے اس کا تذکرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں یہ بات آئی کہ یہ جاہلیت کی رسم نہیں، بلکہ من جانب اللہ تکثیرِ ثمرہ کا سبب ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں بھی انسان ہوں اگر میں دنیوی معاملہ میں جس کا دین سے تعلق نہ ہو اپنی رائے سے بطور مشورہ کوئی حکم دوں تو اس میں خطا کا احتمال ہے اس میں اتباع لازم نہیں ہے، البتہ دینی امور میں اتباع لازم ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ذاتی معاملات میں اگر کوئی بات ارشاد فرماتے تو صحابہؓ معلوم کرتے کہ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ؟ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکم ہونا بتاتے تو اس کا اتباع لازم سمجھتے، مشورہ میں اتباع کو لازم نہ سمجھتے۔

معلوم ہوا کہ اعتصام دینی امور میں لازم ہے مشورہ کی چیزوں میں نہیں، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل توجہ امور دینیہ کی طرف تھی دنیوی امور کی طرف آپ زیادہ توجہ نہ فرماتے۔

''انتم اعلم بامر دنیاکم'' کا صحیح مفہوم اور ایک غلط نظریہ کی تردید:

اس حدیث کے بعض طرق میں ''أنتم أعلم بأمر دنیاکم'' بھی وارد ہوا ہے[1] جس سے بعض اباحت پسند افراد نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شرعی احکامات کی پابندی صرف عقائد وعبادات کی حد تک محدود ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت فقط ان ہی چیزوں کی تعلیم واصلاح کے لئے ہوئی تھی، معاملات، معاشرت اور سیاسیات ان سب میں انسان آزاد ومختار ہیں، شریعت کے مکلّف اور پابند نہیں، لہذا ان امور ومعاملات کو اپنی عقل اور حالات کے تقاضہ کے مطابق جس طرح چاہے انجام دیا جاسکتا ہے، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں اگر کچھ صادر ومنقول بھی ہے تو وہ محض شخصی رائے ہے، کوئی واجب العمل حکم نہیں، کیونکہ آپ نے فرمادیا ہے: ''أنتم أعلم بأمر دنیاکم''۔

(۱) مصابیح ج۱ ص۱۰۲ رقم ۱۰۸: در المعارفہ بیروت.

لیکن اس حدیث سے یہ استدلال سراسر مغالطہ اورفریب ہے، اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ انسان عقائد وعبادات کے ماسوا تمام امور ومعاملات میں آزاد ومختار ہیں، اس لئے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ احادیث مبارکہ کا مجموعہ اورحضرات صحابہ کی زندگی کا مکمل تعامل اس نقطۂ نظر کی پرزورنفی اورتردید کرتا ہے، آپ کی احادیث جیسے عقائد وعبادات کو بیان کرتی ہیں ایسے ہی ان میں معاملات، معاشرت اور سیاسیات کے بارے میں بھی واضح ہدایات ذکر کی گئی ہیں، اوردین کی بیشتر بلکہ تین چوتھائی تعلیمات وہ ہیں جو انہی شعبوں سے متعلق ہیں، حضرات محدثین وفقہاء نے باضابطہ ان تعلیمات کے ایک ایک جزء کو واضح کیا ہے، اورصحابۂ کرام کی پوری زندگی اس کی گواہ ہے، وہ زندگی کے ہرشعبہ میں حضوراکرم علیہ الصلاۃ والتسلیم کی ہدایات کی بھرپوراتباع کرتے اور کرواتے تھے، ترمذی شریف میں حضرت عمرؓ کا معمول نقل کیا گیا ہے کہ وہ بازارمیں گشت کرتے ارو دوکانداروں سے استفسارکرتے کہ انہوں نے معاملات کا شرعی علم حاصل کیا ہے؟ جولاعلمی کا اظہار کرتا اس کوبازارومنڈی سے یہ کہہ کر ہٹادیا کرتے: ''**لایَبِعُ فی سوقنا الامن تفقه في الدين**''[1] یعنی ہمارے بازار میں صرف وہی خرید وفروخت کرے جس نے دین کاعلم حاصل کیا ہو۔

ظاہر ہے کہ اگر دنیوی امورومعاملات شرعی پابندیوں سے آزاد ہیں تو پھرحضرت عمرؓ کا ان سے لاعلمی کی بناء پر بازار سے دوکان ہٹوانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ: یہ جملہ تابیرنخل یعنی کھجورکی پیداوار میں اضافہ کی ایک صورت کے بارے میں وارد ہوا ہے، پس اس کا مطلب فقط اتنا ہے کہ پیداوار میں اضافہ کی صورتوں سے تم زیادہ واقف ہو، میں نہیں، اسی طرح دیگر پیشے وحرفتیں اورطریقہائے کاروبار ہیں ان کی عملی تفصیلات سے بھی میں زیادہ باخبرنہیں، واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ نبیؐ اوررسولؐ کی لائن کی چیز نہیں ہے، پس آپ نے جوفرمایا بجافرمایا، مگراس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس سے جملہ دنیوی اموروبمعاملات میں ہرطرح کی آزادی حاصل ہوگئی ہے اوراب نبی علیہ السلام کی جانب سے اس بارے میں دی گئی ہرہدایت وتعلیم ناقابل عمل ہوگئی ہے بالکل غیرمعقول بلکہ حماقت ہے، آپ علیہ السلام کا یہ فرمان ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی حاکم کے سامنے رعایا کے پیشے اورطریقہائے کاروبارزیربحث ہوں اوروہ دورانِ بحث یہ کہدے کہ: میں ان کی انجام دہی کے طریقوں سے زیادہ واقف نہیں، ظاہر ہے کہ حاکم کے اس کہنے کا یہ نتیجہ نہیں نکالا جائے گا کہ اب ان اموروبمعاملات میں کبھی اس کا کوئی

(۱) ترمذي شريف، كتاب الصلوة، باب ماجاء فى فضل الصلوة على النبي صلى الله عليه وسلم ۱ / ۱۱۰.

حکم نافذ نہیں ہوگا، بیشک وہ ان کی انجام دہی کے عملی طریقوں سے ناواقف ہے مگر پھر بھی وہ اس کے دائرۂ اختیار میں رہیں گے، اوران کے بارے میں اس کی ہدایات وفرامین واجب العمل ہوں گے، ہرملک کا حاکم پیشوں اورکاروبار کی عملی تفصیلات سے ناواقف ہی ہوتا ہے،مگران کے بارے میں اس کے احکامات واجب التنفیذ ہوتے ہیں، پس آپ علیہ الصلوۃ والسلام کا یہ فرمان بھی اسی تناظر میں وارد ہوا ہے۔

اوراس مفہوم کی تائید خود حدیث کے الفاظ سے ہوتی ہے، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے ''علم'' کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کے معنی پختہ اورکامل معرفت کے ہیں، اس کے علاوہ اس کا کچھ اورمفہوم نہیں، پس اس کا مطلب فقط یہ ہے کہ صنعت وکاروبار کا گہرا وپختہ علم اور اس کی اندرونی وعملی تفصیلات سے مکمل واقفیت تم لوگوں کوزیادہ ہے، اس جملہ میں ایسا کوئی اشارہ نہیں کہ جس سے یہ مفہوم ہوکہ اس کے ذریعہ دنیوی تمام امورومعاملات میں کلی آزادی دیدی گئی ہے اوروہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے دائرہ اختیار سے باہر ہوگئے ہیں۔ واللہ اعلم

۱۴۰ / ۹: عَنْ أَبِي مُوسىٰ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ،قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ مَابَعَثَنِي اللّٰهُ بِهٖ كَمَثَلِ رَجُلٍ أَتٰى قَوْماً، فَقَالَ: يَاقَوْمِ!إِنِّيْ رَأَيْتُ الْجَيْشَ بِعَيْنَيَّ، وَإِنِّيْ أَنَا النَّذِيْرُ الْعُرْيَانُ! فَالنَّجَاءَ النَّجَاءَ، فَأَطَاعَهٗ طَائِفَةٌ مِنْ قَوْمِهٖ فَأَدْلَجُوْا، فَانْطَلَقُوْا عَلٰى مَهَلِهِمْ فَنَجَوْا، وَ كَذَّبَتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ فَأَصْبَحُوْا مَكَانَهُمْ، فَصَبَّحَهُمُ الْجَيْشُ فَأَهْلَكَهُمْ وَاجْتَاحَهُمْ، فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ أَطَاعَنِيْ فَاتَّبَعَ مَاجِئْتُ بِهٖ، وَمَثَلُ مَنْ عَصَانِيْ وَ كَذَّبَ مَاجِئْتُ بِهٖ مِنَ الْحَقِّ"(متفق عليه)(۱)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میری اوراس چیز (دین وشریعت) کی مثال جسے دیکر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے اس شخص کی سی ہے جو ایک قوم کے پاس آیا اورکہا:اے قوم! میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لشکر کو دیکھا ہے اور میں ننگا (بے غرض) ڈرانے والا ہوں، لہٰذا تم اپنی نجات کا راستہ تلاش کرلو، چنانچہ اس

(۱)أخرجه البخاري في موضعين "كتاب الاعتصام، باب الاقتداء بسنن رسول الله صلى الله عليه وسلم" ۲ / ۱۰۸۱ برقم ٦٩٩١ .وأيضا"كتاب الرقاق، باب الانتهاء عن المعاصي ۲ / ۹۵۹ برقم ٦٢٣٣ .ومسلم في الفضائل، باب شفقته صلى الله عليه وسلم على أمته الخ ۲ / ۲٤۸ .

قوم میں سے ایک جماعت نے اس کی فرمانبرداری کی چنانچہ وہ لوگ رات کے اول حصہ میں چلدیئے اوراطمینان سے چلتے رہے، انہوں نے (دشمن سے) نجات پالی،اورایک جماعت نے اس کو جھٹلایا اور صبح تک اپنے گھروں میں رہی، صبح کولشکر نے آکر ان کو پکڑلیا، اور ہلاک کرڈالا، اور جڑ سے ختم کردیا، پس یہی مثال ہے اس شخص کی جس نے میری فرمانبرداری کی اور جو احکام میں لایاہوں ان کی پیروی کی، اور مثال ہے اس شخص کی جس نے میری نافرمانی کی اور جوحق کی بات (یعنی دین وشریعت) میں لیکر آیاہوں اس کی تکذیب کی۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

اطاعت نبوی کی ضرورت اوراس کی ایک اورمثال سے تفہیم:

اس حدیث پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اوراپنی تعلیمات کی مثال بیان فرمائی ہے۔

مثال یہ ہے کہ اہل عرب قبائلی لوگ تھے اکثر قبائل جنگل میں رہتے تھے، ان میں باہم لڑائیاں بہت ہوتی تھیں،ایک قبیلہ دوسرے پرحملہ آور ہوتا، وہ لوگ عموماً شب کے اخیر حصہ میں اچانک حملہ کرتے، جس قبیلہ پرحملہ ہونے والا ہے اگراس قبیلہ کا کوئی شخص دشمن کو دیکھ لیتا تو اپنی قوم کومطلع کرتا،ان حالات میں ایک شخص اپنی قوم سے کہتاہے کہ میں نے دشمن کواپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، وہ تمہارے اوپرحملہ آوار ہونے والاہے، اورمیں تم کوصحیح خبردے رہاہوں، اس خبر دینے میں تم مجھے جھوٹا نہ سمجھو، مجھے محض تمہاری ہمدردی مقصود ہے،تم چونکہ دشمن کا مقابلہ نہیں کرسکتے اس لئے یہاں سے نکل جاؤ اوردوسری محفوظ جگہ پہنچ کراپنی جان بچاؤ یہ بات سن کر اس کی قوم میں دوگروہ ہوگئے،بعض نے اس کی بات کا اعتبارکیا، چنانچہ رات کے اول حصے ہی میں اپنے مال واسباب کے ساتھ نکل گئے اورمحفوظ جگہ پہنچ گئے، یہ لوگ نجات پاگئے، اوربعض نے اس کی تکذیب کی اوریہ سوچا کہ اگردشمن آیا بھی تو ہم اسی وقت بھاگ جائیں گے،لیکن صبح ہی صبح معمول کے مطابق دشمن نے ان پرحملہ کیا کہ ان کو بھاگنے کا بھی موقع نہیں ملا اوردشمن نے ان سب کو ہلاک کردیا۔

یہی حال آپ کا ہے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کومبعوث فرمایا،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کوکفروشرک چھوڑنے کی دعوت دی اورجہنم سے اورقیامت کے ہولناک مناظر سے ڈرایا، یہ دعوت پہنچنے

کے بعد امت میں دوقسم کے لوگ ہوئے، بعض نے آپ کو سچا جانا اور ایمان لے آئے اور آپ کا اعتبار کیا اور نجات پاگئے اور بعض نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی، آپ کی بات کا انکار کیا اور ایمان نہ لائے حتی کہ موت نے ان کو آدبوچا اور جہنم میں داخل ہو کر قسم قسم کے عذاب میں مبتلا ہوگئے۔

''نذیر عریان'' کا مفہوم اور اس کی اصل:

أنـا النذير العريان : یہ عربی زبان کا ایک محاورہ ہے، جو شخص بلا کسی غرض ولالچ کے مبالغہ کے ساتھ کسی ناگہانی اور دہشت ناک امر سے اپنی قوم کو ڈرائے اس کو ''نذیر عریان'' کہا جاتا ہے، اس کی اصل یہ ہے کہ جاہلیت میں ایک قبیلے نے اپنا ایک جاسوس دوسرے قبیلے میں بھیجا، ان لوگوں نے اس کو پکڑلیا اور اس کو ننگا کر کے مارا، اسی حال میں وہ وہاں سے بھاگا اور اپنے قبیلے میں پہنچ کر ان کو دشمن سے ڈرانے لگا اور دشمن کے احوال بتانے لگا، یہ پہلا شخص تھا جو حقیقۃً ''نذیر عریان'' تھا اس کے بعد یہی رواج ہوگیا کہ جو شخص دشمن کو دیکھ لیتا تو وہ ننگا ہو کر لوگوں کو خبر دیتا، لوگ اس کو مخلص سمجھ کر اس کی تصدیق کرتے، پھر یہ محاورہ بن گیا اس شخص کے لئے جو بے غرض ہو کر اپنی قوم کو کسی دہشت ناک چیز سے ڈرائے اگر چہ وہ ننگا نہ ہو۔(۱)

فـالـنـجـاء النجاء : بالمد والقصر دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں، یہ فعل محذوف کا مفعول ہے اور تکرار بطور تاکید ہے ای اطلبوا النجاة.

فـأدلـجوا : یہ **دُلْجة** سے ماخوذ ہے بمعنی رات کا اول حصہ، مطلب یہ کہ رات ہی میں نکل کھڑے ہوئے، **عـلـى مهلهم** بمعنی سکون اور اپنی ہیئت پر چلنا، **اجتـاحهـم ای أهـلـكهم بالكلية** ان کو جڑ سے ختم کر دیا یعنی ان کا نام ونشان مٹا دیا۔(۲)

١٤١ / ١٠ : وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :"مَثَلِيْ كَمَثَلِ رَجُلٍ اِسْتَوْقَدَ نَاراً، فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَاحَوْلَهَا ، جَعَلَ الْفَرَاشُ وَهٰذِهِ الدَّوَابُ الَّتِيْ تَقَعُ فِيْ النَّارِ يَقَعْنَ فِيْهَا، وَجَعَلَ يَحْجُزُهُنَّ وَيَغْلِبْنَهُ، فَيَتَقَحَّمْنَ فِيْهَا، فَأَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ، وَأَنْتُمْ تَقَحَّمُوْنَ فِيْهَا" (هذه رواية البخاری ولمسلم

(١) طيبي ١ / ٣٣٥، وفتح الإله لابن حجر مكي ١ / ٥٥٠.

(٢) المرقاة ١ / ٣٤٢، واللمعات ١ / ٤٥٧.

نحوُها، وَقَالَ فِيْ آخِرِهَا:) قَالَ: "فَذٰلِكَ مَثَلِيْ وَمَثَلُكُمْ، أَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ، هَلُمَّ عَنِ النَّارِ، هَلُمَّ عَنِ النَّارِ، فَتَغْلِبُوْنِّيْ تَقَحَّمُوْنَ فِيْهَا" (متفق عليه)(۱)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری مثال اس شخص کے مانند ہے جس نے آگ روشن کی چنانچہ جب آگ نے چاروں طرف روشنی پھیلادی تو، پروانے اور دوسرے وہ جاندار جو آگ میں گرا کرتے ہیں آ کر آگ میں گرنے لگے، آگ روشن کرنے والے شخص نے ان کو روکنا شروع کیا (لیکن وہ نہیں رکے) اوراس (کی کوششوں) پر غالب آ گئے چنانچہ زبردستی آگ میں داخل ہونے لگے، اسی طرح میں بھی تمہاری کمریں پکڑ کر تمھیں آگ میں گرنے سے روکتاہوں اورتم زبردستی آگ میں گررہے ہو، یہ روایت بخاری کی ہے اورمسلم کی روایت کے آخرمیں الفاظ یہ ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: بالکل ایسی ہی مثال میری اورتمہاری ہے میں تمہاری کمریں پکڑے ہوئے ہوں کہ تمھیں آگ سے بچاؤں اور یہ کہتاہوں کہ میری طرف آؤ، دوزخ سے بچو میری طرف آؤ دوزخ سے بچو؛ لیکن تم مجھ پر غالب آتے ہو اورآگ میں گرپڑتے ہو۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

حضوراکرم علیہ الصلوۃ والسلام کے جذبۂ خیرخواہی کی مثال:

روایت کا حاصل یہ ہے کہ حضورصلی اللہ علیہ وسلم امت پر بہت شفیق ومہربان تھے، آپ کے دل میں امت کا بڑادرد تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ امت کا ہرفرد جہنم سے محفوظ ہوجائے اور جنت کا مستحق ہوجائے، اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے احکام بیان فرمائے اورحلال وحرام کو واضح فرمایااورامت کی ہدایت کے لئے بہت سعی کی، اس کے باوجود امت میں بہت سے لوگ جن کوحرام لذتوں کی

(۱)أخرجه البخاري في موضعين: كتاب الانبياء، باب قول الله عزوجل ووهبنا لداود سليمان نعم العبد إنه أواب ۱/۴۸۷برقم ۳۳۱۲ و"كتاب الرقاق، باب الانتهاء عن المعاصي ۲/۹۶۰ برقم ۲۲۸۴. ومسلم في الفضائل، باب شفقته صلى الله عليه وسلم على أمته ۲/۲۴۸.

عادت ہے وہ منہیات ومحرمات کی آگ میں مبتلا ہوکر اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بناتے ہیں، اس مضمون کوحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حسی وواقعی مثال سے سمجھایا، چنانچہ فرمایا کہ میری اورمیری تعلیمات کی مثال ایسی ہے جیسا یک شخص نے رات میں آگ جلائی تا کہ اندھیرا ختم ہوجائے اور ہر چیز واضح طور پر نظر آئے، آگ روشن ہوجانے کے بعد پروانے اور پسو وغیرہ جن کی عادت آگ میں گرنے کی اور آگ کو پسند کرنے کی ہے وہ آگ کی طرف بڑھنے لگے اور آگ میں گرنے لگے، آگ جلانے والے کو ان پر ترس آیا اس نے ان پروانوں کو وہاں سے ہٹایا وہ دوسری طرف سے آکر آگ میں گرنے لگے، یہ شخص وہاں سے بھی ان کو ہٹانے کی کوشش کرتا رہا،غرض یہ کہ یہ شخص اپنا پورا زورصرف کررہا ہے ان کو بچانے کے لئے مگر وہ پروانے اس پرغالب آگئے اورآگ میں گرکرجل گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہاری کمر پکڑ پکڑکر تم کو جہنم سے ہٹارہاہوں مگرتم مجھ پرغالب آرہے ہو اور میری مخالفت کرکے جہنم میں داخل ہورہے ہو۔

اقسام تشبیہ اور مضمونِ حدیث پر اس کا انطباق:

یہ ایک تمثیل ہے، تمثیل کی دوقسمیں ہیں:(۱)تشبیہ مرکب (۲)تشبیہ مفرد، تشبیہ مرکب یہ ہے کہ جانب مشبہ ومشبہ بہ دونوں میں چند چیزیں ہوں، مشبہ کے امور میں غورکرکے ان سے ایک حالت کا انتزاع کیاجائے اسی طرح مشبہ بہ کے امور سے بھی ایک حالت منتزع کی جائے پھر پہلی حالت منتزعہ کو دوسری حالت منتزعہ کے ساتھ تشبیہ دی جائے، اورتشبیہ مفرد یہ ہے کہ جانب مشبہ وجانب مشبہ بہ ہردو میں چند چیزیں ہوں، اس میں سے مشبہ کے اول جز کو مشبہ بہ کے اول جز کے ساتھ تشبیہ دی جائے، ثانی کو ثانی کے ساتھ، ثالث کو ثالث کے ساتھ[1] جیسے قرآن کریم میں ہے ''وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَلَا الظُّلُمَاتِ وَالنُّوْرُ[2]''

یہاں روایت میں تشبیہ مرکب بھی ہوسکتی ہے اورتشبیہ مفرد بھی، تشبیہ مرکب کی صورت یہ ہے کہ: جانب مشبہ میں تین چیزیں ہیں (۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا احکامات کو واضح فرمانا (۲) شریعت کے نور کا پھیل

(۱) مختصر المعاني، ص: ۳۳۱ ط: مکتبه فیصل دیوبند.

(۲) من سورة الفاطر: ۱۹.

جانا(۳)لوگوں کا احکام کی پرواہ نہ کرکے جہنم میں گرنا، جانب مشبہ بہ میں بھی تین چیزیں ہیں (۱)استیقا دِ نار (۲)اضاء ت نار(۳)پروانوں کا آگ میں گرنا، مشبہ بہ کے تینوں اجزاء سے ایک حالت منتزع ہوئی وہ ہے حرص کی وجہ سے پروانوں کا آگ میں گرنا، اورمشبہ کی حالت منتزعہ ہے لوگوں کا خواہشات کی وجہ سے جہنم میں گرنا، پھرایک حالت منتزعہ کودوسری حالت منتزعہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، یہ تمثیل مرکب ہے۔

اورتشبیہ مفرد اس طور پر ہے کہ: حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے احکامات الٰہی کی شرح وتوضیح کو استیقادِ نار سے تشبیہ دی گئی ہے اور احکام شرع کی اشاعت کو اضاءتِ نار سے تشبیہ دی گئیہے اور لوگوں کے ان احکام کو نظر انداز کرکے مستحق جہنم ہوجانے کو پروانوں کے آگ میں گرجانے کے ساتھ تشبیہ دی گئیہے اور وجہ شبہ ظاہر ہے۔(۱)

الفراش: ایسے جانور جن کے پَرجسم سے بڑے ہوں،اور**الدواب** سے مراد ایسے جانور جن کے پرجسم کے مقابلہ میں چھوٹے ہوں، **حجز** جمع حجزۃ کی کمربند باندھنے کی جگہ، اس کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ: اس جگہ کی پکڑ مضبوط ہوتی ہے"**وأنتم تقمحون فيها**" یہ **تقحم** سے ہے جس کے معنی ہیں انجام سوچے بغیر مشکل امور میں گھس جانا۔(۲)

هلم عن النار: **هلم** اسمائے افعال میں سے ہے، جو امرحاضر معروف کے معنی میں ہے، معنی ہیں: "**أبعدوا أنفسكم عن النار**" اس سے پہلے قائلاً حال محذوف ہے۔(۳)

۱۴۲/۱۱: وَعَنْ أَبِيْ مُوْسٰیؓ ، قَالَ: قَالَ: رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : "مَثَلُ مَابَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهِ مِنَ الْهُدَىٰ وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيْرِ أَصَابَ أَرْضاً ،فَكَانَتْ مِنْهَا طَائِفَةٌ طَيِّبَةٌ قَبِلَتِ الْمَاءَ فَأَنْبَتَتِ الْكَلأَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيْرَ، وَكَانَتْ مِنْهَا أَجَادِبُ أَمْسَكَتِ الْمَاءَ، فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا وَسَقَوْ وَزَرَعُوْا، وَأَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةً أُخْرَىٰ إِنَّمَاهِيَ قِيْعَانٌ، لاتُمْسِكُ مَاءً، وَلاتُنْبِتُ كَلأً، فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ وَنَفَعَهُ بِمَابَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهِ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ، وَمَثَلُ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَأْساً،وَلَمْ يَقْبَلْ

(۱)المرقاة ۱/ ۳۵۰.
(۲)اللمعات ۱/ ۴۵۹ - ۴۶۰.
(۳)اللمعات ۱/ ۴۶۱.

هُدَى اللّٰهِ الَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِهٖ''(متفق علیه)(۱)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس چیز کی مثال جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھے دیکر بھیجا ہے یعنی علم اور ہدایت کثیر بارش کے مانند ہے جو زمین پر برسی ہو، چنانچہ زمین کا بعض حصہ عمدہ تھا اس نے پانی اپنے اندر جذب کرلیا، پھراس نے گھاس اورچارہ خوب اگایا، اورزمین کا ایک حصہ سخت تھا اس نے بارش کے پانی کو روک لیا، اللہ نے اس کے ذریعہ لوگوں کو نفع پہنچایا، چنانچہ لوگوں نے وہ پانی پیا اور پلایا اورکھیتی کو سیراب کیا، اور یہ بارش کا پانی زمین کے ایک ایسے حصہ پربھی پہونچا جو چٹیل میدان تھا اس نے نہ پانی (اپنے اندر) روکا اورنہ گھاس اگائی، یہ (مذکورہ چیزیں) مثال ہیں اس شخص کی جس نے اللہ کے دین کو سمجھا اوراس کو نفع پہونچایااس چیز نے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے دیکر بھیجی تھی (یعنی شریعت) پس اس نے خود سیکھا اوردوسروں کو سکھایا اورمثال ہے اس شخص کی جس نے سرنہیں اٹھایا اس چیز (میری شریعت) کی طرف اوراللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کو قبول نہیں کیا جس کو دیکر میں بھیجا گیا ہوں۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

تعلیمات نبوی اورامت کی مثال:

اس حدیث پاک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لائی ہوئی تعلیمات کی اوراپنی قوم کی مثال بیان فرمائی ہے، اپنی تعلیمات کو بارش کے مثل اوراپنی قوم کو زمین کے مثل قرار دیا۔

کمثل الغیث الکثیر: ''غیث'' وہ بارش جوضرورت کے وقت خوب برسے، اس میں اشارہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اہم ضرورت کے وقت ہوئی، چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اس وقت پورے عالم میں گمراہی چھائی ہوئی تھی، اورلوگ جہنم کے کنارہ پر پہنچ چکے تھے، بارش جس زمین پر پڑتی ہے وہ تین قسم کی ہوتی ہے:

(۱) أخرجه البخاري في كتاب العلم، باب فضل من علم وعلّم ۱/۱۸ برقم ۸۰ ومسلم في كتاب فضائل النبي صلى الله عليه وسلم، باب بيان مثل مابعث النبي صلى الله عليه وسلم من الهدى والعلم ۲/۲۴۷.

(۱) بعض زمین نرم ہوتی ہے اور بارش کے پانی کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے، اس کے نتیجہ میں زمین سے جانوروں کے لئے گھاس اور سبزہ اور انسانوں کے لئے طرح طرح کے غلے اور پھل پیدا ہوتے ہیں، اس زمین نے پانی سے خود بھی نفع اٹھایا اور دوسروں کو بھی نفع پہنچایا، یہ سب سے عمدہ زمین ہوتی ہے اسی کو حدیث میں ''ارض طیبہ'' فرمایا گیا ہے۔

(۲) وہ زمین جو سخت ہو اور نشیب میں واقع ہو، یہ زمین پانی کو اپنے اندر جذب تو نہیں کرتی البتہ اس کو جمع کر لیتی ہے، پھر خلق خدا اس پانی سے فیضیاب ہوتی ہے، یہ زمین پانی سے خود تو منتفع نہیں ہوئی البتہ اس نے دوسروں کو نفع پہنچایا اس کو حدیث میں ''ارض اجادب'' کہا گیا ہے۔

(۳) وہ زمین جو چٹیل میدان کی شکل میں ہو، یہ نہ پانی کو اپنے اندر جذب کرتی ہے اور نہ اس کو اپنے اندر جمع کرتی ہے، اس لئے یہ زمین پانی سے نہ خود منتفع ہوئی اور نہ دوسروں کو فائدہ پہنچایا، اس کو حدیث میں ''ارض قیعان'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات آسمان سے مثل بارش کے اتریں اور لوگوں تک پہنچیں، ان تعلیمات کے پہنچنے کے بعد لوگوں کے قلوب تین قسم کے ہوئے، بعض نے اس علم کو فوراً قبول کیا ان تعلیمات پر ایمان لائے اور ان پر خود بھی عمل کیا اور دوسروں کو بھی سکھایا، جیسے محدثین اور فقہائے مجتہدین یہ تعلیمات نبوی سے خود بھی فیضیاب ہوئے اور دوسروں کو بھی فیضیاب کیا، اور بعض لوگ وہ ہیں جو ان تعلیمات پر ایمان تو لائے لیکن ان پر مکمل عمل نہیں کیا البتہ دوسروں کو سکھایا، مثلاً بے عمل علماء، اور بعض لوگ وہ ہیں جنھوں نے سرے سے ان تعلیمات کو قبول ہی نہیں کیا اور متوجہ ہی نہیں ہوئے، جیسا کہ کفار و مشرکین، یہ ''ارض قیعان'' کی طرح ہیں جو انتہائی بیکار زمین ہوتی ہے، انہوں نے اللہ کی عظیم نعمت سے نہ خود فائدہ اٹھایا نہ دوسروں کو فائدہ پہنچایا۔

ایک اشکال و جواب:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مضمون بھی تمثیلی انداز میں بیان فرمایا، ازروئے بلاغت یہ تمثیل تمثیل مفرد ہے، اس تمثیل پر ایک اشکال ہے وہ یہ کہ تمثیلِ مفرد میں آحاد کا آحاد سے تقابل ہوتا ہے جیسا کہ حدیث سابق کے تحت اس کی تفصیل گذر چکی، یہاں جانب مشبہ بہ میں تین قسم کی زمینیں ہیں، ارضِ طیبہ،

ارض اجادب اورارض قیعان، لیکن مشبہ صرف دوہی بیان کیے گئے ہیں عالم باعمل اور کافر،ارض اجادب کا مقابل یعنی عالم بےعمل مذکورنہیں پھر یہ تمثیل کس طرح تام ہوگی؟

اس اشکال کے کئی جواب دیئے گئے ہیں: (۱) بعض نے کہا کہ مشبہ بہ پرقیاس کرتے ہوئے ایک مشبہ کوچھوڑ دیا گیا ہے مخاطب خود سمجھ لے گا کہ جب مشبہ بہ تین چیزیں ہیں تو مشبہ میں بھی تین چیزیں ہونگی پس فہمِ مخاطب پر اعتماد کرکے ایک مشبہ کو ذکرنہیں کیا گیا۔(۱)

(۲) اس طرز بیان میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عالم بےعمل اس لائق ہی نہیں کہ اس کا ذکر کیا جائے، پس یہ ایسے عالم کے لئے تنبیہ بھی ہوگئی۔(۲)

(۳) علامہ مُظہر فرماتے ہیں کہ اصل میں مشبہ دوہی ہیں: ایک قبول کرنے والے اور دوسرے قبول نہ کرنے والے، پھرقبول کرنے والوں کا ایک ضمنی جزو ہے عالم بےعمل، اسی طرح زمین کی بھی اصلاً دوقسمیں ہیں پانی کو قبول کرنے والی اورقبول نہ کرنے والی، اورارض اجادب، ارض طیبہ کاہی ضمنی جزو ہے۔(۳)

الکلأ: بمعنی گھاس خواہ رطب ہویا یابس، العُشب بضم العین وسکون الشین رطب گھاس۔

۱۴۳ / ۱۲: وَعَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: تَلا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "هُوَالَّذِيْ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ، وَقَرَأَ إِلَى: وَمَايَذَّكَّرُإِلَّا أُولُوالْأَلْبَابِ، قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَإِذَا رَأَيْتَ- وَعِنْدَ مُسْلِمٍ: رَأَيْتُمُ- الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ؛ فَأُولٰئِكَ الَّذِيْنَ سَمَّاهُمُ اللّٰهُ، فَاحْذَرُوْهُمْ" (متفق عليه)(٤)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی "هُوَالَّذِیْ أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ" اورآخرآیت

(١) المرقاة ١ / ٣٥٢.
(٢) اللمعات ١ / ٤٦٢-٤٦٣.
(٣) المفاتيح شرح المصابيح ١ / ٢٥٢.
(٤) أخرجه البخاري في كتاب التفسير، باب تفسير سورة آل عمران ٢ / ٦٥٢، برقم ٤٣٦٢.
ومسلم في كتاب العلم، باب النهي عن اتباع متشابه القرآن والتحذير من متبعيه ٢ / ٦٣٢.

’’وَمَايَذَّكَّرُ إِلَّآ أُولُوا الْاَلْبَابِ‘‘(۱)تک پڑھا،حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ: یہ آیت پڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا’’جس وقت تو دیکھے اور مسلم کی روایت میں ہے کہ: جب تم دیکھو کہ لوگ ان آیتوں کے پیچھے پڑتے ہیں جو متشابہ ہیں تو تم سمجھو کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا نام اللہ تعالیٰ نے (کجرو یا گمراہ) رکھا ہے لہٰذا ان لوگوں سے بچتے رہو‘‘ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

آیات محکمہ ومتشابہ کا مفہوم اور کیفیتِ اعتصام:

اس روایت میں اعتصام بالکتاب کا بیان ہے، قرآن کی دوقسم کی آیات ’’محکم اور متشابہ‘‘ کے اعتصام کی کیفیت بیان فرمائی گئی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آیات دوقسم کی ہیں: محکم اور متشابہ، محکم وہ آیات جن کی مراد ایسے شخص پر بین اور ظاہر ہو جو قواعدِ عربیہ کو اچھی طرح جانتا ہو، اور متشابہ وہ آیات جن کے معنی ومراد جزماً کسی کو معلوم نہ ہوں، جیسے حروف مقطعات اور لفظ ید اور ساق وغیرہ، آیات محکمہ ام الکتاب (کتاب کی اصل) ہیں، کیونکہ جن آیات کے معنی ظاہر نہ ہوں ان کو اُن ظاہرالمعنی آیات کے موافق بنایا جاتا ہے جو آیات محکمہ کہلاتی ہے، یہ اقسام کا بیان ہوا۔

کیفیت اعتصام یہ ہے کہ: محکم آیات چونکہ معلوم المراد ہوتی ہیں اس لئے عمل اور عقیدہ میں ان سے استدلال درست ہے اور متشابہ آیات غیر معلوم المراد ہیں اس لئے ان آیات کے بارے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان پر ایمان رکھا جائے اور بلحاظ معنی ان کو پہلی قسم کی طرف راجع کر کے دیکھا جائے، جو معنی اس کے خلاف پڑیں ان کی قطعاً نفی کی جائے اور متکلم کی مراد وہ سمجھی جائے جو آیات محکمات کے خلاف نہ ہو، اور ایسی تاویل صحیح نہ سمجھی جائے جو شریعت کے اصول مسلمہ اور آیات محکمہ کے خلاف ہو، مثلاً قرآنِ کریم کی محکم آیات: (اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ (۲)) وغیرہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کی مخلوق ہیں، اس لئے نصاریٰ کا ان کے بارے میں الوہیت اور ابنیت کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں، اب اگر کوئی شخص ان محکم آیات سے صرفِ نظر کر کے قرآن میں وارد کلمۃ اللہ اور روح منہ وغیرہ متشابہات

(۱) من سورۃ آل عمران: ۷.

(۲) من سورۃ زخرف: ۵۹.

کو لے دوڑے اور اس کے معنی وہ لے جو محکماتِ قرآنیہ اور احادیثِ متواترہ کے منافی ہوں تو یہ کجروی اور ہٹ دھرمی ہوگی۔(۱)

حاصل یہ ہوا کہ متشابہات کا اعتصام یہ ہے کہ ان پر ایمان لائے اور ان کو محکمات کے خلاف کسی معنی پر محمول نہ کرے، اور محکم کا اعتصام یہ ہے کہ ان پر ایمان لاوے، اپنا عقیدہ وعمل محکمات کے مطابق کرے، اور اس صحیح عقیدہ وعمل پر محکمات سے استدلال بھی کرے، جو سلیم الفطرۃ لوگ ہیں ان کا عقیدہ وعمل اسی کے مطابق ہوتا ہے، اور فرق ضالہ اور کج طبع افراد محکمات سے آنکھیں بند کر کے متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور آیات متشابہات میں واردالفاظ ''استوی، ید، ساق وغیرہ'' کو ظاہری معنی پر محمول کر کے اپنے فاسد عقائد ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حق تعالیٰ شانہ نے ''واما الـذین فی قلوبهم زیغ الخ (۲)'' میں ایسے ہی لوگوں کی مذمت فرمائی ہے، اور اس حدیث میں بھی ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا گیا کہ ان سے علیحدہ رہو، کہیں یہ تمہیں فتنہ میں مبتلا نہ کردیں۔

سوال: حضرت ابن عباسؓ اور امام غزالیؒ وغیرہ اس کے قائل ہیں کہ راسخین فی العلم اور علماء حقہ متشابہات کے معنی جانتے ہیں، اسی لئے یہ حضرات آیت بالا میں بجائے إلا اللـه کے **والـراسـخـون فی العلم**، پر وقف کرنے کے قائل ہیں، پھر یہ کہنا کیسے درست ہے کہ متشابہات کے معنی کسی کو معلوم نہیں؟

جواب: اوپر لکھا جاچکا کہ متشابہ وہ ہے جس کے معنی جزماً کسی کو معلوم نہ ہوں، ان حضرات نے متشابہات کے حتمی اور یقینی طور پر کوئی معنی بیان نہیں فرمائے، بلکہ ظن کے درجہ میں متشابہات کی تاویل بیان کی ہے، تاکہ فرقِ ضالہ آیات متشابہات کو ظاہر پر محمول نہ کرسکیں، اور مقصود ان حضرات کا بھی یہ بتانا ہے کہ نصوص متشابہ کے ظاہری معنی مراد لینا درست نہیں ہیں، متشابہات کو ظاہر پر محمول کر کے فاسد عقائد کو ثابت کرنا کجرو اور زیغ وضلال والے لوگوں کا شیوہ ہے۔(۳)

۱۴۴ / ۱۳: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: هَجَّرْتُ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا، قَالَ: فَسَمِعَ اَصْوَاتَ رَجُلَيْنِ اِخْتَلَفَا فِيْ آيَةٍ، فَخَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ

(۱) معارف القرآن ۲ / ۳۳ ط: مکتبہ نعیمیہ دیوبند.

(۲) من سورۃ آل عمران: ۷.

(۳) المرقاۃ ۱ / ۳۵۴.

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْرَفُ فِيْ وَجْهِهِ الْغَضَبُ، فَقَالَ: "إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِاخْتِلافِهِمْ فِيْ الْكِتَابِ" (رواه مسلم)(١)

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ: میں ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ظہر کے وقت حاضر ہوا، حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شخصوں کی آوازیں سنیں جو ایک (متشابہ) آیت میں اختلاف کر رہے تھے (یعنی اس کے معنی میں جھگڑ رہے تھے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تشریف لائے اس وقت آپ کے چہرۂ مبارکہ پر غصہ کے آثار نمایاں تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سے پہلے کے لوگ کتابِ الٰہی میں اختلاف کرنے کی وجہ سے ہی ہلاک ہوئے ہیں۔ (مسلم)

تشریح حدیث

متشابہات کے بارے میں رائے زنی ہلاکت کا سبب:

اس حدیث پاک میں بھی یہی بیان ہے کہ متشابہات کے بارے میں اختلاف اور ان سے استدلال درست نہیں کیونکہ اس طرح کے اختلافات سے تفسیر بالرائے کا دروازہ کھلے گا۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ: ظہر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مجلس ہوتی، بہت سے صحابہ ظہر سے پہلے ہی آجایا کرتے تھے تاکہ ظہر سے پہلے بھی اگر کوئی بات ارشاد فرمائیں تو اس سے بھی محرومی نہ رہے، عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں ایک دن میں ظہر سے پہلے آگیا، میں نے دو شخصوں کو سنا کہ وہ ایک آیت کے بارے میں اختلاف کر رہے تھے، بعض نے کہا کہ وہ آیت متشابہ تھی، اور بعض نے کہا کہ وہ کسی آیت کی تفسیر اور معنی کے بارے میں اختلاف کر رہے تھے، دونوں میں سے جس کے جو سمجھ میں آرہا تھا وہ کہہ رہا تھا، ظاہر ہے کہ یہ تفسیر بالرائے کی صورت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجرۂ مبارکہ سے نکلے تو آپ کے چہرے پر غضب کے آثار تھے، آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ اللہ کی کتاب میں اختلاف کرنے کی وجہ سے ہی ہلاک ہوئے ہیں، مطلب یہ تھا کہ یہ چیز تمہارے لئے بھی ہلاکت اور اللہ کے غضب کے نزول کا سبب ہو سکتی ہے، لہٰذا اس سے بچا جائے۔

(١) أخرجه مسلم في العلم، باب النهي عن اتباع متشابه القرآن ٢/ ٣٣٩.

یہاں آیت متشابہ کا اختلاف مراد ہے یا معنی میں تفسیر بالرائے کے طور پر اختلاف مراد ہے ،اسی کو دینی ہلاکت کا سبب قرار دیا گیا ہے، فروع دین کے استنباط کے لئے ائمہ مجتہدین کا جو اختلاف ہوتا ہے وہ مراد نہیں ہے، اس کو تو حدیث میں رحمت قرار دیا ہے اور صحابہ کے زمانہ سے ابتک اس کے جواز پر امت کا اجماع چلا آرہا ہے۔ (۱)

هـجّـرت : تہجیر سے ماضی کا صیغہ ہے، تہجیر کے معنی ہیں: ہاجرہ یعنی سخت گرمی میں جانا، اسی سے ''**هجيرة**'' ہے، جس کے معنی ظہر کی نماز کے ہیں۔ (۲)

۱۴۵ / ۱۴ : وَعَنْ سَعْدِ بنِ اَبِیْ وَقَّاص ؓ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ أَعْظَمَ الْمُسْلِمِيْنَ فِیْ الْمُسْلِمِيْنَ جُرْماً مَنْ سَأَلَ عَنْ شَیْءٍ لَمْ يُحَرَّمْ عَلَى النَّاسِ، فَحُرِّمَ مِنْ أَجْلِ مَسْأَلَتِهٖ"(متفق عليه)(۳)

تـرجـمـه: حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ شخص ہے جس نے کسی ایسی چیز کا سوال کیا ہو جو حرام نہ تھی مگر اس کے سوال کرنے سے وہ حرام ہوگئی'' (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

احوال سعد بن ابی وقاص:

جلیل القدر صحابی ہیں، ابووقاص کا نام: مالک بن وہیب الزہری القرشی ہے، حضرت سعدؓ قدیم الاسلام صحابی ہیں، ۱۷ سال کی عمر میں مشرف باسلام ہوئے اور ایک قول میں تیسرے نمبر پر اسلام لانے والے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ کے ماموں ہیں، عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، اور کثیر الروایۃ اصحاب میں سے ہیں، انھوں نے ہی اسلام میں سب سے پہلے تیر چلایا اور کسی کافر کو سب سے پہلے زخمی بھی انھوں نے ہی کیا، جس کا واقعہ یہ پیش آیا کہ یہ مکہ مکرمہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے، کچھ

(۱) المرقاة ۱ / ۳۰۴.
(۲) طيبي ۱ / ۳۴۵، وفتح الإله ۱ / ۵۶۳.
(۳) أخرجه البخاري في كتاب الاعتصام، باب مايكره من كثرة السؤال الخ ۲ / ۱۰۸۲، برقم ۶۹۹۶.
ومسلم في الفضائل، باب توقيره صلى الله عليه وسلم وترك اكثاره سؤاله عما لاضروره إليه ۲ / ۲۶۲.

مشرکین آئے اور جھگڑ نے لگے، انہوں نے ان میں سے ایک کے اونٹ کی ہڈی ماری جس سے وہ زخمی ہوگیا، حضور صلی اللہ علیہ سلم نے ان کے لئے دو دعائیں کیں: اَللّٰهُمَّ سَدِّدْ سَهْمَهُ وَأَجِبْ دَعْوَتَهُ کہ انکے نشانے کو درست کردے اور ان کی دعا قبول فرما، یہ دونوں دعائیں قبول ہوئیں، ان کا نشانہ نہایت درست ہوتا اور مستجاب الدعوات بھی تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے فداہ ابی وأمی فرمایا ہے، چار صحابہ بہادر اور دلیر شمار ہوتے تھے، جن میں سے ایک یہ تھے اور باقی تین حضرت عمرؓ، علیؓ اور زبیرؓ تھے، حضرت سعد ہی اصل فاتح فارس ہیں، فارس میں ایران، عراق، افغانستان وغیرہ علاقے آتے تھے، ۵۵ھ میں مقام عقیق میں انکا کا انتقال ہوا، وہاں سے مدینہ منتقل کیا گیا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ (۱)

بے جا سوال کی ممانعت:

اس حدیث میں بے جا سوال کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، اور کہا گیا ہے کہ جس بات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سکوت کریں اس کے بارے میں بلاضرورت سوال نہیں کرنا چاہئے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ جب امت اپنے نبی سے بے جا سوال کرتی ہے تو اس کے متعلق سخت حکم نازل کردیتے ہیں، جیسے بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا بقرہ کے بارے میں کہ وہ جیسا چاہے بقرہ ذبح کردیتے کام چل جاتا، مگر انہوں نے سوال درسوال کئے تو اللہ تعالیٰ بھی معاملہ سخت کرتے رہے، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کی فرضیت بیان کی، اقرع بن حابسؓ نے سوال کرلیا کہ کیا حج ہر سال فرض ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال کرنا فرض ہوجاتا، جو تمام امت کے لئے سخت پریشانی کا سبب ہوتا، تو سوال ایک شخص کرتا ہے مگر حکم سب کے لئے ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے سب کو مشقت پیش آتی ہے لہٰذا بے جا سوالات نہیں کرنے چاہئیں۔

بے جا سوال کی کچھ مثالیں:

بے جا سوال میں یہ بھی داخل ہے کہ: جس چیز کی تحقیق کے ہم مکلّف نہیں اس کی تحقیق میں پڑنے لگیں، مثلاً دسترخوان پر داعی سے پوچھنے لگیں کہ کیا کام کرتے ہو؟ کس طرح کے مال سے دعوت کی ہے؟

(۱) الاصابہ ۲/ ۳۲۴ – ۳۲۶ ط: در الفکر بیروت.

یا بازار میں دوکاندار سے پوچھنے لگیں کہ مال چوری کا ہے یا کیسا ہے وغیرہ؟ یہ درست نہیں، یہ سوچنا چاہئے کہ جب مسلمان ہے تو حلال مال سے ہی دعوت کرے گا، اور حلال مال ہی فروخت کرے گا۔

علماء نے لکھا ہے کہ سوالات کی تین قسمیں ہیں: (۱) وہ سوال جو طلب حق کے لئے ہو، (۲) وہ سوال جو عمل نہ کرنے کے قصد سے ہو، (۳) وہ سوال جو بے فائدہ اور فضول ہو، حدیث میں دوسرے اور تیسرے قسم کے سوالات کی ممانعت ہے، پہلی قسم کے سوالات کی ممانعت نہیں، مگر اس میں بھی موقع، محل اور مسئول کی طبیعت ومزاج کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

١٤٦/١٥: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ: رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "يَكُوْنُ فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ يَأْتُوْنَكُمْ مِنَ الْأَحَادِيْثِ بِمَالَمْ تَسْمَعُوْا أَنْتُمْ وَلَا آبَاؤُكُمْ، فَإِيَّاكُمْ وَإِيَّاهُمْ، لَا يُضِلُّوْنَكُمْ وَلَا يَفْتِنُوْنَكُمْ" (رواه مسلم) (۱)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے "کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ آخری زمانہ میں ایسے (فریب دینے والے) جھوٹے لوگ ہوں گے جو تمہارے پاس ایسی حدیثیں لائیں گے جنہیں نہ تم نے سنا ہوگا اور نہ تمہارے آباء نے سنا ہوگا اس لئے ان سے بچو اور ان کو اپنے آپ سے بچاؤ تا کہ وہ تمہیں گمراہ نہ کریں اور فتنہ میں نہ ڈالیں"

تشریح حدیث

اخیر زمانہ میں جھوٹی احادیث اور غیر مستند باتوں کا شیوع:

ماقبل سے اعتصام بالسنۃ کی روایات کا سلسلہ اور اس کی ترغیب چلی آرہی ہے، تفصیل بتائی گئی کہ حدیث کا اعتصام اس وقت ہوگا جب کہ وہ صحیح اور معتبر ہو، اور اگر وہ موضوع ہو تو اس کا اعتصام نہیں ہوگا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخر زمانہ میں کچھ دجال وکذاب لوگ ہوں گے جو ایسی حدیثیں لائیں گے جن کو نہ تم نے سنا ہوگا اور نہ تمہارے آباء واجداد نے، ان سے تم دور رہو تا کہ گمراہ نہ ہو جاؤ، اس لئے حدیث نبوی میں حزم واحتیاط اور تحقیق وتفتیش ضروری ہے۔

فی آخر الزمان: اس سے مراد ہے: آخر زمان هذه الأمة، معلوم ہوا کہ دور صحابہ میں ایسے لوگ

(۱) أخرجه مسلم في المقدمة، باب النهي عن الرواية عن الضعفاء والاحتياط في تحملها ۱/۹.

نہیں ہوں گے۔ (۱)

دجالون: دجل سے ہے بمعنی تلبیس، یعنی باطل کو حق کی شکل میں پیش کرنا گویا کہ یہ خداعون کے معنی میں ہے۔ (۲)

من الأحاديث: اس میں دو احتمال ہیں: (۱) اس سے مراد عقائد باطلہ اور نظریات فاسدہ ہوں، اس وقت لفظ احادیث لغوی معنی میں ہوگا (۲) اس سے مراد احادیث نبویہ ہوں یعنی احادیث موضوعہ جن کو لوگوں نے گھڑا ہو۔ (۳)

اس سے معلوم ہوا کہ وضع حدیث حرام ہے اور امت کا اس پر اجماع ہے، البتہ فرقۂ کرامیہ اور بعض متصوفہ کا کہنا ہے کہ فضائل اعمال میں حدیث وضع کرنا جائز ہے لیکن علماء نے اس کی سختی سے تردید کی ہے اور علی الاطلاق وضع حدیث کو حرام قرار دیا ہے اور بعض نے تو ایسے شخص کو کافر کہا ہے جیسے علامہ جوینی وغیرہ۔ (۴)

دین مستند اور معتبر افراد سے سیکھیں:

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اخیر زمانہ میں دجال، کذاب اور غیر مستند افراد احادیث اور دین وشریعت کی تعلیم واشاعت کریں گے، اور جب وہ دجال، کذاب اور غیر مستند ٹھہرے تو دین کے نام پر بددینی پھیلائیں گے، امام مسلمؒ ہی نے ایک اثر ذکر کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے سمندر میں کچھ شیاطین قید کر رکھے ہیں، جو قرب قیامت وہاں سے نکل کر لوگوں کو قرآن سکھائیں گے، (۵) چنانچہ یہ فتنہ اب ظاہر ہو چکا ہے، ڈاکٹر ہو یا انجینئر سب قرآن وسنت کی من مانی تشریحات پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں، علامہ ابن سیرینؒ سے منقول ہے: ''**اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ**'' (۶) یعنی یہ علم شریعت

(۱) المرقاة ۱/۳۵٦.

(۲) المرقاة ۱/۳۵٦.

(۳) المفاتيح ۱/۲۵۲، والمرقاة ۱/۳۵۷.

(٤) مقدمة ابن الصلاح، النوع الحادی والعشرون، معرفة الموضوع، وتدريب الراوی للعلامة السيوطی مع شرحه تقريب النواوی ۳/٤٦٦، ت: محمد عوامة.

(٥) مسلم ۱/۱۰.

(٦) مسلم شريف، المقدمة، باب بيان أن الإسناد من الدين ۱/ ۱۱ والدارمي (٤۳۳ و٤۳۸)

دین ہے، لہٰذا غور کرلیا کرو کہ کس سے یہ علم دین حاصل کررہے ہو، مطلب یہ ہے کہ دنیا کا علم تو جس سے چاہے حاصل کرلو، اگر کسی غلط شخص سے بھی حاصل کیا تو نقصان صرف دنیا کا ہوگا، لیکن اگر علم دین کسی غلط اور غیر مستند شخص سے پڑھا تو آخرت برباد ہوگی، جس بربادی کی کوئی تلافی نہیں ہوسکے گی۔

١٤٧ / ١٦: وَعَنْـهُ قَالَ: كَانَ أَهْلُ الْكِتَابِ يَقْرَؤُوْنَ التَّوْرَاةَ بِالْعِبْرَانِيَّةِ، وَيُفَسِّرُوْنَهَا بِالْعَرَبِيَّةِ لأَهْلِ الإِسْلامِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لاتُصَدِّقُوْا أَهْلَ الْكِتَابِ وَلاتُكَذِّبُوْهُمْ، وَقُوْلُوْا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاأُنْزِلَ إِلَيْنَا" الآية، (رواه البخاری)(١)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھا کرتے تھے (جو یہود کی زبان ہے) اور مسلمانوں کے لئے اس کی تفسیر عربی زبان میں کیا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان کا یہ عمل دیکھ کر) صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے فرمایا "تم اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب" بلکہ صرف یہ کہو "ہم اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم پر نازل کی گئی ایمان لائے (آخر آیت تک)" (بخاری)

تشریحِ حدیث

کتب سابقہ پر ایمان اور ان کے اعتصام کی کیفیت:

اس حدیث کا ترجمہ (عنوان) کے پہلے جزء اعتصام بالکتاب سے تعلق ہے، کتاب سے قرآن کریم مراد ہے اس کا اعتصام ایمان وعمل دونوں لحاظ سے ضروری ہے، یہاں ضمناً کتبِ سابقہ کے اعتصام کی کیفیت بتائی گئی ہے کہ کتبِ سابقہ کا اعتصام ان پر اجمالاً ایمان لانے کے ذریعہ کرنا ہے، ان پر نہ تفصیلی ایمان کی ضرورت ہے نہ ان کے احکام پر عمل کی، کتبِ سابقہ کا کوئی خاص حصہ یا ان کا کوئی مضمون اگر کوئی تمہارے سامنے پیش کرے تو اس خاص حصہ کی نہ تصدیق کی جائے نہ تکذیب، حدیث کا مضمون یہ ہے کہ

(١) أخرجه البخاری فی ثلاثة مواضع: کتاب التفسیر، باب قول الله تعالیٰ: قولوا آمنا بالله وماانزل إلینا ٢/ ٦٤٤ برقم ٤٣٠ وأیضاً کتاب الاعتصام، باب لاتسئلوا أهل الکتاب عن شئ ٢/ ١٠٩٤ برقم ٧٠٦٥ .وأیضاً کتاب التوحید، باب مایجوز من تفسیر التوراة وکتب الله بالعربیة ٢/ ١١٢٥ برقم ٧٢٤١.

اہل کتاب اپنی کتاب کو عبرانی زبان میں پڑھتے اور عربی میں مسلمانوں کے لئے تفسیر وترجمانی کرتے تھے، مگر چونکہ توریت وانجیل میں وہ لوگ تحریف کر چکے تھے تو اس کا جو مضمون مسلمانوں کو سنا رہے ہیں معلوم نہیں کہ منزل من اللہ ہے یا محرف ہے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہ ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب، کیونکہ تکذیب کی صورت میں غیر محرف کی تکذیب ہوسکتی ہے اور تصدیق کی صورت میں محرف کی تصدیق ہوسکتی ہے، بس اس پر اجمالی ایمان لاؤ اور یوں کہو آمنا بالله الخ .

البتہ اس میں کچھ تفصیل ہے، وہ یہ کہ: اہل کتاب جو بیان کریں گے اس کی تین صورتیں ہیں: (۱) قرآن میں اس کی تصدیق کی گئی ہو، تو اس کا ماننا لازم ہے (۲) قرآن نے اس کی تکذیب کی ہو، تو ہمارے لئے بھی اس کی تکذیب ضروری ہے (۳) قرآن نے اس کی نہ تصدیق کی ہو اور نہ تکذیب، پس ہمارے لئے بھی ایسی باتوں کا یہی حکم ہے۔

کرشن وغیرہ کو نبی قرار دینے کا حکم:

یہی حکم اس صورت میں ہے جبکہ کوئی شخص قدیم زمانہ کی کسی شخصیت کو نبی قرار دے، جیسا کہ لوگ کرشن وغیرہ کے بارے میں کہتے ہیں، پس ہم ان کی نبوت کی نہ تصدیق کریں گے اور نہ تکذیب۔

۱۴۸ / ۱۷: **وَعَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِباً أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَاسَمِعَ" (رواه مسلم)**(۱)   **ترجمه**: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو (بغیر تحقیق کے) نقل کرے"

تشریح حدیث

ہر سنی ہوئی بات بیان کردینا بھی جھوٹ:

اس حدیث کا تعلق اعتصام بالسنۃ سے ہے، روایات واخبار میں حزم واحتیاط کا حکم دینا مقصود ہے، حدیث کا حاصل یہ ہے کہ: آدمی ہر سنی ہوئی بات کو بیان نہ کرے، کیونکہ آدمی جس طرح صحیح بات سنتا ہے اسی طرح بہت سی مرتبہ خلاف واقعہ اور جھوٹی باتیں بھی سننے میں آتی ہیں، ہر سنی ہوئی بات کو بیان کرنے میں

(۱) أخرجه مسلم في "المقدمة، باب النهي عن الحديث بكل ماسمع ۱/ ۸.

بہت سی جھوٹی باتیں بھی بیان ہوجائیں گی جس سے انسان جھوٹا شمار ہوگا، مطلب یہ ہوا کہ ایک شخص جھوٹا نہیں ہے لیکن اگر اس کے اندر یہ بات ہے کہ ہر سنی ہوئی بات کو بیان کرتا ہے تو اس سے وہ جھوٹوں کی فہرست میں داخل ہوجائے گا، اس لئے بغیر تحقیق کے کسی بھی بات کو بیان نہ کرے، بالخصوص حدیث نبوی میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

جب سے انٹرنیٹ اور واٹسپ وغیرہ کی بلا آئی ہے، تو بکثرت دیکھنے اور سننے میں آرہا ہے کہ لوگ اس میں ہر بات کو بلا تحقیق آگے بھیج دیتے ہیں تو ایسا کرنے والا بھی اس حدیث کی وعید میں داخل ہے۔

کفی بالمرء: اس میں باء زائد ہے اور یہ مفعول ہے، **فاعل:** **ان یحدث بکل ماسمع** ہے۔[1]

۱۴۹ / ۱۸: وَعَنِ ابنِ مَسْعُوْدٍؓ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ’’مَامِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ أُمَّته قَبْلِيْ إِلَّا كَانَ لَهُ فِيْ أُمَّته حَوَارِيُّوْنَ وَأَصْحَابٌ، يَأْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهِ، وَيَقْتَدُوْنَ بِأَمْرِهِ، ثُمَّ إِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَالَايَفْعَلُوْنَ، وَيَفْعَلُوْنَ مَالَايُؤْمَرُوْنَ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْإِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ‘‘(رواه مسلم) [2]

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ’’مجھ سے پہلے کسی قوم میں اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کے مددگار اور ساتھی اس کی قوم میں سے نہ ہوں جو اس نبی کے طریقہ کو اختیار کرتے اور اس کے احکام کی پیروی کرتے تھے، پھر ان (مددگاروں) کے بعد ایسے ناخلف (نالائق) لوگ پیدا ہوتے جو لوگوں سے ایسی بات کہتے جس کو خود نہ کرتے اور وہ کام کرتے جس کا انہیں حکم نہیں ملا تھا، لہٰذا تم میں سے جو شخص ان لوگوں سے اپنے ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن ہے، اور جو شخص ان لوگوں سے اپنی زبان سے جہاد کرے وہ مؤمن ہے اور جو شخص ان لوگوں سے اپنے دل سے جہاد کرے (ان کے فعل کو دل سے برا سمجھے) وہ بھی مومن ہے اور اس کے علاوہ (یعنی جو شخص ان کے خلاف اتنا بھی نہ کر سکے) اس میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہیں ہے‘‘ (مسلم)

(۱) المرقاة ۱ / ۳۵۸.

(۲) أخرجه مسلم في الإيمان، باب بيان كون النهي عن المنكر الخ ۱ / ۵۲.

تشریح حدیث

دین میں بگاڑ پیدا کرنے والوں کا تعاقب ضروری:

اس حدیث میں اعتصام بالسنہ کا بیان ہے کہ مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ نے مبعوث کیا تو اسکی امت میں کچھ خاص مددگار ہوتے تھے جو اس نبی کے طریقوں اور سنن پر اہتمام کے ساتھ عمل پیرا ہوتے۔

حدیث کا مضمون یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کو چونکہ نبی سے کام لینا منظور ہوتا ہے اس لئے اس کی امت اور قوم میں اس کے کچھ معاون و مددگار پیدا فرما دیتا ہے جو اس نبی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس کے مقصد و مشن کو آگے بڑھاتے ہیں، اس کے بعد امت میں کچھ بیہودہ لوگ پیدا ہوجاتے ہیں جو اپنے آپ کو ان بڑوں کا جانشین بتاتے ہیں، جبکہ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے ایسی بات کہتے ہیں جس پر خود عمل پیرا نہیں اور وہ کام کرتے ہیں جس کا ان کو حکم نہیں دیا گیا، یہ برے جانشین ہیں، حدیث کا منشا یہ ہے کہ میری امت میں بھی کچھ لوگ ایسے ہی بیہودہ ہونگے، ان نااہلوں کی بیخ کنی اور ان کی اصلاح کی کوشش ہر امتی پر لازم ہے، جو شخص ان سے ہاتھ سے مقابلہ پر قادر ہو وہ ہاتھ سے مقابلہ کرے، جو زبانی سے ان کے منکر کو روک سکتا ہو وہ زبان سے روکے، اور جو اس پر بھی قادر نہ دیا گیا، نہ ہو وہ ان کے ناشائستہ اعمال کو دل سے برا جانے اور جو ان کی برائی کو دل سے بھی برا نہ سمجھے تو یہ کفر کی علامت ہے، **ولیس وراء ذلک من الایمان حبة خردل**۔

الا کان لہ فی امتہ حواریون: اس پر اشکال ہے کہ کچھ انبیاء ایسے بھی جن کا ایک بھی پیروکار و مددگار نہ تھا، جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ آپ کے سامنے پچھلی امتیں پیش کی گئیں تو بعض انبیاء ایسے تھے کہ ان کے ساتھ ایک دو لوگ تھے اور بعض کے ساتھ ایک بھی نہ تھا۔ (۱)

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کلام اکثر واغلب پر محمول ہے، اکثر انبیاء کے کچھ نہ کچھ تبع ہوتے ہیں۔

''**حواریون**'' یہ لفظ **بتشدید الیاء وبتخفیف الیاء** دونوں طرح مستعمل ہے، یہ ''حور'' سے مشتق ہے بمعنی سفید و گورا رنگ، حضرت عیسیٰ پر بنی اسرئیل کے چند نوجوان ایمان لائے یہ یا تو شہزادے تھے اور سفید کپڑے پہنا کرتے تھے اس لئے ان کو حواری کہا گیا، اور یا یہ دھوبی تھے، لوگوں کے کپڑے صاف

(۱) مسند أبی عوانہ ۱/ ۸۵.

کرتے تھے اس وجہ سے حواری کہا گیا، یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کیا کرتے تھے اس لئے یہ لفظ انصار کے معنی میں ہوا یہاں یہی معنیٰ مراد ہیں، حواری کا لفظ حضرت عیسیٰ کے ساتھیوں کا لقب تھا جیسے صحابی واصحاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو کہاجاتا ہے اس کے بعد ہر نبی کے ساتھیوں کو حواری کہاجانے لگا۔

خلوف: یہ خلف بسکون اللام کی جمع ہے، بمعنی بُرا جانشین، جیسے عدول عدل کی جمع ہے، قرآن کریم میں ہے "فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ الآیۃ"(۱) اور خلف بفتح اللام اس کے معنی ہیں: اچھا جانشین، اس کی جمع اَخلافٌ ہے۔(۲)

"یقولون مالایفعلون" کا صحیح مفہوم ومطلب:

یقولون مالایفعلون: یہ جملہ قرآن کریم میں بھی ہے، اس سے بعض لوگ استدلال کرتے ہیں کہ جس بات پرعمل نہ ہو اس کو دوسروں کو بھی نہ کہاجائے، مگر یہ استدلال غلط ہے، کیونکہ اس کا حاصل تو یہ ہوا کہ نہ عمل کرو اور نہ کہو، اس کا صحیح مفہوم حضرت تھانویؒ نے بیان کیا ہے کہ یہ دعوی کی مذمت وممانعت ہے نہ کہ دعوت کی، یعنی جو کام کرتے نہیں اس کا دعوی مت کرو کہ ہم اس کو کرتے ہیں، مثلاً تہجد پڑھتے نہیں اور کہے کہ پڑھتے ہیں، یہ مراد نہیں کہ جو خود تہجد نہ پڑھے وہ دوسروں کو تہجد کی ترغیب بھی نہ دے۔

فھو مؤمن: اس کی تنوین برائے تنویع ہے اور مطلب یہ ہے کہ آخری شخص مؤمن تو ہے لیکن اس کا ایمان پہلے دونوں کے مقابلہ میں کمزور درجہ کا ہے۔

ولیس ذلک من الایمان حبة خردلٍ: تیسرے درجہ سے کم کی صورت میں ایمان کی نفی اس لئے فرمائی کہ اس نیچے کا درجہ معاصی کو برا نہ جاننا ہے اور معاصی کو برا نہ جاننا اور ان کو اچھا سمجھنا نصوص کا انکار ہے جس کا کفر ہونا ظاہر ہے۔(۳)

۱۵۰/۱۹: وَعَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ دَعَااِلٰی هُدیً کَانَ لَهٗ مِنَ الْأَجْرِمِثْلُ أُجُوْرِمَنْ تَبِعَهٗ، لَایَنْقُصُ ذٰلِکَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَیْئاً وَمَنْ دَعَااِلٰی ضَلَالَةٍ کَانَ عَلَیْهِ مِنَ الْإِثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ تَبِعَهٗ، لَایَنْقُصُ ذٰلِکَ مِنْ

(۱) من سورة مریم: ۵۹.
(۲) اللمعات ۱/۴۷٤.
(۳) طیبی ۱/۳۵۰.

آثَامِهِمْ شَيْئاً"(رواه مسلم)(۱)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: ''جس شخص نے (کسی کو) ہدایت کی طرف بلایا تو اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا اس کو جواس کی پیروی کریگا،اوران کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی، اور جوکوئی کسی کوگمراہی کی طرف بلائے گا تو اس کو اتنا ہی گناہ ہوگا جتنا اس کو ہوگا جواس کی اطاعت کرے گا اوران کے گناہوں میں سے کچھ کم بھی نہ ہوگا''(مسلم)

تشریح حدیث

اچھے کام کی دعوت کا ثواب اور برے کام کی دعوت کا گناہ:

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جوشخص ہدایت کے کسی عمل کی طرف لوگوں کو دعوت دے تو اس کی دعوت کے نتیجہ میں جتنے لوگ بھی اس ہدایت کے کام کوکریں گے جتنا اجران کو ملے گا اتنا ہی اجر وثواب تنہا دعوت دینے والے کو ملے گا، کیونکہ ان لوگوں کے عمل کے لئے اس کی دعوت سبب بنی، اگر یہ دعوت نہ دیتا تو وہ اس ہدایت کے کام کو اختیار نہ کرتے اوران عمل کرنے والوں کے اپنے اجر میں بھی کوئی کمی نہیں کی جائے گی، یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ ان عاملین کے اجر میں سے تھوڑی تھوڑی کمی کرکے داعی کو اجر دیا جائے، بلکہ ان عاملین کے مجموعی اعمال کے برابر داعی کومستقل اجر ملے گا، یہی حال گناہ کے کام کا ہے کہ جوشخص برائی کی طرف رہنمائی کرے اور برائی کا ذریعہ بنے تو جتنا گناہ برائی کرنے والوں کو ہوگا اتنا ہی گناہ تنہا سبب اور ذریعہ بننے والے کو ہوگا، اوراس کو بھی گناہ کرنے والوں کے برابر مستقل گناہ ہوگا اور برائی کرنے والوں کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

حضرت شیخ زکریاؒ نے اوجز المسالک میں اس روایت سے استنباط کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہرطبقہ میں متقدمین کو متاخرین پرفضیلت ہوتی ہے کیونکہ ماقبل والوں کو اپنے مابعد کے لوگوں کی نیکیوں کا ثواب بھی ملتا ہے کیونکہ مابعد والوں کے حسنات کا ذریعہ ماقبل کے لوگ ہی ہوتے ہیں۔(۲)

(۱)أخرجه مسلم فى العلم، باب من سن سنة حسنة اوسيئة الخ۲ / ۳۴۱.

(۲)أوجزا لمسالک و كذا فى المرقاة ۱ / ۳۶۱، لفظه : وبه يعرف فضل المتقدمين على المتأخرين فى كل طبقة.

برے کام کا موجد وداعی اگر توبہ کرلے؟

ملاعلی قاریؒ نے ابن حجر مکی کے حوالہ سے یہاں یہ بحث ذکر کی ہے کہ اگر گناہ کا موجد وداعی گناہ سے توبہ کرلے تو اس کی توبہ کے بعد جو لوگ اس گناہ میں مبتلا رہیں گے تو ان بعد والوں کے گناہ کے بقدر پھر بھی اس کو گناہ ملے گا یا نہیں؟

ابن حجر مکیؒ کا رجحان یہ ہے کہ توبہ کے بعد بھی اس کو گناہ ملتا رہے گا لیکن ملاعلی قاریؒ نے ان کی رائے کے برخلاف اپنا رجحان یہ بتایا کہ توبہ کے بعد یہ شخص گناہ گاروں کا شریک نہیں سمجھا جائے گا؛ کیونکہ حدیث شریف میں ہے "التائب من الذنب کمن لاذنب له[1]" نیز بہت سے لوگوں نے اسلام سے پہلے گمراہی کی بہت سی چیزیں ایجاد کی تھیں مگر ایمان قبول کر لینے کے بعد ان کو ہر قسم کے گناہوں سے پاک قرار دیا گیا اور اسلام کی وجہ سے تمام گناہوں کے معاف ہونے کی ان کو بشارت سنائی گئی: "ان الاســـلام یهدم ماکان قبله"[2]

۱۵۱ / ۲۰: وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "بَدَأَ الإِسْلَامُ غَرِيْباً، وَسَيَعُوْدُ كَمَابَدَأَ، فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ"(رواه مسلم)[3]

تـرجـمـه: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اسلام غربت میں شروع ہوا اور عنقریب لوٹے گا اسی حالت کی طرف جس حالت میں شروع ہوا لہٰذا غرباء کے لئے خوشخبری ہے" (مسلم)

تشریح حدیث

اسلام کا ابتدائی وآخری دور اور اس میں اسلام پر قائم رہنے والوں کی فضیلت:

اس حدیث میں اسلام کے ابتدائی دور اور آخری دور کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ اسلام غربت کی حالت

(۱) رواه ابن ماجه في كتاب الزهد، باب ذكر التوبة ٣١٣ (٤٢٥٠)

(۲) فتح الإله لابن حجر مكي ١ / ٥٧١، والمرقاة ١ / ٣٦١، وقد تقدم هذا الحديث في كتاب الايمان، قبيل الفصل الاول.

(۳) أخرجه مسلم في الايمان، باب بيان أن الإسلام بدأغريبا وسيعود غريباً ١ / ٨٤.

میں شروع ہوا اور اخیر دور میں پھر غربت کی حالت کی طرف لوٹ جائے گا، غربت کے ان دونوں ادوار میں جو افراد اسلام پر قائم اور جمے رہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان غرباء کے لئے خوشخبری اور پیغام مسرت ورضا ہے۔

غربت کی دو قسمیں ہیں (۱) غربت الانصار (۲) غربت المال، غربت الانصار سے مراد جس کے یار ومددگار نہ ہوں، اور غربت المال سے مراد جس کے پاس مال واسباب نہ ہوں، یہاں غربت کی دونوں قسمیں مراد ہیں، ابتدامیں اسلام کے چند ماننے والے تھے، ان کے نہ یار ومددگار تھے نہ کوئی ان کی پشت پناہی کرنے والا تھا، نیز وہ نادار اور تنگدست تھے، اس کے بعد اسلام پھیل گیا، مشرق سے مغرب تک اسلام کا ڈنکا بجا، دنیا کے وسائل اور مال واسباب بھی مسلمانوں کا مقدر بن گئے، حتی کہ روم وفارس کی حکومتیں اور ان کی دولت صحابہ کے قدموں میں آ گئیں اور تمام دنیا اسلام اور مسلمانوں پر رشک کرنے لگی، اخیر دور میں اس میں پھر کمی واقع ہوگی اور اسلام کے ماننے والے بے یار ومددگار اور غریب ونادار رہ جائیں گے جس طرح اول زمانہ میں تھے، لیکن ان حالات میں بھی ان کی استقامت میں کمی نہ آئے گی اور وہ اسلام ودین کی حفاظت میں کسی طرح کی مداہنت برداشت نہیں کریں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کو خوشخبری دی: فطوبی للغربا۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ غریب کے معنی اجنبی کے ہوں یعنی اعمالِ اسلام کو شروع میں اجنبی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا، جس کی وجہ سے صحابہؓ نماز بھی چھپ کر پڑھتے تھے، لوگ بیٹھ کر پیشاب کرنے کو معیوب سمجھتے تھے وغیرہ، ہر طرف اجنبیت وبے گانگی تھی، آخر دور میں یہی صورت حال لوٹ آئے گی پس اس وقت کے جو مسلمان ایسے حالات میں اسلام پر قائم رہیں گے اور اعمال اسلام انجام دیں گے ان کے لئے خوشخبری ہے۔

''بدأ'': اس کو مہموز اللام اور ناقص دونوں طرح ضبط کیا گیا ہے، ''للغربا'': یہ ''غریب'' کی جمع ہے، اس سے مراد ہے اسلام کے دورِ غربت میں اس پر قائم رہنے والے، ''طوبیٰ'': اسم تفضیل مؤنث ہے بمعنی خوشخبری اور خوش بختی۔

۱۵۲/ ۲۱: وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ الإِيْمَانَ لَيَأْرِزُ إِلَى الْمَدِيْنَةِ كَمَا تَأْرِزُ الْحَيَّةُ إِلَى جُحْرِهَا" (متفق عليه) (۱)

(۱) أخرجه البخاري في كتاب فضائل المدينه، باب الإيمان يأرز إلى المدينه ۱/ ۲۵۲ برقم ۱۸۳۸.
ومسلم في الإيمان (۱/ ۵٤) باب بيان ان الإسلام بدأغريبا.

وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ أَبِيْ هُرَيْرَةَ: "ذَرُوْنِي مَاتَرَكْتُكُمْ"فِيْ كِتَابِ الْمَنَاسِكِ، وَحَدِيْثَيْ مُعَاوِيَةَ وَجَابِرٍ: "لايَزَالُ مِنْ أُمَّتِيْ" وَ"لايَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي"فِيْ بَابِ:ثَوَابِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ، إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالىٰ.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا:''ایمان مدینہ کی طرف اس طرح سمٹ آئے گا جس طرح سانپ اپنے بل کی طرف سمٹتاہے'' (بخاری ومسلم)

اورحضرت ابوہریرہؓ کی حدیث:''**ذرونی ماترکتم**''ہم کتاب المناسک میں ذکرکریں گے نیزحضرت معاویہؓاورحضرت جابرؓکی حدیثیں:''**لایزال من أمتی الخ** اور **لایزال طائفة من أمتي**'' باب **ثواب هذه الأمة** میں ذکرکریں گےان شاءاللہ تعالیٰ۔

تشریح حدیث

مدینہ طیبہ؛ایمان واسلام کی پناہ گاہ:

اس حدیث پاک میں مدینہ طیبہ کی فضیلت کابیان ہے، اصولاً یہ روایت باب کے مناسب نہیں ہے اس لئے تاویل کی جائے گی کہ اسلام کاشیوع اورغلبہ مدینہ طیبہ سے ہواہے اوراسلام نام ہے کتاب وسنت دونوں کا،اس لحاظ سے باب سے مناسبت ہے۔

روایت کا مطلب یہ ہے کہ سانپ جب اپنے دشمن کا خوف محسوس کرتاہےتو تیزی سے اپنے بل میں گھس جاتاہے اسی طرح قرب قیامت میں جب مسلمانوں کوپریشان کیاجائے گا تو وہ فتنہ وفساد اورکفروشرک سے بچ کر مدینہ طیبہ میں پناہ لیں گے،بعض نے کہا کہ یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کے سلسلہ میں ارشادفرمائی تھی یعنی میرے مدینہ کی طرف ہجرت کے بعدتمام مسلمان مدینہ کی طرف سمٹ جائیں گے۔

لیأرز :لام تاکیدکاہےاور**یأرز**:ارز، أرزاً سے مضارع کا صیغہ ہے، جب سانپ اپنے بل میں واپس ہوجاتاہےتوکہاجاتاہے:''**أرزت الحيةُ الى جُحْرها**'' مرادی ترجمہ ہے:سمٹ جانا، پناہ پکڑنا، پناہ لینا۔

وسنذکر حدیث ابی هریرةؓ الخ: مصابیح السنۃ میں یہاں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث''**ذرونی**

ماتر کتکم ‘‘ اورحضرت معاویہؓ وجابرؓ سے منقول یہ دوحدیثیں: ’’لایزال من امتی ‘‘اور’’لایزال طائفة من امتی ‘‘ بھی مذکورتھیں، مگر مصنفؒ حدیث ابوہریرہؓ کو ’’کتاب المناسک‘‘ میں اورحضرت معاویہؓ وجابرؓ کی احادیث کو’’باب ثواب هذه الامة‘‘ میں ذکر کریں گے، کیونکہ ان کی مناسبت ان ابواب سے زیادہ ہے۔

الفصل الثانی

۱۵۳ / ۲۲: عَنْ رَبِيْعَةَ الْجُرَشِيِّ، قَالَ: أُتِيَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيْلَ لَهُ: لِتَنَمْ عَيْنُكَ، وَلْتَسْمَعْ أُذُنُكَ، وَلْيَعْقِلْ قَلْبُكَ، قَالَ: "فَنَامَتْ عَيْنِيْ، وَسَمِعَتْ أُذُنَايَ، وَعَقَلَ قَلْبِيْ" قَالَ: فَقِيْلَ لِيْ: سَيِّدٌ بَنىٰ دَاراً، فَصَنَعَ فِيْهَا مَأْدُبَةً، وَأَرْسَلَ دَاعِياً، فَمَنْ أَجَابَ الدَّاعِيَ، دَخَلَ الدَّارَ، وَأَكَلَ مِنَ الْمَأْدُبَةِ، وَرَضِيَ عَنْهُ السَّيِّدُ، وَمَنْ لم يُجِبِ الدَّاعِيَ لَمْ يَدْخُلِ الدَّارَ، وَلَمْ يَأْكُلْ مِنَ الْمَأْدُبَةِ، وَسَخِطَ عَلَيْهِ السَّيِّدُ"قَالَ: "فَاللّٰهُ السَّيِّدُ، وَمُحَمَّدٌ الدَّاعِيْ، وَالدَّارُالإِسْلَامُ، وَالْمَأْدُبَةُ الْجَنَّةُ"(رواه الدارمي)(۱)

ترجمہ: حضرت ربیعہ الجرشیؓ سے روایت ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضری دی گئی (فرشتے حاضر ہوئے) اورحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا(یعنی فرشتوں نے کہا) چاہئے کہ آپ کی آنکھیں سو جائیں اور آپکے کان سنیں اورآپ کا دل سمجھے،حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’میری آنکھیں سوگئیں اورمیرے کانوں نے سنا اورمیرے دل نے سمجھا، پھرآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے کہا گیا(یعنی مثال کے طور پرفرشتوں نے میرے سامنے بیان کیا) کہ ایک سردارنے گھربنایا اورکھانا تیارکیا پھرایک بلانے والے کو بھیجا(تا کہ وہ لوگوں کو بلائے)لہٰذا جس نے بلانے والے کی دعوت کوقبول کیا وہ گھرمیں داخل ہوا اوردسترخوان سے کھایا، اورسرداراس سے خوش ہوا، اورجس نے بلانے والے کی دعوت قبول نہ کی وہ نہ گھرمیں داخل ہوا اورنہ دسترخوان سے کھایا اورسرداراس سے ناراض ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۱)أخرجه الدارمی فی ’’المقدمة، باب صفة النبي صلی الله علیه وسلم فی الکتب قبل مبعثه ۱ / ۱۱ ،برقم ۱۱‘‘

''اس مثال میں سردار سے مراد: اللہ تعالیٰ شانہ ہیں، بلانے والے سے مراد: محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، گھر سے مراد: اسلام ہے، اور دسترخوان سے مراد جنت ہے'' (دارمی)

تشریحِ حدیث

احوال ربیعۃ الجرشی:

جُرش یمن کا قبیلہ تھا، جُرشی اسی کی طرف نسبت ہے، والد کا نام عمرو ہے اور بعض نے کہا کہ ''غاز'' ہے، حضرت معاویہ کے زمانے میں ملک شام کے قاضی اور بڑے فقیہ تھے، ابن ابی حاتم نے ان کے صحابی ہونے کا انکار کیا ہے، مگر راجح ہے کہ یہ صحابی ہیں، کماذکرہ المصنف فی الإکمال ۔۶۴ھ میں اُن کا انتقال ہوا۔(۱)

اس حدیث کا مضمون فصل اول میں آ چکا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ ملائکہ آئے تھے، انہوں نے اللہ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور جنت کی نعمتوں کی مثال بیان کی تھی، زیر نظر روایت میں یہی مضمون الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، یہاں الفاظ یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ چاہئے کہ آپکی آنکھ سو جائے اور کان سنے اور قلب سمجھے، ماقبل کے بہ نسبت یہاں تعبیر کچھ پیچیدہ ہے ماقبل میں یہ مضمون صیغۂ خبر (ان العین نائمۃ وغیرہ) کے ساتھ تھا جبکہ یہاں صیغۂ انشاء لایا گیا ہے البتہ معنیً بھی انشاء ہے یا نہیں؟ اس میں دو احتمال ہیں:

(۱) ایک یہ کہ جیسے لفظاً انشاء ہے معنیً بھی انشاء ہے اور خطاب آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعضاء سے ہے، مقصود یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام چیزوں سے صرف نظر کریں اور ذہن ودماغ کو حاضر کر کے ہماری طرف متوجہ ہوں، آنے والی مثال کو کان اچھی طرح سن لیں اور قلب اچھی طرح سمجھ لے، الحاصل مثال سمجھانے کے لئے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ کو طلب کیا جا رہا ہے۔

(۲) اور بعض نے کہا کہ یہ صیغہ گو لفظاً انشاء ہے لیکن معنیً خبر ہے کہ آپ کی آنکھ سوئی ہوئی ہے لیکن قلب بیدار ہے اور مثال کو سمجھ رہا ہے، پس یہ خبر ہے لیکن اس خبر کی صداقت کو بتلانے کے لئے انشا سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ کہ انشاء میں کذب کا احتمال نہیں ہوتا، یہی قول راجح ہے،(۲) اس صورت میں یہ حدیث

(۱) الإصابۃ ۲/ ۱۶۴–۱۶۵.

(۲) المرقاۃ ۱/ ۳۶۳.

پہلی حدیث کے ہم معنی ہوجائے گی۔

چند اشکال اور ان کا جواب:

اشکال: ماقبل میں یہ حدیث آئی اس میں ''دار'' کا مصداق جنت کو بتایا گیا تھا اور یہاں اسلام بتایا گیا ہے؟

جواب: یہ ہے کہ اسلام دخول جنت کا سبب ہے، یہاں سبب بول کر مسبب مراد لیا گیا ہے، لہذا دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔(۱)

اشکال: ماقبل میں ''مادبہ'' سے نعمائے جنت مراد تھیں اور یہاں خود جنت مراد ہے؟ یہ ماقبل کی روایت کے خلاف ہے۔

اسکا جواب یہ ہے کہ یہاں محل بول کر حال یعنی نعمائے جنت ہی کو مراد لیا گیا ہے اور بعض نے فرمایا کہ تمام جنت دسترخوان کے درجہ میں ہے، اس صورت میں بھی مراد نعماء جنت ہی ہوں گی۔(۲)

١٥٤ / ٢٣: وَعَنْ أَبِي رَافِعٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''لاأُلْفِيَنَّ أَحَدَكُمْ مُتَّكِأً عَلٰى اَرِيْكَتِهِ، يَأْتِيْهِ الْأَمْرُ مِنْ أَمْرِيْ مِمَّا أَمَرْتُ بِهٖ أَوْنَهَيْتُ عَنْهُ، فَيَقُوْلُ: لاأَدْرِيْ، مَاوَجَدْنَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ اتَّبَعْنَاهُ'' (رواه احمد،وأبوداود، والترمذي، وابن ماجه، والبيهقي في دلائل النبوة)(۳)

ترجمه: حضرت ابورافعؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کہ میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ اپنے مزین تخت پر سہارا لگائے ہوئے ہو، اور میرے ان احکام میں سے جن کا میں نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے کوئی حکم اس کے

(۱) طيبي ١ / ٣٥٥.

(٢) شرح المشكاة للطيبي ١ / ٣٥٥.

(٣) أخرجه أبوداود في كتاب السنة، باب في لزوم السنة ٢ / ٦٣٥، والترمذي في كتاب العلم، باب مانهي عنه أن يقال عند حديث النبي صلى الله عليه وسلم ٢ / ٩٥.

وابن ماجه، في كتاب السنة، المقدمه، باب تعظيم حديث الرسول صلى الله عليه وسلم ١ / ٣.

وأحمد ٦ / ٨، برقم ٢٣٩١٢.

والبيهقي في ''دلائل النبوة'' فصل في قبول الأخبار ١ / ٢٤.

پاس پہنچے، اور وہ اسے سن کر یہ کہدے کہ میں کچھ نہیں جانتا، جوکچھ ہم خدا کی کتاب میں پائیں گے بس اس کا اتباع کریں گے۔ (احمد، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی)

تشریح حدیث

احوال ابورافع:

ان کا نام اسلم ہے اور بعض نے کہا کہ ابراہیم ہے اور اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے، پہلے حضرت عباسؓ کے غلام تھے انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کردیا تھا، حضرت عباسؓ ایمان لائے تو اس کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ابورافع نے ہی کی اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد فرمایا لیکن اس کے باوجود وہ پوری زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتے رہے، اور ۳۵ھ میں حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت سے کچھ قبل ان کی وفات ہوئی۔ (۱)

اہل قرآن (منکرین حدیث) کی تردید:

اس حدیث میں منکرین حدیث کا رد ہے، حجیت حدیث کی بحث میں گذر چکا ہے کہ یہ فرقہ حدیث کے حجت ہونے کو تسلیم نہیں کرتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محض پیغام رساں کہتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطاع ومتبوع نہیں مانتا، یہ لوگ اپنے آپ کو ''اہلِ قرآن'' کا نام دیتے ہیں، جبکہ قرآن کریم سے ہی جابجا معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف سفیر اور پیغام رساں نہیں بلکہ آپ کو مستقل مطاع ومتبوع اور تشریع وقانون سازی کا اختیار دے کر مبعوث فرمایا گیا ہے، اگر آپ کی یہ حیثیت تسلیم نہ کی جائے تو سارا قرآن معطل ہوکر رہ جائے گا، اس لئے آپ علیہ السلام نے امت کو ایسے اشخاص سے باخبر کیا ہے کہ یہ درپردہ مکمل شریعت سے انکار اور اس کی تعمیل سے فرار ہے، کیونکہ احادیث قرآن کریم کی تفسیر بھی ہیں کہ قرآنی احکام پر عمل آوری کا طریقہ وکیفیت احادیث ہی کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے اور قرآن کریم کی تکملہ بھی ہیں کہ بہت سے احکام احادیث میں مذکور ہیں اور قرآن ان سے خاموش ہے، جیسا کہ آئندہ احادیث میں آرہا ہے۔

متكئا على أريكته: متکأ اسم فاعل ہے اتکاء باب افتعال سے، بمعنی ٹیک لگانا، اور ''اریکۃ'' بمعنی

(۱) الإصابہ ٦/ ۹۱.

تخت، مسہری، اہل عرب جوصاحبِ ثروت ہوتے تھے وہ ایک خیمہ لگاتے، اس میں ایک تخت سجاتے اوراس پرتکیہ لگاکرآرام کرتے اس جملہ میں اسی کا نقشہ کھینچا ہے، اور یہ کنایہ ہے عیش وعشرت سے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متکأ علی اریکته سے اس طرف اشارہ فرمایا کہ منکرین حدیث عموماً ان لوگوں میں سے ہونگے جودین سے غافل، عیش پرست اورآزادمزاج ہوتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کوان سے باخبرکرتے ہوئے بتایا کہ ان کا حال یہ ہوگا کہ ان کے پاس میراکوئی حکم پہنچے گاتووہ یوں کہیں گے کہ میں اس کونہیں جانتااورہم صرف قرآن کا اتباع کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا کہ تم ہرگز ایسانہ کرنا، اوران کی روش پرنہ چلنا۔

يأتيه الأمر: یہاں امرعام ہے، ماموارت کوبھی شامل ہے اورمنہیات کوبھی۔(۱)

۱۵۵ / ۲۴: وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْ كَرِبَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَلا إِنِّىْ أُوْتِيْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ، أَلايُوْشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلٰى أَرِيْكَتِهِ يَقُوْلُ: عَلَيْكُمْ بِهٰذَاالْقُرْآنِ، فَمَا وَجَدْتُمْ فِيْهِ مِنْ حَلالٍ فَأَحِلُّوْهُ، وَمَا وَجَدْتُمْ فِيْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ، وَإِنَّ مَاحَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ كَمَا حَرَّمَ اللّٰهُ، أَلا لايَحِلُّ لَكُمُ الْحِمَارُ الْأَهْلِيُّ، وَلاكُلُّ ذِيْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ، وَلالُقْطَةُ مُعَاهِدٍإِلَّا أَنْ يَسْتَغْنِىَ عَنْهَا صَاحِبُهَا، وَمَنْ نَزَلَ بِقَوْمٍ فَعَلَيْهِمْ أَنْ يَقْرُوْهُ فَإِنْ لَمْ يَقْرُوْهُ، فَلَهُ أَنْ يُعْقِبَهُمْ بِمِثْلِ قِرَاهُ" (رواه ابوداود، وروى الدارمي نحوه، وكذا ابن ماجة إلى قوله: "كماحرم الله")(۲)

ترجمہ: حضرت مقدام بن معدیکربؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: "آگاہ رہو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اوراس کے ساتھ اس کا مثل، خبردار! عنقریب اپنے مزین تخت پرپیٹ بھراایک شخص کہے گا کہ اس قرآن کواپنے اوپرلازم جانو (یعنی فقط قرآن پرعمل کرو) اورجوچیزتم قرآن میں حلال پاؤ اس کوحلال جانو اورجس چیزکوتم قرآن مین حرام پاؤ

(۱) اللمعات ۱ / ٤٨٠.

(۲) أخرجه ابوداود، كتاب السنة، باب في لزوم السنة ۲ / ٦٣٢ والترمذى، كتاب العلم، باب مانهي عنه أن يقال عند حديث النبي صلى الله عليه وسلم ۲ / ۹٥.

وابن ماجة، كتاب السنة، المقدمه، باب تعظيم حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم ۱ / ۳.

والدارمي ۱ / ۱٥۱ برقم ٥۹۲، المقدمه، باب السنة قاضية على كتاب الله.

اس کو حرام جانو، حالانکہ جو کچھ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام فرمایا ہے وہ اس کے مانند ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا، خبردار تمہارے لئے نہ پالتو گدھا حلال ہے اور نہ کچلی والے درندے، اور نہ تمہارے لئے معاہد (یعنی وہ قوم جس سے معاہدہ کیا گیا ہو) کا لقطہ حلال ہے، مگر وہ لقطہ حلال ہے جس کی پرواہ اس کے مالک کو نہ ہو، اور جو شخص کسی قوم کا مہمان ہو اس قوم پر لازم ہے کہ اس کی ضیافت کریں، اگر وہ ضیافت نہ کریں تو اس شخص کے لئے جائز ہے کہ وہ ضیافت کے بقدر ان سے حاصل کرلے'' (ابوداود، دارمی، اور ابن ماجہ نے **"کماحرم الله"** تک روایت کیا ہے)

تشریح حدیث

احوال مقدام بن معدیکرب:

ان کی کنیت ابوکریمہ ہے، اُن کا شمار اہل شام میں ہوتا ہے، بعض لوگوں نے ان سے کہا کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہیں کی، تو انہوں نے کہا کہ: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور آپ نے میرا کان بھی پکڑا تھا اور میں اپنے چچا کے ساتھ آپ کی خدمت میں پہنچا تھا اور آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے اس وقت ایک حدیث بھی سنائی تھی، ملک شام میں ہی ۸۷ھ میں وفات ہوئی اور خلق خدا نے آپ سے کافی فائدہ اٹھایا، آپ کی کل عمر مبارک ۹۱ سال ہوئی ہے۔(۱)

احادیث؛ قرآن کا مثل:

انی اوتیت القرآن ومثله معه: اس سے مراد احادیث ہیں، احادیث کو مثل قرآن کہا ہے اس کی کئی وجوہ ہیں:

(۱) وحی میں مماثلت مراد ہے کہ احادیث بھی قرآن کی طرح وحی کے ذریعے اتری ہیں، فرق یہ ہے کہ قرآن وحی جلی ہے اور احادیث وحی خفی، بایں معنی کہ ان کے صرف معانی اترے ہیں، ان معانی کو تعبیر کرنے کے لئے الفاظ کا انتخاب خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔(۲)

---

(۱) الإصابة ۵/۱۹۶۔

(۲) اللمعات ۱/۴۸۱۔

(۲)واجب العمل ہونے میں مماثلت مراد ہے کہ قرآن کے احکام کی طرح احادیث کے احکام بھی واجب العمل ہیں۔(۱)

الایوشک رجل شبعان: ''شبعان'' پیٹ بھرا آدمی، یہ کنایہ ہے مستغنی اور بدفہم ہونے سے کہ ایسے شخص کے صحیح بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔(۲)

احادیث نبویہ کے کچھ محرمات وممنوعات:

الالایحل لکم الحمار الأھلی: بہت سی چیزوں کی حرمت کا بیان قرآن میں نہیں ہے بلکہ حدیث میں ہے، انہی میں سے چند کا بیان یہاں کیا گیا ہے:

(۱)حمارِ اُہلی:

حمار کی دو قسمیں ہیں (۱)حمار وحشی (۲)حمار اہلی، پالتو گدھا جو بار برداری کے کام آتا ہے اس کو ''حمار اہلی'' کہا جاتا ہے اور وحشی سے مراد نیل گائے ہے، حمار اہلی ابتدا میں حلال تھا، فتح خیبر کے موقعہ پر اس کی حلت منسوخ ہوگئی، تفصیل آگے آئے گی۔

(۲)ذی ناب درندہ:

ولا کل ذی نــاب من السبــاع: ناب بمعنی نوکیلا دانت جسے کچلی کہتے ہیں، جانوروں میں جو دانتوں کے ذریعہ شکار کرتے ہیں جیسے شیر بھیڑیا، کتا وغیرہ سب حرام ہیں۔

(۳)لقطۂ معاہد

ولا لقطة معاهد: ''معاہد'' وہ شخص جس نے مسلمانوں سے معاہدہ کیا ہے اور مسلمانوں نے اس کو امن دے رکھا ہے، ''لقطہ'' کے معنی گری پڑی چیز، یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح خیبر کے موقع پر ارشاد فرمائی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہود کو جلاوطن کرنا چاہتے تھے مگر ان لوگوں نے درخواست کی اور یہ کہا کہ خیبر کے باغات اور یہاں کی اراضی کے آپ مالک ہوگئے ہیں، آپ ہمیں جلاوطن نہ کریں، ہم ان باغات واراضی میں عمل اور محنت کریں گے جو پیداوار ہوگی اس کا نصف آپ ہمیں دیدیں اور نصف آپ کا ہوگا، ہم

(۱)طیبي ۱/۳٥٦.

(۲)طیبي ۱/۳٥٦–۳٥۷.

مسلمانوں کے جان و مال سے کوئی تعرض نہ کریں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کی مصلحتوں کی وجہ سے انکی درخواست کو قبول فرمالیا، ان سے امن کا اور نصف پیداوار کا معاہدہ ہوگیا، اس معاہدہ کے بعد وہ معاہد (ذمی) ہوگئے، اس وقت ان کے مناسب حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ احکام بیان فرمائے، ایک حکم یہ بیان کیا کہ ان کا لقطہ تمہارے لئے حلال نہیں، الا یہ کہ وہ لقطہ معمولی چیز ہو، جیسے آج کل پچاس پیسے، ایک روپیہ وغیرہ، ایسی معمولی چیز کی تعریف (اعلان) واجب نہیں، پانے والا اس کو استعمال کرسکتا ہے، لقطہ کا مستقل باب مشکوۃ جلد اول کے اواخر میں آئے گا، وہاں لقطہ کے تفصیلی احکام ومباحث انشاء اللہ بیان ہوں گے۔

(۴) ضیافت کا وجوب:

ومن نزل بقوم فعلیھم ان یقروہ: یہ چوتھا حکم ہے کہ اگر کسی شخص کو کسی قوم کے یہاں ٹھہرنا پڑے تو اس قوم پر لازم ہے کہ اسکی ضیافت کریں اپنی وسعت کے بقدر، اگر ان لوگوں نے ضیافت نہیں کی تو مہمان کو اجازت ہے کہ اپنی ضیافت کے بقدر ان کے مال میں سے جس طرح چاہے چوری چھپ کے لے لے، اسی روایت کی وجہ سے حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور لیث بن سعدؒ اس کے قائل ہیں کہ مہمان کی ضیافت واجب ہے لیکن جمہور کے یہاں مستحب ہے واجب نہیں ہے،[۱] اور ان کی طرف سے اس روایت کے دو جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) یہ حدیث منسوخ ہے، ضیافت کے واجب ہونے کا حکم ابتداء اسلام میں تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے تو عرب کے قبائل آپ کے پاس آتے اور امن کا معاہدہ کرتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے معاہدہ کو قبول کرتے اور عموماً ان سے یہ شرط لگایا کرتے تھے کہ اگر میرے صحابہ کا تم پر سے گزر ہو تو تم ان کی ضیافت کرنا، چونکہ وہاں بازار وغیرہ نہ ہوتے تھے اس لئے آپ ان سے یہ شرط لگاتے، اس معاہدہ کی وجہ سے ان پر ضیافت واجب ہوجاتی، لہٰذا ضیافت نہ کرنے کی صورت میں اپنا حق لینے کی اجازت تھی، لیکن جب اسلام کا شیوع اور غلبہ ہوگیا اور باہم انسیت ومحبت قائم ہوگئی اور لوگ خود ہی ضیافت کا اہتمام کرنے لگے تو اس ضیافت کا وجوب منسوخ ہوگیا البتہ اس کا استحبابی حکم باقی رہا۔[۲]

(۲) یہ حکم مضطر پر محمول ہے کہ اضطرار کی صورت میں مہمان کی ضیافت واجب ہے، مہمان کے مضطر

(۱) المرقاۃ ۱/۳۶۸.

(۲) طیبی ۱/۳۵۷–واللمعات ۱/۴۸۳.

ہونے کے باوجود اگر میزبان ضیافت نہ کرے تو اس کے مال سے ضیافت کے بقدر لینا جائز ہے۔[1]

''یقروہ'' باب ضرب سے ہے قری یقری قِری بمعنی میزبانی کرنا ''قراہ'' اسی کا مصدر ہے۔

١٥٦ / ٢٥: وَعَنِ الْعِرْبَاضِ بنِ سَارِيَةَ قَالَ: قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: "أَيَحْسَبُ أَحَدُكُمْ مُتَّكِأً عَلٰى أَرِيْكَتِهِ يَظُنُّ أَنَّ اللّٰهَ لَمْ يُحَرِّمْ شَيْأً إِلَّا مَافِيْ هٰذَا الْقُرْآنِ؟ أَلَاوَإِنِّيْ وَاللّٰهِ قَدْ أَمَرْتُ وَوَعَظْتُ وَنَهَيْتُ عَنْ أَشْيَاءَ، إِنَّهَا لَمِثْلُ الْقُرْآنِ أَوْ أَكْثَرُ، وَإِنَّ اللّٰهَ لَمْ يُحِلَّ لَكُمْ أَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا بِإِذْنٍ، وَلَاضَرْبَ نِسَائِهِمْ، وَلَاأَكْلَ ثِمَارِهِمْ إِذَا أَعْطَوْكُمُ الَّذِيْ عَلَيْهِمْ" (رواه ابوداوٗد وفي إسناده: أشعث بن شعبة المصِّيصي، قدتكُلّم فيه)[2]

ترجمہ: حضرت عرباض بن ساریہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (خطبہ کے لئے) کھڑے ہوئے اورفرمایا: کہ کیا تم میں سے کوئی شخص اپنے مزین تخت پر تکیہ لگائے ہوئے یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہی چیزیں حرام کی ہیں جوقرآن میں ذکر کی گئی ہیں، خبردار! خدا کی قسم بلاشک میں نے بھی حکم دیا، میں نے بھی نصیحت کی اورمیں نے بھی منع کیا بہت سی چیزوں سے جومثل قرآن کے ہیں، بلکہ زیادہ ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے یہ تمہارے لئے حلال نہیں کیا کہ تم اہل کتاب کے گھروں میں اجازت حاصل کئے بغیر چلے جاؤ اورنہ تمہارے لئے ان کی عورتوں کا مارنا حلال ہے اورنہ تمہارے لئے ان کے پھلوں کا کھانا جائز ہے جبکہ وہ حق جوان پرواجب ہے اداء کردیں (ابوداود) اوراس کی سند میں اشعث بن شعبہ مصیصی ہیں جن کے بارے میں کلام ہے (کہ وہ ثقہ ہیں یانہیں)

تشریحِ حدیث

احوال عرباض بن ساریہ:

عرباض: عین کے کسرہ کے ساتھ ہے، کنیت ابونجیح ہے، جلیل القدرصحابی ہیں، چوتھے یاپانچویں نمبر پراسلام لائے، اصحابِ صفہ میں سے ہیں، اوربکائین میں سے ہیں یعنی اللہ کے اشتیاق میں بہت رونے

(١) المرقاة ١ / ٣٦٩.

(٢) أخرجه أبوداود، كتاب الخراج والإمارة والفيئ، باب في تعشير أهل الذمة إذا اختلفوا بالتجارة ٢ / ٤٣٢.

والے تھے، بڑھاپے میں کہتے تھے: ”کَبُرَسِنِّي وَوَهُنَ عظمي فاقبضني إليک“ کہ اے اللہ میری عمر زیادہ ہوگئی، ہڈیاں کمزور ہوگئیں، پس مجھے اپنے پاس بلالے، ۵۷ھ میں وفات ہوئی، آپ کی مرویات ۳۱ ہیں۔(۱)

احادیث کے بیان کردہ احکام قرآن سے بھی زائد:

إنها لمثل القرآن أو أكثر: احادیث کے احکام قرآن کے برابر ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ، مطلب یہ ہے کہ احکام احادیث اولاً قرآن کے احکام کے برابر تھے، لیکن ان میں روز بروز اضافہ ہورہا تھا اس لئے بہ حیثیت مجموعی حدیث کے احکام زیادہ ہوگئے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔

اہل کتاب کی املاک اور عورتوں کی حرمت:

وان الله لم يحل لكم ان تدخلوا بيوت الخ: پہلی حدیث کی طرح اس حدیث میں بھی اہل خیبر کے بعض احکام بیان فرمائے گئے کہ ان کی اجازت کے بغیر ان کے مکانات میں داخل نہ ہونا، ان کی عورتوں کو نہ مارنا، بعض نے کہا کہ یہ کنایہ ہے جماع سے کہ ان کی عورتوں سے جماع جائز نہیں،(۲) کیونکہ معاہدہ کی وجہ سے وہ بہ حکم ذمی ہوگئے، ان کی عورتوں پر باندی ہونے کا حکم نہ ہوگا، اسی طرح ان کے پھلوں کو نہ کھانا کیوں کہ حربی کا مال تو جائز ہے، لیکن یہ ذمی ہوگئے ہیں پس ان کا مال حلال نہ ہوگا، البتہ اگر وہ تمہارا حق نہ دیں جو معاہدہ کی وجہ سے ان پر واجب ہے تو اپنا حق بلا اذن لینا بھی جائز ہوگا۔

۱۵۷ / ۲۶: وَعَنْهُ: قَالَ: صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَوَعَظَنَامَوْعِظَةً بَلِيْغَةً، ذَرَفَتْ مِنْهَاالْعُيُوْنُ، وَوَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ، فَقَالَ رَجُلٌ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! كَأَنَّ هٰذِهٖ مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَأَوْصِنَا، فَقَالَ "أُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ، وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، وَإِنْ كَانَ عَبْداً حَبَشِياً، فَإِنَّهٗ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَى اِخْتِلافاً كَثِيْراً؛ فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ، تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْاعَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ؛ فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ

(۱) الإصابة ۳ / ۴۴۱–۴۴۲، المرقاة ۱ / ۳۶۹.
(۲) المرقاة ۱ / ۳۷۰.

بِـدْعَةٍ ضَـلالَةٌ"(رواه أحـمـد، وأبو داود، والترمذي، وابن ماجه، إلا أنهما لم يذكرا الصلاة)(۱)

تـرجـمـه: حضرت عرباض بن ساریہؓ سے مروی ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی اور پھر ہماری طرف متوجہ ہوکر بیٹھ گئے اور ہم کونہایت مؤثرانداز میں نصیحت کی کہ ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اوردلوں میں خوف پیدا ہوگیا، ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! (ایسا معلوم ہورہاہے) گویا یہ رخصت کرنے والے کی نصیحت ہے، لہٰذا ہم کومزید وصیت فرمادیجئے، آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تم کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور (امیر) کی بات سننے اوراطاعت کرنے کی وصیت کرتاہوں اگرچہ وہ (امیر)حبشی غلام ہو، کیونکہ تم میں سے جوشخص میرے بعدزندہ رہے گا وہ بہت اختلاف دیکھے گا پس تم پرلازم ہے کہ تم میرے اورہدایت یافتہ خلفاء راشدین کے طریقہ کو لازم پکڑواوراسے خوب مضبوطی سے پکڑواور دین میں نئی نئی باتیں پیداکرنے سے بچو، اس لئے کہ ہرنئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔(احمد، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ)مگرترمذی اورابن ماجہ نے اس روایت میں نماز پڑھنے کا ذکرنہیں کیا۔

تشریح حدیث

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بلیغ خطاب

صـلـى بـنـا رسول الله صلى الله عليه وسلم: ایک روز آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو نماز پڑھائی، بیہقی ومستدرک حاکم کی روایت میں ہے کہ وہ فجر کی نماز تھی(۲)"ذات یوم" کے لفظ سے بھی دن کا واقعہ ہونا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ یوم پرذات کا لفظ داخل ہوجائے تو لفظ"یوم" نہار کے معنی کے ساتھ خاص

(۱)أخـرجـه أبـوداود في كتاب السـنة، باب فى لزوم السنة ۲/۶۳۵، والتـرمـذي: في كتاب العلم، باب في الأخذبالسنة واجتناب البدع ۲/۹۶، وابـن ماجه:في كتاب السنة، المقدمة، باب اتباع سنة الخلفاء الراشدين ۱/۵. وأحمد۴/۱۲۶برقم ۱۷۱۸۲، ۱۷۱۸۴،۱۷۱۸۴.

(۲)السـنـن الكبرى للبيهقى ۱۰/۱۹۵ (۲۰۳۳۸)ط دار الـكـتـب الـعـلـمـيه بيروت والمستدرک للحاكم ۱/۱۷۴(۳۲۹)ط دار الكتب العلميه بيروت .

ہو جاتا ہے اور فجر کی نماز دن ہی کی نمازوں میں شمار ہے۔ (۱)

موعظة بليغة: قاضی بیضاویؒ نے فرمایا ہے کہ موعظۂ بلیغہ وہ ہے جس میں الفاظ کم اور معانی زیادہ ہوں (۲) علامہ تورپشتیؒ نے اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ صحیح نہیں، بلکہ موعظۂ بلیغہ وہ خطبہ ہے جو طویل ہو اور موثر ہو، اس لئے کہ قصیر بیان مؤثر نہیں ہوتا، (۳) ملاعلی قاریؒ نے فرمایا کہ موعظہ کے بلیغ ہونے کے لئے طویل ہونا ضروری نہیں، بہت سی مرتبہ وعظ کے چند جملے بھی موثر ہوتے ہیں جب وہ دل کی گہرائی سے نکلیں، لہٰذا قاضی بیضاوی کی بات بھی غلط نہیں ہے۔ (۴)

ذرفت منها العيون: "ذرفت" ذال معجمہ کے ساتھ ہے، یہاں ہندی نسخہ میں زاء معجمہ کے ساتھ لکھا ہے یہ غلط ہے، باب ضرب سے ہے بمعنی بہنا۔ (۵)

وجلت منها القلوب: "وجلت" وجل یوجل باب سمع سے ہے، بمعنی خوفزدہ ہونا۔ (۶)

موعظة مودّع: "مودع" اسم فاعل کا صیغہ ہے تودیع سے، بمعنی رخصت کرنا، مطلب یہ ہے کہ جب کوئی بڑا اپنے چھوٹے کو رخصت کرتا ہے تو اس چھوٹے کے مناسبِ حال تمام مفید اور کارآمد باتیں جامع اور مؤثر انداز میں اس کو بتادیتا ہے، اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت جامع اور مؤثر انداز اختیار فرمایا اسلئے صحابہ نے آپ سے مزید نصائح کی درخواست کی۔ (۷)

تقوی کی وصیت:

أوصيكم بتقوى الله الخ: تقوی کے تین درجے ہیں: (۱) **الاجتناب عن الشرك**، آدمی کفر وشرک سے بچے (۲) **التقوى عن المعاصي**، گناہوں سے بچنا (۳) **التقوى عما سوى الله** یعنی

(۱) المرقاة ۱/۱۰۷ و ۳۷۱.

(۲) تحفة الأبرار ۱/۱۳۷.

(۳) كتاب الميسر للتوربشتيؒ ۱/۸۸.

(٤) المرقاة ۱/۳۷۱.

(٥) المرقاة ۱/۳۷۱۔

(٦) المرقاة ۱/۳۷۱۔

(۷) اللمعات ۱/٤٨٦.

اللہ سے دل کو پھیرنے والی ہر چیز سے بچنا، پہلا تقوی عام مؤمنین کا ہے، دوسرا خواص کا ہے اور تیسرا اخص الخواص کا ہے۔ (۱)

سمع وطاعت کی تاکید:

السمع والطاعة: امیر کی بات سننا اور اس کی اطاعت کرنا اگر چہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، لیکن اطاعت جائز اور مباح امور میں ہوگی، معصیت میں کسی کی اطاعت درست نہیں "**لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق**"(۲)

سوال: حدیث شریف میں ہے "**الائمة من قريش**" کہ مسلمانوں کا امیر اور خلیفہ قریشی شخص ہونا چاہئے پھر عبد حبشی کا بادشاہ بننا کیونکر درست ہے اور اس کی اطاعت کیسے واجب ہوگی؟ اس کے دو جواب ہیں:

(۱) امیر سے خلیفۂ اکبر مراد نہیں بلکہ سریہ وغیرہ کا امیر ہونا مراد ہے وہ کوئی بھی ہوسکتا ہے۔

(۲) **حديث الائمة من قريش** حالت اختیاری پر محمول ہے اور مذکورہ روایت میں اضطراری حالت کا حکم بیان کیا گیا ہے، یعنی مسلمان جب اپنے اختیار سے کسی کو بادشاہ مقرر کریں تو قریشی کو مقرر کرنا چاہئے، اگر غیر قریشی خواہ عبد حبشی ہو قوت اور طاقت کے بل بوتے پر اقتدار پر قابض ہو جائے تو اس نے جو کیا اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے مگر تم پر اس کی اطاعت واجب ہے۔ (۳)

اختلافات کے ظہور کی پیش گوئی اور ایسے وقت میں امت کے لئے راہ عمل:

فسيرى اختلافا كثيرا: اس میں عقائد کا اختلاف بھی داخل ہے اور سیاسی اختلاف بھی داخل ہے جس کی ابتدا حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے ہوئی۔

فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين: اس اختلاف کے زمانے میں خاص طور پر میری سنت کو اور میرے خلفاء کی سنت کو مضبوطی سے پکڑنا کیونکہ سنت کے اتباع میں فتنہ سے امن ہے، خلفائے راشدین چار ہیں ان کی خلافت علی منہاج النبوۃ تھی، ایک حدیث میں ہے "**الخلافة بعدی ثلاثون سنة**"

(۱) المرقاة ۱/ ۳۷۲.

(۲) تقدم تخريجه.

(۳) المرقاة ۱/ ۳۷٤.

کہ میرے بعد خلافت (منہاج نبوت پر) تیس سال رہے گی اور یہ تیس سال حضرت علی کی خلافت پر پورے ہوئے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ یہ خلفاء اربعہ عزیمت پر قائم رہیں گے اس لئے خصوصیت سے آپ نے ان کے اتباع کی تاکید فرمائی۔(۱)

آپ علیہ السلام کی اس نصیحت سے اس سوال کا جواب بھی واضح ہوجاتا ہے جوآجکل بکثرت عام لوگوں کی طرف سے ہوتا رہتا ہے کہ ہر چیز میں اختلاف ہے ہم کیا کریں؟ کس کی اتباع کریں؟ آپ علیہ السلام نے اس حدیث میں واضح فرمادیا کہ اختلافات کی تو کثرت ہوگی لیکن ہر چیز میں خلفاء راشدین کا طرز عمل دیکھو اور اس کو اپناؤ، تم ہدایت پر رہوگے۔

خلفاء راشدین کے تعامل کی حجیت کی دلیل:

نیز اس حدیث سے خلفاء راشدین کے تعامل کا حجت ہونا بھی معلوم ہوتا ہے، اسی لئے اس کے اتباع وتمسک کا حکم کیا گیا ہے۔

عضوا عليها بالنواجذ : عضَّ يعضُّ عضاً، نصر سے ہے بمعنی دانتوں سے پکڑنا، "نواجذ" ناجذة کی جمع ہے بمعنی داڑھ، اور دانتوں سے پکڑنا یہ کنایہ ہے مضبوطی سے پکڑنے سے، کیونکہ جس چیز کو مضبوطی سے پکڑنا ہو اس کو دانتوں سے پکڑتے ہیں۔(۲)

اياكم ومحدثات الامور : اس جملہ میں بدعت سے اجتناب کا حکم ہے، جس کی تفصیل ماقبل میں گزرچکی ہے۔

۱۵۸ / ۲۷: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطاً، ثُمَّ قَالَ: "هٰذَا سَبِيْلُ اللّٰهِ" ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطاً عَنْ يَّمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ، وَقَالَ: "هٰذِهٖ سُبُلٌ، عَلٰى كُلِّ سَبِيْلٍ مِنْهَا شَيْطَانٌ، يَدْعُوْا إِلَيْهِ" وَقَرَأَ: "وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْماً فَاتَّبِعُوْهُ" الآية، (رواه احمد، والنسائي، والدارمي) (۳)

(۱) المرقاة ۱/ ۳۷۴.

(۲) اللمعات ۱/ ۴۸۷.

(۳) أخرجه أحمد ۱/ ۴۳۵ برقم ۴۱۴۲ و ۱/ ۴۶۵ برقم ۴۴۳۷ والدارمي، المقدمة، باب في كراهية أخذ الرأي ۱/ ۷۲ برقم ۲۰۶ والنسائي في "الكبرى" كتاب التفسير، باب قوله تعالى وإن هذا صراطي مستقيما ۶/ ۳۴۳ برقم ۱۱۱۷۴.

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہمیں سمجھانے کے لئے) ایک (سیدھا) خط کھینچا اور فرمایا: یہ اللہ کا راستہ ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خط کے دائیں اور بائیں چند (چھوٹے اور ٹیڑھے) خطوط کھینچے اور فرمایا یہ (بھی) راستے ہیں جن میں سے ہر ایک راستہ پر شیطان (بیٹھا ہوا) ہے جو اپنے راستے کی طرف بلاتا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ''وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَاتَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِه'' اور بے شک میرا راستہ ہے جو سیدھا ہے لہٰذا اس کی پیروی کرو (دوسرے) راستوں کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمھیں اللہ کے راستہ سے جدا کر دیں گے۔ (احمد، نسائی، دارمی)

تشریح حدیث

صراط مستقیم پر چلنے اور کج روی سے اجتناب کی تلقین:

اس حدیث پاک میں اعتصام بالکتاب والسنۃ دونوں کا بیان ہے اور صراط مستقیم کو اختیار کرنے کا اور گمراہوں کے راستوں سے بچنے کا حکم ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس طریقہ پر صراط مستقیم کی اور شیطان کے راستوں کی وضاحت فرمائی، چنانچہ آپ علیہ الصلوۃ السلام نے زمین پر ایک سیدھا لمبا خط کھینچا اور فرمایا کہ یہ اللہ کا راستہ ہے، پھر اس کے دائیں اور بائیں دیگر خطوط کھینچے اور فرمایا کہ یہ دوسرے راستے ہیں جن میں سے ہر ایک پر شیطان مسلط ہے، سیدھے خط (اللہ کا راستہ) سے مراد اسلام کے عقائد اور احکام شرعیہ ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے متوارثاً گویا سیدھے خط کی شکل میں اب تک چلے آرہے ہیں، اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ یہی ہے جو ہر طرح کے افراط تفریط غلو وانحراف سے پاک ہے، اس سیدھے خط کے دائیں اور بائیں ٹیڑھے خطوط کھینچ کر یہ بتایا کہ اس کی رضا حاصل کرنے کا اصلی راستہ تو ایک ہی ہے، لیکن دنیا میں لوگوں نے اپنے اپنے خیالات سے مختلف راستے بنا رکھے ہیں، یہ راستے لمۂ شیطانی کا نتیجہ ہیں، ان میں سے ہر راستہ پر شیطان بیٹھا ہے جو اپنی طرف بلاتا ہے، تم ان راستوں میں سے کسی راستہ پر نہ چلو، کیونکہ یہ راستے حقیقت میں خدا تعالیٰ تک پہنچنے کے نہیں ہیں، اسی لئے جو ان راستوں پر چلے گا وہ اللہ کے راستہ سے دور جا پڑے گا۔

فرق ضالہ کی گمراہی پر ایک لطیف اشارہ:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدھے خط کے دائیں جانب اور بائیں جانب جو خطوط کھینچے اس سے امت کے گمراہ لوگوں کے راستے مراد ہیں، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ امت میں مختلف فرقے اسلام کے نام پر ہی بنیں گے کیونکہ یہ خطوط خط مستوی سے ملے ہوئے ہیں، ان راستوں کو اختیار کرنے والے اگر چہ اپنے لئے صراط مستقیم پر ہونے کے مدعی ہونگے، لیکن واقعہ اور نفس الامر یہ ہے کہ خط مستوی کے لحاظ سے ان خطوط میں کجی ہے اس لئے انکا صراط مستقیم کا دعوی غلط ہوگا، یہ راستے درحقیقت افراط تفریط غلو وانحراف اور زیغ وضلال پر مشتمل ہونگے۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ قرآن کریم نازل کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجنے کا منشاء تو یہ ہے کہ لوگ اپنے خیالات (عقائد) اور اپنی خواہشات کو قرآن وسنت کے تابع کریں اور اپنی زندگیوں کو ان کے سانچہ میں ڈھالیں؛ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ لوگوں نے قرآن وسنت کو اپنے خیالات اور اپنی تجویزات کے سانچہ میں ڈھالنے کی ٹھان لی، جو آیت یا حدیث اپنے نظریہ کے خلاف نظر آئی اس کی تفسیر اپنی خواہش کے مطابق کرلی، یہیں سے دوسری گمراہ کن راہیں پیدا ہوتی ہیں جو بدعات وشبہات کی راہیں ہیں، ان ہی سے بچنے کے لئے اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے۔(۱)

۱۵۹/۲۸: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "لايُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ"(رواه في "شرح السنة"وَ قَالَ النَّوَوِيُّ فِيْ "أَرْبَعِيْنِهٖ": هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ، رَوَيْنَاهُ فِيْ "كِتَابِ الحجة" بِإِسْنَادٍ صَحِيْحٍ)(۲)

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشات اس چیز (یعنی دین وشریعت) کے تابع نہ ہوجائیں جس کو میں اللہ تعالیٰ شانہ کی جانب سے لایا ہوں،

(۱)تفسير مظهری(عربی)۳/۳۰۷ ط مكتبة الرشيد باكستان.

(۲)أخرجه البغوی فی شرح السنة، كتاب الإيمان،باب رد البدع والهواء ۱/۱۸۵ برقم ۱۰۴.
وأورده النووي (متن الاربعين النووية، الحديث الحادي والأربعون. هوى المؤمن)ص۲۸.

مصنف نے اس حدیث کو ''شرح السنہ'' میں روایت کیا ہے، اور امام نوویؒ نے اپنی ''چہل حدیث'' میں لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے جس کو ہم نے کتاب الحجۃ میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

تشریحِ حدیث

ہوائے نفسانی کو بھی دین کے تابع کرنا ضروری:

اس حدیث میں اعتصام بالکتاب والسنۃ دونوں کا بیان ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ایمان کامل اور مکمل ہونے کے لئے خواہشات سے اجتناب اور شریعت کا مکمل اتباع ضروری ہے اور یہ اسی وقت ہوگا جب کتاب وسنت دونوں کو مضبوطی سے پکڑا جائے۔

حتی یکون ھواہ: ''ہوی'' بمعنی خواہش، اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ایمان اپنے میلان وخواہش سے قبول کرے، پس اگر جبر واکراہ سے اسلام لایا ہو، دل اس پر منشرح نہ ہو تو بندہ مؤمن نہیں ہوگا۔

لماجئت بہ: اس میں ما سے کیا مراد ہے؟ اس میں دو احتمال ہیں:

(۱) عقائد مراد ہوں یعنی آدمی اپنی خواہش کو میرے لائے ہوئے عقائد کے مطابق کردے، اس وقت لایؤمن سے مطلق ایمان اور اصل ایمان کی نفی ہوگی، اس صورت میں ''ما'' کے مفہوم اور اوپر ''ہوی'' کی جو تفسیر بیان کی گئی ہے دونوں میں مطابقت ہوجائے گی۔

(۲) ''ما'' سے مراد عقائد، اعمال اور اخلاق تینوں کا مجموعہ ہو اس وقت نفی ایمان کامل کی ہوگی یعنی وہ شخص کامل مومن نہیں ہے جس کی زندگی کے یہ تینوں شعبے اس کے مطابق نہوں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔

علماء نے لکھا ہے کہ تینوں شعبوں میں کامل مطابقت یکدم پیدا نہیں ہوتی بلکہ دھیرے دھیرے پیدا ہوتی ہے، پس انسان اس کی مسلسل کوشش کرتا ہے، یہی حدیث کا مقصود بھی ہے، کیونکہ ''حتی'' تدریج کے لئے ہے۔(۱)

---

(۱) طیبی طاب اللہ ثراہ ۱ / ۳۶۵ - ۳۶۶.

١٦٠ / ٢٩ : وَعَنْ بِلالِ بنِ الْحَارِثِ الْمُزَنِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ اَحْيَاسُنَّةً مِنْ سُنَّتِي قَدْ أُمِيْتَتْ بَعْدِيْ، فَإِنَّ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلَ أُجُوْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ غَيْرِأَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئاً، وَمَنِ ابْتَدَعَ بِدْعَةَ ضَلالَةٍ لايَرْضَاهَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ، كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الإِثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ عَمِلَ بِهَا لايَنْقُصُ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْئاً"(رواه الترمذی وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ كَثِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهِ)[١]

ترجمه : حضرت بلال بن الحارث المزنیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: "جس شخص نے میری کسی ایسی سنت کوزندہ کیا(یعنی رائج کیا) جومیرے بعدمٹ چکی تھی (چھوڑ دی گئی تھی) تواس کواتنا ہی ثواب ملے گا جتنا اس سنت پرعمل کرنے والے کو ملے گا، بغیراس کے کہ ان (سنت پرعمل کرنے والوں) کے ثواب میں کچھ کمی کی جائے، اورجس شخص نے گمراہی کی کوئی ایسی بات نکالی جس سے اللہ اوراس کے رسول خوش نہیں ہوتے تواس کو اتنا ہی گناہ ملے گا جتنا اس بدعت پرعمل کرنے والے کو ہوگا، بغیراس کے کہ ان کے گناہوں میں کمی کی جائے (ترمذی) اورابن ماجہ نے اس روایت کوکثیر بن عبداللہ بن عمرو سے اورکثیر نے اپنے والد عبداللہ سے اورعبداللہ نے کثیر کے دادا عمرو بن العوف سے روایت کیا ہے"۔

تشریحِ حدیث

احوال بلال بن الحارث مزنی:

ان کی کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے، اہل مدینہ میں سے ہیں، عقیق نامی جگہ حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کوبطور جاگیرعنایت کی تھی، اورفتح مکہ کے موقعہ پرقبیلہ "مزینہ" کا جھنڈا انہی کے ہاتھ میں تھا، اخیرعمر میں بصرہ منتقل ہوگئے تھے، ٦٠ھ میں اسّی سال کی عمر میں وفات ہوئی ہے۔[٢]

احیاءسنت کی فضیلت اوراختراعِ بدعت کی شناعت:

من أحيا سنة من سنتي قد اميتت بعدي: اماتت سنت یہ ہے کہ: لوگ اس سنت پرعمل کرنا چھوڑ دیں

(١)أخرجه الترمذي في كتاب العلم، باب في الأخذ بالسنة واجتناب البدع ٢/ ٩٢، وابن ماجه في كتاب السنة، المقدمة في باب من أحياسنة قد أميتت ١ /١٩.

(٢)الإصابة١ /٢٤٥.

حتی کہ اس کا سنت ہونا بھی ذہن سے نکل جائے اور اس کا احیاء یہ ہے کہ آدمی خود بھی اس سنت پرعمل کرے اورلوگوں کوبھی اس کی دعوت دے اور اس کا ثواب بتا کر اس کی ترغیب دے حتی کہ وہ سنت رواج پاجائے تو اس کو بھی عمل کرنے والوں کے برابر ثواب ملتا رہے گا، کیونکہ یہ شخص لوگوں کے اس سنت پرعمل پیرا ہونے کا ذریعہ اور سبب بنا اور نیکی کا ذریعہ بننے والا نیکی کرنیوالے کی طرح ہوتا ہے کما مر۔(۱)

یہی بدعت کا بھی حکم ہے، جو اس کو ایجاد کرے گا اس کو اس کا گناہ ہوگا اور اس ایجاد کے بعد جو لوگ اس کو اپنائیں گے ان کا گناہ بھی اس ایجاد کرنے والے کو ہوگا۔

ایک سوال وجواب:

سوال یہ ہے کہ سنت کے مردہ ہونے سے پہلے کسی زمانہ میں اس سنت پرعمل رہا ہوگا تو ان عمل کرنے والوں کے اجر کے مثل اس شخص کو اجر ملے گا یا نہیں؟

جواب یہ ہے کہ: اس سنت کے متروک ہونے سے پہلے جو لوگ اس سنت کے عامل رہے ان کے عمل میں اس شخص کی کوئی کوشش شامل نہیں، اس لئے یہ شخص قبل الاماتۃ اجر کا مستحق نہیں ہوگا۔

لایرضاها الله ورسوله: یہ بدعۃ ضلالۃ کی صفت کاشفہ ہے۔

أوزارهم: وزر کی جمع ہے بمعنی گناہ۔

رواه ابن ماجة عن كثير بن عبدالله بن عمرو: اس میں عمرو سے مراد عمرو بن عوف ہیں، جو جلیل القدر صحابی ہیں اور کثیر بن عبداللہ کو حضرت امام شافعیؒ أحد الکذابین کہا کرتے تھے۔(۲)

۱۶۱/۳۱: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ الدِّيْنَ لَيَأْرِزُ إِلَى الْحِجَازِ كَمَا تَأْرِزُ الْحَيَّةُ إِلٰى جُحْرِهَا، وَلَيَعْقِلَنَّ الدِّيْنُ مِنَ الْحِجَازِ مَعْقِلَ الْأُرْوِيَّةِ مِنْ رَأْسِ الْجَبَلِ، إِنَّ الدِّيْنَ بَدَأَ غَرِيْباً وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ، فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ، وَهُمُ الَّذِيْنَ يُصْلِحُوْنَ مَا أَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِيْ مِنْ سُنَّتِيْ" (رواه الترمذي)(۳)

(۱) المرقاة ۱/۳۸۷.

(۲) المرقاة ۱/۳۷۸.

(۳) أخرجه الترمذي في "الإيمان، باب ماجاء أن الإسلام بدأ غريبا" ۲/۹۱.

ترجمہ: حضرت عمرو بن عوفؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بلاشبہ دین حجاز کی طرف اس طرح سمٹ آئے گا جس طرح کہ سانپ اپنے بل کی طرف سمٹ آتا ہے اور دین حجاز میں اس طرح پناہ لے گا جیسے بکری پہاڑ کی چوٹی میں پناہ لیتی ہے اور دین ابتداء میں غریب تھا اور آخر میں غربت کی طرف ہی لوٹ آئے گا، پس خوشخبری ہے غریبوں کے لئے اور وہ، وہ ہیں جو (میری اس سنت) کی اصلاح کریں گے جس کو میرے بعد لوگوں نے خراب کردیا ہوگا" (ترمذی)

تشریحِ حدیث

احوال عمرو بن عوف المزنی:

حضرت عمرو بن عوف بڑے درجہ کے صحابی ہیں، قدیم الاسلام ہیں، غزوۂ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں شریک ہوئے، تبوک میں اس لئے شریک نہ ہوئے کہ اس وقت ان کے پاس سواری نہیں تھی، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری مانگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی معذرت فرمائی، اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی "وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ الآية" حضرت معاویہ کے اخیر زمانے میں مدینہ منورہ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔(۱)

حجاز مقدس کی اہمیت اور بگاڑ کے زمانہ میں دین پر چلنے والوں کے لئے خوشخبری:

اس حدیث میں بھی اعتصام بالسنۃ کا بیان ہے اور حجاز مقدس کی فضیلت ہے، مضمون حدیث یہ ہے کہ قرب قیامت میں کفار اور ظالم وجابر لوگ بلاد اسلامیہ پر غلبہ پالیں گے اور اہل ایمان کا دین خطرہ میں پڑجائے گا، اس وقت مسلمان اپنے دین کو بچانے کے لئے حجاز اور پھر مدینہ طیبہ میں آجائیں گے وہاں ان کو پناہ ملے گی اور دین محفوظ رہے گا، نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ ایسے فساد وفتن کے زمانہ میں جو دین پر قائم رہے گا اور سنتوں کا احیاء کرے گا اس کے لئے خوشخبری اور مبارکبادی ہے۔

الحجاز: عرب کی زمین دو قسم کی ہے: ایک زمین قدرتی طور پر کچھ بلندی پر واقع ہے اس کو "نجد"

(۱) الإصابة ٤/ ٢٩٢.

کہا جاتا ہے اورایک زمین نشیب میں واقع ہے اس کو''تہامہ'' کہا جاتا ہے اوران دونوں کے درمیان کا حصہ ''حجاز'' کہلاتا ہے، حجاز کے معنی حائل کے ہیں، کہ یہ علاقہ نجد وتہامہ کے درمیان آڑ ہے، اس میں مکہ ومدینہ اوران کے آس پاس کے علاقے داخل ہیں۔

لیعقلن الدینمن الحجاز معقل الاروية: ایک بکری پالتو ہوتی ہے اورایک پہاڑی ہوتی ہے جس کو''اُرْوِیہ'' کہتے ہیں، اس کی عادت ہوتی ہے کہ پہاڑ کی چوٹی میں اپنا گھر بنالیتی ہے، جب بارش آتی ہے تو وہ اپنے اس گھر میں پناہ لیتی ہے، اسی طرح گرمی اورسردی کے وقت اس گھر میں رہ کر اپنا بچاؤ کرتی ہے۔(۱)

''معقل'' اسم ظرف ہے، عقل یعقل عقولا؛ باب ضرب سے، بمعنی جائے پناہ۔

ایک تعارض اوراس کا حل:

اس حدیث میں یہ کہا گیاہے کہ دین حجاز میں سمٹ کررہ جائے گا، اوراس سے قبل فصل اول کی آخری حدیث میں آیا تھا کہ مدینہ میں سمٹ کررہ جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اختلاف زمان پرمحمول ہے، دین اولاً سمٹ کرحجاز میں رہ جائے گا پھراورسمٹتے سمٹتے صرف مدینہ طیبہ میں رہ جائے گا۔

إن الدين بدأ غريباً: اس کامفہوم پہلے گذرچکا ہے۔

۱۶۲ / ۳۲: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى أُمَّتِيْ كَمَاأَتٰى عَلٰى بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ حَذْوَالنَّعْلِ بِالنَّعْلِ،حَتّٰى إِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَن أَتٰى أُمَّهُ عَلانِيَةً لَكَانَ فِيْ أُمَّتِيْ مَنْ يَّصْنَعُ ذٰلِكَ، وَإِنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ مِلَّةً،وَتَفْتَرِقُ أُمَّتى على ثلاثٍ و سبعينَ ملةً كُلُّهُمْ فِى النَّارِإلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً" قَالُوْا: مَنْ هِيَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ؟ قَالَ: "مَاأَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ"(رواه الترمذي(۱) وَفِيْ رِوَايَةِ أَحْمَدَ، وَأَبِيْ دَاوُدَ(۲) عَنْ مُعَاوِيَةَ: ثِنْتَانِ وَسَبْعُوْنَ فِي النَّارِ، وَوَاحِدَةٌ

(۱) اللمعات ۱ / ۴۹۲–۴۹۳.

(۲)اخرجه الترمذى فى أبواب الإيمان، باب ماجاء فى افتراق هذه الأمة ۲ / ۹۲.

(۳)أخرجه أبوداؤد فى كتاب السنة، باب شرح السنة ۲ / ۶۳۱ واحمد فى مسنده (۱۶۹۳۷)، وقد رواه غير واحد من الصحابة، منهم ابوهريرة ومعاوية بن ابى سفيان وعبد الله بن عمرو وغيرهم، وصححه الترمذى وابن حبان (۱۴ / ۱۴۰) والحاكم (۱ / ۱۲۸) والمنذرى، والشاطبى فى الاعتصام (۲ / ۱۸۹) والسيوطى فى الجامع الصغير (۲ / ۲۰) وكذا جوده الزين العراقى فى تخريج احاديث الاحياء.

فِيُ الْجَنَّةِ، وَهِيَ الْجَمَاعَةُ، وَإِنَّهُ سَيَخْرُجُ فِيُ أُمَّتِي أَقْوَامٌ تَتَجَارَى بِهِمْ تِلْكَ الْأَهْوَاءُ كَمَا يَتَجَارَى الْكَلَبُ بِصَاحِبِهِ، لَايَبْقَى مِنْهُ عِرْقٌ وَلَامَفْصِلٌ إِلَّا دَخَلَهُ"

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یقیناً میری امت پر ایک زمانہ ایسا آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا تھا (دونوں میں ایسی مماثلت ہوگی) جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہوتا ہے، حتی کہ بنی اسرائیل میں سے اگر کسی نے اپنی ماں سے اعلانیہ زنا کیا ہوگا تو میری امت میں بھی ایسا شخص ہوگا جو یہ کام کرے گا، اور بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہوگئے تھے اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوجائے گی اور وہ تمام فرقے جہنمی ہوں گے سوائے ایک فرقہ کے کہ وہ جنتی ہوگا، صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کونسا فرقہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو اس طریقہ پر ہوگا جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں، (ترمذی) اور احمد وابوداود نے جو روایت حضرت معاویہؓ سے نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ: بہتر فرقے جہنم میں جائیں گے اور ایک فرقہ جنت میں جائے گا اور وہ فرقہ جماعت مسلمین ہے اور میری امت میں کئی قومیں ایسی ہوں گی جن میں خواہشات (یعنی عقائد اور اعمال میں بدعات) اس طرح سرایت کرجائیں گی جس طرح ہڑک والے کتے کے کاٹے ہوئے میں ہڑک سرایت کرجاتی ہے کہ کوئی رگ اور کوئی جوڑ باقی نہیں رہتا جس میں وہ سرایت نہ کرگئی ہو''

تشریح حدیث

امت محمدیہ کا بنی اسرائیل کے نقش قدم پر چلنا اور ۷۳رفرقوں میں تقسیم ہونا:

یہ حدیث اعتصام بالسنۃ سے متعلق ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت کو اختیار کرنے کا اور اختلاف وافتراق سے بچنے کا حکم دیا، لیکن امت میں افتراق من جانب اللہ مقدر تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پیش گوئی فرمائی کہ: میری امت بنی اسرائیل کے نقش قدم پر چلے گی اور وہی طرز اختیار کرے گی جو بنی اسرائیل نے کیا جیسے ایک آدمی کا ایک جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہوتا ہے، ان میں کمی بیشی نہیں ہوتی، اسی طرح یہ امت برائی میں بنی اسرائیل کے مساوی ہوگی اور ان کی طرح اختلاف وتقسیم کا شکار ہوگی،

بنی اسرائیل ۷۲ رفرقوں میں منقسم ہوئے، میری امت ۷۳ رفرقوں میں تقسیم ہوگی لیکن نجات پانے والا ایک ہی فرقہ ہوگا جو میرے اور میرے صحابہؓ کے طریقے پر ہوگا۔

لیأتین: اس کا فاعل ''زمانٌ'' ہے جو مقدر ہے۔

حذو النعل بالنعل: یہ مثال عربی زبان میں دو چیزوں کی برابری ومساوات کو بیان کرنے کے لئے بولی جاتی ہے، اس کا اعراب نصب ہے مفعولِ مطلق ہونے کی بناپر، تقدیر عبارت یہ ہے: یحذونهم حذوا مثل حذو النعل بالنعل.(۱)

اس امت میں بھی ماں سے زنا کیا جائے گا:

ان كان منهم من أتى أمه علانية: شراح حدیث نے فرمایا کہ یہاں ام سے موطوٴۃ الاب یعنی سوتیلی ماں مراد ہے؛ کیونکہ حقیقی ماں سے زنا میں طبعی مانع موجود ہے،(۲) لیکن بہ تصریحِ حدیث ہر بعد والا زمانہ پہلے کے بہ نسبت زیادہ شر لئے ہوئے ہوگا، چنانچہ آج کے زمانہ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ بعض لوگ اپنی حقیقی ماں سے زنا کے مرتکب ہوئے، انٹرنیٹ پر ایسے واقعات بتائے گئے، نیز تین سال قبل دہلی کے مضافات میں اسی طرح کے واقعہ کی خبر باقاعدہ اخبار میں شائع ہوئی، لہذا اس کو سوتیلی ماں پر محمول کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، اللہ تعالیٰ امت کو اپنی حفاظت میں رکھے۔

سوال: بعض گناہ ایسے ہیں جو بنی اسرائیل نے کیے لیکن امت مسلمہ کے لئے وہ محال کے درجے میں ہیں جیسے قتلِ انبیاء، اسی طرح تحریف في كتاب الله اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو چکا اور قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری خود حق تعالیٰ لے چکے ہیں؟۔

جواب یہ ہے کہ اگرچہ یہ امت انبیاء کو قتل نہیں کرسکتی لیکن حضرات علماء وصلحاء انبیاء کے وارث ہیں اور امت نے ان کو قتل کیا ہے اور کتاب اللہ میں امت نے اگرچہ لفظی تحریف نہیں کی لیکن معنوی تحریف کی ہے، بالخصوص فرقِ ضالہ اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں یہ الگ بات ہے کہ علماء حقہ اس کو چلنے نہیں دیتے۔

افتراق کی مراد اور فرقہ بننے کی صورت:

وتفترق أمتي على ثلاث وسبعين ملة: اس ''افتراق واختلاف'' سے مراد عقائد کا اختلاف وافتراق

(۱) طيبي ۱/ ۳۶۹.

(۲) المرقاة ۱/ ۳۸۰.

ہے، فروع واعمال کا اختلاف مراد نہیں، اس لئے کہ اس اختلاف پر (سوائے فرقہ ناجیہ کے) دخول نار کی وعید بیان کی گئی ہے، جبکہ ائمہ مجتہدین کے اختلاف کو رحمت قرار دیا گیا ہے، مجتہد سے اگر خطا ہو جائے تب بھی وہ بہ مقتضائے حدیث ایک اجر کا مستحق ہے۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ فرقے عقائد کے اختلاف سے بنتے ہیں، جو جماعت قرآن وسنت اور جماعت صحابہ سے عقائد میں مختلف ہو اس کو الگ فرقہ کہا جائے گا اور جن کے عقائد ان کے موافق ہوں وہ الگ فرقہ شمار نہیں ہوں گے، گو ان میں عملی وفروعی اختلاف پایا جاتا ہو، پس ائمہ اربعہ اوران کے متبعین الگ الگ فرقے شمار نہیں ہوں گے، کیونکہ فروع میں اختلاف کے باوجود وہ سب ازروئے عقائد متحد ہیں۔

۷۳رفرقوں کی تعیین:

یہاں شراح کے درمیان یہ بحث آئی ہے کہ اس امت میں ۷۳رفرقے ہوئے ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ امت میں ۷۳رسے بھی زیادہ فرقے ہوئے ہیں اور ۷۳رسے کثرت مراد ہے، تحدید مقصود نہیں، بعض نے کہا کہ ۷۳رہی مقصود ہیں اور امت میں ۷۳رفرقے ہوئے ہیں، پھر ہر ایک نے اپنے اپنے اعتبار سے ان کی تعیین کی ہے، ملا علی قاریؒ نے فرمایا کہ امت میں اصلاً آٹھ فرقے ہیں اور پھر ان میں متعدد شاخیں ہیں:

(۱) معتزلہ، پھر ان میں بیس فرقے ہیں (۲) خوارج، ان کے بھی بیس فرقے ہیں (۳) شیعہ وروافض، ان کے بائیس فرقے ہیں (۴) مرجئہ، ان میں پانچ ہیں (۵) نجاریہ، ان میں تین فرقے ہیں (۶) جبریہ (۷) مشبہہ (۸) ایک اہل سنت والجماعت، مگر یہ تعداد ظنی ہے اصل تو کثرت مقصود ہے۔(۱)

کلھم فی النار: فرقۂ ناجیہ کے سوا سب جہنم میں جائیں گے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، بلکہ اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ: ان میں جن کے عقائد حد کفر تک پہنچے ہوئے ہوں، مثلاً العیاذ باللہ قرآن کریم میں تحریف کا عقیدہ رکھتے ہوں، حضرت عائشہؓ کی برأت کو صحیح نہ مانتے ہوں وغیرہ، ایسے لوگ کفر میں مبتلا ہونے کی وجہ سے مخلد فی النار ہونگے، اور جن کے عقائد کفر کی حد تک نہیں پہنچے ان پر فاسق ہونے کا حکم ہے، وہ اپنے جرم کی سزا کاٹ کر جنت میں داخل ہونگے، یہ شریعت کا اصول ہے

(۱) المرقاة ۱/ ۳۸۱.

البتہ حق تعالیٰ شانہ ان کو معاف فرمادے تو یہ امر آخر ہے، حق تعالیٰ کا پاک ارشاد ہے: ویغفر مادون ذالک لمن یشاء.

فرقۂ ناجیہ کا مصداق اور نام وماً خذ:

ماأنا علیه و أصحابی: ''ماانا علیہ'' سے مراد سنت ہے، اور ''ماعلیہ اصحابی'' سے مراد اجماع صحابہ واجماع امت ہے، اور مطلب یہ ہے کہ: جو جماعت علماً اور عملاً میری سنت اور جماعت صحابہ کے طریقے پر ہوگی وہ نجات پائے گی، ''علماً'' کا مطلب یہ ہے کہ: سنت رسول اور اجماعِ صحابہ کو حجت تسلیم کیا جائے، پس جو جماعت سنت رسول کو علی الاطلاق حجت نہ مانے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے، جیسا کہ اہل قرآن کا فرقہ، اور جو جماعت اجماع صحابہ کو حجت نہ مانے وہ ضال اور گمراہ ہے، اور ''عملاً'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ جماعت سنت رسول اور جماعت صحابہ کی عقائد واعمال میں پیروی کرنے والی ہو اور ان کے طریقہ کی متبع ہو، ایسے ہی لوگوں کو ''اہل السنۃ والجماعۃ'' سے موسوم کیا جاتا ہے، یہی اہل حق ہیں اور یہ نام اسی جملۂ حدیث سے ماخوذ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے جہاں فرقہ ناجیہ کا علم ہوتا ہے وہیں یہ جملہ امت کیلئے اتحاد واتفاق کا راستہ بھی بتلاتا ہے، یعنی سب جماعتیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے طرزِ فکر وعمل کو اپنالیں، ظاہر ہے کہ پھر باہم کوئی اختلاف باقی نہیں رہے گا، نیز آپ علیہ الصلوۃ والسلام کا یہ ارشاد موجودہ مختلف فرقوں اور جماعتوں میں حق وباطل کی شناخت وتمیز کے لئے معیار بھی ہے، اس کے ذریعہ پہچانا جاسکتا ہے کہ کونسی جماعت وفرقہ حق پر ہے اور کونسی جماعت وفرقہ باطل ہے۔

''دیوبندی'' کوئی فرقہ نہیں؟

یہاں یہ وضاحت بھی بہت مناسب ہے کہ ''دیوبندیوں'' کے نام سے جو جماعت مشہور ہے یہ الگ سے کوئی فرقہ وجماعت نہیں، بلکہ یہ اہل السنۃ والجماعۃ ہی کا ایک حصہ اور فرد ہیں، کیونکہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے کہ فرقہ عقائد کے اختلاف سے بنتا ہے، اور اہل دیوبند کے عقائد قرآن وسنت اور جماعت صحابہ کے عین مطابق ہیں، لہذا دیوبندی حضرات اہل السنۃ والجماعۃ کا کامل مصداق ہیں، ان کو دیوبندی فقط اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ متحدہ ہندوستان میں اہل السنۃ والجماعۃ کا بڑا مرکز دیوبند بنا اور اس کو ان کی ترجمانی کا شرف

حاصل ہوا، پس اسکو **تسمية الشی باسم محله** کہا جاسکتا ہے۔

افتراق کا سبب:

مسند احمد وابوداود میں یہ حدیث حضرت معاویہؓ سے منقول ہے، اس میں ثنتان وسبعون کے الفاظ ہیں اور جنتی فرقہ بڑی جماعت کو بتایا گیا ہے، نیز اس روایت میں یہ الفاظ ہیں: "**تتجاری بهم تلك الاهواء كما يتجاری الكلب بصاحبه**" مطلب یہ ہے کہ کچھ ایسے لوگ اور جماعات امت میں پیدا ہوں گی جن میں خواہشات اور بدعات اس طرح سرایت کر جائیں گی جس طرح کتے میں ہڑک سرایت کر جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ لوگوں پر جھپٹتا ہے، اس مثال سے امت میں افتراق کا سبب بھی معلوم ہوگیا کہ اس کا اصل سبب ہوگا خواہشات نفسانی، اس کی وجہ سے آدمی بدعت وگمراہی کو اختیار کرے گا، مثلاً اہل بدعت کے زمرہ میں داخل ہونے سے اس کو سرداری ملے گی، مال ودولت ہاتھ آئے گا وغیرہ اس قسم کی خواہشات اس کے رگ وریشہ میں سرایت کر جاتی ہیں جس کی وجہ سے وہ افتراق کی راہ پر چل پڑتا ہے۔

تتجاری: بمعنی دوڑنا، یہاں مراد ہے داخل ہونا اور سرایت کرنا۔

الاهواء: اس سے مراد ہیں خواہشات وبدعات۔

الكلب: بسکون اللام بمعنی کتا اور بفتح اللام کتے کا زہر، ہڑک، یہاں یہی مراد ہے۔(۱)

١٦٣ / ٣٣: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ اللّٰهَ لايَجْمَعُ أُمَّتِيْ - أَوْقَالَ: أُمَّةَ مُحَمَّدٍ - عَلٰى ضَلالَةٍ، وَيَدُاللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ، وَمَنْ شَذَّشُذَّفِي النَّارِ" (رواه الترمذی)(۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ میری امت یا یہ فرمایا کہ امت محمد یہ کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا، اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت پر ہے اور جو شخص جماعت سے الگ ہے (وہ جنتیوں کی جماعت سے) الگ کر کے تنہا جہنم میں ڈالا جائے گا۔ (ترمذی)

(۱) المرقاة ٢ / ٣٨٢.

(۲) أخرجه الترمذي في كتاب الفتن، باب ماجاء فی لزوم الجماعة ٢ / ٣٩.

تشریح حدیث

اجماع امت کی حقانیت، جماعت کے ساتھ تائید الٰہی کی شمولیت اوراس سے علیحدگی کی ممانعت

ماقبل میں اعتصام بالسنہ کا حکم تھا، آگے چند احادیث میں اعتصام بالجماعۃ کا حکم دیا جارہا ہے کہ بڑی جماعت کا اتباع کرو، چنانچہ اس حدیث میں فرمایا گیا کہ: اللہ امت محمدیہ کو ضلالت پرجمع نہیں کرے گا، یعنی امت محمدیہ اجماعاً واتفاقاً جوموقف اپنائیگی وہ حق ہوگا، یہ شرف صرف اس امت کو حاصل ہے، سابقہ امتوں کو یہ شرف حاصل نہ تھا۔

لایجمع أمتي أو قال امتی محمد: اس کی دوتفسیریں ہیں: (۱) بعض نے کہا کہ اس میں امت وجماعت سے علماء عاملین اورفقہائے مجتہدین مراد ہیں، عوام نہیں، یعنی کسی بھی زمانے کے علمائے عاملین وفقہائے مجتہدین گمراہی پرجمع نہیں ہوں گے، لہذا آدمی کو عمل وعقیدہ میں ان ہی کے ساتھ رہنا چاہئے، اسی لئے اس امت کا اجماع بھی حجت ہے، اس کی دلیل یہی حدیث ہے۔ یہی مطلب راجح ہے۔(۱)

(۲) بعض نے کہا کہ جماعت سے مراد یہ ہے کہ: مسلمانوں کی بڑی جماعت جس کو اپنا خلیفہ مقرر کرے تم بھی اس کو اپنا خلیفہ تسلیم کرلو، مسلمانوں کی جماعت سے الگ نہ ہواور امور مملکت میں اسی کا اتباع کرو، دونوں مطلب درست ہیں کہ دونوں ہی مطلوب ہیں۔(۲)

علی ضلالۃ: بعض نے کہا کہ اس سے معصیت مراد ہے، علامہ ابہری نے کہا کہ خطا مراد ہے خواہ عمداً ہو یابغیرعمد کے، دونوں تفسیروں کے لحاظ سے معنی یہ ہوئے کہ اساطین امت کا اتفاق معصیت اورخطاء پرنہیں ہوگا، ابن الملک نے فرمایا کہ یہاں امت سے امت اجابت مراد ہے مذکورہ حکم امت اجابت پرجاری ہے، کیونکہ قرب قیامت میں سب لوگ کافر ہونگے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ امتِ اجابت نہ ہوگی۔(۳)

وید اللہ علی الجماعۃ: ''ید'' بمعنی نصرت وتائید، اللہ کی مددونصرت جماعت کے شامل حال ہوتی ہے، پس اللہ کی مدد سے مستفید ہونے کے لئے جماعت کے ساتھ رہنا چاہئے۔

(۱) المرقاۃ ۱/۳۸۲.

(۲) المرقاۃ ۱/۳۸۲-۳۸۳.

(۳) المرقاۃ ۱/۳۸۲-۳۸۳.

ومن شذ شذفی النار: اس میں جماعت مسلمین سے الگ ہونے والے کے لئے وعید ہے کہ جوشخص قول وعمل اور عقیدہ کے اعتبار سے ان سے الگ ہوگا تو قیامت میں اس کو اہل جنت سے الگ کرکے جہنم میں ڈال دیا جائے گا، قرآن کریم کی اس آیت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: ''وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَاتَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَسَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْن نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَ تْ مَصِيْراً'' اس میں عام مؤمنین سے ہٹ کر دوسری راہ اختیار کرنے والے کو دخول جہنم کی وعید سنائی گئی۔

١٦٤/٣٤: وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ''اِتَّبِعُوْا السَّوَادَ الْأَعْظَمَ، فَإِنَّهُ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ'' (رواه ابن ماجة من حديث أنس)(١)

ترجمه: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بڑی جماعت کی پیروی کرو اس لئے کہ جو جماعت سے الگ ہوا وہ تنہا آگ میں ڈالا جائے گا'' ابن ماجہ نے یہ حدیث حضرت انسؓ سے روایت کی ہے۔

تشریح حدیث

جماعت کے پیچھے چلنے کا حکم:

اس حدیث میں جماعت کے پیچھے چلنے کا حکم اور اس سے علیحدگی کی ممانعت کی گئی ہے۔

السواد: ''سواد'' کے اصل معنی سیاہی کے ہیں اور بڑی جماعت کو جب دور سے دیکھا جائے تو سیاہی سی معلوم ہوتی ہے، بڑی جماعت کے مصداق میں یہاں بھی وہی مذکورہ دو احتمال ہوں گے جو اس سے پہلے حدیث میں بیان کئے گئے یعنی علمائے عاملین یا خلیفۂ اکبر کو منتخب کرنے والے۔

١٦٥/٣٥: وَعَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''يَابُنَيَّ! إِنْ قَدَرْتَ أَنْ تُصْبِحَ وَتُمْسِيَ وَلَيْسَ فِيْ قَلْبِكَ غِشٌّ لِأَحَدٍ فَافْعَلْ'' ثُمَّ قَالَ: يَابُنَيَّ! وَذٰلِكَ مِنْ سُنَّتِيْ، وَمَنْ أَحَبَّ سُنَّتِيْ فَقَدْ أَحَبَّنِيْ، وَمَنْ أَحَبَّنِيْ كَانَ مَعِيْ فِي

(١) أخرجه الترمذي، كتاب الفتن، باب ماجاء في لزوم الجماعة ٢/٣٩ وابن ماجه، الفتن، باب السواد الأعظم ٢/٢٨٣.

الْجَنَّةِ"(رواہ الترمذی)[۱]

ترجمہ : حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا "اے میرے بیٹے! اگر تم ایسا کر سکو کہ صبح کرو اور شام کرو اس حال میں کہ تمہارے دل میں کسی کی طرف سے کینہ نہ ہو، تو ایسا کر لینا، پھر فرمایا اے میرے بیٹے! یہ میری سنت ہے، جس شخص نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں داخل ہوگا" (ترمذی)

تشریحِ حدیث

قلب کو "غش" سے پاک رکھنے کا حکم اور اس کی فضیلت واہمیت:

اس حدیث میں اعتصام بالسنہ کا بیان ہے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک سنت بیان فرمائی جس کا تعلق قلوب کی اصلاح سے ہے، وہ ہے اپنے دل کو سب کی طرف سے صاف رکھنا، کسی کی طرف سے کینہ نہ رکھنا، یہ نصیحت حضرت انسؓ کو فرمائی، حضرت انسؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادمِ خاص تھے ان کے واسطہ سے یہ نصیحت تمام امت کے لئے ہے، چنانچہ فرمایا میرے بیٹے! اگر تو اس بات پر قادر ہو کہ تو صبح کرے اور شام کرے اس حال میں کہ تیرے قلب میں کسی کی طرف سے کینہ اور حسد نہ ہو، تو ایسا کر لینا، صبح و شام بول کر دوام اور جمیع وقت مراد لیا گیا ہے[۲] کہ ہر وقت اپنے دل کو سب کی طرف سے صاف رکھو، اس سنت کو نہایت اہتمام سے اس لئے بیان فرمایا کہ معاشرہ کی اصلاح کا مدار اسی پر ہے، کیونکہ لوگ اگر اپنے قلوب کو کینہ ونفرت سے پاک رکھنے کا اہتمام کریں تو اتفاق واتحاد کی فضا قائم ہو کر صالح معاشرہ وجود میں آئے گا، پھر فرمایا کہ یہ میری سنت ہے اور اس پر صلہ اور انعام یہ ہے کہ جو میری سنت سے محبت کرے گا تو گویا اس نے مجھ سے محبت کی اور جو مجھ سے محبت کرے گا وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا، یہ بشارت محض سنت سے محبت پر ہے عمل بالسنہ کا درجہ ظاہر ہے کہ اس سے بھی زیادہ ہوگا، اور جنت میں ساتھ ہونے سے مراد ہمراہ داخل ہونا یا جنت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب رہنا ہے۔

(۱) أخرجه الترمذي، كتاب العلم، باب ماجاء في الأخذ بالسنة واجتناب البدع ۲/۹۶.

(۲) المرقاة ۱/۳۸۴.

غَش: یہ نُصح کی ضد ہے یعنی میل، کدورت۔

١٦٦/ ٣٦: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِيْ عِنْدَ فَسَادِ أُمَّتِيْ، فَلَهٗ أَجْرُ مِائَةِ شَهِيْدٍ" (رواه)(۱)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے میری امت میں بگاڑ کے وقت میری سنت کو تھامے رکھا اس کے لئے سو شہیدوں کا اجر ہے۔

تشریح حدیث

عام بگاڑ کے وقت عمل بالسنۃ کی فضیلت:

اس حدیث میں جہالت اور بدعت کے ماحول میں سنت پر عمل کی ترغیب اور اس کی خاص فضیلت مذکور ہے۔

عند فساد أمتي: فساد امت سے بدعت و جہالت کا غلبہ اور فسق و فجور کا شیوع مراد ہے(۲) اور اس قدر ثواب کی وجہ یہ ہے کہ ایسے ماحول میں سنت پر عمل کرنا نہایت دشوار ہوتا ہے جس طرح اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جان دینا بہت دشوار ہوتا ہے، پھر شہید تو ایک مرتبہ کی مصیبت اٹھا کر اللہ سے جاملتا ہے اور دنیا کے مصائب سے نجات پالیتا ہے لیکن مخالف ماحول میں سنت کا عامل اور سنت کا احیاء کرنے والا مخالفین کے طعن و تشنیع کو ہمیشہ سن سن کر برابر تکلیف میں رہتا ہے۔(۳)

(۱) مرقاۃ میں لکھا ہے: (رواه)بعده بياض، وألحق ميرک وغيره البيهقي في كتاب الزهد له من حديث ابن عباس، (المرقاة ١ / ٣٨٤)، وهو مخرج في الزهد الكبير للبيهقي (١/ ١١٨)وكذا أخرجه ابن بشر في الأمالي (١/ ٢١٨و١/ ٣٠٦)وابن عدي في الكامل (٢/ ٩٠)

وقد أخرجه الطبراني في "الأوسط" ٤ / ١١٩برقم٤١٤ ٥وأبونعيم في "الحلية"٨ / ٢٠٠.عن أبي هريرة مرفوعا، ونصه: المتمسّک بسنتي عند فساد امتی له اجر شهيد، ورواه ابن بطة في الإبانة الكبرى (١/ ٣٤٤) عن عمر مرفوعا، ونصه: المتمسّک بسنتي عند فساد امتی له اجر خمسين شهيدا.

(۲) المرقاة١ / ٣٨٤.

(۳)اللمعات١ / ٤٩٨.

رواہ: یہاں بیاض ہے یعنی اس کے بعد کوئی حوالہ مذکور نہیں ہے، مشکوۃ کے حاشیہ میں ہے کہ بیہقی نے کتاب الزہد میں ابن عباس کے واسطے سے اس کو روایت کیا ہے۔

١٦٧ / ٣٧: وَعَنْ جَابِرٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ أَتَاهُ عُمَرُ فَقَالَ: إِنَّا نَسْمَعُ أَحَادِيْثَ مِنْ يَهُوْدَ تُعْجِبُنَا، أَفَتَرَىٰ أَنْ نَكْتُبَ بَعْضَهَا؟ فَقَالَ: "أَمُتَهَوِّكُوْنَ أَنْتُمْ كَمَا تَهَوَّكَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارَىٰ؟ لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَيْضَاءَ نَقِيَّةً، وَلَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا مَاوَسِعَهُ إِلَّا اتِّبَاعِيْ"(رواه أحمد، والبيهقي في شعب الإيمان)[1]

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ دربار رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "ہم یہود کی حدیثیں سنتے ہیں جو ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہیں، پس آپ کی کیا رائے ہے اس بارے میں کہ ہم ان میں سے بعض کو لکھ لیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "کیا تم بھی (اپنے دین کے معاملہ میں) اسی طرح حیران ہو جس طرح یہود ونصاریٰ حیران رہے؟ (جان لو) کہ میں بلاشبہ تمہارے پاس صاف اور روشن شریعت لایا ہوں اور اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے سوا کوئی گنجائش نہ ہوتی" (احمد، بیہقی)

تشریح حدیث

اگر موسیٰؑ زندہ ہوتے وہ بھی شریعت محمدیہ کا اتباع کرتے:

حضرت عمر جب اپنے کھیت پر جاتے توراستہ میں یہود کا ایک مکتب واقع تھا اس کے پاس سے گذر ہوتا، بعض مرتبہ آپ وہاں چلے جاتے اور وہاں توریت پڑھائی جاتی تھی، اس کی بعض باتیں حضرت عمرؓ کو اچھی معلوم ہوتی تھیں، ایک دن حضرت عمرؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ ہم یہود سے کچھ دینی باتیں سنتے ہیں ان کی بہت سی باتیں اچھی معلوم ہوتی ہیں، کیا ہم ان کو لکھ لیا کریں؟ اس لئے کہ ممکن ہے کہ وہ اچھی باتیں محرف نہ ہوں، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت غصہ آیا اور فرمایا کہ کیا تم اپنی کتاب وشریعت کے بارے میں حیران ہو جیسے یہود ونصاریٰ حیران تھے؟ انہوں نے اپنی کتاب میں تحریف کرلی اور اپنے راہبوں کی رائے سے احکام لینے لگے، اس کے نتیجہ میں وہ اپنے متعلق حیران وپریشان رہتے

(١) أخرجه أحمد ٣/ ٣٨٧ برقم ١٥١٩٥. والبيهقي في "شعب الإيمان" ١/ ١٩٩ برقم ١٧٦.

کہ ہمارا یہ طرزِ عمل ہماری نجات کا ذریعہ ہوجائے گا یا ہمیں گمراہی کے سمندر میں غرق کردے گا؟

آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: کیا اسی طرح تم اپنی کتاب وشریعت کے بارے میں حیرانی کے اندر مبتلا ہوکر اپنے لئے توریت کی ضرورت محسوس کرتے ہو، حالانکہ میں تمہارے پاس ایسی شریعت لے کرآیا ہوں جو باطل (تحریف اور ہرقسم کے شک وشبہ) سے پاک اور صاف ہے اور نجات کے لئے کافی ہے، حتی کہ اگر صاحب توراۃ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی حیات ہوتے تو ان کے لئے بھی میری اتباع واجب ہوتی جیسا کہ اس آیت کا تقاضہ ہے: ''وَلَقَدْ أَخَذْنَا مِيْثَاقَ النَّبِيِّيْنَ لَمَاآتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتَابٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَائَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ'' (۱) یعنی ہم نے نبیوں سے عہد لیا تھا کہ جب تمہارے پاس کتاب وسنت آئے گی پھر وہ رسول آجائیں جو تمہاری کتابوں کی تصدیق کرنے والے ہوں، تو تم سب ان پر ضرور ایمان لاؤ گے اور ان کی مدد کروگے۔

ایک سوال وجواب:

سوال: توریت کی باتوں کو لکھنا جائز ہے، حدیث میں ہے: ''حَدِّثُوْا عَنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ وَلَاحَرَجَ'' تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو کیوں منع فرمایا؟ اس سوال کے کئی جواب ہیں:

(۱) بعض نے جواب دیا کہ یہ ممانعت ابتداء میں تھی اگر اس وقت اجازت دی جاتی تو خلط بالقرآن کا اندیشہ تھا، پھر جب صحابہ کے علم میں پختگی آ گئی اور یہ اندیشہ نہیں رہا تو پھر اجازت دے دی گئی۔

(۲) اصل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود حضرت عمرؓ کے طرز کلام وطرز عمل پر رد کرنا تھا، ان کے ظاہر حال سے یہ معلوم ہورہا تھا کہ دینی ترقی کے لئے گویا توریت کی بھی ضرورت ہے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر نکیر فرمائی۔

متھوکون: تھوّک سے ہے بمعنی حیران وپریشان ہونا۔

بیضاء: سفید رنگ اہل عرب کا سب سے پسندیدہ رنگ ہے، شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے لئے اس لفظ کو لانے میں اس شریعت کے اعلی وارفع ہونے کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ اس شریعت میں زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ہدایت وراہنمائی موجود ہے، مقصد یہ ہوا کہ تمہارے پاس اعلی شریعت موجود ہے، اعلی کے ہوتے ہوئے ادنی کی طلب یقیناً باعث حیرت اور باعثِ تعجب ہے۔

(۱) من سورة آل عمران: ۸۱.

١٦٨ / ٣٨: وَعَنْ أَبِيْ سَعِيدِنِ الْـخُدْرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ أَكَلَ طَيِّباً، وَعَمِلَ فِيْ سُنَّةٍ، وَأَمِنَ النَّاسُ بَوَائِقَهُ، دَخَلَ الْجَنَّةَ" فَقَالَ رَجُلٌ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّ هٰذَاالْيَوْمَ لَكَثِيْرٌ فِي النَّاسِ؟ قَالَ: "وَسَيَكُوْنُ فِيْ قُرُوْنٍ بَعْدِيْ" (رواه الترمذی) (۱)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جو شخص حلال رزق کھاوے، اور سنت پر عمل کرے اور لوگ اس کے شر سے محفوظ رہیں وہ جنت میں داخل ہوگا" ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ! ایسے لوگ تو آج بہت ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اور میرے بعد والے زمانوں میں بھی ایسے لوگ ہوں گے" (ترمذی)

تشریح حدیث

اکل حلال، تعمیل سنت اور لوگوں کو تکلیف نہ پہنچانے کی فضیلت:

اس حدیث میں تین جملے ہیں، ایک جملہ سنت سے متعلق ہے، اسی کے لحاظ سے باب سے مناسبت ہے، اس روایت میں دخول جنت کا نسخہ بیان کیا گیا ہے، اس نسخہ کے تین اجزاء ہیں، چنانچہ فرمایا کہ جو شخص تین کام کرے وہ جنت میں داخل ہوگا:

(۱) من أكل طيباً: طیب وحلال مال کھائے اور حرام غذا سے بچے، طیب وہ مال ہے جس کو کمانے کے وقت یا کمانے کے بعد خلاف شرع کام نہ کرنا پڑے۔ (۲)

طیب؛ حلال سے اوپر کا درجہ ہے اس میں تقوی اور احتیاط کے ساتھ کسب کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے یعنی جس میں حرمت کا شائبہ بھی نہ ہو۔

(۲) وعمل في سنة: زندگی کے ہر شعبہ میں سنت پر عمل پیرا ہو اور سنت پر عمل کرنے سے کامیابی کا یقین رکھے۔

(۳) وامن الناس بوائقهٗ: لوگ اس کے شر سے محفوظ رہیں، اپنے آپ کو معاشرہ میں اس طور پر

(١) أخرجه الترمذي، كتاب صفة القيامة، باب بدون ترجمة ٢ / ٧٨.

(٢) المرقاة ١ / ٣٨٦.

رکھے کہ اس کی ذات سے کسی کو تکلیف نہ ہو، اس کے بارے میں سب لوگ بے فکر اور مطمئن رہیں۔

یہ تین باتیں جس شخص کے اندر ہوں وہ جنتی ہے، اس پر ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! ان صفات کے لوگ آج کے زمانہ میں تو بہت ہیں آئندہ کا حال معلوم نہیں، اس پر فرمایا کہ میرے بعد کے زمانہ میں بھی ان صفات کے لوگ ہونگے، کیونکہ اس امت سے خیر کبھی ختم نہیں ہوگی، کمی وزیادتی کا فرق تو رہے گا لیکن ایسا نہیں ہوگا کہ خیر بالکلیہ ختم ہوجائے۔

بوائقه: جمع بائقة بمعنی شر اور فتنہ۔

> ۱۶۹ / ۳۹: **وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّكُمْ فِيْ زَمَانٍ مَنْ تَرَكَ مِنْكُمْ عُشْرَ مَاأُمِرَبِهٖ هَلَكَ، ثُمَّ يَأْتِيْ زَمَانٌ مَنْ عَمِلَ مِنْهُمْ بِعُشْرِ مَاأُمِرَبِهٖ نَجَا"** (رواه الترمذي)[۱]
>
> **ترجمه**: حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: تم ایسے زمانہ میں ہو کہ اگر تم میں سے کوئی شخص ان احکام کا دسواں حصہ بھی چھوڑ دے جن کا حکم دیا گیا ہے تو وہ ہلاک ہوجائے گا، لیکن ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ اگر کوئی شخص ان احکام کے دسویں حصہ پر بھی عمل کرلے جن کا حکم دیا گیا ہے تو وہ نجات پا جائے گا۔

تشریح حدیث

اخیر زمانہ میں ''مامور بہ'' کے دسویں حصہ پر بھی عمل نجات کے لئے کافی:

اس حدیث پاک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کا بعد والے زمانوں سے موازنہ فرمایا اور پھر اتباع شریعت کا حکم دیا، یہ حدیث اہم ہے، اور ترجمۃ الباب کے دونوں جزء کتاب وسنت دونوں سے متعلق ہے، حاصل حدیث یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت سے معاشرہ صحیح ہوگیا تھا اور دین کا غلبہ ہوگیا تھا اور جب معاشرہ صحیح ہوتا ہے تو دین پر عمل کرنا آسان ہوتا ہے، لہٰذا تمہارے لئے پورے دین پر عمل کرنا لازم ہے لیکن بعد میں جب معاشرہ بگڑ جائے گا تو اس وقت دین کے دسویں حصے پر عمل کرکے بھی آدمی نجات پا جائے گا۔

---

(۱) أخرجه الترمذی، کتاب الفتن، باب بدون ترجمة ۲ / ۵۲.

''ماامر به'' سے مراد:

عشر ماأمر به: اس کے کئی مطلب بیان کئے گئے ہیں:

(۱) ملاعلی قاری، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ وغیرہ نے فرمایا کہ اس سے مراد دین کا ایک خاص شعبہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب معاشرہ صحیح تھا اور دین غالب تھا تو اس وقت امر بالمعروف کے دسویں حصے کو چھوڑنا بھی ہلاکت کا سبب تھا کیونکہ یہ ترک بلا عذر تھا، بعد میں جب معاشرہ خراب ہوجائے گا دین کمزور ہوجائے گا اور دین کے معاون ومددگار کم ہوجائیں گے اس وقت امر بالمعروف مشکل ہوگا، اس وقت اس کے دسویں حصے کو ادا کرنے سے بھی نجات ہوجائے گی، کیونکہ باقی نوحصوں کا ترک عذر کی وجہ سے ہوگا کہ ان کو اپنے جان وعزت کی حفاظت ضروری ہوگی۔(۱)

(۲) حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا ہے کہ ''عُشُر ماامر به'' سے اخلاص مراد ہے اور معنی یہ ہیں کہ اچھے معاشرہ سے فائدہ اٹھاؤ اور مکمل اخلاص اختیار کرو، بعد کے زمانوں میں حب دنیا کا غلبہ ہوگا اور اخلاص حاصل کرنا دشوار ہوگا اس وقت اس کے دسویں حصے سے بھی کام چل جائے گا۔(۲)

(۳) بعض نے کہا کہ اس سے مراد فرائض ونوافل کا مجموعہ ہے اور فرائض؛ نوافل اور سنن کا تقریباً دسواں حصہ ہیں، مطلب یہ ہے کہ اگر اِس زمانے میں مجموعۂ عبادات کے دسویں حصے کو بھی چھوڑا تو ہلاک ہوجاؤ گے یعنی مرتبہ گھٹ جائے گا اور بعد کے زمانے میں عبادت دشورا ہوجائے گی اس وقت صرف ان کا دسواں حصہ یعنی فرائض کی پابندی سے بھی نجات ہوجائے گی۔

(۴) علامہ طیبیؒ نے فرمایا کہ: اس سے سنن ومندوبات مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اِس زمانہ میں خیر کا غلبہ ہونے کی وجہ سے عبادت کی ادائیگی سہل ہے اس لئے تمام سنتوں کو اختیار کرنا ضروری ہے آئندہ زمانہ میں شرائع اسلام اجنبی ہوجائیں گے اس وقت اگر سنتوں کے دسویں حصہ پر عمل کرلیا جائے گا تو بھی نجات ہوجائے گی، یہ رائے بھی اچھی ہے اس لئے کہ اس صورت میں یہ روایت باب کے مناسب ہوجائے گی۔(۳)

---

(۱) المرقاة ۱/۳۸٦ واللمعات ۱/۵۰۱.

(۲) الكوكب الدري ۲/٦٨ نیز ۱/۴۲۹ بھی ملاحظہ فرمائیں.

(۳) شرح الطيبى ۱/۳۷٦.

عمل کم ثواب زیادہ:

الحاصل مذکورہ تفصیل کے مطابق ''ماامربہ'' کی مقدار میں کمی کے باوجود نجات حاصل ہوجائے گی اور ثواب پورا ملے گا، اور ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ایسے فتنہ کے زمانہ میں دوراول کے مقابلہ عمل کے ثواب کی مقدار بھی بڑھادی جائے گی چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں دین پر ثابت قدم رہنا چنگاری پکڑنے کے برابر ہوگا، (ایسے زمانہ میں) عمل کرنے والے کو پچاس آدمیوں کے عمل کے برابر ثواب ملے گا، کسی نے پوچھا: یارسول اللہ! ہم میں سے پچاس کے برابر ثواب ملے گا یا انہیں میں کے پچاس کے برابر؟ آپ نے فرمایا: تم (صحابہ) میں سے پچاس کے برابر[1] پس فتنہ کے زمانہ میں ماامر بہ کی مقدار کم بھی کافی ہوجائے گی اور ثواب بے حد ملے گا فَلِلّٰه دَرُّهٗ۔

۱۷۰ / ۴۰: وَعَنْ أَبِيْ أُمَامَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''مَاضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدىً كَانُوْا عَلَيْهِ إِلَّا أُوْتُوْا الْجَدَلَ'' ثُمَّ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذِهِ الآيَةَ: مَاضَرَبُوْهُ لَكَ إِلَّا جَدَلاً بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ. (رواه أحمد، والترمذي، وابن ماجه)[2]

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''ہدایت پانے کے بعد کوئی قوم گمراہ نہیں ہوئی مگر اس میں عناد پیدا ہوجاتا ہے (جو بسا اوقات گمراہی میں پھنسے رہنے کا ذریعہ بن جاتا ہے) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت شریفہ پڑھی ''مَاضَرَبُوْهُ لَكَ إِلَّا جَدَلا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ'' یعنی وہ تمہارے لئے نہیں بیان کرتے مثال مگر جھگڑنے کے لئے بلکہ وہ جھگڑالو قوم ہے۔ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح حدیث

بحث وجدال ضلالت وگمراہی کا سبب:

اس حدیث میں ہدایت کو اختیار کرنے کا اور جدال وعناد سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے اور ہدایت نام ہے

(۱) ترمذی كتاب التفسير (۳۰۵۸)

(۲) أخرجه الترمذي، في التفسير، باب من سورة الزخرف ۲/ ۱۶۱، وابن ماجه، كتاب السنة، المقدمة، باب اجتناب البدع والجدل ص۶. وأحمده /۲۵۲ برقم ۲۲۲۱۸ و ۵/ ۲۵۶ برقم ۲۲۲۵۸.

کتاب وسنت دونوں کی اتباع کا اس لئے اس میں اعتصام بالکتاب والسنۃ دونوں کا بیان ہوا، مضمون حدیث یہ ہے کہ اگر کوئی قوم ہدایت پر ہو اور پھر وہ بحث ومناظرہ میں پڑجائے اور اسی کو اپنا شغل بنالے تو یہ چیز بسا اوقات ضلالت وگمراہی کا سبب ہوجاتی ہے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مضمون کی تائید میں یہ آیت پڑھی ''مَاضَرَبُوْهُ لَکَ اِلَّا جَدَلاً بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ''(۱)

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ''اِنَّکُمْ وَمَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ، اَنْتُمْ لَهَاوَارِدُوْنَ'' یعنی تم اور جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو جہنم کا ایندھن بنوگے، تم اس میں ضرور داخل ہوگے، تو مشرکین میں سے ایک شخص ابن الزبعری نے اعتراض کیا کہ نصاری عیسی کو خدا مانتے ہیں اور بہت سے لوگ ملائکہ کو اپنا خدا مانتے ہیں، ان کی پرستش کرتے ہیں، اگر ہمارے بت جہنم میں جائیں گے تو عیسیٰ علیہ السلام اور ملائکہ بھی جہنم میں جائیں گے، پھر ہمیں اپنے بتوں کے جہنم میں جانے کا کوئی غم نہیں، اس پر اس کے ساتھیوں نے تالیاں بجائیں، اور بزعم خود خوش ہوئے، مذکورہ آیت اسی موقعہ پر نازل ہوئی۔

اس آیت میں بتایا گیا کہ ان کا مقصد عناد ہے، اس لئے کہ ان کے اعتراض کا جواب خود آیت کے الفاظ سے ظاہر ہے کیونکہ آیت کریمہ میں لفظ ''ما'' ہے نہ کہ ''من'' اور ''ما'' غیر ذوی العقول کے لئے آتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ملائکہ اس کا مصداق نہیں ہوسکتے کہ وہ تو ذوی العقول ہیں، یہ معترضین اہل زبان ہیں، حقیقت کو جانتے ہیں، لیکن ہدایت سے اعراض کرنے کی وجہ سے ان کے اندر عناد پیدا ہوگیا، اس لئے ناحق اعتراض کیا، پس قرآن وسنت میں ایسی بے جا بحثیں اور مناظرے گمراہی اور قرآن وسنت سے دوری کا ذریعہ بن جاتی ہیں، لہذا ان سے اجتناب لازمی ہے۔(۲)

۱۷۱/۴۱: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ: ''لاتَشُدِّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ فَيُشَدِّدَاللّٰهُ عَلَيْكُمْ، فَاِنَّ قَوْماً شَدَّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ، فَشَدَّدَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ، فَتِلْكَ بَقَايَاهُمْ فِي الصَّوَامِعِ وَالدِّيَارِ: ''رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَاكَتَبْنَا هَا عَلَيْهِمْ''(رواه ابوداود)(۳)

(۱) من سورة الزخرف:۵۸.

(۲)اللمعات ۱/۵۰۲.

(۳)اخرجه أبوداود، كتاب الأدب باب في الحسد۲/۶۷۲.

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم اپنے نفس پر سختی نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر سختی کردے گا، ایک قوم (نصاری) نے اپنے نفس پر سختی کی تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سختی کی، پس آج کل جولوگ صومعوں اور دیار میں پائے جاتے ہیں وہ انھیں میں کے باقی ماندہ ہیں، یہ رہبانیت انھوں نے ایجاد کی، ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھی'' (ابوداود)

تشریح حدیث

نفس پر تشدد کی ممانعت اور اعتدال کا حکم:

اس حدیث پاک میں بتایا گیا ہے کہ عبادت وہی معتبر ہے جو سنت کے مطابق ہو ورنہ اس سے اللہ کی رضا حاصل نہیں ہوتی، اور سنت طریقہ اعتدال والا ہے **کماقال صلی الله علیه وسلم: اصلی وارقد، اصوم وافطر**، اس لئے آدمی کو عبادت میں اپنے اوپر سختی نہیں کرنی چاہئے، حضرت عبداللہ بن عمرو کو عبادت کا بہت شوق تھا کہ دن میں روزہ رکھتے اور رات بھر نوافل پڑھتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو سمجھاتے: ''**ان لنفسک علیک حقا وان لاهلک علیک حقا**'' لیکن غلبہ شوق کی وجہ سے مجاہدہ جاری رکھا پھر بڑھاپے میں افسوس کرتے تھے کہ اب قوت نہیں رہی اور پہلی جیسی مواظبت باقی نہیں رہی، حالانکہ اللہ کو مواظبت پسند ہے۔

فیشدد اللہ علیکم: سختی کی صورت نبی کی حیات میں یہ ہے کہ اللہ وحی کے ذریعہ اس عمل کو واجب کردیتے ہیں جیسا کہ پہلے تفصیل آچکی ہے، اور نبی کے بعد سختی کی شکل یہ ہے کہ آدمی اگر ان اعمال شاقہ کی نذر مان لے یا قسم کھالے تو نذر اور یمین کی وجہ سے شریعت کی طرف سے وہ عمل واجب ہوجاتا ہے۔

نصاری کا اپنے نفس پر تشدد کا نتیجہ:

فان قوماً شددوا: اس کی تفصیل یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد نصاری میں بہت سے اہل حق تھے لیکن اکثریت گمراہوں کی نافرمانوں کی اور عیش پرستوں کی تھی، اہل حق حضرات ان نافرمانوں کو اللہ کا خوف دلاتے، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے، عیش پرستوں کو اس سے ناگواری ہوتی، وہ اس کو اپنی بے

مہار زندگی میں خلل سمجھتے، اس لئے انہوں نے اپنے امراء وحکام سے شکایت کی اور کہا کہ یہ دین کے دعویدارلوگ ہمیں پریشان کرتے ہیں، آپ ان سے کہیں کہ ہم سے تعرض نہ کریں، ہمیں ہمارے حال پر چھوڑیں، تو امراء نے انکومنع کیا، اس پراہل حق نے کہا کہ اگرہم یہاں ان کے درمیان رہیں گے تو ہمارا بھی دین محفوظ نہیں رہے گا، ان کی بدعملی ہمارے اندر بھی سرایت کرے گی، لہذا وہ اپنے دین کو بچانے کے مقصد سے پہاڑوں اورجنگلوں میں چلے گئے اوروہاں یکسوئی سے عبادت میں مشغول رہنے کے لئے عبادت خانے بنالئے اورقرب الٰہی کے لئے اپنے اوپر اعمال شاقہ کو لازم کیا کہ ہم نکاح نہیں کریں گے، لذت کی چیزیں نہیں کھائیں گے، لوگوں سے اختلاط نہیں رکھیں گے، اسی کو''رہبانیت'' کہاجاتاہے، شروع میں یہ لوگ مخلص تھے اس لئے اللہ کی مدد بھی اتری کہ اللہ نے لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدافرمادی، لوگ ان کو اللہ کا برگزیدہ بندہ سمجھ کر دعاء کے لئے ان کے پاس آنے لگے، حتی کہ عورتیں بھی آنے لگیں، لیکن بعد میں یہ لوگ اس رہبانیت کا حق ادانہ کرسکے ان کے قلوب میں رفتہ رفتہ دنیا کی محبت آنے لگی، ریاضت ومجاہدوں کو چھوڑ بیٹھے، عیش پرستی میں اورگناہوں اوربہت سے زناکاری میں مبتلا ہوگئے، یہاں حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی کا تذکرہ کیاہے اورآیت کریمہ میں ان کے اس طرزعمل پرنکیر کی۔

البتہ پھربھی ان میں سے بعض واقعۃً حق پرست تھے وہ حق پرقائم رہے اورآئندہ کے لئے حق کے متلاشی رہے، وہ نبی آخرالزماں کی آمد کی خبرتوریت وانجیل میں پڑھ چکے تھے، اس لئے نبی آخرالزماں کے منتظر رہے اور ان ہی عبادت کدوں میں عبادت ومجاہدوں میں لگے رہے، جب ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت معلوم ہوئی تو ان میں سے بہت سے حاضرخدمت ہوئے اورحضور صلی اللہ علیہ وسلم پرایمان لاکر ہمیشہ ہمیش کے لئے کامیاب قرارپائے۔

١٧٢ / ٤٢ : وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''نَزَلَ الْقُرْآنُ عَلٰى خَمْسَةِ أَوْجُهٍ: حَلالٍ، وَحَرَامٍ، وَمُحْكَمٍ، وَمُتَشَابِهٍ، وَأَمْثَالٍ، فَأَحِلُّوْا الْحَلالَ، وَحَرِّمُوْا الْحَرَامَ،وَاعْمَلُوْا بِالْمُحْكَمِ وَآمِنُوْا بِالْمُتَشَابِهِ، وَاعْتَبِرُوْا بِالأَمْثَالِ'' هٰذَا لَفْظُ الْمَصَابِيْحِ، وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ فِيْ ''شُعَبِ الإِيْمَانِ''وَلَفْظُهُ: ''فَاعْمَلُوْا بِالْحَلالِ، وَاجْتَنِبُوْا الْحَرَامَ، وَاتَّبِعُوْا الْمُحْكَمَ''(١)

(١)أخرجه البغوي في مصابيح السنة، باب الاعتصام بالكتاب والسنة ١/٤١برقم ١٣٥، والبيهقي في شعب الإيمان.٣/٥٤٨(٢٠٩٥)

ترجمه: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قرآن کریم پانچ صورتوں پر نازل ہوا ہے(۱)حلال (۲)حرام (۳)محکم (۴)متشابہ (۵)امثال لہذا تم حلال کو حلال جانو، حرام کو حرام جانو، محکم پر عمل کرو، متشابہ پر ایمان لاؤ، اور امثال سے عبرت حاصل کرو، یہ الفاظ مصابیح کے ہیں اور بیہقی نے جو روایت شعب الایمان میں نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: ''لہذا حلال پر عمل کرو، حرام سے بچو اور محکم کی پیروی کرو''

تشریح حدیث

آیات قرآنیہ کی انواع اوران کے اعتصام کی کیفیت:

اس حدیث میں اعتصام بالکتاب کا بیان ہے اور مضمون کے اعتبار سے آیات قرآنیہ کی تقسیم بیان فرمائی گئی ہے کہ آیات قرآنیہ پانچ قسم کی ہیں اور ہر قسم کا مطالبہ الگ ہے جس قسم کا جو مطالبہ ہے اس کو پورا کیاجائے، اور وہ اقسام یہ ہیں:

(۱)بعض آیات میں کچھ چیزوں کی حلت کا بیان ہے جیسے ''کُلُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنٰکُم''
(۲)بعض میں کچھ چیزوں کی حرمت بیان کی گئی ہے جیسے ''اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةَ وَالدَّمَ الخ''
(۳)بعض آیات محکم ہیں جن کی مراد واضح ہے جیسے ''سبحانه ان یکون له ولد'' (۴)بعض متشابہ ہیں جن کی مراد خفی ہے جیسے ''وجاء ربک الخ'' (۵)بعض امثال ہیں جیسے امم سابقہ کے قصے اور واقعات وغیرہ اور وہ آیات جو صراحۃ لفظ مَثَل سے قرآن میں مذکور ہیں۔

آیات حلت کا مطالبہ ہے کہ ان میں مذکور چیزوں کو حلال سمجھو اور آیات حرمت میں مذکور چیزوں کو حرام سمجھو اور ان سے بچو، محکم پر عمل کرو، متشابہ پر ایمان لاؤ اور امثال سے عبرت حاصل کرو، پس جو اس تفصیل کے مطابق قرآن وسنت پر عمل کرتا ہے وہ راہ یاب ہے اور جو اس میں ردوبدل کرتا ہے وہ گمراہ ہے۔

۱۷۳/ ۴۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''اَلأَمْرُ ثَلاثَةٌ: أَمْرٌ بَيِّنٌ رُشْدُهُ فَاتَّبِعْهُ، وَأَمْرٌ بَيِّنٌ غَيُّهُ فَاجْتَنِبْهُ، وَأَمْرٌ اخْتُلِفَ فِيْهِ فَكِلْهُ إِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ'' (رواه أحمد) (۱)

(۱)ولم أعثر على هذا الحديث فى مسند أحمد، نعم وجدته فى ''الكبير للطبرانى ۸/ ۲۷۱۵ برقم ۱۰۷۷٤''

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: امور(احکام) تین طرح کے ہیں(۱)وہ امر جس کا ہدایت ہونا ظاہر ہے اس کی پیروی کرو(۲)وہ امر جس کا گمراہی ہونا ظاہر ہے اس سے بچو،(۳) وہ امر جو مختلف فیہ ہے اس کو اللہ تعالیٰ شانہ کے سپرد کردو۔(احمد)

تشریح حدیث

احکام شریعت کی انواع اوان کے اعتصام کی کیفیت:

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ قرآن وسنت میں تین قسم کے احکام ہیں:

(۱)بعض کا ہدایت ہونا واضح ہے(۲) اور بعض کا گمراہی ہونا واضح ہے (۳)اور بعض میں اختلاف ہے تو واضح ہدایات کا اتباع کرو اور واضح ضلالت سے بچو اور اختلافی چیز کو اللہ کے حوالے کرو، پس اعتصام بالکتاب والسنۃ اس کیفیت اور طرز کے ساتھ ہو۔

امر بین رشده: جیسے اصول اسلام اور اصول عبادات۔[۱]

اَمرٌ بیّنٌ غَیُّہٗ: جیسے کفر،شرک اور معاصی۔

أمر اختلف فيه: اس سے کیا مراد ہے؟: (۱)بعض نے کہا کہ اس سے مراد متشابہات ہیں، ان میں اسلم راستہ تفویض کا ہے[۲] (۲) بعض نے کہا کہ ایسے امور مراد ہیں جن کے بارے میں لوگ اپنی طرف سے اختلاف کرتے ہیں، جیسے تعیین وقت قیامت، شب قدر کی تعیین، ساعت مستجابہ کی تعیین، ان چیزوں کے متعلق نصوص میں جس قدر صراحت آگئی ہے اس حد تک گفتگو صحیح ہے، اس حد سے متجاوز ہو کر اپنی عقل سے رائے زنی صحیح نہیں۔[۳]

الفصل الثالث

١٧٤/٤٤: عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

(١)المرقاة ١/ ٣٩٠.

(٢) فتح الإله٢/ ٣٤.

(٣)شرح مصابيح السنة لابن الملك الرومي الحنفي١/ ١٨٦.

"إِنَّ الشَّيْطَانَ ذِئْبُ الإِنْسَانِ كَذِئْبِ الْغَنَمِ،يَأْخُذُالشَّاذَّةَ وَالْقَاصِيَةَ وَالنَّاحِيَةَ، وَإِيَّاكُمْ وَالشِّعَابَ، وَعَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَالْعَامَّةِ.(رواه احمد)(۱)

ترجمہ : حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: ''شیطان انسان کا بھیڑیاہے جس طرح بکری کا بھیڑیاہوتاہے کہ وہ اس بکری کو اٹھالے جاتاہے جوریوڑ سے نفرت کی وجہ سے نکل گئی ہو،یاحرص کی وجہ سے دور چلی گئی ہو، یا غفلت ولاپرواہی کی وجہ سے ریوڑ سے علیحدہ ہوگئی ہو،اورتم پہاڑ کی گھاٹیوں (یعنی گمراہی والے راستوں) سے بچو نیز جماعت وعامۃ المسلمین کولازم پکڑے رہو'' (احمد)

تشریح حدیث

عقیدہ وعمل میں جماعت مسلمین سے علیحدگی شیطان کا لقمہ بن جانے کا سبب:

إن الشيطان ذئب الإنسان الخ :اس حدیث میں اعتصام بالجماعت کاحکم ہے، جماعت مسلمین کو لازم پکڑنے کی تاکید کی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امت پرنہایت شفیق ومہربان تھے جماعت حقہ سے انحراف کے جونقصانات اورمفاسد ہیں ان کو ایسی واضح مثالوں سے سمجھایا جس سے عوام وخواص سب متنبہ ہوجائیں اورحق وناحق کو پہچان لیں، یہاں ایک واضح مثال بیان فرمائی اورشیطان کوبھیڑیے کے ساتھ تشبیہ دی، وجہ شبہ ہلاکت وفساد ہے، بھیڑیا بکریوں کی ہلاکت کا سبب ہوتاہے اورشیطان انسان کی دینی ہلاکت کا سبب ہوتاہے، بکری اپنے ریوڑ میں رہے تو چرواہے کی نگرانی میں ہونے کی وجہ سے کافی حدتک محفوظ رہتی ہے، لیکن اگربکری ریوڑ سے الگ ہوجائے تو بھیڑیا اس کوتنہا پاکر شکار کرلیتاہے، تین قسم کی بکریاں ریوڑ سے الگ ہوتی ہیں اوربھیڑیے کا شکاربن جاتی ہیں جس کا بیان یہ ہے:

(۱) **يأخذ الشاذه** : **شاذة** وہ بکری جوریوڑ سے اُنس نہ ہونے کی وجہ سے الگ ہو، یعنی بعض بکریوں میں ریوڑ سے انس نہیں ہوتاوہ ریوڑ کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی ہے اس لئے وہ ریوڑ سے علیحدہ ہوجاتی ہے اورالگ جگہ میں چرنا پسند کرتی ہے۔(۲)

(۱)أخرجه أحمد في مسنده ۵/۲۳۲برقم ۲۲۰۸۲، و۵/۲۴۳برقم ۲۲۱۶۰.

(۲) طيبي۱/۳۸۰.

(۲) والقاصیه: ''قاصیة'' وہ بکری جو چارہ کے لالچ میں ریوڑ سے علیحدہ ہوجائے کیونکہ سب کے ساتھ رہے گی تو چارہ کم ملے گا۔(۱)

(۳) والناحیة: ''ناحیة'' جو بکری غفلت، بھولے پن اور لاپرواہی کی وجہ سے الگ ہوجائے کہ وہ چرتے ہوئے ریوڑ سے دور نکل جاتی ہے اور اسے احساس نہیں ہوتا۔(۲)

جماعتِ مسلمین سے علیحدگی کے اسباب:

اسی طرح آدمی جماعت مسلمین اور سوادِ اعظم سے تین وجہوں سے علیحدگی اختیار کرتا ہے:

(۱) بعض کی طبیعت میں کجی ہوتی ہے، ان کو جماعت سے انس نہیں ہوتا، وہ اپنے لئے ہر چیز میں امتیاز کو پسند کرتے ہیں، اس لئے سواد اعظم کے بالمقابل کچھ نئے خیالات وضع کر کے علیحدگی کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں، ان لوگوں کی مثال ''شاةِ شاذة'' کی ہے، اردو زبان میں ایسے لوگوں کے لئے کہاوت ہے کہ وہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا چاہتے ہیں۔

(۲) بعض مرتبہ فرق ضالہ کی طرف سے گاڑی، کوٹھی، خوبصورت عورت اور بڑی ملازمت وغیرہ کی پیش کش کی جاتی ہے، آدمی لالچ میں آکر ان کے غلط عقائد اور نظریات کو قبول کر لیتا ہے اور عمل وعقیدہ میں جماعتِ حقہ سے الگ ہوجاتا ہے، یہ شخص اس بکری کی طرح ہے جو چارہ کے لالچ میں ریوڑ سے دوری اختیار کرے یعنی ''قاصیة'' کی طرح۔

(۳) بعض لوگوں میں تیقظ کم ہوتا ہے، بھولا پن غالب ہوتا ہے، فرق ضالہ کی چرب زبانی اور ان کی قلم کی روانی سے ان کو حق پر سمجھ لیتے ہیں، اور ان کے ہمراہی ہوجاتے ہیں، یہ ''شاة ناحیة'' کے مثل ہیں، اس قسم کا ابتلاء ہمارے بہت سے ناپختہ علماء کو پیش آجاتا ہے کہ وہ باطل کے سطحی دلائل اور ان کے کلام کی سلاست سے مرعوب ومتأثر ہوکر ان کے حق پر ہونے کا نہ صرف اپنا ذہن بنا لیتے ہیں بلکہ ان کے ترجمان بن جاتے ہیں۔

ان اقسام ثلثہ میں امر مشترک عمل وعقیدہ میں جماعت مسلمین اور امت کے سواد اعظم سے علیحدہ ہوجانا ہے، سواد اعظم پر نصرت الٰہی سایہ فگن ہوتی ہے جیسا کہ آئندہ ایک حدیث میں اس کی طرف اشارہ

(۱) اللمعات ۱/ ۵۰۵.

(۲) المرقاة ۱/ ۳۹۱.

آ جائے گا اور اس نصرت اور رحمت کی برکت سے بندہ اغواء شیطانی سے محفوظ رہتا ہے، سواد اعظم سے منحرف ہوجائے تو اس نصرت و رحمت سے محرومی ہوجاتی ہے، شیطان اس کو تنہا پا کر یعنی نصرت الٰہی سے محروم پا کر اس کو شکار کر لیتا ہے اور قسم قسم کی گمراہی میں ڈالدیتا ہے جس سے نجات پانی مشکل ہوجاتی ہے، کیونکہ اغواء شیطانی سے حفاظت اصل اللہ کی رحمت اور اس کے فضل سے ہوتی ہے، اللہ کا پاک ارشاد ہے: "اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ"

جماعت کے ساتھ چلنے کی تاکید:

ایاکم والشعاب الخ: عرب میں پہاڑ بہت ہیں، آدمی کے منزل مقصود پر پہنچنے کے لئے کچھ پہاڑی راستے گھاٹیوں کے درمیان سے ہوتے تھے، یہ راستے مختصر لیکن پرخطر ہوتے، چور، ڈاکو، سانپ بچھو اور درندوں کا بڑا خطرہ رہتا، ان گھاٹیوں والے راستوں میں کم لوگ چلتے، دوسرا بڑا راستہ پہاڑ سے الگ میدانی ہوتا وہ ذرا طویل ہوتا لیکن امن والا ہوتا اس لئے اکثر لوگ اسی میدانی بڑے راستہ کو اختیار کرتے، ایسے موقعہ پر کہا جاتا: **ایاکم والشعاب** کہ پرخطر گھاٹیوں والے راستہ پر نہ چلو بلکہ اس راستہ پر چلو جس پر بڑی جماعت اور اکثر لوگ چل رہے ہیں، اس کے بعد کلام عرب میں یہ جملہ تفرق سے اجتناب کے لئے مثل اور کہاوت بن گیا۔

١٧٥ / ٤٥ : وَعَنْ أَبِیْ ذَرٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْراً فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهٖ" (رواه احمد، وأبوداود)[1]

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی (یعنی ایک ساعت کیلئے بھی) جدا ہوا، اس نے اسلام کی رسی اپنی گردن سے نکال دی" (أحمد، ابوداود)

تشریح حدیث

جماعت مسلمین سے علیحدگی سے اسلام سے نکل جانے کا خطرہ:

اس حدیث میں بھی جماعت مسلمین کے ساتھ جڑے رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اور جماعت سے افتراق کا

(١) أخرجه أبوداود، كتاب السنة، باب فی قتل الخوارج ٢/ ٦٥٥ وأحمد ٥/ ١٨٠ برقم ٢١٦٠١و٢١٦٠٢.

مفسدہ بتایا گیا ہے۔

من فارق الجماعة شبراً: ''شبراً'' ظرف مکان ہے لیکن مراد ظرف زمان ہے، معنی یہ ہیں کہ جو شخص تھوڑی دیر کے لئے بھی جماعت سے (عمل وعقیدہ میں) الگ ہوا، تو گویا کہ اس نے اسلام کی رسی اپنے گلے سے نکال دی۔

اس روایت میں مسلمان کو اس جانور کے ساتھ تشبیہ دی گئی جس کے گلے میں رسی پڑی ہوئی ہو وہ جانور اپنے مالک کا مطیع ہوتا ہے مالک جدھر لے جانا چاہتا ہے وہ ادھر ہی جاتا ہے، یہی حال مسلمان کا ہے جب وہ مسلمانوں کے سواد اعظم کے ساتھ رہے تو شریعت کا پابند رہتا ہے اور گمراہی سے محفوظ رہتا ہے، سواد اعظم سے علیحدہ ہونے سے جادہ شریعت سے منحرف ہوکر بے مہار ہوجاتا ہے۔

فقد خلع ربقة الاسلام: اس روایت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سواد اعظم سے علیحدہ ہونے سے وہ مسلمان نہیں رہے گا، حالانکہ محض ترک اجماع پر کفر کا حکم نہیں ہے؟ لہٰذا یہاں تاویل کریں گے کہ اسلام سے مراد کمال اسلام ہے کہ ایسا شخص کامل مسلمان نہیں رہے گا، یا پھر یہ حکم زجراً ہے اور معنی یہ ہیں کہ جماعتِ مسلمین کی مخالفت سے گمراہی کے گڈھے میں گرجانے کا خطرہ پیدا ہوجاتا ہے جیسا کہ بسا اوقات بعض معاملات میں معمولی لاپرواہی اور کوتاہی بڑے نقصان کا سبب بن جاتی ہے جس کی وجہ سے ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا ہے سواد اعظم اور جماعت مسلمین کے ساتھ جڑے رہنے میں اسی قسم کی احتیاط اور بیداری مطلوب ہے۔

۱۷۶/ ٤٦: وَعَنْ مَالِكِ بْنِ أَنَسٍ مُرْسَلاً قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "تَرَكْتُ فِيْكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَاتَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّةُ رَسُوْلِهِ" (رواه في "الموطا") (۱)

ترجمہ: حضرت مالک بن انسؓ سے مرسلا مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک تم انہیں پکڑے رہوگے ہرگز گمراہ نہیں ہوسکتے، وہ کتاب اللہ (قرآن مجید) اور سنت رسول اللہ (احادیث) ہیں۔ (مؤطا)

(۱) أخرجه مالک في المؤطاء، كتاب القدر، باب النهي عن القول بالقدر ۲/ ۸۹۹.

تشریحِ حدیث

کتاب وسنت کا تمسّک گمراہی سے حفاظت کا ذریعہ:

مطلب ظاہر ہے کہ کتاب وسنت سراسر ہدایت اور ہدایت کا سرچشمہ ہیں، امت کتاب وسنت پر قائم رہے گی تو گمراہی سے محفوظ رہے گی۔

حدیث مرسل:

صاحبِ مشکوۃ نے اس روایت کو مرسل کہا، محدثین کی اصطلاح میں مرسل وہ راوایت ہے جس میں تابعی کے بعد راوی ساقط ہو، جبکہ امام مالکؒ تابعی نہیں بلکہ تبع تابعی ہیں، لہٰذا یہاں تابعی بھی ساقط ہیں اور صحابی بھی ساقط ہیں، پھر اسکو مرسل کہنا کیوں کر صحیح ہے؟

اس کا حل یہ ہے کہ بعض محدثین کے یہاں تابعی سے نیچے کا راوی مافوق کے تمام رواۃ کو ساقط کردے وہ بھی مرسل ہے یہاں مرسل سے یہی مراد ہے۔(۱)

۷۷ / ۴۷۱ : وَعَنْ غُضَيْفِ بْنِ الْحَارِثِ الثُّمَالِيِّ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَاأَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَةً إِلاَّ رُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ؛ فَتَمَسُّكٌ بِسُنَّةٍ خَيْرٌمِنْ إِحْدَاثِ بِدْعَةٍ"(رواه أحمد)(۲)

ترجمہ : حضرت غضیف بن حارث ثمالیؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: جب کوئی قوم (دین میں) نئی بات ایجاد کرتی ہے تو اسکے مثل ایک سنت اٹھالی جاتی ہے لہٰذا سنت کومضبوط پکڑنا نئی بات (بدعت) ایجادکرنے سے بہتر ہے۔(احمد)

تشریحِ حدیث

احوال غضیف بن حارث:

غُضیف: تصغیر کے ساتھ ہے، والد کا نام حارث اورنسبت ''ثمالی'' ہے،ان کے صحابی ہونے میں

(۱)المرقاۃ ۱ / ۳۹۲.

(۲)أخرجه أحمد ٤ / ١٠٥ابرقم ١٧٠١١.

اختلاف ہے، صاحب مشکوٰۃ نے ان کوصحابہ میں شمار کیا ہے، ان کا خود بیان ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اور مصافحہ کیا، لہٰذا راجح یہی ہے کہ یہ صحابی ہیں۔[1]

بدعت ایجاد کرنے کا نقصان:

اس حدیث میں بدعت ایجاد کرنے کا نقصان بتایا گیا ہے کہ اس کی نحوست سے سنت اٹھالی جاتی ہے یعنی اس پر عمل کی توفیق سلب ہوجاتی ہے۔

الارفع مثلها: اس میں مماثلت فی الکمیۃ والکیفیۃ دونوں کا احتمال ہے، اول صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جتنی بدعات ایجاد کی جائیں گی اتنی ہی سنتوں کو اٹھالیا جائے گا اور ثانی صورت میں مطلب ہوگا کہ جتنی بڑی بدعت ایجاد کی جائے گی اتنی ہی بڑی سنت سے محرومی ہوگی۔

فتمسک بسنة خیر: یعنی بدعت حسنہ خواہ کتنی ہی بڑی اوراہم ہو لیکن اس کے مقابلے میں معمولی سنت زیادہ بہتر ہے اوراس میں خیر وبرکت زیادہ ہے، شراح نے فرمایا کہ سنۃٌ کی تنوین تقلیل کے لئے ہے اور بدعۃ کی تنوین تکثیر کے معنی کے لئے ہے۔

١٧٨ / ٤٨ : **وَعَنْ حَسَّانٌ قَالَ: مَاابْتَدَعَ قَوْمٌ بِدعَةً فِيْ دِيْنِهِمْ إِلَّا نَزَعَ اللّٰهُ مِنْ سُنَّتِهِمْ مِثْلَهَا، ثُمَّ لايُعِيْدُهَا إِلَيْهِمْ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ.** (رواه الدارمي)[2]

ترجمہ: حضرت حسانؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی قوم اپنے دین میں نئی بات ایجاد کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کی سنت میں سے اس کا مثل نکال لیتا ہے اور پھر وہ سنت قیامت تک ان کی طرف واپس نہیں کی جاتی۔ (دارمی)

تشریحِ حدیث

احوال حسان بن ثابتؓ:

آپ شاعر رسول ہیں، انصاری وخزرجی ہیں، کنیت ابوالولید ہے، حضرت حسانؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

(١) الإصابة ٤ / ٣١٤-٣١٥، والمرقاة ١ / ٣٩٢.

(٢) أخرجه الدارمي في المقدمه، باب اتباع السنة ١ / ٤٩ برقم ٩٨.

کی طرف سے کفار ومشرکین کے جواب میں ان کی ہجو کیا کرتے تھے،اسلام کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کرتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے باقاعدہ منبر بچھواتے، البتہ فطرۃً کم ہمت اور کم حوصلہ واقع ہوئے تھے، جس کا ایک دلچسپ قصہ یہ ہے کہ ایک موقعہ پر یہ کسی قلعہ میں عورتوں کے ساتھ تھے، ایک یہودی قلعہ پر چڑھ آیا، حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی بھی اسی قلعہ میں تھیں، انہوں نے حضرت حسانؓ سے اس کے دفاع کے لئے فرمایا، انہوں نے کہا کہ میں اس کا اہل نہیں، حضرت صفیہ نے آگے بڑھ کر اس کو قتل کر دیا، اوران سے فرمایا کہ اب جا کر اس کا سامان اٹھالاؤ، حضرت حسانؓ نے فرمایا کہ: مجھے اس کے سامان کی حاجت نہیں، آپ ساٹھ برس کی عمر میں اسلام لائے اور اسلام کے بعد ساٹھ سال حیات رہے ۴۰ھ سے کچھ پہلے وفات ہوئی، ایک سو بیس سال کی عمر ہوئی، ساٹھ سال جاہلیت میں گذارے اور ساٹھ سال اسلام میں۔(۱)

ایک اشکال اوراس کا جواب:

اس حدیث کا مضمون بھی گزشتہ حدیث کی طرح ہے۔

ثـم لایعیدهـا الیهـم: اس پر اشکال ہے کہ بعض مرتبہ آدمی بدعت سے توبہ کر لیتا ہے اور سنت کو اختیار کر لیتا ہے تو سنت تو لوٹ آئی؟

جواب: یہ ہے کہ جس وقت آدمی نے بدعت کو اختیار کیا اس زمانہ میں سنت پر عمل اوراس کی برکت سے محروم رہا؛ لہٰذا اس وقت کی برکت قیامت تک لوٹ کر نہیں آئے گی اس لئے کہ آئندہ وہ وقت دوبارہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔(۲)

۱۷۹ / ۴۹ : وَعَنْ إِبْرَاهِيمَ بْنِ مَيْسَرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ وَقَّرَصَاحِبَ بِدْعَةٍ، فَقَدْ أَعَانَ عَلىٰ هَدْمِ الإِسْلَامِ"(رواه البيهقي فى شعب الإيمان)مرسلاً.(۳)

(۱)الإصابة ۱ / ۴۸۸–۴۸۹.

(۲)طیبی ۱ / ۳۸۲.

(۳)أخرجه البيهقي في"شعب الإيمان،فصل فى مجانبة الفسقة والمبتدعة، باب في مباعدة الكفار والمبتدعين۷ / ۶۱برقم ۹۴۶۴"

ترجمہ: حضرت ابراہیم بن میسرہؒ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے بدعتی کی تعظیم کی اس نے اسلام کا (ستون) گرانے میں اس کی مدد کی'' (بیہقی)

تشریح حدیث

بدعتی کی توقیر کی ممانعت:

اس حدیث میں بدعتی کی مذمت بیان کی گئی اور اس کی تعظیم سے منع کیا گیا، چنانچہ بدعتی کی تعظیم کرنا درست نہیں، مثلاً اس کو مجلس کا صدر بنانا وغیرہ، اس میں مفسدہ یہ ہے کہ اہل حق بدعتی کی تعظیم کریں گے تو وہ لوگوں کا معتمد ہوجائے گا لوگ اس کو حق پر سمجھیں گے اس سے اس کا حوصلہ بڑھے گا، پھر عوام الناس اس کی بدعت کو حق اور سنت سمجھ کر قبول کریں گے جس سے اسلام کا بڑا نقصان ہوگا۔ (۱)

فقد أعان علی هدم الاسلام: اس سے مراد کمال اسلام ہے یعنی اب اس کا اسلام کامل نہیں رہا یا اسلام سے سنت مراد ہے کما ہو ظاہر۔ (۲)

۱۸۰ / ۵۰: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: مَنْ تَعَلَّمَ كِتَابَ اللّٰهِ ثُمَّ اتَّبَعَ مَافِيْهِ؛ هَدَاهُ اللّٰهُ مِنَ الضَّلَالَةِ فِي الدُّنْيَا، وَوَقَاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سُوْءَ الْحِسَابِ، وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ: مَنِ اقْتَدٰى بِكِتَابِ اللّٰهِ لَايَضِلُّ فِي الدُّنْيَا وَلَايَشْقٰى فِي الْآخِرَةِ، ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْآيَةَ: ''فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَايَضِلُّ وَلَايَشْقٰى'' (رواه رزين) (۳)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جس شخص نے کتاب اللہ کا علم حاصل کیا اور پھر اس چیز کی پیروی کی جو اس (کتاب اللہ) کے اندر ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں گمراہی سے بچا کر راہ ہدایت پر ثابت رکھے گا اور قیامت کے دن اس کو برے حساب سے بچائے گا اور ایک روایت میں ہے کہ جس شخص نے کتاب اللہ کی پیروی کی تو نہ وہ دنیا میں گمراہ ہوگا اور نہ

(۱) اللمعات ۱ / ۵۰۷–۵۰۸.

(۲) المرقاة ۱ / ۳۹٤.

(۳) أخرجه الطبراني في الكبير ۹ / ۳۰۷۰ برقم ۱۲٤۳۷.

آخرت میں بد بخت ہوگا، اس کے بعد ابن عباسؓ نے یہ آیت شریفہ تلاوت فرمائی: ''فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَايُضِلُّ وَلَايَشْقٰى'' یعنی جس شخص نے میری ہدایت (قرآن) کی پیروی کی نہ وہ (دنیا میں) گمراہ ہوگا اور نہ (آخرت میں) بد بخت ہوگا۔

تشریح حدیث

کتاب اللہ کا علم اور اس پر عمل گمراہی سے حفاظت کا ذریعہ:

یہ ابن عباسؓ کی موقوف روایت ہے، اس میں اعتصام بالکتاب کا حکم ہے کہ جو شخص کتاب اللہ کو سیکھے، اس کو پڑھے، معنی میں غور وفکر کرے اور اس کا اتباع کرے، اوامر پر عمل کرے اور نواہی سے بچے تو اس کو منجانب اللہ دو انعام ملیں گے دنیا میں ہدایت پر گامزن رہے گا اور گمراہی سے محفوظ رہے گا اور آخرت میں سوء حساب سے بچایا جائے گا، اس میں اشارہ ہے حسن خاتمہ کی طرف۔

سوء الحساب: ایک ہے حساب یسیر کہ اعمال کی صرف پیشی ہو مناقشہ نہ ہو اور معاف کردیا جائے، اور سوء حساب سے مراد مناقشہ ہے کہ ایسا کیوں کیا؟ حدیث شریف میں ہے ''من نوقش الحساب هلک'' پس ایسے شخص سے مناقشہ نہیں ہوگا۔(۱)

اس حدیث کی تائید اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے ''فمن اتبع هدای فلایضل ولایشقی''(۲) آیت کریمہ اور روایت مذکورہ دونوں کا ماحصل یہ ہے کہ جو شخص اخلاص کے ساتھ قرآن کا اتباع کرے گا تو حق تعالیٰ شانہ گمراہی اور بدبختی سے اس کی حفاظت فرمائے گا، اور انشاء اللہ اس کا خاتمہ بالخیر ہوگا، اگر اخلاص نہ ہو بلکہ اتباع ریاء ونمود کے طور پر ہو تو پھر گمراہی کا اندیشہ ہوتا ہے۔

۱۸۱ / ۵۱: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً صِرَاطاً مُسْتَقِيماً، وَعَنْ جَنْبَتَيِ الصِّرَاطِ سُوْرَانِ، فِيْهِمَا أَبْوَابٌ مُفَتَّحَةٌ، وَعَلَى الْأَبْوَابِ سُتُوْرٌ مُرْخَاةٌ، وَعِنْدَ رَأْسِ الصِّرَاطِ دَاعٍ يَقُوْلُ: اِسْتَقِيْمُوْا عَلَى

(۱) ترمذي شريف (۲۴۲۶) وفي رواية البخاري: من نوقش الحساب يهلک (۱۰۳) وفي رواية: من نوقش عذب (خ ۶۵۳۶)

(۲) طه: ۱۲۳.

الصِّرَاطِ، وَلاتَعْوَجُّوْا،وَفَوْقَ ذٰلِکَ دَاعٍ يَدْعُوْا، كُلَّمَا هَمَّ عَبْدٌ أَنْ يَفْتَحَ شَيْئاً مِنْ تِلْکَ الْأَبْوَابِ قَالَ: وَيْحَکَ! لاتَفْتَحْهُ ، فَإِنَّکَ إِنْ تَفْتَحْهُ تَلِجْهُ" ثُمَّ فَسَّرَهُ فَأَخْبَرَ: "أَنَّ الصِّرَاطَ هُوَ الإِسْلامُ، وَأَنَّ الْأَبْوَابَ الْمُفَتَّحَةَ مَحَارِمُ اللّٰهِ، وَأَنَّ السُّتُوْرَالْمُرْخَاةَ حُدُوْدُ اللّٰهِ، وَاَنَّ الدَّاعِيَ عَلٰى رَأْسِ الصِّرَاطِ هُوَ الْقُرْآنُ، وَأَنَّ الدَّاعِيَ مِنْ فَوْقِهٖ وَاعِظُ اللّٰهِ فِيْ قَلْبِ كُلِّ مُؤْمِنٍ "رواه رزين، ورواه أحمد والبيهقي في "شعب الإيمان"عن النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ،و كذاالترمذي عنه إلَّاأنه ذكر أخصر منه.(١)

ترجمہ : حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ:"اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی ہے (وہ یہ کہ)ایک سیدھاراستہ ہے اوراس راستہ کے دونوں طرف دیواریں ہیں اوران دیواروں میں کھلے ہوئے دروازے ہیں، دروازں پرپردے پڑے ہوئے ہیں اورراستہ کے سرے پرایک پکارنے والاکھڑا ہے جوپکارپکارکرکہتا ہے کہ راستہ پرسیدھے چلو،ٹیڑھے مت چلو،اس پکارنے والے کے اوپرایک دوسرا پکارنے والا ہے، جب کوئی بندہ ان دروازوں میں سے کوئی دروازہ کھولنا چاہتاہے تو وہ (دوسراپکارنے والا) پکارکرکہتا ہے تجھ پرافسوس ہے! اس کو نہ کھول، اگرتو اس کوکھولے گا تو اس کے اندرداخل ہوجائے گا(اوروہاں سخت تکلیف میں ہوگا) پھرآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مثال کی وضاحت فرمائی، اورفرمایا:"سیدھے راستے سے مراد اسلام ہے اور کھلے ہوئے درازوں سے مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قراردیاہے اور پڑے ہوئے پردوں سے مراد اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود ہیں، اورراستے کے سرے پر پکارنے والااس سے مرادقرآن ہے اس کے اوپردوسرا پکارنے والا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیحت کرنے والافرشتہ ہے جو ہرمومن کے دل میں ہے"(رزین، احمد،بیہقی، ترمذی)

(١)أخرجه احمد ٤/١٨٢ برقم ١٧٦٧١ و٤/١٨٣ برقم ١٧٦٧٣ و الترمذي، كتاب الأمثال، باب ماجاء في مثل الله لعباده ٢/١١٣، والبيهقي في"شعب الإيمان"فصل في الطبع على القلب، باب في معالجة كل ذنب بالتوبة ٥/٤٤٥برقم ٧٢١٦.

تشریح حدیث

صراط مستقیم کی ایک مثال سے تفہیم:

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام، احکام اسلام اورقرآن کی مثال بیان فرمائی اولاً مشبہ بہ کو بیان فرمایا کہ ایک سیدھاراستہ ہے لوگوں کو اس پر چلنا ہے، اس پر چل کر ہی لوگ اپنی منزل مقصود پرپہنچیں گے،اس راستے کے دونوں جانب دیواریں ہیں، اوران میں جگہ جگہ دروازے کھلے ہوئے ہیں اوران پر پردہ پڑاہواہے اورراستہ کے سرے پرایک داعی ہے، یہ چلنے والوں سے کہتاہے: بھائی! دیکھو راستے پرسیدھے سیدھے چلنااوردائیں بائیں جانب نہ مڑنا، اورایک داعی اس کے اوپر ہے اس کا کام یہ ہے کہ جب کوئی دائیں بائیں جانب کے دروازوں کوکھولنا چاہتاہے تووہ بروقت اس کو روکتاہے، اورنصیحت کرتاہے کہ اس کو نہ کھول؛ کیونکہ اس میں آگ بھری ہوئی ہے، اگراس کوکھولے گاتوجل جائے گا، یہ مشبہ بہ کا بیان ہوا۔

اس کے بعدآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشبہ کو بیان فرمایاکہ سیدھاراستہ اسلام ہے، اوردونوں جانب کے دروازے اللہ کی حرام کردہ چیزیں ہیں، اوران پرپردہ اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں، اورراستے کے سرے پربیٹھاہوا داعی: قرآن ہے، اوراس کے علاوہ دوسرا داعی اللہ کا واعظ ہے، اوروہ ہے لمۂ ملکی، جومنجانب اللہ ہرمومن کے قلب میں موجود ہوتاہے، جوشخص ان دو داعیوں کی بات کو مانتاہے اوردروازوں سے چھیڑ چھاڑ کئے بغیر سیدھاچلتا رہتاہے وہ منزل مقصودتک پہنچ جاتاہے اورجوانکی نصیحت کی پرواہ نہ کرکے ان دروازوں میں داخل ہوجاتاہے وہ ہلاک ہوجاتاہے۔

جنبتی الصراط: یہ ''جنبۃ'' کا تثنیہ ہے، جمع جُنُبٌ ہے، بمعنی طرف، کنارہ، جانب، ''**سوران**'' ''سور'' کا تثنیہ ہے، بمعنی دیوار، ''**مرخاۃ**'' اسم مفعول ہے ارخاء سے، بمعنی لٹکانا، ''**لاتعوجوا**'' تعوج باب تفعل سے ہے، اوراعوجاج؛ باب افعلال سے بھی ہوسکتاہے، اس صورت میں جیم مشدد ہوگا، بمعنی ٹیڑھاہونا، **ویحک**: یہ کلمہ ترحم ہے، کبھی ''ویل'' کے معنی میں بھی آتاہے۔(۱)

تلجه: ولج یلج وُلوجاً باب ضرب سے ہے بمعنی داخل ہونا۔(۲)

---

(۱) المرقاۃ ۱/۳۹۵-۳۹۶.

(۲) مصباح اللغات، مادہ: ول ج۔

۱۸۲ / ۵۲: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: مَنْ كَانَ مُسْتَناً، فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْ مَاتَ، فَإِنَّ الْحَيَّ لَاتُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ، أُولٰئِكَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانُوْا أَفْضَلَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ، أَبَرَّهَا قُلُوْباً، وَأَعْمَقَهَا عِلْماً، وَأَقَلَّهَا تَكَلُّفاً، اِخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ، وَلِإِقَامَةِ دِيْنِهٖ، فَاعْرِفُوْا لَهُمْ فَضْلَهُمْ، وَاتَّبِعُوْاهُمْ عَلٰى آثَارِهِمْ، وَتَمَسَّكُوْا بِمَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ أَخْلَاقِهِمْ وَسِيَرِهِمْ، فَإِنَّهُمْ كَانُوْا عَلَى الْهُدَى الْمُسْتَقِيْمِ. (رواه رزين)(۱)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ: جو شخص کسی کی اتباع کرنا چاہے تو اس کو چاہئے کہ ان لوگوں کی اتباع کرے جو اس دنیا سے رخصت ہوگئے ہیں؛ کیونکہ زندہ آدمی (دین میں) فتنہ سے محفوظ نہیں ہوتا، (جن کی پیروی کرنی چاہئے) وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں، جو اس امت کے سب سے اچھے لوگ تھے، دل کے اعتبار سے سب سے نیک تھے، علم کے اعتبار سے سب سے زیادہ گہرے علم والے تھے اور بہت کم تکلف کرنے والے تھے، ان کو اللہ تعالیٰ شانہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور اپنے دین کی اقامت کے لئے منتخب کیا تھا لہٰذا تم ان کی فضیلت کو پہچانو اور ان کے نقش قدم پر چلو، اور جہاں تک ہوسکے ان کے اخلاق اور ان کی سیرت بھی اختیار کرو (اس لئے کہ) وہی لوگ ہدایت مستقیم پر تھے۔ (رزین)

تشریح حدیث

صحابۂ کرام کے اتباع کا حکم:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ موقوف روایت ہے، اس میں اعتصام بالسنہ کی ترغیب دینے کے لئے حضرات صحابہ کی اتباع کا حکم دیا کہ جو شخص اعتصام بالسنہ کرنا چاہے تو وہ صحابہ کے طریقے کو اختیار کرے اس لئے کہ صحابہ نے جو کچھ حاصل کیا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی حاصل کیا، پس صحابہؓ کا اتباع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی اتباع ہوگا۔

(۱) أخرجه ابن عبدالبر في "جامع بيان العلم وفضله" ۲ / ۹۴۷ برقم ۱۸۱۰، وأبونعيم في "الحلية" ۱ / ۳۰۵.

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں حضرت ابن مسعودؓ کو کوفہ بھیجا اور اہل کوفہ کو لکھا تھا کہ: ابن مسعودؓ ایسے شخص ہیں کہ ان کے علم کا میں خود محتاج ہوں لیکن تم کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہوئے میں ان کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں، کوفہ میں آپ کا درس روزانہ ہوتا تھا اور ہفتہ میں ایک دن وعظ بھی فرماتے تھے چنانچہ ان کی ایک مرتبہ کی نصیحت یہاں مذکور ہے۔

من كان مستنا: ''استنان'' سے ہے، بمعنی پیروی کرنا، اصل تو یہ ہے کہ آدمی براہ راست کتاب وسنت سے استنباط کرے لیکن جس میں یہ صلاحیت نہیں ہے وہ دوسرے کا اتباع کرے، چونکہ ان کے سامعین تابعین تھے، اس لئے انھوں نے صحابہ کی اتباع کا حکم دیا اوران میں بھی ان کے اتباع کا حکم دیا جو وفات پاچکے، اس لئے کہ ان کا حسن خاتمہ یقینی ہے اور زندہ حضرات بھی اگرچہ سیدھے راستے پر ہیں مگر آئندہ کا حال معلوم نہیں ہے اس لئے وہ ابھی فتنے سے محفوظ نہیں ہیں، ابن مسعودؓ کی وفات حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ہوئی لہٰذا ان کے زمانے کے اعتبار سے ''**اولئک اصحاب محمد**'' سے وہ صحابہ مراد ہوں گے جو اس وقت تک دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، لیکن صحابہ کے بعد تا قیامت تمام لوگوں کے لئے اس کا مصداق تمام صحابہؓ ہیں، اس لئے کہ سبھی صحابہ ایمان اور علم وعمل پر دنیا سے رخصت ہوئے ہیں اور سب کو حسن خاتمہ نصیب ہوا ہے۔

صحابۂ کرام کے کچھ فضائل وخصوصیات:

كانوا أفضل هذه الأمة: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آنے والی نسلوں کو صحابہ کی اقتدا پر ابھارنے کے لئے حضرات صحابہؓ کے فضائل بیان فرمائے کہ حضرات صحابہ تمام امت میں افضل ہیں، اس لئے کہ تمام انسانوں میں انبیاء افضل ہوتے ہیں پھر اصحاب انبیاء، اور اصحابِ انبیاء میں اصحابِ محمد سب سے افضل ہیں اوران کی افضلیت کی وجوہات یہ ہیں:

ابرها قلوبا: یعنی وہ امت میں دلوں کے اعتبار سے نیک ترین تھے ان کے دل میں خلوص اور کمال ایمان تھا، ریا، عجب اور تکبر نہیں تھا، اللہ نے ان کے قلوب کا امتحان لیا، اس میں وہ کامیاب ہوئے تو ان کو مغفرت کا مژدہ سنایا گیا: ''**أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ**(۱)''

(۱) الحجرات: ۳.

کہ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں کےتقوی کا اللہ نے امتحان لیا ہے؛ ان کے لئے مغفرت ہے اور بڑا اجر ہے، یعنی اللہ نے سخت مشقتوں میں مبتلا کر کے ان کے قلوب کا امتحان لیا تو ان کو رضا بالقضاء کے ساتھ متصف پایا۔(۱)

واعمقها علماً: یعنی ان کا علم سب سے گہرا تھا اور ان کی فہم بڑی تھی، علم کے تمام پہلوؤں پر باریکی سے غور وخوض کرنے والے تھے، تفسیر، حدیث، فرائض اور تصوف میں ان کو بڑی مہارت تھی۔(۲)

وأقلها تكلفا: حضرات صحابہ نہایت سادہ مزاج اور تکلف سے خالی تھے، رہن سہن میں بھی سادگی تھی، جوتا میسر ہوا جوتا پہن کر چلتے، نہ ہوا ننگے پیر چل پڑتے، کپڑا جیسا میسر ہوتا ویسا پہنتے، اچھا ملا اچھا پہنا گھٹیا ملا، گھٹیا پہن لیتے، کھانے کو اچھا ملتا اچھا کھاتے سادہ ملتا سادہ کھاتے، نہ ملتا تو فاقہ کرتے، تعلیم وتعلم میں بھی تکلف نہیں تھا کوئی بات معلوم نہ ہوتی تو معلوم کر لیتے اور کسی کو معلوم نہ ہوتا تو اس کو از خود بتادیتے۔(۳)

اختارهم الله لصحبة نبيه: یہ ان کے لئے بڑی فضیلت کی بات تھی، ایک روایت میں ہے کہ جب اللہ نے نبی آخر الزماں کو مبعوث فرمانا چاہا تو لوگوں کے قلوب پر نظر ڈالی ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کو سب سے زیادہ پاک وصاف پایا تو ختم نبوت کا نور آپ کے قلب میں رکھا، پھر اصحاب انبیاء میں صحابہ کے قلوب میں سب سے زیادہ صلاحیت تھی اس لئے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپ کے دین کی نصرت کے لئے منتخب فرمایا۔(۴)

فاعرفوا لهم فضلهم: حضرات صحابہ کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد عبداللہ بن مسعودؓ نے حضرات صحابہ کے فضل وکمال کے اعتراف کرنے، ان کے نقش قدم کی اتباع کرنے اور ان کے اخلاق وسیرت کو اپنانے کی تاکید وتلقین فرمائی، لہذا ہر صحابی سے عقیدت ومحبت رکھی جائے ان کے مقام ومرتبہ کی بلندی کا اعتراف کیا جائے، کسی بھی صحابی کے بارے میں دل میں ادنی بدگمانی کو جگہ نہ دی جائے، اسی طرح صحابۂ کرام کے اسوہ ونمونہ کو اپنایا جائے، بالخصوص مذکورہ بالا اوصاف وکمالات اپنے اندر پیدا کرنے کی سعی کی جائے۔

(۱) المرقاة ۱/ ۳۹۸.

(۲) المرقاة ۱/ ۳۹۸.

(۳) المرقاة ۱/ ۳۹۸.

(٤) رواه ابوداود الطيالسي في مسنده (٢٤٣)

علماء نے فرمایا کہ فضیلت صحابہ میں یہ حدیث سب سے جامع ہے کیونکہ یہ خود صحابی کی زبان سے بیان شدہ حقیقت ہے۔

۱۸۳/۵۳: وَعَنْ جَابِرٍؓ: أَنَّ عُمَرَبْنَ الْخَطَّاب رضی الله عنه أَتٰی رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِنُسْخَةٍ مِنَ التَّوْرَاةِ، فَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! هٰذِهٖ نُسْخَةٌ مِنَ التَّوْرَاةِ، فَسَكَتَ، فَجَعَلَ يَقْرَأُ وَوَجْهُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَغَيَّرُ، فَقَالَ أَبُوْبَكْرٍ: ثَكِلَتْكَ الثَّوَاكِلُ! مَاتَرٰی مَا بِوَجْهِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَنَظَرَعمر إِلٰی وَجْهِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ اللّٰهِ وَغَضَبِ رَسُوْلِهٖ، رَضِيْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا، وَبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا، وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَوْبَدَا لَكُمْ مُوْسٰی فَاتَّبَعْتُمُوْهُ وَتَرَكْتُمُوْنِیْ، لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيْلِ؛ وَلَوْكَانَ حَيًّا وَأَدْرَكَ نُبُوَّتِیْ لَاتَّبَعَنِیْ"(رواه الدارمي)(۱)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر بن الخطابؓ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تورات کا ایک نسخہ لیکر آئے اور عرض کیا "یارسول اللہ! یہ تورات کا نسخہ ہے"، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، پھرانھوں نے اس کو پڑھنا شروع کیا اورآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک (غصہ سے) متغیر ہونے لگا (یہ دیکھ کر) حضرت ابوبکرؓ نے کہا: عمر! گم کرنے والیاں تمہیں گم کردیں تم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس کو نہیں دیکھتے؟ حضرت عمرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس کی طرف نظر ڈالی تو (غصہ کے آثار دیکھ کر) کہا "میں اللہ کے غضب اوراس کے رسول کے غصہ سے پناہ مانگتا ہوں، ہم اللہ تعالیٰ شانہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پراورمحمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پرراضی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے اگرموسیٰ علیہ السلام تمہارے درمیان ظاہر ہوتے اورتم ان کی پیروی کرتے اور مجھے چھوڑ دیتے تو تم سیدھے راستے سے بھٹک کرگمراہ ہوجاتے، اگرموسیٰ زندہ ہوتے اورمیرا زمانۂ نبوت پاتے تو وہ بھی یقیناً میری ہی پیروی کرتے" (دارمی)

(۲)أخرجه الدارمي فی المقدمة، باب مايتقي من تفسير حديث النبی صلی الله عليه وسلم ۱/۱۲۲برقم ٤٤١.

تشریح حدیث

حضرت عمرؓ کا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو توراۃ سنانا اور آپ کا تنبیہ فرمانا:

یہ حدیث مختصراً پہلے گذر چکی ہے، یہاں تفصیل کے ساتھ آئی ہے، حضرت عمرؓ یہود کے مکتب سے تورات کا ایک نسخہ لے کر حاضر خدمت ہوئے اور بتایا کہ یہ تورات کا نسخہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا، حضرت عمرؓ سکوت کو دلیل رضا سمجھے اور تورات کے نسخہ کو پڑھنے لگے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آیا اور چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہونے لگا حضرت ابوبکرؓ نے اس بات کو تاڑ لیا اور عمرؓ کو ڈانٹا کہ کیا تم چہرۂ انور پر غصے کے آثار نہیں دیکھ رہے ہو؟ حضرت ابوبکرؓ کے توجہ دلانے پر حضرت عمرؓ فوراً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں معذرت کرتے ہوئے **اعوذ باللہ من غضب الله وغضب رسوله الخ**. پڑھنے لگے حتی کہ آپ صلی اللہ کا غصہ ٹھنڈا ہوا، اس کے بعد حضرت عمرؓ کو سمجھایا جس کا حاصل یہ ہے کہ دین مصطفوی سے افضل کوئی دین نہیں اگر اس زمانہ میں موسیٰ علیہ السلام آجائیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کا اتباع کرو تو سیدھے راستہ سے ہٹ جاؤ گے، کیونکہ اگر موسیٰ علیہ السلام تشریف لے آئیں تو وہ بھی تورات کے بجائے میری اتباع کے پابند ہوں گے۔

ثکلتک الثواکل: یہ جملہ اصل کے لحاظ سے بددعا کا ہے کہ تو مرجائے اور تیری ماں بہنیں تجھے گم کردیں؛ لیکن اہل عرب اس کو اظہار تعجب اور کسی فعل پر نکیر کے لئے بولتے ہیں۔(۱)

قادیانیوں کے ایک غلط استدلال کی تردید:

لوبدالکم موسی فاتبعتموه: بعض روایات میں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ عیسیٰ کا لفظ بھی آیا ہے(۲) جس سے قادیانیوں نے وفاتِ عیسیٰ پر استدلال کیا ہے، اس کے دو جواب ہیں:

(۱) صحیح روایات میں صرف موسیٰ کا لفظ ہے جس روایت میں عیسیٰ کا لفظ بھی آیا ہے وہ ضعیف ہے۔

(۲) یہاں بدا کا لفظ ہے جس کے معنی ظاہر ہونے کے ہیں اس سے وفات لازم نہیں آتی معنی یہ ہیں

(۱) المرقاة ۱/ ۳۹۹.

(۲) اخرجه الدار قطنی فی سننه، کتاب النوادر ٤/ ٨٢ برقم: ٤٢٣٣ .

کہ: وہ آسمانوں میں ہیں اگر دنیا میں ظاہر ہو جائیں تو میرا اتباع کریں۔ (۱)

١٨٤ / ٥٤: وَعَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "كَلامِيْ لايَنْسَخُ كَلامَ اللّٰهِ، وَكَلامُ اللّٰهِ يَنْسَخُ كَلامِيْ، وَكَلامُ اللّٰهِ يَنْسَخُ بَعْضُهُ بَعْضاً" (۲)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "میرا کلام، اللہ تعالیٰ کے کلام کو منسوخ نہیں کرتا، اور کلام اللہ میرے کلام کو منسوخ کرتا ہے اور کلام اللہ کا بعض حصہ بعض حصہ کو منسوخ کرتا ہے" (دارمی)

تشریح حدیث

مسئلہ نسخ کا بیان:

اعتصام بالکتاب والسنہ کا بیان چل رہا ہے اس حدیث میں اور آئندہ حدیث میں کتاب وسنت سے متعلق ایک معرکۃ الآراء مسئلہ نسخ کا بیان کیا گیا ہے، نسخ سے کتاب وسنت کی عظمت ثابت ہوتی ہے لہٰذا ان کو مضبوطی سے پکڑنا چاہئے۔

مسئلہ نسخ کی اہمیت:

قرآن وحدیث سمجھنے کے لئے نسخ کا علم ضروری ہے اس کے بغیر کتاب وسنت کو کماحقہ نہیں سمجھا جاسکتا، حضرت علیؓ نے ایک مسجد میں ایک شخص کو دیکھا کہ آیت منسوخہ پر تقریر کررہا تھا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم کو نسخ کا علم ہے؟ اس نے انکار کیا آپ نے لوگوں سے کہا کہ اس کو مسجد سے نکال دو اس میں یہ صلاحیت نہیں کہ لوگوں کو قرآن سمجھا سکے۔ (۳)

نسخ سے متعلق یہاں چند مباحث ہیں:

نسخ کے لغوی واصطلاحی معنی:

نسخ کے لغوی معنی ہیں اٹھانا، زائل کرنا، متغیر کرنا، اور اصطلاحی معنی دو بیان کئے گئے ہیں:

(۱) المرقاة ١ / ٤٠٠.

(۲) أخرجه الدار قطني في سننه، كتاب النوادر ٥ / ٢٥٥ (٤٢٧٧)

(۳) تفسير قرطبی، معارف القرآن ١ / ٢٨٨.

(۱) بیانُ انتهاءِ الامرِ التعبدیِّ (امرِ تعبدی کی انتہاء کو بیان کرنا) اس کا حاصل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم آتا ہے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ حکم ہمیشہ رہے گا لیکن اللہ کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم فلاں وقت تک چلے گا، مثلاً ہجرت سے پہلے مسلمانوں کا قبلہ خانہ کعبہ تھا، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو اللہ کی طرف سے حکم ملا کہ بیت المقدس کو قبلہ بنایا جائے، اس وقت اس میں کئی وجوہ اور کئی مصلحتیں تھیں ان میں سے ایک بڑی وجہ انسیت یہود تھی کہ وہ مانوس ہوں اور اسلام کی طرف مائل ہوجائیں، نیز بیت المقدس مہبط وحی رہا ہے لہٰذا اس کی برکات حاصل ہوجائیں وغیر ذالک من المصالح، مسلمان یہ سمجھے کہ بیت المقدس ہمیشہ قبلہ رہے گا، لیکن ۱۶ ریا ۱۷ ر مہینے کے بعد حکم ملا کہ اب خانہ کعبہ کی طرف رخ کرو: ''فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَام '' اس آیت کے ذریعہ بیت المقدس کا قبلہ ہونا منسوخ کردیا گیا، لیکن حق تعالیٰ شانہ کو پہلے سے ہی معلوم تھا کہ پہلا حکم صرف ۱۶ ر یا ۱۷ ر مہینے کے لئے رہے گا، پس نسخ کے ذریعہ حکم الٰہی کی انتہا معلوم ہوگئی۔

(۲): رَفْعُ الحكمِ الشرعي بدليلٍ شرعيٍّ متراخٍ یعنی حکم شرعی کو اٹھادینا ایسی دلیل سے جو اس حکم سے مؤخر ہو، نسخ کی نوعیت یہی ہوتی ہے کہ اس میں مؤخر دلیل کے ذریعہ سابق حکم مرتفع ہوجاتا ہے۔

کلام الٰہی میں وقوعِ نسخ کا مسئلہ:

یہود ونصاریٰ اور علماء اسلام میں سے ابومسلم اصفہانی کلام الٰہی میں نسخ کے قائل نہیں ہیں؛ کیونکہ یہ حاکم کی جہالت وسفاہت کو مستلزم ہے، اور قرآن کی آیت ''ماننسخ من آية أوننسها'' (البقرة) کو یہ لوگ قضیہ فرضیہ مانتے ہیں ''لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا '' کی طرح، لیکن جمہور امت کا اتفاق ہے کہ کلام الٰہی میں نسخ ہوتا ہے۔

دنیا کے قوانین میں بھی نسخ ہوتا ہے، البتہ دنیا کے قانون میں تبدیلی دووجہ سے ہوتی ہے، ایک قانون ساز کی جہالت کی وجہ سے کہ پہلا قانون غلطی سے نافذ ہوگیا تھا اس کی اصلاح کے لئے دوسرا قانون لایا گیا، اور کبھی حکم کی تبدیلی لوگوں کے حالات میں تغیر وتبدل کی وجہ سے کی جاتی ہے کہ جس مصلحت کی وجہ سے پہلا حکم نافذ کیا گیا، جب وہ مصلحت ختم ہوگئی تو دوسرا حکم نافذ کردیا گیا، پھر بہت سی مرتبہ حاکم کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ اتنے عرصہ کے بعد لوگوں کے حالات بدل جائیں گے پھر دوسرا حکم جاری کیا جائے گا

اور بسااوقات اس کا علم نہیں ہوتا۔

کلام الٰہی میں نسخ پہلی وجہ سے نہیں دوسری وجہ سے ہوتا ہے، اور اس سے حاکم کی جہالت نہیں بلکہ کمال علم اور اس کی دور بینی ثابت ہوتی ہے، جیسے مریض کے احوال بدل جانے سے ڈاکٹر اس کے نسخہ میں ترمیم کرتا ہے، یہ ڈاکٹر کی مہارت کی دلیل ہوتی ہے نہ کہ جہالت کی، حق تعالیٰ شانہ علیم وخبیر ہے اس کو پہلے سے علم ہے کہ آئندہ حالات بدلیں گے، اس لئے وہ بندوں کے حال کے مطابق حکم لاکر پہلے حکم کو منسوخ فرمادیتا ہے۔

البتہ بعض مضامین کی نصوص میں نسخ نہیں ہوتا وہ یہ ہیں:

(۱) آیات عقائد، مثلا اللہ ایک ہے، ذات وصفات میں یکتا ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں وغیرہ کیوں کہ یہ نفس الامر اور واقعہ کی خبر ہے اور نسخ کی صورت میں ان میں کذب لازم آئے گا۔

(۲) آیات قصص وامثال۔

(۳) آیات ذات وصفات مثلاً ملک یوم الدین وغیرہ۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ نسخ صرف آیات احکام میں ہوتا ہے۔

نسخ کی مختلف اقسام:

نسخ کی باعتبار کیفیت کے چار قسمیں ہیں۔

(۱) نسخ التلاوۃ دون الحکم: جیسے "الشیخُ والشیخۃُ اذَازَنَیَا فارْجُمُوْھُمَا" پہلے اس آیت کی تلاوت بھی ہوتی تھی پھر تلاوت منسوخ ہوگئی لیکن حکم باقی ہے۔

(۲) نسخ الحکم دون التلاوۃ: جیسے آیت وصیت "کتب علیکم إذا حضر أحدکم الموت" (البقرۃ) اس آیت کے تقاضہ کے مطابق ابتداء اسلام میں حکم یہ تھا کہ جب آدمی کی وفات کا وقت آتا تو اپنے وارثوں کے لئے وصیت کرنا فرض تھا، ورثہ کے حصے وہ خود متعین کرتا، اس کے بعد حدیث "لا وصیۃ لوارث" سے وہ حکم منسوخ ہوگیا، نیز وارثین کے حصے قرآن میں متعین کردیئے گئے پس یہ آیت منسوخ ہوگئی لیکن اس کی تلاوت باقی ہے۔

(۳) نسخ التلاوۃ والحکم: قرآن میں اس طرح کی بہت سی آیات تھیں جن کی تلاوت اور حکم

دونوں منسوخ ہوگئے مثلاً سورۂ طلاق سورۂ بقرہ کے برابر تھی اس کے اکثر حصے کو منسوخ کیا گیا ہے، ایسے ہی سورۂ احزاب۔

(۴)غیر منسوخ التلاوۃ والحکم: ایسی آیات کو ''محکم'' کہا جاتا ہے، ان آیات میں کسی طرح کا نسخ نہیں ہوتا لیکن تقابل کے طور پر اس نوع کو باقاعدہ قسم کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔

اور نسخ کی باعتبار ناسخ کے پانچ قسمیں ہیں:

(۱)**نسخ الکتاب بالکتاب:** جیسے ''**یاایھاالنبی حرض المؤمنین علی القتال**'' (انفال) اس آیت میں حکم ہے کہ ایک مسلمان دس کافروں سے مقابلہ کرے، کفار کی تعداد دس تک ہو پھر بھی فرار اختیار کرنا جائز نہیں، اس کے بعد اس حکم میں تخفیف آئی اور یہ آیت نازل ہوئی: ''**الأن خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفا**'' (الانفال) اس میں فرمایا گیا کہ اب ایک مسلمان کو دو کافروں کا مقابلہ کرنا ہے، ایک مسلمان کو دو کافروں کے مقابلہ سے فرار اختیار کرنا جائز نہیں، کفار دو سے زیادہ ہوں تو پھر ان کے سامنے سے ہٹ جانا جائز ہے۔

(۲)**نسخ الحدیث بالحدیث:** جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً صحابہ کو زیارت قبور سے منع فرمادیا تھا اس وجہ سے کہ ابھی بت پرستی سے نکلے ہیں کہیں قبر پرستی میں مبتلا نہ ہوجائیں، پھر جب صحابہ کے اندر پختگی آ گئی تو زیارت قبور کے فوائد کے پیش نظر اس کی اجازت مرحمت فرمائی، چنانچہ فرمایا ''**کنتُ نهيتُكم عن زيارة القبور فزُوْرُوْها؛ فإنها تُذَكِّرُ الآخرةَ**''[1]

(۳)**نسخ الحدیث بالکتاب:** جیسے **فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ** اس آیت نے بیت المقدس کے قبلہ ہونے کو منسوخ کیا اور بیت المقدس کا قبلہ ہونا حدیث کے ذریعہ تھا۔

(۴)**نسخ الکتاب بالخبر الواحد:** یہ بالاتفاق ناجائز ہے۔

(۵)**نسخ الکتاب بالخبر المتواتر:** اس میں اختلاف ہے، احناف ومالکیہ اس کو ثابت مانتے ہیں، اور شوافع وحنابلہ اس کا انکار کرتے ہیں،[2] ان کی دلیل حضرت جابر والی یہی حدیث ہے کہ میرا کلام، اللہ کے کلام کو منسوخ نہیں کرتا ہے: ''**کلامی لاینسخ کلام الله**'' احناف ومالکیہ کی طرف سے اس کے کئی

(۱)أخرجه احمد فی مسنده (۲۳۰۰۵)

(۲)المرقاۃ ۱/ ۴۰۰۔

جواب دیئے گئے ہیں:

(۱)''کلامی'' سے مراد وہ حدیث ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہاد سے بیان فرمائی ہو اس سے کلام اللہ کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔

(۲)''کلامی لاینسخ کلام الله'' سے نسخ تلاوت مراد ہے البتہ حدیث کے ذریعہ قرآن کے حکم کو منسوخ کیا جا سکتا ہے جیسے نسخ الحکم دون التلاوۃ والی مثال سے ظاہر ہے۔

(۳)''کلامی'' سے خبر واحد مراد ہے اور معنی یہ ہیں کہ جو حدیث خبر واحد کے درجہ کی ہو اس کے ذریعہ قرآن کی آیت منسوخ نہ ہوگی، البتہ خبر متواتر سے منسوخ ہو سکتی ہے۔

(۴) یہ حدیث خود منسوخ ہے اور ناسخ اگلی حدیث ہے آئندہ حدیث میں آخری جملہ ''کنسخ القرآن'' سے اس روایت کا منسوخ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

۱۸۵ / ۵۵: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ أَحَادِيْثَنَا يَنْسَخُ بَعْضُهَا بَعْضاً كَنَسْخِ الْقُرْآنِ"(۱)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''ہماری (بعض) احادیث بعض کو منسوخ کرتی ہیں قرآن کے منسوخ کرنے کی طرح۔

تشریح حدیث

احادیث بھی قرآن کی طرح ناسخ:

اس روایت کے اول جملہ سے نسخ الحدیث بالحدیث کا ثبوت ہوا، اور ثانی جملہ کے دو مطلب ہیں:

(۱) کنسخ القرآن القرآنَ۔ یعنی جیسے قرآن قرآن کو منسوخ کرتا ہے۔(۲)

(۲) کنسخ الحدیث القرآن یعنی جیسے حدیث قرآن کو منسوخ کرتی ہے چنانچہ خبر متواتر کے ذریعہ قرآن کا حکم منسوخ ہوتا ہے، جس کی مثال یہ ہے کہ: قرآن میں ورثاء کے حصے مقرر کئے گئے ہیں قرآن کے اس حکم کے لحاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث بھی ورثہ میں تقسیم ہونی چاہئے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ورثاء نے حصہ مانگا، اس پر حضرت ابوبکرؓ نے حدیث

(۱) أخرجه الدارقطني في سننه، كتاب النوادر ٥ / ٢٥٥ برقم ٤٢٧٨.

(٢) المرقاة ١ / ٤٠١.

سنائی: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: "لانورث ماتركناه صدقة"[1] چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ورثاء کو مال نہیں دیا گیا آپ کا مال میراث نہیں بنا اور اسی پر تمام صحابہ کا اتفاق ہوا لہذا یہ حکمِ قرآنی حدیث کے ذریعہ منسوخ ہوا۔

١٨٦ / ٥٦: وَعَنْ أَبِي ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوْهَا، وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَاتَنْتَهِكُوْهَا، وَحَدَّحُدُوْداً فَلَا تَعْتَدُوْهَا، وَسَكَتَ عَنْ أَشْيَاءَ مِنْ غَيْرِنِسْيَانٍ فَلَاتَبْحَثُوْا عَنْهَا" (روى الأحاديث الثلاثة الدارقطني)[2]

ترجمه: حضرت ابوثعلبہ الخشنیؓ سے مروی ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے چند فرائض کو فرض کیا ہے لہٰذا ان کو ضائع نہ کرو، اور چند چیزیں حرام قرار دی ہیں لہٰذا تم ان کے خلاف ورزی مت کرو اور چند حدود مقرر کی ہیں لہٰذا تم ان سے تجاوز مت کرو، اور چند چیزوں کے بارے میں بھول کر نہیں بلکہ (دانستہ) سکوت اختیار فرمایا ہے، لہٰذا ان چیزوں میں تم بحث نہ کرو" (مذکورہ تینوں حدیثیں دارقطنی نے روایت کی ہیں)

تشریح حدیث

احوال ابوثعلبہ الخشنی:

اسی کنیت سے مشہور ہیں ان کے اور ان کے والد کے نام میں سخت اختلاف ہے، بڑے صحابہ میں سے ہیں ۷۵ھ میں وفات ہوئی ہے ان کی مرویات کی تعداد ۴۰ رہے۔[3]

(١) أخرجه البخاري في المغازي، باب حديث بني النضير ٢ / ٥٧٦، ومسلم في الجهاد والسير، باب حكم الفيء ٢ / ٩١.

(٢) أخرجه الدارقطني في سننه، ٥ / ٣٢٥ برقم ٤٣٩٦. وقد مر تخريج ماقبله من الحديثين.

(٣) الإصابة ٦ / ٣٩. ابوثعلبہ الخشنی کا نام کیا تھا؟ اس سلسلہ میں حضرات محدثین کا اختلاف ہے امام ذہبیؒ نے ان کے نام کے سلسلہ میں ایک درجن سے زائد اقوال ذکر کئے ہیں (١) امام احمد ابن حنبل، ابن معین، ، ابن المدینی، ابن سعد اور ابوبکر بن زنجویہ نے فرمایا کہ ان کا نام جرہم بن ناشم ہے (٢) جرثوم بن الاشر (٣) جرثوم بن عمرو (۴) جرثوم بن ناشر (۵) جرہم قالہ البخاری (٦) جرثوم بن ناشم (۷) جرثوم بن ناشم (۸) جرثوم بن ناشب (۹) جرثوم بن عمرو (۱۰) لاشر بن حمید (۱۱) لاشومہ بن جرثومہ (۱۲) لاشق بن جرہم (۱۳) جرثومہ بن ناشج ان کی وفات کے بارے میں لکھا ہے "فبيناهو يصلي في جوف الليل، قبض، وهو ساجد" (سیر اعلام النبلاء ۲/ ۵۶۷-۵۷۱ مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ بیروت)

احکام شرعیہ کی انواع اوران کے امتثال کی کیفیت:

اس حدیث میں معنی ومضمون کے اعتبار سے احکام شرع کی پانچ قسمیں بیان فرمائیں اور ہر قسم کا جومطالبہ ہے اس کو بتایا ہے، چنانچہ فرمایا کہ اللہ نے کچھ چیزوں کو فرض فرمایا ہے اور کچھ آیات میں بہت سی چیزوں کی حرمت کو بیان کیا گیا ہے، نیز بہت سے احکام کی حدود مقرر کی گئی ہیں،مثلاً فرض نمازوں کی رکعات کی تعداد، فرض روزوں کی تعداد، احکام معاشرت میں جمع بین الاختین کا جائز نہ ہونا چارعورتوں سے زیادہ سے نکاح کا جائز نہ ہوناوغیرہ،اور کچھ چیزوں سے سکوت اختیارفرمایاہے لیکن بھول کی وجہ سے نہیں بلکہ مصلحت کی وجہ سے، پھر ہر مضمون کا مطالبہ الگ ہے کہ فرائض کو اداکیاجائے ان کو ضائع نہ کیا جائے اورمحرمات سے اجتناب کیاجائے، اورحدودمقررہ سے تجاوز نہ کیا جائے اورمسکوت عنہااشیاء کے پیچھے مت پڑومثلا قیامِ ساعت، آیات متشابہات، شب قدروغیرہ۔ ان چیزوں کے متعلق نصوص میں جس قدرصراحت آ گئی ہے اُس حدتک گفتگو صحیح ہے، اس حد سے متجاوز ہوکر اپنی عقل سے رائے زنی صحیح نہیں جیسا کہ ماقبل بھی آ چکا ہے۔

کتاب العلم

کتاب الایمان مکمل ہوجانے کے بعد کتاب العلم کوشروع فرمارہے ہیں، اس بارے میں چند باتیں سمجھنا ضروری ہیں:

ماقبل ومابعد سے ربط:

ماقبل میں اعتصام بالکتاب والسنہ کا بیان تھا، کتاب وسنت خاص علوم میں سے ہیں، اب یہاں سے عام علوم کو بیان کیاجارہاہے، کیونکہ یہاں کتاب وسنت سے ثابت شدہ علوم فقہ اصول فقہ تفسیروغیرہ کابھی بیان ہے، گویایہ تعمیم بعدالتخصیص کےقبیل سے ہے۔(۱)

اور مابعد سے ربط یہ ہے کہ کتاب العلم کے بعد کتاب الطہارت یعنی احکام کابیان ہے اوراحکام سے پہلے علم کی اہمیت پہچاننا ضروری ہے اس لئے احکام کے بیان سے پہلے علم کو بیان کیا گیا ہے۔

(۱)المرقاۃ ۱/ ٤٠٥.

علم کے لغوی معنیٰ:

العلم باب سمع کا مصدر ہے بمعنیٰ کسی چیز کو جاننا، اس کے قریب دوسرا لفظ ہے معرفت، علم اور معرفت میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ راجح یہ ہے کہ ان دونوں میں فرق ہے، کیا فرق ہے اس سلسلہ میں دو قول ہیں:

(۱) علم کہا جاتا ہے کلیات و جزئیات دونوں کے جاننے کو اور معرفت کہا جاتا ہے صرف جزئیات کے جاننے کو؛ اسی لئے اللہ کے لئے لفظ علم استعمال ہوتا ہے لفظ معرفت استعمال نہیں کیا جاتا ہے ورنہ وہم پیدا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کو صرف جزئیات کا علم ہے۔(۱)

(۲) علم؛ ذات وصفات دونوں کے جاننے کا نام ہے اور معرفت؛ صرف صفات کے جاننے کو کہتے ہیں اس لئے عارف باللہ تو کہا جاتا ہے عالم باللہ نہیں بولا جاتا اس لئے کہ اللہ کی ذات کو کوئی نہیں جان سکتا۔

علم کے اصطلاحی معنیٰ:

اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ علم کی تعریف ممکن ہے یا نہیں؟ بہت سے علماء اس کو ناممکن کہتے ہیں پھر عدم امکان کے سبب میں ان کا اختلاف ہے:

(۱) امام الحرمین اور امام غزالیؒ نے فرمایا کہ: علم ایسی نظری شئ ہے کہ جس کے جنس وفصل کا کسی کو پتہ نہیں ہے اور بغیر جنس وفصل کے تعریف ممکن نہیں۔

(۲) فخر الدین رازی نے فرمایا کہ: عدم امکان کا سبب علم کا انتہائی بدیہی ہونا ہے، اور بدیہی شے کی تعریف نہیں کی جاسکتی جیسے پانی۔(۲)

مگر بہت سے علماء نے اس کی تعریف کو ممکن کہا ہے، پھر تعریف میں بھی اختلاف ہے:

علامہ عینیؒ نے فرمایا کہ علم کی تعریفات میں سب سے زیادہ صحیح تعریف یہ ہے: ''أنه صفة من صفات النفس توجب تمييزاً، لايحتمل النقيض في الأمور المعنوية''(۳) یعنی علم نفس کی صفات میں

---

(۱) عمدة القاری ۲/۳ مطبوعه دار الفکر بيروت.

(۲) عمدة القاری ۲/٤.

(۳) عمدة القاری ۱/٤، انظره لزاماً؛ فيه تفصيل حسن ، ملاعلی قاریؒ نے فرمایا: ''العلم نور في قلب المؤمن مقتبس من مصابيح مشكاة النبوة من الأقوال المحمدية والأفعال الأحمدية والأحوال المحمودية يهتدي به إلى الله وصفاته وأفعاله وأحكامه؛ فإن حصل بواسطة البشر فهو كسبي وإلا فهو العلم اللدني المنقسم إلى الوحي والإلهام والفراسة''(المرقاة ۱/٤٠٥)

ایک ایسی صفت ہے جو امور معنویہ کے مابین ایسا امتیاز اورفرق پیدا کردیتی ہے جس میں نقیض کا احتمال نہیں ہوتا، مطلب یہ ہے کہ علم اس صفت کا نام ہے جس کے نتیجہ میں معنوی اور غیرمحسوس اموراس طور پر معلوم ہوجاتے ہیں کہ دوسرے کے ساتھ کوئی اشتباہ اورالتباس باقی نہیں رہتا۔

علم کا مصداق:

یہاں جس علم کا بیان ہے اس سے شرعی و دینی علم مراد ہے، جس کا مصداق تین علوم ہیں، جیسا کہ آئندہ حدیث میں آرہا ہے: علم قرآن، علم سنت اورعلم فقہ، قرآن وسنت کی اصطلاح میں ''علم'' سے یہی علم مراد ہوتا ہے، اسی کے جاننے والے کو''عالم دین'' کہا جاتا ہے اوراس کے حاصل کرنے والے اور اس کومقصد حیات بنانے والے کو''وارثِ انبیاءؑ'' کہا گیا ہے، دنیوی علوم وفنون جن کا مقصد دنیا اوراس کی ضروریات کی برآری اورسہولیات کا حصول ہے، وہ نہ یہاں مراد ہے اورنہ قرآن وسنت میں اس کوموضوع بحث بنایا گیا ہے، ان علوم وفنون کی تحصیل واشتغال شرعی حدود میں رہتے ہوئے اگرچہ جائز ہے بلکہ ازراہ ضرورت مطلوب بھی ہے، مگر قرآن وسنت میں علم کے جوفضائل ومناقب وارد ہوئے ہیں اورجس کے حصول واشتغال اورنشرواشاعت کی ترغیب دی گئی ہے وہ شریعت کا علم ہے نہ کہ دنیوی ضرورتوں کا علم، آئندہ جو احادیث آرہی ہیں ان سب کا موضوع شریعت کے علوم ہی ہیں۔

علم کی تقسیمات:

علم کی اولاً دوقسمیں ہیں: دینی اوردنیوی یہاں علم دینی کا بیان مقصود ہے، پھرعلم دینی کی دوقسمیں ہیں علم تشریعی اورعلم تکوینی:

(۱) تشریعی وہ علم ہے جس کا تعلق عالَم ظاہر کے ساتھ ہو اوروہ بندے کی اصلاح اورقرب الٰہی کا ذریعہ بنے جیسے قرآن وحدیث کا علم۔

(۲) علم تکوینی وہ علم ہے جس کا تعلق عالَمِ باطن کے ساتھ ہوجس سے واقعات وحالات کونیہ کا علم ہو جیسے خضر علیہ السلام کا علم، ان دونوں میں علم تشریعی کا درجہ بڑھا ہوا ہے کہ وہ قرب الٰہی کا ذریعہ ہوتا ہے۔

پھرعلم تشریعی کی دوقسمیں ہیں: کسبی اور وہبی۔

(۱) کسبی وہ ہے جومحنت وکوشش سے اوراستاذ کے واسطے سے حاصل ہو۔

(۲)علم وہبی وہ علم ہے: جس میں محنت وکوشش کو دخل نہ ہو، محض عطاء الٰہی پر موقوف ہو، اس کو "علم لدنی" بھی کہتے ہیں، جیسے حضرت خضر علیہ السلام کا علم، ان کے بارے میں قرآن کریم میں ہے: "**وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْماً**"(۱) اوراس کے حصول کے ذریعے تین ہیں: (۱) وحی (۲) الہام (۳) فراست اور سمجھ۔

اور علم کی باعتبار انکشاف کے تین قسمیں ہیں علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔

(۱) علم الیقین وہ علم ہے: جو ترتیب مقدمات سے حاصل ہو، (۲) عین الیقین وہ علم ہے: جو مشاہدہ سے حاصل ہو (۳) حق الیقین وہ علم ہے: جو تجربہ سے حاصل ہو مثلاً کسی کو خبر ملی کہ آگ جلاتی ہے یہ علم الیقین ہے، پھر اس نے آنکھوں سے دیکھا کہ آگ کسی شی کو جلا رہی ہے یہ عین الیقین ہے، اور پھر خود اس کی انگلی جل گئی تو یہ حق الیقین ہے۔

نیز تحصیل علم کے حکم کے لحاظ سے علم کی دو قسمیں ہیں:

(۱) فرض عین: وہ علم ہے جس کا جاننا بقدر ضرورت ہر مسلمان مرد و عورت عاقل بالغ پر ضروری ہے، جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ کے ضروری مسائل، اسی طرح عقائد، معاشرت وغیرہ کے مسائل جن پر عمل ضروری ہو اور روزمرہ کی زندگی میں جن حرام امور سے بچنا لازم ہے اس کا علم وغیرہ۔

(۲) فرض کفایہ: قدر ضرورت سے زیادہ علم حاصل کرنا فرض کفایہ ہے، جیسے عالم مفتی اور محدث بننا۔

نیز علم کی ایک تقسیم ہے: علم نافع اور علم غیر نافع:

(۱) علم نافع: وہ علم ہے جس کے مطابق عمل ہو، اوراس سے خشیتِ الٰہی پیدا ہو اور غیر نافع وہ علم ہے جس پر عمل نہ ہو اور خوف وخشیتِ الٰہی دل میں پیدا نہ ہو، حدیث میں علم نافع کی دعا اور علم غیر نافع سے پناہ مانگی گئی ہے۔

الفصل الاول

١٨٧ / ١: عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً، وَحَدِّثُوْا عَنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ وَلاحَرَجَ، وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ" (رواه البخاري)(٢)

(١) من سورة الكهف: ٦٥.

(٢) أخرجه البخاري كتاب الأنبياء، باب ماذكر عن بني إسرائيل ١ / ٤٩١، الرقم ٣٣٤٢.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری طرف سے پہنچاؤ اگر چہ ایک ہی آیت ہو، اور بنی اسرئیل سے (جو باتیں سنو) ان کو بیان کر سکتے ہو اس میں کوئی حرج نہیں، اور جو آدمی قصداً میری طرف جھوٹ کی نسبت کرے اس کو چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ (بخاری)

تشریح حدیث

تبلیغ دین کا حکم اوراس کے آداب:

اس حدیث میں تین جملے ہیں اور ہر جملہ مستقل حدیث کے درجے میں ہے:

بلغوا عنی: یہ پہلا جملہ ہے اس میں علم کی تبلیغ وتعلیم کا حکم دیا گیا ہے، ''تبلیغ'' کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کی انتہاء تک پہنچانا، اس کے مفہوم میں تحقیق اور ثبوت سند کے معنی بھی پائے جاتے ہیں، پس اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ میری آیات واحادیث دوسروں تک پہنچاؤ، دوسرے یہ کہ بلاتحقیق کے میری طرف سے کوئی بات بیان نہ کرو، اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر نہ کرو، حدیث میں یہ سب معانی ملحوظ ہیں۔(۱)

ولو آیة: یعنی دوسروں تک میری بات پہنچاؤ، گوایک ہی آیت ہو، یعنی ضروری نہیں کہ تمام آیات واحادیث پہنچائی جائیں، اگرایک آیت اور ایک بات یاد ہے تو اسی کو پہنچادو؛ کیونکہ تبلیغ کا وجوب بقدر علم ہوتا ہے۔

یہاں آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے ''ولو حدیثاً'' نہیں فرمایا، حالانکہ نشرعلم کے لئے جس طرح آیات کی تبلیغ ضروری ہے اسی طرح تبلیغ احادیث بھی ضروری ہے؟

اس کے کئی جواب ہیں:

(ا) اول یہ کہ تبلیغ آیت سے تبلیغ حدیث کا حکم بطریقۂ اولیٰ ثابت ہوگیا کیونکہ آیات قرآنیہ دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ تحریف سے محفوظ ہیں اس کے باوجود جب آیت کی تبلیغ کا حکم ہے تو حدیث کی تبلیغ بطریق اولی ضروری ہوگی۔(۲)

(۱) المرقاة ۱/۴۰۵.
(۲) شرح الطيبي ۱/۳۹۰.

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ آیات کا اہتمام زیادہ تھا تبلیغ حدیث کے مقابلہ میں، اس لئے کہ آیات قرآنیہ آپ کا معجزہ ہیں، پس منجانب اللہ جو چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرار دی گئی اسکی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ زیادہ تھی، اسلئے ولو آیۃ فرمایا۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ آیات کا اہتمام زیادہ فرماتے تھے اس لئے کہ ان میں تواتر لفظی ضروری ہے۔

(۴) بعض نے کہا کہ: یہاں آیت سے مفید بات مراد ہے اوراس کا مصداق آیات قرآنیہ بھی ہیں اوراحادیث بھی۔ (۱)

پھر یہاں ''آیۃ'' فرمایا ''کلمۃ'' نہیں اس لئے کہ کلمہ بسا اوقات مفید معنی نہیں ہوتا ہے۔

اسرائیلی روایات کے بیان کا حکم:

وحدثوا عن بنی اسرائیل الخ: آیات کے لئے لفظ ''تبلیغ'' استعمال کیا گیا اوراسرائیلی روایات کے لئے ''تحدیث'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کے معنی ہیں مطلقاً بیان کرنا خواہ سند کے ساتھ ہو یا بلا سند، کیونکہ بنی اسرائیل کی باتیں سند کے ساتھ محفوظ نہیں ہیں، سند تو صرف امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی خصوصیت ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے شروع میں یہود نصاری کی کتب اور روایات میں غور کرنے اور ان کو بیان کرنے کی ممانعت فرمادی تھی کہ ایسا نہو کہ لوگ گمراہی کا شکار ہو جائیں، پھر جب وہ اسلامی عقائد وتعلیمات میں پختہ ہوگئے تو آپ علیہ السلام نے ان کی کتب کے پڑھنے اور بیان کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی، پس ''حدثوا عن بني اسرائیل ولا حرج ''میں امر ترخیص واباحت کے لئے ہے، وجوب کے لئے نہیں ہے؛ البتہ اس میں کچھ تفصیل ہے کہ بنی اسرائیل سے کونسی احادیث وروایات نقل کی جائیں اور کونسی نہیں، وہ تفصیل یہ ہے:

اسرائیلیات کی قسمیں:

علماء نے فرمایا کہ اسرائیلی روایات کی قسم کی ہیں:

(۱) المرقاۃ ۱ / ٤٠٦ .

(۱) بعض اسرائیلی روایتیں وہ ہیں جن کی قرآن وحدیث نے تصدیق فرمائی ہے جیسے ساحرین موسیٰ کا ایمان لانا، فرعون کا غرق ہونا وغیرہ ایسی باتوں کو بیان کرنا بلاشبہ جائز ہے۔

(۲) بعض اسرائیلی روایات وہ ہیں جن کی قرآن نے تکذیب کی ہے اور قرآن میں ان کے خلاف صراحت موجود ہے جیسے سلیمان علیہ السلام کا العیاذ باللہ کفر اختیار کرنا، داود علیہ السلام کا متہم بالزنا ہونا، اور موجودہ تورات میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بجائے حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح اللہ قرار دینا وغیرہ، ایسی روایات کو بیان کرنا جائز نہیں ہے۔

(۳) تیسری قسم وہ اسرئیلی روایات ہیں جن کی قرآن وسنت سے نہ تصدیق ہوتی ہے اور نہ تکذیب، قرآن وسنت ان کے بارے میں خاموش ہیں۔

ان تین اقسام میں سے پہلی اور تیسری قسم کی روایات کے بیان کی اجازت دی گئی ہے، دوسری قسم کی روایات کو بیان کرنا جائز نہیں ہے۔

ایک اشکال وجواب:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اشتغال بکتب الیہود والنصاری جائز ہے اور ماقبل کی روایت میں گزرا ہے کہ حضرت عمرؓ کو صحیفہ تورات پڑھنے سے منع فرمایا گیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کتابوں سے اشتغال جائز نہیں، دونوں حدیثوں میں بظاہر تعارض ہے؟ اس کے کئی جواب ہیں:

(۱) بنی اسرائیل کی کتب میں دوطرح کے مضامین تھے قصص وامثال اور احکام، قصص وامثال کو بیان کرنا تو جائز ہے کیونکہ ان میں عبرت وموعظت ہے، لیکن احکام کو بطور عمل نقل کرنا جائز نہیں اور حضرت عمرؓ کے نسخہ میں احکام مذکور تھے۔ (۱)

(۲) ممانعت ابتدائے اسلام میں تھی خلط بالقرآن کے اندیشہ سے جبکہ حضرات صحابہ کے علم میں پختگی نہیں آئی تھی اور اسلامی احکام مقرر نہیں ہوئے تھے، جب اسلامی احکام مقرر ہوگئے اور اسرائیلی احکام پر عمل کا اندیشہ ختم ہوگیا تو ممانعت باقی نہیں رہی۔ (۲)

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اصلاً حضرت عمرؓ کے طرز عمل پر رد تھا جس سے معلوم ہوتا تھا

(۱) یہ جواب ملا علی قاریؒ نے علامہ سید جمال الدین سے نقل فرمایا ہے، مرقاۃ ۱/ ۴۰۷ مطبوعہ اشرفیہ دیوبند۔

(۲) المرقاۃ ۱/ ۴۰۷.

کہ نجات کے لئے سابقہ شرائع کی بھی ضرورت ہے،آپ نے اس کی تردید فرمائی کہ ہماری شریعت نجات کے لئے اور دینی ترقی کے لئے کافی ہے کسی اور شریعت کی حاجت نہیں۔

وضع حدیث پر وعید اور ایک باطل نظریہ کی تردید:

ومن كذب عليّ متعمداً : پہلے جملے میں تبلیغ دین کا حکم تھا، لہٰذا ممکن تھا کہ کوئی تبلیغ کے شوق میں جھوٹی اور بے سند باتوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرے؛ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر سخت وعید بیان فرمائی، چنانچہ فرمایا کہ جو شخص جان بوجھ کر میری طرف جھوٹی بات منسوب کرے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

عليّ : ''علی'' ضرر کے لئے آتا ہے اس کی بنا پر بعض صوفیاء وفرقۂ کرامیہ نے کہا کہ ایسی حدیث وضع کرنا حرام ہے جس میں دین کا نقصان ہو، لیکن دین کے فائدے کے لئے حدیث وضع کرنا جائز ہے جیسے اعمال کی فضیلت اور سورتوں کی فضیلت کے سلسلہ میں، مگر یہ موقف اور ان کا یہ استدلال درست نہیں، کیونکہ یہاں علی ضرر کے لئے نہیں، بلکہ شہرت کے لئے ہے اور معنی یہ ہیں کہ جو شخص جھوٹ بات میری طرف اچھالے اور شہرت دے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، لہٰذا وضع حدیث بہر صورت حرام ہے، بلکہ علامہ شیخ ابومحمد جوینیؒ نے اس کو کفر قرار دیا ہے کیونکہ اس میں شریعت کا استخفاف ہے۔(۱)

متعمداً : اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص موضوع حدیث غیر دانستہ طور پر بیان کردے تو وہ معذور سمجھا جائے گا، وہ اس وعید میں داخل نہیں ہوگا۔(۲)

فليتبوأ مقعده : یہ امر ہے لیکن معنیٰ خبر ہے مضمون کی صداقت کو بتانے کے لئے خبر کو انشاء سے تعبیر کیا ہے کہ جس طرح انشاء میں کذب کا احتمال نہیں ہوتا اسی طرح اس خبر میں کذب کا احتمال نہیں ہے۔(۳)

(۱) المرقاة ۱/۴۰۷ مطبوعه اشرفيه ديوبند.

(۲) مرعاة المفاتيح ۲/۶ مطبوعه مدار القبس للنشر والتوزيع، الرياض.

(۳) (فائدہ) من کذب علي متعمداً الخ مستقل حدیث ہے، ابن الصلاحؒ نے فرمایا یہ حدیث متواتر ہے اور احادیث میں اس سے زیادہ متواتر کوئی اور روایت نہیں ہے حضرات صحابہؓ کی ایک بڑی جماعت اس حدیث شریف کو نقل کرتی ہے تقریبا ۶۲ صحابہؓ سے یہ حدیث مروی ہے جن میں عشرۂ مبشرہ بھی ہیں اس کے علاوہ کوئی اور ایسی روایت نہیں ہے جس کے روایت کرنے پر عشرۂ مبشرہ متفق ہوں، مرقاۃ ۱/ ۴۰۸ مطبوعہ اشرفیہ دیوبند۔

۱۸۸ / ۲ : وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ وَالْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ ، قَالَا : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ حَدَّثَ عَنِّيْ بِحَدِيْثٍ يُرَى أَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ" (رواه مسلم)(۱)

ترجمہ : حضرت سمرہ بن جندبؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: جوشخص میری طرف نسبت کرکے کوئی ایسی حدیث بیان کرے جس کے بارے میں اس کا خیال ہو کہ وہ حدیث جھوٹی ہے تو وہ دوجھوٹے لوگوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔(مسلم)

تشریحِ حدیث

یہ حدیث دوصحابیوں سے مروی ہے، سمرۃ بن جندب اورمغیرہ بن شعبہ۔

احوال سمرہ بن جندبؓ:

آپ جلیل القدرصحابی ہیں، حلیف انصار ہیں، کثیرالروایۃ صحابی ہیں، فارس فتح ہونے کے بعد بصرہ چلے گئے تھے، جری اور بہادر تھے،ایک مرتبہ جہاد کے لئے انصار کے بچے حضورصلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کئے گئے تو ایک لڑکے کوآپ نے جہاد میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمادی اور حضرت سمرہ کومنع کردیا، اس پرحضرت سمرہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ نے فلاں کو اجازت دیدی اور مجھے اجازت نہیں دی، حالانکہ اگراس کااورمیرامقابلہ ہوتو میں اس کو پچھاڑ دونگا، اس پرحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کا مقابلہ کرایا، حضرت سمرہ نے اس کو پچھاڑ دیا، جس پرآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمرہ کوبھی جہاد میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمادی، ۵۹ھ میں بصرہ میں وفات ہوئی۔(۲)

احوال مغیرہ بن شعبہ:

آپ جلیل القدرصحابی ہیں، ثقفی ہیں، غزوۂ خندق کے سال ۵ھ میں مسلمان ہوئے اورمدینہ طیبہ

(۱) أخرجه مسلم ، المقدمه، باب وجوب الرواية عن الثقات وترک الكذابين والتحذير من الكذب على رسول الله صلى الله عليه وسلم ۱ / ۷.

(۲) الإصابة ۲ / ۳۹۳.

کی طرف ہجرت کی اور بیعت رضوان میں شریک رہے، عرب کے ذہین لوگوں میں تھے، قبیصہ بن جابر کہتے ہیں کہ: میں مغیرہ کے ساتھ رہا، اگر مدینہ کے آٹھ دروازے ہوں اور بلاحیلہ کے ان سے نکلنا ناممکن ہو تب بھی مغیرہ آٹھوں دروازوں سے نکل سکتے تھے، ہر مشکل میں کوئی نہ کوئی راہ نکال لیا کرتے تھے، مضبوط قد وقامت رکھتے تھے، ایوان کسریٰ میں انہوں نے ہی کسری کو للکارتے ہوئے زبردست تقریر کی تھی، کوفہ میں رہنے لگے تھے اور وہیں ۵۰ھ میں بعمر ۷۰ سال وفات ہوئی۔ (۱)

بیانِ حدیث میں حزم واحتیاط کی تاکید:

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث روایت کرنے میں حزم واحتیاط کو بیان فرمایا جسکا حاصل یہ ہے کہ اگر کسی روایت کا حدیث نہ ہونا معلوم ہوتو اس کو بیان نہیں کرنا چاہئے، ورنہ بیان کرنے والا جھوٹا شمار ہوگا۔

یــــرى: اس میں دوضبط ہیں: یاء کے ضمہ کے ساتھ، ''اراءۃ'' سے مجہول کا صیغہ ہے، اراءۃ بمعنی دکھانا، یہ ''یظن'' کے معنی میں ہوتا ہے، دوسرا ضبط یاء کے فتحہ کے ساتھ صیغہ معروف ہے جو ''یعلم'' کے معنی میں ہے، یہ رأی سے ماخوذ ہے، معروف کی صورت میں معنی ہونگے کہ حدیث نہ ہونے کا یقین ہو پھر بھی اس کو حدیث کہہ کر بیان کرے وہ جھوٹا ہے اور مجہول کی صورت میں معنی یہ ہیں کہ حدیث نہ ہونے کا گمان ہو اس کے باوجود حدیث کے عنوان سے بیان کرے وہ جھوٹا ہے اول ضبط (مجہول) راجح ہے، اسلئے کہ اس میں احتیاط زیادہ ہے کیونکہ مجہول کی صورت میں مطلب یہ نکلتا ہے کہ اگر حدیث نہ ہونے کا گمان بھی ہو یعنی اگر اس بات کا شبہ بھی ہوجائے کہ یہ حدیث ہے یا نہیں تو بھی بیان نہیں کرنا چاہئے، ورنہ جھوٹا شمار ہوگا۔ (۲)

کذب: اس میں بھی دوضبط ہیں:

(۱) کذب صیغہ صفت کے ساتھ اس وقت ''أنہ'' کی ضمیر کا مرجع ''من'' ہوگا، جس سے مراد روایت کرنے والا ہے۔

(۲) كَذِبٌ مصدر اس وقت ضمیر حدیث کی طرف راجع ہوگی، راجح ضبط اول ہے۔ (۳)

---

(۱) الإصابة ٥/١٩٢–١٩٤.

(۲) المرقاة ١/٤٠٩.

(۳) المرقاة ١/٤٠٩.

الکاذبین : ابونعیم اصفہانی نے اس کو تثنیہ کے ساتھ ضبط کیا ہے، یعنی یہ دو جھوٹوں میں سے ایک ہے ایک جھوٹا حدیث کو وضع کرنے والا اور دوسرا اس کو بیان کرنے والا، اور جمہور علماء نے اس کو صیغۂ جمع کے ساتھ ضبط کیا ہے یعنی یہ بیان کرنے والا جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے کہ دنیا میں بہت سارے جھوٹے ہیں ہر جھوٹا اپنی لائن سے جھوٹ بولتا ہے، یہ جھوٹی حدیث بیان کرنے والا علم کی لائن سے جھوٹ بول رہا ہے۔(۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موضوع حدیث کو بیان کرنا جائز نہیں ہے، لیکن اس پر سوال یہ ہے کہ حضرات محدثین موضوعات کو بیان کرتے ہیں تو ان حضرات کا یہ عمل کیونکر صحیح ہے؟

جواب یہ ہے کہ موضوع حدیث کو وضع کی نشان دہی کئے بغیر بیان کرنا جائز نہیں ہے، البتہ وضع کی نشان دہی کر کے بیان کرنا جائز ہے، تاکہ لوگوں کو موضوع روایات کا علم ہو جائے اور وہ ان روایات پر عمل کرنے سے پرہیز کریں، حضرات محدثین موضوع روایات کو وضع کی نشاندھی کے ساتھ ہی بیان کرتے ہیں۔

۱۸۹/۳: وَعَنْ مُعَاوِيَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ يُرِدِاللّٰهُ بِهِ خَيْراً يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ، وَإِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِيْ"(متفق عليه)(۲)

ترجمہ : حضرت معاویہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ شانہ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطاء فرمادیتے ہیں اور میں "علم" کو تقسیم کرنے والا ہوں، دینے والا تو اللہ ہی ہے۔(بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

احوال معاویہ بن ابی سفیانؓ:

جلیل القدر صحابی ہیں، بعثت سے پانچ سال قبل پیدا ہوئے، فتح مکہ کے سال ایمان لائے، ان کے والد ابوسفیان القریشی ہیں، اور والدہ ہند بنت عتبہ بن ربیعہ ہیں، بعض نے کہا کہ: حضرت معاویہؓ فتح مکہ سے

(۱) شرح النووی ۱/۷، المرقاۃ ۱/۴۰۹.

(۲) أخرجه البخاري في ثلاثة، مواضع: كتاب العلم، باب من يرد الله به خيراً يفقهه في الدين ۱/۱۶ الرقم ۷۲، وكتاب فرض الخمس، باب قول الله عزوجل فان لله خمسه وللرسول ۱/۴۳۹ الرقم ۳۰۱۶، وكتاب الاعتصام، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم لاتزال طائفة من أمتي الخ ۱/۱۰۸۷ الرقم ۷۰۱۹، ومسلم كتاب الزكاة، باب النهي عن المسئلة ۱/۳۳۳ الرقم ۱۰۳۷.

قبل عمرۃ القضاء کے موقعہ پر اپنے والد سے پہلے ہی مشرف باسلام ہوگئے تھے، مگر والد کے ڈر سے اسلام ظاہر نہیں کرتے تھے، فتح مکہ کے موقع پران کا اسلام ظاہر ہوا، ابوسفیان کے کئی بیٹے غزوۂ بدر واحد میں مسلمانوں کے مقابلہ میں مشرکین کے ساتھ لڑنے کے لئے آئے ان میں سے کئی مارے بھی گئے، لیکن حضرت معاویہؓ کبھی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں نہیں آئے، گویا کہ دل سے پہلے ہی مسلمان تھے، اسی وجہ سے آپ کو بڑا مرتبہ ملا ان کا شمار کاتبین وحی میں ہے آپ کی بہن حضرت ام حبیبہؓ ازواج مطہرات میں سے تھیں، بچپن سے ہی آپ میں آثار سیادت ظاہر تھے، فرماتے تھے کہ میں ایک مرتبہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے لئے وضوء کا پانی لے کر پہنچا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضوء کے دوران میری جانب دیکھ کر فرمایا کہ: اگر تو حاکم بنا تو اللہ کا خوف رکھنا اور عدل کرنا، فرمایا کہ: اسی وقت سے مجھے گمان ہونے لگا کہ میں حاکم بنایا جاؤں گا، حضرت عمرؓ نے ان کو ملک شام کا گورنر بنایا تھا، بعمر ۷۷ سال ماہ رجب ۶۰ھ میں ان کی وفات ہوئی، ان کے پاس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ازار، چادر، قمیص، اور کچھ بال وناخن تھے، انھوں نے وصیت کی تھی کہ انتقال کے بعد مجھے آپ علیہ السلام کی قمیص پہنانا، چادر میں لپیٹنا، ازار پہننانا، اور میرے ناک، کان میں اور مواضعِ سجود میں بال اور ناخن رکھ دینا اور پھر ارحم الراحمین کے حوالہ کردینا۔(۱)

فہمِ دین کا عطاء ہوجانا خیر کثیر:

اس حدیث میں فقاہت فی الدین کی ترغیب دی گئی ہے اوراس کی عظمت واہمیت کو واضح کیا گیا ہے، فقاہت اور فہم دین عظیم ترین نعمت ہے، اوراللہ کی رضاء وقرب کی علامت ہے کیونکہ کسی شخص کے بارے میں اللہ کا ارادہ کیا ہے؟ کچھ نہیں کہا جاسکتا، مگر جس کو فہم دین کی دولت عطاء ہوگئی اس حدیث کے مطابق اس کے ساتھ خدا کو بالیقین خیر مطلوب ہے۔

امام محمد کو ان کی وفات کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ

(۱)سیر اعلام النبلاء ۳/ ۱۶۲ مطبوعہ مؤسسة الرسالہ بیروت میں امام ذہبیؒ نے تقریباً ۴۰ صفحات میں آپکا ترجمہ لکھا ہے جو بہت مفید ترین باتوں پر مشتمل ہے من شاء فلیطالع .

فرمایا؟ امام محمدؒ نے کہا کہ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: محمد! اگر مجھے تیرے ساتھ خیر منظور نہ ہوتی تو میں تجھے دین کا فہم وعلم عطاء نہ کرتا۔ (۱)

خیراً: اس میں تنوین برائے تعظیم ہے یعنی خیرعظیم اور خیر کثیر۔ (۲)

یفقهه فی الدین: شراح نے فرمایا کہ: یہاں لفظ فقہ علم فقہ یعنی فروعی احکام کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اس سے تمام علوم شرعیہ (تفسیر، حدیث، فرائض واحکام) مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو علوم دینیہ حاصل کرنے کی توفیق ملی اس کو منجانب اللہ خیر کثیر عطا کی گئی، یہی معنی راجح ہیں، معلوم ہوا کہ دین کی سمجھ عظیم ترین نعمت ہے، اس کے مقابلہ میں تمام نعمتیں ہیچ ہیں، کیونکہ یہ انبیاء علیہم السلام کی میراث ہے اور فرشتے بھی ایسے شخص کی عظمت کے قائل ہوتے ہیں، حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث سے تمام لوگوں پر علماء کی فضیلت اور تفقہ فی الدین کا تمام علوم سے افضل ہونا ظاہر ہے۔ (۳)

انـمـا أنا قاسم و اللّٰه یعطی: اس جملہ کا تعلق یا تو علم کے ساتھ ہے یا مال کے ساتھ، اول صورت میں یہ ایک شبہ کا جواب ہے، کسی کو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مخزنِ علوم ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس کو زیادہ سکھائیں گے اس کو زیادہ علم حاصل ہوگا؟ اس شبہ کا جواب دیا کہ میں مجلس میں سب کے سامنے برابر بیان کرتا ہوں، بعض لوگ اپنی خداداد فہم کی وجہ سے علم زیادہ حاصل کر لیتے ہیں گویا کہ علم کی کمی وزیادتی من جانب اللہ ہے، یہ مطلب راجح ہے۔ (۴)

لیکن امام مسلمؒ نے اس حدیث کو کتاب الزکاۃ میں اور امام بخاری نے باب الخمس میں ذکر کیا ہے، اس لحاظ سے اس حدیث کا تعلق مال سے ہوا، جس کا پس منظر یہ ہے کہ غزوۂ حنین میں بہت سا مال غنیمت مسلمانوں کو ملا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کو انکی تالیفِ قلب کے لئے زیادہ دیا کیونکہ من جانب اللہ ایسا ہی حکم تھا، اس پر کچھ کم سمجھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ مکہ والوں کو مال زیادہ دیا گیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: **إنـمـا انـاقـاسـم و اللّٰه یعطی** کہ میں تو تقسیم کرنے والا ہوں دینے والا حقیقت میں اللہ ہے، اللہ کی طرف سے جس کو جس قدر دینے کا حکم ہوتا ہے میں اسی کے مطابق دیتا ہوں۔

(۱) اعلاء السنن ۲۱/۱۱.

(۲) المرقاة ۱/۴۱۰.

(۳) المرقاة ۱/۴۱۰، فتح الباری ۱/۱۲۴.

(۴) شرح الطیبی ۱/۳۹۳۔فتح الإله ۲/۵۳ مطبوعه دارالکتب العلمیه بیروت لبنان.

١٩٠ / ٤ : وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "اَلنَّاسُ مَعَادِنُ كَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقُهُوْا" (رواه مسلم)(١)

ترجمہ : حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انسانوں کی کانیں ہیں جس طرح سونے اور چاندی کی کان ہوتی ہے جولوگ زمانۂ جاہلیت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں اگر وہ دین کی سمجھ حاصل کرلیں۔ (مسلم)

تشریح حدیث

فقاہت فی الدین؛ فطری صلاحیتوں میں نکھار اور ترقی کا ذریعہ:

اس حدیث پاک میں فقہ فی الدین کی ترغیب ہے اور خلقی اوصاف کے لحاظ سے لوگوں کے مختلف المرتبۃ ہونے کا بیان ہے، خلاصہ یہ ہے کہ تمام انسانوں میں کچھ نہ کچھ اچھی صفات ہوتی ہیں گوآدمی کافر ہو، اسلام لانے اور اس کی تعلیمات سے اپنے آپ کو آراستہ کرلینے سے ان صفات میں مزید نکھار اور جلا پیدا ہوجاتا ہے، اسلام میں ان صفات کا اعتبار ہے، انھیں صفات کے لحاظ سے لوگ مختلف مرتبہ کے ہوتے ہیں ایسا نہیں کہ تمام لوگوں کو ایک ہی مرتبہ کا شمار کیا جائے۔

الناس معادن : معادن، معدن کی جمع ہے، بمعنیٰ کان جہاں سونا، لوہا، تانبا وغیرہ قدرتی ذخائر نکلتے ہیں، معنی یہ ہیں کہ لوگوں کی فطری صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں جیسے کانیں مختلف ہوتی ہیں۔(٢)

سوال: الـنـــــاس ذوالعقل مبتدا ہے اور معادن غیر ذی العقل خبر ہے اور خبر کا مبتدا پر حمل ہوتا ہے، تو غیر ذوی العقل کا حمل ذوالعقل پر ہو رہا ہے، جو جائز نہیں ہے؟

جواب یہ ہے کہ: یہ کلام تشبیہ ہے نہ کہ حقیقت، تقدیر عبارت یہ ہے: "**الـنـــاس مثل الـمعـادن كمعادن الذهب والفضة**" اور وجہ شبہ میں دو احتمال ہیں:

(ا) ظرف ہونا جواہر نفیسہ کے لئے، کہ جس طرح کان ظرف ہوتی ہے جواہر نفیسہ کے لئے، اسی طرح

(١) اخرجه مسلم كتاب الفضائل، باب خيار الناس ٢ / ٣٠٧ الرقم: ٢٥٢٦.

(٢) كتاب الميسر للتوربشتي ١ / ٩٨ ط: مكتبه نزار المصطفى الباز، مكة المكرمة.

لوگ بھی اچھی صلاحیتوں اورعلوم لطیفہ کے لئے ظرف ہیں، نیز جس طرح سونے چاندی وغیرہ کو پگھلاکر مختلف قسم کے زیورات تیار کئے جاتے ہیں اسی طرح تعلیم وتربیت کے ذریعہ انسان کو قابل بنالیا جاتا ہے۔

(۲) دوسری وجہ شبہ تفاوت ہے کہ جس طرح کانوں کی حیثیت میں تفاوت ہوتا ہے ایسے ہی لوگوں کی صلاحیت میں بھی تفاوت ہوتا ہے، کسی شخص میں کوئی صلاحیت، کسی میں دوسری صلاحیت ہرانسان میں عموماً کوئی نہ کوئی صلاحیت ضرور ہوتی ہے، اس کارخانۂ عالم میں اللہ نے کسی کو بیکار پیدانہیں فرمایا۔ (۱)

خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاسلام: اس جملہ میں بتایا جارہا ہے کہ لوگوں کی مختلف صلاحیتوں اوراخلاق کا اسلام میں بھی لحاظ ہے، سب کو ایک درجہ میں شمار نہیں کیا جائے گا، بعض لوگوں میں خلقی اورفطری طور پر بہت استعداد ہوتی ہے مثلاً شجاعت، سخاوت، ذہانت، وغیرہ اعلی اوصاف ان میں ہوتے ہیں، انہی اوصاف کی وجہ سے ان کو معاشرہ میں بڑا سمجھا جاتا تھا، پھرایسے لوگوں نے اسلام قبول کرلیاتو اب بھی ان کوخیار سمجھا جائے گا، بلکہ اسلام کا نوران کے خلقی اوصاف کے ساتھ مل کر ان کومزید بڑے درجہ والا بنادے گا، بشرطیکہ وہ دین کی سمجھ پیدا کرلیں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جاہلیت میں جو اپنے قبیلہ کا سردار تھا اوراس نے اسلام قبول کرلیا اوراسلام لانے کے بعد فقاہتِ دین حاصل کرلی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو ان کے قبیلہ کا سردار بناتے تھے، ہاں اگرکوئی پہلے خیارشمار ہوتا تھااوردوسرا ادنیٰ تھا دونوں اسلام لائے لیکن صرف ادنی نے دین کا علم حاصل کیا، تو اب اس ادنی کو افضل وبرتر شمار کیا جائے گا۔ (۲)

فہم دین کی شان:

اذافقھوا: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شرف وفضیلت کا مدارفقاہت وفہم دین پر ہے نہ کہ نفسِ صفات کمالیہ پر، پس اگرکوئی شخص دورِجاہلیت میں اعلیٰ انسانی صفات کا حامل ہونے کی وجہ سے خیارشمار کیاجاتا تھالیکن اسلام کے سایہ میں آنے کے باوجود انہی سابقہ صفات پراکتفاء کرکے بیٹھ جائے اورفقاہت وفہم دین حاصل نہ کرے تو پھرمحض سابقہ اوصاف حمیدہ کی بناء پر وہ خیار وبرتر شمارنہیں ہوگا۔

---

(۱) شرح الطیبی ۱/ ۳۹٤ مطبوعہ زکریا دیوبند، مرقاۃ ۱/ ٤۱۱ مطبوعہ اشرفیہ دیوبند، حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ نے "التعلیق الصبیح" ۱/ ۱٤۱ میں نو وجوہات تشبیہ ذکرفرمائی ہیں من شاء فلیطالع.

(۲) المفاتیح فی شرح المصابیح للمظھری الحنفی ۱/ ۳۰۲ مطبوعہ ادارۃ الثقافۃ الإسلامیۃ، التعلیق الصبیح ۱/ ۱٤۱ مطبوعہ مکتبہ فخریہ دیوبند.

۵/۱۹۱ :وَعَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لاحَسَدَ إِلَّافِي اِثْنَيْنِ:رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالاً فَسَلَّطَهُ عَلَى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ، وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِيْ بِهَا وَيُعَلِّمُهَا" (متفق عليه)(۱)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ حسد (درست) نہیں لیکن دوشخصوں کے بارے میں: ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ شانہ نے مال دیا پھراللہ تعالیٰ نے اس کوحق کے راستہ میں خرچ کرنے کی توفیق عطا کی، دوسراوہ انسان جس کو اللہ تعالیٰ نے علم دیااوروہ اس علم کے مطابق فیصلہ کرتا ہےاوردوسروں کواس کی تعلیم دیتا ہے۔(بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

دولوگوں پرحسد کی اجازت:

اس حدیث میں دوشخصوں کی فضیلت مذکور ہے ان میں سے ایک وہ ہے جوعلم دین سکھانے میں مشغول رہتا ہو،اسی مناسبت سے یہ حدیث یہاں آئی ہے، دوسراوہ شخص جوخیر کے کاموں میں خرچ کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، ہرکارخیرمیں خوب بڑھ چڑھ کرخرچ کرتا ہے۔

حسد کا مفہوم اورحسد ورشک میں فرق:

لاحسد إلاّفي إثنين: حسد کہتے ہیں: کسی کے پاس نعمت دیکھ کراس کے زائل ہونے کی تمنا کرنا، محققین کے نزدیک اس نعمت کے اپنی طرف منتقل ہونے کی تمنا کرنا حسد کے مفہوم میں داخل نہیں ہے، اگرچہ بعض حضرات نے انتقال کی تمنا کی بھی قید لگائی ہے، مگرراجح یہ ہے کہ یہ قید نہیں ہے، کسی کے پاس نعمت

(۱)أخرجه البخاري في أربعة مواضع، كتاب العلم، باب الاغتباط في العلم والحكمة ۱/۱۷ الرقم ۷۴.

وكتاب الزكاة، باب انفاق المال في حقه ۱/۱۸۹ الرقم ۱۳۹۱، وكتاب الأحكام، باب أجر من قضى بالحكمة الخ ۲/۱۰۵۷ الرقم ۶۸۵۸ والاعتصام، باب ماجاء في اجتهاد القضاء بماانزل الله لقوله تعالى ومن لم يحكم بماانزل الله فأولئك هم الظلمون ۲/۱۰۸۸ الرقم ۷۰۲۳ .

ومسلم كتاب فضائل القرآن ومايتعلق به، باب مقتل من يقوم بالقرآن ويعلمه وفضل من تعلم حكمة من فقه أوغيره فعمل بها وعلمها ۱/۲۷۲الرقم ۸۱۶.

دیکھ کر اپنے لئے بھی اس کے حصول کی تمنا کرنا غبطہ اور رشک کہلاتا ہے۔(۱)

اشکال: حسد حرام ہے اور اللہ کی تقدیر پر اعتراض ہے پھر یہاں حدیث میں حسد کی اجازت کیسے دی گئی ہے؟ اس کے دو جواب ہیں:

(۱): یہ قضیہ نافیہ فرضیہ ہے کہ اگر حسد جائز ہوتا تو ان دو شخصوں پر جائز ہوتا، جیسے آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ اگر غیر اللہ کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں حکم کرتا کہ عورتیں اپنے شوہر کو سجدہ کریں۔(۲)

(۲): یہاں حسد سے مراد غبطہ ورشک ہے جس کا بیان اوپر گذرا، یعنی کسی کے پاس نعمت دیکھ کر اس کے پاس سے زوال کی تمنا کئے بغیر اس کے مثل کی اپنے لئے تمنا کرنا، اس میں اللہ سے اس نعمت کے مثل کی اپنے لئے دعا ہے، ظاہر ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں، بلکہ جس نعمت کی تمنا ہے اگر وہ دینی ہو تو یہ تمنا مستحب ہے اور اگر دنیوی ہو تو مباح ہے، گویا کہ لفظِ حسد اپنے معنی میں نہیں ہے۔(۳)

لیکن اس پر سوال ہے کہ غبطہ تو ہر چیز میں جائز ہے پھر انہی دو کے ساتھ کیوں خاص کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حصر سے ماعدا کی نفی کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ حصر کا مقصود ان دو نعمتوں کی اہمیت بیان کرنا ہے کہ غبطہ کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ دو نعمتیں ہیں۔

علی هلكته في الحق: ہلاک کرنے سے خرچ میں مبالغہ کرنا مراد ہے اور فی الحق کی قید لگا کر اسراف کو نکال دیا اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد اخلاص کے ساتھ خرچ کرنا ہے۔(۴)

١٩٢ / ٦: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْعِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْوَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْلَهُ" (رواه مسلم)(۵)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

(۱) المرقاة ١ / ٤١١.

(۲) مرقاة ١ / ٤١١ مطبوعه اشرفيه ديوبند.

(۳) مرقاة ١ / ٤١١ مطبوعه اشرفيه ديوبند.

(٤) المرقاة ١ / ٤١١.

(٥) أخرجه مسلم، كتاب الوصية، باب مايلحق الانسان من الثواب بعد وفاته ٢ / ٤١ الرقم: ١٦٣١.

جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل کے ثواب کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے؛ لیکن تین اعمال کے ثواب کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے (۱) صدقہ جاریہ (۲) وہ علم جس سے نفع حاصل کیا جاتا رہے (۳) اور نیک اولاد جو مرنے کے بعد اس کے لئے دعا کرے۔ (مسلم)

تشریح حدیث

وہ اعمال جن کا ثواب بعد از مرگ بھی جاری رہتا ہے:

اس حدیث میں کئی جملے ہیں، ان میں ایک جملہ علم سے متعلق ہے، اسی لحاظ سے باب سے مناسبت ہے، روایت کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو اپنے عمل کا ثواب ملتا رہتا ہے، جب اس دنیا سے دار آخرت کی طرف چلا جاتا ہے تو عمل کرنے کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے اس لئے ثواب کا سلسلہ بھی ختم ہوجاتا ہے، لیکن تین عمل ایسے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی ان پر ثواب ملتا رہتا ہے، وہ تین عمل یہ ہیں: (۱) صدقۂ جاریہ (۲) علم نافع، (۳) ولد صالح۔

(۱) **من صدقة جارية**: صدقۂ جاریہ وہ صدقہ ہے جس کا نفع جاری وساری رہے، مثلاً مسجد بنوانا مدرسہ بنوانا وغیرہ کہ جب تک یہ مسجد ودرسگاہ باقی اور آباد رہیں گے، اس وقت تک بانی کو ثواب ملتا رہے گا اسی طرح کنواں کھدوادیا، نل لگوایا، کہ جب تک لوگ اس کنویں یا نل سے پانی پیتے رہیں گے اس وقت تک اس کو ثواب ملتا رہے گا۔

(۲) **أو علم ينتفع به**: ایسا علمی کام جس کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہے مثلاً اخلاص سے دینی کتاب تصنیف کرنا، شاگردوں کا سلسلہ جاری کرنا وغیرہ۔

(۳) **أو ولد صالح يدعو له**: والدین کی تربیت کی وجہ سے اولاد اگر نیک بن جائے تو اولاد کے اعمال کا ثواب بلانیت کے بھی والدین کو بھی ملے گا، بعض نے کہا کہ: "یدعو لہ" کی قید احترازی ہے چنانچہ والدین کو ثواب اس وقت ملے گا جب اولاد ان کیلئے دعا کرے، لیکن جمہور کے یہاں یہ قید تحریض وترغیب کیلئے ہے، اولاد کو ترغیب دینا مقصود ہے کہ وہ اپنے والدین کے لئے دعاء کا اہتمام کرے، اگر دعا نہ بھی کرے تب بھی ولدِ صالح کے عمل کا ثواب والدین کو ملے گا، کیونکہ اولاد کے صالح بننے میں والدین کی تربیت کو دخل ہے جیسے کوئی شخص کسی کے درخت سے پھل کھاوے اور مالک کی طرف سے دلالۃً اجازت ہوتو

اس کا ثواب درخت لگانے والے کو بہر دو صورت ملتا ہے خواہ کھانے والا دعا کرے یا نہ کرے۔[(۱)]

ایک تعارض اور اس کا حل:

یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ اس سے پہلے حدیث آئی ہے کہ سنت حسنہ جاری کرنے پر جاری کرنے والے کو ثواب ملتا رہے گا گو وہ مرجائے، جبکہ یہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ صرف تین اعمال ایسے ہیں کہ ان کا ثواب مرنے کے بعد جاری رہتا ہے، لہٰذا دونوں حدیثوں میں تعارض ہے؟

اس کے دو جواب ہیں: (۱) ایک یہ کہ سنت حسنہ ''علم ینتفع'' بہ میں داخل ہے، کیونکہ سنت حسنہ سے بھی علمی سلسلہ کی طرح لوگوں کو دینی فائدہ ہوتا ہے۔

(۲) یہاں حدیث میں جو حصر ہے وہ حصر ادعائی اور حصر اضافی ہے، جس میں ماعدا کی نفی نہیں ہوتی فلا اشکال۔[(۲)]

۱۹۳/۷: وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِماً سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ، وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ أَخِيْهِ، وَمَنْ سَلَكَ طَرِيْقاً يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْماً سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ بِهٖ طَرِيْقاً إِلَى الْجَنَّةِ، وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِيْ بَيْتٍ مِنْ بُيُوْتِ اللّٰهِ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَيَتَدَارَسُوْنَهُ بَيْنَهُمْ، إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ، وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهُ، وَمَنْ بَطَّأَ بِهٖ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهُ'' (رواه مسلم)[(۳)]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(۱) شرح مصابيح السنة لابن الملك الرومي الحنفي ۱/۱۹۳.

(۲) المرقاة ۱/۴۱۳.

(۳) أخرجه مسلم ''كتاب الذكر والدعاء والتوبة والإستغفار باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن وعلى الذكر ۲/۳۴۵ الرقم ۲۶۹۹''

''جوشخص دنیا کی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت کسی مومن سے دور کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کی مصیبتوں میں سے ایک بڑی مصیبت کو دور کردیگا، اور جس شخص نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی تو اللہ تعالیٰ شانہ دنیا وآخرت میں اسکی پردہ پوشی فرمائے گا، اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک اپنے بندے کی مدد کرتا ہے جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے اور جوشخص علم کی تلاش میں کسی راستہ پر چلتا ہے تو اللہ اسکے بدلہ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرمادیتے ہیں، اور نہیں جمع ہوتی کوئی قوم اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر (مسجد مدرسہ وغیرہ) میں مگران پر اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے سکینہ نازل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ان پر چھاجاتی ہے اور فرشتے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں اور ان کا ذکر اللہ تعالیٰ اس مخلوق میں کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ شانہ کے پاس ہے، (یعنی ملائکہ میں) اور جس شخص کو اس کا عمل (بڑے درجہ سے) پیچھے کردے اس کا نسب اس کو آگے نہیں بڑھا سکے گا'' (مسلم)

تشریح حدیث

اس حدیث پاک میں کئی اعمال کی ترغیب وفضیلت بیان کی گئی ہے ان میں سے ایک عمل طلب علم بھی ہے اسی وجہ سے یہ روایت کتاب العلم میں لائی گئی ہے۔

کسی کی پریشانی دورکرنے کی فضیلت:

من نفس عن كربة: نفّس بمعنی ہٹانا، دورکرنا، **کربة**: مصیبت اورغم۔

حضرات شراح نے فرمایا کہ: پہلے کربۃ کی تنوین تقلیل وتحقیر کے لئے ہے اور دوسرے کی تعظیم کے لئے ہے، مطلب یہ ہے کہ جوشخص دنیا میں کسی کی معمولی سی مصیبت بھی دور کرے گا اللہ سبحانہ وتعالیٰ روز قیامت اس کی بڑی مصیبت دور فرمائیں گے۔(۱)

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ کے یہاں تو ایک نیک عمل پر دس گنا اجر ملتا ہے، ''مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا '' یہاں اس نے ایک مصیبت دور کی تو اس سے بھی ایک مصیبت ہٹادی گئی جبکہ مذکورہ آیت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ دس مصیبتیں دور کی جاتیں؟

(۱) شرح الطیبی ۱/ ۳۹۹ مطبوعه زکریا دیوبند.

جواب یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ کے یہاں ثواب کی زیادتی کبھی تو کمیت کے اعتبار سے ہوتی ہے اور کبھی باعتبار کیفیت کے ہوتی ہے، یہاں زیادتی کیفیت کے لحاظ سے ہے اور معنی یہ ہیں کہ جس شخص نے دنیا میں کسی کی معمولی مصیبت دور کی آخرت میں اس کی بڑی مصیبت دور ہوگی، گویا کہ وہ ایک بڑی مصیبت دس چھوٹی مصیبتوں کے قائم مقام ہوگی۔ (۱)

تنگ دست کومہلت دینے کی فضیلت:

ومن یسر علی معسر: "**معسر**" بمعنی غریب وتنگ دست، خواہ مومن ہو یا کافر، اور "**یسّر**" سے قرض کی ادائیگی میں آسانی پیدا کرنا مراد ہے، جس کے مختلف درجات ہیں: اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ کل یا بعض قرض معاف کردیا جائے اور ادنیٰ یہ ہے کہ اس کو مہلت دیدی جائے اور اگر مہلت دی ہوتی ہے تو اس میں اضافہ کردیا جائے دونوں محمود ہیں **کماقال الله تعالیٰ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّ قُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ**.

یعنی اگر قرض لینے والا تنگ دست ہو تو اسے وسعت حاصل ہونے تک مہلت دی جائے اور معاف کرنا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔ (۲)

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک واقعہ بیان فرمایا کہ امم سابقہ میں ایک مالدار تھا اس نے اپنے خادم سے کہہ رکھا تھا کہ ہمارا قرض اگر کسی غنی کے پاس ہو تو اس کو مہلت دے دو، اور اگر کسی غریب پر ہے تو اس کو معاف کردینا، جب وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوا تو اللہ تعالی نے فرمایا کہ تمہارے پاس کیا نیک عمل ہے اس نے کہا کہ اے بار الہٰ! کچھ نہیں، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ غور کرلو، اس نے کہا کہ بس اتنا تو ہے کہ میں دنیا میں تجارت کرتا تھا، میرا معمول یہ تھا کہ اپنے حق کو تنگ دست سے معاف کردیتا اور صاحبِ وسعت کو (ضرورت کے وقت) مہلت دیدیتا، اللہ نے فرمایا معاف کرنے کا میں زیادہ حقدار ہوں، چنانچہ اللہ نے اس کو معاف فرمادیا اور جنت عطا فرمادی۔ (۳)

---

(۱) مرقاة ۱/ ٤١٤ مطبوعه اشرفيه ديوبند.

(۲) المرقاة ۱/ ٤١٤، وهذه الآية من سورة البقره: ۲۸۰.

(۳) مشكوة ص ۲۴۳ بحواله بخاری ومسلم.

پردہ پوشی اور ستر پوشی کی فضیلت:

ومن ستر مسلما: اس جملہ کے دو مطلب ہیں:

(۱) جس شخص نے کسی مسلمان کے عیب اور برائی کو چھپایا اور اس کو رسوا نہیں کیا تو دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ شانہ اس کی پردہ پوشی کرے گا یعنی اہلِ محشر کے سامنے اس کے عیوب کو ظاہر نہیں کرے گا، البتہ پردہ پوشی کا حکم ایسے گناہوں میں ہے جن میں لوگوں کا ضرر نہ ہو، اگر اس برائی میں لوگوں کا ضرر ہے تو ایسے شخص کو اولاً تنہائی میں سمجھانا چاہئے تاکہ وہ اس برائی سے باز آئے، پھر بھی نہ مانے تو اس کے بارے میں ایسے شخص کو بتایا جائے جو اس کو برائی سے روک سکے جیسے بادشاہ، قاضی وغیرہ، اس سے غیبت کی ممانعت بھی معلوم ہوئی، کیونکہ غیبت پردہ پوشی کے خلاف ہے۔

(۲) اس سے مراد کسی غریب انسان کو کپڑا پہنانا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی ننگے مسلمان کے ستر کو چھپائے تو اللہ دنیا و آخرت میں اس کے عیوب چھپائے گا اور ستاری کرے گا۔(۱)

مسلمان بھائی کی مدد کی فضیلت:

والله فی عون العبد: جب تک بندہ مسلمان بھائی کی مدد کا جذبہ رکھتا ہے اور اس کے لئے کوشاں رہتا ہے اس وقت تک اللہ تعالیٰ شانہ بھی اس بندہ کی مدد میں لگے رہتے ہیں، پس دوسروں کی مدد وتعاون کرنے سے اپنے کام بھی آسان ہوتے ہیں، ایک حدیث میں ہے: ''ارحموا مَنْ فِي الأرْض يرحمكم من في السماء(۲)'' اگر خود غرضی آجائے تو اللہ تعالیٰ شانہ بھی اپنا مدد کا ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔

تحصیل علم کی فضیلت:

من سلک طریقا یلتمس فیه علما: اس جملہ میں طلب علم کی فضیلت مذکور ہے، یہی جزء باب کے مناسب ہے ''طریق'' عام ہے خواہ قریب ہو یا بعید، بری ہو یا بحری، ہوائی ہو یا زمینی اور مشکل ہو یا آسان، ''بہ'' کی ضمیر کے مرجع میں چار احتمال ہیں:

(۱) اس کا مرجع طریق ہو یعنی اس طریق کی وجہ سے طریق جنت آسان کر دے گا (۲) اس کا مرجع

(۱) اللمعات ۱/ ۵۳۱.

(۲) رواه ابوداؤد في الأدب (٤٩٤١) والترمذي في ابواب البر والصلة (١٩٢٤)

سلوک فی العلم ہو(۳) اس کا مرجع علم ہو(۴)اس کا مرجع التماسِ علم ہو یعنی طلب علم یہ احتمال راجح ہے، کیونکہ اس صورت میں یہ فضیلت ہراس شخص کو حاصل ہوگی جوطلب علم کے لئے گھر سے نکل جائے خواہ اس کوعلم حاصل ہو یانہ ہو، البتہ اخلاص ہو، مال وجاہ مقصود نہ ہو۔(۱)

وماجتمع قوم فی بیت : جولوگ علم کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہیں ان کی فضیلت بیان فرمائی کہ ان پر اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے، فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں اورحق تعالیٰ شانہ ملائکہ کے سامنے ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔

''بیت'' سے مراد وہ جگہ جہاں قرآن پڑھااور پڑھایاجائے خواہ مسجد ہویامدرسہ، اور بیت کی نسبت اللہ کی طرف بطورتعظیم کے ہے،اور اس نسبت سے مساجد یہود ونصاری کو نکالنا مقصود ہے کیونکہ ان میں داخل ہونا مکروہ ہے۔(۲)

یتلون کتاب اللہ ویتدارسونہ بینھم :علماء نے فرمایاکہ:اس میں تمام علومِ شرعیہ کا پڑھناپڑھاناداخل ہے،جیساکہ''یتدارسونہ'' سے بھی معلوم ہوتاہے،اس لئے یہ فضیلت الفاظ کی تعلیم کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

السکینة :اس سے مرادہے:طمانینتِ قلب، جوایمان کے بعدسب سے بڑی نعمت ہے،قلبی سکون دوچیزوں سے حاصل ہوتاہے(۱)انسان کی امیدیں لمبی نہ ہوں(۲) ماسوی اللہ کا خوف نہ ہو،اور جوحضرات اخلاص کے ساتھ پڑھتے پڑھاتے ہیں ان کے اندر یہ دونوں باتیں پیداہوجاتی ہیں۔(۳)

نسب؛عمل صالح کے بغیر غیرمفید:

ومن بطأبه عمله : بطأ بمعنی پیچھے ہٹانا،یعنی جس شخص کواس کاعمل پیچھے کردے اس کا نسب اس کو آگےنہیں بڑھاپائے گا۔

اس جملہ میں اعمال صالحہ کی ترغیب دی گئی ہے کہ قرب الٰہی کا حصول اعمال صالحہ سے ہوتاہے،محض نسب سےقرب حاصل نہیں ہوتا:''اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقَاكُمْ''،ملاعلی قاریؒ نے فرمایاکہ علمائےسلف میں اکثر

(۱)المرقاة ١/ ٤١٤.
(۲)اللمعات ١/ ٥٣١-٥٣٢.
(۳)اللمعات ١/ ٤٣٢-٥٣٣.

لوگ ایسے تھے کہ ان کا نسب عالی نہیں تھا بلکہ اکثر موالی اور آزاد شدہ غلام تھے، مگر علم اور اعمال صالحہ کی وجہ سے سادات الامۃ اور ینابیع الرحمہ بن گئے جیسے نافع غلام تھے مگر امام مالکؒ کے استاذ بن گئے، اس کے برخلاف بعض وہ لوگ جو عالی نسب تھے مگر ایمان، علم اور اعمال صالحہ سے کورے تھے تو رذیل بن گئے اور نسیامنسیا ہو گئے، جیسے فرعون، ابوجہل اور ابولہب وغیرہ۔(۱)

١٩٤ / ٨: وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ اَوَّلَ النَّاسِ يُقْضٰى عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ اسْتُشْهِدَ، فَأُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعْمَتَهٗ،فَعَرَفَهَا،فَقَالَ: مَاعَمِلْتَ فِيْهَا؟قَالَ: قَاتَلْتُ فِيْكَ حَتّٰى اسْتُشْهِدْتُ، قَالَ: كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ قَاتَلْتَ لأَنْ يُقَالَ: جَرِيْءٌ، فَقَدْ قِيْلَ، ثُمَّ أُمِرَبِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ حَتّٰى أُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَعَلَّمَهٗ، وَقَرَأَ الْقُرْآنَ، فَأُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعَمَهٗ، فَعَرَفَهَا، قَالَ: فَمَاعَمِلْتَ فِيْهَا؟قَالَ: تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَعَلَّمْتُهٗ وَقَرَأْتُ فِيْكَ الْقُرْآنَ، قَالَ: كَذَبْتَ؛ وَلٰكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِيُقَالَ: إِنَّكَ عَالِمٌ، وَقَرَأْتَ الْقُرْآنَ لِيُقَالَ: هُوَ قَارِئٌ، فَقَدْ قِيْلَ، ثُمَّ أُمِرَبِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ حَتّٰى أُلْقِيَ فِي النَّارِ، وَرَجُلٌ وَسَّعَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَأَعْطَاهُ مِنْ أَصْنَافِ الْمَالِ كُلِّهٖ، فَأُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعَمَهٗ فَعَرَفَهَا، قَالَ فَمَاعَمِلْتَ فِيْهَا؟قَالَ: مَاتَرَكْتُ مِنْ سَبِيْلٍ تُحِبُّ أَنْ يُنْفَقَ فِيْهَا إِلاَّ أَنْفَقْتُ فِيْهَا لَكَ، قَالَ: كَذَبْتَ، وَلٰكِنَّكَ فَعَلْتَ لِيُقَالَ: هُوَ جَوَادٌ، فَقَدْ قِيْلَ، ثُمَّ أُمِرَبِهٖ فَسُحِبَ به عَلٰى وَجْهِهٖ ثُمَّ أُلْقِيَ فِي النَّارِ"(رواه مسلم)(٢)

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ لوگوں میں سب سے پہلا وہ شخص جس کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا وہ ہوگا جس کو اللہ کے راستہ میں شہید کر دیا گیا تھا، چنانچہ اس کو لایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں یاددلائے گا، چنانچہ وہ اس کو یاد آجائیں گی، پھر اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ: تو نے ان نعمتوں کے شکر میں کیا کام کیا؟ تو وہ کہے گا کہ میں نے تیری راہ میں قتال کیا یہاں تک کہ مجھے شہید کر دیا گیا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے جھوٹ کہا بلکہ تو نے اس لئے قتال کیا کہ تجھے بہادر کہا جائے چنانچہ وہ کہا جا چکا، پھر اس کے متعلق (آگ میں ڈالے جانے کا) حکم دیا جائے گا چنانچہ منہ کے بل

(١)المرقاة ١ / ٤١٦.

(٢)أخرجه مسلم في كتاب الإمارة، باب من قاتل للريا والسمعة استحق النار ٢ / ١٤٠ الرقم ١٩٠٥.

گھسیٹا جائے گا حتی کہ اسے آگ میں ڈالدیا جائے گا۔
(دوسرا) وہ شخص جس نے علم سیکھا اور سکھایا، اور قرآن پڑھا، چنانچہ اس کو بھی لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں یاد دلائے گا جو اس کو یاد آجائیں گی، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے شکر میں کیا کام کیا؟ تو وہ کہے گا: میں نے علم سیکھا اور سکھایا اور آپ کے لئے قرآن پڑھا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے جھوٹ کہا، کیونکہ تو نے علم اس لیے حاصل کیا تھا تا کہ تجھ کو عالم کہا جائے، اور قرآن اس لئے پڑھا تا کہ قاری کہا جائے، چنانچہ (عالم وقاری) کہا جا چکا، پھر اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا، چنانچہ منہ کے بل گھسیٹا جائے گا حتی کہ اس کو آگ میں ڈال دیا جائے گا۔
(تیسرا) وہ شخص ہوگا جس کو اللہ نے وسعت دی، اور ہر قسم کا مال عطا فرمایا، چنانچہ اس کو لایا جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں یاددلائے گا جو اس کو یاد آجائیں گی، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے شکر میں کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا، کہ میں نے کوئی ایسی راہ نہیں چھوڑی جس میں خرچ کرنے کو تو پسند کرتا ہو اور میں نے تیری رضا کی خاطر اس میں خرچ نہ کیا ہو، اللہ فرمائے گا: تو نے جھوٹ کہا، کیونکہ تو نے ایسا اس لیے کیا تا کہ تجھ کو سخی کہا جائے، چنانچہ وہ کہا جا چکا، پھر اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا، تو اس کو چہرے کے بل گھسیٹا جائے گا پھر اس کو آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ (مسلم)

تشریح حدیث

اخلاص کی قدر و قیمت اور عدم اخلاص کا نقصان:

اس حدیث میں اخلاص کی تعلیم دی گئی ہے کہ ہر دینی کام میں اخلاص ہونا چاہئے ریا و نمود نہیں ہونا چاہئے، ورنہ آدمی کے اعمال حسنہ بھی بجائے خیر کے وبال جان بن جائیں گے، چنانچہ اس حدیث میں صراحت ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے تین اشخاص کو لایا جائے گا اور ان کو منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا، ایک وہ مجاہد جو اس لئے جہاد کرے تا کہ لوگ اس کو بہادر کہیں، دوسرے وہ عالم جو اس نیت سے علم حاصل کرے تا کہ لوگ اس کو عالم کہیں اور اس کی عزت اور ناموری ہو اسی طرح وہ قاری جو

اس نیت سے قرآن کریم پڑھے تا کہ اس کی شہرت ہو اور تیسرے وہ سخی جو اس نیت سے مال خرچ کرے تا کہ لوگ اس کی سخاوت کی داد دیں۔

إن أول الناس يقضى عليه يوم القيامة : اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے ان تین قسم کے لوگوں کا فیصلہ ہوگا جو یہاں مذکور ہوئے حالانکہ ایک روایت میں ہے کہ سب سے پہلے نماز کا فیصلہ ہوگا اور ایک حدیث میں ہے کہ اولاً دم کا فیصلہ ہوگا پس ان روایات میں ظاہراً تعارض ہے، اس کے دو جواب ہیں:

(۱) یہاں خلاف کا فیصلہ مراد ہے اس لئے کہ یہاں ''علیہ'' کا لفظ وارد ہوا ہے چنانچہ یہ تینوں لوگ ایسے ہیں کہ ان کے خلاف فیصلہ ہوگا اور جن احادیث میں نماز اور دم کے معاملہ کو اول فیصلہ قرار دیا گیا ہے وہاں خلاف کا فیصلہ ہونا ضروری نہیں، موافق بھی ہوسکتا ہے اور مخالف بھی۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ حقوق اللہ میں اولاً نماز کا فیصلہ ہوگا اور حقوق العباد میں اولاً دم وقتال کا فیصلہ ہوگا اور مخالف فیصلوں میں سب سے پہلے وہ فیصلہ ہوگا جو یہاں مذکور ہے، پس ہر ایک اپنے اپنے لحاظ سے اول ہے **فلاتعارض بينهما**.[۱]

فعرفه نعمته: یہاں شہید کے لئے لفظ ''نعمت'' واحد اور بقیہ دو اشخاص کے لئے ''نعمه'' جمع کا صیغہ لایا گیا ہے، اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ شہید میدان جہاد میں اصلاً جان کی قربانی دیتا ہے، پس اصالۃً اس کے پاس ایک نعمت ہے اس لحاظ سے اس کے لئے مفرد کا صیغہ لایا گیا اور علم ومال ہر دو کی مختلف انواع واقسام ہیں پس اس اعتبار سے ان کو جمع کے صیغہ سے تعبیر کیا گیا۔[۲]

حتى استشهدت قال كذبت : اس پر اشکال ہے کہ اس نے جھوٹ کہاں کہا؟ اس نے تو واقعہ بیان کیا ہے وہ واقعۃً شہید ہوا ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہاں اس نے اپنے قول ''قاتلت فيک'' سے اخلاص کا دعوی کیا ہے جس میں وہ جھوٹا ہے، پس دعوی اخلاص کی تکذیب کی جارہی ہے، نہ کہ نفس شہادت کی۔[۳]

(۱) اللمعات ۱/۵۳٤.

(۲) المرقاة ۱/٤۱۷.

(۳) المرقاة ۱/٤۱۸.

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں غلط نیت سے انسان کو کوئی مفاد حاصل ہو جائے تو ہو جائے مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

فسحب: "سحب" باب ضرب سے ہے، بمعنی زمین پر گھسٹنا۔

تعلمت العلم وعلمته وقرأت فيك: اس میں قرأتِ قرآن کو الگ سے بیان کیا گیا، یہ یا تو تخصیص بعد التعمیم ہے یا اس وجہ سے کہ قاری عموماً ریا میں زیادہ مبتلا ہوتا ہے، اس لئے اس کو علیحدہ ذکر کیا گیا۔ (۱)

جواد: مفرد ہے، جمع اس کی اجواد واجاود ہے، بمعنی سخی، فیاض۔

١٩٥ / ٩: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ اللّٰهَ لايَقْبِضُ الْعِلْمَ اِنْتِزَاعاً يَنْتَزِعُهُ مِنَ الْعِبَادِ، وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ، حَتّٰى إِذَالَمْ يُبْقِ عَالِماً؛ إِتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُوْساً جُهَّالاً، فَسُئِلُوْا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِعِلْمٍ، فَضَلُّوْا وَأَضَلُّوْا" (متفق عليه) (٢)

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اللہ علم کو ایسے نہیں اٹھائے گا کہ لوگوں سے اس کو نکال لے، بلکہ علم کو اس طرح اٹھائے گا کہ علماء کو اٹھالے گا، یہاں تک کہ جب کسی عالم کو باقی نہیں چھوڑے گا، تو لوگ جاہلوں کو پیشوا بنالیں گے، ان سے مسئلے معلوم کیے جائیں گے اور وہ بغیر علم کے فتوی دیں گے، چنانچہ وہ خود بھی گمراہ ہونگے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔ (بخاری مسلم)

تشریح حدیث

علماء کی وفات جہالت کے شیوع اور قیامت کی آمد کا پیش خیمہ:

اس حدیث میں صحیح علماء کی قدر کرنے کا حکم دیا گیا کہ لوگوں کو چاہئے کہ علم حاصل کریں اور علماء کو اپنا

(١) المرقاة ١ / ٤١٩.

(٢) أخرجه البخاري في موضعين، كتاب العلم، باب كيف يقبض العلم ١ / ٢٠ الرقم ١٠٠، وكتاب الاعتصام، باب مايذكر من ذم الرأي وتكلف القياس ٢ / ١٠٨٦ الرقم ٧٠١٤.

ومسلم كتاب العلم، باب رفع العلم وقبضه وظهور الجهل والفتن في آخر الزمان ٢ / ٣٤٠ الرقم ٢٦٧٣.

سردار و پیشوا بنائیں نااہلوں سے دور رہیں، کیونکہ قربِ قیامت علم کو اٹھالیا جائے گا، اور علم کو اٹھانے کی شکل یہ نہیں ہوگی کہ اہل علم کے سینوں سے اور کتابوں کے اوراق سے علم محو ہو جائے، بلکہ اس کی شکل یہ ہوگی کہ صحیح علم والے علماء وفات پاجائیں گے اور پھر ان کا کوئی قابل جانشین نہیں ہوگا، اس طرح علم اٹھ جائے گا، پھر جب مستند عالم نہیں ملے گا لوگ جاہلوں کو سردار بنائیں گے اور وہ بغیر علم کے فتوی دیں گے اور خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے، اس طرح دنیا میں چاروں طرف ضلالت وگمراہی عام ہو جائے گی۔

حتی اذالم یبق عالما: یہ ابقاء سے ہے اور ضمیر فاعل اللہ کی طرف راجع ہے، مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی عالم کو روئے زمین پر باقی نہیں چھوڑے گا پھر ایسا ہوگا، اور بخاری میں "**اذالم یبق عالم**" "بقاء" سے آیا ہے، جس کے معنی ہیں کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا پھر ایسا ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ عالم کی موت بہت بڑا خسارہ ہے یہ علم کا اٹھ جانا ہے اور قیامت کا قریب آجانا ہے۔

رؤوساً جهالاً: اس سے مراد وہ شخص ہے جس کو کوئی عہدہ دیا جائے، مگر اس کی لیاقت اس میں نہ ہوگی، یہ قرب قیامت کے وقت ہوگا، چنانچہ ایک حدیث میں وارد ہے: "**إذَاوُسِّدَ الأَمْرُ إلٰی غَیْرِ أهله فانتظر الساعة**[1]"، یعنی جب معاملات نااہل کے حوالہ کئے جانے لگیں تو پھر قیامت کا انتظار کرو، لہذا نااہل کو از خود بھی دینی مسائل میں رائے زنی اور فتوی دہی سے گریز کرنا چاہئے، اور ارباب امر کو بھی نااہلوں کے مناصب حوالہ نہ کرنے چاہئیں، ورنہ اولا ضلالت پھیلے گی اور پھر قیامت آئے گی۔[2]

١٩٦ / ١٠: وَعَنْ شَقِیْقٍ قَالَ: کَانَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ یُذَکِّرُالنَّاسَ فِيْ کُلِّ خَمِیْسٍ، فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ: یَاأَبَاعَبْدِالرَّحْمٰنِ! لَوَدِدْتُّ أَنَّکَ ذَکَّرْتَنَا فِيْ کُلِّ یَوْمٍ، قَالَ: أَمَاإِنَّهٗ یَمْنَعُنِيْ مِنْ ذٰلِکَ أَنِّيْ أَکْرَهُ أَنْ أُمِلَّکُمْ، وَإِنِّيْ أَتَخَوَّلُکُمْ بِالْمَوْعِظَةِ کَمَاکَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَتَخَوَّلُنَا بِهَا مَخَافَةَ السَّامَةِ عَلَیْنَا. (متفق علیه)[3]

(١) رواه البخاري فی کتاب العلم، باب من سئل علما ١ / ١٤.

(٢) المرقاة ١ / ٤١٩.

(٣) أخرجه البخاري في موضعین، "کتاب العلم" باب ماکان النبي صلی الله علیه وسلم یتخولهم بالموعظة والعلم کي لاینفروا ١ / ١٦ الرقم ٧١ وکتاب الدعوات، باب الموعظة ساعة بعد ساعة ٢ / ٩٩٤، الرقم ٦٤٦١، ومسلم کتاب صفة القیامة باب الاقتصاد في الموعظة (٢٨٢١)

ترجمہ: حضرت شقیقؒ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہر جمعرات کولوگوں کو وعظ کہا کرتے تھے، ایک شخص نے ان سے عرض کیا: اے ابوعبدالرحمٰن! میری تمنا ہے کہ آپ ہم کو روزانہ وعظ کہا کریں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جواب دیا کہ: (میں ایسا اس لیے نہیں کرتا) کہ میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ تم کو اکتاہٹ میں ڈالوں، میں نصیحت کے معاملہ میں تمہارے حال کا خیال اس طرح رکھتا ہوں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے حال کا خیال رکھتے تھے ہمارے بارے میں اکتاہٹ کے خوف سے۔ (متفق علیہ)

تشریح حدیث

تعارف شقیقؒ:

یہ شقیق بن سلمہ اسدی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہوگئے تھے، لیکن رؤیت نصیب نہیں ہوسکی، کبار تابعین میں سے تھے، حضرت عمرؓ اور ابن مسعودؓ کے شاگرد ہیں، حجاج کے زمانہ میں وفات ہوئی۔ (۱)

وعظ وتقریر میں مخاطبین کے نشاط کی رعایت ضروری:

اس حدیث میں وعظ وتقریر کا ادب بتایا گیا ہے کہ وعظ اس وقت کہنا چاہئے جب سامعین میں نشاط ہو اس بارے میں ان کے حال کی رعایت رکھنی چاہئے ورنہ ان پر اثر نہیں ہوگا۔

یذکر الناس فی کل خمیس: علماء نے فرمایا کہ یہ ادب وعظ کے لئے ہے، درس روزانہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ خود ابن مسعودؓ کا درس روزانہ ہوتا تھا۔

انی املکم و اتخولکم: ''املکم'' املال سے ہے بمعنی ملال میں ڈالنا ''اتخولکم'' تخول سے ہے بمعنی نگرانی کرنا، حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کی شرح میں فرمایا ہے کہ: ہر کام مین اگرچہ مواظبت ومداومت مطلوب ہے مگر نشاط وچستی اور لوگوں کے مشقت میں نہ پڑجانے کا خیال بھی ضروری ہے، لہذا وعظ ونصیحت روزانہ بھی ہوسکتا ہے مگر سامعین کے نشاط کے بقدر، ورنہ ایک دن چھوڑ کر یا ہفتہ میں ایک روز۔ (۲)

(۱) الإصابة ۲/ ۵۲۳–۵۲۴.

(۲) فتح الباری ۱/ ۲۰۵.

١٩٧ / ١١: وَعَنْ أَنَس قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أَعَادَهَا ثَلاثاً حَتّٰى تُفْهَمَ عَنْهُ، وَإِذَاأَتٰى عَلٰى قَوْمٍ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلاثاً. (رواه البخاري)[1]

ترجمه: اورحضرت انسؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات ارشاد فرماتے تو تین مرتبہ فرماتے یہاں تک کہ لوگ اس بات کو سمجھ جاتے، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی جماعت کے پاس آتے اوران کوسلام کرتے تو تین مرتبہ سلام کرتے۔ (بخاری)

تشریح حدیث

وعظ وتقریر واضح اور مفہم ہو:

اس حدیث میں علم کا ایک اورادب بتایا گیا کہ اگرکوئی اہم بات ہوتو اس کا متعدد مرتبہ تکرار کرنا چاہئے تا کہ طالبین اس کواچھی طرح سن لیں اور وہ بات ان کے قلوب میں راسخ ہوجائے۔

إذاتكلم بكلمة أعادها ثلاثا: تین مرتبہ کہتے مخاطبین کےفہم کے اعتبار سے، کہ بعض کی فہم اعلی ہوتی ہے وہ ایک مرتبہ ہی میں سمجھ جاتے ہیں، اوربعض کی فہم اوسط ہوتی ہے وہ دومرتبہ میں سمجھتے ہیں، اور بعض کی فہم ادنیٰ ہوتی ہے تین مرتبہ کہنے سے وہ بھی سمجھ جاتے ہیں۔[2]

بعض نے کہا کہ جب مجمع بڑاہوتا تب تین جہتوں میں تین مرتبہ بیان کرتے تھے، لیکن ہر بات کو تین مرتبہ بیان نہ فرماتے، بلکہ یہ عادت شریفہ اہم بات سے متعلق تھی، اس لئے کہ روایات سے ثابت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت سی باتوں کو اشارہ وکنایہ میں بیان کرتے چہ جائیکہ تین مرتبہ اعادہ فرمائیں، لہذا مذکورہ حدیث میں لفظِ کلمۃ میں تنوین تعظیم کے لئے ہے ای كلمة مهمة عظيمة.

سلام کا ایک ادب:

وإذاأتى على قوم فسلم عليهم: یہاں بھی تین مرتبہ سلام کرنا الگ الگ جہت کے اعتبار سے تھا،

---

(١) أخرجه البخاري في موضعين كتاب العلم، باب من اعاد الحديث ثلثا ليفهم ١ / ٢٠ الرقم ٩٥، و"الاستيذان، باب التسليم والاستيذان ثلاثا ٢ / ٩٢٣ الرقم ٦٠٠٣"

(٢) المرقاة ١ / ٤٢١.

ایک ان لوگوں کو جو سامنے ہوتے پھر دائیں جانب والوں کو اور پھر بائیں جانب والوں کو، لیکن راجح یہ ہے کہ سلام اول بطور استیذ ان ہوتا تھا پھر سلام تحیہ کہتے اور پھر واپسی میں سلام وداع ہوتا تھا۔ (۱)

۱۹۸ / ۱۲: وَعَنْ أَبِيْ مَسْعُوْدِنِ الْأَنْصَارِيْؓ، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: إِنَّهُ أُبْدِعَ بِيْ فَاحْمِلْنِيْ، فَقَالَ: مَاعِنْدِيْ فَقَالَ رَجُلٌ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ أَنَا أَدُلُّهُ عَلٰى مَنْ يَّحْمِلُهُ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ دَلَّ عَلٰى خَيْرٍ فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهٖ" (رواه مسلم) (۲)

ترجمہ: اور حضرت ابومسعود انصاریؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ: ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ: میری سواری چلنے سے عاجز ہوگئی ہے، آپ مجھے سواری عنایت فرمادیجئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا میرے پاس نہیں ہے، ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ! میں ایسا شخص بتاتا ہوں جو اس کو سواری دے دے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جو شخص کسی بھلائی کی طرف راہ نمائی کرے تو اسے بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ اس بھلائی پر عمل کرنے والے کو۔ (مسلم)

تشریح حدیث

احوال ابومسعود انصاریؓ:

مشہور صحابی ہیں، نام: عقبہ بن عمرو الانصاری ہے، قدیم الاسلام ہیں، ان کو بدری بھی کہا جاتا ہے حالانکہ غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے، اس لئے کہ مقام بدر میں رہتے تھے، مقام بدر میں سکونت کی وجہ سے بدری کہلاتے ہیں، حضرت علیؓ کے زمانے میں وفات ہوئی ہے۔ (۳)

خیر کی جانب رہنمائی خیر پر عمل کے مثل:

فانه أُبدع بي: ابداع کے معنی ہیں: نئی بات ایجاد کرنا، اونٹ کو اللہ تعالیٰ نے چلنے کے واسطے پیدا

(۱) المرقاة ۱ / ۴۲۱.

(۲) أخرجه مسلم في الإمارة، باب فضل إعانة الغازي في سبيل الله الخ ۲ / ۱۳۷.

(۳) الإصابة ٦ / ٢٤٣، و ٢ / ٤٦٧–٤٦٨.

فرمایا ہے گویا کہ چلنا اس کی دائمی عادت ہے پس اگر وہ چلنے سے عاجز آجائے تو گویا اس نے اپنی عادت کے خلاف ایک نئی بات ایجاد کی، لہٰذا اس کا ترجمہ سواری (اونٹ) کے تھکنے سے اور چلنے سے عاجز آنے سے کیا جاتا ہے۔ (۱)

من دل علی خیر فله مثل اجر فاعله : یہ حدیث عام ہے کہ ہر معاملہ میں دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنی چاہئے، اوران کو خیر پر ابھارنا چاہئے، اس کے مواقع کی نشاندہی کرنا چاہئے جس کا عظیم الشان فائدہ یہ ہے کہ ترغیب وتحریض کے بعد جس قدر ثواب اس عمل کے کرنے والوں کو ملے گا اسی قدر اس ترغیب دلانے والے کو بھی ملے گا، اسی حدیث کی بنا پر شریعت میں باقاعدہ اصول مقرر ہے: **الدال علی الخیر کفاعله**۔

علماء نے لکھا ہے کہ اس سے تعلیم وتعلم کی فضیلت ظاہر ہے، معلم کو بھی متعلم کے ساتھ بھلائی کرنی چاہئے اور علم پر اس کی راہنمائی کرنی چاہئے اسی مناسبت سے اس روایت کو کتاب العلم میں لایا گیا ہے۔ (۲)

١٩٩ / ١٣ : وَعَنْ جَرِيْرٍؓ قَالَ: كُنَّا فِيْ صَدْرِ النَّهَارِ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَجَاءَهُ قَوْمٌ عُرَاةٌ مُجْتَابِي النِّمَارِ أَوِ الْعَبَاءِ، مُتَقَلِّدِي السُّيُوْفِ، عَامَّتُهُمْ مِنْ مُضَرَ، بَلْ كُلُّهُمْ مِنْ مُضَرَ، فَتَمَعَّرَ وَجْهُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَا رَأَىٰ بِهِمْ مِنَ الْفَاقَةِ، فَدَخَلَ ثُمَّ خَرَجَ فَأَمَرَ بِلَالاً فَأَذَّنَ، وَأَقَامَ فَصَلّٰى ثُمَّ خَطَبَ فَقَالَ: "يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ إِلٰى آخِرِ الْآيَةِ" "إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً" وَالْآيَةَ الَّتِيْ فِي الْحَشْرِ "اِتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّاقَدَّمَتْ لِغَدٍ" تَصَدَّقَ رَجُلٌ مِنْ دِيْنَارِهِ، مِنْ دِرْهَمِهِ، مِنْ ثَوْبِهِ، مِنْ صَاعِ بُرِّهِ، مِنْ صَاعِ تَمْرِهِ، حَتّٰى قَالَ: وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ قَالَ فَجَاءَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ بِصُرَّةٍ كَادَتْ كَفُّهُ تَعْجِزُ عَنْهَا، بَلْ قَدْ عَجَزَتْ، ثُمَّ تَتَابَعَ النَّاسُ حَتّٰى رَأَيْتُ كَوْمَيْنِ مِنْ طَعَامٍ وَثِيَابٍ، حَتّٰى رَأَيْتُ وَجْهَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَهَلَّلُ كَأَنَّهُ مُذْهَبَةٌ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ

(١) شرح الطيبى ١ / ٤٠٣۔

(٢) شرح الطيبى ١ / ٤٠٤.

شَيْئٌ، وَمَنْ سَنَّ فِي الإِسْلامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَامِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِأَنْ يَنْقُصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْئٌ''(رواه مسلم)(۱)

ترجمہ : اورحضرت جریرؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ: ہم دن کے ابتدائی حصہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، ایک قوم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی یہ لوگ ننگے بدن تھے اورعبا، یاکمبل لپیٹے ہوئے تھے، اور گلے میں تلوار لٹکائے ہوئے تھے، ان میں سے اکثر بلکہ سب قبیلۂ مضر کے لوگ تھے، ان پر فاقہ کا اثر دیکھ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہوگیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے پھر باہر تشریف لائے، حضرت بلالؓ کوحکم دیا تو حضرت بلالؓ نے اذان پڑھی اور تکبیر کہی اور نماز ادا کی پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور یہ آیت پڑھی: ''يَاأَيُّهَاالنَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍإِلٰى آخِرِالآيَةِ ''یعنی''اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا'' پوری آیت پڑھی (جس کا آخری حصہ یہ ہے:)''إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً'' کہ بے شک اللہ تمہارا نگہبان ہے، اور وہ آیت پڑھی جوسورۂ حشر میں ہے:''اِتَّقُوْا اللّٰـهَ وَلْتَنْظُرْنَفْسٌ مَّاقَدَّمَتْ لِغَدٍ ''یعنی''اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھ لے کہ کل (قیامت کے دن) کے لیے اس نے کیا بھیجا ہے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ صدقہ کرے آدمی اپنے دینار میں سے، اپنے درہم میں سے، اپنے کپڑے میں سے، اپنے گیہوں کے پیمانے میں سے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر چہ کھجور کے ٹکڑے سے، راوی کہتے ہیں کہ ایک انصاری (دینارودرہم) سے بھری ہوئی ایک تھیلی لائے، (اس تھیلی کے وزن سے) قریب تھا کہ ان کا ہاتھ تھک جائے بلکہ تھک گیا تھا، اس کے بعد لوگ پے درپے (کچھ نہ کچھ) لانے لگے یہاں تک کہ میں نے غلہ اور کپڑے کے دو ڈھیر دیکھے، پھر میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ اقدس اس طرح چمک رہا تھا، جیسے چہرہ انور پر سونے کا پانی پھیر دیا گیا ہو، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جو شخص اسلام میں کسی نیک طریقے کو رائج کرے تو اس کو اسکا بھی ثواب ملے گا اور اس شخص کا ثواب

(۱) أخرجه مسلم كتاب العلم باب من سن سنة حسنة أوسيئة الخ ۲ / ۳٤۱ الرقم ۱۰۱۷ والزكاة، باب الحث على الصدقة ولوبشق تمرة أو كلمة طيبة الخ ۱ / ۳۲۷.

بھی جواس کے بعد اس پر عمل کرے، لیکن عمل کرنے والے کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی، اور جس نے اسلام میں کسی برے طریقے کو رائج کیا تو اسے اس کا بھی گناہ ہوگا اور اس شخص کا بھی جواس کے بعد اس پر عمل کرے گا، لیکن عمل کرنے والے کے گناہ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ (مسلم)

تشریح حدیث

احوال جریر بن عبداللہؓ:

جریر بن عبداللہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کل چالیس دن قبل ایمان لائے مگر حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تردید کی ہے اور فرمایا ہے کہ ۱۰ھ سے قبل انہوں نے اسلام قبول کیا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کوان سے بہت محبت تھی اور وہ بہت خوبصورت تھے حتی کہ حضرت عمرؓ ان کو یوسف زمانہ کہا کرتے تھے ۵۱ھ میں وفات پائی۔ (۱)

آپ ﷺ کی اپیل پر ایک جماعت کی حاجت روائی اور آپ ﷺ کا اظہار مسرت:

ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ہمراہ تشریف فرما تھے، دن کی شروعات تھی، ایک جماعت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی، جس کی حالت بہت خستہ تھی، بدن پر کپڑے نہیں تھے، کمبل لٹکائے ہوئے تھے، گردن میں تلواریں پڑی تھیں، ان کی خستہ حالی کو دیکھ کر آپکو نہایت رنج ہوا، حتی کہ جب نماز کا وقت ہوا تو نماز کے بعد آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے وعظ فرمایا، جس میں آخرت کی طرف توجہ دلاکر ان لوگوں کی امداد کا حکم فرمایا ایک انصاری صحابی نے تعاون کرنے میں پہل کی پھر باقی صحابہ کرام نے اپنی اپنی حیثیت کے لحاظ سے تعاون فرمایا اور بہت کچھ جمع ہوگیا جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے اس کا اجر وثواب بتلایا۔

اس واقعہ میں باب کے مناسب پہلو یہ ہے کہ اُن انصاری صحابی نے صدقہ میں سبقت کرتے ہوئے دراہم سے بھری ہوئی تھیلی پیش کی، ان کے اِس عمل کو دیکھ کر دیگر لوگ بھی صدقہ کرنے لگے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان انصاری کے عمل کو سراہتے ہوئے اسلام کا ضابطہ بیان فرمایا کہ جو شخص اسلام میں بہتر طریقہ

(۱) الإصابة ۱/ ۳٤۹–۳۵۱.

رائج کرے (کسی نیک کام میں سبقت کرے) اس کو اپنے عمل کا ثواب ہے اور ان لوگوں کے ثواب کے بقدر بھی ثواب ہے جو اس پر عمل کریں گے۔

استاذ اپنے تلامذہ کو علم سکھاتا ہے تو وہ بھی ایک عظیم الشان نیک کام کی بنیاد ڈالتا ہے اس لئے وہ بھی اِس فضیلت کا مستحق ہے۔

عراة: عاری کی جمع ہے بمعنی ننگے بدن۔

مجتابي النمار : اى لابس النمار یعنی اونی دھاردار لباس سے ستر کو چھپا رکھا تھا، جیسے چیتے کی کھال ہوتی ہے۔

عَبَاء، بغیر آستین کا چوغہ جو کپڑوں کے اوپر پہنا جاتا ہے۔

متقلدی السیوف: یہ ان کی وجہِ غربت کی طرف اشارہ ہے کہ اکثر خانہ جنگیوں میں مبتلا رہتے تھے۔

فتمعر :ای تغیر.

فأمر بلالاً فأذن: اظہر یہ ہے کہ یہ ظہر یا جمعہ کی نماز تھی "فی صدر النہار" اس پر قرینہ ہے۔(١)

فصلی ثم خطب : اس خطبہ سے خطبۂ جمعہ مراد لینا ضروری نہیں بلکہ وعظ ونصیحت مراد ہوسکتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں دو آیتیں پڑھیں، یہ دونوں آیتیں موقعہ کے بہت مناسب تھیں، کیونکہ پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ سب لوگ ایک آدم کی اولاد ہیں، لہٰذا ایک دوسرے کی تکلیف کا احساس کرکے اس کو دور کرنے کی فکر کرنی چاہئے، اور دوسری آیت میں آخرت یاد دلاکر اس کی تیاری کرنے کا حکم فرمایا گیا اور صدقہ کرکے پریشان حال لوگوں کی مدد کرنا آخرت کی بہترین تیاری ہے۔

تصدق رجل: یہ خبر ہے لیکن انشاء وامر کے معنی میں ہے، امر کو خبر سے تعبیر کیا نیک فالی کے لئے، گویا کہ امر کیا اور لوگوں نے عمل کیا اور پھر اس کی خبر دی گئی۔(٢)

کومین: کوم کا تثنیہ ہے، بمعنی ڈھیر، جمع اکوام ہے۔

یتهلل: بمعنی چمکنا، روشن ہونا۔

مُذهبة: گویا کہ سونا ملا دیا گیا ہو۔

(١)المرقاة١/ ٤٢٢.

(٢)شرح الطيبي١/ ٤٠٥.

٢٠٠ / ١٤: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''لاتُقْتَلُ نَفْسٌ ظُلْماً إِلاَّ كَانَ عَلَى ابْنِ آدَمَ الْأَوَّلِ كِفْلٌ مِنْ دَمِهَا؛ لِأَنَّهُ أَوَّلُ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ''(متفق عليه[1]) وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ مُعَاوِيَةَ: 'لايَزَالُ مِنْ أُمَّتِيْ'' فِيْ بَابِ ثَوَابِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى).

ترجمه : اورحضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ نہیں قتل کیا جاتا کوئی شخص ظلماً مگر اس کے خون کا ایک حصہ آدم کے پہلے بیٹے (قابیل) پر ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے قتل کا طریقہ نکالا۔ (بخاری ومسلم) اورحضرت معاویہ کی روایت کردہ حدیث ''لایزال من أمتی'' ہم انشاءاللہ ''باب ثواب هذه الأمة'' میں بیان کریں گے۔

تشریح حدیث

برائی کے مرتکب کا گناہ اس کے موجد کے نامۂ اعمال میں:

اس حدیث میں گزشتہ احادیث کا دوسرا پہلو مذکور ہے کہ اگرکوئی شخص برے کام کی بنیاد ڈالے گا تواسکے نقش قدم پر چلتے ہوئے بعد میں جوبھی اس برائی کا مرتکب ہوگا اس کے گناہ کے بقدر بنیاد ڈالنے والے کوگناہ ملتارہے گا، حدیث کا مضمون یہ ہے کہ قیامت تک ظلماً جتنے قتل ہونگے ان کا گناہ قابیل کوبھی ملے گا کیونکہ اسی نے سب سے پہلے ناحق قتل کیا اورظلماً قتل کرنے کی بنیاد ڈالی جسکا واقعہ اس طرح ہے کہ:

واقعۂ ہابیل وقابیل:

ہابیل وقابیل حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے، حضرت حوا کے بطن سے ایک ساتھ دو بچے پیدا ہوتے تھے، ایک لڑکا ایک لڑکی، اس وقت اختلاف بطن کو اختلاف ابوین کے قائم مقام قرار دیا جاتا تھا، اورایک بطن کے لڑکے کا دوسرے بطن کی لڑکی سے نکاح ہوتا تھا، اورایک بطن سے پیدا ہونے والے لڑکے ولڑکی

(١) أخرجه البخاري في ثلاثة مواضع، ''كتاب الأنبياء، باب خلق آدم وذريته الخ'' ١ / ٤٦٩، الرقم ٣٢٢٥، والديات، باب قول الله تعالىٰ: ومن أحياها الخ ٢ / ١٠١٤ الرقم ٦٦٠٢، والاعتصام، باب من دعا إلى ضلالة الخ ٢ / ١٠٨٨ ومسلم ''كتاب القسامة، باب إثم من سن القتل'' ٢ / ٦٠ الرقم ١٦٧٧.

حقیقی بہن بھائی ہوتے تھے، جن کا باہم نکاح نہیں ہوسکتا تھا۔

قابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی خوبصورت تھی اور اس کا نکاح ہابیل سے ہونا تھا، مگر قابیل اپنی ہی بہن سے نکاح کرنے پر آمادہ ہوا اور اس پر اصرار کرنے لگا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے بھائی ہابیل کو ظلماً قتل کیا، یہی سب سے پہلا قتل ہے، جو دنیا میں واقع ہوا، لہٰذا دنیا میں جتنے بھی قتل ہوں گے ان کے قاتلین کے ساتھ قابیل کو بھی گناہ ہوگا من سن سنة سيئة کے قاعدے کے تحت۔ (۱)

كـان عـلى ابن آدم الأول: اس سے یہ مراد نہیں کہ قابیل حضرت آدم علیہ السلام کا پہلا اور اولین بیٹا تھا، کیونکہ ہابیل وقابیل کئی بطون کے بعد پیدا ہوئے تھے، بلکہ اول سے مراد "اول قاتل" ہے پس یہ اولیت باعتبار قتل کے ہے، اول کا اطلاق قتل کے اعتبار سے ہے نہ کہ ترتیب ولادۃ کے اعتبار سے۔ (۲)

الفصل الثانی

۲۰۱ / ۱۵: عَنْ كَثِيْرِبنِ قَيْسٍ قَالَ: كُنْتُ جَالِسًا مَعَ أَبِي الدَّرْدَاءِ فِيْ مَسْجِدِ دِمَشْقَ، فَجَاءَه رَجُلٌ فَقَالَ: يَاأَبَاالدَّرْدَاءِ! إِنِّيْ جِئْتُكَ مِنْ مَدِيْنَةِ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِحَدِيْثٍ بَلَغَنِي أَنَّكَ تُحَدِّثُهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مَاجِئْتُ لِحَاجَةٍ، قَالَ: فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُوْلُ مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَطْلُبُ فِيْهِ عِلْماً سَلَكَ اللّٰهُ بِهِ طَرِيْقاً مِنْ طُرُقِ الْجَنَّةِ، وَإِنَّ الْمَلائِكَةَ لَتَضَعُ أَجْنِحَتَهَا رِضًى لِطَالِبِ الْعِلْمِ، وَإِنَّ الْعَالِمَ يَسْتَغْفِرُلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ، وَالْحِيْتَانُ فِيْ جَوْفِ الْمَاءِ، وَإِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلٰى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ، وَإِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرثَةُ الْأَنْبِيَاءِ، وَإِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَاراً وَلادِرْهَماً، وَإِنَّمَا وَرَّثُوْا الْعِلْمَ فَمَنْ أَخَذَه أَخَذَ بِحَظٍ وَافِرٍ. (۳)(رواه احمد

(۱) المرقاة ۱/۴۲۵–۴۲۶.

(۲) الميسر للتوربشتی ۱/۱۰۲، وفتح الإله ۲/۷۱.

(۳) رواه أحمد والترمذی وابوداود وابن ماجه والدارمي، وسماه الترمذی قيس بن كثير، رواه احمد فی مسنده برقم: ۲۱۷۱۵، والترمذی فی سننه: ابواب العلم باب ماجاء فی فضل نقله على فضل العبادة رقم: ۲۶۸۲، وابن ماجه باب كتاب الايمان فضل العماء الحديث على طلب العلم برقم: ۲۲۳، وابوداود كتاب العلم باب الحث على طلب العلم برقم: ۳۶۴۱، والدارمي: كتاب العلم باب فی فضل العلم والعالم الفقه برقم: ۳۵۴.

والترمذى وابوداؤد وابن ماجة والدارمى وسماه الترمذى قيس بن كثير.)

ترجمہ: حضرت کثیر بن قیسؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: میں ایک مرتبہ حضرت ابوالدرداءؓ کے پاس ملک شام کے شہر دمشق کی مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا اورعرض کیا کہ: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر سے آپ کی خدمت میں ایک حدیث حاصل کرنے کے لئے آیا ہوں، جس کے متعلق مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں، میں (اس کے علاوہ) کسی اورضرورت کی وجہ سے نہیں آیا ہوں، حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: جوشخص علم طلب کرنے کے لئے کوئی راستہ اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے راستہ پر چلاتا ہے، اورفرشتے طالب علم کی رضامندی کے لئے اپنے پروں کو بچھاتے ہیں، اورزمین وآسمان کی مخلوق اور پانی کے اندرمچھلیاں عالم کے لئے استغفار کرتی ہیں، اورعالم کوعابد پرایسی ہی فضیلت ہے جیسے کہ چودھویں رات کے چاند کو دوسرے ستاروں پرفضیلت ہے، اورعلماء انبیاء کے وارث ہیں، اورانبیاء علیہم السلام درہم ودنانیر کے وارث نہیں بناتے، سوائے اس کے نہیں کہ وہ علم کاوارث بناتے ہیں، لہٰذا جس شخص نے علم حاصل کیا اس نے کامل اوروافرحصہ حاصل کرلیا۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی، اورامام ترمذی نے راوی حدیث کا نام قیس بن کثیر ذکر کیا ہے)

تشریحِ حدیث

احوال کثیر بن قیس وابوالدرداء:

کثیر بن قیس تابعین میں سے ہیں اور حضرت ابوالدرداء کے شاگرد ہیں، بعض نے ان کا نام قیس بن کثیر کہا ہے، مگر راجح کثیر ہے، اورابوالدرداءؓ مشہور صحابی ہیں، آپ کا نام عویمر اوربعض نے عامر کہا ہے، نیز ان کے والد کے نام میں بھی مختلف اقوال ہیں: عامر، مالک، ثعلبہ، عبداللہ، زید وغیرہ، حضرت ابوالدرداء نے بدر کے دن اسلام قبول کیا، جنگ احد میں شریک ہوئے اورزخمی ہوئے، حضورعلیہ الصلوۃ والسلام نے ان کو ''حکیم امتی'' کا لقب عطاء فرمایا تھا، حضرت عمرؓ کے دورخلافت میں دمشق کے قاضی مقرر کئے گئے تھے،

حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں انتقال ہوا۔ (۱)

علم دین کے حصول کی فضیلت:

کثیر بن قیس فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابوالدرداءؓ کے ساتھ دمشق کی جامع مسجد میں بیٹھا ہوا تھا، ایک شخص آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ میں مدینہ منورہ سے ایک حدیث سننے کے لئے آیا ہوں جس کے بارے میں مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ اس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، میری اِس آمد کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے اس پر حضرت ابوالدرداءؓ نے علم کی فضیلت پر مشتمل یہ حدیث بیان فرمائی:

من سلک طریقا یلتمس فیه علما الخ: سائل کو حضرت ابوالدرداءؓ سے کونسی حدیث سننا مطلوب تھا؟ اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ یہی حدیث مطلوب تھی جس کو ان سے سننا چاہتے تھے، دوسرا یہ کہ حدیثِ مطلوب تو اس کے علاوہ تھی جس کو انہوں نے بعد میں سنایا ہوگا، لیکن یہ حدیث اس آنے والے کے عمل کی تحسین اور تبشیر کے لئے ذکر فرمائی کہ جو شخص علم حاصل کرنے کے لئے کوئی راستہ طے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ سہل اور آسان فرما دیتے ہیں کیونکہ علم ذریعہ ہے عمل کا اور عمل سبب ہے دخول جنت کا۔

فی مسجد دمشق: ''دمشق'' دال کا کسرہ اور میم کا فتحہ نیز دال کا فتحہ و میم کا کسرہ دونوں طرح پڑھنا صحیح ہے، ملک شام کا ایک شہر ہے، (۲) خلفاء بنوامیہ نے دارالسلطنت دمشق کو بنایا اور وہاں ایک عالیشان جامع مسجد بنوائی، جس کو جامع بنوامیہ اور مسجد دمشق بھی کہا جاتا ہے اسی مسجد میں حضرت ابوالدرداء بیٹھ کر درس دیتے تھے۔

مدینة الرسول صلی اللہ علیه وسلم: امام شافعی سے نقل کیا گیا ہے کہ مدینۃ الرسول کہنا مکروہ ہے کیونکہ رسول کے معنی قاصد کے ہیں جسکی وجہ سے یہ لفظ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور رسول بمعنی قاصد کے معنی میں مشترک ہے جس میں اشتباہ ہے۔ (۳)

---

(۱) الإصابة ٤ / ٦٢١.

(۲) معجم البلدان ٦ / ٤٦٣.

(۳) فتح الإله ٢ / ٧٢.

لیکن ملاعلی قاریؒ نے فرمایا کہ: جب خود روایت میں اس لفظ کی صراحت آ گئی تو کوئی کراہت نہیں بالخصوص جب کہ لفظ رسول کے ساتھ درود بھی مذکور ہے تو پھر اس میں کوئی اشتباہ نہیں رہا۔ (۱)

بلغني إنک تحدثه عن رسول الله صلی الله علیه وسلم: ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حدیث سائل کو معلوم تھی پھر بھی انہوں نے اس قدر طویل سفر کیا اور اس حدیث کو سننے کی درخواست کی شراح نے اس کی دو وجہیں تحریر کی ہیں: (۲)

ممکن ہے کہ انہوں نے وہ حدیث اجمالاً سنی ہو پھر تفصیلا سننے کے لئے یہ سفر کیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے وہ روایت بالواسطہ سنی ہو اب براہ راست خود راوی سے سننے کے لئے سفر کیا ہو، گویا سند کو عالی کرنا مقصود تھا، سند کا عالی ہونا بھی دین کا شعبہ ہے۔

سلک الله به: "بہ" کے مرجع میں دو احتمال ہیں:

(۱) ضمیر کا مرجع "من" ہے یعنی علم کے راستے پر چلنے والا اور باء تعدیہ کے لئے ہے یعنی اللہ تعالی اس کو جنت کے راستہ پر چلائے گا۔

(۲) ضمیر کا مرجع علم ہے اور سلک سہل کے معنی میں ہے اور یہاں عائد محذوف ہے ای **سهل الله له به** اور جنت کے راستے سے مراد نیکی کا راستہ ہے، پس معنی یہ ہونگے کہ اللہ اس کے لئے علم کی وجہ سے جنت کا راستہ آسان کرے گا۔ (۳)

طالب علم کی فضیلت:

وان الملائکة لتضع أجنحتها: پروں کے بچھانے سے کیا مراد ہے؟ اس میں کئی احتمال ہیں:

(۱) اس کے حقیقی معنی مراد ہیں کہ ملائکہ طالب علم کے اکرام میں اپنے پروں کو بچھاتے ہیں، اور ہمیں اگرچہ اس کا مشاہدہ نہیں ہوتا لیکن جب پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے خبر دیدی تو مشاہدہ کی ضرورت نہیں رہی، منقول ہے کہ عراق کی ایک علمی مجلس میں یہ حدیث سنائی گئی، اس میں ایک معتزلی بھی تھا، اس نے اس حدیث کا استہزاء کیا اور کہا کہ میں کل جوتے پہن کر آؤں گا تا کہ فرشتوں کے پروں کو روندوں، اگلے دن

(۱) المرقاة ۱/ ٤٢٦.

(۲) المرقاة ۱/ ٤٢٧.

(۳) المرقاة ۱/ ٤٢٧.

وہ جوتے پہن کر آیا اور زمین کو روندنے لگا تو اس کے پیروں میں کوڑھ ہوگیا[1] (اللهم احفظنامنه)

(۲)اس سے مراد یہ ہے کہ: فرشتے پَروں کو بند کرکے مجلس میں بیٹھ جاتے ہیں اوراپنی پرواز موقوف کردیتے ہیں۔

(۳) بعض نے کہا کہ وضع اجنحہ کنایہ ہےتواضع سے، جیسے آیت کریمہ''واخفض لهما جناح الذل'' میں خفضِ جناح تواضع سے کنایہ ہے۔

(۴)بعض نے کہا کہ وضع جناح سے مراد ہے سلامی دینا اوراستقبال کرنا، اس لئے کہ فرشتے اللہ کی فوج ہیں اورطالب علم مہمان،تو فرشتے اللہ کے مہمانوں کا استقبال کرتے ہیں۔

(۵)بعض نے کہا کہ وضع جناح کنایہ ہے نصرت ومدد سے کہ سفروحضرمیں فرشتے طالب علم کی مددکرتے ہیں۔[2]

الحيتان في جوف الماء: اس سے پہلے جملہ میں''من في الارض'' کا لفظ ہےجسمیں مچھلیاں بھی داخل ہیں، پھربھی ان کا تذکرہ اس لئے کیا کہ ظاہر الفاظ سے یہ وہم ہورہا تھا کہ عالم کے حق میں صرف زمین وآسمان میں بسنے والے دعا کرتے ہیں،سمندرکی مخلوق دعانہیں کرتی، لہٰذا اس وہم کو دورکردیا اور بتادیا کہ سمندرکی مخلوق بھی عالم کے لئے دعا کرتی ہے، اس لئے کہ سمندری مخلوق کو حیات کے لئے پانی ضروری ہے اور پانی علماء کی دعا سے ملے گا کیونکہ فرمایا گیا ہے:''بهم يُمطرون وبهم يُرزقون''یعنی اہل علم کی برکت سے بارش ہوتی ہے اورانہی کے واسطے سے رزق ملتا ہے۔[3]

عالم کی عابد پرفضیلت اورعالم وعابد سے مراد:

وان فضل العالم على العابد كفضل القمر ليلة البدر: عالم کو عابد پرایسی فضیلت حاصل ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کوستاروں پر، وجہ اس کی یہ ہے کہ عالم کا فیض متعدی ہے اور عابد کی عبادت کا فائدہ صرف اس کی ذات تک محدود رہتاہے جیسا کہ چاند کی روشنی اہل زمین تک پہنچتی ہے اور ستاروں کی روشنی فقط ان تک محدود ہوتی ہے۔

---

(١)المرقاة ١/٤٢٧.

(٢)اللمعات ١/٥٤٦،المرقاة ١/٤٢٨.

(٣)المرقاة ١/٤٢٨.

اور قاضی بیضاویؒ نے تحریر کیا ہے کہ وجہ شبہ یہ ہے کہ ستارے روشنی حاصل کرتے ہیں چاند سے، اور چاند روشنی حاصل کرتا ہے سورج سے، گویا کہ عُبّاد، علماء سے کسبِ فیض کرتے ہیں اور علماء آفتابِ نبوت سے کسبِ فیض کرتے ہیں۔

پھر یہاں ''عالم'' سے مراد وہ شخص ہے جو فرائض وواجبات کی ادائیگی کے بعد علم میں مشغول رہتا ہو اور ''عابد'' سے مراد وہ ہے جس کو بقدر ضرورت علم حاصل ہو اور باقی اوقات عبادت میں مشغول رہتا ہو، ایسے عابد پر ایسے عالم کو فضیلت حاصل ہے، لہذا جو عالم بے عمل ہو اس کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، بلکہ اس کے لئے اس کا علم وبال جان ہے، اور جس عابد کو قدر ضرورت بھی علم حاصل نہیں وہ عابد ہی شمار نہیں اور وہ اس بحث سے خارج ہے۔(۱)

علماء؛ وارثین انبیاء:

وان العلماء ورثة الانبياء: علماء باعمل انبیاء کے حقیقی وارث ہیں اور انبیاء کی میراث علم ہے، دینار ودرہم نہیں، پس انسان اگر انبیاء علیہم السلام کے وارثین میں شمار ہونا چاہے تو علم صحیح حاصل کرے، دنیا کا طالب نہ بنے، ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہل علم کو دنیا اور اس کے مال ومتاع کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہونی چاہئے اور دنیا کے سلسلہ میں اللہ تعالی شانہ کی ذات پر توکل کرنا چاہئے۔(۲)

وارثین انبیاء ہونے کے تقاضے اور ذمہ داریاں:

یہاں اہل علم کو انبیاء علیہم السلام کا وارث کہا گیا ہے، اس میں یہ ہدایت ہے کہ اہل علم کے پیش نظر وہی مقاصد وامور ہوں جن کے لئے انبیاء علیہم السلام مبعوث کئے گئے، اور انبیاء علیہم السلام کے مقاصدِ بعثت کا بیان قرآن کریم میں متعدد جگہ آیا ہے:

(۱) ایک جگہ ارشاد ہے: ''اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِی هِیَ اَحْسَن'' (النحل:۱۲۵) یعنی لوگوں کو اپنے رب کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلایئے

(۱) تحفة الابرار ۱/ ۲۰۲.

(۲) المرقاة ۱/ ٤٢٩.

اوران سے بہتر انداز میں مباحثہ کیجئے۔

(۲) دوسری جگہ ارشاد ہے: ''يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ'' (آل عمران:۱۶۴) یعنی یہ رسول ان کے سامنے قرآن کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اوران کے نفوس کا تزکیہ کرتے ہیں اورانہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

(۳) نیز ارشاد ہے: ''يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتُ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثِ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْأَغْلالَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِم'' (الاعراف:۱۵۷) یعنی یہ رسول انہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں، حلال چیزوں کی حلت بتاتے ہیں اورحرام چیزوں کی حرمت واضح کرتے ہیں اوران سے بدعات ورسومات کوختم کرتے ہیں۔

(۴) ایک موقع پرفرمایا گیا ہے: ''یاایھاالرسول بلغ ماانزل الیک من ربک'' (المائدۃ:۶۷) کہ اے رسول آپ پرآپ کے رب کی طرف سے جونازل کیا گیا ہے اس کو دوسروں تک پہنچادیجئے۔

ان سب آیات سے حضرات انبیاءعلیہم السلام کے جومشاغل اور وظائف مستفادہوتے ہیں وہ اجمالاً یہ ہیں: دعوت الی اللہ، علمی مباحثہ، تلاوت قرآن، تعلیم کتاب وحکمت، تزکیہ نفوس وتربیت اخلاق، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، حلت وحرمت کے مسائل، رد رسوم وبدعات اور احکام دین کی تبلیغ واشاعت، پس ایک حقیقی عالم دین کے مشاغل ووظائف بھی اصولاً یہی ہیں اوربحیثیت وارث انبیاء یہی اس کے امور مفوضہ ہیں۔

وسماہ الترمذي قیس......الخ: ابوالدرداءؓ کے شاگرد کانام امام ترمذی نے ''قیس بن کثیر'' ذکرکیاہے، مگرراجح یہ ہے کہ وہ کثیر بن قیس ہیں۔(۱)

۲۰۲ / ۱۶: وَعَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ قَالَ: ذُكِرَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلَانِ: أَحَدُهُمَا عَابِدٌ، وَالْأٰخَرُ عَالِمٌ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِيْ عَلٰى أَدْنَاكُمْ، ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ وَأَهْلَ السَّمٰوٰاتِ وَالْأَرْضِ حَتَّى النَّمْلَةَ فِيْ جُحْرِهَا وَحَتَّى

(۱) کماقال علي القاري (المرقاۃ ۱ / ۴۳۰)

الْحُوْتَ لَيُصَلُّوْنَ عَلٰى مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرَ"(رواه الترمذي [١]) ورواه الدارمي عن مكحول مرسلا، ولم يذكر: رجلان وقال: فضل العالم على العابد كفضلي على أدْنَاكُمْ، ثم تلاهذه الآية: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰاءِ، وسرد الحديث الى آخره.[٢]

ترجمہ: حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دوآدمیوں کا تذکرہ کیا گیا، ان میں سے ایک عابد اور دوسرا عالم تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: عالم کو عابد پراس طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح کہ مجھےتم میں سے ادنیٰ شخص پرفضیلت حاصل ہے،اس کے بعدحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: اللہ اوراس کے فرشتے اورآسمان اورزمین کی تمام مخلوق یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنے سوراخوں میں اورمچھلیاں بھی اس شخص کے لئے مغفرت اورخیرکی دعائیں کرتی ہیں جولوگوں کو دین کاعلم سکھاتا ہے۔ (ترمذی) اوردارمی نے بھی اس کوروایت کیا ہے البتہ دارمی نے ''رجلان'' کا تذکرہ نہیں کیا اورکہا کہ: عالم کی عابد پرایسی فضیلت ہے جیسا کہ میری فضیلت ہےتم میں سے ادنیٰ انسان پر، پھرآپ علیہ الصلوۃ والسلام نے یہ آیت تلاوت کی: ''انمایخشی اللہ من عبادہ العلماء'' اوراخیرتک حدیث بیان کی۔

تشریح حدیث

اس حدیث کا مضمون ماقبل کی روایت سے ملتا جلتا ہے، چنانچہ عالم کے سلسلہ میں دوباتیں فرمائی گئیں ایک عالم کی عابد پرحددرجہ فضیلت اوردوسرے یہ کہ تمام کائنات عالم کے لئے دعاگورہتی ہے۔

ذکرلرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجلان: یہ تذکرہ بطورِتمثیل ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سےعرض کیا گیا کہ مثال کےطور پردوشخص ہوں، ایک عالم اورایک عابد، ان میں سے کون افضل ہے؟ اس پرحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عالم کی فضیلت عابد پرایسی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے

(١) أخرجه الترمذي أبواب العلم، باب ماجاء في فضل الفقه على العبادة ٢/٩٨، الرقم ٢٦٨٥.

(٢) رواه الدارمي في سننه: كتاب العلم، باب من قال: العلم الخشية وتقوى الله، الرقم: ٢٩٧.

ادنی پر، یا پھر بنی اسرائیل کے دو شخصوں کا تذکرہ آپ علیہ الصلوۃ والسلام سے کیا گیا ایک عالم کا اور ایک عابد کا اس پر یہ فضیلت بیان فرمائی۔

أحدهما عابد والآخر عالم : عالم سے مراد وہ شخص ہے جو عبادت ضروریہ ادا کرنے کے بعد باقی اوقات کو نشرِ علم میں مشغول رکھے اور عابد سے مراد وہ شخص ہے جس کو بقدر ضرورت علم ہو اور عبادات ضروریہ کو ادا کرنے کے بعد باقی اوقات نوافل میں مشغول رہے۔ کما مر (۱)

کفضلي علی أدناکم : اس میں دو احتمال ہیں: (۱) کُمْ کا مصداق حضرات صحابہ ہوں یعنی ادنیٰ صحابی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسی فضیلت حاصل ہے اور ادنی صحابی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام ومرتبہ میں بڑا فرق ہے۔ (۲)

(۲) کُمْ سے مراد تمام امت محمدیہ ہو یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسی فضیلت ادنی امتی پر حاصل ہے ویسی ہی فضیلت عالم کو عابد پر ہے، اور ایک ادنی امتی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام ومرتبہ میں زمین وآسمان سے بھی زیادہ کا فرق ہے، اس لحاظ سے عالم کو عابد پر حد درجہ فضیلت حاصل ہوگی۔ (۳)

حتی النملة في جحرها : ''نملہ'' کا تذکرہ الگ سے کیا تاکہ یہ خشکی کی تمام مخلوق کو شامل ہوجائے اور مچھلی کا تذکرہ بھی الگ سے کیا تاکہ دریائی تمام مخلوق کو شامل ہوجائے۔ (۴)

علی معلم الناس الخير: ''خیر'' سے مراد علمِ دین ہے کیونکہ وہ سراسر خیر ہے۔ (۵)

احوال مکحول:

راه الدارمي عن مکحول مرسلا : یہ روایت امام دارمی نے مکحول سے مرسلا یعنی بلا واسطۂ صحابی روایت کی ہے، اور رجلین کا تذکرہ بھی نہیں کیا، مکحول مشہور تابعی ہیں اوساط تابعین میں ان کا شمار ہے، فقیہ شام کہلاتے ہیں، حضرات صحابہ نے جب افغانستان میں کابل کا علاقہ فتح کیا اس وقت ان کو قیدی بنایا گیا پھر

(۱) المرقاة ۱/ ۴۳۰ مطبوعه أشرفيه، ديوبند.
(۲) فتح الإله ۲/ ۷۷ دار الكتب العلميه، بيروت لبنان
(۳) المرقاة ۱/ ۴۳۰.
(۴) المرقاة ۱/ ۴۳۰.
(۵) تحفة الأبرار ۱/ ۲۰۴.

انھوں نے اسلام قبول کیا اور علم حاصل کیا امام اوزاعی وزہری کے استاذ ہیں۔

علماء ہی خشیت الٰہی رکھنے والے:

إنما يخشى الله من عباده العلماء : عالم کی فضیلت اس لئے زیادہ ہے کہ خشیت زیادہ علماء میں ہی پائی جاتی ہے، خشیت کے معنی ہیں الخوف مع التعظیم کہ آدمی جس سے ڈرے اس کی عظمت قلب میں ہو، جیسے اولاد والدین سے استاذ شاگرد سے ڈرتا ہے، علماء میں اللہ کی خشیت زیادہ اس لئے ہے کہ وہ اللہ کی ذات وصفات سے واقف ہوتے ہیں اور بادشاہ سے وہی ڈرتا ہے جو اس کے احوال سے زیادہ واقفیت رکھتا ہو اور شاہی آداب کو جانتا ہو۔

۲۰۳ / ۱۸ : وعَنْ أَبِي سَعِيْدِ نِ الْخُدْرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "إِنَّ النَّاسَ لَكُمْ تَبَعٌ، وَإِنَّ رِجَالاً يَأْتُوْنَكُمْ مِنْ أَقْطَارِ الأَرْضِ يَتَفَقَّهُوْنَ فِي الدِّيْنِ فَإِذَا أَتَوْكُمْ فَاسْتَوْصُوْا بِهِمْ خَيْراً" (رواه الترمذي)(۱)

ترجمه : حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: لوگ تمہارے (یعنی صحابہ) کے تابع ہیں، اور لوگ تمہارے پاس اطراف عالم سے علم دین سیکھنے آئیں گے، لہٰذا جب وہ تمہارے پاس آئیں تو تم ان کے ساتھ بھلائی اور شفقت کا معاملہ کرنا۔ (ترمذی)

تشریح حدیث

طلبۂ دین کے ساتھ خیر خواہی کی تاکید:

اس حدیث میں حضرات صحابہؓ کو اور صحابہؓ کے واسطہ سے قیامت تک آنے والے تمام معلمین کو نصیحت ہے کہ جو لوگ ان کے پاس علم حاصل کرنے کے لئے آئیں ان کے ساتھ نرمی وشفقت کا معاملہ فرمائیں اور خیر خواہی وہمدردی کا برتاؤ کریں۔

طبقۂ تابعین اور اس کی وجہ تسمیہ:

ان الناس لكم تبع : یہ خطاب صحابہؓ کو ہے، اور مطلب یہ ہے کہ لوگ اقوال وافعال میں تمہارا اتباع

(۱) أخرجه الترمذي في أبواب العلم، باب ماجاء في الاستيصاء لمن يطلب العلم ۲ / ۹۳.

کریں گے کیونکہ تم نے شریعت کے اقوال وافعال کو مجھ سے سیکھا ہے، تبع کے لفظ سے تابعین کی وجہ تسمیہ بھی معلوم ہوگئی کہ وہ بلاواسطہ صحابہؓ کا اتباع کرنے والے ہیں، اس لئے تابعین ہیں۔

وان رجالا یأتونکم من أقطار الارض: ''اقطار'' قطر کی جمع ہے بمعنی گوشہ، جہت، اس جملہ میں آپ علیہ السلام نے پیش گوئی فرمائی کہ دنیا کی ہر سمت سے لوگ تمہارے پاس تحصیل علم کے لئے آئیں گے، علماء نے فرمایا کہ یہ پیش گوئی سوفیصد پوری ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدینہ طیبہ دارالعلم بن گیا، اور دنیا بھر سے لوگ جوق درجوق فرداً وجماعۃً صحابہ کرام کے پاس آئے، یہاں تک کہ مدینہ کے علاوہ اگر کسی دوسری جگہ کسی صحابی کا ہونا معلوم ہوتا لوگ وہاں بھی پہنچ جاتے۔(۱)

یتفقهون فی الدین: یہ جملۂ مستانفہ ہے اور ماقبل کے جملہ کی علت ہے۔

فاستوصوابهم: یہ استیصاء سے ہے بمعنی حسن سلوک کرنا، خیرخواہی کرنا، خیرخواہی یہ ہے کہ ان کو شفقت کے ساتھ تعلیم دیں، ان کے اوقات کو ضیاع سے بچائیں، مفید چیزیں ان کو سکھائی جائیں، اوران کی تربیت بھی کی جائے جس سے علم پر عمل کا جذبہ بھی ان میں پیدا ہو۔(۲)

۲۰۳/۱۹: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْحَكِيْمِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا، رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَة،(۳) وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَإِبْرَاهِيْمُ بْنُ الْفَضْلِ الرَّاوِيْ يُضَعَّفُ فِي الْحَدِيْثِ.

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: دانائی (علم) کی بات عقلمند (عالم) کا گم شدہ سامان ہے، لہٰذا جہاں اس کو پالے وہ اس کا حقدار ہے۔

اس حدیث کو امام ترمذی اورامام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے، اور امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے، اوراس کی سند میں ابراہیم بن فضل نام کے ایک روای ہیں جن کی (حدیث کے سلسلے میں) تضعیف کی گئی ہے۔(ترمذی وابن ماجہ)

(۱)المرقاة ۱/۴۳۲.

(۲)اللمعات ۱/۵۵۳.

(۳)أخرجه الترمذي في العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة ۲/۹۸. وابن ماجه في المقدمة.

تشریح حدیث

کلمۂ حکمت؛ دانا انسان کی متاعِ گمشدہ:

اس حدیث میں طلباء وعلماء کے لئے نصیحت ہے کہ طالب علم اور عالم کو چاہئے کہ علم اور دانشمندی کی بات جہاں بھی ملے اور جس شخص کے پاس ملے اس کو حاصل کرلے۔

الکلمة الحکمة : موصوف صفت ہے، نیز اضافت کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے یعنی **کلمة الحکمة** اس حدیث کے دو مطلب ہیں:

(۱) علم کی بات جس کے پاس بھی پاؤ اس سے حاصل کرلو چاہے وہ شخص کم درجہ کا ہو اور خواہ وہ عالم نہ ہو، اس لئے کہ علم کی بات تمہارا گم شدہ مال ہے یعنی اگر تمہارا مال گم ہوجائے اور وہ کسی ایسے شخص کے پاس ملے جو معاشرہ میں کم درجہ والا ہے تو وہاں سے تم اپنے مال کو لے لوگے اس کے پاس سے لینے میں عار محسوس نہ کروگے، اسی طرح علم کی بات تمہیں جہاں بھی ملے وہ تمہارا متاع ہے اس کو وہاں سے حاصل کرنے میں عار محسوس نہ کرو۔(۱)

(۲) اس میں عوام کو ہدایت ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس علمی بات ہے تو وہ اصلاً عالم کا گم شدہ مال ہے اور اس کا حق ہے، لہٰذا وہ بات عالم تک پہنچادینی چاہئے۔(۲)

اس حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ عالم دین کو ہر مفید بات کا طالب رہنا چاہئے، اور حتی الوسع اس کے حصول کی کوشش کرنا چاہئے۔

درجۂ حدیث:

وقال الترمذی هذا حدیث غریب : صاحب مشکوۃ امام ترمذی کے حوالہ سے اس حدیث کا درجہ بتارہے ہیں کہ از روئے سند یہ حدیث ضعیف ہے، اس لئے کہ اس کی سند میں ابراہیم بن الفضل المخزومی ایک راوی ہے، جس کی تضعیف کی گئی ہے۔

---

(۱) شرح المشکاة للطیبی ۱/۴۱۴.

(۲) المرقاة ۱/۴۳۳.

٢٠٤ / ٢: وَعَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيْهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ. (رواه الترمذی و ابن ماجه)(۱)

ترجمه: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک فقیہ، شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔

تشریح حدیث

فقیہ عالم؛ شیطان پر ہزار عابدوں سے بھاری:

اس حدیث میں بھی عابد پر عالم کی فضیلت بیان کی گئی ہے کہ ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔

فقیہ سے مراد وہ عالم ہے جس کو علوم دینیہ میں رسوخ کا درجہ حاصل ہو اور مکائد شیطانی سے واقف ہو اور اپنی خداداد فہم وفراست سے ان مکائد سے حفاظت کی تدبیر کر سکے، چنانچہ شیطان بہت سی مرتبہ لوگوں کو راہ راست سے ہٹانے کے لئے گمراہی کا جال بچھاتا ہے، لوگ اس کو حق سمجھتے ہیں، ایسے موقعہ پر ایک فقیہ عوام الناس کو بتاتا ہے کہ یہ شیطان کا مکر اور اس کا فریب ہے لوگ صحیح بات سمجھ لیتے ہیں اور شیطان کا فریب آشکارا ہو جاتا ہے جس سے شیطان کی وہ تدبیر ناکام ہو جاتی ہے اور وہ کفِ افسوس ملتا ہوا رہ جاتا ہے، محض عبادت گذار شخص شیطان کے مکائد سے واقف نہیں ہوتا، اس لئے وہ بہت سی مرتبہ خود ہی شیطان کے جال میں پھنس جاتا ہے، چہ جائیکہ وہ دوسروں کی حفاظت کرے، اس لئے ایک فقیہ شیطان پر ہزار عبادت گذاروں سے بھی زیادہ بھاری ہوتا ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا واقعہ:

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا واقعہ ہمارے حضرت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ سناتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت جیلانیؒ رات کو مراقبہ فرما رہے تھے، جس میں یہ محسوس ہوا کہ اللہ کے بہت قریب پہنچ گیا ہوں، اسی حال پر سخت پیاس لگی، اوپر سے ایک ہاتھ نظر آیا جس میں سونے کا گلاس تھا، آپ نے اس کو لینا چاہا مگر یہ سوچ کر لیتے

(۱) أخرجه الترمذی فی أبواب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة ۲ / ۹۷ الرقم ۲٦۸۱.

و ابن ماجه فی المقدمه، باب فضل العلماء و الحث علی طلب العلم ۱ / ۲۰ الرقم ۲۲۲.

لیتے رک گئے کہ اس کا استعمال تو حرام ہے، پھر خیال ہوا کہ اللہ ہی نے حرام کیا ہے اور وہی دے رہے ہیں، اس کے بعد خیال آیا کہ نہیں پیئوں گا کیونکہ شریعت محمدیہ میں نسخ نہیں، اور یہ سوچ کر لاحول پڑھا، تو شیطان بھاگ گیا، مگر جاتے جاتے ٹانگ مار گیا اور کہا کہ: تو اپنے علم کے ذریعہ بچ گیا ورنہ اس جگہ پر لاکر میں نے بہت سوں کو گمراہ کیا، حضرت نے فرمایا: خبیث! اب بھی مجھے گمراہ کرنا چاہتا ہے، میں اللہ کے فضل سے بچا نہ کہ علم کی وجہ سے۔ (۱)

من الف عابد: ''الف'' برائے تکثیر ہے، برائے تحدید نہیں۔

اس حدیث کے مطابق جس طرح علماء عاملین اور فقہاء ماہرین شیطان کے لئے سخت ہوتے ہیں اسی طرح دنیا میں شیطانی طاقتوں اور اس کے آلہ کاروں کے لئے بھی یہ حضرات ''سخت'' ہوتے ہیں، اور ظاہری اسباب وآلات سے خالی ہونے کے باوجود شیطانی قوتیں انہی کو اپنے لئے خطرہ اور اپنے مقاصد کی راہ میں رکاوٹ سمجھتی ہیں۔ کما ہو مشاہد

۲۰۵ / ۲۱ : وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ ، وَوَاضِعُ الْعِلْمِ عِنْدَ غَيْرِ أَهْلِهِ كَمُقَلِّدِ الْخَنَازِيْرِ الْجَوْهَرَ وَاللُّؤْلُؤَ وَالذَّهَبَ. (رواه ابن ماجه[۲] وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ فِيْ ''شعب الإيمان''[۳] إِلٰى قَوْلِهِ: ''مُسْلِمٍ'' وَقَالَ: هٰذَا حَدِيْثٌ مَتْنُهُ مَشْهُوْرٌ، وَإِسْنَادُهُ ضَعِيْفٌ ، وَقَدْ رُوِيَ مِنْ أَوْجُهٍ كُلُّهَا ضَعِيْفٌ)

ترجمہ : حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، اور نااہل کو تعلیم دینے والا خنزیر کے گلے میں جواہرات، موتی اور سونے کا ہار ڈالنے والے کے مانند ہے۔

اس حدیث کو امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے، اور امام بیہقیؒ نے اس کو ''شعب الایمان'' میں لفظ ''مسلم'' تک روایت کیا ہے اور فرمایا کہ اس حدیث کا متن مشہور ہے، اور اس کی سند ضعیف ہے، اور یہ حدیث مختلف سندوں سے مروی ہے، مگر وہ سب ضعیف ہیں۔

(۱) ازملفوظات فقیہ الامت ۲ / ۵۷۔

(۱) أخرجه ابن ماجه في المقدمة، باب فضل العماء والحث على طلب العلم ۱ / ۲۰.

(۲) ۲ / ۲۵۵ (۱۶۶۵)

تشریح حدیث

طلب علم کی فرضیت اور نااہل کو علم سکھانے کی ممانعت:

اس حدیث میں علم کا حکم بیان کیا اور معلمین کو نصیحت کی گئی ہے کہ ناقدروں کو علم نہیں سکھانا چاہئے۔

طلب العلم فریضة: ''فریضۃ'' کی تاء مبالغہ کے لئے ہے یعنی بڑا فرض ہے اور علم سے مراد ''علم دین'' ہے، اور معنی یہ ہیں کہ علم دین کی تحصیل ہر مسلمان پر فرض ہے، پھر علم دین کی دو قسمیں ہیں: فرض عین اور فرض کفایہ، جیسا کہ کتاب العلم کے شروع میں گزرا، فرض عین اس قدر علم ہے جس سے شرعی فرائض وواجبات کو ادا کیا جا سکے اور محرمات وممنوعات سے بچا سکے، اتنا علم ہر شخص پر نماز روزہ کی طرح فرض ہے اور ہر بستی وعلاقہ میں مکمل علم دین کے حامل شخص کا رہنا فرض کفایہ ہے، خواہ وہ انہی میں سے ہو یا باہر سے بلایا گیا ہو، فرضِ عین کو ''علم الحال'' کہا جاتا ہے یہاں یہی علم الحال مراد ہے،(۱) جس کا مفہوم ہے کہ ہر شخص پر اپنی ضرورت کا علم سیکھنا لازم ہے، پس غریب پر غیر مالی فرائض، مالدار پر مالی فرائض، تاجر پر تجارت کے، ملازم پر ملازمت واجرت کے اور کسان پر کاشتکاری وزراعت کے مسائل کا سیکھنا فرض ولازم ہے۔

علی کل مسلم: ملا علی قاریؒ نے فرمایا کہ بعض روایات میں ''مسلمة'' کا بھی لفظ ہے (۲) لیکن علامہ سخاویؒ نے فرمایا کہ اس کے کسی طریق میں یہ لفظ مذکور نہیں اگرچہ معنی صحیح ہیں (۳) لہذا یہ اضافہ ثابت نہیں ہے، البتہ مراد ضرور ہے، کیونکہ بقدر ضرورت علم دین کی تحصیل عورت پر بھی فرض ہے۔

پھر ''مسلم'' سے عاقل بالغ مسلمان مراد ہے، ناعاقل اور نابالغ پر تاوقت بلوغ وشعور کچھ فرض نہیں۔

وواضع العلم عند غیر أهله: اس جملہ میں بتایا گیا ہے کہ ناقدروں کو علم نہیں سکھانا چاہئے، کیونکہ یہ ایسا ہی ہے جیسے خنزیر کے گلے میں بیش قیمت چیزوں کا ہار ڈالا جائے، ایسا کرنے میں ان چیزوں کی ناقدری ہے۔

---

(۱) المرقاة ١/٤٣٤.

(۲) المرقاة ١/٤٣٤.

(۳) المقاصد الحسنة ص ٤٤٢.

"غير أهله" کی مراد میں کئی اقوال ہیں:
(۱) بعض نے فرمایا کہ: نااہل سے مراد وہ شخص ہے جس میں اُس علم کے سمجھنے کی استعداد نہ ہو۔
(۲) بعض نے کہا کہ: اس سے مراد وہ ہے جو علم دین حاصل کرے دنیوی غرض کے لئے۔
(۳) بعض نے فرمایا کہ: اس سے مراد وہ شخص ہے جس میں علم کی طلب نہ ہو۔

درجۂ حدیث

وقال: هذا حديث متنه مشهور وإسناده ضعيف: یہ روایت کافی مشہور اور زبان زد عام وخاص ہے، مگر از روئے سند ضعیف ہے، اور جیسا کہ ذکر کیا گیا "مسلمة" کا اضافہ تو ثابت ہی نہیں ہے، امام بیہقیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث متعدد سندوں سے روایت کی گئی ہے، لیکن تمام کی تمام اسانید ضعیف ہیں تاہم امام مزی نے فرمایا ہے کہ تعددِ طرق کی وجہ سے یہ حدیث حسن لغیرہ کے درجے میں ہے۔ (۱)

٢٠٦ / ٢٢: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "خَصْلَتَانِ لايَجْتَمِعَانِ فِيْ مُنَافِقٍ: حُسْنُ سَمْتٍ وَلافقهٌ فِي الدِّيْنِ" (رواه الترمذی) (۲)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: دو خصلتیں ایسی ہیں جو منافق میں جمع نہیں ہوسکتیں: ایک اچھے اخلاق اور دوسرے دین کی سمجھ۔ (ترمذی)

تشریح حدیث

حسن اخلاق اور تفقہ کی ترغیب:

اس حدیث میں علم کی اور اچھے اخلاق کے حصول کی تاکید ہے، فرمایا: دو خصلتیں منافق میں جمع نہیں

(١) وقال العلقمي في شرح الجامع الصغير: رأيت له خمسين طريقا، جمعتها في جزء وحكمت بصحته لكن من القسم الثاني وهو الصحيح بغيره، فقول الجزري في البداية: لاأصل له، أي ليس له أصل صحيح، وقد مثل به ابن الصلاح للمشهور الذي ليس بصحيح؛ لكن قال العراقي: قد صحح بعض الأئمة بعض طرقه هذا، وقد ألحق بعض المصنفين بآخر الحديث "ومسلمة" وليس لها ذكر في شيئ من طرقه، المرقاة ١/ ٤٣٥.

(٢) أخرجه الترمذي في أبواب العلم، باب فضل طلب العلم، والدارمي، أبواب العلم عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب فضل طلب العلم. (٢٦٤٧)

ہوتیں، اچھے اخلاق اورفقہ فی الدین، منافق کے اندران میں سے کوئی ایک خصلت تو ہوسکتی ہے لیکن دونوں جمع نہیں ہوں گی اگرایک خصلت ہوگی تو دوسری مفقود ہوگی،مقصودمومنین کوان دونوں صفتوں کے جمع کرنے کی ترغیب دینا ہے، کہ ان کی سیرت واخلاق بھی عمدہ ہوں اور دین کی فہم وسمجھ بھی حاصل ہو، بالخصوص ایک عالم دین کوان دونوں صفات کا حامل ہونا چاہئے تبھی لوگ اس کے علم سے لوگ فیضیاب ہوسکیں گے۔ (۱)

ولا فقه في الدين: اس سے مراد ایسا علم جو دل میں اتر کر خشیت پیدا کرے اور خشیت کے نتیجہ میں عمل کی توفیق ملے۔

۲۰۷/۲۳: وَعَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ خَرَجَ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَرْجِعَ.(رواه الترمذي والدارمي)(۲)

ترجمه: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: جوشخص علم حاصل کرنے کے لئے اپنے گھر سے نکلا تو وہ اللہ کے راستہ میں ہے، یہاں تک کہ (اپنے گھر) واپس لوٹے۔

تشریح حدیث

طلب علم کے لئے گھر سے نکلنے والا راہِ خدا میں:

اس حدیث میں بھی طلب علم کی فضیلت ہے کہ جوطلب علم کے لئے گھر سے نکلتا ہے تو وہ جبتک واپس نہ آجائے خدا کی راہ میں ہوتا ہے جس طرح مجاہد اللہ کے راستہ میں ہوتا ہے، کیونکہ طلب علم اور جہاد دونوں میں اتعابِ نفس اورتذلیل شیطان ہے، اس لئے دونوں اللہ کے راستہ میں ہیں اوراللہ کے راستہ میں مباح اعمال پربھی ثواب ہے، پس طالب علم کا ہرعمل موجب ثواب بن جائے گا،اوراگرگھرآ کرنشرعلم میں مشغول ہوجائے تو اس کا درجہ اور بڑھ جائے گا، کیونکہ نبیوں والے کام میں مشغول ہوگیا۔

(۱) تحفة الابرار ۱/۲۰۶.

(۲) أخرجه الترمذي في أبواب العلم، باب فضل طلب العلم ۹۳/۱ الرقم ۲۶۴۸ والدارمي في المواسته، باب البلاغ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وتعليم السنن ۱۴۶/۱ الرقم ۵۶۷.

۲۰۸/ ۲٤: وَعَنْ سَخبَرَةَ الأزديِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ كَانَ كَفَّارَةً لِمَا مَضٰى. رواه الترمذي والدارمي(۱) وقال الترمذي: هذا حديث ضعيف الإسناد، وأبو داود الراوي يضعف.

ترجمہ: حضرت سخبرہؓ ازدی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جوشخص علم حاصل کرتا ہے تو یہ(طلبِ علم) اس کے گذشتہ گناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے۔

امام ترمذی نے فرمایا کہ اس حدیث کی سند کمزور ہے، ابوداود نامی راوی (جواس حدیث کی سند میں ہیں) کی تضعیف کی گئی ہے۔(ترمذی، دارمی)

تشریحِ حدیث

تعارف سخبرہ الازدیؓ:

ازد: یمن کا ایک قبیلہ ہے اس کی طرف نسبت ہے، ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے، لیکن صاحبِ مشکوۃ نے ان کو صحابہ کی فہرست میں ذکر کیا ہے اور یہی راجح ہے، البتہ قلیل الروایۃ ہیں اور صرف یہی ایک حدیث ان سے مروی ہے۔(۲)

تحصیل علم، گزشتہ گناہوں کا کفارہ:

من طلب العلم كان كفارة لمامضى: طلب علم گناہوں کے لئے کفارہ اس وجہ سے ہے کہ طلبِ علم حسنہ ہے اور قاعدہ ہے، **إن الحسنات يذهبن السيئات** البتہ اس سے مراد صرف صغائر ہیں، کبیرہ کی معافی کے لئے توبہ لازم ہے، یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ تحصیل علم حقوق شناسی کا اور اور توبہ کا ذریعہ ہوجاتا ہے۔

(۱) أخرجه الترمذي في أبواب العلم، باب فضل طلب العلم ۱/ ۹۳، والدارمي في المقدمة، باب البلاغ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وتعليم السنن ۱/ ۱٤٦، الرقم ٥٦٧.

(۲) سخبرة الأزدى بسكون الزاى، والدعبدالله بن سنجرة، ويقال له الأسدي (الإصابة في القسم الأول: ۲/ ۳۰) وقد ذكره علاء الدين مغلطائى فى الإنابة إلى معرفة المختلف فيهم من الصحابة" ۱/ ۲٤۳، وقال: قال ابن حبان: يقال إن له صحبة، وذكره فى الصحابة أبوعمر، والأصفهانيان، وذكره ابن الجوزي فى "تسمية أصحاب الرسول ومن رآه" تحت الاسماء المفردة في الباب من حرف السين، "التلقيح" ۱٤۸ وصنيع الحافظ فى "الإصابة" يدل على أن له حديثين.

درجۂ حدیث:

وأبو داود الراوي يضعف: اس سے امام ابوداود صاحب سنن مراد نہیں ہیں، بلکہ اس حدیث کے رواۃ میں سے ایک راوی اسی نام کے ہیں، وہ مراد ہیں جن کی تضعیف کی گئی ہے، لہٰذا یہ حدیث سنداً ضعیف ہے۔(۱)

۲۰۹ / ۲۵: وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَنْ يَّشْبَعَ الْمُؤْمِنُ مِنْ خَيْرٍ يَسْمَعُهُ حَتّٰى يَكُوْنَ مُنْتَهَاهُ الْجَنَّةَ. (رواه الترمذي) (۲)

ترجمه: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: مؤمن ہرگز خیر (علم) سے سیر نہیں ہوتا، جس کو وہ سنے (حاصل کرے) یہاں تک کہ اس کی انتہا جنت ہوجاتی ہے۔

تشریح حدیث

حقیقی طالبِ علم کی پہچان:

اس حدیث میں حقیقی طالب علم کی نشاندہی فرمائی گئی ہے کہ حقیقی طالب علم وہ ہے جو علم سے کبھی سیراب نہ ہو، بلکہ ہمیشہ زیادتی علم کا طلبگار رہے، اور طلب علم ہی میں اس کی موت آئے، یہ معنی اس لئے ہیں کہ "یشبع" کا لفظ استمرار پر دلالت کرتا ہے کہ تاحیات وہ علم کی طلب میں رہا، ایسے شخص کی انتہاء اور انجام جنت ہے، پس علم کی کوئی انتہاء نہیں، لہذا تازندگی اس کی تحصیل اور اس میں اضافہ کی کوشش رہے، چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں، پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ملا کہ ازدیادِ علم کی دعا کیا کریں: **وقل رب زدني علما**.

(۱) المرقاة ۱ / ٤٣٧.

قال الترمذي: أبو داود اسمه نفيع الأعمى، يضعف في الحديث، ولانعرف معا لعبدالله من سنجرة كبير شيئ، ولا لأبيه، (جامع الترمذي ۲ / ۹۳)

قال الحافظ في "التقريب" رقم ۷۱۸۱: نفيع بن الحارث أبوداود الأعمى مشهور بكينة، كوفي، ويقال له: نافع، متروك، وقد كذبه ابن معين، من الخامسة، ت ق.

(۲) أخرجه الترمذي في سننه، ابواب العلم، باب ماجاء في فضل الفقه على العبادة ۲ / ۹۸.

٢١٠/ ٢٦: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ عَلِمَهُ ثُمَّ كَتَمَهُ، أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ، (رواه احمد وأبوداود، والترمذي ورواه ابن ماجه عن أنسؓ)(١)

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جس شخص سے علم کے متعلق کوئی ایسی بات پوچھی گئی جس کا اس کو علم تھا مگر اس نے اس کو چھپایا تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔

تشریح حدیث

کتمانِ علم پر سخت وعید:

اس حدیث میں کتمان علم پر وعید ہے کہ جس سے کوئی علمی بات معلوم کی جائے اور معلوم ہونے کے باوجود نہ بتائے تو قیامت میں اس کو آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔

کیونکہ علم دین کی تحصیل کی اصل غرض لوگوں کی رہنمائی اور ان کو مرضی الٰہی سے واقف کرانا ہے، پس لوگوں سے علم چھپانا گویا ان کو خداتعالیٰ سے دور کرنا ہے، ظاہر ہے کہ اس جرم کی جو بھی سزا ہو کم ہے، کتمانِ علم کے گناہ کا تعلق منہ اور زبان سے ہے اس لئے اس کے مناسب سزا کی وعید سنائی گئی، پس اہل علم کو دین کی تبلیغ واشاعت سے گریز نہیں کرنا چاہئے۔

علامہ خطابی نے فرمایا کہ یہ وعید اس وقت ہے جب کسی سخت ضرورت والی چیز کے بارے میں سوال کیا جائے اور مسئول کے علاوہ اور کوئی بتانے والا نہ ہو، اور مسئول کو بھی وہ بات تحقیق سے معلوم ہو، شک وتردد نہ ہو، نیز پوچھنے والا بھی باصلاحیت ہو۔(٢)

---

(١) أخرجه أبوداود في العلم، باب كراهية منع العلم ٢/ ٥١٥ والترمذي فيه، باب كتمان العلم ٢/ ٩٣. وابن ماجه: في المقدمة باب من سئل عن علم فكتمه ص: ٢٣.

وأحمد في "مسنده" ٢/ ٢٦٣ الرقم ٧٥٦١. و٢/ ٣٠٥ الرقم ٨٠٣٥ و٢/ ٤٩٥ الرقم ١٠٤٢٥ و٢/ ٣٤٤ الرقم ٨٥١٤ و٢/ ٣٥٣ الرقم ٨٦٢٣ و٢/ ٢٩٦ الرقم ٧٩٣٠.

(٢) المرقاة ١/ ٤٣٨.

علماء نے فرمایا ہے کہ کتاب کا نہ دینا بھی اس میں داخل ہے، جبکہ مذکورہ امور متحقق ہوں۔ (۱)

۲۱۱/ ۲۷: وَعَنْ كَعْبِ بنِ مَالِكٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُجَارِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ اَوْلِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ، اَوْيَصْرِفَ بِهٖ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْهِ أَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ، (رواه الترمذي، ورواه ابن ماجة عن ابن عمرؓ)(۲)

ترجمه: حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: جس شخص نے علم اس لئے حاصل کیا کہ وہ علم کے ذریعہ علماء پرفخر کرے، بیوقوفوں سے جھگڑے، اورلوگوں کے چہروں کو اپنی طرف متوجہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کی آگ میں داخل کرے گا۔

تشریحِ حدیث

احوال کعب بن مالکؓ:

جلیل القدراور مشہور صحابی ہیں، ابوعبداللہ اورابوعبدالرحمٰن کنیت ہے، اوربعض نے ابوبشیر کنیت بتائی ہے، بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تھے، اور بدروتبوک کے سوا تمام غزوات میں شریک رہے، ان تین صحابہ میں سے ہیں جن کی توبہ پچاس دنوں کے بعد قبول ہوئی تھی، جن کے بارے میں یہ آیت شریفہ نازل ہوئی: ''وعلى الثلثة الذين خلفوا ......الخ'' ۵۰ھ میں انتقال ہوا ہے۔ (۳)

مذموم مقاصد کے لئے علمِ دین کی تحصیل پر وعید:

اس حدیث میں اوراگلی حدیث میں طلب علم میں اخلاص کی اورنیت صحیح کرنے کی تعلیم دی گئی ہے،

(۱) ملاعلی قاریؒ نے مقاصد حسنہ للسخاوی سے نقل فرمایا ويشمل الوعيد حبس الكتب عن الطالب لاسيما عند عدم التعدد والابتلاء بهذا كثير، ۱۵۱.وخصوصا كتاب الوقف،مرقاة ۱/ ۴۳۸، المقاصد الحسنه.

(۲)أخرجه الترمذي في العلم، باب ماجاء في من يطلب بعلمه الدنيا ۲/ ۹۴ وابن ماجه في المقدمة، الانتفاع في العلم والعلم به ۱/ ۲۲.

(۳) وكان أحد شعراء النبى صلى الله عليه وسلم، وهو أحد الثلاثة الذين تخلفوا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في غزوة تبوك؛وهم كعب بن مالك، وهلال بن أميه، ومرارة بن ربيعه بجمع أوائل أسمائهم مكه، المرقاة ۱/ ۴۳۸.

کہ تحصیل علم میں رضائے الٰہی کی اوراحیاء دین کی نیت ہو، نیز اپنی ذات سے اوردوسروں سے صفت جہل دورکرنے کی نیت ہو، علماء پرعلمی تفوق جتلانے کی نیت نہ ہو، جاہ اورشہرت اوربےعلم افراد کوخاموش کرنا مقصود نہ ہو۔

لیجاری به العلماء: ''مجاراۃ'' سے ہے بمعنی الجری فی العدو یعنی دوڑ میں مقابلہ کرنا،مراد ہے ان پرعلمی تفوق جتلانا۔

لیماری به السفهاء: ''مماراۃ'' سے ہے بمعنی بحث کرنا، حجت بازی کرنا، مراد ہے بےعلموں کو خاموش کرنا،''سفہاء'' سے مراد بےعلم یاکم علم لوگ ہیں۔

اویصرف به وجوه الناس الیه:لوگوں کے چہرے اپنی جانب پھیرنے سے مراد جاہ وشہرت کا طالب ہونا ہے۔

۲۱۲/۲۸: وَعَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ "مَنْ تَعَلَّمَ عِلْماً مِمَّا یُبْتَغیٰ بِهٖ وَجْهُ اللّٰه، لایَتَعَلَّمُهٗ إلاَّ لِیُصِیْبَ بِهٖ عَرَضاً مِنَ الدُّنْیا، لَمْ یَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ"یعنی رِیْحَهَا. (روا ه أحمد، وأبوداود ، وابن ماجه)[1]

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے ارشادفرمایا کہ: جوشخص اس علم کو حاصل کرے جس کے ذریعہ اللہ کی رضاوخوشنودی کوطلب کیا جاتا ہے (لیکن)وہ اس کو اس غرض سے سیکھے کہ اس کے ذریعہ سے دنیا کا مال ومتاع حاصل کرے تو قیامت کے دن وہ جنت کی خوشبوبھی نہیں پائے گا۔

تشریح حدیث

اس حدیث میں بھی جیسا کہ اوپر بتایا گیا طلب علم میں اخلاص کی تعلیم دی گئی ہے کہ علم دین کی تحصیل سے اصل مقصود رضاءالٰہی ہو، فانی دنیا کا مال ومتاع مقصودنہ ہو۔

ممایبتغی به وجه الله: اس سے مرادعلمِ دین ہے،علم دنیادنیاکے لئے حاصل کرنا جائز ہے اس پر

(۱)أخرجه أبوداود فی العلم، باب فی طلب العلم لغیرالله ۲/۵۱۵.وابن ماجه فی المقدمة ۱/۲۲، وأحمد ۲/۳۳۸ الرقم: ۸٤۳۸.

یہ وعید نہیں ہے۔(۱)

لم یجد عرف الجنة: عرف، عین کے فتحہ اور راء کے سکون کے ساتھ ہے بمعنی خوشبو، یہ کنایہ ہے تحریمِ جنت سے، کہ ایسے شخص کو جنت نصیب نہ ہوگی، مگر اس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ فسادِ نیت گناہ تو ہے لیکن کفر نہیں ہے پھر تحریم جنت کیوں ہوگا؟

اس کے کئی جواب ہیں: (۱) یہ وعید مستحل پر محمول ہے۔(۲)

(۲) یہ وعید زجراً وتوبیخاً ہے کہ اگر اس شخص نے اپنی اصلاح نہ کی تو نیت کا فساد مفضی الی الکفر ہوسکتا ہے۔(۳)

(۳) عدم وجدان ریح مقید ہے یوم القیامۃ کی قید کے ساتھ اور یوم قیامت کہا جاتا ہے نفخۂ اولی سے دخولِ جنت ودخول جہنم تک کے زمانہ کو، اور معنی یہ ہیں کہ صحیح عالم دین کو دخول جنت سے پہلے یعنی میدان محشر میں ہی جنت کی خوشبو آنی شروع ہوجائے گی اور ایسا عالم جس کی غرض فاسد ہے میدان محشر میں اس خوشبو سے محروم رہے گا اگرچہ جنت کا داخلہ اس کو مل جائے گا۔(۴)

۲۱۳/۲۹: وَعَنِ ابنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْداً سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا وَأَدَّاهَا؛ فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيْهٍ، وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلٰى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ، ثَلاثٌ لايَغِلُّ عَلَيْهِنَّ قَلْبُ مُسْلِمٍ: إِخْلاصُ الْعَمَلِ لِلّٰهِ، وَالنَّصِيْحَةُ لِلْمُسْلِمِيْنَ، وَلُزُوْمُ جَمَاعَتِهِمْ، فَإِنَّ دَعْوَتَهُمْ تُحِيْطُ مِنْ وَرَائِهِمْ" (رواه الشافعي والبيهقي في "المدخل" ورواه احمد، والترمذی، وأبوداود، وابن ماجه، والدارمي عن زيد بن ثابتؓ، إلاّأنَّ الترمذي وأباداوُد لم يذكرا "ثلاث لايغل عليهن" إلى آخره)(۵)

(۱) شرح المشكاة للطيبي ۱/ ۴۲۱–۴۲۲.

(۲) هذا قول ابن حجر المكي كمافي فتح الإله ۲/ ۸۸ مطبوعه دارالكتب العلميه بيروت لبنان.

(۳) المرقاة ۱/ ۴۴۰.

(۴) كتاب الميسر للتوربشتي ۱/ ۱۰۷.

(۵) أخرجه أبوداود في "العلم" باب فضل نشر العلم ۲: ۵۱۵، والترمذی فيه باب ماجاء فی حث على تبليغ السماع ۲: ۹۴ وابن ماجه فی المقدمه، باب من بلغ علما ۱/ ۲۱ وأحمد فی مسنده ۵: ۱۸۳ الرقم ۲۱۶۳۰.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: اللہ تعالیٰ اس بندے کو تروتازہ رکھے جس نے میری بات کوسنا، اوراس کو یادکیا، اور محفوظ رکھا، اوراس کو (جس طرح سنا بعینہ اسی طرح) لوگوں تک پہنچایا، اس لئے کہ بہت سے فقہ (علم حدیث) حاصل کرنے والے فقیہ نہیں ہوتے، اور بہت سے فقہ (علم حدیث) حاصل کرنے والے اپنے سے زیادہ فقیہ کو حدیث پہنچاتے ہیں۔

اور تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے ہوتے ہوئے مسلمان کا دل خیانت نہیں کرتا ایک چیز عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کرنا، دوسرے مسلمانوں کے ساتھ بھلائی اور خیرخواہی کرنا، تیسرے مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑنا، اس لئے کہ جماعت کی دعا ان کا چاروں طرف سے احاطہ کئے رہتی ہے۔

تشریح حدیث

اصحابِ حدیث کے لئے عظیم بشارت:

اس حدیث میں حدیث کی حفاظت اوراس کی تعلیم وتبلیغ کی فضیلت کا بیان ہے، اسی کے ضمن میں تین اہم اعمال کی فضیلت مذکور ہے۔

نضر الله عبداً سمع مقالتي: ''نضر'' ضاء کی تخفیف اور تشدید دونوں طرح صحیح ہے ''نضارۃ'' سے مشتق ہے بمعنی چہرہ کی رونق، اسی لئے اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ اس شخص کو سرسبز اور شاداب رکھے یا اللہ اس کو تروتازہ رکھے، مطلب یہ ہے کہ حدیث میں مشغول شخص کو چہرہ کی رونق وشادابی کی نعمت حاصل ہوتی ہے، جوسکون اور طمانینت کا نشان ہوتا ہے، سفیان بن عیینہ سے منقول ہے: ''**ما من احد يطلب الحديث إلاو في وجهه نضرة اى بهجة صورية أو معنوية**[1]'' یعنی حدیث کے طالب ہر شخص کو چہرہ کی ظاہری یا معنوی شادابی حاصل ہوتی ہے، اور بقول بعض لوگوں میں قدرومنزلت اور برتری مراد ہے کہ لوگ اس کو عزت اور رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور بفضل الٰہی حدیث میں مشغول افراد کو یہ دونوں نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔

---

(۱) المرقاة ۱/۴۴۱.

آپ علیہ الصلوۃ والسلام کے اس قول فرمان میں دعاء وخبر ہر دو کا احتمال ہے اور ظاہری یا معنوی شادابی کی یہ نعمت اس لئے عطاء کی گئی کہ اس شخص نے بھی حدیث کو یادرکھ کر اور دوسروں تک پہنچا کے گویا اس کو زندہ وشاداب رکھا۔(۱)

فحفظها ووعاها: اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ طالب علم کو علوم حفظ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، ہرفن کا کوئی جامع ومختصر متن حفظ کرنے کی سعی کرنی چاہئے، ایسا کرنے سے اس فن کا اجمالی خاکہ ہمہ وقت ذہن میں رہے گا اور اس کے گہرے وباریک مسائل سمجھنا آسان ہوں گے اور اس میں خوب بصیرت پیدا ہوگی۔

وأداها فرب حامل فقه غير فقيه: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث حاصل کرنے کے بعد اس کو آگے پہنچانے کا حکم دیا اور اس کے فائدہ ومقصد کو بھی واضح فرمایا، وہ یہ کہ حدیث کا اصل مقصود مسائل وتعلیمات کا استنباط ہے، جس کے لئے فقہ وفہم ضروری ہے، اور اس کا ہر شخص میں ہونا ضروری نہیں، پس ایسا ہوسکتا ہے کہ حدیث حاصل کرنے والا فقیہ وفہیم نہ ہو، یا کم فقہ اور کم فہم والا ہو، جس کی وجہ سے وہ اس حدیث سے مسائل وتعلیمات کا کماحقہ استنباط نہ کرسکے اور مقصودِ حدیث فوت ہوجائے، لہذا اس کو چاہئے کہ وہ حدیث آگے پہنچادے، عین ممکن ہے کہ جس کو آگے حدیث پہنچے گی وہ پہنچانے والے شخص کے مقابلہ میں فقیہ یا اس سے افقہ ہو اور وہ حدیث سے خوب مسائل وتعلیمات کا استخراج کرے اور مقصود حدیث حاصل ہو۔

امام ابو یوسف کے تفقہ کا ایک واقعہ:

امام ابو یوسفؒ مشہور محدث سلیمان اعمش کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، ایک عورت نے آکر سلمان اعمش سے مسئلہ معلوم کیا، انہوں نے لاعلمی کا اظہار کردیا، امام ابو یوسفؒ نے سلیمان اعمش سے کہا کہ: اجازت ہوتو مسئلہ میں بتلادوں، انہوں نے اجازت دیدی، تو امام ابو یوسفؒ نے اس عورت کو مسئلہ بتادیا، جب وہ عورت چلی گئی تو سلیمان اعمش نے امام ابو یوسفؒ سے کہا کہ: تم نے یہ مسئلہ کہاں سے بتایا؟ امام ابو یوسفؒ نے کہا کہ: فلاں حدیث سے جو آپ نے ہمیں سنائی تھی، سلیمان اعمش نے کہا: یہ حدیث تو ہمیں اس وقت سے یاد ہے جب تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، مگر آج تک اس مسئلہ کی طرف ہمارا ذہن نہیں گیا،(۱)

(۱) المرقاة ۱/ ٤٤١.

(۲) المرقاة ۱/ ٤٤٠ – ٤٤١.

تو یہ واقعہ اس حدیث کی تصدیق اور اس کا ایک مظہر ہے۔

تین اعمال اور ان کی فضیلت ومنفعت:

ثلث لا یغل علیھن قلب مسلم: اس میں تین اعمال کی فضیلت اور منفعت بتائی گئی ہے: (۱)عمل کو اللہ کے لئے خالص کرنا (۲)مسلمانوں کے حق میں خیرخواہی کا جذبہ رکھنا (۳)جماعت مسلمین کو لازم پکڑنا، لزوم جماعت سے مراد ہے اعتقاد اور عمل صالح، صلوۃ جمعہ اور جماعت وغیرہ میں مسلمانوں کی موافقت کرنا۔[۱]

بالخصوص یہ آخری عمل ایسا ہے کہ اس کی برکت سے انسان شیطانی مکاید سے محفوظ رہتا ہے، کیونکہ مسلمانوں کی دعاء جماعت کے شامل حال رہتی ہے، جس کی وجہ سے شیطانی تدبیریں اثرانداز نہیں ہوتیں۔

لایغل: بفتح الیاء، بابِ ضرب سے ہے بمعنی کینہ وحسد پر ہونا، اور بضم الیاء باب افعال سے ہے بالضم بمعنی خیانت کرنا، یعنی ان تین اعمال پر ہوتے ہوئے کسی مسلمان کا قلب خیانت نہیں کرے گا اور نہ ہی اس میں حسد وکینہ پیدا ہوگا۔[۲]

حدیث کے اول وآخر میں ربط:

سوال: حدیث کے دو جملے ہیں، اول میں تبلیغ حدیث کی فضیلت ہے اور ثانی میں تین اعمال کی فضیلت ہے دونوں چیزیں بظاہر جدا جدا ہیں پھر ان دونوں میں ربط ومناسبت کیا ہے؟

جواب: ان میں کئی ربط ہیں:

(۱)اس طرف اشارہ ہے کہ تبلیغ حدیث ایسا عمل ہے جو مذکورہ تینوں اعمال کو جامع ہے یعنی تبلیغ حدیث کا منشاء ومحرک یہی صفات وجذبات ہوتے ہیں۔

(۲)اول حصہ میں تبلیغ حدیث کی فضیلت ہے اور ثانی میں ایک حدیث ذکر کردی ہے جس سے اشارہ ہے کہ اس حدیث کی تبلیغ زیادہ ہونی چاہئے۔

(۳) یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حدیث کی تبلیغ کرنے والے کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ ان صفات کو اپنے

(۱)تاریخ المشاهير از قاضي سليمان منصورپوری ص ۲۸۵.

(۲) المرقاة ۱/ ۴۴۰.

اندر پیدا کرلے، اس کے بغیر تبلیغ کا فریضہ کما حقہ اداء نہیں کیا جاسکتا۔[۱]

وروا ہ أحـمـد و الترمذی الخ :اس روایت کو امام احمد، امام ترمذی، امام ابوداود، امام ابن ماجہ اور امام دارمیؒ نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے، مگر دوفرقوں کے ساتھ، ایک یہ کہ ان حضرات نے حضرت زید بن ثابت سے اس کو روایت کیا ہے جبکہ امام بیہقی اورامام شافعیؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ امام ترمذی وامام ابوداود نے حدیث کا دوسرا جز ''ثـلاث لایـغـل'' کو حذف کردیا ہے، یعنی انہوں نے اختصار کیا ہے۔

۲۱۴ / ۳۰ : وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: نَضَّرَ اللّٰهُ اِمْرأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعَهُ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَىٰ لَهُ مِنْ سَامِعٍ. (روه الترمذي وابن ماجه[۲] ورواه الدارمي عن أبي الدرداءؓ)[۳]

تـرجـمـه : حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو تروتازہ (خوش وخرم) رکھے جس نے مجھ سے کوئی بات سنی، اورجس طرح سنی اسی طرح دوسروں تک پہنچادی، اس لئے کہ بہت سے وہ لوگ جن کو بات پہنچائی جاتی ہے وہ سننے والے کے مقابلہ میں زیادہ یادرکھنے والے ہوتے ہیں۔

تشریح حدیث

اس حدیث پاک کا مضمون بھی وہی ہے جو اس سے پہلے والی روایت کا تھا۔

مصنف کے اختیارکردہ طرز پرایک اشکال وجواب:

سوال:اس سے پہلی روایت ابن مسعودؓ سے مروی ہے اوراس روایت کے راوی بھی ابن مسعودہی ہیں ایسے موقعہ پرمصنف لفظ عنہ سے کام چلالیتے ہیں راوی کا نام ذکرنہیں کرتے، مگر یہاں مستقلاً نام ذکرکیا ہے

(۱)المرقاة ۱ / ٤٤١.

(۲)أخرجه الترمذی فی "العلم" باب ماجاء فی الحث علی تبلیغ السماع ۲ / ۹٤ وابن ماجه فی المقدمة، باب من بلغ علما ۱ / ۲۱.

(۳)أخرجه الدارمي في المقدمة، باب الاقتداء بالعلماء ۱ / ۸۱ الرقم ۲۳٤.

اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب یہ ہے کہ: مصنفؒ نے ایک وہم کے دفعیہ کے لئے ایسا کیا ہے وہ یہ کہ اس سے پہلی حدیث کا اصل حوالہ تحریر فرمانے کے بعد تخریج پر مزید کلام کرتے ہوئے بتایا کہ امام احمد، ترمذی، ابوداود وغیرہ نے اس حدیث کو زید بن ثابت سے روایت کیا ہے اب اگر یہاں عنہ کا لفظ استعمال کیا جاتا تو المرجع هو القريب کی وجہ سے کسی کو شبہ ہوسکتا تھا کہ یہ روایت زید بن ثابت سے مروی ہے اس شبہ کو دور کرنے کے لئے مصنفؒ نے یہاں لفظ ''عنہ'' استعمال نہ فرما کر ''عن ابن مسعودؓ'' فرمایا۔(۱)

فبلغه كما سمعه: اس حدیث میں روایت باللفظ کی قید ہے لہٰذا جو فضیلت یہاں مذکور ہے یہ اصلاً روایت باللفظ کی صورت میں حاصل ہوگی اگرچہ روایت بالمعنی بھی جائز ہے، اور امید ہے کہ وہ بھی اس بشارت سے محروم نہ ہوگا، کیونکہ جمہور علماء کے یہاں روایت بالمعنی بھی درست ہے۔(۲)

فرب مبلغ اوعى له من سامع: اس میں ''مبلَغ'' سے مراد شاگرد اور ''سامع'' سے مراد استاذ ہے، ''مبلَّغ'' لام کے فتحہ کے ساتھ اسم مفعول کا صیغہ ہے۔

٢١٥ / ٣١: وَعَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِتَّقُوْا الْحَدِيْثَ عَنِّيْ إِلَّامَاعَلِمْتُمْ، فَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ. (رواه الترمذي(٣) ورواه ابن ماجه(٤) عن ابن مسعود وجابر، ولم يذكر: "اتقوا الحديث عني إلا ما علمتم")

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: میری طرف سے حدیث بیان کرنے سے بچو، سوائے اس حدیث کے کہ جس کے متعلق تمہیں یقین ہو (کہ یہ سچ ہے) اور جس آدمی نے عمداً مجھ پر جھوٹ گھڑا اس کو چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔

(١) المرقاة ١/٤٤٣.

(٢) المرقاة ١/٤٤٣.

(٣) أخرجه الترمذي في التفسير، باب ماجاء في الذي يفسر القرآن برأيه ٢/١٢٣.

(٤) أخرجه ابن ماجه في المقدمه، باب التغليظ في تعمد الكذب على رسول الله صلى الله عليه وسلم. ١/٥.

تشریح حدیث

بیان حدیث میں جزم وتثبت کی تاکید اور کذب بیانی پر وعید:

ماقبل میں تبلیغ حدیث کی عظیم فضیلت بیان فرمائی لیکن اس میں اندیشہ تھا کہ کوئی اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لئے بیان حدیث میں حد سے تجاوز کر جائے اس لئے یہاں حدیث بیان کرنے میں احتیاط کا حکم دیا گیا ہے کہ جس حدیث کا تحقیق سے حدیث ہونا ثابت ہو اسی کو بیان کیا جائے۔

من كذب علي متعمداً: یہ مستقل حدیث بھی ہے اور حدیث کا ٹکڑا بھی، اور یہ حدیث متواتر ہے، تقریباً ساٹھ صحابہ سے مروی ہے، اور اس حدیث کی تشریح کتاب العلم کے شروع میں آ چکی ہے۔

۲۱٦ / ۳۱: وعنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ فِيْ الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ.

وفي رواية: مَنْ قَالَ فِيْ الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ. (رواه الترمذي)[1]

ترجمه: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جس شخص نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی اس کو چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم کو بنالے۔

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ: جس نے قرآن کی تفسیر بغیر علم کے کی اس کو چاہئے کہ وہ جہنم کی آگ کو اپنا ٹھکانا بنالے۔ (ترمذی)

۲۱۷ : ۳۲: وَعَنْ جُنْدُبٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ قَالَ فِيْ الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ" (رواه الترمذي وأبو داود)[2]

ترجمه: حضرت جندبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ

(۱) أخرجه الترمذي في التفسير، باب ماجاء في الذي يفسر القرآن برأيه ۲ / ۱۲۳.

(۲) أخرجه أبو داود في العلم، باب الكلام في كتاب الله بلاعلم ۲ / ۵۱٤ والترمذي ابواب التفسير، باب ماجاء في الذي يفسر القرآن برأيه ۲ / ۱۲۳.

علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ جس شخص نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی ، اوروہ تفسیر (اتفاق سے) صحیح اوردرست بھی ہو پھربھی اس نے غلطی کی۔(ترمذی وابوداود)

تشریح حدیث

تفسیر بالرائے کی ممانعت اوراس پر وعید:

ان دونوں حدیثوں میں تفسیر بالرائے کی ممانعت ہے، پہلی حدیث میں تفسیر بالرائے پرجہنم کی وعید بیان فرمائی اوردوسری حدیث میں فرمایا کہ قرآن کے بارے میں اگر کوئی شخص اپنی رائے سے کچھ کہے اگر اتفاقی طور پر اس کی وہ بات صحیح بھی ہو پھربھی اس نے خطا کی، اس لئے کہ وہ تفسیر کے اصول مقررہ سے ہٹ گیا۔

تفسیر بالرائے کامفہوم:

تفسیر بالرائے کا مطلب ہے تفسیر کے مسلمہ اصول اورتفسیر کے مآخذ کونظرانداز کرکے ایسی تفسیر بیان کی جائے جوقرآن وسنت اوراجماع امت کے خلاف ہو،، مآخذتفسیر چھ ہیں:

مأخذتفسیر:(۱) قرآن کریم:

تفسیر کا پہلا مأخذخودقرآن کریم ہے، علماء نے لکھا ہے:''القرآن یُفَسِّر بعضُه بعضًا'' چنانچہ ایسا بکثرت ہوتاہے کہ کسی آیت میں کوئی بات مجمل اورتشریح طلب ہوتی ہے تو خودقرآن کریم ہی کی کوئی دوسری آیت اس کے مفہوم کوواضح کردیتی ہے مثلاً سورہ فاتحہ کی دعامیں یہ جملہ موجود ہے:''**صراط الذین أنعمت علیهم** ''یعنی ہمیں ان لوگوں کے راستہ کی ہدایت کیجئے جن پرآپ کا انعام ہوا''،اب یہاں یہ بات واضح نہیں ہے کہ وہ لوگ کون ہیں جن پراللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا؟ لیکن ایک دوسری آیت میں ان کو واضح طور پرمتعین کردیا گیاہے، چنانچہ ارشاد ہے:''**فأُولئک مع الّذینَ أَنعَمَ اللهُ علیهم من النبیینَ والصّدیقین والشهداءِ والصالحین** [۱]'' وہ لوگ جن پراللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اورصالح لوگ۔

---

(۱) من سورة النساء: ٦٩.

چنانچہ مفسرین کرام جب کسی آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر خود قرآن کریم میں ہی کسی اور جگہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہوتی ہے تو سب سے پہلے اسی کو اختیار فرماتے ہیں۔

(۲) حدیث:

''حدیث'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کو کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث ہی اس لئے فرمایا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی صحیح تشریح کھول کھول کر بیان فرمادیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل دونوں سے یہ فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا، اوردرحقیقت آپکی پوری مبارک زندگی قرآن ہی کی عملی تفسیر ہے، اس لئے مفسرین کرامؒ نے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے دوسرے نمبر پرسب سے زیادہ زورحدیث پردیاہے، اوراحادیث کی روشنی میں کتاب اللہ کے معنی متعین کئے ہیں، البتہ چونکہ حدیث میں ''صحیح''، ''ضعیف'' اور''موضوع'' ہرطرح کی روایات موجود ہیں، اس لئے محقق مفسرین اس وقت تک کسی روایت کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے جب تک وہ تنقید روایات کے اصول پر پوری نہ اترتی ہو، لہٰذا جوروایت جہاں نظرآجائے اسے دیکھ کر قرآن کریم کی کوئی تفسیر متعین کرلینا درست نہیں، کیونکہ وہ روایت ضعیف اوردوسری مضبوط روایتوں کے خلاف بھی ہوسکتی ہے، لہٰذا یہ معاملہ بڑانازک ہے، اوراس میں قدم رکھنا انہی لوگوں کا کام ہے جنھوں نے اپنی عمریں ان علوم کو حاصل کرنے میں خرچ کی ہیں۔

(۳) صحابہ کے اقوال:

صحابہ کرامؓ نے قرآن کریم کی تعلیم براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی، اس کے علاوہ نزول وحی کیوقت وہ بہ نفس نفیس موجود تھے، اورانہوں نے نزول قرآن کے پورے ماحول اورپس منظر کا بذات خود مشاہدہ کیا تھا، اس لئے فطری طور پرقرآن کریم کی تفسیر میں ان حضرات کے اقوال جتنے مستند اورقابل اعتماد ہوسکتے ہیں بعد کے لوگوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا، لہٰذا جن آیتوں کی تفسیر قرآن یا حدیث سے معلوم نہیں ہوتی ان میں سب سے زیادہ اہمیت صحابہ کرامؓ کے اقوال کو حاصل ہے، چنانچہ اگرکسی آیت کی تفسیر پرصحابہؓ کا اتفاق ہوتو مفسرین کرام اسی کو اختیار کرتے ہیں اوراس کے خلاف کوئی اورتفسیر بیان کرنا جائز نہیں، ہاں! اگرکسی آیت کی تفسیر میں صحابہ کرامؓ کے اقوال مختلف ہوں توبعد کے مفسرین دوسرے دلائل کی

روشنی میں یہ دیکھتے ہیں کہ کونسی تفسیر کو ترجیح دی جائے؟ اس معاملہ میں اہم اصول اورقواعد: اصول فقہ، اصول حدیث، اوراصول تفسیر میں مدون ہیں، ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

(۴) تابعینؒ کے اقوال:

صحابہؓ کے بعد تابعینؒ کا نمبرآتا ہے، یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے قرآن کریم کی تفسیر صحابہ کرام سے سیکھی ہے، اس لئے ان کے اقوال بھی علم تفسیر میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اگرچہ اس معاملہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ تابعینؒ کے اقوال تفسیر میں حجت ہیں یا نہیں؟ لیکن ان کی اہمیت سے انکارنہیں کیا جاسکتا۔

(۵) لغت عرب:

قرآن کریم چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس لئے تفسیر قرآن کرنے کے لئے اس زبان پرمکمل عبور حاصل کرنا ضروری ہے، قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ ان کے پس منظر میں چونکہ کوئی شان نزول یا کوئی اورفقہی یا کلامی مسئلہ نہیں ہوتا، اس لئے ان کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ وتابعینؒ کے اقوال منقول نہیں ہوئے، چنانچہ ان کی تفسیر کا ذریعہ صرف لغت عرب ہوتی ہے، اورلغت ہی کی بنیاد پراس کی تشریح کی جاتی ہے، اس کے علاوہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں کوئی اختلاف ہوتو مختلف آراء میں محاکمہ کے لئے بھی علم لغت سے کام لیا جاتا ہے۔

(۶) تدبراوراستنباط:

تفسیر کا آخری مأخذ "تدبر اوراستنباط" ہے، قرآن کریم کے نکات واسرار ایک ایسا بحرنا پیدکنارا ہے، جس کی کوئی حدونہایت نہیں، چنانچہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اسلامی علوم میں بصیرت عطافرمائی ہو وہ جتنا اسمیں غوروفکر کرتا ہے اتنے ہی نئے نئے اسرار ونکات سامنے آتے ہیں، چنانچہ مفسرین کرامؒ اپنے اپنے تدبر کے نتائج بھی اپنی تفسیروں میں بیان فرماتے ہیں،لیکن یہ اسرارونکات اسی وقت قابل قبول ہوتے ہیں جبکہ وہ مذکورہ بالا پانچ مأخذ سے متصادم نہ ہوں، لہٰذا اگرکوئی شخص قرآن کی تفسیر میں کوئی ایسا نکتہ یااجتہاد بیان کرے جوقرآن وسنت، اجماع، لغت یاصحابہؓ وتابعینؒ کے اقوال کے خلاف ہو یاکسی دوسرے شرعی اصول سے ٹکراتا ہوتو اس کا کوئی اعتبارنہیں، بعض صوفیاؒ نے تفسیر میں اس قسم کے اسرارو نکات بیان کرنے شروع کئے تھے،لیکن امت کے محقق علماء نے انھیں قابل اعتبارنہیں سمجھا، کیونکہ قرآن وسنت اورشریعت کے

بنیادی اصولوں کے خلاف کسی کی شخصی رائے ظاہر ہے کہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اور ایسی ہی تفسیر جو قرآن وسنت اور اجماع امت کے خلاف اور مذکورہ بالاماٰ خذ سے متصادم ہو "تفسیر بالرائے" کہلاتی ہے۔(۱)

۲۱۸ / ۳۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "اَلْمِرَاءُ فِي الْقُرْآنِ كُفْرٌ" (رواه أحمد وأبو داود)(۲)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قرآن میں جھگڑنا کفر ہے۔

تشریح حدیث

جدال فی القرآن؛ کفر:

اس حدیث پاک میں جدال فی القرآن کی ممانعت فرمائی گئی ہے بلکہ اس کو کفر قرار دیا ہے۔

المراء فی القرآن: قاضی بیضاوی نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تکذیب کی نیت سے بعض آیات کو بعض سے ٹکرایا جائے اور آیات کا باہم تعارض ثابت کیا جائے اور پھر قرآن کریم کو یہ کہکر چھوڑ دیا جائے کہ اس متضاد اور متعارض کلام پر کیسے عمل کریں یہ کفر ہے، اس لئے کہ ترک قرآن کفر ہے، اور اگر واقعی تعارض محسوس ہو تو اسکا حل حتی الامکان تطبیق دینا یا اپنی کم علمی کا اعتراف ہے نہ کہ اس کی تکذیب اور اس کو ترک کر دینا۔(۳)

اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا کہ: اس سے مراد یہ ہے کہ کسی منصوص وقطعی حکم کو محض کسی شبہ کی بناء پر ترک کر دیا جائے اور یہ بھی کفر ہے۔(۴)

۲۱۹ / ۳٤: وَعَنْ عَمْرِو بنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ: سَمِعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَوْماً يَتَدَارَؤُونَ فِي الْقُرْآنِ فَقَالَ: "إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِهٰذَا: ضَرَبُوا كِتَابَ اللّٰهِ بَعْضَهُ بِبَعْضٍ، وَإِنَّمَا نَزَلَ كِتَابُ اللّٰهِ يُصَدِّقُ بَعْضُهُ بَعْضاً فَلَاتُكَذِّبُوا

(١) الإتقان ٢/١٨٤، معارف القرآن ١/٥٠-٥٢.

(٢) أخرجه أبوداود في كتاب السنة، باب النهي عن الجدال في القرآن ٢/٦٢٣. وأحمد ٢/٤٢٤ الرقم ٩٤٧٤.

(٣) تحفة الابرار ١/٢١٣.

(٤) التعليق الصبيح ١/١٥٥ بحواله حجة الله البالغة.

بَـعْـضَهُ بِبَعْضٍ، فَمَاعَلِمْتُمْ مِنْهُ فَقُوْلُوْا وَمَاجَهِلْتُمْ فَكِلُوْهُ إِلى عَالِمِهِ"(رواه أحمد وابن ماجه)(۱)

ترجمه: حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم کے متعلق سنا کہ وہ قرآن کے سلسلے میں آپس میں جھگڑ رہے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ سن کر) ارشاد فرمایا کہ: اسی وجہ سے (یعنی کتاب اللہ میں جھگڑے کے سبب) تم سے پہلے لوگ ہلاک ہوئے کہ انہوں نے کتاب اللہ کے بعض کو بعض سے ٹکرایا، حالانکہ اللہ کی کتاب اس طرح نازل ہوئی ہے کہ اس کا بعض بعض کی تصدیق کرے پس تم اس کے بعض کی بعض کے ذریعہ تکذیب نہ کرو، اس کے متعلق جتنا تم کو علم ہو اتنا بیان کرو اور جس کا علم نہ ہو اس کو اس کے عالم کے حوالہ کرو۔

تشریح حدیث

غیر عالم کو قرآن کریم میں رائے زنی کی ممانعت اور اہل علم سے رجوع کی تاکید:

اس حدیث میں گذشتہ حدیث کا مضمون کچھ تفصیل ووضاحت کے ساتھ مذکور ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کے بارے میں سنا کہ انھوں نے کتاب اللہ کے بعض حصے کو بعض کے مخالف بتایا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہو چکے ہیں، کہ انھوں نے کتاب اللہ کے بعض حصے کو بعض کے مخالف بتایا تھا، حالانکہ اللہ کی کتاب اس طرح نازل ہوئی ہے کہ بعض بعض کی تصدیق کرتی ہے، پھر فرمایا کہ اگر تمھیں کہیں تعارض نظر آ رہا ہو اس میں تطبیق کی کوشش کرو، اور اگر تمھیں اتنا علم نہیں تو اس کو اس کے عالم کے حوالے کردو۔

يتدارؤن في القرآن: يتدارؤن باب تفاعل سے ہے اور ''درأ'' سے مشتق ہے بمعنی تدافع، یعنی ایک دوسرے کی بات کی تردید کرنا، مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ قرآن کریم کی بعض آیات کو دوسری بعض آیات کے مخالف قرار دیکر ان کی تکذیب کر رہے تھے، یا یہ کہ ہر ایک اپنے نظریات قرآن کریم سے ثابت کر رہا تھا اور دوسرا قرآنِ کریم سے ہی اس کی تردید کر رہا تھا اور مقصد دونوں کا قرآنِ کریم کی تکذیب تھا، نہ

(۱)أخرجه ابن ماجه في المقدمه، باب القدر ۱/ ۹ الرقم ۸۵ وأحمد في مسنده ۲: ۱۸۵ الرقم ۶۷۴۱.

کہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل۔

وإنما نزل كتاب الله: یعنی قرآنِ کریم کی آیات باہم متعارض نہیں بلکہ ایک دوسرے کی مؤید ہیں اگر متعارض محسوس ہوں تو وہ ہماری کم فہمی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے رسوخ فی العلم عطا فرمایا ہے ان کو تعارض محسوس نہیں ہوتا۔

حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر قرآن میں مہارت:

حضرت ابن عباسؓ دفع تعارض میں بہت ماہر تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دعادی تھی ''اللهم فَقِّهْهُ في الدينِ وعَلِّمْهُ التاويلَ'' یعنی اے اللہ ان کو دین کا فہم اور تفسیر کا علم عطاء فرما، اس دعاء کا اثر یہ تھا کہ آپ ''ترجمان القرآن'' کے لقب سے مشہور ہوئے، اور قرآن کریم کی تفسیر اور اس کے حل کے لئے بڑے بڑے صحابہ آپ سے رجوع کرتے تھے۔

ایک مرتبہ اُن سے لوگوں نے سوال کیا کہ: قرآن کریم کی دوآیتوں میں تعارض ہے، ایک آیت میں مشرکین کا مقولہ ہے: ''والله ربنا ماكنا مشركين ''اور دوسری آیت میں ہے''وَلايَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثاً''؟ پہلی آیت کا حاصل یہ ہے کہ وہ اپنے شرک کو چھپائیں گے اور دوسری آیت میں ہے کہ وہ اللہ سے کچھ مخفی نہیں رکھ سکیں گے؟

حضرت ابن عباسؓ نے تطبیق بیان فرمائی کہ: ابتداً امیدِ نجات میں وہ شرک کو چھپائیں گے اور کہیں گے''والله ربنا ماكنا مشركين '' پھر اللہ تعالیٰ ان کی زبان پر مہر لگادیں گے جس کا بیان اس آیت میں ہے: فرمائیں گے''اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلِهِمْ بِمَاكَانُوْا يَكْسِبُوْن '' پھر ان کے اعضاء وجوارح ان کی بداعمالیاں بیان کریں گے، چنانچہ آخر کار وہ اقرار کرلیں گے، تو''وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَاكُنَّا مُشْرِكِيْنَ '' میں ابتداء کی بات بیان کی گئی ہے اور''وَلايَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا'' میں اخیر حالت کا بیان ہے۔[1]

اسی طرح قرآن کریم میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:''وَمَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمَنْ نَفْسِكَ'' جس کا حاصل یہ ہے کہ اچھی حالت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور بری حالت خود انسان کی پیدا کردہ، اور دوسری جگہ ارشاد ہے:''كل من عندالله'' کہ ہر طرح کی حالت

(۱) المرقاة ۱ / ٤٥٠.

اللہ کی طرف سے ہے تو بظاہر دونوں میں تعارض ہے؟

اس میں تطبیق یہ ہے کہ ''کل من عندالله'' میں خلق وتقدیر کا بیان ہے اور مااصابک میں سبب ظاہری کو بیان کیا گیا ہے۔ (۱)

پس قرآن کریم میں بظاہر کچھ تعارض محسوس ہوتا ہے لیکن ذرا بھی تفکر اور تدبر سے کام لیا جائے تو وہ ختم ہوجاتا ہے۔

''**فما علمتم منه فقولوا وماجهلتم فكلوه الى عالمه**'' یعنی ایسے موقعہ پر یا تو خود تدبر کرو وہ تعارض حل ہوجائے گا اور اگر خود حل نہ ہوسکے تو اہل علم کے حوالہ کردو وہ اپنے علم کی روشنی میں اس کو حل کردیں گے۔

۲۲۰ / ۳۵: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ''أُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ، لِكُلِّ اٰيَةٍ مِنْهَا ظَهْرٌ وَبَطْنٌ، وَلِكُلِّ حَدٍّ مُطَّلَعٌ'' راوه في شرح السنة. (۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: قرآن سات لغات پر نازل کیا گیا ہے، اوران میں سے ہرآیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے، اور ہرحد کے لئے ایک خبر مطلع ہونے کی جگہ ہے۔ (شرح السنۃ)

تشریح حدیث

اہمیتِ حدیث:

یہ حدیث بہت اہم ہے اور یہ متفق علیہ روایت ہے بلکہ ابن ماجہ کے علاوہ جملہ صحاح ستہ میں موجود ہے اور معناً متواتر ہے، ابن حجر مکیؒ نے فرمایا اس حدیث شریف کا جزء اول ۲۱ صحابہ سے مروی ہے، لہذا یہ حدیث لفظاً بھی متواتر ہے۔ (۳)

(۱) تحفة الابرار ۱ / ۲۱۴، والمفاتيح ۱ / ۳۲۹.

(۲) أخرجه البغوي في شرح السنة، كتاب العلم باب الخصومة في القرآن ۱ / ۲۱۴ الرقم ۱۲۲.

(۳) فتح الإله ۲ / ۱۰۴.

اس حدیث میں بہت سی ابحاث ہیں، اُوجز المسالک میں حضرت شیخؒ نے دس بحثیں ذکرفرمائی ہیں سب سے نازک اوراہم بحث اس میں تحقیق معنی کی ہے کہ ''سبعۃ احرف'' سے کیا مراد ہے۔

قرآن کریم کاسبعۃ احرف پرنزول اوراس کی مراد:

اس میں علماء کا بہت اختلاف ہے علامہ ابن العربی نے ۳۵ اورامام سیوطی نے ۴۰؍اقوال بیان فرمائے ہیں ان میں سے مشہوراقوال یہ ہیں۔

(۱) بعض نے کہا کہ یہ حدیث متشابہات میں سے ہے، اس کی مراد ہمیں معلوم نہیں، اس لئے کہ حرف متعدد معنی میں استعمال ہوتا ہے حرف ہجا: الف، با، تاوغیرہ، کلمہ، جہت، یہاں حرف سے کیامراد ہے؟ معلوم نہیں۔

(۲) بعض نے کہا کہ ''سبعۃ'' کے معنی سات اور ''احرف'' سے مراد مضامین ہیں، یعنی قرآن سات قسم کے مضامین پرنازل ہواہے اوروہ یہ ہیں: (۱) عقائد (۲) احکام (۳) اخلاق (۴) قصص (۵) وعدہ (۶) وعید (۷) امثال۔

(۳) بعض نے کہا ''سبعۃ'' سے مراد سات اور ''احرف'' سے متواتر قرات مراد ہے، اورمعنی یہ ہیں کہ قرآن سات متواتر قرأتوں پرنازل ہواہے مگر یہ قول صحیح نہیں ہے اس لئے کہ متواترقرأت محض سات نہیں بلکہ دس ہیں، سات اس لئے مشہور ہوگئیں کہ علامہ ابن مجاہد نے اپنے ایک رسالہ میں سات کوجمع فرمایا ہے لیکن ان کامقصود انحصارکرنانہیں تھا۔

(۴) قاضی عیاض اور شاہ ولی اللہ نے فرمایا کہ ''سبعۃ'' سے مراد کثرت اور ''احرف'' سے مرادقرأت ہے اورمطلب یہ ہے کہ قرآن بہت سی متواترقراءتوں پرنازل ہواہے اوروہ دس ہیں۔

(۵) ابن جریرطبری نے فرمایا کہ اس سے قبائل عرب کی سات لغات مراد ہیں، عربی زبان ایک وسیع زبان ہے جس میں علاقائی طورپرفرق پایاجاتاہے، جیسے اردوزبان میں علاقائی طورپرفرق ہے، قرآن کا اصل نزول لغت قریش کے مطابق ہواتھا لیکن دیگرقبائل کے لئے اس لغت میں پڑھنا دشوارتھا، اس لئے ان کو اپنی لغات میں پڑھنے کی اجازت دی گئی، اوروہ سات قبائل یہ ہیں: (۱) قریش (۲) طی (۳) ہوازن (۴) ثقیف (۵) اہل یمن (۶) ہذیل (۷) بنوتمیم، مشہورقبائل یہی ہیں، پھرجب قرآنی زبان کادائرہ بڑھ گیا

اورلغت قریش پر پڑھنا آسان ہوگیا تو صرف اس کو باقی رکھا گیا اور باقی کو منسوخ کردیا گیا۔

(٦) امام مالکؒ اور علامہ جزریؒ نے فرمایا کہ اس سے مراد اختلاف قرات کی سات نوعیتین ہیں اور وہ یہ ہیں:

(١) اسماء کا اختلاف، اس میں افراد، تثنیہ، جمع کا اختلاف بھی داخل ہے جیسے تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ اورایک قرات ہے تَمَّتْ كَلِمَاتُ رَبِّكَ.

(٢) افعال کا اختلاف، جیسے ربَّنَا بَاعَدَ بَيْنَ اَسْفَارِنَا اور رَبَّنَا بَاعِدْ.

(٣) وجوہ اعراب کا اختلاف، جیسے ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ اور ذِی الْعَرْشِ الْمَجِيْدِ.

(٤) الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف، جیسے وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ و الأنثى اور ایک قراءت کے مطابق صرف والذكر و الأنثى ہے۔

(٥) تقدیم وتاخیر کا اختلاف، جیسے جَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ، اور ایک قرات میں جَاءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ.

(٦) بدلیت کا اختلاف، یعنی ایک قراءت میں ایک لفظ ہے اور دوسری قراءت میں اس کے بجائے دوسرا جیسے نُنْشِزُهَا اور دوسری قرأت میں ہے نَنْشُرُهَا۔

(٧) لہجوں کا اختلاف، اس میں مد، قصر، امالہ، تفخیم، ترقیق وغیرہ سب داخل ہیں۔[1]

اس حدیث کی تفسیر میں یہ چھٹا قول راجح ہے، اور اس پر کوئی خاص اشکال بھی نہیں ہوتا، باقی پر کچھ نہ کچھ اشکالات ہیں۔

آیات قرآن کا ظاہر و باطن:

لكل أية منها ظهر و بطن: اس کی ہر آیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے ''ظہر وبطن'' سے کیا مراد ہے اس میں بھی کئی قول ہیں:

(١) ''ظہر'' سے مراد الفاظ اور 'بطن'' سے مراد معانی۔

(٢) ظہر سے مراد ظاہر التفسیر اور معروف المعنی آیات اور ''بطن'' سے مراد وہ آیات جن کی تفسیر خفی اور جن کا مضمون مشکل ہے۔

(١) شرح المشكاة للطيبي ١ / ٤٣٢، ٤٣٣، وفتح الإله ٢ / ١٠٤ - ١٠٩، والمرقاة ١ / ٤٥١ - ٤٥٦.

(۳) ''ظہر'' سے مراد ظاہری معنیٰ اور بطن سے اسرار ونکات مراد ہیں یہی قول راجح ہے۔
(۴) ''ظہر'' سے مراد وہ معانی جو نفس الفاظ سے سمجھ میں آجاتے ہیں اور ''بطن'' سے مراد وہ دقیق احکام ومسائل جن کے لئے قوت اجتہاد چاہئے، یہ مفہوم بھی قرین قیاس ہے۔(۱)

ولکل حدمطّلع: ''مطلع'' اسم ظرف ہے، بمعنی وہ جگہ جہاں سے چڑھ کر دیکھا جائے، مراد ذریعۂ اطلاع ہے، اور ''حد'' میں تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے، تقدیر عبارت یہ ہے: **ولکل حدمنهما (ای من الظهر و البطن) مطلع**، یعنی ظاہر اور باطن میں سے ہر ایک کی حد کا ایک ذریعۂ اطلاع ہے، مطلب یہ ہے کہ ظاہر اور باطن میں ہر ایک کی ایک حد ہے اور ہر حد کا ایک ذریعۂ اطلاع ہے، ظاہری معنی کا ذریعۂ اطلاع: ''علوم تفسیر یہ'' میں درک اور کمال ہے، اور باطنی معنی کا ذریعۂ اطلاع: تزکیہ نفس اور علم پر عمل ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''**من عمل بماعلم علمه الله علم مالم يعلم**''(۲)

۳٦/٢٢١: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلْعِلْمُ ثَلَاثَةٌ: اٰيَةٌ مُحْكَمَةٌ، أَوْسُنَّةٌ قَائِمَةٌ، أَوْفَرِيْضَةٌ عَادِلَةٌ، وَمَاكَانَ سِوَى ذٰلِكَ فَهُوَ فَضْلٌ. (رواه أبو داود و ابن ماجه)(۳)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: علم تین ہیں (۱) آیاتِ محکمہ (۲) سنتِ ثابتہ (۳) فریضۂ عادلہ، اور ان کے علاوہ جو کچھ ہے وہ زائد ہے۔ (ابوداود وابن ماجہ)

تشریح حدیث

علوم شرعیہ اور ان کا مصداق:

اس حدیث میں شریعت کے بنیادی علوم بتائے گئے ہیں کہ شریعت کے بنیادی علوم تین علوم ہیں:
(۱) آية محكمة کا علم، ''محکمات'' کی قید لگا کر متشابہات کو نکال دیا کیونکہ ان سے استدلال نہیں

(۱) طيبي ١/٤٣٥، وفتح الإله ٢/١٠٩–١١٠.
(۲) المرقاة ١/٤٥٤ وقد مر تخريج هذا الحديث.
(۳) أخرجه أبوداود في الفرائض، باب ماجاء في تعليم الفرائض ٢/٣٩٩ وابن ماجه في المقدمة، باب اجتناب الرأي والقياس ١/٦ الرقم ٥٤.

کیا جاتا ہے۔

(۲)او سنة قائمة ای معمولة بها یعنی ایسی احادیث کا علم جو معمول بہا ہوں ''قائمۃ'' کی قید سے منسوخ کو نکال دیا گیا۔

(۳)او فریضة عادلة ،انصاف کرنے والا فریضہ، اس سے مراد ہے قرآن وسنت سے مستنبط ہونے والا فقہی مسئلہ، فقہی مسئلہ کو ''فریضۃ'' اس لئے کہا کہ اس پر عمل واجب ہے اوراس کے ذریعہ معاشرہ میں انصاف قائم ہوتا ہے اس لئے اس کو ''عادلۃ'' کہا، اور بعض علماء نے کہا ہے کہ ''فریضۃ عادلۃ'' سے مراد اجماع اور قیاس ہیں، کیونکہ دونوں قرآن وسنت پر ہی مبنی ہوتے ہیں، پس ان ادلۂ اربعہ کا علم اور جو علوم ان سے مستنبط ہیں یہی شرعی علوم ہیں کہ شریعت کا علم انہی سے حاصل ہوتا ہے، باقی چیزیں علوم شرعی کا مصداق نہیں۔

وما کان سوی ذلک فهو فضل :ان علوم کے علاوہ جو علوم ہیں وہ ''فضل'' ہیں یعنی منجانب شرع فی نفسہ لازم نہیں، البتہ وسیلہ ہونے کے لحاظ سے بعض علوم ضروری ہوسکتے ہیں جیسے نحو صرف معانی بیان وغیرہ۔

۲۲۲ / ۳۷: وَعَنْ عَوْفِ بنِ مَالِكٍ الْأَشْجَعِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لايَقُصُّ إلاأَمِيْرٌ أَوْمَأْمُوْرٌ أَوْمُخْتَالٌ. (رواه أبو داو [۱] ورواه الدارمي [۲] عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده وفي روايته: "أو مراء" بدل "او مختال")

ترجمه : حضرت عوف بن مالک الأشجعیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: وعظ ونصیحت تین آدمی ہی کرتے ہیں (۱) امیر (۲) مأمور (۳) متکبر، اس حدیث کو امام أبوداودؒ نے روایت کیا ہے۔

اور امام دارمیؒ نے اس کو ''عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده'' کے طریق سے روایت کیا ہے، اور دارمی کی روایت میں لفظ ''مختال'' کے بجائے لفظ ''مراء'' واقع ہوا ہے ''جس کے معنی ہیں ریاکار''۔(ابوداود، داری)

(۱) أخرجه أبو داود في العلم، باب في القصص ۲/ ۵۱۵.

(۲) أخرجه الدارمي في الرقاق، باب النهي عن القصص ۲/ ۷۷۵ الرقم ۲٦۷۷.

تشریح حدیث

ہر شخص وعظ ونصیحت کے لئے آگے نہ بڑھے:

اس حدیث میں وعظ کا ادب بتایا کہ وعظ اخلاص کے ساتھ ہونا چاہئے، اس میں ریاونمود نہ ہو۔

لایقص : بمعنی قصہ بیان کرنا، مراد ہے وعظ کہنا نصیحت کرنا، اس لئے کہ قصہ بیانی سے مقصود نصیحت ہوتی ہے، حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تین قسم کے لوگ وعظ کہتے ہیں ان میں سے دو کے اندر اخلاص ہوتا ہے ایک میں نہیں، امیر اپنی رعایا کو وعظ کہے تو یہ اخلاص پرمبنی ہوتا ہے کیونکہ اپنی رعایا کو اور اپنے ماتحتوں کو نصیحت کرنا حاکم کے فرائض منصبی میں داخل ہے لہٰذا وہ اخلاص ہی کے ساتھ کرے گا، یا پھر وعظ کہے گا حاکم کا مامور، جیسے اسلامی حکومتوں میں امر بالعروف ونہی عن المنکر کا شعبہ ہوتا ہے[1] شراح نے فرمایا کہ اس دوسری قسم میں علماء بھی داخل ہیں، "**لان العلماء ورثة الانبیاء**"، ان کے علاوہ جو وعظ کہتا ہے عموماً اس میں تکبر ہوتا ہے پس جو نہ امیر ہو اور نہ مامور وہ اس پر اقدام نہ کرے۔

۲۲۳/۳۸: وَعَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ أُفْتِيَ بِغَیْرِ عِلْمٍ كَانَ إِثْمُهُ عَلٰی مَنْ أَفْتَاهُ، وَمَنْ أَشَارَ عَلٰی أَخِیْهِ بِأَمْرٍ یَعْلَمُ أَنَّ الرُّشْدَ فِيْ غَیْرِهٖ فَقَدْ خَانَهُ" (رواه ابوداود)[2]

ترجمه : حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: جس شخص کو بغیر علم کے فتویٰ دیا گیا تو اس کا گناہ مفتی پر ہوگا، اور جس شخص نے اپنے مسلمان بھائی کو ایسے کام کا مشورہ دیا جس کے بارے میں اس کو علم ہے کہ بھلائی اس کے علاوہ صورت میں ہے تو اس نے اس کے ساتھ خیانت کی۔ (ابوداود)

تشریح حدیث

مفتی کو تحقیق اور مستشار کو صحیح رہنمائی کی تاکید:

اس حدیث میں مفتی اور مستشار کو نصیحت کی گئی ہے مفتی کو بلاتحقیق مسئلہ نہ بتانا چاہئے اور مستشار کو

(۱) المرقاة ۱/۴۵۸.

(۲) أخرجه أبوداود في كتاب العلم، باب التوقي في الفتيا ۲/۵۱۵.

خیر و بھلائی کی جانب ہی رہنمائی کرنی چاہئے۔

من أفتی بغیر علم: ''اُفتِيَ''، فعل ماضی مجہول ہے اِفتاء سے اور ''افتاء'' باب افعال کا مصدر ہے بمعنی کسی مسئلہ کا جواب دینا، پھر اس میں تخصیص ہوئی اور صرف دینی مسئلہ کے جواب دینے کو افتاء کہا جانے لگا، مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو دینی و شرعی حکم غلط بتایا تو اس کا گناہ مفتی پر ہوگا، البتہ اگر مفتی نے صحیح حکم معلوم کرنے کے لئے حتی الوسع سعی کی پھر بھی خطا ہوگئی تو اس وقت گناہ نہیں ہوگا، یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ فتویٰ دینے والا فی نفسہ اس کا اہل ہو، لیکن اگر کوئی شخص نااہل ہونے کے باوجود افتاء پر جرأت کرے تو ہر حال میں گنہگار ہوگا، اسی طرح اگر کوئی نااہل سے سوال کرے تو سائل بھی گناہ گار ہوگا۔

و من أشار علی أخیه: یعنی جس سے مشورہ طلب کیا جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ خیر والی بات کا مشورہ دے، چاہے مشورہ طلب کرنے والا دشمن ہی کیوں نہ ہو، لہذا جس پہلو میں خیر محسوس ہو اگر اس کے علاوہ دوسرے پہلو کا مشورہ دیا تو خائن شمار ہوگا۔

۲۲۴ / ۳۹: وَعَنْ مُعَاوِيَةَؓ قَالَ: إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الْأُغْلُوْطَاتِ. (رواه ابو داود)(۱)

ترجمہ: حضرت معاویہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نادر اور پیچیدہ مسائل (کے بارے میں سوال کرنے) سے منع فرمایا۔ (ابوداود)

تشریح حدیث

بے فائدہ اور پیچیدہ سوال کی ممانعت:

اس حدیث میں عوام کو نصیحت ہے کہ علماء سے سوال کرنے میں نیت استفادہ کی کریں، بے فائدہ اور پیچیدہ باتوں کا سوال نہ کیا جائے، جس سے مقصود مسئول کو ذلیل کرنا اور اپنی علمی برتری ظاہر کرنا ہو، البتہ اگر مخاطب کی فہم کو پرکھنا مقصود ہو تو پھر پیچیدہ بات کا سوال کیا جا سکتا ہے، جیسے امتحان میں ہوتا ہے، یہ چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہؓ سے فرمایا: ایسا درخت بتاؤ جس کے پتے نہیں جھڑتے اور جو مسلمان کے مانند ہے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی جواب مرحمت

(۱) أخرجه ابو داود فی العلم، باب التوقی فی الفتیا ۲ / ۵۱۵.

فرمایا کہ وہ: کھجور کا درخت ہے۔

شراح نے فرمایا کہ بے جا سوال ابتداءً ناجائز ہے، اس لئے کہ یہ سبب ایذاء ہے اور ایذاء پہنچانا حرام ہے، نیز بے جا سوال کرنا فتنہ وعداوت کا سبب ہے اور اس میں ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ اپنی برتری کا اور دوسرے کے نقص کا اظہار ہے، مگر جواباً وجزاءً ایسا سوال کرنا جائز ہے ''لقوله تعالىٰ وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا''۔ (۱)

اغلوطات: اغلوطۃ کی جمع ہے، بمعنی پیچیدہ سوال، مشکل بات، فارسی میں اس کو چیستاں کہا جاتا ہے۔

> ۲۲۵ / ٤٠ : وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ''تَعَلَّمُوْا الْفَرَائِضَ وَالْقُرْآنَ وَعَلِّمُوا النَّاسَ فَإِنِّيْ مَقْبُوْضٌ''(رواه الترمذي)(۲)
>
> **ترجمه**: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: تم فرائض (اسلام) اور قرآن سیکھو، اور دوسروں کو بھی سکھاؤ، اس لئے کہ میری روح تو قبض کر لی جائے گی۔ (ترمذی)

تشریح حدیث

تحصیلِ علم میں جلدی کرنے کی ترغیب:

اس حدیث میں جلد علم حاصل کرنے کی ترغیب ہے کہ مجھ سے علوم جلدی حاصل کرو، اس لئے کہ ایک وقت آئے گا کہ میری وفات ہو جائے گی پھر یہ موقعہ نکل جائے گا۔

تعلموا الفرائض: فرائض کی مراد میں کئی قول ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ اس سے مراد علم فرائض (علم میراث) ہے۔

(۲) بعض نے کہا تمام احکام ضروریہ مراد ہیں یہی قول راجح ہے۔

(۳) بعض نے کہا کہ وہ فرائض مراد ہیں جو اوامر ونواہی پر مشتمل ہیں، فرائض کے ساتھ قرآن کا تذکرہ اس لئے کیا کہ قرآن تمام احکام کی بنیاد ہے۔ (۱)

---

(۱) المرقاة ۱ / ٤٥٩.

(۲) رواه الترمذی فی سننه: کتاب الفرائض، باب ماجاء فی تعليم الفرائض، ۲ / ۲۹.

(۳) المرقاة ۱ / ٤٥٩.

۲۲۶/ ۴۱: وَعَنْ اَبِیْ الدَّرْدَاءِؓ قَالَ: کُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَشَخَصَ بِبَصَرِهٖ إِلَی السَّمَاءِ، ثُمَّ قَالَ: "هٰذَا أَوَانٌ یُّخْتَلَسُ فِیْهِ الْعِلْمُ مِنَ النَّاسِ حَتّٰی لَایَقْدِرُوْا مِنْهُ عَلٰی شَیْءٍ"(رواه الترمذی)(۱)

ترجمہ: حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی اورارشاد فرمایا کہ: یہ ایساوقت ہے جس میں علم (وحی) لوگوں کے درمیان سے اٹھالیاجائے گا یہاں تک کہ وہ اس کے کسی حصہ پربھی قدرت نہ رکھیں گے۔

تشریح حدیث

علم کے اٹھ جانے کی پیش گوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی وفات کا اشارہ:

اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کے اٹھ جانے کی پیش گوئی فرمائی ہے اور اس کی ابتدا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ہوگی۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھاکر فرمایا کہ عنقریب وہ وقت آرہا ہے جس میں لوگوں سے وحی کو اٹھالیا جائے گا، یعنی میری وفات ہوجائے گی، جس کی وجہ سے وحی کا سلسلہ بند ہوجائے گا، اور پھر ایک وقت وہ آئیگا کہ علم اور دین سارا ہی اٹھ جائے گا۔

فشخص ببصرہ: "شَخَصَ" باب فتح سے ہے بمعنی بلند کرنا، "اوان" بمعنی وقت، "یختلس" اختلاس سے ہے بمعنی چھین لینا، اچانک لے لینا، "**العلم**" اس سے مراد "وحی الٰہی" ہے۔

۲۲۷/ ۴۲: وَعَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَؓ رِوَایَةً: "یُوْشِکُ أَنْ یَّضْرِبَ النَّاسُ أَکْبَادَ الإِبِلِ یَطْلُبُوْنَ الْعِلْمَ، فَلَایَجِدُوْنَ أَحَداً أَعْلَمَ مِنْ عَالِمِ الْمَدِیْنَةِ"(رواه الترمذي، و في جامعه: قال ابن عيينة: إنه مالكُ بنُ أنس، ومثله عن عبدالرزاق وقال إسحاق بن موسى: وسمعت ابن عيينة أنه قال: هو العمري الزاهد، واسمه: عبدالعزيز بن عبدالله.(۲)

(۱) أخرجه الترمذي في العلم، باب ماجاء في ذهاب العلم ۲/ ۹۴

(۲) أخرجه الترمذي في العلم، باب ماجاء في عالم المدينة ۲/ ۹۷.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ وہ وقت قریب ہے کہ لوگ اونٹوں کے جگروں کو ماریں گے (سفر کریں گے) کہ وہ علم کوتلاش کریں گے چنانچہ وہ عالم مدینہ سے بڑا کوئی عالم نہیں پائیں گے۔ (ترمذی)

اور جامع ترمذی میں ابن عیینہ سے منقول ہے کہ عالمِ مدینہ سے مراد حضرت امام مالک بن انس ہیں اور عبدالرزاق سے بھی یہی منقول ہے، اسحاق بن موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عیینہؒ سے یہ سنا کہ ''عالم مدینہ'' سے مراد'' عمری الزاہد'' ہیں، جن کا نام عبدالعزیز بن عبداللہ ہے۔

تشریح حدیث

مدینہ میں ایک عالم پیدا ہونے کی پیشین گوئی:

اس حدیث میں عالم مدینہ کی فضیلت مذکور ہے کہ ایک زمانہ ایسا ہوگا کہ لوگ تحصیل علم کیلئے مختلف مقامات کے لمبے لمبے سفر کریں گے لیکن ''عالم مدینہ'' سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں پائیں گے۔

عن ابی هريرة رواية: روایةً کے صیغہ سے حدیث کا مرفوع ہونا بیان کیا جاتا ہے کہ جو مضمون بیان کیا جارہا ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے نہ کہ صحابی کا، یہاں روایةً کہنے والے ابوہریرہؓ کے شاگرد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے یہ مضمون بیان کیا، شاگرد کو پختہ طور پر یاد نہیں رہا کہ ان کے استاذ ابوہریرہؓ نے اس موقعہ پر قال رسول اللہ کہا تھا یا سمعت رسول اللہ کہا اس لئے شاگرد نے احتیاط پر عمل کرتے ہوئے رفع کے صریح صیغہ کے بجائے رفع کا مفہوم ادا کرتے ہوئے ''روایةً'' کا صیغہ استعمال کیا۔

ان يضرب الناس أكباد الأبل: ''اکباد'' کبد کی جمع ہے بمعنی جگر، اونٹوں کے جگر کو مارنے سے مراد اونٹ کو تیز چلانا ہے کہ اونٹ کو تیز چلانے کے لئے ایڑھ لگائی جاتی ہے اور وہ اس کے جگر پر لگتی ہے، جس سے وہ تیز دوڑتا ہے۔

عالم مدینہ کی مراد:

امام ترمذی نے اس حدیث کو روایت کیا اور فرمایا کہ: سفیان بن عیینہ نے فرمایا کہ اس سے مراد امام

مالکؒ ہیں جو امام مجتہد اور حدیث کی مشہور کتاب ''مؤطا شریف'' کے جامع ومؤلف ہیں، آپ اپنے زمانے میں مدینہ کے بڑے عالم تھے، عبدالرزاق سے بھی عالم مدینہ کا مصداق یہی نقل کیا گیا ہے۔

مگر محدث اسحاق بن موسیٰ نے ابن عیینہ سے دوسرا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد عمری الزاہد ہیں، پھران کی مراد میں دو قول ہیں:

(۱)ان سے مراد عبدالعزیز بن عبداللہ ہیں یہ حضرت عمرؓ کے پڑپوتے تھے اور دنیا سے بے رغبت تھے اس لئے ان کو عمری الزاہد کہا جاتا ہے۔

(۲)اس سے مراد عمر بن عبدالعزیز ہیں کہ وہ بھی والدہ کی طرف سے عمری ہیں اور وہ بھی زاہد فی الدنیا تھے، مگر یہ قول مرجوح ہے اس لئے کہ عمر بن عبدالعزیز اہل شام میں سے ہیں اور یہاں فضیلت اہل مدینہ کی مذکور ہے۔[1]

۲۲۸ / ۴۳ : وَعَنْهُ فِيمَا أَعْلَمُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِأَةِ سَنَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ لهادِيْنَها. (رواه أبو داود)[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھے جو علم حاصل ہے اس میں سے یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس امت کے (نفع کے) لئے ہر صدی کے سرے پر ایسے شخص کو بھیجتا رہے گا جو اس کے دین کی تجدید کرے۔ (ابوداود)

تشریح حدیث

ہر سو سال میں مجدد کا ظہور:

اس حدیث کے راوی بھی حضرت ابوہریرہؓ ہیں اور یہ روایت ''حدیث المجددین'' کہلاتی ہے جو بہت اہم حدیث شمار ہوتی ہے، علماء نے اس پر باقاعدہ رسائل بھی لکھے ہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ

(۱)المرقاة ۱ / ٤٦١ .

(۱)أخرجه أبو داود في الملاحم، باب ما يذكر في قرن المأة ۲ / ٥٨٩ .

علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا، اور لوگوں کی عادت ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ شریعت میں نئی باتیں پیدا کرلیا کرتے ہیں، لہٰذا اصلاح امت اور حفاظت شریعت کے لئے اللہ نے علماء کو پیدا فرمایا، اسی لئے وہ انبیاء کے وارث بھی ہیں، اللہ نے مزید حفاظت کے لئے یہ بھی انتظام فرمایا کہ ہر صدی کے شروع میں ایک مجدد کو مبعوث فرماتے ہیں، جو دین وشریعت پر پڑ جانے والے صدی بھر کے گرد وغبار اور اس میں پیدا ہوجانے والی خرابیوں کو اس سے ہٹاتے ہیں اور دین کو روز اول کی طرح تروتازہ کردیتے ہیں۔

وعنه فيما أعلم: "اعلم" اس صیغہ میں تین احتمال ہیں:

(۱) واحد متکلم کا صیغہ ہے اس وقت فاعل ابوہریرہؓ ہوں گے یعنی ان باتوں میں سے جن کو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا ہے ان میں سے یہ بھی ہے۔

(۲) باب افعال سے واحد غائب کا صیغہ ہے بمعنی بتانا، خبر دینا اس صورت میں اس کا فاعل ابوہریرہؓ کے شاگرد ابوعلقمہ ہونگے یعنی ان باتوں میں سے جن کی خبر ابوہریرہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دی ہے ایک بات یہ بھی ہے، اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا اور اُن باتوں میں سے جن خبر ابوہریرہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دی گئی ایک بات یہ ہے۔

(۳) باب افعال سے مضارع مجہول متکلم کا صیغہ ہے، اور اس کا نائب فاعل ضمیر مستتر ہے جو حضرت ابوہریرہؓ کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ "اور ان باتوں میں سے جن کی خبر ابوہریرہؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دی گئی ایک بات یہ ہے"۔[1]

مجدد کی آمد کا وقت:

علی رأس كل مائة سنة: اس سے مراد ہے صدی کا آخری حصہ یا ابتدائی حصہ، اس میں اللہ مجدد بھیجتا ہے تاکہ صدی بھر کی خرابیاں دور ہوجائیں اور نئی صدی کی ابتداء تروتازہ اور نکھری ہوئی شریعت سے ہو، اور یہ تجدیدی کام پچاس ساٹھ سال تک جاری رہتا ہے۔[2]

مجدد کو سو سال میں بھیجا جاتا ہے اسلئے کہ سو سال میں عموماً ایک طرح کے علماء ختم ہوجاتے ہیں، بدعات رائج ہوجاتی ہیں، سنت متروک ہوجاتی ہے حتی کہ اصل دین ختم ہونے کے قریب ہوجاتا ہے پس

(۱) شرح الطيبي ۱/۴۴۰.

(۲) راس کا اطلاق ابتداء وانتہاء دونوں پر ہوتا ہے: مرقاة ۱/۴۶.

سو سال گزرنے پر تجدید دین اور اس کی تدوین نو کی ضرورت ہوتی ہے۔

مجدد فرد واحد یا جماعت؟

پھر بعض نے کہا کہ ساری دنیا کا مجدد ایک ہی ہوتا ہے چنانچہ دوسری صدی کے مجدد عمر بن عبدالعزیز تھے اور امام شافعی امام غزالی اور امام سیوطی بھی اپنی اپنی صدی کے مجدد تھے، لیکن جمہور نے فرمایا کہ پوری دنیا کے لئے ایک ہی مجدد ہونا ضروری نہیں بلکہ ایک زمانے میں مختلف مقامات میں کئی کئی لوگ مجدد ہو سکتے ہیں اور دین کے مختلف شعبے ہیں، ہر شعبہ کا مجدد الگ بھی ہو سکتا ہے۔ (۱)

لہذا جو بھی اپنے علاقے میں تجدیدی نوعیت کا کام کرے وہ مجدد ہوگا، چنانچہ برصغیر میں تیرھویں صدی کے مجدد حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی ہیں کہ انہوں نے مدارس کا سلسلہ جاری کیا ورنہ دین مٹنے کے قریب تھا، حضرت تھانوی کو بھی مجدد کہا گیا ہے۔

مجدِّدُ الفِ سنۃ:

اللہ نے دین کی مزید حفاظت کے لئے یہ انتظام فرمایا کہ دس صدی میں ایک بڑا مجدد بھیجتے ہیں، اس کو "مجدد الف سنۃ" کہا جاتا ہے اول دس صدی کے مجدد عمر بن عبدالعزیز ہیں اور ثانی دس کے مجدد ہیں: شیخ احمد سرہندی، جن کو "مجدد الف ثانی" کہا جاتا ہے، آپ کے دور میں اکبر بادشاہ نے دین الٰہی کے نام سے ایک نیا دین قائم کیا تھا جو خرافات کا مجموعہ تھا تو آپ نے اس کا مقابلہ کیا اور دین محمدی کی حفاظت وتجدید کا فریضہ انجام دیا۔

مجدد ہونے کا علم کیسے ہوگا؟

پھر مجدد کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے مجدد ہونے کا دعوی کرے، بلکہ اس کو اس کا علم ہونا بھی ضروری نہیں کہ وہ مجدد ہے، اس وقت کے علماء کسی کے تجدیدی کارناموں کی وجہ سے ظن کے درجے میں اس کے بارے میں کہہ دیں کہ وہ مجدد ہے، بس اتنا کافی ہے۔

(۱) تفصیل کے ملاحظہ فرمائیں: (فتح الباری)، وجامع الأصول لابن الأثیر ۱۱/۳۲۰، فی حرف النون، فی کتاب النبوۃ، فی الفصل الأول من (الباب الخامس فی معجزاته صلى الله علیه وسلم) عند شرح حدیث (تجدید الدین) وفیض القدیر للمناوي ۱/۱۰-۱۲.

تجدید دین سے مراد:

من يجدد لها دينها: دین کی تجدید سے مراد احیاء سنت رد بدعت اور لوگوں کو اتباع سنت کی دعوت اور ان کو اصل دین کی طرف پھیرنا ہے، لہذا جو ان امور کو انجام دے وہی مجدد ہوسکتا ہے۔

۲۲۹ / ٤٤ : وَعَنْ إِبْرَاهِيمَ بنِ عَبدِالرَّحْمٰنِ الْعُذْرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ، يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ، وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَتَأْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ.(رواه البيهقي في كتاب المدخل مرسلا)(۱)

وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ جَابِرٍ "فَإِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ" في باب التيمم إن شاء الله تعالىٰ.

ترجمہ: حضرت ابراہیم بن عبدالرحمٰن العذری سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اس علم کو ہر آنے والی جماعت کے نیک اور ثقہ لوگ حاصل کرتے رہیں گے جو اس علم (کتاب وسنت) سے حد سے تجاوز کرنے والوں کی تحریف، اور اہل باطل کے جھوٹ اور جاہلوں کی تاویلوں کو دور کریں گے، امام بیہقی نے اس کو کتاب المدخل میں مرسلا روایت کیا ہے اور حدیث جابرؓ "فانما شفاء العی السوال" کو ہم عنقریب باب التیمم میں ذکر کریں گے انشاء اللہ تعالی۔

تشریح حدیث

دین کی حفاظت کرنے والے ہر زمانہ میں:

یہ حدیث مرسل ہے اور ابراہیم بن عبدالرحمٰن العذری تابعی ہیں، انہوں نے بلاواسطہ صحابی اس حدیث کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے اس کا مضمون بھی سابق روایت کی طرح ہے، کہ حق تعالی شانہ دین وشریعت کی حفاظت علماء سے کرائے گا، پس اہل علم کا اصل مشن حفاظت دین ہونا چاہئے۔

(۱) أخرجه البيهقي في السنن الكبرى ، باب الرجل من أهل الفقه يسأل عن الرجل من أهل الحديث فيقول كفوا عن حديثه لأنه يغلط أويحدث بمالم يسمع أو لأنه لايبصر الفتيا ۱ / ۲۰۹ .

من كل خلف عدوله: ''خلف'' لام کے فتحہ کے ساتھ ہے بمعنی لائق جانشین اور لام کے سکون کے ساتھ اس کے معنی نااہل جانشین کے ہوتے ہیں، چنانچہ آیت کریمہ فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ میں برے جانشینوں کے لئے لام کے سکون کے ساتھ وارد ہوا ہے۔

عدول: عادل کی جمع ہے، بمعنی ثقہ و باعتماد لوگ۔

تحریف الغالین: غالین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کتاب وسنت کو ان کے معنی مرادی سے ہٹاتے ہیں، جیسے قدریہ معتزلہ وغیرہ علماء کی کوشش کی وجہ سے ان کی معنوی تحریف کامیاب نہیں ہوتی۔

انتحال المبطلین: انتحال کہتے ہیں دوسرے کے قول یا شعر کو اپنی طرف منسوب کرنا، ظاہر ہے کہ یہ کذب ہے اس لئے انتحال کا مرادی ترجمہ جھوٹ سے ہوتا ہے، باطل پرست دین میں بھی جھوٹی باتیں داخل کریں گے، علماء حق دین سے جھوٹ کو دور کریں گے یعنی ان جھوٹی باتوں کو دین میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔(۱)

تاویل الجاھلین: جاہلین سے فرق ضالہ کے وہ لوگ مراد ہیں جو جہالت اور ناسمجھی کی وجہ سے کتاب وسنت میں بے جا تاویل کرتے ہیں علماء ان جاہلانہ تاویلوں کو چلنے نہیں دیں گے۔(۲)

اس حدیث سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی شریعت اور دین کی حفاظت کے لئے تا قیام قیامت ایسے لوگ پیدا کرے گا جو دین وشریعت کی حفاظت کا فریضہ انجام دیں گے، اور کسی کو دین میں ادنی تبدیلی کا موقعہ نہ دیں گے چنانچہ علماء اسلام نے ہر زمانہ میں یہ فریضہ اداء کیا ہے۔

الفصل الثالث

۲۳۰ / ٤٥: عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلاً قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الإِسْلَامَ، فَبَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّيْنَ دَرَجَةٌ وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ'' (رواه الدارمي)(۳)

---

(۱) شرح الطيبي ۱ / ٤٤٢.

(۲) شرح الطيبي ۱ / ٤٤٢.

(۳) أخرجه الدارمي في المقدمة، باب في فضل العلم والعالم ۱ / ۱۰٦ الرقم ۳٦۰.

ترجمہ: حضرت حسن بصریؒ سے بطریق مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کی موت اس حال میں آئے کہ وہ علم حاصل کررہا ہوتا کہ اس کے ذریعہ اسلام کا احیاء کرے تو جنت میں اس کے اور انبیاء علیہم السلام کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا۔ (دارمی)

تشریحِ حدیث

طالب علم کا فریضہ اور فضیلت:

اس حدیث میں مخلص طالب علم کا مقام ومرتبہ بیان کیا گیا ہے، حاصل یہ ہے کہ طالب علم اور عالم دین کا فرض منصبی اسلام کا احیاء اور اسلامی تعلیمات کی تبلیغ ہے، انبیاء علیہم السلام کو اسی عظیم مقصد کے لئے مبعوث کیا گیا ہے، اسی لئے علماء انبیاء کے وارث قرار پاتے ہیں اس لئے علماء کا مقام بھی بہت بلند ہے، لیکن انبیاء کے پاس وحی آتی ہے اور علماء کے پاس وحی نہیں آتی اس لئے ان کے درمیان ایک درجہ کا فرق رکھا گیا ہے اور وہ درجہ نبوت ہے۔

حسن نام کا مصداق:

اس حدیث کے راوی حضرت حسن بصریؒ ہیں حضرات محدثین کی اصطلاح میں جب حسن مطلق بولا جائے تو حسن بصری ہی مراد ہوتے ہیں، (۱) اور فقہاء کے یہاں مطلق بولے جانے کے وقت حسن بن زیاد اور صحابہ میں حضرت حسن بن علی مراد ہوتے ہیں، حضرت حسن بصریؒ کی مرسل روایات بھی مقبول ہیں۔

يحيى به الاسلام: یعنی احیاء اسلام اور احیاء دین مقصود ہو مال وجاہ مقصود نہو۔

فبينه وبين النبيين درجة واحدة: اس درجہ سے ''درجہ نبوت'' مراد ہے۔

۲۳۱ / ٤٦ : وَعَنْهُ مُرْسَلاً قَالَ: سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ رَجُلَيْنِ كَانَا فِيْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ: أَحَدُهُمَا كَانَ عَالِماً يُصَلِّي الْمَكْتُوْبَةَ، ثُمَّ يَجْلِسُ فَيُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَيْرَ، وَالآخَرُ يَصُوْمُ النَّهَارَ، وَيَقُوْمُ اللَّيْلَ، أَيُّهُمَا أَفْضَلُ؟ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَضْلُ هٰذَا الْعَالِمِ الَّذِيْ يُصَلِّي الْمَكْتُوْبَةَ ثُمَّ يَجْلِسُ فَيُعَلِّمُ النَّاسَ

(۱) المرقاة ۱ / ٤٦٤.

الْخَيْرَ عَلَى الْعَابِدِ الَّذِي يَصُومُ النَّهَارَ وَيَقُومُ اللَّيْلَ كَفَضْلِي عَلَى أَدْنَاكُمْ. (رواه الدارمي)[1]

ترجمه: حضرت حسن بصریؒ سے بطریق مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بنی اسرائیل کے دوشخصوں کے متعلق سوال کیا گیا، جن میں سے ایک تو عالم تھا جوفرض نماز پڑھتا اور پھر بیٹھ کرلوگوں کوعلم دین کی تعلیم دیتا تھا، اوردوسرا شخص وہ تھا جودن کوروزہ رکھتا اوررات کو عبادت کرتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ:اس عالم کی فضیلت جوفرض نماز پڑھتاہے اورپھر بیٹھ کر لوگوں کوعلمِ دین سکھاتا ہے اس عابد پرجودن میں روزہ رکھتاہے اوررات میں عبادت کرتاہے ایسی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ادنی شخص پر۔(دارمی)

تشریح حدیث

اس مضمون کی حدیث پہلے گزرچکی ہے کہ عالم کو عابد پرحددرجہ فضیلت حاصل ہے، اس لئے کہ اس کا نفع متعدی ہے اورعابد کا نفع لازم ہے، اِس حدیث میں واقعی طور پر بنی اسرائیل کے دوشخصوں (ایک عالم اورایک عابد) کا حال بتا کرحضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا گیا،اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم کی فضیلت بیان فرمائی، عالم وعابد کی مراد کوبھی بیان کیا گیاہے کہ عالم سے ایسا عالم مراد ہے جواداءِفرائض کے بعد باقی اوقات کونشرعلم میں مشغول رکھتاہے اورعابد سے مراد وہ عبادت گذار ہے جواداءِ فرائض کے بعد باقی اوقات میں نوافل میں مشغول رہتاہے۔

۲۳۲/ ۳۷: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: نِعْمَ الرَّجُلُ الْفَقِيْهُ فِي الدِّيْنِ، إِنِ احْتِيْجَ إِلَيْهِ نَفَعَ وَإِنِ اسْتُغْنِيَ عَنْهُ أَغْنَىٰ نَفْسَهٗ. (رواه رزين)[2]

ترجمه: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: فقیہ کتنا اچھاشخص ہے کہ اگراس کی طرف لوگوں کو(دینی) ضرورت پیش آئے تو ان کونفع

(۱)أخرجه الدارمي في سننه، المقدمة، باب في فضل العلم والعالم ۱/ ۱۰۳(۳۵۲)

(۲)رواه ابن عساكر في تاريخه (۴۵/ ۳۰۳)

پہنچاتا ہے (اس ضرورت کو پوری کرتا ہے) اوراگراس سے استغناء اختیارکیاجائے تو وہ اپنی ذات کو نفع پہنچاتا ہے۔(رزین)

تشریح حدیث

فقیہ کی شان:

اس حدیث میں فقیہ کی مدح کی گئی اوراس کی شان بتائی گئی کہ اس کےعلم سے ہرحال میں فائدہ ہوتا ہے فقیہ اپنےعلم پرعمل کرکے خودبھی منتفع ہوتا ہے اور دوسروں کوبھی فائدہ پہنچاتا ہے، اگرلوگ اپنی دینی ضرورتوں کے سلسلہ میں اس سے رجوع کرتے ہیں تو ان کی رہبری اوررہنمائی کرکے اپنا فریضہ انجام دیتا ہے اوراپنے آپ کونافع بناتا ہے۔

اوراگرلوگ اس سے استغناء برتیں بایں طور کہ دین سے دورہوجائیں اوراپنی دینی ضرورتوں کواس کے پاس نہ لیجائیں تو اس کاعلم اس حال میں بھی بے کارنہیں، بلکہ وہ اس وقت بھی اپنےعلم پرعمل کرکے حق تعالی شانہ کی رضاوخوشنودی حاصل کرتارہتا ہے اوراپنی ذات کونفع پہونچاتارہتا ہے، حاصل یہ کہ فقیہ کسی بھی حال میں فائدہ سے خالی نہیں۔

''اغناءنفس'' کاایک مفہوم یہ بھی ہے کہ جب لوگ اس سے بے نیازی برتتے ہیں تویہ بھی ان سے بے نیازی برتتا ہے، ان سے تعلقات بڑھانے کی تمنانہیں رکھتا اورنہ ان کے اپنے پاس آنے کی خواہش رکھتاہے، پس حدیث کاسبق یہ ہے کہ فقیہ عالم کولوگوں سے تعلقات بڑھانے کی فکرنہیں رکھنی چاہئے، ہاں از خود جب وہ کسی رہنمائی کےخواہشمند ہوں تووہ ضرورکرنی چاہئے۔

۲۳۳ / ٤٨: وَعَنْ عِكْرِمَةَ أَنَّ ابنَ عَبَّاسٍ قَالَ: حَدِّثِ النَّاسَ كُلَّ جُمُعَةٍ مَرَّةً، فَإِنْ أَبَيْتَ فَمَرَّتَيْنِ، فَإِنْ أَكْثَرْتَ فَثَلاثَ مَرَّاتٍ، وَلاتُمِلَّ النَّاسَ هٰذَا الْقُرْآنَ، وَلاأُلْفِيَنَّكَ تَأْتِي الْقَوْمَ وَهُمْ فِي حَدِيْثٍ مِنْ حَدِيْثِهِمْ فَتَقُصُّ عَلَيْهِمْ فَتَقْطَعُ عَلَيْهِمْ حَدِيْثَهُمْ فَتُمِلُّهُمْ، وَلٰكِنْ أَنْصِتْ فَإِذَا أَمَرُوْكَ فَحَدِّثْهُمْ وَهُمْ يَشْتَهُوْنَهُ، وَانْظُرِ السَّجْعَ مِنَ الدُّعَاءِ فَاجْتَنِبْهُ فَإِنِّيْ عَهِدْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَصْحَابَهُ لايَفْعَلُوْنَ ذٰلِكَ.(رواه البخاري)[1]

(۱)أخرجه البخاري في كتاب الدعوات، باب مايكره من السجع فى الدعاء۲ / ۹۳۸ الرقم: ٦٣٣٧.

ترجمہ: حضرت عکرمہؒ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ: تم ہفتہ میں ایک مرتبہ لوگوں کو وعظ کہا کرو، اور اگر تمہیں اس سے انکار ہو (زیادہ وعظ کہنا چاہو) تو (ہفتہ میں) دو مرتبہ، اور اگر کثرت سے وعظ کہنا چاہو تو (ہفتہ میں) بس تین مرتبہ (وعظ کہو) اور تم لوگوں کو قرآن شریف سے اکتاہٹ میں مت ڈالو، اور میں تم کو اس حال میں نہ پاؤں کہ تم کسی قوم کے پاس جاؤ اور وہ اپنی باتوں میں مشغول ہوں تو تم ان کی بات کاٹ کر ان کے سامنے وعظ کہنا شروع کردو، اور ان کو اکتاہٹ میں ڈال دو، بلکہ مناسب یہ ہے کہ تم خاموش رہو، پس جب وہ تم سے وعظ کی درخواست کریں تو اس وقت ان کے سامنے وعظ کہو حال یہ کہ وہ اس کی تمنا کررہے ہوں اور تم اپنی دعاء میں قافیہ بندی سے اجتناب کرو، چنانچہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے متعلق علم ہے کہ وہ حضرات ایسا نہیں کرتے تھے۔ (بخاری)

تشریحِ حدیث

احوالِ عکرمہؒ

آپ ابن عباسؓ کے خاص شاگرد ہیں، ابوعبداللہ کنیت ہے، اور فقہاء مکہ میں شمار ہیں، یہ بربری غلام تھے، حصین عنبری نے انہیں بطور ہدیہ ابن عباس کو پیش کیا تھا، حضرت ابن عباس نے ان کی خصوصی تربیت فرمائی اور بہت محنت سے ان کو علم سکھایا، فرماتے تھے کہ میں نے چالیس سال طلب علم میں گذارے ہیں، امام شعبی فرماتے تھے کہ ہمارے زمانہ میں ان سے بڑا کتاب اللہ کا کوئی عالم نہیں تھا۔ (۱)

وعظ و نصیحت کے کچھ آداب:

عبداللہ بن عباسؓ اپنے شاگردوں کو مختلف نصیحت فرمایا کرتے تھے، یہاں عکرمہ کو کئی نصیحتیں فرمائیں، ایک یہ کہ ہفتہ میں ایک بار یا دو بار وعظ کہو اور اگر تمھیں وعظ کا زیادہ ہی جذبہ ہے تو ہفتہ میں بس تین مرتبہ وعظ کہو ورنہ لوگ اکتا کر ان دینی مجلسوں میں شریک ہونا چھوڑ دیں گے۔

دوسری نصیحت یہ فرمائی کہ جب لوگ اپنی باتوں میں مشغول ہوں تو ان کی بات کاٹ کر وعظ مت

(۱) تهذيب التهذيب ۷/۲٦٤، تذكرة الحفاظ للذهبي ۱/۹۰.

کہو ورنہ لوگ تم سے متوحش ہو نگے اور دین کی پاکیزہ باتوں سے اکتانے لگیں گے، بلکہ طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ تم ان کی مجلس میں خاموشی سے بیٹھ جاؤ پھران کو احساس پیدا ہوگا کہ یہ عالم دین ہیں ان سے دینی استفادہ کرنا چاہئے، چنانچہ جب وہ تم سے اس کی درخواست کریں تب وعظ کہو پھر وہ تمہاری بات توجہ سے سنیں گے اوراس وقت تمہارا وعظ مؤثر ہوگا۔

تیسری نصیحت فرمائی کہ دعاء میں مسجع کلام استعمال نہ کرو، اس لئے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اورآپ کے صحابہ کوایسے کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

ایک سوال و جواب:

سوال: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء میں مسجع کلام استعمال فرمایا ہے اور ماثورہ دعاؤں میں بہت سی دعائیں مسجع ومقفی ہیں، مثلا یہ دعا ہے: ''اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ عِلْمٍ لَایَنْفَعُ وَقَلْبٍ لَایَخْشَعُ وَنَفْسٍ لَا تَشْبَعُ''؟

جواب: ممانعت اس وقت ہے جبکہ سجع مقصود بالذات ہواور بہ تکلف سجع وقافیہ بندی اختیار کی جائے لیکن اگرکوئی شخص ایسا فصیح وبلیغ ہے کہ خود بخود مسجع کلام اس کی زبان پرجاری ہوجاتا ہے تواس کے حق میں ممانعت نہیں ہے حضورعلیہ الصلوۃ والسلام اسی شان کے حامل تھے۔(۱)

اورعام لوگوں کے حق میں وجہ ممانعت یہ ہے کہ دعا کا مقصود اللہ کی طرف مکمل توجہ اوراس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار ہے اگرموزون کلام استعمال کیا جائے گا تو قلب موزون کلام کی طرف متوجہ رہے گا اورحق تعالی شانہ کی طرف مکمل توجہ نہیں ہوگی جس سے دعا کا اصل مقصد فوت ہوجائے گا۔(۲)

ولاالفینک: ''الفاء'' سے ہے بمعنی پانا۔

۲۳٤/٤٩: وَعَنْ وَاثِلَةَ بنِ الْأَسْقَعِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ فَأَدْرَكَهُ كَانَ لَهُ كِفْلانِ مِنَ الْأَجْرِ، فَإِنْ لَمْ يُدْرِكْهُ كَانَ لَهُ كِفْلٌ مِّنَ الْأَجْرِ. (رواه الدارمي)(۳)

(۱) طیبي ۱/٤٤٥.

(۲) طیبي ۱/٤٤٥.

(۳)أخرجه الدارمي في المقدمة، باب في فضل العلم والعالم ۱/۱۰۳(۳٤۳)

ترجمہ : حضرت واثلہ بن اسقعؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو انسان علم کا طالب ہو پھر وہ اس علم کو حاصل بھی کر لے تو اس کے لئے اجر کے دو حصے ہیں، اور اگر وہ اس علم کو حاصل نہ کر پائے تو اس کے لئے ایک حصہ اجر ہے۔ (دارمی)

تشریح حدیث

احوال واثلہ بن اسقع:

جلیل القدر صحابی ہیں، پورا نام: واثلہ بن عبداللہ بن الاسقع ہے، پس یہ نسبت الی الجد ہے، حضرت واثلہ غزوہ تبوک سے قبل اسلام لائے اور اس غزوہ میں شریک بھی ہوئے، اُنکا اصحاب صفہ میں شمار ہے، اخیر میں شام چلے گئے تھے، اور وہیں ۸۷ سال کی عمر میں انتقال ہوا، دمشق میں وفات پانے والے آخری صحابی تھے۔[1]

طالبِ علم ہر حال میں فائدہ میں:

اس حدیث میں بتایا گیا کہ مخلص طالب علم کی کوشش کبھی رائیگاں نہیں جاتی، خواہ علم حاصل ہو یا نہ ہو، اگر علم حاصل ہو جائے تو اس کو دو اجر ملیں گے ایک علم پر اور ایک طلب وکوشش پر، اور اگر علم حاصل نہ ہو تو ایک اجر یعنی محنت وکوشش پر پھر بھی ملے گا، یہ ایسا ہے جیسے مجتہد کہ اگر اس کا اجتہاد درست ہو تو اس کو دوگنا اجر ملتا ہے، ایک اجتہاد کا دوسرے صحیح اجتہاد کا، اور اگر اجتہا میں خطا ہو جائے تو نفسِ اجتہاد کا اجر پھر بھی ملتا ہے۔

۲۳۵ / ۵۰: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ مِمَّا يَلْحَقُ الْمُؤْمِنَ مِنْ عَمَلِهِ وَحَسَنَاتِهِ بَعْدَ مَوْتِهِ: عِلْماً عَلِمَهُ وَنَشَرَهُ، وَوَلَداً صَالِحاً تَرَكَهُ، أَوْمُصْحَفاً وَرَّثَهُ أَوْمَسْجِداً بَنَاهُ، أَوْبَيْتاً لابنِ السَّبِيْلِ بَنَاهُ، أَوْنَهْراً أَجْرَاهُ، أَوْصَدَقَةً أَخْرَجَهَا مِنْ مَالِهِ فِيْ صِحَّتِهِ وَحَيَاتِهِ تَلْحَقُهُ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهِ. (رواه ابن ماجة والبيهقي في شعب الإيمان)[2]

(۱) الإصابة ۵ / ۴۳۶–۴۳۷.

(۲) أخرجه ابن ماجه في المقدمة، باب ثواب معلم الناس الخير ۱ / ۲۲ والبيهقي في شعب الإيمان، فصل في الاختيار في صدقة التطوع ۳ / ۲۴۸ الرقم: ۳۴۴۸.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: مومن کو مرنے کے بعد اس کے جس عمل اور جن نیکیوں کا ثواب ملتا ہے، ان میں سے ایک تو علم ہے جس کو اس نے سیکھا ہو اس کی اشاعت کی ہو، اور نیک اولاد ہے جس کو اس نے مرنے کے بعد چھوڑا ہو، اور قرآن مجید ہے جس کو اس نے وارثوں کے لئے چھوڑا ہو، اور مسجد ہے جس کو تعمیر کیا ہو، اور مسافر خانہ ہے جس کو اس نے بنایا ہو، اور پانی کی نہر ہے جس کو اس نے جاری کیا ہو، اور وہ صدقہ ہے جس کو اس نے اپنی زندگی میں نکالا ہو اپنے مال سے صحت کی حالت میں، ان تمام امور کا ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔ (ابن ماجہ، شعب الایمان)

تشریح حدیث

وہ اعمال جن کا ثواب بعد موت بھی ملتا ہے:

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ انسان جب مرجاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہوجاتا ہے اس لئے ثواب کا سلسلہ بھی منقطع ہوجاتا ہے مگر چند چیزوں کا ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے، اشاعت علم، صالح اولاد کے اعمال، میراث میں قرآن کریم چھوڑ کر جانا، مسجد تعمیر کرنا، مسافر خانہ بنانا، نہر کھدوانا صحت وتندرستی کی حالت میں صدقہ کرنا، پہلے بھی اس مضمون کی حدیث آچکی ہے۔

اشکال: ماقبل میں اس نوع کے تین اعمال بیان کئے گئے تھے اور یہاں ایسے سات اعمال بتائے گئے ہیں؟

جواب: حقیقۃً یہاں بھی وہی تین اعمال ہیں (۱) علم (۲) ولد صالح (۳) صدقہ جاریہ، یہاں جو باقی دیگر امور مذکور ہیں وہ سب صدقۂ جاریہ کی مثالیں ہیں فتدبر۔ (۱)

فی صحتہ و حیاتہ: معلوم ہوا کہ صحت کی حالت میں صدقہ کرنا مرض الوفات میں صدقہ کرنے سے بہتر ہے، چنانچہ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی نے اپنی صحت کے دوران مال پر حرص کے باوجود اور فقر پر اندیشہ کے باوجود نکالا ہو۔ (۲)

(۱) المرقاۃ ۱/۴۶۷.

(۲) رواہ مسلم فی کتاب الزکاۃ، باب بیان ان افضل الصدقة صدقة الصحیح الشحیح (۱۰۳۲).

۲۳۶ / ۵۱: وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَقُوْلُ إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ أَوْحٰى إِلَيَّ أَنَّهُ مَنْ سَلَكَ مَسْلَكًا فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ سَهَّلْتُ لَهُ طَرِيْقَ الْجَنَّةِ، وَمَنْ سَلَبْتُ كَرِيْمَتَيْهِ أَثَبْتُهُ عَلَيْهِمَا الْجَنَّةَ، وَفَضْلٌ فِيْ عِلْمٍ خَيْرٌ مِنْ فَضْلٍ فِيْ عِبَادَةٍ، وَمِلَاكُ الدِّيْنِ الْوَرَعُ. (رواه البيهقي في شعب الإيمان)(۱)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے میری طرف یہ وحی بھیجی ہے: جو شخص علم حاصل کرنے کے لئے کوئی راستہ اختیار کرے تو میں اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کردوں گا، اور جس آدمی کی دونوں آنکھیں میں نے چھین لی ہوں تو میں اس کو ان پر "صبر کرنے کی وجہ سے" جنت کا بدلہ دوں گا۔اور علم کے اندر زیادتی عبادت کے اندر زیادتی سے بہتر ہے اور دین کی جڑ پرہیز گاری ہے۔(شعب الایمان)

تشریح حدیث

طلبِ علم کی فضیلت اور بینائی چلے جانے کا ثواب:

اس حدیث میں دو چیزوں کی فضیلت مذکور ہے: علم طلب کرنا اور بینائی کا سلب ہوجانا، اور دو چیزوں کی جانب متوجہ کیا گیا ہے: ایک علم میں اضافہ کی کوشش کرنا اور دوسرے پرہیز گاری اختیار کرنا، یہ حدیث حدیثِ قدسی ہے۔

من سلک مسلکا: یہ جملہ اور اس کی تشریح ماقبل میں متعدد مرتبہ گزر چکی ہے۔

ومن سلبت کریمتیہ: "کریمۃ" بمعنی عمدہ وبیش قیمت چیز "أثبتہ" یہ اثابہ سے ہے بمعنی بدلہ دینا، بینائی حق تعالیٰ شانہ کی دی ہوئی بہت بڑی نعمت ہے اگر وہ ختم ہوجائے تو گویا سب کچھ ختم ہوگیا، اس عظیم نعمت کے سلب ہوجانے پر اگر بندہ صبر کرے تو حق تعالیٰ نے اس کے لئے جنت کا وعدہ فرمایا، صبر کی قید دوسری حدیث میں مذکور ہے۔(۲)

(۱) أخرجه البيهقي في شعب الإيمان، باب في المطاعم والمشارب ۵ / ۵۴ الرقم ۵۷۵۱ .

(۲) المرقاة ۱ / ۴۶۹ .

حدیث کے اول وآخر میں ربط:

یہاں پہلے جملے میں طلب علم کی فضیلت ہے اورثانی میں سلب بینائی پر صبر کی فضیلت ہے دونوں میں مناسبت یہ ہے کہ علماء عموماً راتوں کو مطالعہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی بینائی جاتی رہتی ہے، یاکم ازکم متأثر ہوتی ہے، اس لئے دونوں کو ایک ساتھ ذکرکیا گیا شراح نے فرمایا کہ اس فضیلت میں مادرزاد اورعارضی نابینا دونوں داخل ہیں۔(۱)

وفضل فی علم: یعنی علم کی قبیل کی معمولی فضیلت عبادت کی قبیل کی بڑی فضیلت سے بہتر ہے، کیونکہ عبادت کا نفع لازم ہے اورعلم کا متعدی ہے،لہٰذا انسان کو ہمہ وقت اضافۂ علم اورخدمتِ علم کے لئے کوشاں رہنا چاہئے۔

ملاک الدین الورع: ''ملاک'' بمعنی مایعتمد علیہ،جس چیز پراعتماد کیاجائے،مرادی ترجمہ جڑاوربنیاد سے کیا جاتا ہے،اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ علم اس وقت مفید ہے جب کہ عالم کی زندگی میں تقوی ہو۔

۲۳۷/۵۲: وَعَنِ ابنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: تَدَارُسُ الْعِلْمِ سَاعَةً مِنَ اللَّيْلِ خَيْرٌ مِنْ إِحْيَائِهَا. (رواه الدارمي)(۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: رات کی ایک گھڑی علم کا پڑھنا پڑھانا پوری رات عبادت کرنے سے بہتر ہے۔(دارمی)

تشریح حدیث

کچھ دیرمذاکرۂ علم احیاء لیل سے افضل:

یہ حدیث موقوف ہے اس میں علمی مجلس کی فضیلت بتائی گئی ہے عبادت پر، کہ رات میں کچھ دیرعلم کا مذاکرہ خواہ پڑھنا پڑھانا ہو یاتکرار ومذاکرہ ساری رات عبادت کرنے سے بہتر ہے، اس لئے کہ علم کا نفع متعدی اورعبادت کا نفع لازم ہے۔

(۱) المرقاة ۱/۴۶۸.

(۲) أخرجه الدارمي في المقدمة، باب مذاكرة العلم ۱/۱۵۷ الرقم ۶۱۹.

٢٣٨ / ٥٣ : وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بنِ عَمْرٍوؓ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّبِمَجْلِسَيْنِ فِيْ مَسْجِدِهٖ فَقَالَ: كِلاهُمَا عَلٰى خَيْرٍ، وَأَحَدُهُمَا أَفْضَلُ مِنْ صَاحِبِهٖ، أَمَّا هٰؤُلاءِ فَيَدْعُوْنَ اللّٰهَ وَيَرْغَبُوْنَ إِلَيْهِ فَإِنْ شَاءَ أَعْطَاهُمْ وَإِنْ شَاءَ مَنَعَهُمْ، وَأَمَّاهٰؤُلاءِ فَيَتَعَلَّمُوْنَ الْفِقْهَ أَوِ الْعِلْمَ وَيُعَلِّمُوْنَ الْجَاهِلَ فَهُمْ أَفْضَلُ، وَإِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً ثُمَّ جَلَسَ فِيْهِمْ.(رواه الدارمي)[1]

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مسجد میں دو مجلسوں کے پاس سے گذرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے متعلق فرمایا کہ یہ دونوں مجلسیں خیر پر ہیں لیکن ان میں سے ایک دوسری سے افضل ہے، بہرحال ان میں سے ایک جماعت تو وہ ہے جو اللہ سے دعاء کررہی ہے اوراس سے اپنی رغبت کا اظہار کررہی ہے، تو اگر اللہ چاہے توان کو دے اور اگر چاہے تو نہ دے، اور بہرحال یہ لوگ (دوسری مجلس والے) فقہ اورعلم حال کررہے ہیں اور جاہلوں کوسکھارہے ہیں تو یہ افضل ہیں اور میں معلم بناکر بھیجا گیا ہوں پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی مجلس میں بیٹھ گئے ۔(دارمی)

تشریح حدیث

آپ علیہ السلام کوبحیثیت معلم مبعوث کیا گیا:

اِس حدیث کا حاصل بھی یہی ہے کہ علم کی مجلس عبادت کی مجلس سے افضل ہے کیونکہ اہل علم عبادات ضروریہ کوتو ادا کرتے ہی ہیں ساتھ ساتھ ان کا اشتغال علم کے ساتھ ہے علم خود بھی سیکھتے ہیں اور ناواقفوں کوبھی سکھاتے ہیں پس ان کا نفع دوچند ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں سے اپنا زیادہ قرب بتانے کے لئے ان کے پاس تشریف رکھی اورفرمایا کہ میں معلم بناکرہی بھیجا گیا ہوں۔

٢٣٩ / ٥٤ : وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِؓ قَالَ: سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مَاحَدُّ الْعِلْمِ الَّذِيْ إِذَا بَلَغَهُ الرَّجُلُ كَانَ فَقِيْهاً؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : مَنْ حَفِظَ عَلٰى أُمَّتِيْ أَرْبَعِيْنَ حَدِيْثاً فِيْ أَمْرِ دِيْنِهَا بَعَثَهُ اللّٰهُ فَقِيْهاً وَكُنْتُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

(١) أخرجه الدارمي في المقدمة، باب فضل العلم والعالم ١ / ١٠٥ الرقم ٣٥٥.

شَافِعاً وَ شَهِيداً (۱)

ترجمہ: حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ علم کی وہ مقدار کیا ہے جس کو حاصل کرنے سے انسان فقیہ ہو جائے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جو شخص میری امت کے نفع کے لئے دین سے متعلق چالیس احادیث یاد کرلے تو اللہ تعالیٰ شانہ قیامت کے دن اس کو فقیہ بنا کر اٹھائے گا اور میں قیامت کے دن اس کی سفارش کرنے والا اور اس کے (خیر پر ہونے کی) گواہی دینے والا ہوں گا۔ (شعب الایمان)

تشریح حدیث

فقیہ کون؟:

اس روایت میں تبلیغ علم کی خاص صورت ذکر کی گئی ہے، روایت کا پس منظر یہ ہے کہ کتاب وسنت میں فقہ فی الدین کے فضائل اور عنداللہ اس کا بڑا اجر وثواب بیان کیا گیا ہے اس کو سن کر علم کی صحیح طلب رکھنے والا شخص تمنا کرتا ہے کہ وہ بھی اس زمرہ میں داخل ہو جائے اور اس اجر کا مستحق ہو جاتے، اس لئے صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کیا کہ علم کی وہ مقدار کیا ہے جس سے آدمی اللہ کے یہاں فقیہ شمار ہو؟ اور روز قیامت اس کا حشر فقہاء میں ہو؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص میری امت کے لئے ایسی چالیس احادیث محفوظ کرے جو دین سے متعلق ہوں تو حق تعالیٰ شانہ اس کو فقیہ بنا کر اٹھائے گا اور میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کرنے والا اور گواہی دینے والا ہوں گا۔

من حفظ علی أمتی اربعین حدیثا: اس کی مراد میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) امام نوویؒ نے فرمایا کہ اس سے مراد چالیس حدیثوں کو نقل کرنا اور ان کو امت تک پہنچانا ہے ان کو حفظ یاد کیا ہو یا نہ کیا ہو اور ان کے معانی کو سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو،

(۲) ملا علی قاریؒ نے فرمایا کہ معنی کو پہچاننا بھی ضروری ہے محض الفاظ کا یاد کرنا کافی نہیں، اس لئے کہ حدیث میں "فقیہ" کا لفظ وارد ہوا ہے اور فقہ کے معنی کسی شی کو جاننے اور اس کو گہرائی سے سمجھنے کے ہیں، ملا علی قاری کی یہ بات نہایت معقول ہے۔ (۲)

---

(۱) اخرجه البیهقی فی شعب الایمان ۲ / ۲۷۰ (۱۷۲٦)

(۲) المرقاة ۱ / ٤۷۱.

فی أمر دینها: اِس قید کے ذریعہ اُن اخباری روایات سے احتراز کیا گیا جن کا تعلق دین سے اعتقاداً یا عملاً نہ ہو۔ (۱)

درجۂ حدیث:

یہ حدیث اگرچہ سنداً ضعیف ہے مگر متعدد اسانید سے مروی ہونے کی وجہ سے حسن لغیرہ کا درجہ رکھتی ہے اور اس کو تلقی بالقبول بھی حاصل ہے، ہر زمانہ میں علماء ومحدثین ''الاربعین'' کے نام سے مختلف مجموعے مرتب کرکے امت میں پھیلاتے رہے ہیں۔

۲۴۰/ ۵۵: وَعَنْ أَنَسِ بنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَنْ أَجْوَدُ جُوْداً؟ قَالُوْا: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ: قَالَ: ''اَللّٰهُ تَعَالٰى أَجْوَدُ جُوْداً، ثُمَّ أَنَا أَجْوَدُ بَنِي آدَمَ، وأَجْوَدُهُمْ مِنْ بَعْدِيْ: رَجُلٌ عَلِمَ عِلْماً فَنَشَرَهُ يَأْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَمِيْراً وَحْدَهُ أَوْقَالَ: أُمَّةً وَاحِدَةً. (۲)

ترجمه: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ سب سے بڑا سخی کون ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ: اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ سب سے بڑا سخی ہے اور انسانوں میں سب سے بڑا سخی میں ہوں، اور میرے بعد سب سے بڑا سخی وہ شخص ہوگا جس نے علم سیکھا پھر اس کی اشاعت کی ایسا شخص قیامت کے دن ایک امیر یا ایک امت کی طرح آئے گا۔ (بیہقی)

تشریح حدیث

اشاعت علم میں مشغول عالم کی شان:

اس حدیث میں اس عالم کی فضیلت ہے جو نشر علم میں مشغول ہو کہ وہ روز قیامت امیر کی حیثیت

(۱) المرقاة ۱/ ۴۷۰.

(۲) اخرجه البيهقي في شعب الايمان ۲/ ۲۸۱ الرقم ۱۷۶۷.

سے یا ایک پوری امت کی حیثیت سے اللہ کے حضور حاضر ہوگا۔

من اجود جودا: جود کے معنی ہیں: **بذل الموجود مالاً كان أو علماً.** یعنی اپنے پاس موجود چیز خرچ کرنا خواہ وہ علم ہو یا مال۔

اللہ تعالیٰ اجود جودا: وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام عالم کو بغیر کسی غرض کے پیدا فرمایا اور پھر تمام عالم کو روزی دیتا ہے اور ان کی ضرورتیں پوری فرماتا ہے۔

ثم أنا أجود بنی آدم: اس کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مالی سخاوت بھی سب سے بڑھی ہوئی تھی جس کے واقعات آئندہ آئیں گے، خلاصہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص آپ علیہ الصلوۃ والسلام کے در سے خالی نہیں جاتا تھا، اور علمی سخاوت کا حال یہ ہے کہ آپ نے قیامت تک کے لئے علم و ہدایت کا فیضان فرمایا۔

یأتی یوم القیامۃ امیرا وحدہ: یعنی یہ عالم قیامت کے دن عزت وعظمت میں اس جماعت کے مانند ہوگا جس میں ایک شخص امیر ہو اور باقی سب مامور ہوں، ظاہر ہے کہ آدمی کی عزت اور قدر جماعت میں زیادہ ہوتی ہے۔

أو أمة واحدة: اگر کسی شخص میں بہت سی خصال حمیدہ جمع ہو جائیں جو عموماً ایک جماعت میں ہوتی ہیں تو اہل عرب اپنے محاورہ میں اس کو "امۃ" سے تعبیر کرتے ہیں جیسے قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے فرمایا "**اِنَّ اِبراهيم كان أمة**" حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اندر تنہا اتنے اچھے اخلاق موجود تھے، جو ایک جماعت میں ہوتے ہیں، پس اس شخص کی حیثیت بھی یہی ہوگی۔[1]

۲۴۱/۵٦: وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْهُوْمَانِ لَايَشْبَعَانِ: مَنْهُوْمٌ فِي الْعِلْمِ لَايَشْبَعُ مِنْهُ، وَمَنْهُوْمٌ فِي الدُّنْيَا لَايَشْبَعُ مِنْهَا [2] (روى البيهقي الأحاديث الثلاثة في "شعب الإيمان" وقال: قال الإمام أحمد في حديث أبي الدرداءؓ: هذا متن مشهورٌ فيما بين الناس وليس له إسنادٌ صحيح).

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

(۱) المرقاة ۱/۴۷۲۔

(۲) اخرجه البيهقي في شعب الايمان في باب الزهد وقصر الأمل ۷/۲۷۱ الرقم: ۱۰۲۷۹۔

ارشادفرمایا کہ: دوحریص ایسے ہیں جو(کبھی) سیراب نہیں ہوتے، ایک علم کا حریص کہ وہ علم سے سیراب نہیں ہوتا اوردوسرا دنیا کا حریص کہ وہ دنیا سے سیراب نہیں ہوتا۔(بیہقی)

مذکورہ تینوں احادیث امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں روایت فرمائی ہیں اورفرمایا ہے کہ: امام احمد نے حضرت ابوالدرداء کی حدیث(حفظ الاربعین) کے بارے میں کہا ہے: کہ اس کا متن مشہور ہے مگراس کی کوئی سند صحیح نہیں ہے۔

تشریح حدیث

دوحریص افراد:

اس حدیث میں زیادتی علم کی ترغیب دی گئی ہے،حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ دوقسم کےلوگ ایسے ہیں جن کی حرص تمام زندگی ختم نہیں ہوتی: ایک طالب علم کہ وہ علم سےکبھی آسودہ نہیں ہوتا: وہ علم سے جتنی سیرابی حاصل کرتا ہے اس کی تشنگی میں اسی کے بقدر اضافہ ہوتا ہے، یہی حال طالبِ دنیا کا ہے کہ وہ دنیا کی دولت سےکبھی آسودہ نہیں ہوتا،جتنی دولت حاصل ہوتی ہے اتنا ہی زیادہ اس کے لالچ اورطلب دنیامیں اضافہ ہوتا ہے اِن دونوں قسم کےلوگوں کی حرص کا سلسلہ مرتے دم تک جاری رہتا ہے البتہ جیسا کہ آئندہ روایت میں آرہا ہے دنیا کی حرص مذموم اورعلم کی حرص محمود ہے۔

منہومان: نَهُمٌ سے ہے، بمعنیٰ کسی چیز کی حد سے زیادہ حرص اورخواہش رکھنا۔

هذا متن مشهور: امام احمد بن حنبلؒ نے حدیث ابی الدرداء ''**من حفظ علی امتی الخ**'' کے بارے میں فرمایا کہ یہ متن حدیث لوگوں میں مشہور ہے مگراس کی کوئی سند صحیح نہیں ہے،لیکن اوپرذکرکیاجاچکا ہے کہ چونکہ اس کوتلقی بالقبول حاصل ہے،اورمتعددطرق واسانید سےمنقول ہےاس لئے مجموعی لحاظ سے یہ حدیث حسن لغیرہ ہے۔(۱)

---

(۱)(وليس له إسناد صحيح)قال النووي: طرقه كلها ضعيفة، وقال الحافظ ابن حجر :جمعت طرقه كلها في جزء ليس فيها طريق تسلم من علة قادحة، قال ابن حجرالمكي ولذا قال النووي: واتفق الحفاظ عل أنه حديث ضعيف وإن كثرت طرقه، وقداتفق الحفاظ على جواز العمل بالحديث الضعيف في فضائل الأعمال.اه

وأنت خبير بأن قضية مامهدوه في فن الحديث أن الحكم عليه بالضعف إنما هو بالنظر لكل طريق على حدته، وأما بالنظر إلى مجموع طرقه فحسن لغيره فيرتقي عن درجة الضعف إلى درجة الحسن.(المرقاة ١/ ٤٧٢وفتح الإله ٢/ ١٣٨)

۲۴۲ / ۵۷: وَعَنْ عَوْنٌ قَالَ: قَالَ عَبْدُاللّٰهِ بنِ مَسْعُوْدٌ: مَنْهُوْمَانِ لايَشْبَعَانِ، صَاحِبُ الْعِلْمِ وَصَاحِبُ الدُّنْيَا، وَلايَسْتَوِيَانِ، أَمَّا صَاحِبُ الْعِلْمِ فَيَزْدَادُ رِضىً لِلرَّحْمٰنِ، وَأَمَّا صَاحِبُ الدُّنْيَا فَيَتَمَادَىٰ فِي الطُّغْيَانِ، ثُمَّ قَرَأَ عَبْدُاللّٰهِ: "كَلَّاإِنَّ الإِنْسَانَ لَيَطْغٰى أَنْ رَّآهُ اسْتَغْنٰى" قال: وَقَالَ الآخَرُ: إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ" (رواه الدارمی)(۱)

ترجمه: حضرت عونؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: دوحریص کبھی سیر نہیں ہوتے، ایک عالم اوردوسرے دنیادار، لیکن یہ دونوں (درجہ کے اعتبار سے) برابر نہیں ہیں، بہرحال عالم تو وہ (اپنے لئے) اللہ تعالیٰ کی خوشنودی زیادہ کرتا رہتا ہے، اوردنیادار کی سرکشی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، پھرحضرت ابن مسعودؓ نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی: "كَلَّاإِنَّ الإِنْسَانَ لَيَطْغٰى أَنْ رَّآهُ اسْتَغْنٰى" (خبردار! انسان سرکشی کرتا ہے جب کہ وہ کثرتِ مال کی وجہ سے اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے) عونؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ دوسرا استشہاد یہ آیت ہے: "إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءِ" (اللہ کے بندوں میں علماء ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں)

تشریح حدیث

اس حدیث کا مضمون ماقبل کی روایت کی طرح ہے، البتہ یہ روایت حضرت عبداللہ بن مسعود پر موقوف ہے یعنی ان کا قول ہے، ماقبل میں گذرا کہ علم کے طالب اوردنیا کے طالب کی حرص کبھی ختم نہیں ہوتی لیکن دونوں کا درجہ یکساں نہیں ہے، اس کی دلیل میں حضرت ابن مسعودؓ نے دوآیتیں تلاوت فرمائیں: ایک دنیادار کی مذمت میں کہ مال کی وجہ سے انسان اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتا ہے اوریہی بے نیازی اسے خدا کا نافرمان بنادیتی ہے، دوسری آیت صاحب علم کی مدح میں تلاوت کی کہ جس میں جتنا زیادہ علم ہوگا اتنا ہی اس میں خشیت زیادہ ہوگی، اوراس کی وجہ سے اللہ کی رضا اورمحبت میں اضافہ ہوگا اس لئے صاحب دنیا مذموم اورصاحب علم محمود ہے دونوں کا درجہ برابر نہیں ہے۔

(۱) أخرجه الدارمي في المقدمه، باب فضل العلم والعالم ۱ / ۱۰۲ الرقم ۳۳۸.

۲٤۳ / ۵۸: وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ أُنَاساً مِنْ أُمَّتِيْ سَيَتَفَقَّهُوْنَ فِي الدِّيْنِ وَيَقْرَأُوْنَ الْقُرْآنَ، يَقُوْلُوْنَ: نَأْتِي الْأُمَرَاءَ فَنُصِيْبُ مِنْ دُنْيَاهُمْ وَنَعْتَزِلُهُمْ بِدِيْنِنَا وَلَايَكُوْنُ ذٰلِكَ كَمَالَايُجْتَنٰى مِنَ الْقَتَادِ إِلَّا الشَّوْكُ كَذَالِكَ لَايُجْتَنٰى مِنْ قُرْبِهِمْ إِلَّا قَالَ مُحَمَّد بنُ الصَّبَاحِ كَأَنَّهُ يَعْنِي الْخَطَايَا. (رواه ابن ماجه)(۱)

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: میری امت میں بہت سے لوگ علمِ دین حاصل کریں گے اورقرآن پڑھیں گے اورکہیں گے کہ ہم امراء کے پاس جاتے ہیں اوران کی دنیا میں سے کچھ حاصل کرتے ہیں اورہم ان (کی برائیوں) سے علیحدہ رہتے ہیں اپنے دین کی برکت سے لیکن ایسانہیں ہوگا جس طرح خاردار درخت سے سوائے کانٹے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح امراء کی صحبت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، مگرمحمد بن صباح کہتے ہیں گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گناہ (گناہ حاصل ہوتے ہیں)۔

تشریح حدیث

اہلِ علم کوامراء اوراہلِ ثروت کے پاس جانے سے احتراز کی تلقین:

اس حدیث میں علماء کونصیحت فرمائی گئی کہ اپنے علم کی قدرکریں اور مال اوراقتدار کے لالچ میں دنیا داروں کے پاس نہ جائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی کہ آئندہ زمانہ میں علم دین کے حامل کچھ لوگ مال وجاہ کے لالچ میں دنیاداروں کے پاس جائیں گے اورکہیں گے کہ ہم ان سے کچھ دنیاحاصل کرتے ہیں، لیکن ان کی صحبت کا اثراپنے دین پرنہیں پڑنے دیتے اورہم کسی گناہ میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہوتے۔

ولایکون ذٰلک: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کی یہ بات درست نہیں کیونکہ ضدین جمع نہیں ہوتے پس جس طرح خاردار درخت کے پاس سے کانٹے ہی چنے جاسکتے ہیں وہاں سے پھولوں کی

(۱) أخرجه ابن ماجه في المقدمة، باب الانتفاع بالعلم والعمل به ۱ / ۲۲–۲۳.

امید فضول ہے، اسی طرح امراء کے پاس جانے سے فتنوں اور برائیوں میں ابتلاء ضرور ہوگا وہاں سے بھلائی کی توقع لغو ہے۔

سيتفقهون في الدين: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ فقہ فی الدین کا دعوی کریں گے حالانکہ حقیقی علم ان کے پاس نہیں ہوگا، اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ ان کو واقعۃً فقہ فی الدین حاصل نہیں ہوگا۔(۱)

ويقرء ون القرآن: قراءت قرآن کا الگ سے ذکر تخصیص بعد التعمیم کے طور پر ہے۔

لايجتني من القتاد إلا الشوك: ''لا تجتنی'' اجتناء سے ہے بمعنی چننا، ''القتاد'' کانٹے دار درخت، ''الشوک'' کانٹا۔

لايُجْتَنىٰ من قربهم إلا: یہاں مستثنیٰ کو حذف کردیا گیا ہے یہ بتانے کے لئے کہ مستثنیٰ ایسی شئ ہے جو قابل تذکرہ نہیں، محمد بن صباح نے جو اس حدیث کے رواۃ میں سے ہیں انہوں نے مستثنیٰ لفظ ''خطایا'' بتایا ہے اور مطلب یہ ہے کہ امراء کے پاس جانے سے گناہوں میں ابتلاء ہوگا، لیکن اس سے بہتر یہ ہے کہ مستثنیٰ: ''الاخسران الدنیا والآخرہ'' قرار دیا جائے اس لئے کہ ''خطایا'' کو مستثنیٰ قرار دینے میں صرف ضرر اخروی کا بیان ہوگا، اور مذکورہ جملہ کو مستثنیٰ قرار دینے میں دنیا وآخرت ہردو کے نقصان کا بیان ہوگا، آخرت کا نقصان تو ظاہر ہے اور دنیا کا نقصان یہ ہے کہ تملق اور سوال سے ذلت آتی ہے اور فقر کا دروازہ کھلتا ہے۔

٢٤٤ / ٥٩: وَعَنْ عَبْدِاللهِ بنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: لَوْأَنَّ أَهْلَ الْعِلْمِ صَانُوْا الْعِلْمَ، وَوَضَعُوْهُ عِنْدَ أَهْلِهِ لَسَادُوْا بِهِ أَهْلَ زَمَانِهِمْ، وَلٰكِنَّهُمْ بَذَلُوْهُ لِأَهْلِ الدُّنْيَا لِيَنَالُوْابِهِ مِنْ دُنْيَاهُمْ فَهَانُوْا عَلَيْهِمْ، سَمِعْتُ نَبِيَّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَاحِداً هَمَّ آخِرَتِهِ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ، وَمَنْ تَشَعَّبَتْ بِهِ الْهُمُوْمُ أَحْوَالُ الدُّنْيَا لَمْ يُبَالِ اللّٰهُ فِيْ أَيِّ أَوْدِيَتِهَا هَلَكَ. (رواه ابن ماجه ورواه البيهقى فى شعب الإيمان عن ابن عمرؓ من قوله: مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ الى آخره)(۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے: انھوں نے فرمایا کہ اگر علماء علم کی

(۱) شرح الطيبي ۱ / ۴۵۱ – ۴۵۲، المرقاة ۱ / ۴۷۳.

(۲) رواه ابن ماجه في المقدمة ۱ / ۲۳ والزهد ۲ / ۳۰۲ والبيهقي فى شعب الايمان ۷ / ۲۸۹، الرقم ۱۰۳۴۰.

حفاظت کرتے اور علم کو اس کے اہل ہی کو سکھاتے تو وہ علم کے ذریعہ اپنے زمانہ والوں کے سردار بن جاتے لیکن انہوں نے اپنے علم کو دنیا داروں (نااہلوں) کے لئے خرچ کیا تاکہ وہ اس کے ذریعہ دنیا کو حاصل کریں تو وہ دنیا والوں کی نظر میں ذلیل ہوگئے میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص اپنی تمام فکروں کو ایک فکر یعنی آخرت کی فکر بنالے تو اللہ دنیا کی فکروں سے اس کی کفایت فرمائے گا اور جس شخص کے افکار دنیا کے احوال (بجائے آخرت کی فکر میں منحصر ہونے کے) مختلف اور متفرق ہوں تو حق تعالیٰ اس کی پرواہ نہیں فرماتے خواہ وہ کسی وادی میں ہلاک ہوجائے۔(ابن ماجہ)

اور امام بیہقی نے ''شعب الإیمان'' میں ابن عمرؓ کے واسطہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد'' **من جعل الهموم** '' سے آخر تک نقل کیا ہے۔

تشریح حدیث

اہل علم کو علم کی قدر دانی کی نصیحت:

یہ حدیث بھی موقوف ہے، عبداللہ بن مسعودؓ نے علم کی قدر دانی کے سلسلہ میں علماء کو نصیحت فرمائی کہ اگر علماء اپنے علم کی قدر کرتے اور اور جو اہل لوگ ہیں انھیں کو علم سکھاتے یعنی جن کو علم کی طلب ہے اور ان کے اندر حصول علم کی استعداد ہے ان کو علم سکھاتے دنیا کے لالچ میں بے طلب لوگوں کو سکھانے کے درپے نہ ہوتے تو لوگوں کے قلوب میں علماء کی وقعت پیدا ہوجاتی اور لوگ ان کو اپنا سردار بنا لیتے، لیکن (بہت سے) علماء کا حال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے علم کو دنیاداروں کے لئے خرچ کیا اور دنیوی اغراض حاصل کرنے کے لئے انکے دروازوں پر جاکر بغیر ان کی طلب کے ان کو علم سکھانے کی پیش کش کرنے لگے تو اس کی وجہ سے علماء ذلیل اور بے قدر ہوگئے، حالانکہ جو شخص اللہ کی رضا اور آخرت کی درستگی کو اپنا مقصد بنالے تو اس کی دنیا کی حاجتیں خود حق تعالیٰ شانہ پوری فرماتا ہے، چنانچہ اس بات کی تائید میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک حدیث مرفوع سنائی جس کا مطلب اور وجہ تائید خود ترجمہ سے ظاہر ہے حاصل یہ ہے کہ جو شخص دنیا کے افکار کو اپنے اوپر مسلط کرلے، فکر آخرت کو مقصود بنا کر اپنی مساعی کا محور اس کو نہ بنائے تو حق تعالیٰ شانہ اس کی پرواہ نہیں فرماتے، ایسا شخص مدد خداوندی سے محروم ہوجاتا ہے، وادی میں ہلاک ہونے سے یہی مراد ہے۔

اس میں اہل علم کو سبق ہے کہ ان کے پیش نظر اصل آخرت ہو، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ دنیوی

مسائل بھی حل فرمادے گا، اوراگروہ دنیوی مسائل کو اصل مقصود بنائیں گے اور آخرت کو نظرانداز کریں گے تو پھر نہ دنیا کا مسئلہ حل ہوگا اور نہ آخرت کا۔

۲۴۵ / ۶۰: وَعَنِ الْأَعْمَشِ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: آفَةُ الْعِلْمِ النِّسْيَانُ، وَإِضَاعَتُهُ أَنْ تُحَدِّثَ بِهٖ غَيْرَ أَهْلِهٖ.(رواه الدارمي مرسلاً)(۱)

ترجمه: حضرت اعمشؒ سے (مرسلاً) روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: علم کی آفت بھولنا ہے اور اس کو ضائع کرنا یہ ہے کہ تو اس کو نااہل کے سامنے بیان کرے۔(دارمی)

تشریحِ حدیث

احوال اعمشؒ:

نام سلیمان بن مہران ہے، ان کی آنکھوں میں چندھاپن تھا اس لئے اعمش لقب پڑ گیا، آپ رؤیۃً تابعی ہیں روایۃً تابعی نہیں ہیں، وکیع بن الجراح فرماتے ہیں کہ تقریبا ستر سال تک ان کی تکبیرِاولیٰ فوت نہیں ہوئی، ۶۱ھ میں پیدائش اور ۱۴۷ھ میں وفات ہوئی۔(۲)

علم کی حفاظت کی تاکید:

اس حدیث میں علم کی حفاظت اوراس کی قدردانی کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، نسیان سے علم ختم ہوجاتا ہے، پس اس کے اسباب سے بچو، اور جو لوگ علم کے قدردان اور مشتاق ہوں ان کے سامنے ہی علم بیان کرو۔

أفة العلم النسيان :اس کا تعلق بعد التحصیل سے ہے کہ حصولِ علم کے بعد اس کے ئے ایک ہی آفت (مصیبت) ہے وہ ہے نسیان ورنہ قبل التحصیل تو بہت آفات (رکاوٹیں) ہیں اسی لئے کہا گیا ہے "لکل شئ آفة وللعلم آفات"(۳)

(۱)أخرجه الدارمی فی سننه ۱/۱۵۸ الرقم ۶۲۹.

(۲)سیر اعلام النبلاء ۶/۲۲۶—۲۴۸ مطبوعہ بیروت.

(۳)حلیة الأولیاء وطبقات الأصفیاء ۳/۱۸۳.

اسبابِ نسیان:

پھر نسیان غیر اختیاری چیز ہے لیکن نسیان کے اسباب سے بچنا اختیاری امر ہے اس لئے حدیث کا مقصد یہ ہے کہ عالم کو اسبابِ نسیان سے بچنا چاہئے نسیان کے اسباب متعدد ہیں جن میں بعض اسباب یہ ہیں:

(۱) کتابوں کی طرف التفات نہ کرنا (۲) قلب کا خواہشات کی طرف متوجہ ہونا (۳) ارتکاب معاصی (۴) چوہے کا جھوٹا کھانا (۵) جوں کو زندہ چھوڑ دینا (۶) ٹھیرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنا (۷) کھٹا سیب کھانا (۸) دنیا کے غموں کا زیادہ ہونا (۹) تیز گرم روٹی کھانا (۱۰) براہ راست ہانڈی سے کھانا (۱۱) زیادہ ہنسنا خصوصاً قبرستان میں (۱۲) کثرت مزاح، علامہ زرنوجیؒ نے تعلیم المتعلم میں ان کو تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ (۱)

٢٤٦ / ٦١ : وَعَنْ سُفْيَانَ أَنَّ عُمَرَبْنَ الخَطَّابِؓ قَالَ لِكَعْبٍ: مَنْ أَرْبَابُ الْعِلْمِ؟ قَالَ: الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ بِمَايَعْلَمُوْنَ، قَالَ: فَمَاأَخْرَجَ الْعِلْمَ مَنْ قُلُوْبِ الْعُلَمَاءِ، قَالَ: اَلطَّمْعُ. (رواه الدارمي)(٢)

ترجمہ: حضرت سفیان ثوریؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے کعب احبارؒ سے معلوم کیا کہ: صاحبِ علم کون ہیں؟ حضرت کعب احبارؒ نے جواب دیا کہ جو لوگ اپنے علم کے مطابق عمل کریں، پھر حضرت عمرؓ نے کہا کہ علماء کے دل سے علم کو کیا چیز نکالتی ہے؟ کعب نے فرمایا کہ لالچ۔ (دارمی)

تشریحِ حدیث

احوال سفیان ثوری:

یہ سفیان بن سعید بن مسروق ہیں، ائمہ مجتہدین میں سے ہیں، امام الحفاظ اور اپنے زمانہ کے علماء کے سرخیل علماء میں ہیں، امام مالک کے اساتذہ میں اور امام ابوحنیفہ کے معاصر ہیں، اُن پر آخرت کا خوف

(١) ردالمحتار ١ / ٢٢٥، تعليم المتعلم ص ٩٤.

(٢) أخرجه الدارمي في سننه ١ / ١٥١ الرقم ٥٩٠.

غالب رہتا تھا جس کی وجہ سے پیشاب کی جگہ خون آتا تھا، حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ سے افضل قرار دیتے تھے اور راجح قول کے مطابق آپ تبع تابعی ہیں، ۹۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۶۱ھ میں وفات ہوئی۔(۱)

احوال کعب احبار:

ان کا نام کعب بن ماتع الحمیری ہے، یہ یہود کے بڑے عالم تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہوئے، البتہ ایمان حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایمان لائے، یہ توریت کے بڑے عالم وماہر تھے اس کے علوم ومعارف کثرت سے صحابۂ کرام کے سامنے بیان فرماتے تھے، حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ کرام ان سے علمی باتیں معلوم کرتے رہتے تھے۔(۲)

حقیقی عالم کا مصداق اور اہل علم کی شان کو مخدوش کرنے والی چیز:

اس حدیث میں حقیقی اہل علم کا مصداق اور ان کی شان ذکر کی گئی ہے نیز جس چیز سے اہل علم کی شان مخدوش ہوتی ہے اس کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، حقیقی اہل علم وہ ہیں جو علم کے تقاضہ پر عمل کرتے ہیں، سفیان ثوری جو اس حدیث کے راوی ہیں اور حفاظ حدیث میں شمار ہیں، فرماتے تھے کہ میں نے ہر حدیث پر کم از کم ایک مرتبہ ضرور عمل کیا ہے۔

اور جس چیز سے علماء کی شان پر دھبہ آتا ہے وہ ہے لالچ اور حرص، کیونکہ لالچ کی وجہ سے عالم کی وقعت ختم ہوجاتی ہے جس سے علم کی نفع رسانی کا سلسلہ کمزور یا منقطع ہوجاتا ہے، نورِ علم کے نکل جانے سے یہاں یہی مراد ہے۔

۲۴۷ / ۶۲: وَعَنِ الْأَحْوَصِ بنِ حَكِيمٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: سَأَلَ رَجُلُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الشَّرِّ فَقَالَ: لاتَسْأَلُوْنِيْ عَنِ الشَّرِّ، وَسَلُوْنِيْ عَنِ الْخَيْرِ يَقُوْلُهَا ثَلاثاً، ثُمَّ قَالَ: أَلا إِنَّ شَرَّالشَّرِّ شِرَارُ الْعُلَمَاءِ وَإِنَّ خَيْرَ الْخَيْرِ خِيَارُالْعُلَمَاءِ. (رواه الدارمي)(۳)

(۱) سير أعلام النبلاء ۷/ ۲۲۹.

(۲) سير أعلام النبلاء ۳/ ۴۸۹.

(۳) أخرجه الدارمي في المقدمة، باب التوبيخ لمن يطلب العلم لغير الله ۱/ ۱۱۰.

ترجمہ: حضرت اُحوص بن حکیم اپنے والد (حکیم) سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شر کے متعلق سوال کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: مجھ سے (محض) شر کے بارے میں سوال نہ کرو، بلکہ خیر کے بارے میں سوال کرو، اور یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ کہی، پھر آپ نے فرمایا کہ (سنو!) برے لوگوں میں سب سے برے لوگ برے علماء ہیں اور اچھے لوگوں میں سب سے اچھے لوگ اچھے علماء ہیں۔(دارمی)

تشریحِ حدیث

احوال احوص:

یہ تابعی ہیں اوران کے والد صحابی ہیں،لیکن ''الاکمال'' میں ان کا تذکرہ نہیں ہے۔

بدترین علماء اور بہترین علماء:

لاتسئلونی عن الشر: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحمت بنا کر بھیجے گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ مظہر جلال بھی تھے لیکن آپ پر جمال کا غلبہ تھا لہٰذا اگر محض شر کے متعلق سوال ہوتا رہے تو غلبہ جلال کا واہمہ ہوتا حالانکہ یہ حقیقت کے خلاف تھا، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محض شر کے بارے میں سوال سے منع فرمایا، مقصد یہ ہے کہ یا محض خیر کے متعلق سوال کرو، یا خیر وشر دونوں کے بارے میں پوچھو۔

إن شر الشر شرار العلماء: لفظ شر کبھی اسم تفضیل کے معنیٰ میں ہوتا ہے اور کبھی اسم فاعل کے معنیٰ میں، یہاں اول لفظ اسم تفضیل کے معنیٰ میں اور ثانی اسم فاعل کے معنی میں ہے،اسی طرح خیر کا حال ہے۔

علماء خیر کو سب سے بہتر اور علماء سوء کو سب سے برا قرار دینے کا سبب یہ ہے کہ علماء پر عالَم کے صلاح وفساد کا مدار ہوا کرتا ہے، عالِم میں اگر صلاح ہو تو اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں میں صلاح آئے گی، اسی طرح اس کے فساد سے عالَم میں فساد پیدا ہوگا، مقولہ مشہور ہے: ''**زَلَّةُ العالِم زلةُ العالَم**'' یعنی عالِم کی لغزش سے پورا عالَم غلط راہ پر چل پڑتا ہے، پس چونکہ عالِم کا صلاح وفساد متعدی ہوتا ہے، اسلئے آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے یہ حکم لگایا۔

۲۴۸ / ۷۱: وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ: "إِنَّ مِنْ أَشَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ: عَالِمٌ لَا يَنْتَفِعُ بِعِلْمِهِ" (رواه الدارمي)(۱)

ترجمہ: حضرت ابوالدرداءؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: کہ قیامت کے دن خدا کے نزدیک مرتبہ میں سب سے براوہ عالم ہے جس نے اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ (دارمی)

تشریح حدیث

اللہ کے نزدیک سب سے برا انسان:

یہ روایت موقوف ہے یعنی صحابی کا قول ہے، اس روایت میں عالم بےعمل کے لئے وعید ہے کہ وہ قیامت کے دن لوگوں میں سب سے برا شمار ہوگا اور جاہل سے بھی زیادہ عذاب میں گرفتار ہوگا جس کی وجہ اوپر کی حدیث میں بیان ہوچکی ہے۔

۲۴۹ / ۷۲: وَعَنْ زِيَادِ بنِ حُدَيْرٍ قَالَ: قَالَ لِيْ عُمَرُ: هَلْ تَعْرِفُ مَا يَهْدِمُ الإِسْلَامَ؟ قَالَ: قُلْتُ: لَا! قَالَ: يَهْدِمُهُ زَلَّةُ الْعَالِمِ، وَجِدَالُ الْمُنَافِقِ بِالْكِتَابِ، وَحُكْمُ الْأَئِمَّةِ الْمُضِلِّيْنَ. (رواه الدارمي)(۲)

ترجمہ: حضرت زیاد بن حدیر سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: کہ حضرت عمرؓ نے مجھ سے فرمایا: کہ کیا تم جانتے ہو کہ اسلام کو ڈھانے والی کیا چیز ہے؟ میں نے کہا مجھے نہیں معلوم! حضرت عمرؓ نے فرمایا: عالم کا پھسلنا، اور منافق کا کتاب اللہ میں جھگڑنا، اور گمراہ سرداروں کے فیصلے (اسلام کی عمارت کو تباہ کردیتے ہیں) (دارمی)

تشریح حدیث

احوال زیاد بن حدیر:

آپ تابعی ہیں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے روایات سنی ہیں، کثیر العبادة تھے۔(۳)

(۱) أخرجه الدارمي في المقدمة، باب العمل بالعلم وحسن النية فيه ۱ / ۸۷ الرقم ۲۷٦.

(۲) أخرجه الدارمي في المقدمة، ۱ / ۸۲ الرقم ۲۱٤.

(۳) المرقاة ۱ / ٤۷۹.

اسلام کونقصان پہنچانے والی تین چیزیں:

اس حدیث میں تین ایسی چیزیں بتائی گئیں جن سے دین کونقصان پہنچتا ہے اور گویا اسلام کی عمارت منہدم ہوجاتی ہے:

(۱) **یهدمه زلة العالم**: یعنی عالم کا اپنے علم کے مقتضی سے پھسل جانا بالخصوص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے غافل ہوجانا کہ پھرلوگ اسلام کے ارکانِ خمسہ کوترک کردیں گے جس سے اسلام کی عمارت منہدم ہوجائے گی۔

(۲) **وجدال المنافق بالکتاب**: منافق سے مراد وہ شخص ہے جوحقیقۃً بدعتی ہولیکن اپنا متبعِ سنت ہونا ظاہر کرے، لوگ ایسے شخص کومتبع سنت سمجھ کر اس سے مانوس ہوجاتے ہیں اور وہ اتباع سنت کے لبادہ میں اپنے عقائد باطلہ کو پیش کرتا ہے اوران عقائد کو کتاب اللہ سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، عموماً فرق ضالہ اور گمراہ لوگ یہی طرز اپناتے ہیں اس سے لوگوں کے عقیدے خراب ہوتے ہیں اور یہ اسلام کا سب سے بڑا نقصان ہے۔

(۳) **وحکم الأئمة المضلین**: اس سے مراد امراء اور حکام ہیں وہ غیر شرعی فیصلے صادر کرتے ہیں جس سے احکامِ اسلام ضائع ہوتے ہیں۔

۲۵۰ / ۷۳: وَعَنِ الْحَسَنِؒ قَالَ: اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ: فَعِلْمٌ فِي الْقَلْبِ فَذَاکَ الْعِلْمُ النَّافِعُ، وَعِلْمٌ عَلَى اللِّسَانِ فَذَاکَ حُجَّةُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ عَلَى ابْنِ آدَمَ.(رواه الدارمي)[1]

ترجمہ: حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں: علم کی دوقسمیں ہیں: ایک وہ علم جودل میں (پہنچتا) یہ علم تو نفع دیتا ہے اوردوسرا وہ علم ہے جو (محض) زبان پر ہوتا ہے، یہ علم آدمی پر اللہ عزوجل کی دلیل وحجت ہے۔(دارمی)

(۱) أخرجه الدارمي في سننه ، باب التوبيخ لمن يطلب العلم لغير الله ۱/ ۱۱٤ الرقم ۳٦۱.

تشریح حدیث

علم نافع اور علم غیر نافع:

یہ روایت مقطوع ہے کیونکہ حسن بصری تابعی ہیں اور جس روایت کی سند تابعی تک پہنچے وہ محدثین کی اصطلاح میں مقطوع کہلاتی ہے کمافی کتب الاصول، حسن بصریؒ نے علم کی تقسیم فرمائی کہ علم دو قسم کا ہے:
ایک علم وہ ہے جس کا اثر قلب میں پہنچتا ہے، اس کی شناخت یہ ہے کہ یہ علم آدمی کو عمل پر برانگیختہ کرتا ہے یہ علم نافع ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم نافع کی دعا مانگی ہے: **اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْأَلُکَ عِلْماً نَافِعاً۔**
دوسری قسم علم کی وہ ہے جو قلب میں نہ اترے وہ محض زبان پر رہے، یہ علم آدمی کو عمل پر نہیں ابھارتا یہ بجائے نافع ہونے کے قیامت کے روز بندہ کے خلاف حجت بنے گا اور وبال جان ثابت ہوگا، ایسے علم سے حدیث میں پناہ طلب کی گئی ہے: **اللھم اَعوذُبک من علم لایَنْفَعُ.**

۲۵۱ / ۷۴: وَعَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وِعَائَیْنِ؛ فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ فِیْکُمْ، وَأَمَّا الآخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهُ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ، یَعْنِیْ مَجْرَى الطَّعَامِ. (رواه البخاري)(۱)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو برتن (یعنی دو طرح کے علم) یاد کئے ہیں: ان میں سے ایک کو میں نے تمہارے درمیان پھیلا دیا ہے، اور دوسرا علم وہ ہے اگر میں اس کو بیان کروں تو میرا یہ گلا کاٹ دیا جائے۔ (بخاری)

تشریح حدیث

علم کی اور دو قسمیں:

اس حدیث میں بھی علم کی تقسیم ہے، حضرت ابوہریرہؓ فرمارہے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو قسم کا علم حاصل کیا ہے ان میں سے ایک قسم کو میں نے تمہارے سامنے بیان کردیا ہے دوسری قسم کا علم ایسا ہے کہ اگر میں اس کو لوگوں کے سامنے بیان کردوں تو لوگ مجھے مارڈالیں اور میرا گلا کاٹ دیں۔

(۱) أخرجه البخاري في العلم، باب حفظ العلم ۱ / ۲۳ الرقم ۱۲۰.

وعائین: وعاءٌ کا تثنیہ ہے بمعنی ظرف (برتن) مراد علم ہے، کیونکہ جس طرح ظرف اپنے مظروف کا احاطہ کئے ہوئے ہوتا ہے اسی طرح علم صاحب علم کا احاطہ کئے ہوتا ہے اوراس کا محافظ ہوتا ہے۔(۱)

یہاں روایت میں اول قسم سے مراد تو شریعت کا وہ علم ہے جس کا تعلق حلال وحرام اورعقائد سے ہے، ثانی قسم سے کونسا علم مراد ہے اس میں علماء کے کئی قول ہیں:

(۱)اس سے مراد تصوف کے اسرار ودقائق کا علم ہے اورمطلب یہ ہے کہ تصوف کے اسرار ورموز کی تعبیر دقیق ہوتی ہے،عوام الناس ان کے سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں، بلکہ بسا اوقات وہ ان تعبیرات سے غلط معنی سمجھ لیتے ہیں اور بیان کرنے والے کو گمراہ خیال کرکے اس کو مارنے کے درپے ہوجاتے ہیں، اس لئے میں نے اس دوسری قسم کو لوگوں کے سامنے بیان کرنے سے گریز کیا۔

(۲) اس سے مراد منافقین کے اسماء ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کو منافقین کے نام بتادیئے تھے حضرت ابوہریرہؓ اگر ان کو ظاہر کردیتے تو قتل کردیئے جاتے۔(۲)

(۳)اِس سے مراد علم فتن یعنی فتنوں کی تفصیلات اورظالم امراء کے نام اوران کے حالات ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب چیزیں حضرت ابوہریرہؓ کو بتائی تھیں، حضرت ابوہریرہؓ بسا اوقات اشارۃً اس کا تذکرہ فرماتے اور ایسے حالات سے محفوظ رہنے کی دعا فرماتے، ان سے یہ دعا منقول ہے: اعوذ بالله من رأس الستين وإمارة الصبيان یعنی اللہ سے پناہ مانگتا ہوں ۶۰ھ (کے فتنوں) سے اور بچوں کی امارت سے، اس میں یزید بن معاویہ اوران کے بعد کے امراء کی طرف اشارہ ہے۔

۶۰ھ کے کچھ احوال:

۶۰ھ میں یزید امیر بنا اوراس کے بعد معاویہ بن یزید،مروان وغیرہ امیر مقرر ہوئے، یہ سب نوجوان اور کم علم تھے، انہوں نے عموماً ناکردنی امورانجام دیئے اوران کے زمانہ میں بڑے فتنے رونما ہوئے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دور کے فتنوں سے حضرت ابوہریرہؓ کو آگاہ کردیا تھا، اگر وہ ان فتنوں سے لوگوں کو مطلع کرتے تو فتنہ پرداز لوگ ان کو مارڈالتے، البتہ یہ اس دور سے حفاظت کی دعاء مانگتے تھے، اللہ نے

(۱)المرقاة ۴۷۹/۱.

(۲)المرقاة ۴۷۹/۱.

انکی دعا قبول فرمائی اوراس دور کے آنے سے قبل ۵۹ھ میں اُن کی وفات ہوگئی۔[۱]

مذکورہ تین احتمالات میں سے دوسرے اور تیسرے احتمال کا حاصل ایک ہی ہے، اور راجح یہی ہے کہ حضرت ابوہریرۃؓ نے جوعلم ظاہر نہیں کیا وہ منافق لوگوں کے نام اورظالم حکمرانوں کے اعمال تھے، انہوں نے شرعی احکام کا کوئی حصہ چھپالیا ہوایسانہیں، کیونکہ اس کی اجازت نہیں، جیسا کہ اس بارے میں کتمان علم پر وعید کی حدیث خودانہوں نے روایت کی ہے۔[۲]

۲۵۲/۷۵: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ: يَاأَيُّهَاالنَّاسُ! مَنْ عَلِمَ شَيْئاً فَلْيَقُلْ بِهٖ، وَمَنْ لَمْ يَعْلَمْ فَلْيَقُلْ :اَللّٰهُ اَعْلَمُ، فَإِنَّ مِنَ الْعِلْمِ أَنْ تَقُوْلَ لِمَا لاتَعْلَمُ :اَللّٰهُ اَعْلَمُ، قَالَ اَللّٰهُ تَعَالیٰ لِنَبِيِّهٖ: "قُلْ مَاأَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍوَّمَاأَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ"(متفق عليه)[۳]

ترجمه : حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: اے لوگو! جوشخص کسی بات کوجانتا ہوتو چاہئے کہ اس کو بیان کرے ،اورجو نہ جانتاہوتواسے چاہئے کہ کہے "اللہ زیادہ جانتاہے"،اس لیے کہ جس چیز کا اسے علم نہیں ہے اس کے بارے میں اللہ زیادہ جانتا ہے کہنا بھی علم کی ایک قسم ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا: "قُلْ مَاأَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍوَّمَاأَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ" (سورۂ ص ۸۶)

یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ فرمادیجئے کہ میں اس قرآن پرتم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا، اورمیں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔(بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

لاعلمی کا اعتراف بھی علم کا حصہ:

یہ روایت موقوف ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اہل علم کونصیحت فرمائی جس کا حاصل یہ کہ بے شک تبلیغ علم فضیلت وثواب کی چیز ہے، لیکن جو بات تحقیق سے معلوم ہواسی کو بیان کیاجائے اور جوبات معلوم نہ ہو

(۱)المرقاة ۱/۴۷۹.

(۲)أخرجه البخاری فی التفسير، باب قوله: ومااانا من المتكلفين ۲/۷۱۰ الرقم ۴۸۰۹ و۲/۷۱۴ الرقم ۴۸۲۲ ومسلم فی كتاب صفات المنافقين وأحكامهم، باب صفة القيامةوالجنة والنار ۲/۳۷۳و۳۷۳.

(۳)فتح البارى ۱/۱۷۵، عمدة القارى ۲/۲۸۷.

اس کے متعلق کہہ دینا چاہئے کہ مجھے اس کا علم نہیں ہے، بلاعلم جواب دینے کے لئے تکلف کر کے تاویل نہیں کرنی چاہئے، یہ اہل علم کی شان نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے: ''قُلْ مَاأَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَّمَاأَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ''، اور اپنی لاعلمی کا اقرار بھی ایک قسم کا علم ہے، کیونکہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کو معلوم ومجہول کے درمیان تمیز حاصل ہے اور یہ تمیز بھی ایک علم ہے، اگر معلوم ومجہول کے درمیان تمیز نہ ہوتو یہ جہل مرکب ہے کہ نہ اصل بات کا علم ہے اور نہ لاعلمی کا احساس ہے، اور اپنے سے علم کی نفی کرنے میں شرم نہیں ہونی چاہئے، اس لئے کہ انسان کی جہالت اس کے علم سے زیادہ ہے: ''وَمَاأُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّاقَلِيْلاً''

واقعۂ حضرت علیؓ

ایک مرتبہ حضرت علیؓ منبر پر خطبہ دے رہے تھے ایک شخص نے کسی چیز کے متعلق سوال کیا، حضرت علیؓ کو وہ بات معلوم نہ تھی تو انہوں نے لاعلمی ظاہر کی اس پر سائل نے کہا: جب آپ کو علم نہیں پھر منبر پر کیوں چڑھے ہو؟ تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: میں اپنے علم کے بقدر (چند سیڑھیوں پر) چڑھا ہوں اگر اپنی جہالت کے تناسب سے اوپر کی طرف چڑھتا تو آسمان پر پہنچ جاتا (کیونکہ انسان کی جہالت اس کے علم سے زیادہ ہے)(۱)

۲۵۳ / ۷۶: وَعَنِ ابنِ سِيْرِيْنَؒ قَالَ: إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ؛ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ. (رواه مسلم)(۲)

ترجمہ: اور ابن سیرین سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ: یہ علم؛ دین ہے، لہٰذا (جب تم اس کو حاصل کرو تو) یہ دیکھ لو کہ اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو۔ (مسلم)

تشریح حدیث

احوال ابن سیرینؒ:

نام محمد ہے، والد کا نام سیرین ہے، حضرت انس کے غلام تھے، غلامی سے آزاد ہوئے تو بڑے عالم بنے

(۱) ذكره الزمخشري في ربيع الأبرار، كمافي المرقاة ۱ / ٤٧٩.

(۲) أخرجه مسلم في المقدمة ۱ / ۱۱.

اور کبار تابعین میں شمار ہوئے، تعبیر رؤیا کا بڑا ملکہ اللہ نے ان کو عطا فرمایا تھا لفظ ''سیرین'' علمیت اور یاء نون زائدتان کی وجہ سے غیر منصرف ہے، ابو علی نحوی کے نزدیک علمیت کے ساتھ یاء نون زائدتان کی وجہ سے بھی کلمہ غیر منصرف ہوجاتا ہے، الف نون ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ (۱)

مستند لوگوں سے حصول علم کی تاکید وتلقین:

یہ روایت مقطوع ہے کیونکہ تابعی کا قول ہے، اوراسمیں معتبر ومستند لوگوں سے ہی علم دین حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

فانظروا عمن تأخذون دينكم: یعنی اس پرغور کرلیا کروکہ وہ شخص عادل وثقہ ہے یانہیں؟ اس کے عقائد واعمال درست ہیں یانہیں؟ پس اس بارے میں جوشخص قابلِ اعتماد ہواسی سے علم حاصل کرو۔

ایک تعارض کا دفعیہ:

لیکن علماء کے مابین ایک مقولہ مشہور ہے: '' انظر إلى ماقال و لاتنظر الى من قال '' یہ مقولہ بظاہر ابن سیرین کی روایت کے خلاف ہے کیونکہ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ علم کی بات کسی بھی شخص سے حاصل کی جاسکتی ہے؟ لیکن غور سے کام لیا جائے تو دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے اس لئے کہ ابن سیرین کی روایت کا مقصد یہ ہے کہ عادل وثقہ شخص سے ہی علم حاصل کرنا چاہئے اور مقولۂ مذکورہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ وہ عادل وثقہ ہے اوراس کا عقیدہ صحیح ہے لیکن معاشرہ میں کم درجے کا شمار ہوتا ہے تو اس سے بھی علم حاصل کرو، اس سے علم حاصل کرنے میں عار محسوس نہ کرو، اسی کے لئے یہ تعبیر اختیار کی گئی کہ یہ دیکھو کہنے والا کیا کہہ رہا ہے؟ اس کی بات کتنی قیمتی ہے؟ اس پر نظر نہ کرو کہ وہ کون ہے معاشرہ میں اس کا درجہ کم ہے یا زیادہ۔

> ٢٥٤ / ٧٧: وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ: يَامَعْشَرَ الْقُرَّاءِ! اِسْتَقِيْمُوْا، فَقَدْ سَبَقْتُمْ سَبْقاً بَعِيْداً، وَإِنْ أَخَذْتُمْ يَمِيْناً وَشِمَالاً لَقَدْ ضَلَلْتُمْ ضَلا لاًبَعِيْداً. (رواه البخاري)(٢)

(١) المرقاة ١ / ٤٨٠.

(٢) أخرجه البخاري في الاعتصام، باب الاقتداء بسنن رسول الله صلى الله عليه وسلم وقول الله تعالىٰ واجعلنا للمتقين إماماً ٢ / ١٠٨١ الرقم ٧٢٨٢.

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: اے قاریوں کی جماعت سیدھے رہو، اس لیے کہ تم سبقت لے گئے ہو بڑی سبقت، اور اگر تم دائیں بائیں مڑ گئے تو بڑی گمراہی میں پڑ جاؤ گے۔ (بخاری)

تشریح حدیث

احوال حذیفہؓ:

آپ جلیل القدر صحابی ہیں، حذیفہ بن الیمان العبسی پورا نام ہے، ان کے والد کا اصل نام ''حسل'' ہے ''یمانیہ'' سے محالفت کی وجہ سے ''یمان'' کے نام سے مشہور ہوگئے، بدر میں شریک نہیں ہوسکے تھے کیونکہ اس وعدہ پر اہل مکہ نے ان کو ہجرت کی اجازت دی تھی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منافقین کے اسماء اور آئندہ ہونے والے فتنوں واختلافات کے بارے میں بتادیا تھا، اس لئے ''صاحب السر'' کے لقب سے نوازے گئے، حضرت علیؓ کے دور خلافت میں شہید ہوئے، اور کبار صحابہ میں سے ہیں۔[1]

اہل علم کو صحیح راہ پر استقامت کی تاکید:

اس حدیث میں حضرت حذیفہؓ نے اہل علم کو علم کے تقاضہ پر عمل کرنے کی نصیحت فرمائی اور گمراہیوں میں پڑنے سے منع فرمایا۔

استقیموا: یعنی عقائد صحیحہ، اعمال صالحہ اور علم نافع پر استقامت اختیار کرو۔

یـامعشـر الـقـراء: ''قراء'' سے مراد علماء ہیں، کیونکہ اس زمانہ میں علماء کو عموماً ''قراء'' سے تعبیر کیا جاتا تھا اور اس خطاب میں دو احتمال ہیں:

(ا) یہ خطاب صغار صحابہ کو ہے، اسوقت ''سبـقـتـم'' صیغۂ معروف ہوگا یعنی تم نے اسلام کے اول زمانے کو پایا ہے اس لئے تم سبقت لے گئے ہو، لہٰذا تمہیں استقامت ومداومت اختیار کرنے کی زیادہ ضرورت ہے کہ پھر بعد والے بھی صحیح راستے پر رہیں گے اور ان کا ثواب تمہیں بھی ملے گا، بعض شراح نے صیغۂ معروف کو ہی راجح کہا ہے۔

---

(۱) الإصابة ۱/ ٤٧٦–٤٧٧.

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ خطاب تابعین کو ہو، اس صورت میں ''سبقتم'' کو مجہول پڑھا جائے گا یعنی تم سے پہلے ایک بڑی سبقت لی جاچکی ہے یعنی اہل استقامت تم سے پہلے گزر چکے ہیں، لہٰذا ان سے عبرت حاصل کرو اور ان کی اتباع کرو۔ (۱)

وإن أخذتم يـمينا وشمالا: اس سے مراد اعمال وعقائد کا خراب کرلینا اور استقامت اختیار نہ کرنا ہے کہ ایسی صورت میں تم بھی گمراہ ہوگے اور بعد والے بھی تمہاری وجہ سے گمراہ ہوں گے اور ان کا گناہ تم پر ہوگا۔

۲۵۵ / ۷۸: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ''تَعَوَّذُوا بِاللّٰهِ مِنْ جُبِّ الْحُزْنِ'' قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! وَمَاجُبُّ الْحُزْنِ؟ قَالَ: ''وَادٍ فِيْ جَهَنَّمَ يَتَعَوَّذُ مِنْهُ جهنّمُ كُلَّ يَوْمٍ أَرْبَعَ مِائَةِ مَرَّةٍ'' قِيْلَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! وَمَنْ يَدْخُلُهَا؟ قَالَ: اَلْقُرَّاءُ الْمُرَاؤُوْنَ بِأَعْمَالِهِمْ'' (رواه الترمذی و كذا ابن ماجه) (۲)

وَزَادَ فِيْهِ: ''وَإِنَّ مِنْ أَبْغَضِ الْقُرَّاءِ إِلَى اللّٰهِ تَعَالىٰ الَّذِيْنَ يَزُوْرُوْنَ الْأُمَرَاءَ'' قَالَ الْمُحَارِبِيُّ: يَعْنِي الْجَوَرَةَ:

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تم اللہ سے پناہ مانگو ''جب الحزن'' سے؟ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! جُبُّ الحُزْن (غم کا کنواں) کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: وہ جہنم کی ایک وادی ہے جس سے دوزخ (بھی) دن میں چارسو مرتبہ پناہ مانگتی ہے، صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس میں کون داخل ہوگا؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: وہ قرآن پڑھنے والے جو اپنے اعمال کو دکھاوے کے لئے کرتے تھے۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

اور ابن ماجہ کی روایت میں یہ زیادتی ہے کہ: اللہ کے نزدیک مبغوض ترین وہ قاری ہیں جو امراء سے ملاقات کرتے ہیں، محاربی نے فرمایا کہ: امراء سے مراد ظالم امراء ہیں۔

(۱) المرقاة ۱ / ۴۸۱.

(۲) رواه الترمذي في سننه: أبواب الزهد، باب ماجاء في الرياء والسمعة، برقم: ۲۳۸۳، وابن ماجه: أبواب الإيمان، باب الانتفاع بالعلم والعمل به، برقم: ۲۵٦.

تشریح حدیث

ریاکار اور خوشامدی علماء کے لئے سخت وعید:

اس حدیث میں ان قراء وعلماء کے لئے وعید ہے جو اپنے اعمال میں ریاکاری کرتے ہیں اور امراء کی تملق وچاپلوسی کرتے ہیں، تاکہ وہ اِس حقیر دنیا کے سیم وزر کو جمع کرلیں اور انھیں دنیا کے منصب اور عہدے حاصل ہوجائیں، ایسے لوگوں کے لئے جہنم میں ایسی وادی ہے کہ خود جہنم بھی اس وادی سے روزانہ چارسو مرتبہ پناہ طلب کرتی ہے۔

جُب الحزن: جُبٌّ: بمعنی کنواں اور ''الحزن'' بمعنی غم، یعنی غم کا کنواں، جہاں غم ہی غم ہے خوشی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ (۱)

یتعوذ منه جهنم: سوال: جہنم تو غیر ذوی العقول ہے پھر اس کی طرف پناہ طلب کرنے کی نسبت کیوں کر صحیح ہے؟ اس کے کئی جواب ہیں:

(۱) یہ تمثیل کے طور پر ہے کہ اگر جہنم انسان ہوتی تو وہ اس وادی سے پناہ طلب کرتی۔

(۲) بعض نے کہا کہ: یہاں جہنم سے اہل جہنم مراد ہیں۔

(۳) بعض نے کہا: اس سے جہنم کے فرشتے مراد ہیں جن کو ''زبانیہ'' کہا جاتا ہے۔

(۴) بعض نے کہا کہ یہ حقیقت پر محمول ہے اور اللہ نے جہنم کو عقل وادراک دیا ہے، قرآن کریم میں حق تعالیٰ کا جہنم کو خطاب کرنا اور جہنم کا جواب دینا وارد ہے، جو اس کی دلیل ہے، اللہ کا پاک ارشاد ہے: ''يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْد'' (۲)

اربع مائة مرة: اس عدد کی وجہ کے سلسلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں:

(۱) بعض نے کہا اس عدد کی وجہ ہمیں معلوم نہیں۔

(۲) بعض نے کہا کہ اس سے کثرت مراد ہے تحدید مراد نہیں۔

(۳) بعض نے کہا کہ اس وادی کے چار کونے ہیں اور جہنم اس کے ہر کونے سے سو مرتبہ پناہ طلب

(۱) شرح الطيبی ۱/ ٤٦٢.

(۲) ق: ۳۰.

کرتی ہے۔[1]

القراؤون المراؤن باعمالهم: یہاں بھی ''قراء'' سے مراد علماء ہیں، اور ''المراؤن'' ارائۃ سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے، بمعنی دکھلاوا کرنے والے، ریاکاری کرنے والے۔

وان من أبغض القراء: ابن ماجہ میں اسی حدیث میں یہ اضافہ ہے کہ سب سے مبغوض علماء اللہ کے نزدیک امراء وحکام کی زیارت کرنے والے ہیں، اس کی سند میں ایک راوی ''محاربی'' ہیں انہوں نے فرمایا ہے کہ یہاں ''امراء'' سے ظالم بادشاہ مراد ہیں، لہذا جو علماء ظالم بادشاہوں سے تعلقات رکھیں اور ان کے ظلم پر نکیر نہ کریں اور ان کی ہاں میں ہاں ملائیں تو وہ مبغوض ہیں، جس کی وجہ ظاہر ہے، اسی طرح اگر امراء وحکام سے ملاقات مال وجاہ کے قصد سے ہو تو یہ بھی ممنوع ہے، البتہ ضرورت کے وقت کی ملاقات اس میں شامل نہیں، اس کی اجازت ہے اور بادشاہ اگر منصف وعادل ہے تو اس کی زیارت اور ملاقات تو عبادت ہے۔

٢٥٦ / ٧٩: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''يُوْشِكُ أَنْ يَّأْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ، لَايَبْقٰى مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهٗ وَلَايَبْقٰى مِنَ الْقُرْآنِ إِلَّا رَسْمُهٗ، مَسَاجِدُهُم عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدٰى، عُلَمَاؤُهُمْ شَرُّ مَنْ تَحْتَ أَدِيْمِ السَّمَاءِ، مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ، وَفِيْهِمْ تَعُوْدُ'' (رواه البيهقي في شعب الإيمان)[2]

ترجمہ: حضرت علیؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: عنقریب لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا، کہ اسلام میں سے صرف اس کا نام باقی رہ جائے گا، اور قرآن میں سے صرف اس کے نقوش باقی رہیں گے، ان کی مسجدیں تو آباد ہونگی مگر ہدایت سے خالی ہونگی، ان کے علماء آسمان کے نیچے کی مخلوق میں سب سے برے ہوں گے، ان ہی میں سے فتنہ نکلے گا اور ان ہی میں لوٹ جائے گا۔ (بیہقی)

تشریح حدیث

اسلام کی روح نکل جانے اور علماء اسلام میں خرابی پیدا ہوجانے کی پیش گوئی:

اس حدیث میں قرب قیامت میں دین کے کمزور ہوجانے کی پیش گوئی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ

(١) المرقاة ١ / ٤٨٢.

(٢) أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٢ / ٣١١ الرقم ١٩٠٨.

ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اعمالِ اسلام کی صرف صورت باقی رہ جائے گی ان کی روح ختم ہوجائے گی، اس وقت کے علماء میں بیشتر ایسے ہونگے جو خود بھی فتنہ میں پڑنے والے اور دوسروں کو بھی فتنہ میں ڈالنے والے ہونگے۔

لایبقی من الإسلام الا اسمہ: یہاں اسلام سے مراد شعائر اسلام ہیں جیسے نماز، روزہ وغیرہ یہ بظاہر نظر آئیں گے مگر ان کی روح ختم ہوجائے گی کہ نماز سے خشوع، روزوں سے تقوی اور حج سے عشق الٰہی ختم ہوجائے گا، کمال اسلام باقی نہیں رہے گا۔(۱)

ولایبقی من القرآن الارسمہ: ''رسم'' بمعنی ظاہر، اس سے مراد قرآن کے الفاظ ہیں کہ لوگ الفاظ کی طرف زیادہ توجہ دیں گے اور معانی میں غور وفکر نہیں کریں گے اور احکام کا اتباع نہیں کریں گے، حالانکہ اصل مقصود تو تدبر اور عمل ہے۔(۲)

مساجدھم عامرۃ وھی خراب: ''عامر'' بمعنی آباد اور ''خراب'' بمعنی ویران، یعنی مسجدوں میں نقش ونگار خوب ہوگا لیکن ان کو آباد کرنے والے کم ہونگے، نمازی کم ہوں گے، یا نمازی تو ہونگے لیکن اخلاص سے خالی ہوں گے۔(۳)

علماء ھم شر من تحت ادیم السماء: ''أدیم السماء'' یعنی آسمان کی نچلی سطح، یہ علماء فتنہ پرداز ہونگے اپنے مفاد کی خاطر لوگوں کو برانگیختہ کریں گے، پھر وہی لوگ کسی بات پر ان کے مخالف ہوکر انھیں کے خلاف جدوجہد کریں گے، اسی اعتبار سے ایسے علماء کو مخلوق میں سب سے برا کہا۔(۴)

من عندھم تخرج الفتنة: یعنی علماء اپنے مفاد کے لئے فتنہ پرداز لوگوں کو میدان میں اتاریں گے۔

وفیھم تعود: وہ فتین لوگ کسی بات پر ناراض ہوکر ان علماء کے خلاف جدوجہد کریں گے اس لحاظ سے گویا فتنہ انھیں میں لوٹ گیا۔(۵)

---

(۱)المرقاۃ ۱/۴۸۳.

(۲)المرقاۃ ۱/۴۸۳.

(۳)المرقاۃ ۱/۴۸۳.

(٤)شرح الطیبی ۱/٤٦٣.

(٥)شرح الطیبي ۱/٤٦٣.

٢٥٧ / ٨٠: وَعَنْ زِيَادِ بنِ لَبِيدٍؓ قَالَ: ذَكَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئاً ،فَقَالَ: "ذَاکَ عِنْدَ أَوَانِ ذَهَابِ الْعِلْمِ" قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! وَكَيْفَ يَذْهَبُ الْعِلْمُ وَنَحْنُ نَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَنُقْرِئُهُ أَبْنَاءَ نَا ، وَيُقْرِؤُهُ أَبْنَاؤُنَا أَبْنَاءَ هُمْ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ؟ فَقَالَ: "ثَكِلَتْکَ أُمُّکَ زِيَادُ! إِنْ كُنْتُ لَأَرَاکَ مِنْ أَفْقَهِ رَجُلٍ بِالْمَدِيْنَةِ! أَوَلَيْسَ هٰذِهِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارىٰ يَقْرَؤُوْنَ التَّوْرَاةَ وَالإِنْجِيْلَ لَايَعْمَلُوْنَ بِشَيْءٍ مِمَّا فِيْهِمَا؟ !" (رواه أحمد وابن ماجه، وروى الترمذي عنه نحوه[١] وكذا الدارمي عن أبي أمامة.[٢]

ترجمہ : اور حضرت زیاد بن لبیدؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں: کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی (خوف ناک) چیز کا ذکر فرمایا، پھر فرمایا: کہ یہ اس وقت ہوگا جبکہ علم جاتا رہے گا، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! علم کس طرح جاتا رہے گا؟ حالانکہ ہم قرآن پڑھتے ہیں، اور اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں اور ہمارے بچے اپنے بچوں کو پڑھائیں گے، اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زیاد! تمہیں تمہاری ماں گم کرے! میں تو تم کو مدینہ کے لوگوں میں بڑا سمجھ دار سمجھتا تھا، کیا یہ یہود ونصاری توریت اور انجیل کو نہیں پڑھتے لیکن ان کی کتابوں میں جو کچھ ہے اس میں سے وہ کسی چیز پر عمل نہیں کرتے۔ (احمد، ابن ماجہ، اور اسی جیسی روایت ترمذی نے زیاد سے روایت کی ہے اور امام دارمی نے اسی کے ہم معنی حدیث ابوامامہ کے واسطہ سے نقل فرمائی ہے)

تشریح حدیث

احوال زیاد بن لبید:

آپ انصاری صحابی ہیں، مدینہ کے مشہور عقلمندوں میں تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ تشریف لانے سے پہلے حضرت زیاد مسلمان ہو گئے تھے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہنے کے مقصد سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور پھر جب تمام مسلمانوں کے لئے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف

(١) أخرجه الترمذی فی العلم، باب ماجاء فی ذهاب العلم ٢ / ٩٤ وابن ماجه فی الفتن، باب ذهاب القرآن والعلم ٢ / ٢٩٣ واحمد ٤ / ١٦٠ الرقم ١٧٥٠٧ و ٤ / ٢١٨ الرقم ١٧٩٤٨.

(٢) أخرجه الدارمي في المقدمة ١ / ٨٢ (٢٤٤)

ہجرت کا حکم نازل ہوا اور مسلمان ہجرت کرنے لگے تو زیاد بن لبید بھی مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آ گئے، اسی لئے وہ مہاجر انصاری کہلاتے تھے، حضرات محدثین کے یہاں یہ ایک چیستاں بھی ہے کہ ایسے کونسے صحابی ہیں جو انصاری ہونے کے ساتھ مہاجر بھی ہیں؟ جواب یہ ہے کہ وہ زیاد بن لبید ہیں۔[1]

علم کیسے اٹھے گا:

اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ علماء کو چاہئے کہ اپنے علم کے مقتضی پر عمل کریں اور قرآن میں تدبر کریں ورنہ خطرات لاحق ہوں گے، آفات وبلیات پیش آئیں گی، حدیث شریف کے پہلے جملہ **ذکر النبی صلی الله علیه وسلم شیئا** کی شرح ملا علی قاری نے اس طرح فرمائی **شیئاً أی هائلا** یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خوفناک چیز کا تذکرہ فرمایا اور فرمایا کہ یہ اس وقت ہوگا جب علم اٹھ جائے گا۔

ثکلتک أمک : تیری ماں تجھے گم کرے، یہ جملہ موت کی بددعا کے لئے استعمال ہوتا تھا پھر اظہار تعجب کے طور پر استعمال ہونے لگا، معنی یہ ہیں کہ تم سمجھدار ہوتے ہوئے ناسمجھی کی بات کر رہے ہو! یہود ونصاریٰ بھی تو توریت وانجیل پڑھتے پڑھاتے ہیں لیکن اس پر عمل نہیں کرتے، اس لئے اللہ نے ان کو جاہل بلکہ اس گدھے کی مانند کہا ہے جو اپنے اوپر بوجھ لادے ہوئے ہو، اِس تنبیہ کا حاصل یہ ہوا کہ محض الفاظ کے پڑھنے پڑھانے کا نام علم نہیں، بلکہ حقیقی علم وہ ہے جس پر عمل کیا جائے، جب علم پر عمل نہیں ہوگا تو کہا جائے گا کہ علم اٹھ چکا ہے۔

۲۵۸ / ۸۲: وَعَنْ اِبنَ مَسْعُوْدٍقَالَ: قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "تَعَلَّمُوْا الْعِلْمَ وَعَلِّمُوْهُ النَّاسَ، تَعَلَّمُوْا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوْهَا النَّاسَ، تَعَلَّمُوْا الْقُرْآنَ وَعَلِّمُوْهُ النَّاسَ؛ فَإِنِّيْ اِمْرَؤٌ مَقْبُوْضٌ، وَالْعِلْمُ سَيُنْقَبِضُ، وَيَظْهَرُالْفِتَنُ حَتّٰى يَخْتَلِفَ اِثْنَانِ فِيْ فَرِيْضَةٍ لايَجِدَانِ أَحَدايُفْصِلُ بَيْنَهُمَا" (روا ه الدارمی، والدارقطني)[2]

ترجمه : حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: علم کو سیکھو اور سکھاؤ، اور فرائض سیکھو اور اس کو لوگوں کو سکھاؤ، قرآن کو سیکھو اور

(۱) الإصابه ۲ / ۲۳٤ / – ۲۳۵.

(۲) أخرجه الدارمی فی المقدمة ۱ / ۸۷ الرقم ۲۲۵ والدارقطنی فی الفرائض والسیر وغیر ذلک ٤ / ٤٦ الرقم ٤۰۵۹.

لوگوں کو سکھاؤ، اس لیے کہ میں ایک شخص ہوں جو اٹھالیا جاؤں گا اور علم بھی اٹھ جائے گا اور فتنے ظاہر ہونگے یہاں تک کہ دو شخص ایک فرض کے بارے میں اختلاف کریں گے اور کسی کو ایسا نہ پائیں گے جو ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرے۔ (دارمی، دار قطنی)

تشریح حدیث

علم کے اٹھ جانے سے قبل اس کے حصول کی تاکید:

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علم حاصل کرنے کی ترغیب دی بالخصوص قرآن اور فرائض کے اہتمام کا حکم دیا، حدیث کا حاصل یہ ہے کہ علم دین خود بھی سیکھو لوگوں کو بھی سکھاؤ قرآن اور فرائض کے علم کا خوب اہتمام کرو میری حیات کو غنیمت جانو کیونکہ میں دنیا میں ہمیشہ نہیں رہونگا وحی کے ذریعہ علم آنے کا جو سلسلہ ہے وہ عنقریب ختم ہوجائے گا اس لئے مجھ سے خوب علم حاصل کرلو، ایک وقت آئے گا کہ علم اٹھ جائے گا اور جب علم نہیں ہوتا تو فتنے پیدا ہوتے ہیں۔

قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: عبداللہ بن مسعودؓ کو خطاب کیا، یا تو اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت وہی تھے کوئی اور نہ تھا، یا دیگر لوگ بھی موجود تھے لیکن حضرت عبداللہ بن مسعود کے اندر فہم وفقاہت زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کو خطاب کیا، البتہ مراد عام لوگ ہیں۔

حتی یختلف اثنان فی فریضۃ: ''فریضہ'' سے کیا مراد ہے؟ اس میں دو قول ہیں:

(۱) مطلق فرائض اسلام مراد ہیں۔

(۲) علم الفرائض مراد ہے۔ (۱)

مطلب یہ ہوا کہ علم کی قلت اور فتنوں کی کثرت کی وجہ سے اسلامی فرائض اور میراث کے مسائل بتانے والا کوئی نہیں ملے گا۔

۲۵۹ / ۸۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَثَلُ عِلْمٍ لَايُنْتَفَعُ بِهٖ كَمَثَلِ كَنْزٍ لَايُنْفَقُ مِنْهُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ. (رواه أحمد والدارمي) (۲)

(۱) المرقاة ۱ / ۴۸۵.

(۲) أخرجه الدارمی فی المقدمة، باب البلاغ عن رسول الله صلی الله علیه وسلم وتعلیم السنن ۱ / ۱۴۵ الرقم ۵٦۲ وأحمد فی مسنده ۲ / ۴۹۹ الرقم ۱۰۴۸۱.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس علم کی مثال جس سے نفع نہ اٹھایا جائے اس خزانہ کی طرح ہے جس سے خدا کی راہ میں کچھ خرچ نہ کیا جائے۔ (احمد، دارمی)

تشریح حدیث

جس علم سے نفع نہ اٹھایا جائے اس کی مثال:

اس حدیث میں علم کے واجب حقوق کو ادانہ کرنے پر وعید کا بیان ہے، حدیث کا ماحصل یہ ہے کہ اپنے علم کے مقتضی پر عمل کرنا چاہئے اور دوسروں کو سکھانا بھی چاہئے، یہ علم کے حقوق واجبہ ہیں، علم کے حقوق واجبہ کو ادانہ کیا جائے تو وہ علم آدمی کے لئے وبال جان بنتا ہے، جیسے مال اور خزانہ کہ وہ اس لئے ہے تاکہ بندہ اسے اپنے اوپر بھی خرچ کرے اور اللہ کی راہ میں بھی خرچ کرے یہ مال کے واجب حقوق ہیں، اگر مال کے ان حقوق واجبہ کو ادانہ کیا جائے تو وہ مال بھی صاحب مال کے لئے وبال جان بنے گا، جیسا کہ اللہ کا پاک ارشاد ہے: ''وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَايُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ''(۱)

یعنی اور جو لوگ سونا اور چاندی خزانہ بنا کر رکھتے ہیں اور اسے خرچ نہیں کرتے اللہ کے راستہ میں تو آپ انھیں بشارت سنادیجئے دردناک عذاب کی جس دن جہنم کی آگ میں اسے گرم کیا جائے گا پھر اس کے ذریعہ ان کی پیشانی اور ان کے پہلوؤں اور ان کی پیٹھوں کو داغا جائے گا (اور کہا جائے گا) کہ یہ وہ ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا تو اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو۔

تم المجلد الاول من هذا الشرح
والحمد لله الذى تتم بنعمته الصالحات.

---

(۱) التوبہ: ٣٤–٣٥.